تجلیات آفتاب

(جلد اوّل)

مناظر اہل سنت

مولانا کرم دین دبیر آف بھیں تحصیل چکوال

کی شہرہ آفاق کتاب آفتاب ہدایت کا ایک تاریخی مقدمہ

اثر خامہ

حضرت علامہ جسٹس خالد محمود

ڈائریکٹر اسلامک اکیڈیمی مانچسٹر

ایک حق گو کے قلم سے ڈھکو کے اس کتاب پر اٹھائے ہوئے جملہ ایرادت کا کامل جواب

شائع کردہ

محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ

جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی لاہور

تجلیات آفتاب

(جلد اوّل)

مناظرِ اہل سنت

مولانا کرم دین دبیر آف بھیں تحصیل چکوال

کی شہرہ آفاق کتاب آفتاب ہدایت کا ایک تاریخی مقدمہ

اثر خامہ

حضرت علامہ جسٹس خالد محمود

ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر

ایک حق گو کے قلم سے ڈھکو کے اس کتاب پر اٹھائے ہوئے جملہ ایرادات کا کامل جواب

شائع کردہ: محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ لاہور

جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی لاہور

نام کتاب .... **تجلیات آفتاب** (جلد اوّل)

کمپوزنگ .... جناب ناصر الدین عامر (امریکہ)

نبیرہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس اللہ سرہ العزیز

صفحات ۶۰۰

اشاعت .... ۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۰۱۰ء / ۵۰۰

جملہ حقوق طبع و اشاعت بنام مؤلف محفوظ

شائع کردہ .... محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ لاہور

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز لاہور — جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی (شاہدرہ) لاہور

ملنے کے پتے

۱۔ جامع مسجد ختم نبوت کلاں محمود کالونی شاہدرہ لاہور۔

۲۔ قاضی ظہور حسین صاحب قصبہ بھیں ضلع چکوال۔

۳۔ جیلانی اکیڈیمی، خیبر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔

۴۔ اسلامک اکیڈیمی آف مانچسٹر 0161-273-1145

Jamia Islamia

347-349, Stockport Rd, Manchester, M13-OLF

فہرست مضامین

مقدمۃ الکتاب

تحقیق عقائد کے چند بنیادی اصول ۶۸

تعلیمات اسلامی کا کامل نصاب

جسٹس ڈاکٹر علامہ خالد محمود ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر کے قلم سے

۱۔ آثار التنزیل — دو جلد

۲۔ آثار الحدیث — دو جلد

۳۔ آثار التشریع — دو جلد

۴۔ آثار الاحسان — دو جلد

یونیورسٹیوں کے فنی تعلیم کے طلبہ، کالجوں کے جدید تعلیم کے طلبہ اور مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ کے لئے

اسلام کے علمی مآخذ کا ایک مکمل، مرتب اور آسان کورس

شائع کردہ:
محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ لاہور
جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی (شاہدرہ) لاہور

مقدمۃ الکتاب

تجلیات آفتاب

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ سید الرسل وخاتم الانبیاء وعلی آلہ الاتقیاء واصحابہ الاصفیاء اما بعد.

آفتاب ہدایت کی کرنیں کہاں کہاں پہنچیں کہ اہل حق کو اپنے قرب وجوار اور دور ودراز ہر جگہ اس سے اطمینان نصیب ہوا اور اہل شک میں لاکھوں کی اصلاح ہوئی یہ پچھلی صدی کی ایک روشن تاریخ ہے۔

پچھلی صدی میں موضع بھیں تحصیل چکوال ضلع جہلم میں ایک جلیل القدر عالم دین مولانا ابوالفضل کرم الدین دبیر ۱۸۵۷ء سے کچھ سال قبل پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے شاگرد رشید مولانا فخر الدین سے عربی ادب کی تکمیل کی اور دورہ حدیث کے لئے استاذ الہند حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی خدمت میں پہنچے۔

اُن دِنوں چکوال، میانوالی، سرگودھا اور جہلم پنجاب کے پسماندہ علاقے سمجھے جاتے تھے اور جہاں تعلیم کی کمی ہو وہاں خلاف دین باطل قوتیں بڑی تیزی سے ابھرتی ہیں۔ ان علاقوں میں شیعہ ذاکرین ہر قریہ ودیہہ میں مجلسیں پڑھتے اور ان پڑھ سنی لوگوں میں خلفاء راشدین کے خلاف اچھی خاصی ذہن سازی ہو جاتی اللہ دین حق کا خود محافظ ہے وہ ایسے علاقوں میں ایسے اشخاص بھی پیدا کر دیتا ہے جو اپنے پورے علاقے میں روشنی کا مینار بن جاتے ہیں۔

مولانا محمد کرم الدین دبیر (وفات ۱۹۶۴ء) بھیں ضلع چکوال سے نکلے اور اپنے علم وخطابت اور قوت مناظرہ میں بڑی شہرت سے اپنے پورے علاقے پر چھا گئے آپ نے اپنے سنی بھائیوں کو شیعہ وہمات واعتراضات سے بچانے کے لئے کتاب آفتاب ہدایت لکھی، اور شیعہ کے جھوٹے الزامات کا نہایت مدلل جواب دیا یہ کوئی کلید مناظرہ نہیں کہ ہر بات شیعہ کتابوں سے ہی لی جائے۔ عام مغالطے انہی کتابوں سے دور کئے جاتے ہیں جن کے حوالوں سے مخالفین اپنے مسلک کی راہیں ہموار کرتے ہیں سو مناسب ٹھہرتا ہے کہ ان الزامات کی صفائی انہی کتابوں سے پیش کی جائے جن کے

حوالوں سے مخالفین استدلال کرتے ہیں حوالے جن کتابوں کے ہوں ان کی وضاحت انہی کتابوں سے لینا عین عدل وانصاف ہے۔ یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ اعتراض تو اہل سنت کی کتابوں سے پیش کیے جائیں اور ان کی صفائی شیعہ کتابوں سے لانی ضروری قرار دی جائے۔ ہاں ضمنی طور پر کہیں شیعہ کتابوں سے اس کی تائید ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اس نہج سے آفتاب ہدایت میں ان کتابوں سے بھی کہیں کہیں کچھ حوالے دے دیئے گئے ہیں۔

ان علمی امور اور الزامی بحثوں سے گزر کر لوگوں میں شیعہ تحریک کا ایک اپنا قدیمی تعارف ہے اور صحابہ کے بارے میں ان کے عقیدے کسی سے چھپے نہیں اس طرح اس حقیقت سے بھی کسی صاحب علم کو انکار نہیں کہ اسلامی تاریخ خلفائے راشدین سے ہی چلتی ہے اور امت مسلمہ اپنے اسی تسلسل سے پہچانی جاتی ہے جب خلافت راشدہ سے ہی اعتماد اٹھا لیا جائے تو امت مسلمہ کو کہیں سہارا نہیں ملتا سوائے اس کے کہ اس دنیا کے آخر میں حضرت امام محمد مہدی کا انتظار کریں اور خود جب کچھ نہ بن پڑے تو چند تاریخی بحثوں میں وقت گزار کر جس طرح بھی ہو چند صدیاں عبور کر لیں اور امید باندھیں کہ حضرت امام منتظر خود ان کے دشمنوں سے ان کا انتقام لیں گے۔ اللہ بس وماقی ہوس۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے صرف یہ کر سکیں گے کہ ہر سال کچھ رونے پیٹنے کی مجلسیں کر لیا کریں گے اور اس وقت یہ عزاداری ہی دین کا کل سرمایہ زندگی ہوگی۔

مولانا دبیر نے کتاب آفتاب ہدایت کے شروع میں پہلے سنی شیعہ نظریات کا ایک تقابلی نقشہ کھینچا ہے کہ عوام میں سنی شیعہ تاریخیں اسلام کی کیا تصویر کھینچتی ہیں اب جو شخص اس کتاب کا جواب دے اسے لازم ہے کہ وہ اس تصویر کو غلط ثابت کرے اور عوام کے ذہنوں سے سنی شیعہ اختلافات کا صدیوں کا بوجھ اتارے لیکن اگر وہ اس تصویر کو غلط ثابت کرنے کی بجائے اپنی طرف سے ایک اور تصویر بنائے کہ سنی دینی حلقوں سے متعارف حضرات کہیں اس کی تصدیق نہ کر سکیں تو یہ ہرگز اس پہلی تصویر کا جواب نہ سمجھا جائے گا اور یہ بات مانی جائے گی کہ وہ پہلی پیش کردہ تصویر کو عام ذہنوں سے دھو نہیں سکا۔ اپنے اس موقف میں اسلامیات کا مطالعہ رکھنے والا عام شخص اپنے ذہن میں ان دو فرقوں کا یہی تاثر رکھتا ہے جو مولانا دبیر نے آفتاب ہدایت میں دیا ہے۔

اور مولانا اس میں پورے کامیاب ہوئے ہیں، آفتاب ہدایت ایسی قبول ہوئی کہ اس کے اڈیشنوں پر اڈیشن نکلتے گئے اور کسی اثناء عشری کو اس کے دلائل کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی، چھٹے اڈیشن کے بعد سرگودھا کے ایک شخص محمد حسین نے اس کے جواب میں ایک کتاب تجلیات صداقت لکھی مگر افسوس کہ اس سے بھی کوئی جواب بن نہ پڑا اور جس نے بھی اسے دیکھا اس نے آفتاب ہدایت کو اور لاجواب پایا اور یہ حقیقت ہے کہ یہ شخص آفتاب ہدایت کی کسی ایک کرن کو بھی چھو نہ پایا اور اس کی ہر بات نہایت کمزور اور گری ہوئی نکلی۔ جب بنیاد ڈھ جائے (گر جائے) تو پھر اس پر کوئی دیوار تعمیر نہیں ہوتی۔ محمد حسین مذکور سوائے اس کے کہ اسے ڈھ گو (کمزور بات کرنے والا) کہیں، کہیں بھی یا کسی علمی سطح پر آفتاب ہدایت

کے دیئے ہوئے تقابلی نقشے میں کوئی رخنہ دکھا نہیں سکا تاہم اس نے آفتاب ہدایت کے دیئے دلائل توڑنے کی بجائے اپنی طرف سے صحابہ کے خلاف جو بے سروپا داستانیں وضع کی ہیں اور بے سند قصوں اور کہانیوں سے اہل سنت کے قرآن کریم کی آیات قطعیہ سے حاصل کردہ عقائد کو مجروح کرنے کی جو علمی غلطیاں کی ہیں نامناسب نہ ہوگا کہ ہم اس ڈھ گو کی اس نئی پیش کردہ تصویر اور قرآن کی آیات قطعیہ سے صحابہ کی جو منقبت ہر قاری کے سامنے آتی ہے۔ اس کے مقابل ڈھگو کی خلفائے ثلثہ کو چند موضوع قصوں اور وضعی داستانوں سے اس عموم ایمان سے نکالنے کی جاہلانہ کوشش کا کچھ مختصر جائزہ لیں اور اس ترتیب سے چلیں جس سے یہ ڈھگو چلا ہے۔ پھر ڈھگو اور حق گو کی باتوں میں قارئین خود فیصلہ کریں کہ سچائی کی کرنیں کہاں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ آفتاب ہدایت کی کرنیں ہیں جو پچھلی صدی سے لے کر اب تک ان پورے علاقوں میں ضیاء باری کر رہی ہیں۔

ڈھگو رافضی نے اہل سنت عقائد کی غلط تصویر کھینچی ہے

اہل سنت کے عقیدہ توحید، عقیدہ شان رسالت اور عقیدہ مقام صحابہ پر محمد حسین ڈھ گو نے خوب دل کھول کر جھوٹ بولے ہیں۔ بایں ہمہ تجلیات صداقت بس ایک حجم ہی حجم ہے جس میں کوئی نئی بات نہیں کہ اس کا جواب پہلے سے اہل سنت کی کتابوں میں دیا نہ گیا ہو۔ مولف مذکور نے صرف اپنے حلقے کو مطمئن کرنے کے لئے وہی پرانے اعتراضات اپنی اس کتاب میں لا جمع کیے ہیں جن کے اطمینان بخش جوابات علماء اہل سنت پہلے سے اپنی کتابوں میں دیتے آئے ہیں اور اثنا عشریوں پر وہ اپنی حجت تمام کر چکے ہیں۔

ہاں تجلیات صداقت کی ایک اپنی ترتیب ہے سو ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کا جواب اس نئی ترتیب سے بھی دیا جائے۔

اس وقت تجلیات کا دوسرا اڈیشن ۱۹۸۱ ہمارے سامنے ہے۔ ۱۹۷۳ کا پہلا اڈیشن بالکل ناقابل التفات طباعت میں تھا اور بقول اس کے مصنف کے نہ اس کا کاغذ اچھا تھا نہ کتابت عمدہ تھی اور نہ طباعت دیدہ زیب تھی اور نہ شیعہ قوم میں اس کی کوئی پذیرائی ہوئی۔ یہ کتاب اپنے پہلے اڈیشن میں بالکل ایک گمنامی میں رہی اور ملک کے پڑھے لکھے حلقوں میں کسی شخص نے اس طرف دھیان نہ کیا اور جس نے اسے دیکھا بھی اس نے اس میں کوئی علمی قوت محسوس نہ کی۔

مولف تجلیات آفتاب ہدایت کی تصدیق میں

تجلیات میں آفتاب ہدایت کی تردید نہیں ہے اس کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ تجلیات صفحہ نمبر ۹ پر مصنف نے مولانا کرم الدین دبیر کا یہ استدلال نقل کیا ہے کہ شیعوں کا نام رافضی خدا نے رکھا ہے اور اس کے لئے مولانا کرم دین نے فروع کافی کتاب الروضہ کا حوالہ دیا ہے۔

اس کا جواب تجلیات میں پورے صفحہ میں دیا گیا ہے۔ مگر مولف اس میں آفتاب ہدایت کی کوئی تردید نہیں کر سکا نہ اس نے اس کے حوالے کی تغلیط کی ہے اور نہ لفظ رافضی کا انکار کیا ہے بلکہ اس کی پوری تصدیق کی ہے اور اپنے اوپر اس نام کو خوب چسپاں کیا ہے۔ کیا یہ آفتاب ہدایت کی کھلی پذیرائی اور تصدیق نہیں؟

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جب یہ نام انہیں اتنا پیارا ہے اور ان کے لئے ایک خداداد نام ہے۔ تو ہم اسے رافضی کے نام سے ذکر کریں ہر جگہ مولف تجلیات صداقت لکھنے کی ضرورت نہ رہے گی اسے رافضی کہنا کافی ہو سکتا ہے۔ امید ہے اس پر یہ ڈھگو خوش رہے گا۔ سنا ہے کہ اس کے پورے علاقے میں لوگ اس کو ڈھ گو کے نام سے ہی ذکر کرتے ہیں۔

آفتاب ہدایت کو ناقابل جواب مانتے ہوئے رافضی نے ایک دعویٰ کیا ہے۔

شیعان حیدر کرار کو اس لئے رافضی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے امت محمدیہ کے بعض فرعون صفت مدعیان خلافت و امامت کی اتباع ترک کر کے خدا کے مقرر کردہ آئمہ ہدایت و خلفاء حق کو مرکز رشد و ہدایت تسلیم کرتے ہیں۔

(تجلیات ص ۹)

آخری دو لفظ ''کیا ہے'' لکھنے تھے رافضی حواس باختہ اُنہیں کرتے ہیں۔ لکھتا ہے یہ مولف کے علمی نوادرات میں سے ہے۔ اپنی زبان میں یہ حال ہے تو عراق میں کسی دوسری زبان میں اس کا کیا حال ہوگا یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

اس عبارت میں اس رافضی نے اقرار کیا ہے کہ شیعہ پہلے انہی (سنی) مدعیان خلافت و امامت کی پیروی کرتے تھے اور پھر انہوں نے اسے ترک کیا اور رافضی کہلائے اس کا حاصل اس کے سوا کیا نکلتا ہے کہ سنی مذہب پہلے سے موجود تھا اور رافضی مذہب بعد میں بنا۔ یہ کب بنا؟ اسی وقت سے جب انہوں نے ان پہلوں کی پیروی ترک کی تو اسلام کا نشان بن کر دنیا میں پہلے کن لوگوں کا تعارف ہوا؟ انہی کا جو حق گو تھے ڈھ گو نہ تھے۔

آپ خود سوچیں کہ سچ اور جھوٹ میں، روشنی اور اندھیرے میں، نیکی اور بدی میں پہلے کون رہا ہے اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔ حق پہلے سے ہوتا ہے اور خلاف حق بات بعد میں آتی ہے۔ یہاں رافضی مذکور کو اپنے اکابر شیعوں کی ایک فہرست بھی پیش کرنی چاہیئے تھی۔ جنہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کی اور پھر انہیں ترک کر کے وہ رافضی کہلائے یہ فہرست رافضی مذکور کے ذمہ رہے گی۔ اہل حق کا اس پر اور اسکے مقلدین پر یہ ہمیشہ ایک قرض رہے گا۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ نجف اشرف اور قم کے تمام رافضی مل کر بھی قیامت تک وہ فہرست کبھی سامنے نہ لا سکیں گے کہ ان حضرات نے خلفائے ثلثہ کی زندگی میں ان کی بیعت امامت کی اور پھر ان کے سامنے ہی وہ ان کے حلقہ بیعت سے باہر آ نکلے۔ حضرت امام حسینؓ کا اور حضرت امام حسنؓ کا آخری زندگی تک حضرت معاویہؓ کی بیعت میں رہنا بتلاتا ہے کہ وہ ڈھ گو کی تحقیق کے مطابق کبھی رافضی نہ کہلائے ہوں گے اور نہ وہ حضرت معاویہؓ کی امامت سے کبھی نکلے ہوں گے۔

حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور آپ مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہوتے تھے تو بتایا جائے کہ آپ نے کب حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑی؟ اگر کبھی نہ چھوڑی تو ظاہر ہے کہ آپ ہرگز رافضی نہ تھے۔

رہا آپ کا حضرت ابوبکر کے مقتدیوں کی صف میں کھڑا ہونا تو اسے علامہ طبرسی اس طرح لکھتا ہے:۔

ثم قام و تهيأ للصلوٰة و حضر المسجد و صلّى خلف ابى بكرؓ و خالد بن الوليد يصلى بجنبه. (كتاب الاحتجاج ص ٦٠)

ترجمہ: ''پھر آپ کھڑے ہوئے نماز کی نیت کی اور مسجد میں آئے اور حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی اور خالد بن الولید آپ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔''

آپ کا مسجد میں آنا صرف نماز پڑھنے کے لئے نہ تھا یہ دکھانے کے لئے تھا کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے مقتدیوں میں کھڑا ہوں۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کے مقتدی بننے کا حوالہ ہم نے دکھا دیا ہے اب رافضی اس پر حوالہ پیش کرے کہ پھر آپ نے ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی (معاذ اللہ) اور رفض اختیار کر لیا تھا لیکن حق بات یہ ہے کہ آپ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے بعد خود اپنی خلافت میں بھی ان کی پیروی سے باہر نہ آئے تھے قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) لکھتا ہے:

حضرت امیر در ایام خلافت خود دید کہ اکثر مردم حسن سیرت ابوبکرؓ عمرؓ را معتقد اند و ایشاں را برحق مے دانند قدرت برآں نداشت کہ کارے کند کہ دلالت بر فساد خلافت ایشاں داشتہ باشد۔۔۔ اکثر اھل آں زمان را اعتقاد آں بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است و فساد امامت ایشاں را دلیل فساد امامت او مے دانند

(مجالس المومنین جلد ۱ ص ۵۴)

(ترجمہ) حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں دیکھا کہ لوگ بڑی کثرت سے حضرت ابوبکر و عمر کے حسن سیرت کے معتقد ہیں اور انھیں خلفائے حق مانتے ہیں سو آپ اس پر قادر نہ تھے کہ کوئی کام ایسا کریں جس سے پتہ چلے کہ ان کی خلافت حق نہ تھی۔ اس زمانے کے اکثر لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت علیؓ کی خلافت انہی کی خلافت پر مبنی ہے اور اگر ابوبکر و عمر کی خلافت کو غلط سمجھا جائے تو اس سے حضرت علی کی خلافت بھی غلط سمجھی جائے گی۔

اس سے ہم یہی سمجھے ہیں کہ حضرت علیؓ رافضی نہ تھے نہ حضرت حسن اور حضرت حسین رافضی تھے نہ انہوں نے خلفاء ثلثہ کی پیروی کو زندگی کے کسی مرحلے میں ترک کیا۔ رافضی بطور فرقہ عبداللہ بن سبا کے بھی مدتوں بعد سامنے آئے ہیں اور راہ حق چھوڑنے والے لوگ رافضی کہلائے ہیں۔

ان کی پیروی کے حوالے ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب اسے ترک کرنے کے اس سطح کے حوالے اس رافضی کے ذمہ ہیں جو اپنے رافضی ہونے پر یہ خوشیاں منا رہا ہے، ہمیں ان کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ رافضی مذکور کبھی وہ فہرست نہ دکھا سکے گا۔ نہ ان رافضیوں کا توبہ نامہ دکھا سکے گا جس کی بناء پر خدا نے ان کا نام رافضی رکھا ہے، بہتر ہے کہ رافضی مذکور وہ سن بھی لکھے اور وہ دن بھی بتائے جب ان شیعانِ حیدر کرار نے خلفاء ثلثہ کی پیروی ترک کر کے اپنے لئے رافضی کا لقب اختیار کیا تھا۔

قارئین کرام! یہ بات واضح ہے کہ حضرت علیؓ کی بیعت کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی۔ گو حضرت معاویہؓ اسے تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ آخر تک حضرات خلفاء ثلثہ کے ساتھ رہے سوان حضرات ثلثہ کو کسی طرح بھی رافضی نہیں کہا جاسکتا۔ حضرت علیؓ آخر تک حضرت عثمانؓ کا دفاع کرتے رہے کوئی رافضی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ انہیں چھوڑ کر کبھی رافضی ہو گئے ہوں۔ آپؓ خود فرماتے ہیں:۔

واللّٰہ قد دفعت عنہ حتی خشیت ان اکون آثماً (نہج البلاغہ ۲ ص ۲۶۱)

ترجمہ: ''خدا کی قسم میں نے عثمان کی طرف سے پورا دفاع کیا یہاں تک کہ میں ڈرا کہ کہیں میں گناہ گار نہ ٹھہروں''

معلوم ہوا کہ جس حد تک آپ ان کا دفاع کر سکتے تھے آپ اس میں اللہ کی رضا کے امیدوار تھے ورنہ اس سے زیادہ کارروائی کو وہ معصیت نہ کہتے۔ حضرت عثمانؓ کا حکم تھا کہ ان حملہ آوروں سے لڑنا نہیں اہلِ سنت سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات ثلثہ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دل سے ان کے ساتھ تھے اور شیعہ کہتے ہیں کہ یہ تقیۃً ان کے ساتھ رہے۔ تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ یہ حضرات ثلثہ آخر دم تک خلفاء ثلثہ کے ساتھ رہے اور حضرت علیؓ کی اپنی خلافت ان پہلے تین خلفاء کی خلافت کا ہی ایک تسلسل تھی اور آپؓ ان کے طریقوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے جو ان کے فیصلے کو غلط کہہ سکے وہ فیصلہ فدک کا ہو یا نماز تراویح کا یا جمعہ کی دو اذانوں کا۔

رافضی مذکور کی کھینچی دوسری تصویر

رافضی مذکور نے آگے صفحہ نمبر ۱۰ پر اسلام کی دو تصویریں کھینچی ہیں۔ یہ دو تصویریں ہیں دو تصویر کشیاں نہیں مگر ڈھگو انہیں دو تصویر کشیاں ہی کہہ رہا ہے۔ کشی کی جمع بتانے میں ہم مولف مذکور کو علم کی داد دیتے ہیں۔ اس رافضی نے یہ دونوں تصویریں صفحہ نمبر ۱۰ اور صفحہ نمبر ۱۱ پر نقل کی ہیں اور اسی انداز میں وہ کتاب کا حجم بڑھاتا آیا ہے تاکہ عوام پر یہ اثر رہے کہ تجلیات صداقت دو جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ آفتاب ہدایت کی پیش کردہ ان دونوں تصویروں میں (بقول رافضی دو تصویر کشیوں میں) جو کچھ دیا گیا ہے۔ ان میں رافضی کسی بات پر انگلی نہیں رکھ سکا نہ اس کی تردید کر سکا ہے۔ تجلیات صداقت میں یہ آفتابِ ہدایت کی فتح کا ایک کھلا اقرار ہے۔

اہل سنت اور شیعہ کی دو تاریخی تصویریں مولانا کرم دین دبیر نے پیش کی تھیں ان میں تاریخی طور پر دونوں مذہبوں کا تقابلی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے دونوں مکاتبِ فکر میں اسلام کی اس پہلے دور کی تاریخ کیسے چلی۔ اس تاریخ میں ان کے عقائد در بارہ توحید و رسالت یا مقام صحابیت پر بحث نہیں کی گئی۔ رافضی شیعوں کی اس بھیانک تصویر کو بدل نہ سکتا تھا اس نے اس پر انگلی رکھے بغیر اہل سنت کی ایک نئی اعتقادی تصویر کھینچ دی ہے تاکہ قارئین کا ذہن اس پہلے تاریخی نقشے پر نہ رہے۔ جواب نہ دے سکنے کی پریشانی میں اس نے ایک نیا موضوع چھیڑ دیا ہے۔ اس نے گویا دبے لفظوں میں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ مولانا دبیر نے دو حلقوں کی جو تقابلی تصویر کھینچی وہ امر واقعی ہے۔ کیا یہ اس کا ایک اقرار شکست نہیں ہے جو اس رافضی نے اختیار کیا ہے۔ وہ نئے دو نقشے پیش کرتا ہے لیکن مولانا دبیر کے پیش کردہ نقشوں کا اس سے کوئی جواب نہیں بن سکا وہ لکھتا ہے:۔

مولف آفتاب ہدایت کی پیش کردہ دونوں تصویریں قارئین کرام نے ملاحظہ فرمالیں۔۔۔ اب ہم انشاء اللہ اسلام کے وہ دو نقشے پیش کرتے ہیں جو شیعہ سنی کتب سے ظاہر و آشکار ہیں (تجلیات ص ۱۲)

مولف مذکور کو آفتاب ہدایت کی پہلی دو تصویروں پر انگلی رکھنے اور انہیں غلط ثابت کرنے کی ہمت نہ ہوئی مجبوراً اس نے نئی دو تصویریں بنائیں۔ گویا رافضی مذکور نے مولف آفتابِ ہدایت کی پیش کردہ دو تصویروں پر سر تسلیم جھکا دیا ہے اور اب وہ ایک نئے موضوع کو سامنے لا کر غلط بحث کے سائے میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔

رافضی نے اپنے خیال سے اسلام کے جو دو نقشے پیش کیے ہیں اور دونوں طرفوں کے عقائد کی جو نئی بحثیں شروع کی ہیں اب یہ نئی بحثیں جو رخ بھی اختیار کریں یہ ایک نیا میدان ہے اور اس کی کوئی ذمہ داری مولف آفتابِ ہدایت پر نہیں آتی۔

مولف تجلیات کے توحید و سنت کے پیش کردہ دو نقشے

رافضی نے پہلے اہلِ سنت کے عقیدہ توحید و رسالت پر وہ فرسودہ بحثیں اٹھائیں ہیں جن کی تردید علماء اہل سنت پہلے بارہا کر چکے ہیں۔ یہاں آفتابِ ہدایت کے نام سے کوئی نئی بات پیش نہیں کی گئی۔ پہلے سنیوں کے عقیدہ توحید کی ایک جھوٹی تصویر دی گئی ہے۔ پھر سنیوں کے ہاں شانِ رسالت کی ایک جھوٹی تصویر دی گئی ہے پھر صفحہ نمبر ۱۳ پر سنیوں کے ہاں شانِ صحابہ کا ایک غلط نقشہ کھنچا ہے جو آفتابِ ہدایت میں کہیں دکھایا نہیں جاسکتا۔ پھر آگے صفحہ نمبر ۱۴ پر حنفیوں کی نماز کا ایک ڈرامہ پیش کیا ہے حالانکہ حنفی شافعی نماز کا کوئی مبحث آفتابِ ہدایت میں مذکور نہ تھا۔

یہاں کوئی عاقل یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب ان باتوں میں سے کوئی بات بھی آفتابِ ہدایت میں موجود نہیں تو یہ رافضی تجلیات صداقت کو کیوں اس کا رد کہہ رہا ہے۔ یہ اس کی بوکھلاہٹ ہے کیونکہ اس کے پاس آفتابِ ہدایت کی

تردید کے لئے کوئی مواد موجود نہیں نہ آفتاب ہدایت میں کوئی ایسی غلطی کی گئی ہے جس پر اس کا کوئی مخالف اس کی کسی بات پر انگلی رکھ سکے۔

سو ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود شیعہ کے ہاں بھی پڑھے لکھے لوگ اسے آفتاب ہدایت کا جواب کہنے میں کافی شرم محسوس کرتے ہوں گے۔

ڈھکو کی تجلیات پڑھنے کے بعد کئی شیعہ لوگ بھیں ضلع چکوال کی سالانہ کانفرنس میں محض اس لیے جاتے رہے کہ ان کے ہاں وہ ان عقائد کی تبلیغ سنیں جو ڈھکو نے اپنی اس دوسری تصویر میں پیش کیے ہیں لیکن انہوں نے وہاں کسی مقرر کو یہ تقریر کرتے نہ سنا کہ خدا کا قد ساٹھ گز ہے یا یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعلان نبوت سے پہلے مشرکین کے مذہب پر تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے وہاں عصمتِ رسالت پر بہت ایمان پرور خطاب سنے اور وہ اسی یقین سے واپس لوٹے کہ ڈھکو نے اپنی تجلیات میں دوسری تصویر کشی میں نہایت غلط کش پر کش لگائے ہیں۔ اگر اہل سنت کے وہی عقائد ہوتے جو ڈھ گو نے اس میں بتائے ہیں تو کہیں تو سنی حلقوں میں ان عقائد کی کھلم کھلا تبلیغ بھی تو ہوتی۔

مولف تجلیات کے پیش کردہ مبحث

ہر مذہبی حلقے میں ان کے کچھ لوگ اہل علم سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا انداز کلام ان کی علمی شرافت کا پتہ دیتا ہے جب وہ کسی بات کو اختلافی کہتے ہیں تو وہ واقعی اختلافی ہوتی ہے لیکن کچے اور کم علم لوگوں میں ایک دوسرے کی وہ باتیں سننے میں آتی ہیں کہ کوئی شریف آدمی انہیں کسی گروہ کا عقیدہ ماننے کے لئے جلدی آمادہ نہیں ہوتا۔

الا یہ کہ وہ اسے بچوں کی تو تو میں میں سمجھتے ہوئے خاموشی سے اس سے گزر جائے۔ واذا مروا باللغو مروا کراما۔ شیعہ قوم کی بدقسمتی سے یہی پیرایہ کلام مولف تجلیات صداقت کو نصیب ہوا ہے۔ دیکھئے وہ اہل سنت عقائد کا کیا نقشہ کھینچتا ہے۔ اہلسنت مساجد و مدارس سے گزرنے والا کوئی شخص اسے کبھی اہل سنت کے عقائد نہ کہہ سکے گا لیکن ڈھکو رافضی نے توحید اہل سنت کا یہ نقشہ پیش کیا ہے۔

توحید اہل سنت...... اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس کی لمبائی 60 گز بنائی مشکوٰۃ شریف کتاب الآداب باب السلام ص 219 بخاری پ 18 ص 102)

اللہ تعالیٰ جنت کے ایک باغ میں اپنا دیدار کرائے گا مسلمانوں کے ساتھ روبرو گفتگو کرے گا اور اپنے منہ سے پردہ اٹھا کر مسلمانوں سے مجلس کرے گا۔

مشکوٰۃ باب صفۃ الجنان جلد 4 ص 189 ابن ماجہ ص 183 جب خدا عرش پر بیٹھتا ہے تو وہ اس طرح چرچراتا ہے جس طرح نئی زین سوار کے بیٹھنے سے چرچراتی ہے۔ (کنز العمال جلد 1 ص 57)

خدا کی آنکھیں دکھنے آئیں تو فرشتوں نے بیمار پرسی کی۔ اللہ تعالیٰ طوفان نوح پر اتنا رویا کہ آنکھیں جوش کر آئیں خدا کے جوتے سونے کے ہیں اور چہرہ پر سنہری پردہ لٹک رہا ہے۔ اس کا مکان عرش معلیٰ پر ہے اور اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے وہ جہت فوق میں ہے جہاں چاہے جا سکتا ہے اور چڑھتا ہے اور نیچے اترتا ہے۔ (انوار اللغہ پ 14 علامہ وحید الزمان) (تجلیات صداقت ص 12)

عقائد اہل سنت بیان کرنے میں رافضی کے ہاتھ کی صفائی

رافضی نے یہاں جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں ان میں سے ایک بھی عقائد اہل سنت کی کتاب نہیں۔ قرآن و حدیث کے حوالے متشابہات سے دے رہا ہے۔ آدم کے قد سے خدا کا قد ساٹھ گز بتا رہا ہے متشابہات سے عقائد نہیں لیے جاتے اہل سنت کی مساجد اور مدارس میں جانے والوں نے کبھی یہ متشابہ عقائد ان کے علماء سے نہ سنیں ہوں گے لیکن ڈھکو عقائد اہل سنت کی تصویر کھینچنے میں بڑے دلیری سے کنز العمال اور انوار اللغہ کو محکم احادیث کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ ان مذبوحی حرکات سے ڈھکو کی بے چینی اور بدعنوانی بری طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ رہا کہ اہل سنت عوام تو درکنار خود شیعہ حلقوں میں بھی تجلیات صداقت باوجود بڑے قد کے کچھ بھی پذیرائی نہ پا سکی۔

محمد حسین ڈھ گو کی کتاب کیوں مقبول عام نہ ہو سکی

ڈھکو کی کتاب "تجلیاتِ صداقت" اپنے حلقوں میں پذیرائی نہ پا سکی۔ کتاب ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا اڈیشن نو سال کے بعد ۱۹۸۱ء میں چھپا اور اب اسے چھپے بھی تیس سال سے زیادہ ہو رہے ہیں اور اس کے تیسرے اڈیشن کی شاید ہی کہیں ضرورت محسوس کی جائے۔ اور جس کتاب (آفتاب ہدایت) کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اب تک اس کے اٹھارہ اڈیشن نکل چکے ہیں۔ چھٹا اڈیشن وہ تھا جس پر اس ڈھکو نے تینتیس سال پہلے اپنا کام شروع کیا تھا۔ "آفتاب ہدایت" اس لیے زیادہ مقبول رہی کہ اس کا مقصد صحابہ اور اہل بیت میں اچھے تعلقات ثابت کرنا رہا اور اس کی پالیسی جوڑ کی رہی۔ اور "تجلیات صداقت" میں ڈھکو کی محنت صحابہؓ اور اہل بیت میں نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کی رہی اور اس کی پالیسی توڑ کی تھی۔ ان دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ملت اسلامی میں اب بھی جوڑ کو پسند کیا جاتا ہے توڑ کو نہیں۔ حضرت حسنؓ اور امیر معاویہؓ کی صلح اور تو اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی نظر میں بھی پوری عظمت کی حامل رہی۔ آپ نے دونوں فریقوں کو فئتین عظیمتین من المسلمین فرمایا (صحیح بخاری ج ا ص ۳۷۳) اب اہل دانش خود سوچیں کہ فئہ باغیہ کی مبہم روایت کو کس طرح اس فئہ عظیمہ کی روایت پر ترجیح دی جا سکتی ہے لسان رسالت نے اپنے اس ارشاد میں حضرت معاویہ اور ان کے پورے حامیوں کو فئہ عظیمہ اور فئہ مسلمہ فرمایا ہے اور اس نیک کام کے باعث حضرت حسنؓ کو سید فرمایا ہے۔ سو یہ صلح کوئی دباؤ کی کارروائی نہ تھی کہ اسے ایک ڈرامہ کہا جائے جو صلح لسان رسالت سے

منقبت پائے اسے کس طرح ایک دکھاوے کی کارروائی کہا جا سکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت حسنؓ کو اس قربانی پر اتنا نوازا کہ اب اس امت کے آخری امام (المھدی) انہی کی اولاد میں مقدر ٹھہرائے۔ اتحاد ملت کے لیے اپنی سلطنت کو قربان کرنے والا دنیا کے آخری دور میں پوری سلطنت اسلامی کی امامت پا گیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس آخری دور میں اس کا ظہور غار سے نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس آخری دور میں ماں باپ سے ولادت سعیدہ دیں گے اور وہ دنیا کا ایسا امام ہوگا جو کل صفحہ کائنات کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسا کہ اب یہ ظلم و جور سے بھرا ہوا ہے۔ رب قدیر نے اس کی نصرت کے لیے ایک پیغمبر کو پہلے سے اوپر اٹھا رکھا اور آسمانوں میں بٹھا رکھا ہے تا کہ دنیا کے آخر میں وہ حضرت امام مہدی کی نصرت کے لیے دجال کو قتل کریں۔ خنزیروں کا خاتمہ کریں۔ یہ اس لیے کہ قیام عدل کا یہ آخری معرکہ اس طرح ظہور میں نہ آئے کہ کوئی کہے کہ امامت نبوت پر سبقت لے گئی۔

اس کتاب کی طرف اہل علم نے توجہ کیوں نہ دی

اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ڈھکو مولف نے اس کتاب میں جو پیرایہ استدلال اختیار کیا ہے اور جو زبان استعمال کی ہے نہ وہ اہل علم کا پیرایہ استدلال ہے اور نہ وہ اہل علم کی زبان ہے۔ یہ وہ وجوہ ہیں جس کے باعث وقت کے اہل علم اس کی طرف توجہ نہ کر پائے۔ مولانا دبیر نے اپنی کتاب میں اسلام کی دو تصویریں کھینچی تھیں۔ ایک اہل حق کی اور دوسری رافضیوں کی۔ یہ دو تصویریں تو کہی جا سکتی ہیں لیکن مولف انہیں دو تصویریں کہنے کی بجائے صفحہ ۱۰ پر یہ سرخی باندھتا ہے: "اسلام کی تصویر کشیاں۔"

یہ تصویر کی نہیں تصویر کشی کی جمع بنانا مولف کی علمی شان ہے۔ وہ تصویر کی جمع بنانے کی بجائے تصویر کشی پر اپنا کش لگا رہا ہے۔ اس زبان کو اہل علم کیا کہیں گے؟ یہ قارئین فیصلہ کریں۔

۲۔ اہل علم دنیا کو ہمیشہ آخرت کے مقابلہ میں رکھتے ہیں۔ جہلاء اسے دین کے مقابل ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دین دار ہے اور وہ دنیا دار ہے۔ قرآن کریم میں **منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرہ** ۔ اور **ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة** ۔ میں دنیا اور آخرت دو جہان بتلائے گئے ہیں۔ دنیا آخرت کے مقابل ذکر کی ہے دین کے مقابل نہیں۔ دین دونوں (دنیا اور آخرت) کے بارے میں رہنمائی بخشتا ہے۔ مگر ڈھکو مولف قرآن کے حوالے سے کہتا ہے:

"تم میں کچھ ایسے ہیں جو دنیا کے خریدار ہیں اور کچھ وہ ہیں جو دین کے طلبگار ہیں۔" (تجلیات ص ۱۳)

دین و دنیا کے اس تقابل پر کون مولف کا تعاقب کرے گا۔ وہ جو پہلے ایک لفظ (یرید) کا ترجمہ خریدار کرے

اور جب یہ لفظ آخرت کے لیے آئے تو اس کا ترجمہ طلب گار۔ خریدار کو کچھ قیمت دینی پڑتی ہے اور طلبگار کبھی ویسے ہی اپنی طلب پوری کر لیتا ہے۔

آخرت کے طلبگار کو خریدار کہنا جائز نہ ہوتا تو قرآن پاک یہ نہ کہتا:

ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنة۔ (پ ۱۱۔ التوبہ ۱۱۱)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔"

آخرت میں جنت کے خریدار اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے جنت کے خریدار بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت دے کر ان سے ان کی جانوں اور مالوں کو خریدا۔

افسوس جو لوگ قرآن کریم کا یہ سطحی علم بھی نہیں رکھتے وہ اس فرقہ میں صدر المحققین جانے جاتے ہیں۔ پھر ڈھکو کی یہ علمی شان بھی دیکھئے' صحیح مسلم کی ایک حدیث کا وہ اس طرح حوالہ دیتا ہے۔ (ھکذا فی صحیح المسلم ص ۱۳) مسلم پر الف لام لا کر اس نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ اب اگر اہل علم نے ان دنوں اس کتاب (تجلیات صداقت) کو کوئی اہمیت نہ دی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

(نوٹ) یہاں سہوِ کاتب کا بھی احتمال نہیں۔ عربی عبارت مولف کی اپنی ہی ہو سکتی ہے۔ اردو کتاب میں کاتب اپنے عربی جملے نہیں لکھتے۔

۳۔ مولف کی تاریخ دانی کے چند نمونے

یہ بات کسی صاحب علم سے مخفی نہ ہوگی کہ حضرت عمر صف اسلام میں آنے سے پہلے مشرکین مکہ کے مذہب پر تھے۔ اہل کتاب میں سے نہ تھے مگر یہ ڈھکو حضرت عمر کے بارے میں لکھتا ہے:

"تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار اسلام کے بعد بھی ان کا قلبی میلان اپنے سابقہ مذہب (دین اہل کتاب) ہی کی طرف رہتا تھا اور جناب جابر بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمر بن الخطاب تورات کا ایک نسخہ لائے اور بارگاہ نبوی میں اسے پڑھنا شروع کیا۔" (۴۴)

حضورؐ جب مدینہ تشریف لائے تو مسلمانوں کا واسطہ یہود سے پڑا اور حضرت عمر مکہ کے رہنے والے تھے اور وہاں سے وہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اب جو شخص علم تاریخ سے اتنا بے خبر ہو کہ حضرت عمرؓ کو بنو نظیر یا بنو قریظہ میں سے سمجھے وہ کس طرح کسی کے ہاں لائق خطاب ہو سکتا ہے۔

پھر اس میں کوئی شخص شک نہیں کر سکتا کہ اثنا عشری فرقہ کی ابتداء اسی وقت سے ہوئی جب بارہویں امام پیدا

ہو گئے تھے۔ان کو اپنے پیشوا ماننے والا طبقہ کبھی کسی خارجی وجود میں آ سکتا ہے کہ خارج میں یہ بارہ امام اس دنیا میں آ چکے ہوں۔سو یہ بات باتفاق مورخین کہی جا سکتی ہے کہ شیعہ تیسری صدی ہجری میں وجود میں آئے۔اس سے پہلے بعض شیعی خیالات جیسے بغض صحابہ، مسئلہ رجعت وغیرہ بے شک بعض ملحدین میں اترتے محسوس کیے جا رہے تھے۔حضرت علی مرتضیٰؓ موسس شیعیت عبداللہ بن سبا یہودی کو خود آگ میں جلا چکے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اثنا عشری مذہب کا پہلا محدث ملا محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) اصول کافی اور فروع کافی مرتب کر کے چوتھی صدی میں منظر عام پر آیا۔سو ظاہر ہے کہ اثنا عشری مذہب کو دنیا میں قائم ہوئے بارہ سو سال ہی ہوئے ہیں۔اہل سنت ہیں جو چودہ سو سال سے چلے آ رہے ہیں۔

اب ڈھ گو مولف کی تاریخ سے یہ بے خبری بھی ملاحظہ ہو: وہ شیعہ مذہب کو پہلی صدی ہجری سے شروع کر رہا ہے:

''چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ شیعہ علماء اسلام نے ہمیشہ اپنی روایتی رواداری اور مثالی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔'' (تجلیات ص ۴)

اس سے زیادہ اپنی تاریخ سے بے خبری اور کیا ہو سکتی ہے۔

پہلی صدی، دوسری صدی میں شیعہ کہاں تھے کہ یہاں چودہ صدیوں کی شہادت پیش کی جا رہی ہے۔ان صدیوں کے کوئی چار علماء کے نام لیں جو بارہ اماموں کے قائل ہوں اور اپنے آپ کو ان کے پیرو کہتے ہوں۔ ان دو صدیوں میں کوئی ایسا شہسوار ایک بھی ان کو کہیں نہ ملے گا۔

۴۔ مولف کا ذاتِ رسالت پر شرمناک حملہ

یہ ڈھگو بغض صحابہ میں اس قدر مدہوش ہے کہ اسے اپنے ان نظریات کی پذیرائی میں خود ذات رسالت پر اس شرمناک حملے میں بھی کوئی علمی حجاب مانع نہیں ہوا۔وہ اپنے شیعہ عقائد کی تصدیق میں تو حضرت ام المومنین پر ناپاک حملہ کر ہی رہا تھا مگر اسے یہ ہوش نہیں کہ وہ اس میں خود ذات رسالت کی بے ادبی اور گستاخی میں سلمان رشدی سے بھی چند قدم آگے نکل گیا ہے۔جس طرح عرب میں لیلیٰ و مجنوں اور ایران میں شیریں اور فرہاد اور پنجاب میں ہیر اور رانجھا کی داستانیں ضرب الامثال میں ذکر کی جاتی ہیں، اس نے ایک ایسی داستان عشق کو اسلام میں لانے میں کچھ حیا نہیں کی۔قارئین کرام اس ڈھ گو رافضی کے اس جارحانہ حملے پر خود فیصلہ کریں کہ یہ لوگ کیا کسی درجے میں بھی صف اسلام میں تسلیم کیے جا سکتے ہیں؟ آپ سب کا جواب نفی میں ہوگا۔ڈھ گو لکھتا ہے:

''امام زہری کہتے ہیں کہ اسلام میں پہلے پہل عشق نے جو قدم رکھا وہ رسول اللہ کا عشق جناب عائشہؓ سے تھا۔اسی وجہ سے امام مسروق جناب عائشہؓ کو حبیبہ رسولؐ کہا کرتے تھے۔مسجد فضیح میں

آنحضرت کی خدمت میں شراب کا پیالہ پیش کیا گیا جو آپ پی گئے۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۳)

آسماں را حق رسد کہ خوں ببارد بر زمیں
بر زوال عقل و ایمان از درون ایں چنیں

ڈھگو نے پہلی بات کے لیے الجواب الکافی کا حوالہ دیا ہے۔الجواب الکافی کا مولف آٹھویں صدی ہجری میں گزرا ہے۔وہ اسے حسب بیان امام زہری (۱۲۴ھ) سے روایت کرتا ہے۔اور اس پر وہ کوئی سلسلہ سند پیش نہیں کرتا کہ اس نے کہاں سے یہ بات لی ہے۔پھر اس کے ساتھ ہی اس نے حضورؐ کے (معاذ اللہ ثم استغفر اللہ) شراب پینے کی فرضی کہانی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) کی کتاب جذب القلوب سے پیش کی ہے۔اور اسے اس کتاب جذب القلوب کی یہ عبارت حذف کرتے ہوئے کچھ بھی علمی حجاب نہ آیا۔

بعضے از علماء تضعیف ایں حدیث کردہ اند۔ (جذب القلوب ص 139 طبع لکھنؤ 1916ء بار سوم)

اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اس کا نام روضۃ المحبوب ترجمہ جذب القلوب ہے۔مترجم کے پاس مطبع احمدی دہلی کا 1282 کا طبع شدہ فارسی نسخہ تھا اس ترجمہ کے ص 172 پر یہ لکھا ہے:

'لیکن بعض علماء نے اس روایت کی تضعیف کی ہے۔اس قسم کی روایات کو عقائد کی فہرست میں لانا کہاں تک صحیح ہے یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں اہل علم کے ہاں عقائد کے لیے دلائل قطعیہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ اس شدید درجہ کے اقوال ضعیفہ کی جن کا ضعف وضع کے قریب پہنچا ہوا ہو۔گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔

قطع نظر اس کے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔شیعہ علماء ہی فیصلہ کریں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بغض میں حضور اکرم کی شان میں اس گستاخی اور بے ادبی سے کیا وہ ڈھگو کو صف اسلام میں کوئی بھی جگہ دے سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔تو کیا کتاب تجلیات صداقت یہ رسوائے زمانہ مقام رکھتے ہوئے اہل سنت کی طرف سے کسی درجے میں لائق جواب سمجھی جا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ ہی بتائیں ڈھگو کا یہ شکوہ کہ اس کی اس رسوائے زمانہ کتاب کا جواب کیوں نہیں لکھا اس میں کچھ وزن بھی رہ جاتا ہے؟ اور اس کا پھر اسے سنیوں کے نزدیک شان رسالت کی سرخی سے پیش کرنا ظلمت بالائے ظلمت اور ظلم بالائے ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ مولف نے خود ان شرمناک باتوں کی کہیں تردید نہیں کی۔ اب کس طرح سمجھا جائے کہ اس کا عصمت رسالت پر ایمان ہے؟

مولف نے اپنی اس کتاب میں اتنا علم پیش نہیں کیا جتنا اس نے اپنا بغض اگلا ہے اور علم کے نام سے بھی جو اس نے جو چند باتیں کی ہیں وہ بھی اس کی کوئی نئی تحقیقات نہیں ہیں کہ کوئی نادان ڈھگو کو صدر المحققین سمجھنے لگے۔یہ وہی فرسودہ باتیں ہیں جنہیں اثنا عشری شیعہ صدیوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں اور علماء اسلام ان کے بارہا جواب دے چکے ہیں اور

انہی الزامات اور روایات پر شیعوں نے مناظروں میں بار بار شکستیں بھی کھائیں۔ مگر یہ لوگ ہیں کہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے انہی فرسودہ باتوں کو بار بار دہرانے میں ہی اپنی بقا سمجھتے ہیں۔

اس پس منظر میں کوئی ضرورت نہ تھی کہ تجلیات صداقت کا کوئی مبسوط جواب لکھا جائے۔ اس کتاب کو پڑھنے والے ہماری پہلی لکھی کتابوں میں اس کتاب کا جواب پڑھ سکتے ہیں۔ پھر بھی کوئی مسئلہ ان میں نہ ملے تو اس کی نشاندہی کریں' مولف کو بذریعہ خط اس کا جواب اس کے گھر بھیج دیا جائے گا۔

تاہم شیعہ مولفین کی ان نئی کتابوں کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں شیعہ مذہب کا جو پرانا تصور موجود ہوتا ہے انہیں ان نئے شیعوں سے بھی اس کی پوری تصدیق مل جاتی ہے ورنہ کئی لوگ اس مغالطے میں ان کو بھائی سمجھ لیتے ہیں کہ شاید وہ سیاہ عقائد ان پرانے شیعوں کے ہی ہوں۔ عصر جدید کے شیعہ شاید کلینی مجلسی اور خمینی کے ہم اعتقاد نہ ہوں اور اب شیعہ شاید کسی اور جماعت کا نام ہو جنہیں اہل بیت کی مخالفت کا ملزم نہ ٹھہرایا جا سکے۔ مثلاً

ا۔ اثنا عشری

شیعوں کی پرانی کتابوں سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ موجودہ قرآن کو موافق جمع رسول نہیں مانتے اور ان کے ہاں اس کی موجودہ ترتیب ترتیب رسول نہیں ہے۔ وہ ترتیب نزول اور ترتیب رسول میں اختلاف کے قائل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں پہلے یہ آیت لکھی جانی چاہیے تھی۔

اقراء باسم ربک الذی خلق ...... نہ کہ الحمد للہ رب العالمین.

ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ مختلف سورتوں میں بعض آیتوں میں کمی بیشی بھی کر دی گئی ہے۔

یہ باتیں اثنا عشری شیعوں کے ہاں تواتر سے ملتی تھیں مگر جھنگ' سرگودھا اور میانوالی کے شیعہ حلقوں میں مدت سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ شیعہ بھی اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں جو اس وقت عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن ان کے مولوی محمد حسین ڈھکو نے تجلیات صداقت میں یہ لکھ کر ان کے مغالطے کو دور کر دیا کہ ہم کوئی نئے شیعہ نہیں ہیں۔ ہم وہی ہیں جو پہلے گزرے ہیں اور ان کا ایمان قرآن کریم کی موجودہ ترتیب پر نہ تھا۔ مولف اہل سنت کی طرف سے ایک الزام خود وضع کرتا ہے اور پھر اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

اہل سنت عوام الناس کو یہ تاثر دینے کی سعی نافرجام کرتے ہیں:

''آنجناب (حضرت علی) کا جمع کردہ قرآن موجودہ قرآن سے حقیقت اور مطالب کے اعتبار سے بالکل الگ تھا۔'' (ص ۲۹)

یہ ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ اہل سنت کا شیعہ پر یہ الزام نہیں کہ ان کا قرآن موجودہ قرآن سے حقیقت اور

مطالب کے لحاظ سے مختلف ہے۔ ان کا الزام ان پر یہ ہے کہ وہ اس کی موجودہ ترتیب کو ترتیب رسول نہیں مانتے۔ اسے ترتیب صحابہ کہتے ہیں۔ اب دیکھئے اسے ترتیب کی بحث سے نکال کر قرآن کی حقیقت اور مطالب کے موضوع پر لے آنا یہ مولف کی سعی نافرجام نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈھکو پھر آگے جا کر تسلیم کرتا ہے کہ:

''اور واضح ہوتا ہے کہ آنجناب نے (حضرت علیؓ نے) قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب فرمایا تھا۔ تفسیر اتقان میں ہے:

قدروی عن علی انه جمع القرآن علیٰ ترتیب النّزول عقب موت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اخرجه ابوداؤد . (کذافی ص ۶۳' ۶۴)

قطع نظر اس سے کہ یہ نسبت جھوٹ ہے۔ سنن ابی داؤد میں کہیں یہ روایت موجود نہیں ہے۔ ڈھکو نے اس پر ص ۶۳ و ۶۴ کا حوالہ صرف اپنے الزام کو پختہ کرنے کے لیے دیا ہے۔ تاہم مولف نے دبے لفظوں میں یہ بات ذکر کر دی ہے کہ ایمان بالقرآن کی بحث میں اہل سنت اور شیعہ کا اختلاف قرآن کے مطالب پر نہیں اس کی موجودہ ترتیب کے بارے میں ہے۔ اہل سنت ترتیب نزول میں پہلے سورہ فاتحہ کو نہیں **اقراء باسم ربک الذی خلق** کو مانتے ہیں اور ترتیب رسول میں وہ فاتحۃ الکتاب سورۃ الحمد کو مانتے ہیں۔ ان کے ہاں موجودہ ترتیب ترتیب نزول نہیں ترتیب رسول ہے۔ یہ دعویٰ کہ حضرت علیؓ نے اسے خلاف ترتیب رسول ترتیب نزول پر جمع کیا تھا' حضرت علیؓ سے کسی سند صحیح سے ثابت نہیں۔ امام سیوطی سے اتنی بڑی غلطی نہیں ہو سکتی کہ وہ ابوداؤد کا غلط حوالہ دیں۔ سو یہ ساری روایت اس کتاب میں داخل کی گئی ایک جعلی کارروائی سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ ڈھکو اس روایت کو اپنی حمایت میں نقل کر رہا ہے تبھی تو اس نے آخر میں تاریخ الخلفاء کے حوالے سے یہ لکھا ہے اور اس کی تردید نہیں کی۔

''اگر جناب امیر علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن مجید دستیاب ہو جاتا تو علم کا ذخیرہ ہاتھ آ جاتا۔''

(تجلیات صداقت ص ۲۹)

یہ شیعہ حضرات کی طرف سے اس بات کا کھلا اعلان ہے کہ حضرت علیؓ کا جمع کردہ قرآن مسلمانوں کے موجودہ قرآن سے مختلف تھا۔

حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا قرآن

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنے سفر ایران میں مشہد میں حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن دیکھا تھا اور آپ کے بیان کے مطابق وہ موجودہ ترتیب پر ہی ہے۔ ترتیب نزول پر نہ تھا۔ ہم نے اسے اپنی کتاب آثار التنزیل میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

(نوٹ) ترتیب رسول اور ترتیب نزول اگر ایک ہی ہوتی تو سارا قرآن ایک ہی دفعہ نازل ہوتا۔ مختلف موقعوں پر پیش آنے والی ضروریات کے مطابق نہ اترتا۔ ضرورات کسی دور کی کبھی کسی دوسرے دور کی ضرورتوں سے منطبق نہیں ہوتیں اور نہ ترتیب ادوار ہی ایک سی رہتی ہے۔ قرآن کریم کا مختلف ضرورتوں کے مطابق اترنا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی اصل ترتیب کوئی اور ہوگی۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنے عمل میں اور حضرت جبریل نے اپنے سالانہ دور میں اس کی وہی ترتیب اختیار کی جو لوح محفوظ کی ترتیب تھی اور اسی کو ہم ترتیب رسول کہتے ہیں۔ ڈھکو نے موجودہ قرآن پر ایمان ثابت کرنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں مگر یہ بات بھی اس کے منہ سے آخر نکل ہی گئی کہ حضرت علیؓ نے اسے کسی اور ترتیب سے جمع کیا تھا۔ اور وہ اپنے اس عقیدے کی کہیں تردید نہیں کر سکا۔ سو اس قسم کی باتوں سے عوام کو پتہ چل جاتا ہے کہ اس دور کے شیعہ بھی پہلے دور کے شیعوں سے جو تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے تھے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔

ڈھکو نے یہاں ایمان بالقرآن کی بات اس طرح چھیڑی ہے کہ بلی خود ہی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔

(۲) ڈھکو کی بدبودار زبان ملاحظہ کیجئے

اہل علم گو وہ کسی بھی عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں بین المذاہب جلسوں میں آدابِ گفتگو کا ضرور کچھ پاس رکھتے ہیں ان کے نزدیک جو بزرگ نہیں ان کا نام بھی وہ ان لوگوں کے سامنے جو انہیں بزرگ اور لائق احترام سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ مناسب الفاظ میں لیتے ہیں وہ اپنے فریق مخالف کی دل آزاری نہیں کرتے اذا جاء کم کریم قوم فاکرموہ ایک بین الاقوامی ضابطہ اخلاق ہے۔

مگر افسوس کہ ڈھکو مذکور نے تجلیات میں ایسا لغو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے کہ کئی حضرات اس کا جواب دیتے دیتے اس آیت قرآنی کو سامنے رکھتے جواب آں غزل سے رک گئے۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھو ناً و اذاخاطبھم الجٰھِلُون قالوا سلاماً. (پ ۱۹ الفرقان ۶۳)

ترجمہ: ''اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب ان سے جہالت والے لوگ جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ اس سے اثر لئے بغیر گزر جاتے ہیں۔''

یہ کتاب اپنے بودے طرزِ استدلال، لچر مضامین، رکیک ایرادات، بھونڈے اعتراضات، بے بنیاد الزامات اور انتہائی بھدی و بے ربط عبارات کی وجہ سے اس قابل نہ تھی کہ اس کو کچھ قابل توجہ سمجھا جاتا یہ جو اپنے حلقوں میں قبولیت نہیں پا سکی اس کا جواب دے کر اسے شہرت دینا قرین مصلحت نہیں تھا۔ اب اس بدبودار زبان کی کچھ اور شہادتیں بھی نوٹ کر لیں۔

پہلے تو یہ بعض صحابہ پر احد کے دن بھاگنے کا الزام لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ گو خدا نے انہیں معاف کر دیا ہے ہم انہیں کبھی معاف نہ کریں گے اب انہوں نے ان کا نام بھگوڑے رکھ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے اور اس میں یہ لوگ بہت لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ بدذوقی، بدزبانی اور بے ایمانی کی انتہا ہے۔

''منجملہ احد کے بھگوڑوں کے ایک عثمان بھی تھے'' (تجلیات ص ۴۹)

استغفر اللہ العظیم۔

اس پر بھی رافضی کی بھڑاس نہ نکلی آگے اس بدزبانی پر وہ اور غراں ہے۔ وہ لکھتا ہے:

مخفی نہ رہے کہ جنگ کے بھگوڑوں کی فہرست میں شاہ مرداں شیر یزداں کا نام لینا ناصبیت اور خارجیت کی بدترین مثال ہے (تجلیات صداقت ص ۹۹)

مولف کی غیر شریفانہ زبان

اس کے بعد جو شخص خم ٹھونک کر کسی مقابلہ میں نکلتا ہے تو اس میں علم کی بات نہ سہی کم از کم شرافت کی زبان تو ہونی چاہیے۔ ہمارے قارئین اس ذات شریف کی زبان ملاحظہ فرمائیں:

ص ۹ پر سنیوں کا نام اس طرح لیتا ہے گویا وہ اپنے بڑوں کو یاد کر رہا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''دشمنان دین وایمان''۔ (استغفر اللہ)۔ حضورؐ نے فرمایا' منافق کی علامات میں ہے کہ کسی اختلاف میں آئے تو گالیوں پر اتر آئے۔ ڈھکو اذا خاصم فجر (قاضی مظہر حسین مرحوم) کے مقابل لفظ مچھندر ملا کر اس طرح اپنا ذوق طبع پورا کرتا ہے۔ قاضی صاحب کے بارے میں کہتا ہے:

روزی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

اس ڈھکو کو کون سمجھائے کہ حضرت قاضی صاحب کی روزی تو مجالس محرم کی فیسوں سے نہ چلتی تھی۔ تم انہیں کس طرح مچھندر کہہ رہے ہو۔

ایک مقام پر ڈھکو قاضی صاحب مرحوم سے اس طرح ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کی زبان ملاحظہ ہو:

1- شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ (ص ۳۰)

2- ''ایسا کہنے والوں کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ شرم شرم شرم۔'' (ص ۱۹۷)

واہ رے تیرا علمی بھرم۔ شیعہ پھر بھی اسے سرکار کہتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو برسر روزگار بتلاتا ہے

3- ایک مقام پر مولانا دبیر کو لکھتا ہے:

''باتیں بڑھ بڑھ کے نہ کیجئے ہمیں معلوم ہے نسب۔

ہم پتہ کی جو کہیں گے تو خجالت ہوگی۔" (ص ۲۲۳)

4- پھر زبان کی فصاحت بھی ملاحظہ ہو۔ لکھتا ہے:

"مسئلہ میں کتنے غیر متعلق مسائل گھسیڑ دیے ہیں۔" (ص ۷۸)

یہی نہیں مولف شروع سے اپنے مخالفین پر گھسیڑنے کا الزام لگاتا آیا ہے۔"

کسی مولف کو اتنا زور رنج نہ ہونا چاہیے مگر ڈھگو اتنا زور رنج ہے کہ غصے میں بات بات پر جنازہ نکالتا ہے۔ حالانکہ جنازہ انسان کی آخری منزل ہوتی ہے اسے ایک ہی دفعہ نکلنا چاہیے۔ ڈھگو ایک مقام پر لکھتا ہے:

5- "(مولانا دہیرنے) اپنے علم وفضل کا جنازہ نکالا ہے۔" (ص ۱۲۵)

6- "حضرت ابوبکر کے دامن میں کوئی سی فضیلت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔" (ص ۱۷۱)

"جناب عمرؓ کی کوئی منقبت نہیں۔ ان کی بھی دیانت اور امانت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔" (ص ۱۸۵)

7- پھر وہ اپنے سوا دوسرے سب مسلمانوں کا جنازہ اس طرح نکالتا ہے:۔

"ان لوگوں کا حافظہ ختم ہو جاتا ہے اور دینی و ذہنی فہم شعور سلب ہو جاتا ہے اور دیانت اور امانت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔" (تجلیات صداقت ۱۸۹)

8- جب اس پر بھی طبیعت نہ بھری تو خدا کا جنازہ نکالنے پر اتر آیا۔ لکھتا ہے:۔

"آج اس ارض مقدسہ پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہے جنہوں نے چند سال ہوئے خدا کا جنازہ نکال کر نذر آتش کیا۔" (ص ۱۴۷)

اب آپ ہی فیصلہ کریں کیا ایسا شخص کسی درجہ میں لائق خطاب رہ جاتا ہے جو بات بات پر اپنا جنازہ نکالے۔ اب اس کی اس کتاب کا کوئی جواب دے تو وہ آخر کس کو سمجھائے۔ ایسے شخص کو سمجھانا جو علم وشرافت دونوں سے بے نیاز ہو کر چلے اور اس طرح بھڑکیں مارے گویا لڑے بغیر اب وہ پیچھے نہ ہٹے گا اور اس کے ہاتھ پلے بھی کچھ نہ ہو۔ اس سے کوئی شخص کیا کسی امر کی تحقیقی بات کر سکتا ہے۔ اور کیا اس کی نیت میں نہ ماننوں کے سوا کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اس کا میدان میں نکلنا بھی ملاحظہ ہو:

کس به میداں در نمے آید
سواراں را چہ شد ص ۳۳

ڈھگو کا اہل سنت پر اتہام کا دعویٰ

شیعہ علماء اپنے لوگوں کو اہل ایمان کہتے ہیں اور اہل سنت کو اہل اسلام کا نام دیتے ہیں۔ مولف حضرت عمرؓ کے بارے میں لکھتا ہے:

"یہ شیعوں پر سراسر اتہام ہے کہ وہ حضرت ثانی کو کافر سمجھتے ہیں...... ہاں یہ درست ہے کہ ہم ان کو مومن نہیں جانتے۔" (تجلیات ص ۱۹۲ سطر ۴)

شیعوں پر یہ اتہام کس نے لگایا؟ خود ان کے علامہ باقر مجلسی نے۔ افسوس کہ ڈھگو نے اس کا نام نہیں لیا۔ مجلسی لکھتا ہے:

"ہر دو کافر بودند ہر کہ ایشاں را دوست دارد کافر است۔" (حق الیقین ص ۳۱۴)

دیکھیے کس چال سے پوری امت پر یہ فتویٰ کفر لایا گیا ہے جو خلفائے راشدین کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ پھر جب یہ فتویٰ شیعوں کو واپس کیا جاتا ہے تو وہ اس سے بہت چڑتے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ کسی مومن کو کافر کہنے پر کفر خود اس کہنے والے پر لوٹتا ہے۔

اور وہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھی لکھتا ہے:

"وہ عثمان کو کافر ومشرک نہیں سمجھتے...... منافقین پر بھی سب احکام اسلام جاری ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر اگر یہ نکاح بھی عمل میں آ گیا تو اس میں قباحت کی کونسی بات ہے۔" (تجلیات ص ۲۱۱)

اس پس منظر میں کہ شیعہ اپنے آپ کو مومن کہتے اور اہل سنت کو صرف مسلمان سمجھتے ہیں تو انہیں ڈھگو کو شیخ الایمان لکھنا چاہیے تھا۔ شیخ الاسلام تو ہمیشہ سے سنی علماء اسلام ہی کہلاتے رہے ہیں لیکن افسوس کہ ڈھگو نے اپنے شیعوں کو اپنے لیے شیخ الاسلام لکھنے کی اجازت دی۔ حالانکہ سنی علماء اسلام نے تو تاریخ اسلام کے پچھلے بارہ سو سال میں کبھی انہیں اہل اسلام تسلیم نہیں کیا۔

اب کتاب تجلیات صداقت کے ٹائٹل پر ڈھگو کا نام ان القاب سے ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ ڈھگو کو حجۃ الاسلام والمسلمین کہلانے سے کوئی علمی حجاب محسوس ہوا؟ اس کے پیرو اسے حجۃ الایمان والمومنین کہتے تو یہ ایک پردے کی بات تھی۔ کون کسی کے دل میں اترا ہے کہ حجۃ الایمان والمومنین کہلائے اور ظاہر میں کمزور سے کمزور مسلمان بھی ایمان اور اسلام میں فرق کرنے کی راہ سے کہیں کبھی کسی شیعہ ذاکر یا عالم کو اپنا پیشوا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آستانہ خلافت تاریخ میں ہمیشہ سے مسلمانوں کے پاس رہا ہے اور ان کے مرکزی عالم کو ہی شیخ الاسلام کہا جاتا تھا۔

یہ وہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے اہل علم نے پہلے اس کے جواب کی ضرورت محسوس نہ کی تاہم اب ہم نے اس طرف توجہ کیوں کی؟ اس کا جواب ہم اپنے الفاظ میں نہیں ڈھگو کے الفاظ میں اس طرح دیتے ہیں۔

”یہ کتاب اپنے پورے طرز استدلال، لچر مضامین، رکیک ایرادات، بھونڈے اعتراضات، بے بنیاد الزامات اور انتہائی بھدے اور بے ربط عبارات کی وجہ سے اس قابل نہ تھی کہ اسے درخور اعتناء سمجھ کر اس کے رد میں نفس نفیس صرف کیا جاتا۔ مگر ایک تو بعض مومنین چکوال کے مخلصانہ اصرار فرمانے' دوسرے عوام کو غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے...... بکرہ خاطر اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اس میدان میں قدم رکھنا پڑا۔“ (ص ۷)

ہم کتاب تجلیات صداقت کے دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے درپے کیوں ہوئے۔ ہم مولف کی ہی ان پانچ سطروں میں اسے عطائے تو بہ لقائے تو۔ کہہ کر واپس کرتے ہیں۔ ان پانچ سطروں کو یوں سمجھئے کہ پوری کتاب تجلیات صداقت اس آئینہ میں اترتی ہے۔ اگر چلتی گاڑی کو گاڑی کہہ سکتے ہیں اور ایک نہایت خوش رنگ پھل کو نارنگی کہہ سکتے ہیں تو اس کتاب کو صداقت نہ سہی اس کی اکھڑی اکھڑی باتوں کو اس کے پیرو تجلیات کہہ لیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تجلیات صداقت کے جواب میں تاخیر کی وجہ

(۱) آفتاب ہدایت ۱۳۴۴ھ میں لکھی گئی اور اس کے اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکلتے رہے یہاں تک کہ مولف مولانا کرم الدین دبیر بھی ۱۹۶۴ء میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ پھر ۱۹۷۳ میں سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا سے اس کا یہ جواب شائع ہوا مجیب کو اس کتاب کے چھٹے اڈیشن سے اس کا پتہ چلا اور اس نے اس کے جواب کی یہ ناکام کوشش کی۔ اس کا یہ جواب مولانا دبیر کی وفات کے مدتوں بعد شائع ہوا۔ تاہم مولف آفتاب ہدایت کے جانشین مولانا قاضی مظہر حسین نے ایک مختصر سا جواب بطور نمونہ مولف تجلیات کو لکھ بھیجا اور کافی عرصہ اس مختصر جواب کے جواب کا انتظار کیا۔ سو یاد رہے کہ اس تاخیر کی وجہ مولف تجلیات کا اپنا ردعمل تھا یا اسے اس کے مصرعہ اولیٰ کا دوسرا مصرعہ سمجھئے امید ہے کہ اب دوسرے شیعہ مجتہدین بن اس پر جواب آل غزل کے طور پر ضرور کچھ غور فرمائیں گے۔

مؤلف عفا اللہ عنہ

مقدمۃ العلم...... اس میں پانچ فصلیں ہیں

فصلِ اوّل

اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد.

اسرائیل نے جہاں مسلمانوں کو سیاسی اور قومی سطح پر بہت نقصان پہنچایا ہے وہاں علمی اور فکری پہلو سے بھی ان کے لگائے زخم کچھ کم گہرے نہیں ہیں۔ امت میں بڑے بڑے مفکرین بھی اٹھے اور انہوں نے مسلمانوں میں غیروں کے بچھائے فرقہ بندی کے ان کانٹوں کو چننے کی بہت کوشش کی مگر افسوس کہ شیعہ سنی پھر بھی ایک قوم نہ بن سکے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے سمجھ میں نہیں آتی کہ ان میں ابتداء میں اختلافات اتنے نہ تھے جتنی نفرتوں کی دیواروں پر دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں اور ایک طبقہ جس دور کو تاریخ اسلام کا بہترین دور سمجھتا ہے دوسرا اسی کے اکابر کی توہین اور ان سے بیزاری پھیلانے کو اپنا مذہبی فریضہ جانتا ہے۔ فیا للعجب۔

کاش کہ یہ لوگ امام عالی مقام حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلے کو مان لیتے:

اِن الناس قد اجتمعوا علٰی امور کثیرة لیس بینهم اختلاف فیها ولا تنازع ولا فرقة علٰی شهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمداً رسول اللّٰه عبده والصلٰوة الخمس والزکٰوة المفروضة و صوم شهر رمضان و حج البیت ثم اشیاء کثیرة من طاعة اللّٰه لا یحصی ولا یعدها الا اللّٰه واجتمعوا علٰی تحریم الزنا والسرقة والکذب والقطعیة والخیانة واشیاء کثیرة من معاصی اللّٰه لا یحصی ولا یعدها آلا اللّٰه واختلفوا فی سنن اقتتلوا فیها وصاروافرقاً یلعن بعضهم بعضا وهی الولایة ویتبرأ بعضهم عن بعض ویقتل بعضهم بعضاً ایهم احق و الاولٰی لها آلا فرقة تتبع کتاب اللّٰه وسنة نبیه فمن اخذ بما علیه اهل القبلة الذی لیس فیه اختلاف وَرد علم ما اختلفوا فیه الٰی اللّٰه سلم ونجاه من النار ودخل الجنة. (کتاب الاحتجاج ۱۵۵، ۱۵۶)

ترجمہ: ''مسلمان بہت سی باتوں پر جمع ہیں اور ان میں ان کے بارے میں کوئی اختلاف تنازع اور تفرقہ نہیں۔ (۱) اقرار شہادتین میں (۲) (روز کی) پانچ نمازوں میں (۳) زکوٰۃ میں (۴) رمضان کے روزوں میں اور (۵) حج بیت اللہ میں اور پھر طاعت خداوندی میں اور کئی چیزیں ہیں جن کا احاطہ اور گنتی کوئی نہیں کر سکتا سوائے خدا کے۔ سب اس پر جمع ہیں کہ زنا، چوری، جھوٹ، قطع رحمی اور خیانت حرام ہیں اور اللہ کی نافرمانی کے بھی کئی امور ہیں جن کا احاطہ اور گنتی کوئی نہیں جانتا ماسوائے اللہ کے۔ اور مسلمانوں میں کچھ طریقوں میں اختلاف ہوا کہ وہ آپس میں لڑ پڑے اور کئی گروہ بن گئے اور ایک دوسرے کو لعنت کرنے لگے اور وہ مسئلہ ولایت امور کا تھا۔ اس میں وہ ایک دوسرے سے بیزار ہوئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہوئے کہ ان کا حق زیادہ ہے اور وہ اس کے زیادہ لائق ہیں۔ ہاں ایک گروہ جو کتاب وسنت کی پیروی میں چلا وہ ان زیادتیوں میں نہیں پڑا۔ جو شخص ان باتوں کو اپنائے جن پر تمام اہل قبلہ متفق ہیں۔ اور جن میں اختلاف ہے انہیں اللہ کے سپرد کرے (ان پر اختلافی مورچے نہ بنائے) وہ بچ گیا اور آگ سے نجات پا گیا اور وہ جنت میں داخل ہونے کے لائق ہے۔''

مگر افسوس کہ اثنا عشری علماء نفرت کی ان دیواروں کو گرانے پر قطعاً تیار نہ ہوئے اور ایسے وقت میں جبکہ حضرت علیؓ کو خلافت دلانا قطعاً ممکن نہیں وہ حضرت علیؓ کو خلافت دلانے کے لیے مدعی بنے کھڑے ہیں۔

ان کا سرگودھا کا ایک ڈھ گو محمد حسین لکھتا ہے:

''ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کے لیے ہماری حیثیت مدعی کی ہے اور بار ثبوت ہم پر عائد ہوتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ظاہری مسند خلافت پر قبضہ جماعت کا رہا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جس قدر چیخ وپکار کریں اب ہمیں قبضہ ودخل نہیں مل سکے گا کیونکہ وہ زمانہ ہی لد چکا مگر مولف (مولانا دبیر) کو صرف قبضہ دلیل صحت نہیں ہو سکتا۔ ان پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس وقت ہماری چیخ وپکار یہ بتلانے کے لیے ہے کہ آپ کے احباب ثلثہ کا یہ قبضہ غاصبانہ اور جابرانہ تھا۔'' (تجلیات صداقت ج ا ص ۲۳۱)

گویا شیعہ کی اس دور کی یہ ساری مذہبی جدوجہد کسی اختلاف عمل کے لیے نہیں حضرات خلفائے ثلثہ کے خلاف محض نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ ان کے ہاں بھی یہ بات کسی پردے میں نہیں کہ اب نہ صرف حضرت ابوبکرؓ سے خلافت واپس لی جاسکتی ہے نہ حضرت علیؓ کو دی جاسکتی ہے۔ اور حق خلافت کی اب یہ بحث کسی اختلاف عمل کے لیے نہیں فقط اپنے دعویٰ کی تسلی کے لیے ہے اور عملاً اس کا اثر صف اسلام میں ایک انتشار پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔

اس گری سوچ والوں کو جب حضرت حسنؓ کی مندرجہ بالا تجویز منافرت کی یہ دیواریں کھڑی کرنے سے روک نہ سکی تو اقبال مرحوم نے انہیں مغربی قوموں کی ترقی کی طرف متوجہ کیا کہ دنیا عمل ارتقاء میں کس قدر آگے بڑھ چکی اور تم ابھی تک اہل بیت کے ماتم میں ہی لگے ہوئے ہو۔ کبھی ان کے پیرو بن کر بھی دکھاؤ۔ تاہم اقبال مرحوم نے انہیں یہ دعوت عمل دے ہی دی۔

ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں سے سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ایران والوں نے تو ماتم چھوڑ دیا اور کچھ ہوش کی انگڑائی بھی لے لی لیکن پاکستان کے یہ ڈھ گو (پست باتیں کرنے والے) یہ جاننے کے باوجود کہ اب وہ کسی طرح خلافت حضرت علیؓ کو نہیں دلوا سکتے صرف فرقہ وارانہ نفرت پیدا کرنے کے لیے اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے لٹھ لیے کھڑے ہیں۔ علامہ اقبال نے بروقت کہا تھا۔ اب بھی تم نے خلافت کی بحث کو نہ چھوڑا تو تم دنیا میں کبھی دوسری قوموں کی دوڑ نہیں دوڑ سکو گے۔

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں سے سن
اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

محمد حسین مذکور نے ''تجلیات صداقت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اسے سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا سے شائع کیا۔ یہ کتاب جناب مولانا کرم دین دبیر کی کتاب ''آفتاب ہدایت'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مولانا دبیر کی یہ کتاب مثبت پیرائے کی ہے جو اپنی کثرت پھیلاؤ سے صحابہ اور اہل بیت کو جوڑنے میں ایک نہایت کامیاب تالیف رہی ہے مگر محمد حسین کی مذکورہ کتاب منفی پیرائے کی ہے اور اس میں مولف نے خلفائے ثلثہ کو حدیث میں وارد ہونے والے اہل بیت سے جدا رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اس سے اثنا عشری شیعہ کا یہ تعارف کھل کر قارئین کے سامنے آگیا ہے کہ گو ہر دین ومذہب کی بناء اپنے مثبت نظریات پر ہوتی ہے ان سے کسی کا اختلاف ہو یا اتفاق لیکن شیعہ مذہب کی اساس منفیات پر ہے اور یہ کسی کو اہل بیت کا محب نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ خلفاء ثلثہ اور حضرت ام المؤمنین سے تبرا نہ کرے۔ اس کے برعکس اہل سنت اپنے آپ کو خلفائے راشدین کا بصمیم قلب پیرو سمجھتے ہیں اور اہل بیت کرام کی محبت کو بھی لازمہ ایمان

سمجھتے ہیں۔ ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہیں۔ یہ پورا حلقہ مثبت پیرایہ یقین پر چلا ہے یہاں کسی سے ضد اور تبرا بروئے کار نہیں لایا جاتا اور نہ یہ حضرات کسی نفرت کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔

اسلام ما اطاعت خلفائے راشدین

ایمان ما محبت آل محمد است

بخلاف ان کے اثنا عشری شیعوں کے ہاں خلفائے ثلٰثہ سے تبرا لازمہ ایمان ہے اور اسی سے وہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں۔

اثنا عشریوں کے ہاں عقیدہ تبرا ضروریات دین میں سے

ان کی تولا اور تبرا کی دو اصطلاحیں کسی حلقہ علم سے مخفی نہیں ملا باقر مجلسی لکھتا ہے۔

ابوحمزہ ثمالی از آنحضرت از حال ابی بکر و عمر سوال کرد فرمود کہ...... ہر کہ ولایت ریشاں را داشتہ باشد کافر است دریں باب احادیث بسیار است (حق الیقین ص ۶۰۳ طہران)

اور یہی مؤلف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے۔

وبسند معتبر منقول است کہ حضرت امام جعفر صادق از جائے نماز خود بر نغے برخواستند تا چہار ملعون و چہار ملعونہ را لعنت نے کردند پس باید بعد از ہر نماز بگوید اللھم العن......الخ (عین الحیوٰۃ ص ۵۹۹ طبع طہران)

یہ لوگ نام لے لے کر ان بزرگوں پر تبرا کرتے ہیں۔

ان کے ہاں کوئی شخص اہل بیت کے دائرہ ولایت میں نہیں آتا جب تک کہ باقی سب سے اس طرح اظہار لاتعلقی نہ کرے۔ ان کے ہاں اظہار لاتعلقی کا سب سے احسن پیمانہ اس پر نماز کے بعد لعنت کرنا ہے۔

ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں ان کے مذہب کی بناء ایک منفی بات پر ہے۔ خلفائے ثلٰثہ اور حضرت معاویہ سے تبرا کرنا ان کے ہاں ضروریات مذہب شیعہ میں سے ہے۔

فصلِ دوم

شیعہ سنی اختلاف کو بڑھانے کی منحوس راہیں

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد۔

ابتداء میں شیعہ اختلافات صرف چند سیاسی امور ہی رہے۔ اس سے زیادہ شکایت کہیں نہ سنی گئی کہ حضرت علی کو سقیفہ کے مشورہ میں کیوں نہ بلایا گیا۔ اگر انہیں پتہ ہو کہ یہ میٹنگ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے نہ بلائی تھی۔ اس کے بلانے والے انصار تھے جو حضرت سعد بن عبادہؓ کو امیر بنانا چاہتے تھے تو شاید یہ اب بھی اپنا یہ سوال واپس [illegible]۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت سے کسی کو انکار نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے آپ کے سامنے کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف کیا:

انا قد عرفنا فضلک و ما اعطاک اللّٰہ ولم ننفس علیک خیراً ساقہ اللّٰہ الیک ولکنک استبدت علینا بالامر وکنا نری لقرابتنا من رسول اللّٰہ نصیباً حتی فاضت عینا ابی بکر فلما تکلم ابوبکر قال والذی نفسی بیدہ لقرابۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احب الی ان اصل من قرابتی و اما الذی شجر بینی و بینکم من ھٰذہ الاموال فانی لم ال فیھا عن الخیر و لم اترک امراً رایت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصنعہ فیھا الا صنعتہ. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹)

ترجمہ: ”بے شک ہم آپ کی فضیلت کو اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (خدمت اسلام) میں جو مرتبہ دیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور ہم اس خیر پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہے آپ سے کوئی حسد نہیں کرتے لیکن آپ نے ہم پر (اس سقیفہ کے معاملہ میں) زیادتی کی۔ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاندانی قرابت کے باعث اپنا بھی کچھ حق سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر حضرت ابوبکرؓ کی دونوں آنکھیں بہہ نکلیں (آپ رو پڑے) حضرت ابوبکرؓ نے جواباً کہا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ حضور کی قرابت مجھے اپنی قرابت سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جو مجھ میں

اور آپ میں تقسیم اموال میں اختلاف ہوا اس میں بھی میں نے نیکی میں کوئی کمی نہیں کی اور میں نے
کوئی ایسا کام جو حضورؐ کو کرتے دیکھا چھوڑا نہیں مگر یہ کہ اسے کر دکھایا ہے۔"

آہ ایک وہ ابتداء تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت تک سے انکار نہ تھا اور ایک انتہاء یہ ہے کہ اب ان لوگوں کو آپؓ کے ایمان تک سے انکار ہے۔ یہ آدم کو جنت سے کیوں نکالا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ فرقہ آرائی کے درخت پر یہی پھل لگتا ہے۔

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے نکلواتا ہے جو آدم کو جنت سے

ابتداء میں صرف سقیفہ کی مجلس ہی زیر بحث تھی، اس وقت تک تمام مسلمان وضوء، نماز، روزہ وغیرہ میں ایک تھے۔ اگر ان میں ان ارکان اسلام میں کوئی اختلاف ہوتا تو وہ اختلاف پہلے ظہور میں آتا۔ خلافت میں کوئی رائے بعد میں سامنے آتی۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس وقت تک سب مسلمان اعتقاد و عمل میں ایک تھے اور اختلاف کی بات بس واقعہ سقیفہ سے ہی چلی تھی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت تک بھی صحابہ میں کوئی مذہبی اختلاف نہ تھا حضرت عمر نے اپنے بعد کے لئے جو خلافت کمیٹی قائم کی اس میں حضرت عثمان اور حضرت علی دونوں برابر کے امیدوار رہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کسی اپوزیشن گروپ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان دنوں سلطنتِ اسلامیہ میں کوئی دینی اختلاف نہ تھا۔ پھر حضرت معاویہ اور حضرت حسن کی صلح تک بھی دونوں حلقوں میں کوئی دینی اختلاف نہ تھا کافی عرصے تک یہی بات سمجھی گئی کہ شیعہ صرف مسئلہ خلافت میں جمہور مسلمانوں سے جدا ہوئے ہیں نہ کہ ان میں کوئی اعتقادی اختلاف تھا۔

یہاں تک کہ پہلے دور میں شیعہ راویوں سے حدیث روایت کرنے میں بھی کوئی تعصب حائل نہ ہوا۔ اس وقت کے شیعہ محض چند سیاسی رجحانات میں دوسروں سے مختلف تھے۔ ضروریات دین میں ان میں سے کسی کا انکار نہ تھا۔

حضرت علیؓ مرتضیٰ نے امیر معاویہؓ کو بھی اپنا ہم عقیدہ بتلایا صرف ایک واقعہ قتل میں ان سے اختلاف کا اظہار کیا اور آپ اس میں حق پر تھے اور یہ واقعی کوئی مذہبی اختلاف نہ تھا۔ آپ کسی عقیدہ میں ان سے مختلف نہ تھے۔ آپؓ نے فرمایا:

و کان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اهل الشام و ا لظاهر ان ربنا واحد ونبینا
واحد ودعوتنافی الاسلام واحدة ولا نستز یدهم فی الایمان بالله والتصدیق
برسوله ولایستر ید وننا الامر واحد الا ما اختلفنا فیه من دم عثمان ونحن منه
براء (نهج البلاغه ج۳ ص۱۲۶)

ترجمہ: "یہ ہمارے اختلاف کی ابتداء تھی کہ ہم اور اہل شام آپس میں ٹکرا گئے اور ظاہر ہے کہ ہم دونوں ایک خدا ایک نبی اور ایک دعوت اسلام پر جمع ہیں۔ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے میں ان سے زیادہ نہیں اور وہ ہم سے ایمان میں زیادہ نہیں۔ ہم سب ایک ہیں ماسوائے اس کے کہ خون عثمانؓ کے بارے میں ہم میں کچھ اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری ہیں۔"

مسلمانوں کا اتحاد انکار کہاں تک تھا۔ اسے ان کے قاضی نور اللہ شوستری کی زبانی آپ سن آئے ہیں کہ حضرت علیؓ خود اپنے دور خلافت میں بھی سیرت شیخین کے خلاف کبھی اور کہیں نہ چلے تھے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ایمان کی ان کھلی شہادتوں کے بعد خلیفہ راشد حضرت عثمان کے ایمان کی بھی دو شہادتیں قبول کریں جنہوں نے حضرت عثمان کو ذوالنورین بنا دیا آنحضرت ﷺ نے حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثوم باری باری حضرت عثمان کے نکاح میں دیں اور ان کے ایمان پر مہر تصدیق ثبت کی کیونکہ قرآن کی رو سے کسی مومنہ کا نکاح غیر مومن سے نہ ہو سکتا تھا۔ مدار نکاح ایمان ہے ظاہری اسلام پر کسی کو رشتہ نہیں دیتے نہ اپنی بیٹیوں کا نہ اپنی لے پالک بچیوں کا۔

قرآن کہتا ہے: ولا تنکحوا المشرکین حتیٰ یؤمنوا. (پ ۱ . البقره ۲۲۱)

ترجمہ: "اور تم لڑکیاں کافروں کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔"

ایک غلط تاویل اور اس کی کھلی تردید

جو لوگ منصب نبوت کے عالی مقام حاملین کو نہیں پہچانتے وہ کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے بطور تقیہ یہ دو بیٹیاں آپ کے نکاح میں دی تھیں یہ بھی نہیں ہو سکتا تقیہ کی اگر کوئی صورت ہے تو صرف عام لوگوں کے لئے ہے اور وہ بھی بدرجہ رخصت۔ اہل عزیمت کبھی تقیہ نہیں کرتے وہ سختیاں برداشت کرتے ہیں اور صبر سے کام لیتے ہیں اور ان عالی مقام لوگوں کے لیے یہی عزیمت ہے۔

وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور. (پ ۴ . آل عمران ۱۸۶)

ترجمہ: "اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو جان لو کہ عزیمت اسی میں ہے۔"

انبیاء کرام کے لئے تقیہ کرنا جائز نہیں

فقد دلّت الادلة العقلیة التی لا تحتمل التاویل علیٰ ان الا نبیاء لا یجوز علیهم
الکذب وان لم یقصدوا به غروراً ولا ضرراً کمالا یجوز علیهم التعمیة فی
الاخبار ولا التقیة لان ذلک یودی الی التشکیک فی اخبارهم
(تفسیر مجمع البیان للطبرسی ج۴ ص ۵۲)

ترجمہ: ''انبیاء کرام کے لیے جھوٹ بولنا گو کسی کو دھوکہ دینے کے قصد سے نہ ہو' جائز نہیں جیسا کہ
ان پر کسی بات کو چھپانا جائز نہیں اور نہ ان کے لیے تقیہ کی اجازت ہے کیونکہ اس سے ان کی بتائی
باتوں میں شک کو راہ ملتی ہے۔''

پھر آگے آیت الذین یبلغون رسالت اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ کے تحت لکھتے ہیں۔ لایخافون من سوی اللہ فیما یتعلق یالاداء التبلیغ وفی ھذا دلالۃ علی ان الانبیاء لایجوز علیھم التقیہ فی تبلیغ الرسالۃ (مجمع البیان جلد ۴ ص ۳۱۱ طبع قم)

مگر افسوس کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کے بعد ان لوگوں نے تقیہ کے زینہ سے پورے اسلام میں بگاڑ پیدا کیا اور دو طبقوں میں اسلام کے تمام اصول و فروع کو اختلافی بنا دیا۔ امام جعفر کو یہ طنزاً صادق کہتے تھے کہ وہ تقیہ کی راہ سے عام مسلمانوں سے ایک علیحدہ دین ترتیب دینے کے حق میں نہ تھے۔ وہ پوری عمر صادق رہے۔ وہ اپنے پیش کردہ مسائل کو فقہ کہتے تھے' انہیں وحی امامت کا نام نہ دیتے تھے اور نہ وہ کسی نئے مذہب کے مدعی تھے۔ ان کی فقہ کو فقہ امامی نہیں فقہ جعفری کہا جاتا ہے۔

تقیہ کے بعد دوسری منحوس راہ جس سے یہ اختلاف اور بڑھے' ظالم حکمرانوں کی پالیسی تھی کہ لڑائی کراؤ اور اپنے اقتدار کو طول دو۔ ایران میں صفوی بادشاہوں نے جبراً اپنے خیالات نافذ کیے اور دونوں طبقوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کا جو تاریخی ناٹک ملا باقر مجلسی نے لگایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انگریز مورخ ایڈورڈ براؤن نے اس پر بجا تبصرہ کیا ہے۔

''ارباب نقد و نظر جانتے ہیں کہ ایران کے اس ابتلائے عظیم کا سب سے بڑا سبب تعصب اور تنگ
نظری کی وہ آگ تھی جو ملا باقر مجلسی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی لگائی ہوئی تھی۔''

(تاریخ ادبیات ایران۔ ایڈورڈ براؤن۔ ج ۴ ص ۱۹۲)

ہندوستان کے مسلم حکمرانون نے اس نازک موضوع پر ہمیشہ احتیاط اور اعتدال کی پالیسی قائم رکھی اور یہاں کے علماء بھی اپنے عوام کو ان تمام راہوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہے جو سنی شیعہ اختلافات کو اور بڑھائیں۔

لیکن افسوس کہ جب شیعہ کے شدت پسند علماء مولانا کرم الدین دبیر کی آفتاب ہدایت جیسی معتدل کتاب کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اس کے خلاف ان کے ایک ڈھ گو نے تجلیات صداقت کے اوراق سیاہ کیے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ تعصب کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہم آفتاب ہدایت کے گرد پھیلائے گئے اس دھویں کو کچھ زائل کریں جو شیعہ علماء نے صدیوں سے صحابہ کرامؓ کے خلاف پھیلا رکھا ہے۔ ڈھ گو کی بس اپنی محنت یہی ہے کہ اس نے اپنے صدیوں کے ان

فرسودہ اعتراضات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور اس کی یہ کوئی نئی تحقیقات نہیں ہیں۔ ہم تو اب بھی ان دونوں حلقوں میں اقبال کی یہ آواز پہنچا رہے ہیں:

اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

سنی شیعہ اختلافات کے فاصلے کسی صاحب علم سے مخفی نہیں کہ دور اول میں جو لوگ صحابہ سے اعتقاداً کٹے وہ اپنے اپنے مختلف ناموں سے معروف ہوئے۔ وہ سب اپنے بنیادی عقائد میں صحابہ و تابعین سے کٹ گئے تھے۔ جیسے جھمیہ' قدریہ' مرجۂ' معتزلہ' خوارج وغیرہ اور ان کے متصلاً بعد پیدا ہونے والے کرامیہ و مجسمہ اور روافض وغیرہا۔

اہل حق سب صحابہؓ کی راہ پر رہے۔ (ما انا علیہ و اصحابی) ایک ہی فرقے کا نشان رہا ہے۔

فروعی اختلافات وہ ہیں جو صحابہ اور تابعین کرام میں وسعت عمل میں ابھرے۔ بایں ہمہ وہ سب ایک جادہ اہل سنت میں رہے۔ ان فروعی اختلافات میں وہ ایک دوسرے کو باطل پر نہ کہتے تھے۔ بخلاف معتزلہ و خوارج اور قدریہ و روافض کے کہ وہ سب ایک دوسرے کو باطل پر کہتے تھے۔ اہل سنت اپنے فروعی اختلافات کو صواب و خطا میں دائر رکھتے تھے۔ ان میں حق و باطل کے فاصلے نہ کھینچتے تھے۔ علامہ تاج الدین الشافعی طبقات شافعیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

ان خطاء المعتزلی والرافضی قطعی والمسئلۃ قطعیۃ.

(طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۳۲)

''معتزلہ اور روافض کی غلطی قطعی درجے کی ہے۔ (اسے فروعی اختلاف میں نہیں لایا جا سکتا۔)''

قطعی اختلافات میں دلائل قطعی درکار ہوتے ہیں' فقہی اختلافات میں خبر واحد بھی کافی ہوتی ہے۔

خبر واحد سے قطعیت پیدا نہیں ہوتی۔ معتزلہ مطلق خبر واحد کو حجت نہیں مانتے۔ ان کے ہاں خبر واحد کم از کم عزیز کے درجے کو پہنچے تو اس سے کچھ استدلال کیا جا سکتا ہے۔ احادیث تواتر کے درجہ کو پہنچ کر قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں۔ اہل سنت کتب حدیث میں کچھ کتابیں نچلے درجے کی ہیں جن میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کے حوالوں سے عقائد کشید نہیں کیے جاتے۔ صرف فضائل اعمال کی حد تک ان سے استدلال ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ میں ان کے پانچ مراتب لکھے ہیں۔

افسوس کہ بعض نادان اثنا عشری شیعان پاکستان ڈھ گو کی کتاب تجلیات صداقت کو اثنا عشری مذہب اور سنی شیعہ اختلافات کا ایک انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں مگر وہ جانتے نہیں کہ یہ ڈھ گو اپنی اس کتاب میں عقائد پر قطعی دلائل کہیں بھی نہیں لا سکا۔ ہم ذیل میں اس کے ماخذ علمی کے کچھ نام دیتے ہیں۔ اس سے عام لوگ بھی جان لیں گے کہ ڈھگو نے حوالجات پیش

کرنے میں کہیں یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ قطعی اختلافات میں دلائل قطعی درکار ہوتے ہیں۔ محض کہانیاں اور وضعی داستانیں اس کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اس بات کا پتہ ہی نہیں۔

الدرالمنثور رامام سیوطی (۹۱۱ھ) تفسیر کی کتاب ہے حدیث کی نہیں۔ اس تفسیر میں وہ حدیث کی روایات زیادہ ان کتابوں سے لاتے ہیں جو نچلے درجے کی کتابیں ہیں اور ان کی بھی سند ساتھ نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۰ھ) نے اپنے مسلک کی مختلف کتب حدیث کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا طبقہ: موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم

دوسرا طبقہ: سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی

تیسرا طبقہ: مسند ابی یعلیٰ، المصنف لابی بکر بن ابی شیبہ، مسند امام احمد، مسند ابی داؤد الطیالسی، سنن کبریٰ امام بیہقی، شرح معانی الآثار امام طحاوی اور امام طبرانی کی کتابیں ان احادیث کا جو ان کتابوں میں منفرد ہیں فقہاء نے کچھ زیادہ استعمال نہیں کیا اور محدثین نے ان کی صحت وسقم سے زیادہ بحث نہیں کی۔
تیسرے طبقہ کی حدیثوں پر عمل کرنا اور ان کا قائل ہونا انہیں متبحر محققین کا کام ہے جو اسماء الرجال کو محفوظ رکھتے ہیں اور اسانید کی علتوں سے خوب واقف ہیں۔ (حجۃ اللہ)

چوتھا طبقہ: ابن حبان، ابن عدی، ابن مردویہ، ابونعیم، ابن عساکر، ابن جارد، دیلمی اور خوارزمی کی کتابیں چوتھے طبقہ کی حدیثوں کو توجہ سے جمع کرنا اور ان سے احکام کا مستنبط کرنا علماء متاخرین کی طرف سے ایک تعمق ہوا کرتا ہے اور مبتدعین کے گروہ رافضی اور معتزلہ وغیرہ ادنیٰ توجہ سے ان حدیثوں سے اپنے شواہد پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن علماء حدیث کے معرکوں میں ان کے ذریعہ وہ فتح پا نہیں سکتے۔ (حجۃ اللہ)

پانچواں طبقہ: پانچویں طبقہ میں وہ کتابیں ہیں کہ فقہاء اور صوفیا اور مورخین کے ہاں ان کی شہرت ہے اور چار طبقوں میں ان کی کچھ اصل معلوم نہیں ہوئی۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن کو ایسے لوگوں نے گھڑ لیا ہے جو بد دین تھے۔ ان لوگوں نے اسلام میں ایک سخت مصیبت پیدا کر دی ہے لیکن جب علماء حدیث ان روایات کو شواہد پر پیش کرتے ہیں اس وقت ان کی پردہ دری ہوتی ہے اور عیب ظاہر ہو جاتا ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

اب ڈھگو کے ان علمی ماخذ کو بار بار تجلیات صداقت کے ان صفحات میں دیکھیں اور غور کریں کہ ڈھگو جب متنازعہ فیہ مسائل میں دلائل قطعیہ سے تہی دامن ہوتا ہے تو وہ ان نچلے درجہ کی کتابوں کے کمزور دلائل سے مکڑی کا جالا بنتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے عقائد ان کی انتہائی ظنی درجے کی روایات سے ثابت کرتا ہے اور اپنے علمی ماخذ بھی وہ ان کی ان کتابوں کو قرار دیتا ہے جن سے کسی درجہ میں قطعیت کو راہ نہیں ملتی۔

ڈھگو کے قطعی دلائل کے ظنی ماخذ ملاحظہ کیجئے

درمنثور کے حوالے تجلیات میں ص ۱۳ ص ۱۴ ص ۳۰ ص ۳۱ تین دفعہ ص ۳۴ پھر کنز العمال کے حوالے تجلیات میں ص ۱۲ ص ۴۳۔ اور کئی دوسرے مقامات پر ملاحظہ کریں۔

اہل علم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کنز العمال حدیث کی بنیادی کتابوں میں سے نہیں ہے۔ اس کا مولف جن کتابوں سے روایت لاتا ہے وہ برابر ان کے حوالے دیتا ہے اور ڈھگو یہ حوالے پیش نہیں کرتا، سند کہیں نہیں پیش کرتا اور ان روایات کو وہ دوسروں کے عقائد ثابت کرنے کے لیے لاتا ہے۔ بایں ہمہ وہ انہیں ایک قطعی درجہ میں پیش کرتا ہے اور ظاہر ہے جہالت کی ضد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں عقائد کی بحث میں اس کے ماخذ کونسے ہیں ان پر بھی ایک نظر کر لیجئے۔

۱۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ (ص ۱۸، ۴۳، ۴۶، ۹۱، ۱۵۳)
۲۔ جذب القلوب (ص ۱۳)
۳۔ مدارج النبوۃ (ص ۱۴، ۴۹، ۵۲، ۷۱، ۷۴)
۴۔ العقد الفرید (ص ۱۸)
۵۔ حیاۃ الحیوان دمیری (ص ۱۵، ۴۵)
۶۔ فتاویٰ عزیزی (ص ۱۳، ۱۱۴)
۷۔ شواہد النبوۃ علامہ جامی (ص ۴۵)
۸۔ تفسیر الدرالمنثور (ص ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۶، ۴۴، ۵۵، ۶۶)
۹۔ کنز العمال (ص ۱۲، ۴۳، ۴۸، ۵۲، ۹۹، ۱۲۳)

جو شخص بھی مولف کے ان شاذ حوالوں سے گزرے گا وہ مؤلف کی علمی تہی دامنی کو ضرور محسوس کرے گا اور ساتھ ہی سوچے گا:

(۱) ڈھگو نے اس حوالے کی اصل عبارت کیوں نہیں لکھی۔
(۲) حوالے میں جس کتاب کا نام دیا گیا ہے کیا اس میں یہ بات قطع وتواتر سے لائی گئی ہے یا یہ محض ایک حوالے کے درجہ میں ہے۔ عقائد تو قطعیات سے ہی قائم ہوتے ہیں۔
(۳) یہ عبارت اس مولف کی اپنی ہے یا اس نے اسے کسی دوسرے سے اسے روایت کیا ہے۔
(۴) کیا اس مصنف نے کسی دوسرے موقع پر اس کے خلاف بھی لکھا ہے؟
(۵) اس روایت کا کیا کوئی اور ماخذ بھی اس میں دیا گیا ہے؟

پھر جب ڈھگو کی زبان بھی غیر شریفانہ ہو تو کون اس کتاب کو اہمیت دے گا۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان معمولی باتوں کو بھی صحیح سمجھ نہ پائے وہ کسی بحرِ علم میں کیسے کوئی غوطہ لگا سکتا ہے؟
اس صورت حال میں یہ بات نادانی ہوگی کہ تحقیق کے چند بنیادی اصول طے کیے بغیر ہم صدیوں کے اختلافات میں ڈوبے لوگوں کی کشتی کسی کنارے پر لاسکیں۔

اہل سنت اور شیعہ کے اختلافات اس لیے بھی اصولی ہیں کہ دونوں کی (اپنے دعویٰ کے مطابق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی دو مختلف رستوں سے ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے آپس میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں' ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ موطا امام مالک (۱۷۹ھ)' کتاب الآثار امام محمد (۱۸۹ھ)' صحیح بخاری (۲۵۶ھ)' صحیح مسلم (۲۶۱ھ)' سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ)' جامع ترمذی (۲۷۹ھ)' سنن نسائی (۳۰۳ھ) اور امام طحاوی (۳۲۱ھ) وغیرھا من کتب الحدیث سے ہے۔

اہل سنت کے یہ ذخائر حدیث بہت پہلے مرتب ہوئے اور شیعہ مذہب اس کے کافی بعد مدون ہوا۔
اثناعشریوں کے اصول اربعہ اپنے ہیں (۱) الکافی للکلینی (۳۲۸ھ) (۲) من لایحضرہ الفقیہ لابن بابویہ القمی (۳۷۰ھ) (۳) تہذیب الاحکام (۴) الاستبصار کلاھما لمحمد بن الحسن الطوسی (۴۶۰ھ)
پھر ان کے شیخ صدوق شیخ مفید اور شیخ مرتضٰی کے بھی اپنے اپنے حدیثی مجموعے ہیں۔
شیخ صدوق کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ موجودہ قرآن کو ہی تنزلِ آسمانی مانتے تھے اور اس میں کمی بیشی کا عقیدہ نہ رکھتے تھے۔ ان کی کتاب ثواب الاعمال اس مفروضہ کی تائید نہیں کرتی۔ آپ حضرت امام جعفر صادق کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں۔

یا ابن سنان ان سورۃ الاحزاب کانت اطول من سورۃ البقرۃ ولکن نقصوھا و حرفوھا.

(ثواب الاعمال ص ۲۴۸ طبع طہران)

مولوی مقبول احمد دہلوی نے بھی ترجمہ مقبول میں اس روایت سے استناد کیا ہے۔
پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جب یہ دو طبقے اپنی پہلی کتابوں میں ہی آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان میں کس طرح فروعی اختلافات ہو سکتے ہیں' ایسا نہیں۔ ان دو اختلافات کے اصولی اور بنیادی ہیں اور ان دو میں محاکمہ کوئی آسان اور سطحی کام نہیں ہے۔ رہا کسی کا بھڑکیں مارنا تو اس سے کبھی میدان سر نہیں ہوئے۔
عام لوگوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ شیعوں کے اپنے بھی کئی فرقے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ بات درست نہیں بیٹھتی۔ اسماعیلیوں کے سوا اور کوئی شیعہ فرقہ ایسا نہیں جس کے پیرو ان ممالک میں عام پائے جاتے ہوں۔ سو ان دیار میں جب بھی کسی پر شیعہ کا لفظ آئے تو اس سے مراد اثناعشری ہی ہوتے ہیں اور یہ اصول اربعہ انہی کے حدیثی مجموعے ہیں اور ان کی اسماء الرجال کی کتابیں بھی اپنی ہیں اور کسی دوسرے فرقے کی اپنی کوئی علیحدہ کتب حدیث نہیں ہیں۔

فصلِ سوم

مسلم معاشرے میں منافقین کس پوزیشن میں رہے

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی امابعد.

مسلم معاشرہ پہلے مکہ مکرمہ میں بنا' اس میں مسلمان مشکلات میں ہی گھرے رہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ وہ اس مشکلات میں گھرے طبقہ میں نفاق سے داخل ہو اور اس طرح اپنی پوری زندگی تلخ کرلے۔
ایک غیر مسلم اس وقت دائرہ اسلام میں آنے کا یہ نقشہ کھینچتا ہے:
"جو شخص اسلام قبول کرتا تھا وہ گویا ایک قسم کی موت اپنے لیے پسند کرتا تھا اور (اس وقت) اس طرح اسلام لانا سزائے موت کے قائم مقام ہو جاتا تھا۔" (چشمہ معرفت ص ۲۔ رخ ج ۲۳ ص ۳۹۶)
البتہ مدینہ منورہ کے مسلم معاشرہ میں مسلمان ایک واقعی عزت یافتہ قوم ہو چکے تھے۔ اب کچھ ایسے لوگ پیدا ہو سکتے تھے جو اندر سے مسلمان نہ ہوں اور اس معاشرہ میں بطریق نفاق داخل ہو کر انہیں دھوکہ دیں۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون مسلم معاشرے میں منافقین بطور ایک گروہ کے مدینہ منورہ میں ہی ملتے ہیں۔ اٹھائیسویں پارہ کی سورۃ منافقون مدنی سورت ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ نے اس گروہ منافقین کی بطور گروہ خبر دی ہے۔ سورۃ البقرہ کے شروع میں بھی منافقوں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے اور وہ بھی ایک مدنی سورت ہے۔
تاہم اس میں شک نہیں کہ مدینہ منورہ میں مسلم معاشرے میں منافقوں کا بھی آنا جانا رہا اور یہیں منافقوں کا پہلا تعارف ملتا ہے۔ یہ نفاق اعتقادی کی بات ہو رہی ہے کہ وہ پہلے کس دور میں مسلم معاشرے میں پایا گیا۔ اس طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ حضور اکرمؐ کی ان کے بارے میں ابتدائی پالیسی انہیں بے نقاب کرنے کی اور مسلم معاشرہ سے نکالنے کی نہ تھی۔
سو اس وقت منافقین مسلمانوں میں کس پوزشن میں رہے' مسلمانوں کو اسے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ وگرنہ اس ملے جلے معاشرے میں مومنوں اور منافقوں کو نمایاں طور پر معلوم کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس نقطہ نظر سے ہم اس موضوع کی کچھ وضاحت یہاں کیے دیتے ہیں۔

ابتداء میں منافقوں کو کیوں برداشت کیا گیا' اس میں کئی حکمتیں اور مصلحتیں تھیں۔

ڈھکو مولف نفاق کو پھیلانے اور وسعت دینے میں اس قدر مزا لیتا ہے کہ گویا وہ اس ایک ڈکار میں ہی تبرا کی ساری منزلیں طے کر گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ اسلام کی ابتداء میں منافقوں کو بہت ڈھیل اور رعایت دی گئی تھی۔ مولف اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ حضور (معاذ اللہ) اپنی زندگی کے آخر تک غالب پوزیشن میں نہ آ سکے۔ کیا یہ جاء الحق وزھق الباطل کا کھلا انکار نہیں؟ ہر تحریک کی ابتداء میں کچھ اپنی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ تحریکیں اپنے مقاصد اور انجام سے پہچانی جاتی ہیں' اپنے ابتدائی ایام کے اقدامات اور مصلحتوں سے نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جب پہلی اسلامی ریاست قائم کی تو پہلے تین چار سال تو جنگوں کا سامنا کرنے میں ہی لگ گئے۔ ہنوز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحت اسی میں تھی کہ منافقین کو نکالا نہ جائے۔ اگر ان کو نمایاں کر دیا جائے تو کئی نئے لوگ قریب نہ آئیں گے۔ وہ اس وہم میں رکے رہیں گے کہ شاید ہم بھی نکال دیے جائیں پھر ان کے پختہ مسلمان ہونے کی امید شاید کبھی بر نہ آئے سنہ ۵ ھجری میں غالباً غزوہ بنی مصطلق میں ایک مہاجر اور انصاری مسلمانوں میں کچھ بدمزگی ہو گئی اور دونوں نے مہاجرین اور انصار کو اپنی اپنی حمایت میں آواز دی' یہ دور جاہلیت کی بات تھی۔ اس قسم کی آواز دینا لوگوں کو حق و باطل کی بجائے برادریوں کے نام سے بلانا اسلام کے قانون عدل کے خلاف تھا۔ حضورؐ اس پر ناراض ہوئے کہ یہ جاہلیت کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: **دعوھا فانھا منتنة**' اسے چھوڑو یہ نہایت بدبودار آواز ہے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضور ان کی طرف نکلے اور یہ بات فرمائی: **فخرج النبیؐ فقال ما دعوی الجاهلية؟ ما شانهم۔** (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۸' ج ۲ ص ۷۲۸)

عبداللہ بن ابی منافق نے سنا تو کہا اب تو مہاجرین نے ہم سے زیادتی کر لی ہے جب ہم مدینہ واپس ہوں گے تو پھر بتائیں گے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ان دنوں مدینہ میں انصار کثرت سے تھے اور وہ منافق دور جاہلیت کی پیروی میں پھر سے ان آوازوں کو اٹھانا چاہتا تھا۔

حضرت عمرؓ منافقوں کی اس طرح کی ریشہ دوانیوں میں حضورؐ کے شریک راز تھے۔ آپؐ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔

فقام عمر فقال یا رسول اللہ دعنی اضرب عنق ھذا المنافق.

(صحیح البخاری ج ۲ ص ۷۲۸۔ جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۶۵۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۸)

ترجمہ: "حضرت عمرؓ جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا حضورؐ مجھے اجازت دیں میں ابھی اس منافق کی گردن اتارتا ہوں۔"

یہاں یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہاں اور کوئی صحابی کیوں نہ اٹھا۔ یہ اس لیے کہ جس درجہ کا وہ منافق تھا اس کے مقابل ایسے ہی کسی بڑے مومن کو آواز دینی چاہیے تھی۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

دعه لا یتحدث الناس ان محمداً یقتل اصحابه ...... وکانت الانصار اکثر من المهاجرین حین قدموا المدینة ثم ان المهاجرین کثروا بعد.

(رواہ البخاری ج ۲ ص ۷۲۸)

ترجمہ: "اسے اپنے حال پر رہنے دو' لوگ یہ نہ کہیں کہ حضرت (محمدؐ) اپنے ساتھیوں کو مار رہے ہیں۔ (یہ اس لیے کہ وہ منافق اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کیے ہوئے تھا)"

حضرت عمرؓ اگر اسے قتل کریں تو حضورؐ اسے یہ قرار دے رہے ہیں کہ گویا اسے خود آپ (محمدؐ) نے قتل کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے فعل کو حضور اکرمؐ کا اپنا فعل کہنا حضرت عمرؓ کی عجیب شان قبولیت ہے۔ یہ فعل محمدی شمار ہوگا جو حضرت عمرؓ کے ہاتھوں پورا ہو۔ اس سے حضرت عمر کے حضورؐ سے قرب کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا فعل ان کا فعل شمار ہو۔ یہ اس طرح ہے جس طرح کسی کو غایت قرب میں اس طرح کہا جائے۔ **عملک عملی و یدک یدی و لحمک لحمی۔**

اب اس واقعہ کو اس ڈھکو کی زبان سے سنیں اور اس کی ایک ایک علمی خیانت پر سر دھنیں۔ جب آنکھیں نہ ہوں تو روشن چراغ بھی دکھائی نہیں دیتے۔

منافقین کو شروع میں قتل نہ کرنے کی وجہ

ڈھکو تجلیات صداقت کے ص ۱۷ پر اس واقعہ کو اس طرح لکھتا ہے:

"ایسا کرنے میں آپ کے اپنے مشن کے ناکام ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ جب آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ آپ منافقوں کو قتل کیوں نہیں کرتے تو آپؐ نے فرمایا لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔ اس طرح تبلیغ رسالت رک جائے گی۔ اس لیے آنحضرتؐ نے منافقین کے ساتھ صرف لسانی جہاد پر اکتفا فرمایا۔" (ص ۱۷)

۱۔ یہ کہنا کہ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ آپ منافقوں کو قتل کیوں نہیں کرتے' یہ مولف کا جھوٹ ہے۔ حضورؐ کو کسی نے نہ کہا تھا کہ آپ قتل کیوں نہیں کرتے؟۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے اجازت چاہی تھی کہ وہ اسے قتل کریں۔ حضرت عمرؓ کی اس پیش کش کو چھپانے کے لیے مولف نے اسے ان لفظوں سے بدلا ہے "آپ قتل کیوں نہیں کرتے۔" اس کھلی خیانت میں شاید ڈھکو کا اپنا دل بھی شرمارہا ہوگا مگر اپنے جہلاء کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے اپنی طرف سے یہ الفاظ گھڑ لیے۔

پھر حضرت عمرؓ نے جب عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی تو اسے لفظ منافق سے ذکر کیا۔ یہ تقابلی پیرایہ بتا رہا ہے کہ آپ خود منافقوں میں سے نہ تھے۔ ورنہ کلام مقتضائے حال کے مطابق نہیں رہتا۔ ایسا ہوتا تو حضورؐ اس پر نکیر فرماتے۔ منافق سے ٹکر مومن ہی لے سکتا ہے۔ اس میں بھی حضرت عمرؓ کے ایمان پر ایک جلی اشارہ موجود ہے۔

حضرت عمرؓ کا اسے منافقوں میں شمار کرنا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلقہ اعتماد میں ان لوگوں کی کچھ نشاندہی آپ سے بھی کر رکھی ہو اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر حضورؐ کے خاص حلقہ اعتماد میں سے ہوں۔ خصوصاً منافقین کے بارے میں۔ اس صورت میں یہ واقعہ آپؓ کے ایمان کی کھلی دلیل سمجھا جائے گا۔

۲۔ پھر مولف کا یہ کہنا کہ اس سے تبلیغ رسالت رک جائے گی' نہایت غلط بات ہے۔ حضورؐ نے یہ نہیں کہا۔ تبلیغ رسالت تو حضورؐ کا اپنا عمل ہے وہ کیسے رک سکتا ہے؟ ہرگز نہیں لوگوں کا آپ کی بات ماننا تو رک سکتا ہے لیکن آپ کا انہیں اپنی بات پہنچانا ہرگز نہیں رک سکتا تھا۔ تبلیغ رسالت کا یہ مطلب آج تک کسی نے نہیں لکھا کہ لوگ منافق بن کر آپ کے حلقہ میں آئیں تا کہ آپ ان تک دین پہنچائیں۔ آپؐ نے اپنی رسالت مجمع عام میں اور کھلے بندوں لوگوں کے سامنے پیش کی۔ تبلیغ رسالت کا یہ طریقہ کہ لوگوں کو منافقین کے طور پر اپنے حلقہ میں لایا جائے تا کہ ان تک دین پہنچ جائے (تبلیغ رسالت ہو جائے) آج تک کسی گمراہ سے گمراہ فرقے نے بھی یہ بات نہیں کہی ہے۔ تبلیغ رسالت کو اس طرح کی ایک خفیہ کاروائی ٹھہرانا ایک بڑی جہالت ہے۔

۳۔ ''آنحضرتؐ نے منافقین سے لسانی جہاد پر اکتفا کی۔'' یہ تبھی درست ہو سکتا ہے کہ یہ لسانی جہاد آخر تک آپ کا عمل رہا ہو لیکن واقعات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ ایک وقت آیا کہ آپ نے بر سر عام ایک ایک منافق کا نام لے کر ان کو مجلس صحابہؓ سے نکال دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جمعہ کے دن منبر پر کھڑے ہو کر چھتیس آدمیوں کو نام بہ نام مخاطب کر کے فرمایا اخرج فانک منافق ''تو منافق ہے مسجد سے نکل جا۔''

(تفسیر عثمانی سورہ التوبہ آیت ۱۰۱)

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعة خطیباً قال قم یا فلان فاخرج فانک منافق اخرج یا فلان فانک منافق فاخرجھم باسمائھم ففضحھم۔

(رواہ ابن ابی حاتم والطبرانی کمافی روح المعانی ج)

جب یہ نکالے گئے تھے تو ان کا صحابہؓ کے ساتھ عام رہنا سہنا نہ تھا۔ یہ اپنے اطوار و کردار سے ان سے مختلف رہتے تھے۔ سیرت ابن اسحاق میں ہے:

کان ھولاء المنافقون یحضرون المسجد فیسمعون احادیث المسلمین و یسخرون عنھم ویستترون بدینھم فاجتمع فی المسجد منھم ناس فراھم رسول اللہ یتحدثون بینھم فاخفیٰ اصواتھم قد لصق بعضھم ببعض فاخرجھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخرجوا من المسجد اخراجاً عنیفاً۔

اس میں پوری صراحت ہے کہ منافقین صحابہ کے ساتھ اس طرح مل کر نہ رہتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ہم نشین ہوں۔ سو یہ بھی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ منافق کبھی ہم نشین مجلس رسالت رہے ہوں۔ وہ اپنے اطوار و کردار میں ہمیشہ صحابہ کرام سے الگ نظر آتے تھے۔ صحابہ کرام اور منافقین میں اختلاط عام نہ تھا۔ پھر جب ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی ممانعت کی گئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت صحابہ کرامؓ اور منافقین ایک مخلوط سوسائٹی رکھتے تھے۔ قرآن پاک میں ان کی نماز جنازہ سے روک دیا گیا تھا اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ وہاں منافقین کی اپنی پہچان ہو اور وہ صحابہ کرام سے الگ جانے جاتے ہوں۔

ولا تصل علیٰ احد منھم مات ابداً ولا تقم علیٰ قبرہ. (التوبہ۔ صحیح بخاری ج۲ص۶۷۳)

سر عام نکالے جانے سے پہلے بھی صحابہ کی ان پر پوری نظر ہوتی تھی۔ جب ایک بدری صحابی حضرت عتبانؓ بن مالکؓ نے حضورؐ کو اپنے گھر ایک حصہ زمین پر نماز پڑھنے کے لیے گزارش کی اور آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیے ان کے گھر پہنچے تو وہاں مالک بن دخیش کے بارے میں منافق ہونے کی بات چلی اور بعض صحابہ نے کہا:

فانا نری وجھہ ونصیحتہ الی المنافقین۔ (صحیح بخاری ج۲ص۸۱۳)

گو حضورؐ نے مالک دخیش کے بارے میں یہ بات تسلیم نہ کی لیکن اس روایت سے یہ ضرور پتہ چلا کہ اس وقت بھی صحابہ کرام اور منافقین میں اختلاط عام نہ تھا۔ وہ اپنے اطوار میں ایک علیحدہ گروہی حیثیت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف کچھ عرصہ کے لیے انہیں صحابہ کرامؓ کی مجلس سے نکالنے سے روکا تھا ہمیشہ کے لیے نہیں۔ عبیداللہ بن عدی انصاری روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ سے رازدارانہ طور پر ایک منافق کو قتل کرنے کی اجازت مانگی۔ حضورؐ نے بلند آواز سے فرمایا کیا وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت نہیں دیتا؟ اس نے کہا بلیٰ (کیوں نہیں) پھر آپ نے کہا الیس یصلی (کیا وہ نماز نہیں پڑھتا؟) اس نے کہا کیوں نہیں؟ لیکن اس کی (کافر کی) نماز تو نہیں ہوتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

اولئک الذین نھانی اللہ عنھم. (مسند امام احمد ج ۹ ص ۱۲۹)

ترجمہ: ''وہ لوگ ہیں کہ خدا نے مجھے ان پر کارروائی کرنے سے روک رکھا ہے۔''

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ بھی حضورؐ کے ساتھ ان منافقوں سے اچھے آگاہ تھے تبھی تو اس صحابی نے کہا تھا کہ اس کی نماز نہیں ہوئی اور حضورؐ نے اس پر اپنے اوپر آئے ہوئے پرانے والے ایک حکم الٰہی کا اشارہ کر دیا تھا۔

یہ نہی کب تک رہی؟ اس وقت تک جب تک حضورؐ نے ان کو برسرِ عام مجلس صحابہؓ سے نکال نہیں دیا اور قرآن کریم میں ان منافقین کو حضورؐ کی مجلس سے دور کرنے کی خبر پہلے سے دی گئی تھی۔''

ہمیشہ کے لیے منافق آپ کی مجلس پر چھائے رہیں قرآن کریم نے اس تصور تک کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا تھا۔

لئن لم ینته المنافقون والذین فی قلوبهم مرض والمرجفون فی المدینة لنغرینک بهم ثم لا یجاورونک فیها الا قلیلاً ٥ ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتّلوا تقتیلا ٥ (پ ۲۲ . الاحزاب ۶۱)

ترجمہ: ''اگر منافق نہ رکے اور وہ لوگ بھی جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑانے والے تو ہم تجھ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ پھر وہ تیرے اس شہر میں بھی تیرے ساتھ نہ رہ سکیں مگر تھوڑے دن۔ وہ پھٹکارے جہاں کہیں بھی پائے جائیں ان پر مار دھاڑ ہو گی۔''

سو قرآن کریم کی رو سے منافقوں کی سرگرمیاں حضورؐ کی حیاۃ طیبہ میں ہی سرد پڑ گئیں اور خدا کا وعدہ پورا ہوا۔ حضورؐ کی زندگی میں ان کے حملے شدید تھے اور ان کی کارروائیاں گہری تھیں۔ پھر بھی یہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ حضورؐ کے بعد یہ کھل گئے۔ منافق نہ رہے اور اب صرف دو ہی طبقے رہے' مسلمان اور کافر۔ منافق اب کھلے کافروں میں آ ملے اور وہ جب ظاہر ہی ہو گئے تو نفاق کہاں رہا؟ نفاق تو اس چیز کا نام ہے کہ حقیقت پر پردہ پڑا رہے۔ اس بات کی تائید حضرت حذیفہؓ بن یمان کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

ان المنافقین الیوم شر منهم علی عهد النبیؐ کانوا یومئذ یسرون والیوم یجهرون. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۴)

''یہ منافقین آج اس سے زیادہ برائی میں ہیں جتنے کہ وہ حضورؐ کے وقت میں تھے۔ ان دنوں وہ چھپے رہتے تھے اور اب وہ (کافر ہو کر) بالکل ظاہر ہو گئے ہیں۔''

قال انما کان النفاق علٰی عهد النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فاما الیوم فانما هو الکفر او الایمان رواہ البخاری. (مشکوٰۃ ص ۱۸ . مرقات ج ۱ ص ۱۱۳)

ترجمہ: ''بے شک نفاق تو صرف حضورؐ کے عہد میں ہی تھا۔ آج دو ہی چیزیں ہیں' کفر یا ایمان (نفاق اور اس کے احکام جاتے رہے)۔''

نفاق کے احکام اب باقی نہیں رہے

سو اب حضورؐ کے بعد یہ زیادہ بری حالت (ارتداد) میں آئے۔ حضورؐ کے عہد میں جو منافق صف اسلام سے نکالے گئے ان پر ارتداد کا حکم نہ آیا تھا۔

انما النفاق ای حکمه بعدم التعرض لاهله والستر علیهم کان بعهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لمصالح کانت مقتصرة علٰی ذلک الزمان اما الیوم فلم تبق تلک المصالح.

ترجمہ: ''نفاق کے احکام کہ ان منافقین سے ٹکراؤ نہ کیا جائے' ان کی پردہ پوشی رہے یہ حکم صرف حضورؐ کے عہد میں تھا اور اس میں کئی مصلحتیں تھیں اور وہ صرف حضورؐ کے عہد تک محدود تھیں۔ آج ان مصالح کو روا نہ رکھا جائے گا۔ اب لوگ صرف مسلمان اور کافر ہی سمجھے جائیں گے۔''

اب جو صف اسلام سے نکلے اسے نفاق کی پہلی رعایت نہ دی جائے گی۔ اب اسے مرتد شمار کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ پہلے سے زیادہ بری پوزیشن میں آ گئے۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

یعنی ان حکم المنافقین من ابقاء ارواحهم و اجراء احکام المسلمین علیهم انما کان علٰی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بناءً علی مصالح منها ان المؤمنبن اذا ستروا علٰی المنافقین احوالهم خفی علی المخالفین حالهم وحسبوا انهم من جملة المسلین فیجنبوا عن معاردتهم لکثرتهم بل ذلک الٰی ان یخافوا وتقل شوکتهم. (مرقات ج ۱ ص ۱۳۳)

ترجمہ: ''یعنی منافقین کے احکام کہ ان کی زندگیوں کا تحفظ رہے اور ان پر مسلمانوں کے ہی احکام جاری رہیں۔ یہ صرف حضور اکرمؐ کے عہد میں رہا اور اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔ ان میں یہ بات بھی تھی کہ جب مومن منافقوں پر پردہ ڈالے رہیں گے تو کھلے مخالفوں کو ان کا حال معلوم نہ ہو پائے گا۔ وہ انہیں مسلمان ہی سمجھتے رہیں گے۔ تو مسلمانوں کی کثرت تعداد سے وہ مسلمانوں کی مخالفت اور ایذا رسانی سے کچھ دور رہیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان سے ڈرے رہیں اور ان کی شوکت کم

سمجھی جائے۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ بھی اسے اسی طرح لیتے ہیں:

"درزمان شریف آنحضرت آدمیاں سہ قسم بودند مومن وکافر ومنافق وحکم شریعت دروں زماں آں بود کہ منافقاں رادرحکم مسلماناں مے داشتند وستر حال ایشاں مے نمودند وتعرض بحال ایشاں نمے کردند از جہت حکمتھا ومصلحت ہا کہ دراں بودامالاآن آں حکم نماند؟ اگر فرضاً ظاہر شودوثابت گردد کہ یکے نفاق مے کند وپنہاں کفرمے ورزد اور اقتل مے کنیم واحکام کفر بروے اجراء مے نمائیم۔"

(اشعۃ اللمعات ج ا ص ۷۹)

منافقین کو اس دی گئی رعایت کے باوجود اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضورؐ کی زندگی میں منافقین امور امت پر چھائے رہے ہوں ورنہ حضور اکرمؐ کی وفات کے معاً بعد صحابہؓ ان پر حکم کفر صادر کرنے اور انہیں سزائے موت دینے کی پوزیشن میں نہ ہوتے۔ منافقین کا پایا جانا اور بات ہے اور ان کی قوت وشوکت ہونا ایک دوسری بات ہے جس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اہل ایمان کا اس وقت تک مغلوب ہونا' یہ عقیدہ قرآن پاک کی مذکورہ سابقہ آیت کے خلاف ہے۔ حضورؐ کی وفات کے وقت مدینہ میں منافقوں کا ایک بڑی تعداد میں موجود ہونا اور بات ہے اور ان کا امور امت کا متولی ہونا اور بات ہے۔ مولف ڈھکو مولانا شبلی کی عبارت سے دلیل پہلی بات پر لا رہا ہے اور اس سے استدلال دوسری بات پر کر رہا ہے۔ یہ اس کی علمی درماندگی ہے۔ دلیل اور مدلول میں مطابقت ضروری ہے۔ پھر اس نے علامہ شبلیؒ کی عبارت بھی پوری نقل نہیں کی۔ ہم اسے ذیل میں درج کیے دیتے ہیں۔ جو عبارت اس نے عمداً چھوڑی ہے ہم اسے خط کشید کرتے ہیں تاکہ قارئین جان سکیں۔

"آنحضرتؐ نے جب وفات پائی تو مدینہ منافقوں سے بھرا پڑا تھا جو مدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ رسول کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام (اس ظاہر دین) کو پامال کردیں۔"

(الفاروق ص ۱۱۱)

جب قرآن پاک کا یہ فیصلہ تھا کہ آخرکار منافقین آپ کے اس شہر میں (مدینہ میں) بھی عزت سے نہ رہ سکیں گے تو اب یہ بات کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے کہ منافقین حضور کے آخر وقت تک امور امت پر چھائے رہے تھے۔ استغفر اللہ من الجھل و سوء الفھم۔ عوام میں یہ پھیلے ہوئے ہوں یہ اور بات ہے اور یہ کسی بااختیار حیثیت میں ہوں یہ اور بات ہے۔

ان تفصیلات سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آپ کا ان منافقوں کے معاملہ میں صرف لسانی جہاد پر اکتفا کرنا ہمیشہ کے لیے نہ تھا۔ آپ حق کو غالب کر کے ہی دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ جاء الحق وزھق الباطل پوری

طرح ظاہر ہو کر رہا۔

منافقین صحابہ کرامؓ سے مخفی نہ تھے۔ حضورؐ ان کے بارے میں صحابہؓ سے کبھی بات بھی کرلیتے تھے۔ لیکن انہیں حکم تھا کہ ان کو نمایاں نہ کریں۔ کافر تو انہیں مسلمانوں میں سے ہی سمجھیں اور انہیں مسلمانوں کی گنتی زیادہ دکھائی دے۔ تاہم پیش نظر رہے کہ بڑے منافقوں کی گنتی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہ اثنا عشر تھے۔ امام مسلم حضرت قیس سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں حضرت حذیفہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی:

فی ان امتی اثنا عشر منافقاً لا یدخلون الجنة ولا یجدون ریحها حتی یلج الجمل فی سم الخیاط ثمانیة منهم تکفیهم الدبیلة واربعة لم احفظ ما قال شعبة فیهم.

ترجمہ: "میرے صحابہ میں بارہ منافق ملے ہوئے ہیں۔ ان میں آٹھ وہ ہیں جو کبھی جنت میں داخل نہ ہو پائیں گے۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے گزر جائے۔ ان کی پشت پر ایک زہر ملا زخم بنے گا وہی ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔ راوی کہتا ہے' چار کے بارے میں مجھے یاد نہیں رہا حضورؐ نے کیا بتایا تھا۔"

شراج من النار تظهر بین اکتافهم حتی تنجم من صدورهم.

(دلائل النبوة للامام البیهقی ج ۵ ص ۲۶۲)

امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت حذیفہؓ اور حضرت عمار سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ بارہ اس طرح آتے دیکھے ہیں:

حتی اذا کنا بالعقبة فاذا انا باثنی عشرر اکباً قد اعترضوه فیها قال فانبهت رسول الله صلی الله علیه وسلم بهم فصرخ بهم فولوا مدبرین فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم هل عرفتم القوم فقلنا لا یا رسول الله کانوا متلثمین و لکنا قد عرفنا الرکاب قال هٰولاء المنافقون الیٰ یوم القیٰمة وهل تدرون ما ارادوا قلنا لا قال ارادوا ان یزا حموا رسول الله صلی الله علیه وسلم فی العقبة فیلقوه منها. (تفسیر ابن کثیر سورة البراة. دلائل النبوة ج ۵ ص ۲۶۱)

ترجمہ: "جب ہم گھاٹی پر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بارہ اونٹ سوار اشخاص سامنے سے آ رہے ہیں۔ حذیفہؓ نے حضورؐ کو ان کے آنے کی خبر دی۔ آپ نے ان کو ایک کرخت آواز دی وہ پشت پھیر کر بھاگ گئے...... آپؐ نے فرمایا قیامت تک یہ منافق ہی رہیں گے۔ ان کا ارادہ تھا کہ خدا

کے رسول کو اس گھاٹی میں گرا دیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بددعا فرمائی:

اللھم ارمھم بالدبیلة قلنا یا رسول اللہ و ما الدبیلة قال شھاب من نار یقع علی نیاط قلب احدھم فیھلک. (دلائل النبوة ج ٥ ص ٢٦١)

ترجمہ: "اے اللہ ان کو دبیلہ میں مبتلا کردے (ہم نے پوچھا یہ دبیلہ کیا ہے؟) آپ نے فرمایا وہ ایک زہریلا پھوڑا ہے جو شعلہ کی طرح دل کی رگوں کو پھونک دیتا ہے اور انسان کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔"

حافظ ابن کثیر بھی ثم یردون الی عذاب الیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وذکرلنا ان نبی اللہ صلی اللہ علیه وسلم اسرّ الی حذیفه باثنی عشری رجلاً من المنافقین فقال ستة منھم تکفیھم الدبیلة سراج من نار جھنم یاخذ فی کتف احدھم حتی یفضی الی صدره وستة یموتون موتاً. (تفسیر ابن کثیر ج ٢ ص ٣٨٥)

محدث طبرانی (٣٦٠ھ) نے ایک روایت میں ان بارہ سواروں کے نام بھی بتائے ہیں۔

(دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

دبیلہ سے ہلاکت کے بعد اب صرف چار منافق باقی رہ گئے۔ زید بن وھب روایت کرتے ہیں:

کنا عند حذیفة فقال ما بقی من اصحاب ھذه الآیة (قاتلوا ائمة الکفر انھم لا ایمان لھم. پ ١٠ . التوبه ١٢) الا ثلثة ولا من المنافقین الا اربعة.

(صحیح البخاری ج ٢ ص ٦٧٢)

پھر ان چار میں سے ایک کے متعلق کہا:

لم یبق منھم الا اربعة احدھم شیخ کبیر لو شرب الماء البارد لما وجد برده.

ترجمہ: "اب ان میں سے صرف چار باقی رہ گئے ہیں۔ ایک ان میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ پانی پیتے اسے پتہ نہیں چلتا کہ پانی گرم ہے یا ٹھنڈا۔"

پھر یہ بھی ایک ایک کر کے راہیٔ ملک عدم ہوئے اور حضرت حذیفہؓ کی زندگی میں ہی صف اسلام ان منافقوں سے پاک ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت حذیفہؓ نے کہا اب لوگوں میں یا کافر رہیں گے یا مومن۔ نفاق کا دور اب جاتا رہا۔ ان بڑے منافقوں کے جانے سے پھر ان کی ذیلی صفیں بھی اٹھ گئیں۔ فللہ الحمد۔

ایک دفعہ حضورؐ ایک سفر سے واپس آ رہے تھے کہ اتنے زور سے ہوا چلی کہ سواروں کو بھی دفن کردے۔ اس پر

حضورؐ نے فرمایا:

بعثت ھذه الریح لموت منافق.

ترجمہ: "یہ ہوا کسی منافق کی موت سے چلی ہے۔"

جب آپ مدینہ واپس پہنچے تو آپ کو ایک بڑے منافق کی موت کی خبر ملی۔

ان تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ منافقین کبھی بھی نہ حضورؐ کی زندگی میں اور نہ آپ کے بعد کبھی امور مسلمین پر قابض اور ان کے متولی او متصرف رہے۔ ہمارا شیعوں سے اختلاف منافقوں کے وجود پر نہیں اس پر ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں مسلمانوں کی باگ دوڑ کبھی منافقوں کے قبضے میں نہیں رہی۔ اور قرآن کریم نے جو خبر دی تھی کہ منافقین اب تیرے شہر میں بھی تیرے ساتھ نہ رہ سکیں گے؛ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ رہے کمزور درجے کے منافقین یا بعض علامات نفاق کے حاملین تو وہ بھی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اپنے انجام کو پہنچے اور نظام حکومت اپنی پوری شان سے منہاج نبوت پر جلوہ پیرا ہوا اور دنیا نے

جاء الحق و زھق الباطل کا پھریرا پوری دنیا میں اڑتا دیکھا۔

اب ذرا آپ سوچیں کہ شیعہ اس پرچم اسلام کو پرچم خلافت کی بجائے علم بغاوت کے پیرائے میں کیوں کھینچ رہے ہیں۔ یہ محض اس لیے کہ جس طرح بھی بن پائے حضرت علی مرتضیٰؓ کے لیے مستضعفین کی زندگی اختیار کرنے کا جواز فراہم کیا جائے۔

شیعوں کی اس عقیدہ مغلوبیتِ رسالت سے کیا غرض رہی ہے؟

شیعوں نے مغلوب شدہ رسالت کی یہ خیالی تصویر اس لیے بنائی کہ اسے حضرت علیؓ کو مغصوب خلافت کی خیالی تصویر سے ہم آہنگ کر سکیں۔ اور حق یہ ہے کہ ڈھکو کہتا ہے کہ حضورؐ نے ان صحابہؓ کو قوموا عنی فرما کر آخری وقت میں اپنی بزم سے نکال دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ یہاں اس بات پر کوئی وضاحت پیش نہیں کر پایا کہ پھر وہ نکلے کیسے؟ آپ کی تجہیز و تکفین پر اور آپ کی مسجد کے مصلائے امامت پر اور پھر اراضی فدک پر تو وہ آخر تک چھائے رہے۔ وہ نکلے کب؟ نکالے جانے والے اگر اتنے طاقتور تھے تو وہ کیسے نکالے گئے ہوں گے۔ شیعہ یہاں چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں مگر انہیں صحابہ کو طرید رسول کہتے ہوئے کچھ شرم نہیں آ رہی۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

بہرحال ڈھکو نے اپنے ناکام استدلال سے حضرت علیؓ کے خلفاء ثلثہ سے جنگ نہ کرنے کی جو تصویر کھینچی ہے ہم اسے بھی ہدیہ قارئین کیے دیتے ہیں۔

وجہ عدم قتال علی مرتضیٰ بہ خلفاء ثلثہ

"جناب امیر خیبر گیر نے نہ ذوالفقار نیام سے نکالی اور نہ خداداد شجاعت کے جوہر دکھائے۔ اس میں آپ کو دو چیزیں مانع تھیں۔ اولاً شیر خدا کو رسول مقبول نے ایسے حالات میں صبر و ضبط سے کام لینے کی وصیت میں جکڑ دیا تھا۔ (۲) ثانیاً اس وقت جنگ کرنے سے اسلام کے دارالحکومت میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ چاروں طرف سے دشمنان اسلام کو حملہ کرنے کا موقع مل جاتا اور اس طرح اسلام نیست و نابود ہو جاتا۔" (تجلیات ص ۱۹)

یہاں ڈھکو یہ شرمناک بات کہہ رہا ہے کہ غیر مسلموں کے اس حملے کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی تلوار ذوالفقار بالکل بیکار تھی اور ان کے سامنے آپ اپنی خداداد شجاعت کے جوہر بالکل نہ دکھا سکتے تھے۔

سیدنا حضرت علیؓ کی خداداد بہادری کے خلاف شیعوں کی اس گستاخی کا ہم کہیں ساتھ نہیں دے سکتے۔

شیعوں کے اس تصور امامت کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ وہ خود تو اہل بیت کی عزاداری میں ماتم کرتے کرتے تھک چکے ہیں لیکن حضرت علیؓ کے اس کردار و عمل پر اہل سنت اپنا یہ عقیدہ کس طرح قائم رکھ سکیں گے۔ یہ بات شیعہ نے شاید کبھی نہ سوچی ہو۔ آیئے اب اس باب میں اہل سنت کا عقیدہ ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امام ابو جعفر الطحاوی لکھتے ہیں:

ولعلی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کان اعلم باللہ من ان یجری شیاء علیٰ ما الحق عندہ فی خلافہ ...... ھذا عندنا محال. (شرح معانی الآثار ج ۳ ص ۲۳۳ بیروت)

ترجمہ: "حضرت علی بن ابی طالب حکم خداوندی کو زیادہ جانتے تھے اس سے کہ آپ کوئی ایسا حکم نافذ کریں کہ حق اس سے دوسری طرف ہو ہم اہل سنت کے نزدیک حضرت علیؓ کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا ممکن نہیں۔"

یعنی ہم ان کی عزت، صداقت اور حق گوئی سے ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم انہیں تقیہ کی چادر اوڑھا کر خدا کی مرضی کے خلاف انہیں دوسرے غلط اعمال پر لگائے رکھیں۔ ہم آپ کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ شیعہ ان کے بارے میں ایسا سوچیں اور انہیں عمر بھر تقیہ کی چادر پہنائے رکھیں تو ہم سوائے صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں خلیفہ راشد کی اس قدر توہین ہرگز گوارا نہیں۔ امام طحاوی کے یہ الفاظ **ھذا عندنا محال** آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ شیعہ سے جب اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو وہ یہ بات بتاتے ہیں کہ انہیں حضورؐ نے اس زندگی میں جکڑ رکھا تھا۔

شیعہ اضداد کی چکی کے دو پاٹوں میں

شیعہ ایک طرف اپنے آپ کو حضرت علیؓ کا مدح خوان کہتے ہیں دوسری طرف انہیں اتنا کمزور دکھاتے ہیں کہ آپ کی اہلیہ سیدہ حضرت فاطمہؓ پر دروازہ گرایا جاتا ہے اور انہیں قتل کی دھمکیاں دے کر حضرت ابو بکرؓ کی بیعت پر مجبور کیا جاتا ہے، انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لایا جاتا ہے اور تو اور انہیں خود حضور بھی اس وصیت میں جکڑ جاتے ہیں کہ کچھ بھی ہو تم نے صحابہؓ کے خلاف نہیں اٹھنا اور دوسری طرف آپ کو شیر خدا اور امیر خیبر گیر کہتے ہیں۔ آپ ذوالفقار کو حرکت دیں تو دنیا میں کوئی رہنے نہ پائے مگر بایں ہمہ وہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے آگے دم نہیں مارتے۔ ان دو اضداد میں شیعیت کی چکی الٹی گھوم رہی ہے۔ امام طحاوی (۳۲۱ھ) اور علامہ کلینی (۳۲۸ھ) ایک ہی دور میں گزرے ہیں۔ امام طحاوی نے علامہ کلینی کے اس عقیدے کو **ھذا عندنا محال** کہا اور علامہ کلینی نے اسے ایں نزد ما مجال غار کہا۔ اب خدارا انصاف کریں کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی شان آپ کو کدھر نظر آتی ہے۔

شیعہ نے اضداد کی اس چکی سے نکلنے کی یہ راہ تجویز کی کہ حضرت علیؓ کے لیے ایک مقام امامت تجویز کیا جس کی رو سے امام خدا کے حکم سے چلتا ہے اور اس کے حکم سے اپنی اور اپنی بیوی کی عزت کو بچانے کے لیے بھی کچھ نہیں کرتا۔ سنی تو حضرت علیؓ کے حق میں اس قسم کے عقیدے کی تجویز کو محال کہتے ہیں۔ مگر ڈھکو علامہ کلینی کی تابعداری میں اسے مجال کہتا ہے۔ ڈھکو اضداد کی اس چکی سے اس طرح نکلتا ہے:

کمزور دست و بازو شیر خدا نہ تھا
سب قدرتیں وہی تھیں پر حکم خدا نہ تھا

(تجلیات ص ۱۹ سطر ۱۴)

ڈھکو نے ان اضداد کو چکی کا نچلا پاٹ کیسے بنایا

ان مظالم کو دیکھئے جو حضرت امیر خیبر گیر نے حضورؐ کے اہل بیت پر گوارا کیے:

"جناب سیدہ عالم کے پہلوئے اقدس پر دروازہ گرایا گیا جس سے شہزادہ محسن کی شہادت واقع ہوئی۔" (ص ۱۸۔ آخری سطر)

"جناب امیر کو رواں دواں مسجد نبوی میں لے گئے اور بیعت کرنے کے لیے قتل کی دھمکیاں دیں۔" (ص ۱۹۔ پہلی سطر)

مگر بایں ہمہ جناب امیر خیبر گیر نے نہ ذوالفقار نیام سے نکالی اور نہ خداداد شجاعت کے جوہر دکھائے۔" (ص ۱۹۔ سطر ۴)

اگر عقیدہ امامت تجویز کیا جائے اور حضرت علی پر یہ وحی اتری ہو کہ جو کچھ بھی ہو دیکھتے رہو۔ ہم نے ابو بکر و عمر کے خلاف ہرگز نہیں اٹھنا تو بے شک حضرت علیؓ کا یہ کردار سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر کوئی اس عقیدہ امامت کا قائل نہ ہو تو وہ امام طحاوی کی طرح اس کے سوا کچھ نہ کہے گا هذا عندنا محال ۔ حضرت علیؓ کسی صورت میں حضرت فاطمہؓ کی عزت کے خلاف کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیتے تھے۔

بنو اسرائیل سے بنو اسماعیل کے ارتداد پر استدلال

ڈھکو اس طرح حضرت علیؓ کو بری الذمہ کرتا ہے:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام چند روز کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور پوری قوم سوائے معدودے چند افراد کے گوسالہ پرستی کا شکار ہو گئی۔ یہاں بھی ان مرتدین کے ارتداد اور خلافت علوی کے انکار کو انہی لوگوں کی نااہلی کا نتیجہ و ثمرہ قرار دیا جائے گا۔'' (تجلیات ص ۱۸)

غالباً کسی صاحب علم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ حضرت موسیٰ کے آنے پر پھر ساری قوم حضرت موسیٰ کے کہنے پر تائب ہو گئی تھی۔ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ اور وہ تابع حکم ہو گئے تھے۔

واذ قال موسٰى لقومه يقوم انكم ظلمتم انفسكم باتخاذكم العجل فتوبوا الى بارئكم فاقتلوا انفسكم ذلكم خيرلكم عند بارئكم فتاب عليكم انه هو التواب الرحيم. (پ ۱ البقرہ ۵۴)

ترجمہ: ''اور جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑے کو معبود بنانے سے اپنے اوپر ایک بڑا ظلم کیا۔ سو تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور توبہ بجا لاؤ اور اپنے آپ کو فنا کے گھاٹ اتار دو۔ تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ سو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور وہ ہے توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا۔''

بنو اسرائیل کی اس چند روزہ گمراہی کے آثار چند روز بعد اصلاح پا گئے تھے اور قوم کی گوسالہ پرستی بقا نہ پا سکی۔ اور شیعہ عقیدہ کے مطابق حضرت علیؓ کے حالات سالہا سال کی تکلیفیں دیکھنے کے بعد بھی نہ بدلے اور وہ اپنے دور خلافت میں بھی لوگوں کو اس طرح دیکھتے رہے کہ ابو بکر و عمر کی حکومت ان کے دلوں پر اب بھی وہی ہے جو ان کے دور خلافت میں تھی۔ یہاں تک کہ حضرت حسنؓ بھی حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہوئے۔ حضرت حسینؓ بھی کربلا میں شہید ہو گئے اور بارہویں امام ایک غار میں روپوش ہو گئے۔ اب آپ ہی اندازہ کریں کہ بنو اسرائیل کی اس چند دنوں کی گوسالہ پرستی سے صحابہ کرامؓ کے اس طویل دور اقتدار پر دلیل لانا اپنے اندر کتنا وزن رکھتا ہے۔

خلافت بلافصل ثابت کرنے میں ڈھکو کی قابل رحم ناکامی

مولف نے اپنی اس کتاب میں اپنے شیعہ رؤسا کو تسلی دینے کی بہت راہیں تلاش کیں لیکن اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کی کوئی بات بن نہیں سکی اور اس میں وہ چاروں شانے چت گرا نظر آتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے غیر متعلق حوالوں سے کتاب کو لمبا کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اتنی بے وزن باتیں اور خام اور نامکمل حوالے اسے کسی حلقے میں بھی کوئی پذیرائی نہیں دلوا سکے اور وہ مجبور ہوا کہ اب وہ عقائد کی بجائے مسائل کا رخ کرے۔ اس نے خلافت بلافصل ثابت کرنے میں ناکامی کے بعد بیالیس مسائل کا ایک سائبان تانا ہے تا کہ اس کے نیچے وہ اپنے زخم خوردہ معتقدین کو بٹھلا سکے۔ تاہم اس کا ضمیر اسے برابر ملامت کر رہا ہوگا کہ وہ اپنے موضوع سے بہت دور جا نکلا ہے۔

ان مسائل میں بھی مولف قابل رحم حالت تک ناکام ہے۔ وہ اپنے شیعہ عمائد سے اس قدر بے زار نظر آتا ہے کہ باوجودیکہ وہ جو کچھ کہہ گئے وہی شیعہ مذہب ہے۔ وہ ان سب باتوں کو ان کے ذاتی خیالات کہہ کر شیعیت کے ان مسلمہ عقائد و مسائل سے اپنے آپ کو لاتعلق کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہم اس کے سوا کچھ سمجھ نہیں پائے کہ وہ اپنے عقائد و مسائل کے ثابت کرنے میں چاروں شانے چت گرا نظر آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ناقدین کو بھی اس پر رحم آ رہا ہے۔

ملا محمد باقر مجلسی نے حیات القلوب میں لکھا ہے

''شکے نیست در کفر عمر و کسے کہ عمر را مسلم داند''

شکے نیست کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ شیعہ حلقوں میں یہ کوئی اختلافی بات نہیں۔ سب اسلاف شیعہ بلا تردد اسے اپنا ایک متفقہ موقف سمجھتے آئے ہیں اور اس میں اب کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔

مگر ڈھکو کہتا ہے:

''مذہب شیعہ نہ جناب ابو بکر و عمر و عثمان کو کافر سمجھتا ہے اور نہ ہی ان کے پیروکاروں کو...... اگر حضرت علامہ مجلسی نے ان کو کافر کہا ہے تو وہ ان کا ذاتی قول ہے اور وہی اس کے جواب دہ ہیں۔'' (تجلیات ص ۳۸۱)

اہل علم سے مخفی نہیں کہ کسی کی ذاتی رائے کو بے شک کہہ کر کبھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ مولف کی اپنی ناکامی پر خود اپنی مہر ہے۔

حضرت عمرؓ کے نکاح میں جو حضرت ام کلثوم تھیں وہ حضرت فاطمہؓ کی بیٹی تھیں۔ اثنا عشری محدث علامہ خلیل قزوینی شارح اصول کافی نے اسے بنت فاطمہ کہا ہے۔ اس پر ڈھکو لکھتا ہے:

''کسی روایت میں اس ام کلثوم کے بطن فاطمہ سے ہونے کی صراحت موجود نہیں ہے۔ ملا خلیل قزوینی

کا بیان ان کا ذاتی خیال ہے۔" (تجلیات ص ۲۰۰)

مولانا دبیر نے شیعہ کی مستند کتاب اصول کافی سے نقل کیا تھا کہ حضور کی حضرت فاطمہؓ کے علاوہ تین اور لڑکیاں بھی تھیں جن کے نام حضرت رقیہ، حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم تھے۔ اس کے جواب میں ڈھکو لکھتا ہے:

"یہ سرکار کلینی مولف اصول کافی کی ذاتی رائے ہے۔" (تجلیات ص ۲۱۲)

شیعہ شعراء ملا یمان علی صاحب حملہ حیدری ہوں یا دبیر دانیس یہ لوگ ہمیشہ شیعہ نظریات کے ترجمان رہے ہیں انہوں نے مشترکہ بات وہیں کی جہاں شیعہ کے مخصوص اندرونی نظریات کو قطع وتواتر اور عقل ونقل کی روشنی میں کوئی سہارا نہ مل سکا۔ مولانا دبیر نے وہیں ان سے استفادہ کیا۔ جہاں شیعی مخصوص نظریات کے کھنڈرات بالکل ویران نظر آئے۔

ڈھکو مولانا دبیر کے جواب میں لکھتا ہے:

"حملہ حیدری کا مولف و ناظم شیعہ محدثین میں سے نہیں اور نہ علماء و مجتہدین میں سے ہے۔ وہ صرف فردوسی کی طرح شیعی المذھب شاعر ہے۔" (تجلیات ص ۱۲۶)

آزاد شاعر میں اور مذہبی شاعر میں جو فرق ہے وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں۔ ڈھکو اسے واضح لفظوں میں شیعی المذھب شاعر لکھ رہا ہے۔ اور پھر بھی اس کے ان اشعار کو جو اس نے حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے صحابہؓ کے بارے میں لکھے ہیں وہ انہیں اس کے ذاتی خیالات کہہ کر ان کے جواب سے فارغ ہو رہا ہے۔ تو کیا یہ اس کی ایک قابل رحم حالت نہیں ہے؟

ایران میں شیعی دور حکومت کس طرح عمل میں آیا۔ ہم اس وقت اس پر بحث نہیں کر رہے۔ ناظرین کرام اس باب میں ایڈورڈ براؤن کی کتاب تاریخ ادبیات ایران کی پہلی اور چوتھی جلد کا مطالعہ کریں۔ ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایران کے شیعی دور حکومت میں تاریخ کی کسی بڑی کتاب کا حکومتی سطح پر لایا جانا اس دور کے علماء کو اس کی تاریخی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں کرتا۔ لسان الملک مرزا محمد تقی سپہر کاشانی نے حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر جو لکھا اسے مولانا دبیرؒ نے آفتاب ہدایت میں پیش کیا تھا کہ اس سے اسلام کو کتنی عزت ملی۔ اس پر ڈھکو کا جواب ملاحظہ ہو:

"اگرچہ یہ کتاب شیعی دور حکومت میں ایران میں لکھی گئی مگر لکھنے والے بزرگ لسان الملک مرزا محمد تقی سپہر کاشانی کا شمار علماء کبار تو در کنار علماء صغار میں بھی نہیں ہوتا۔" (تجلیات ص ۱۴۴)

تجلیات صداقت میں مولف کی اس قسم کی عبارات سے کوئی صاحب علم یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ڈھکو دلائل کی دنیا میں کسی جگہ جم کر کھڑا نہیں رہ سکا۔ قدم قدم پر اس کی یہ پسپائی اور خود اپنوں سے یہ جلی بے اعتنائی کبھی علامہ کلینی سے اختلاف اور کبھی باقر مجلسی سے انحراف۔ یہ صورت حال اس کے اندر کا پورا x-ray دے رہی ہے کہ وہ بغض صحابہ

کے سوا اپنے شیعی عقائد و نظریات پر ایک بھی قطعی دلیل پیش نہیں کر سکا جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالۃ بھی۔ تو اس صورت حال میں اگر علماء حق نے اس کتاب کو لائق جواب نہیں سمجھا تو اس پر تعجب کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈھکو بغض صحابہ میں اس قدر مدہوش ہے کہ اسے اپنے ان نظریات کی پذیرائی میں خود ذات رسالت پر اس شرمناک حملے میں بھی کوئی علمی حجاب محسوس نہیں ہوا۔ وہ اپنے شیعہ عقائد کی رو سے تو حضرت ام المومنین پر یہ ناپاک حملہ کر رہا ہے مگر اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ اس میں ذات رسالت کی بے ادبی اور گستاخی میں مسٹر رشدی سے بھی چند قدم آگے نکل گیا ہے۔ جس طرح عرب میں لیلیٰ و مجنوں اور ایران میں شیریں اور فرہاد اور پنجاب میں ہیر اور رانجھا کے عشق کی داستانیں ضرب الامثال میں ذکر کی جاتی ہیں اسے دائرہ اسلام میں بھی ایک اس پیرائے کو ہوئے کوئی علمی حجاب محسوس نہیں ہوا۔ قارئین کرام ڈھکو کی اس عبارت پر غور کریں اور خود فیصلہ کریں کہ کیا ایسے لوگ کہیں بھی صف اسلام میں تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ ڈھکو لکھتا ہے:

اسلام میں پہلے پہل عشق نے جو قدم رکھا وہ رسول اللہ کا عشق جناب عائشہ سے تھا۔ اس وجہ سے امام مسروق جناب عائشہ کو حبیبہ رسول کہا کرتے تھے۔ مسجد تفسیح میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں شراب کا پیالہ پیش کیا گیا جو آپ پی گئے۔ (استغفر اللہ ثم استغفر اللہ) (تجلیات صداقت ص ۱۳)

قارئین ڈھکو کے اس انداز کلام سے یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے۔

گر چنیں مکتب و چنیں ملا...... کار طفلاں تمام خواہد شد

تحقیق عقائد کے چند بنیادی اصول

فصلِ چہارم

تحقیق عقائد کے چند بنیادی اصول

الحمدللّٰہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد.

۱۔قرآن کریم سے کوئی استدلال ہو تو محکمات سے ہو متشابہات سے نہ ہو متشابہات سے وہی لوگ دلیل پکڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہو قرآن کریم میں ہے۔

اماالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنہ و ابتغاء تاویلہ.

(پ ۳ آل عمران)

ترجمہ: ''سو جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ اس کے اس حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے دین میں فتنہ ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کا غلط مطلب ڈھونڈنے کی طلب میں۔''

۲۔ہماری کتب حدیث میں صحیح مسلم اور صحیح بخاری وغیرہ میں کتاب الایمان کے مستقل ابواب ہیں۔ان میں عقائد اہل سنت کی پوری تنقیح موجود ہے پھر عقائد علم کے ایک مستقل باب کے طور پر علیحدہ بھی مرتب ہوئے اور عقائد پر مستقل کتابیں وجود میں آئیں جیسے فقہ اکبر، عقیدہ طحاوی، عقائد نسفی اور شرح مقاصد وغیرہ۔

شیعہ حضرات کے ہاں بھی اصول کافی اصول کی ایک مستقل دستاویز ہے۔تجرید الاعتقاد علامہ طوسی اور اس کی شرح کشف المراد لابن مطہر الحلی اور حق الیقین وغیرہ ان کی مستقل کتب عقائد ہیں جو صاحب دونوں حلقوں کے عقائد کا تقابلی جائزہ چاہے وہ ان کتابوں سے انہیں معلوم کرسکتا ہے۔

۳۔کتب تاریخ سے واقعات لئے جاتے ہیں عقائد نہیں۔پھر جب تاریخ کی کوئی کتاب بذات خود سند نہیں۔ان میں دیئے واقعات کی سند تلاش کی جاتی ہے۔تب کہیں جا کر ان کا کسی درجے میں اعتبار کیا جاسکتا ہے تو آپ ہی سوچیں کہ تحقیق عقائد میں کہاں تاریخ کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔حدیث کی کتابیں بے شک واقعات کو سند کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔سو ان کی بھی سند کی تحقیق ہوتی ہے۔

سو کتب تاریخ اور کتب حدیث کے اختلاف میں کتب حدیث اونچا درجہ رکھتی ہیں۔

۴۔واقعات میں پھر زمانے اور دور کو بھی دیکھا جاتا ہے۔خود حضور کے عہد کے واقعات ہوں تو بھی آپ کے آخری قول و فعل کو لیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے:۔

کان صحابة رسول الله ﷺ یتبعون الاحدث فالاحدث من امرہ صلی الله علیه واله وسلم (صحیح مسلم ج ا ص ٣٥٥)

ترجمہ: ''حضور اکرمؐ کے صحابہ حضورؐ کے آخری عمل کو اپنے عمل میں لاتے تھے۔''

آگے امام زہری سے بھی یہ منقول ہے:

انمایوخذمن امر رسول الله ﷺ بالآخر فالآخر .

صحیح بخاری میں بھی ہے:۔

وانما یوخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی الله علیه وسلم. (ج ا ص ٩٦)

قال الزهری ...... وانما یوخذ من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم الآخر فالآخر . (ج ٢ ص ٦١٣)

امام ابوداوٗد باب ترک الوضوء مماغیرته النار میں لکھتے ہیں:

کان آخر الامرین عن رسول الله ﷺ (سنن ابی داؤد ج ا ص ١١٦)

ترجمہ: ''یہ بات حضور ﷺ کا آخری عمل ہے۔''

علامہ خطابی بھی لکھتے ہیں:۔

انمایوخذ بالآخرمن امر رسول الله ﷺ (معالم السنن ج ا ص ١٢٣)

علامہ کلینی بھی تسلیم کرتے ہیں:۔

انمایوخذ بآخر امر رسول الله ﷺ .

(اصول کافی ج ا ص ١٦٧' فروع کافی ج ٤ ص ١٢٧)

سو حضورؐ نے جن حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت دی وہ اپنے آخری عمل میں یقیناً خیر پر سمجھے جائیں گے۔ ان کی پہلی غلطیاں سب رحمتِ الٰہی کے پانی سے دھل چکیں۔

غیر مسلم حضرات قرآن کریم کی آیت والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم کی تکذیب میں کہتے ہیں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں صحابی تھے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ آپس میں لڑے انہیں یہی جواب دیا جاتا ہے کہ لڑنا ان کا آخری فعل نہ تھا وہ عام الھدنہ (٤٠ھ) میں ایک معاہدہ کے ساتھ آپس میں لڑنے سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ پھر سیدنا حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ نے اس کی کھلے بندوں توثیق کردی پس آپس میں لڑنا ان کا آخری عمل نہ تھا۔

۵۔ کسی سے کتنا بڑا گناہ کیوں نہ صادر ہوا گر وہ شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی کا منکر نہیں تو اہل سنت کے ہاں وہ ایمان سے باہر نہیں ہوتا اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ خوارج کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ سو کسی شخص کو میزان الرجال میں تولنے کے لئے اس کی اس کے بعد کی زندگی کو سامنے رکھنا تقاضائے فطرت ہے۔

٦۔ عقائد بھی دو قسم کے ہیں (ا) عقائد قطعیہ اور عقائد ظنیہ۔ اسلام کے عقائد قطعیہ کا انکار کفر ہے۔ لیکن عقائد ظنیہ کا انکار گمراہی ہے کفر نہیں سو حدیث کی کتابوں میں فضائل اور مناقب کے ابواب میں دی گئی احادیث سے عقائد کا استنباط اپنی جگہ درست ہوگا اور صحابہ میں فضائل کی ترتیب بھی درست ٹھہرے گی۔

اہل سنت کے ان عقائد کے لئے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے یا یہ کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد حضرت ابراہیمؑ تمام پیغمبروں سے افضل ہیں اور یہ کہ عذاب قبر روح اور اس جہاں والے جسد سے ہی (گو وہ ریزہ ریزہ کیوں نہ ہو گیا ہو) متعلق ہے۔ اسی اصول پر مبنی ہیں اور یہ بات کہ عقائد کے لئے دلیل قطعی درکار ہے اپنے عموم پر نہیں ہے۔ بعض عقائد دلائل ظنیہ سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔

بعض اخبار احاد جو اپنی اپنی جگہ متفرق ہیں اگر کسی قدر مشترک پر جمع ہو جائیں تو ان سے بھی ایک ایسا یقین ملتا ہے کہ اس پر عقیدے کی بناء رکھی جا سکتی ہے۔ حضرت علامہ شاطبی مالکی (٧٩٠ھ) لکھتے ہیں:

و انما الادلة المعتبرة ههنا المستقرأة من جملة ادلة ظنّية تظافرت علیٰ معنی واحد حتی افادت القطع فان للاجتماع من القوة ما لیس للافتراق ولاجله افاد التواتر القطع وهذا نوع منه فاداحصل من استقراء ادلة المسئلة مجموع یفید العلم الدلیل المطلوب وهو شبیهٌ بالتواتر المعنوی. (الموافقات جلدا ص ٣٦)

ترجمہ: ''اس مقام پر جن دلائل کا اعتبار کیا جا سکتا ہے وہ ہیں جو ادلہ ظنیہ سے استقراء ایک بات پر مجتمع ہو جائیں ان ظنی دلائل کا کسی ایک بات پر مجتمع ہو جانا اس میں وہ قوت آ جاتی ہے جو علیحدہ علیحدہ ان دلائل کو حاصل نہ تھی تواتر بھی اسی وجہ سے قطعیت کا فائدہ دیتا ہے اور یہ (اخبار احاد سے استقراء ملنے والا) تواتر بھی دراصل اسی تواتر کی ایک قسم ہے جب کسی مسئلہ کے دلائل کا استقراء کرتے ہوئے ایسی مجموعی بات مل جائے جس سے یقین حاصل ہو تو یہ وہی دلیل ہے جو یہاں درکار تھی یہ تواتر معنوی سے ایک ملتی جلتی بات ہے۔''

دسویں صدی کے مجدد محدث کبیر ملا علی قاریؒ (١٠١٤ھ) نے عذاب قبر کے داخل عقائد ہونے میں اسی اصول سے استدلال کیا ہے۔

فلا یخفی ان المعتبر فی العقائد ھو الادلة الیقینیة و احادیث الاحاد لو ثبتت انما تکون ظنیة اللھم الا اذا تعددت طرقه بحیث صار متواتراً معنویاً فحینئذٍ قد یکون قطعیاً. (شرح فقه اکبر ص ۱۲۲)

ترجمہ: ''یہ بات مخفی نہ رہے کہ عقائد کے باب میں دلائل یقینیہ ہی درکار ہیں اور اخبار احاد اگر صحت کے درجے کو پہنچیں پھر بھی وہ ظنی رہتی ہیں۔ ہاں اگر اس کے کئی طرق مل جائیں یہاں تک کہ معنوی تواتر کو پہنچ جائیں تو اس صورت میں یہ موقف بھی قطعی قرار پائے گا۔''

اب تیرھویں صدی کے جلیل القدر عالم علامہ عبدالعزیز فرہاروی صاحب النبراس سے بھی اس کی تائید لے لیں، آپ شرح شرح العقائد میں ایک بحث میں لکھتے ہیں:۔

واما فی الثانی فلان الحکم بعدم کفایة الظن فی الاعتقادیات لیس علی اطلاقه وذلک لانا نجد علماء السنة سلفھم و خلفھم یذکرون فی کتب العقائد مسائل ... کتفضیل الملک علی الانبیاء او بالعکس وان افضل الانبیاء آدم و ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰؑ وان افضل الصحابة العشرة المبشرةثم اھل بدر ثم احد ثم الشجرة وان الخلافة ثلثون سنة مستدلین بخبرالواحد وان المجتھدیخطیِ و یصیب خلافاًلبعضھم...فعلم ان عدم جواز الظن فی العقائد انماھو حیث یطلب الیقین کا لتوحید والرسالة واذاکان الظن فاسداً کظن بل وجب ذلک للقطع بان الدلیل قد افاد الظن بکونھاعقائد و لئلا یلزم اھمال کثیر من الاحادیث المرویة فی الاعتقادیات و جعل وجودھا کعدمھا کا ....تفصیل لحفی احوال القبر والحشر. (النبراس شرح شرح العقائد ص ۴۸۹)

ترجمہ: ''دوسری صورت میں یہ بات سامنے رہے کہ عقائد میں دلائل ظنیہ کا کافی نہ سمجھا جانا علیٰ الاطلاق نہیں ہے۔ ہم علمائے اہل سنت کے سلف وخلف کو کتب عقائد میں ایسے مسائل ذکر کرتے دیکھتے ہیں۔۔۔ جیسے (۱) فرشتوں اور انبیاء میں سے کون افضل ہیں (۲) انبیاء میں افضل حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ (۳) افضل ترین صحابہ عشرہ مبشرہ ہیں پھر اہل بدر پھر اہل احد پھر اصحاب شجرہ (۴) اور یہ کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ خبر واحد کے استدلال سے تیس سال تک چلی (۵) اور یہ کہ مجتہد کا اجتہاد، خطاء اور صواب دونوں احتمال رکھتا ہے گو اس میں بعض کا

اختلاف ہے...... سو معلوم رہے کہ عقائد میں دلائل ظنیہ کا عدم اعتبار صرف انہی امور میں ہے جہاں قطع ویقین مطلوب ہو جیسے توحید و رسالت۔'' الخ

وہ چند اصول جن سے عوام کسی حد تک حق تک پہنچ سکیں

علم ایک ایسی شرافت ہوتی ہے جو حق بات کہتے واضح ہو جاتی ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف اظہارِ حق ہونا چاہیئے نہ کہ ضد بندی اور تنگ بندی۔ وقت کا ضیاع اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ انسان اس بات کا جواب دے جس کا جواب پہلے کئی دفعہ دیا جا چکا ہے۔ سنی شیعہ اختلافات بارہ سو سال سے چلے آ رہے ہیں۔ اور ہر اختلاف میں وہی چند باتیں ہیں جو بارہا کہی گئیں اور ہر دفعہ دہرائی گئی ہیں۔ نئے لکھنے والے پہلے لکھنے والے سے ہی مواد لیتے ہیں اور دنیا ایک نئے مصنف سے آشنا ہو جاتی ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ میری باتوں کا اب تک جواب نہیں آیا اور بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نئی بات تو کوئی کہی نہیں جواب کس بات کا مانگ رہا ہے؟

جن باتوں پر کئی دفعہ سوال و جواب ہو چکے انہیں پھر سے معرضِ بحث میں لانا اور آخر تک کوئی بات نہ کہہ پانا انہی لوگوں کا کام ہے جو فرقہ بندی اور ضد بندی کے لئے لکھتے ہیں ورنہ ان کو پرانی باتوں کو دہرانے کی ضرورت نہ تھی جن کے جوابات بارہا دیئے جا چکے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اسے تنگ بندی سے زیادہ کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ سنجیدہ لوگ اب ان تنگ بندیوں سے ذرہ برابر اثر نہیں لیتے اسی پرانی ڈگر پر سرگودھا کے ایک شیعہ مصنف نے تجلیات صداقت بجواب آفتاب ہدایت لکھی اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں لکھ پایا ۔جس کا جواب علماء اہل سنت پہلے نہ دے چکے ہوں انہی پرانی باتوں کو دھرانا ایک تنگ بندی کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اہل دانش کے ہاں یہ کوئی علمی خدمت نہیں ہے۔

ہم وزن بیت کے طور پر اس کا جواب نہیں لکھ رہے نہ یہ اہل بیت کا طریقہ رہا ہے ہم اپنے قارئین کو چند بنیادی اصول نئے سرے سے سمجھاتے ہیں جن پر غور کرنے سے شیعہ مذہب کا پورا ملبہ خود ان کے اوپر ہی آ گرتا ہے۔

ا۔ ہر حوالے پر کتاب کا درجہ بھی سامنے رکھا جائے

یہ لوگ اہل سنت والجماعت پر ان کی انہی کتابوں سے حملہ کرتے ہیں۔ جن میں رطب ویابس دونوں طرح کی باتیں ملی ہوتی ہیں۔ علماء اہل سنت تعلیم وتدریس میں انہیں نکھارتے ہیں ان کی غلط باتوں کو پوری قوت دلائل سے واضح کرتے ہیں۔

ڈھکو رافضی بھی تسلیم کرتا ہے کہ اہل سنت کی بعض کتابوں میں رطب ویابس دونوں طرح کی روایات پائی جاتی

ہیں۔اور وہ اپنی مسند تدریس میں یہ سب باتیں نکھارتے ہیں۔ڈھکو لکھتا ہے۔

مخالفین اسلام بانی اسلام اور تعلیمات اسلام پر جو ناپاک حملے کرتے رہے ہیں ان کا مصدر و ماخذ صرف اور صرف اہل سنت والجماعت کی وہ کتابیں ہیں جو ہر قسم کے رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔(تجلیات ص ۱۰)

کیا عقائد ایسی روایات اور ایسی کتابوں سے ثابت ہو سکتے ہیں؟ یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عقاید ہرگز اس قسم کی روایات سے ثابت نہیں ہوتے۔

۲۔اونچی کتابوں کے بھی بعض حوالے معتبر نہیں ہوتے

اہل سنت کی کتابوں میں بعض علماء کے ایسے اقوال بھی ملتے ہیں جنہیں محققین اہل سنت نے قبول نہیں کیا اور نہ ان کے ہاں ان کی بیان کردہ باتوں کو مذھب اہل سنت قرار دیا گیا ہے۔ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس اختلاف سے ان کے ہاں اس اختلاف کا وزن ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں یہ کفر و اسلام کا اختلاف ہے یا اجتہاد کا یا وقائع یا یہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔

رافضی یہ بھی تسلیم کرتا ہے۔

بعض علماء کا نظریہ پورے مذہب کا نہیں ہو سکتا (تجلیات ص ۳۳)

معلوم نہیں پھر کس برتے پر اس نے بعض دور کی کتابوں سے شاذ اقوال لے کر صحابہ کے قرآن پاک سے ثابت ہونے والے قطعی فضائل کو چیلنج کیا ہے۔

تحقیق کا تقاضا ہے کہ ہمارے مخالفین صرف ان روایات سے استدلال کریں جنہیں ہم اپنے ہاں مختار کئے ہوئے ہوں۔کسی استدلال میں صرف کتاب کا نام کافی نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر ایک مقام پر صحیح بخاری کی ایک روایت پر محدث اسمٰعیلی کا اشکال اس طرح نقل کرتے ہیں:

وقد استشکل الا سمٰعیلی ھذا الحدیث من اصلہ و طعن فی صحتہ

(فتح الباری ج ۸ ص ۳۸۴)

کیا یہ ایک اونچی کتاب کی مختلف فیہ بات نہیں؟ معلوم ہوا کہ اونچی کتابوں کے بھی کئی حوالے بعض دوسری اصولی وجوہ سے کمزور ہو جاتے ہیں اور وہ اس لائق نہیں رہتے کہ انہیں مسائل قطعیہ و یقینیہ میں قبول کیا جا سکے۔

خود صحیح بخاری میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

واختلفوا فی صحۃ ھذا الخبر (صحیح بخاری ۲ ص ۱۰۰۰ کتاب الفرائض)

سو یاد رکھئے کہ ان کتابوں کی روایات میں بھی کبھی مزید جانچ پڑتال کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔صرف صحیح بخاری

کا نام ہونا کافی نہیں۔

میرے کہنے پہ کیا ہے آزمائے جس کا جی چاہے

مذہب اہل سنت پر کئے گئے اعتراضات کو پادر ہوا ہوتے دیکھئے

آیئے اب ہم بنیادی اصولوں کی روشنی میں رافضی مذکور کے قائم کردہ کچھ الزامات کا جائزہ لیں جو اس نے صحابہ کرام اہل بیت اور مذہب اہل سنت پر قائم کئے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے انہیں تجلیات صداقت کا نام دیا ہے۔

۳۔جو بات اصول دین پر پوری نہ اترے وہ قبول نہ کی جائے

حافظ ابن جوزی (۵۹۷ھ) نے روایات کے رد و قبول میں محدثین کے کچھ اصول پیش کئے ان پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ محدثین دین کے فطری تقاضوں کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلے ہیں۔جس بات کو انہوں نے مبدء حسی کے بغیر پایا اس کا راوی کتنا ثقہ کیوں نہ ہو انہوں نے اسے رد کر دیا۔اسی طرح جس حدیث کو انہوں نے قرآن کریم یا سنت متواترہ کے خلاف پایا انہوں نے اسے اصولاً رد کر دیا۔

قال ابن الجوزی:۔

کل حدیث رایتہ یخالف العقول اویناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلایتکلف اعتبارہ ...اویکون مما ید فعہ الحس والمشاھدۃ اومبائنا لنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ اوالاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذلک التاویل

(فتح المغیث ص ۱۱۴)

ترجمہ: ''ہر حدیث جسے تم عقل سلیم کے خلاف دیکھو یا وہ اصول سے ٹکرائے تو جانو کہ یہ موضوع ہے اس کے اعتبار کا تکلف نہ کیا جائے۔یا وہ ایسی روایت ہو کہ حس و مشاہدات اسے قبول نہ کریں یا وہ نص قرآن و سنت کے خلاف ہو کہ اس میں کسی تاویل کو راہ نہ دی جا سکے۔''

جب اس طرح کی روایت میں تاویل کے سب رستے رک جائیں تو اس کے راویوں کو غلطی کرتے ماننا اصول کو نظر انداز کرنے کی بجائے کیا بہتر ہوگا۔امام نووی (۶۷۶ھ) علامہ مازری سے ایک ایسے موقع پر یہ الفاظ نقل کرتے ہیں

اذاانسدت طرق تاویلھا نسبنا الکذب الیٰ رواتھا۔

ترجمہ: ''جب اس روایت میں تاویل کے سب رستے بند دکھائی دیں تو ہم اس کے راویوں کی طرف خلاف واقع کہنے کی نسبت کریں گے (غلط عقیدہ اختیار نہ کریں گے)۔''

۴۔ مستند کتابوں میں بھی بعض کمزور باتیں مل جاتی ہیں

صحیح بخاری میں ہے:۔

خلق اللّٰہ آدم وطوله ستون ذراعاً ...... فلم یزل الخلق ینقص حتیٰ الآن.

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۸)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ساٹھ گز لمبا قد دیا پھر یہ قامت کم ہوتی گئی اور اب موجودہ صورت یہ ہے۔''

بایں ہمہ محدثین اس میں درایۃً غور کرنے سے غافل نہیں رہے اور راویوں کی ثقاہت انہیں اس کی درایت سے بے پرواہ نہیں کر سکی اس حدیث پر حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

ویشکل علیٰ هذا مایو جد الآن من آثار الامم السالفة کد یا ر ثمود فان مساکنهم تدل علیٰ ان قاماتهم لم تکن مفرطة الطول علیٰ حسب ما تقتضیه الترتیب السابق ولا شک ان عهد هم قدیم ...ولم تظهرلی الآن مایزیل هذاالاشکال (فتح الباری ج ۱۶ ص ۲۶۰)

ترجمہ: ''اس روایت پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ امم سابقہ کے جو آثار ہمیں اب ملتے ہیں جیسا کہ قوم ثمود کی بستیوں کے آثار قدیمہ وہ بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کے قد اتنے لمبے نہ تھے جیسا کہ یہ پرانی ترتیب بتلاتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی یہ ایک پرانی قوم ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ملی جو اس شک کو دور کر سکے۔''

اس سے پتہ چلا کہ مستند کتابوں کی روایات میں بھی بعض اوقات غور کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ شرافتِ علم تقاضا کرتی ہے کہ محض کتاب کے نام سے دوسروں پر حجت نہ کی جائے دیکھنا چاہیئے کہ ان کے ہاں اس باب میں قول مختار کیا ہے اور انہوں نے اپنی کتب عقائد میں اس بات کو کس طرح جگہ دی ہے یا ان کے ہاں اس باب میں اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہے۔

جماعت اہلحدیث کی طرف سے بھی اس کی تائید

ہمارے یہ دوست بعض اوقات صحیح بخاری کی کسی روایت پر انگلی رکھتے ہی تڑپ جاتے ہیں' ان کے اطمینان کے لیے ہم یہ بات سامنے لا رہے ہیں کہ قادیانیوں سے پردہ ہٹانے کے لیے خود انہیں بھی اس راہ میں چلنا پڑا ہے۔

۱۔ عموماً روایات میں الٹ پلٹ ہو جایا کرتے ہیں اور خود صحیح بخاری کی بعض احادیث میں بھی ایسا مواد موجود ہے چنانچہ ہم حدیث لا تفضلونی علیٰ موسیٰ نقل کر آئے ہیں کسی نے لاتفضلونی کہا کسی راوی نے لاتخیرونی کہا کسی نے موسیٰ کے علاوہ دیگر انبیاء کو بھی اس روایت کی تحقیق میں شامل کیا۔ لاتخیر وا بین انبیاء اللّٰہ۔

(محمدیہ پاکٹ بک ص ۶۰۲)

۲۔ اب اگر کوئی کہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت کی رو سے تقدیر بنانے والے حضورؐ اکرم ہیں تو اسے کہا جائے گا کہ ایسا نہیں تقدیریں صرف حکم الٰہی سے بنتی ہیں۔

عن النبی ﷺ قال لم یات ابن آدم النذر بشئی لم یکن قد قدر ته ولکن یلقیه القدروقد قدرته له استخرج به من البخیل . (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۷۸)

ترجمہ: ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا نذر ابنِ آدم کو کچھ نہیں دیتی جو میں نے اس کے لئے مقدر نہ کیا ہو لیکن تقدیر اس سے مال نکلواتی ہے اور میں اس کی تقدیر بنا چکا اس طرح میں بخیل سے مال نکلواتا ہوں۔''

ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اپنی طرف سے نہ کہی ہوگی۔ یہ تو کھلا شرک ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں سند سے یہ لفظ بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ قال اللّٰہ تعالیٰ (کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کہا ہے) صحیح مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ تقدیریں میں بناتا ہوں۔

ہم شرح صدر سے کہتے ہیں کہ ان چند اصولوں کی روشنی میں ڈھگو مذکور کے اہل سنت پر کیے گئے جملہ ایرادات از خود ھباء منثور ہو جاتے ہیں۔

۱۔ بیشتر کتابوں کی اصل عربی عبارات نہیں لکھتا زیادہ انحصار اور کتابوں پر کرتا ہے۔ اصل ماخذ سے حوالہ نہیں دیتا۔ نہ اس نے وہ پڑھے ہوئے ہیں۔

ڈھگو کا خاص انداز نقل

۲۔ مختلف بیانات میں فصل قائم نہیں کرتا ان میں فاصلے نہیں رکھتا تا کہ پڑھنے والا انہیں ایک مسلسل عبارت سمجھے مثلاً اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس کی لمبائی ۶۰ گز بنائی۔ اس میں رافضی یہ بتا رہا ہے کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ خدا معاذ اللہ ساٹھ گز لمبا ہے۔ حالانکہ یہ بات حضرت آدم کے بارے میں کہی گئی تھی نہ کہ خدا کے بارے میں۔

ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کے لئے لیس کمثله شی کا عقیدہ رکھتا ہے۔ مسلمان اس کے لئے نہ کسی جسم کے قائل ہیں اور نہ کسی قد کے نہ کسی حد کے نہ کسی مکان کے نہ کسی جہت کے۔ ہم آگے جا کر اس کی وضاحت کریں گے کہ ان اللّٰہ خلق آدم علی صورته میں اللہ تعالیٰ کے لئے آدم کا قد بتلانا مقصود نہیں ہے۔ زمین پر اسے خلیفہ بنانا اور پوری دنیا کو اس

کے لئے مسخر کرتا ہے۔ صورت حال مراد ہے صورت جسم مراد نہیں۔ ساٹھ گز والی روایت ایک دوسری عبارت ہے۔ جس میں خدا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ہم یہاں صرف یہ بتلا رہے ہیں کہ اس رافضی نے علمی شرافت سے ہٹ کر سواد اعظم کے عقائد کو بچوں کے کھیل کے طور پر بیان کیا ہے وہ مختلف عبارات میں فاصلے نہیں دیتا، یہ کوئی علمی خدمت نہیں اس دھوکہ بندی میں کئی لٹ جاتے ہیں کیا دھوکہ دیئے بغیر یہ لوگ اپنے مسلک کی خدمت نہیں کر سکتے۔ یہ طریق کار راستباز لوگوں کا نہیں ہوتا۔

آگے دیکھئے مصنف کا نام لئے بغیر اور یہ بتائے بغیر کہ وہ یہ بات کہاں سے لے رہا ہے رافضی لکھتا ہے:

خدا کی آنکھیں دکھنے آئیں تو فرشتوں نے بیمار پرسی کی (یہ آنکھیں کیوں دکھنے پر آئیں اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ طوفان نوح پر اتنا رویا کہ آنکھیں جوش پر آگئیں (کتاب الملل والنحل ص ۷۸)

اہل سنت عوام نے کیا کبھی اپنے خطیبوں کو اپنی مساجد میں ان عقائد کو بیان کرتے دیکھا یا سنا؟ کبھی نہیں یہ ان کا عقیدہ ہو تو وہ اسے بیان کریں یہ ان پر محض ایک الزام ہے اور ایک بہتان ہے۔

رہا یہ کہ کیا خدا کی آنکھیں ہیں؟ تو ان کا ذکر تو قرآن کریم میں بھی ہے:۔

واصنع الفلک باعیننا. (پ ۱۲ ھود ۳۷. پ ۱۸ المومنون ۲۷)

ولتصنع علیٰ عینی. (پ ۱۶ . طه ۳۹)

وہ رونے والی آنکھیں نہیں ہیں جس طرح اللہ کی ذات بے مثال اس کی صفات بھی بے مثال ہیں۔

لیکن آیات صفات میں لیس کمثله شئی کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ جس طرح ہم خدا کے لئے اس کی صفات کا اقرار کرتے ہیں ان الفاظ سے ان کے ظاہری معنی کی نفی بھی ضروری جانتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اقرار صفات کے ساتھ ان کے ظاہری معنی جن میں وہ الفاظ مخلوق کے لیے استعمال ہوئے ان کی نفی بھی کی جائے۔

فصل پنجم

عقائد اہل سنت کی غلط تصویر اور اس کا تحقیقی جائزہ

الحمدللہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

ڈھکو رافضی نے حق گو مولانا دبیر کے ذمہ بہت سے ایسے شرمناک عقائد لگائے ہیں کہ انہیں نقل کرتے بھی گھن آتی ہے۔ مثلاً

۱۔ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ خدا (معاذ اللہ) ساٹھ گز لمبا ہے۔ (تجلیات صداقت ص ۱۲)

کیا اب تک آپ نے اہل سنت کی کسی مسجد میں اس عقیدہ کی کبھی تبلیغ سنی ہے؟

ساٹھ گز لمبائی کی بات حضرت آدمؑ کے بارے میں کہی جا رہی تھی۔ ڈھکو رافضی نے اسے (آدم کی صورت کو) خدا سے جوڑ کر اہل سنت کا عقیدہ بنا دیا کہ یہ خدا کو ساٹھ گز لمبا جانتے ہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔ ہم مقدمۃ الکتاب میں اس کا کچھ ذکر کر آئے ہیں یہاں ڈھکو رافضی کی دی گئی پوری تصویر پر خط انکار کھینچنا پیش نظر ہے اس لیے ہم یہاں اس کی کچھ اور تفصیل کیے دیتے ہیں۔

ان اللہ خلق ادم علی صورته سے استدلال کر کے اپنے مدلول کو اہل سنت کا عقیدہ کہنا علم و شرافت سے ایک کھلا تصادم ہے اور اللہ رب العزت کے حضور ایک نہایت شرمناک جسارت ہے۔ الزامات سے اہل سنت اور شیعہ اختلافات کی تصویر کشی کسی فکری تناؤ کو سامنے نہیں لا سکتی اور نہ کسی پیرائے سے کسی فرقہ وارانہ آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے۔

یہ ساری کارروائی ڈھکو نے صرف ایک جوش انتقام میں کی ہے۔ مولانا دبیر نے آفتاب ہدایت میں اصول کافی کے حوالے سے یہ بات لکھی تھی کہ شیعوں کے ہاں اصل قرآن ستر گز لمبا ہے۔ ڈھکو کو چاہیے تھا کہ اس روایت کا اقرار یا انکار کرتا۔ یہ اس نے کیا جواب دیا۔ تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو۔ اصول کافی میں تلاش کرنے والے کو اب بھی جلد ۲ صفحہ ۶۷۱ پر یہ ستر گز والی روایت مل جائے گی مگر اہل سنت کے کسی مکتب فکر میں آپ کو خدا کے ساٹھ گز لمبا ہونے کا عقیدہ ہرگز نہ ملے گا۔

اہل سنت محدثین ان اللہ خلق ادم علی صورته میں کبھی اس بات کے قائل نہیں رہے کہ اس حدیث کی

رُو سے خدا ایک انسانی صورت رکھتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی شان تسخیر میں اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ تاہم ادم کا اپنا قد اگر ساٹھ گز بھی ہوتو یہ کوئی کفر کی بات نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اسے غلط کہہ سکیں گے لیکن افسوس کہ اثناعشری محدث محمد بن یعقوب الکلینی نے کھلے طور پر حضرت آدم کی طرف کفر کی نسبت کی ہے۔ شیعہ نے جو تین اصول کفر بتائے ہیں ان کے ہاں ان میں سے ایک حضرت آدم میں بھی پایا گیا ہے۔ حضرت آدم سے معاذ اللہ کفر کیسے ثابت ہوسکتا ہے۔ افسوس کہ اس بات کی نسبت اس نے حضرت امام جعفر صادق کی طرف کردی ہے۔

قال ابو عبداللّٰہ علیہ السلام اصول الکفر ثلثة الحرص والا ستکبار والحسد. فاماالحرص فان آدم حین نھی عن الشجرة حمله الحرص علیٰ ان یاکل منھاو اما الاستکبار فابلیس حیث امر بالسجود لأدم فابیٰ واما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدھما صاحبه. (اصول کافی جلدص ۵۱۷۔ شرح الکافی جلد۴ حصہ۲ص ۱۲۳)

ترجمہ: ''حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا' کفر کے اصول تین ہیں (۱) حرص (۲) استکبار اور (۳) حسد۔ حرص آدم میں پائی گئی' تکبر ابلیس میں پایا گیا اور حسد حضرت آدم کے دو بیٹوں میں آیا' جب ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔''

یہ فیصلہ قارئین کریں کہ یہ بات سخت ہے یا حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ گز ہونے کی روایت زیادہ موجب دہشت ہے۔ پھر اس ابہام سے ان کے ہاں خدا کے ساٹھ گز لمبا ہونے کا تصور کتنا بچگانہ کھیل ہے جو یہ ڈھ گو رافضی کھیل رہا ہے۔ پھر اثناعشریوں نے یہ صرف حضرت آدم کی ہی توہین نہیں کی کہ ان میں کفر کی جڑ ثابت کی' فرشتوں کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ کچھ ایسا ہی الجھا پڑا ہے۔

فرشتے بالاتفاق معصوم مخلوق ہیں۔ قرآن کریم میں ان کی شان میں وارد ہے:

لایعصون اللّٰہ ما امر ھم و یفعلون مایؤمرون. (پ ۲۸ التحریم)

ترجمہ: ''یہ کبھی حکم الٰہی کے خلاف نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔''

لیکن آپ دیکھیں کہ شیعوں کے فرشتے کیسے فرشتے ہیں جو حضرت امام حسینؓ کی میدان کربلا میں مدد کے لئے تیاری ہی کرتے رہ گئے کربلا نہ پہنچ سکے اور ظالموں نے سیدنا حضرت حسینؓ کو شہید کر ڈالا۔

ملا محمد بن یعقوب کلینی اصول کافی کتاب الحجہ کے باب ۶۱ میں لکھتا ہے۔

ان الملئكة سألت اللّٰہ فی نصرته فاذن لها فمكثت تستعد للقتال وتناهب لذلک حتی قتل فنزلت وقد انقطعت مدته وقتل علیه السلام فقالت الملئكة یارب اذنت لنا فی الانحدار واذنت لنا فی نصرته فانحدرنا و قد قبضته فاوحی اللّٰہ الیھم...... الحدیث.

ترجمہ: فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے امام حسین کی (کربلا میں) مدد کی اجازت مانگی اللہ نے انھیں اجازت دی وہ فرشتے کچھ عرصہ جنگ کی تیاری کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت امام قتل کردیے گئے وہ فرشتے اترے اور آپ کی مدت عمر پوری ہوچکی تھی۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی اے رب تو نے ہمیں اترنے کی اجازت دی اور حضرت حسین کی مدد کا بھی اذن فرمایا اور آپ کی روح قبض ہو چکی تھی اللہ تعالیٰ نے انھیں کہا...... الحدیث (الصافی شرح الکافی ملا خلیل قزوینی جلد۲ص ۳۸۴)

خدا کا جواب اس کے ص ۲۳۵ پر پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین کو اختیار دیا تھا کہ آپ دشمنوں پر مدد چاہتے ہیں یا مرگ اور میری ملاقات؟ آپ نے اللہ تعالیٰ سے ملنے کو اختیار فرمایا سو فرشتے آگے کربلا تک جا نہ سکے۔ فرشتے کربلا میں جانے کی اجازت ملنے پر رکے کیوں رہے؟ وہ جنگ کی کچھ تیاری میں لگے رہے ملا خلیل قزوینی اسے اس طرح لکھتا ہے۔

ماندند در آسمان مستعد مے شدند برائے جنگ ویراق گیری مے کردند برائے آں جنگ تا وقتیکہ مقتول شد پس
فرود آمدند وحال آنکہ بہ تحقیق ہماں دم بریدہ شدہ بود عمر واو درا کشتہ شدہ بود وہ فرشتے آسمان میں ہی رکے رہے وہ جنگ
کی مشقیں کرتے رہے اور اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے ڈنڈ نکالتے رہے یہاں تک کہ حضرت امام شہید ہوگئے پھر وہ
فرشتے اترے اور تحقیق یہی ہے کہ حضرت امام حسین تو اسی وقت شہید ہو چکے تھے۔

ممکن ہے ہمارے قارئین یہاں سوچیں کہ جنگ بدر میں فرشتوں کو اترنے سے پہلے تیاری کی ضرورت کیوں محسوس نہ ہوئی اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انھیں شکست کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور یہاں فرشتوں کو خطرہ تھا کہ کہیں حضرت حسین کے ساتھ ہمیں بھی شہید نہ ہونا پڑے اس لیے وہ ڈنڈ پیلنے لگے اور جنگی مشقیں کرنے لگے ہوں گے ہم یہاں کچھ نہیں کہہ سکتے ان روایتوں کے اسرار وہی جانیں جنھوں نے یہ روایتیں وضع یا روایت کی ہیں۔

قارئین کرام غور فرمائیں بھلا اس قسم کی باتوں اور طعن وتشنیع سے کبھی سنی شیعہ اختلافات کے فاصلے ناپے جاسکتے ہیں؟ نہیں علم کی شرافت تقاضا کرتی ہے کہ ان دونوں کو ایسی جزئیات سے قطع نظر اصولاً ایک دوسرے کے قریب کیا جائے۔ نہایت افسوس ہے کہ ان کا ایک ڈھگو اپنی اس غلط چال سے اس خلیج کو اور وسیع کرتے پایا گیا۔ اور وہ اسے دین وملت کی بڑی خدمت سمجھتا رہا۔ آپ ہی فیصلہ کریں کہ کیا یہ واقعی اہل سنت عقائد کی کوئی تصویر ہے یا صرف اسے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اور اپنی بے بسی پر پردہ ڈالنے کے لئے قوم میں تفرقہ ڈالنے کی ایک مزید کارروائی کی ہے۔

پھر آگے اہل سنت کے عقیدہ شان رسالت ﷺ پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بی بی عائشہؓ کو حبشیوں کا کھیل دکھایا۔"

(بخاری مترجم کتاب العیدین)

(پ۴ص۴۷ مصری۲ص۹۶ھکذا فی صحیح المسلم ج ۱ ص۲۹۲ص۱۳)

پھر یہ بھی لکھتا ہے:

"آنجناب کھڑے ہو کر پیشاب کیا کرتے تھے۔" (بخاری مترجم پ۱ص۸۹)

"وہ اسے اس طرح لکھ رہا ہے کہ گویا یہ کسی ایک مجبوری کا واقعہ نہیں تھا بلکہ (معاذ اللہ) آپ کی یہ ایک عام عادت تھی۔"

اور پھر یہ بھی لکھتا ہے۔

امام زہری کہتے ہیں' اسلام میں پہلے پہل عشق نے جو قدم رکھا وہ رسول اللہ کا عشق جناب عائشہ سے تھا۔ اس وجہ سے امام مسروق جناب عائشہؓ کو حبیبہ رسول کہا کرتے تھے۔ (الجواب الکافی لابن القیم ص۱۶۴)

مسجد فضیح میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں شراب کا پیالہ پیش کیا گیا جو آپ پی گئے۔ اسی لیے اسے مسجد فضیح کہا جاتا ہے۔ (جذب القلوب ص۱۹۱ طبع کلکتہ طبع ۱۲۶۲ھ) استغفر اللہ العظیم۔

یہاں بھی رافضی کی جرأت ملاحظہ ہو۔

۱۔ کتابوں کی اصل عبارات نہیں لکھیں۔ الجواب الکافی عربی میں ہے اور جذب القلوب فارسی میں۔ یہاں نہ عربی عبارت ہے نہ فارسی۔ پھر آگے تو یہ لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں اس نے اسے یکسر چھوڑ دیا ہے تا کہ اس کا الزام درست رہے۔ پھر دیکھئے کہ حضرت ام المومنین کے بغض میں اس نے حضور اکرمؐ پر بھی غلط چھینٹا گرانے سے دریغ نہیں کیا۔ حضورؐ کے لیے محبت کا لفظ وارد تھا۔ اس نے اسے عشق سے بدل دیا۔ حالانکہ حضورؐ زندگی بھر کبھی یہ لفظ اپنی زبان پر نہ لائے تھے۔

۲۔ ابن قیم جو آٹھویں صدی میں ہوا ہے' وہ مسروق (۶۳ھ) اور امام زہری (۱۲۴ھ) کی یہ بات کہاں سے لے رہا ہے۔ رافضی نے اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ جذب القلوب کے مصنف (۱۰۵۲ھ) نے یہ پہلی صدی کی بات کہاں سے لی اس پر بھی یہ رافضی کوئی سند پیش نہیں کر رہا۔ ہاں ھکذا فی صحیح المسلم کے الفاظ بے شک اس کے علمی نوادرات میں سے ہیں اور جذب القلوب کی روایت میں جو کمزوری ہے وہ خود مصنف نے اسے آگے ذکر کر دی ہے۔

توحید اہل سنت کا نقشہ رافضی نے یہ پیش کیا ہے

اس رافضی نے صفحہ نمبر۱۲ پر مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۳۹۷ سے توحید اہل سنت کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ ان کے ہاں خدا العیاذ باللہ ساٹھ گز لمبا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا اس کی لمبائی ۶۰ گز لمبی بنائی۔

یہ ساٹھ گز لمبائی کس کی بتائی گئی ہے؟ حضرت آدمؑ کی نہ کہ یہ لمبائی (العیاذ باللہ) خدا کی ہے۔ لیکن رافضی نے اسے جس استہزائی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس سے وہ یہ سمجھا رہا ہے کہ اہل سنت کے ہاں معاذ اللہ خدا کا ایک جسم ہے اور وہ اس کے ساٹھ گز طول کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔

حقیقت حال

یہاں ان اللہ خلق آدمؑ علی صورتہ میں صورت کا لفظ صفت کے معنی میں ہے۔ جس طرح ہم کہیں صورت مسئلہ یہ ہے کہ یہاں صورت کے لفظ سے کسی جسم کی تشکیل نہیں کی جا رہی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مادی مخلوق پر وہ جمادات ہوں یا نباتات یا حیوانات انسان کو تسخیر بخشی ہے۔ سخر لکم مافی الارض جمیعاً۔

یہ صورت اس کی اپنی صفت ہے۔ آدم پر اس نے اس کا پرتو ڈالا۔ انسان اس پر اس کا خلیفہ ٹھہرا۔ انسان کیا ہے؟ یہ زمین پر بقدر طاقت بشری اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے یہاں صورۃ صفت کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی جسم ہے نہ اس کی کوئی جسمانی صورت ہے۔ لیس کمثلہ شئی کے قرآنی ارشاد نے ہم کو اس سوچ سے بالکل فارغ کر دیا ہے کہ اس پر کسی دوسرے قد کو تشبیہ دی جائے۔ اس سے خدا کے ساٹھ گز ہونے کا الہام ایک شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ اس حدیث میں ساٹھ گز قد آدم کا بتایا گیا ہے۔ رافضی اگر یہ پوری حدیث ہی نقل کر دیتا تو بات واضح ہو جاتی کہ اس میں ساٹھ گز قد کس کا بتایا گیا ہے۔ حضورؐ نے اس روایت کی رُو سے فرمایا تھا:۔

اللہ نے آدم کو اپنی صورت (صفت) پر پیدا فرمایا۔ آدم کا قد ساٹھ گز تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کی تو آپ کو کہا تم جاؤ اور ان لوگوں کو سلام کہو وہ بیٹھے فرشتے تھے سنو وہ کیا جواب دیتے ہیں یہ تیرا اور تیری اولاد کا سلام ہے۔ آدم وہاں گئے اور انہیں السلام علیکم کہا انہوں نے کہا السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ آپؐ نے صرف سلام فرمایا انہوں نے ورحمۃ اللہ کا اضافہ فرمایا۔ آپؐ نے یہ بھی کہا ہر شخص جنت میں اس قد سے داخل ہوگا۔ پھر آدمی کا قد چھوٹا ہوتا گیا۔ اور یہ کمی اب تک ہوتی آئی ہے۔

اس حدیث میں اور بھی کئی اشکالات ہیں اور اہل سنت کے ہاں یہ ایک مبہم روایت سمجھی گئی ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے رافضی نے ساٹھ گز سے اپنے ستر گز کے قرآن کے لئے راہ پیدا کی ہے۔ اب صرف دس گز باقی رہے معلوم نہیں شاید اسی سے انہوں نے عاشورا کی تقریب اخذ کی ہو۔

رافضی کی ایک دوسری غلط بیانی

کنزالعمال سے ایک روایت بدوں سند نقل کرتے وقت اس رافضی نے بیٹھنے کا لفظ اس میں بڑھا دیا ہے۔ بیٹھنے پر جو زین چرچراتی ہے تو کیا یہ صرف سوار کے وزن سے ایسا ہوتا ہے یا بدوں عمل کے وہ صرف اس کی ہیبت سے بھی کانپ سکتی ہے۔ عرش الٰہی اللہ رب العزت کی ہیبت سے کانپتا ہے۔ جس طرح فرشتے اس کے رعب وجلال سے سمٹتے ہیں اور بادل اس کی حمد سے گرجتا ہے اور بجلیاں کڑکتی ہیں اور پھر وہ جس پر چاہتا ہے انہیں ڈال دیتا ہے۔

ویسبح الرعد بحمده والملئکۃ من خیفته ویرسل الصواعق فیصیب بها من یشاء. (پ۱۳ الرعد ۱۳)

ترجمہ: ”اور گرجنے والا اس کی حمد پڑھتا ہے اور فرشتے اس کے ڈر سے تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھیجتا ہے کڑک بجلیوں کی اور پھر ڈال دیتا ہے اس کو جس پر چاہے۔“

العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ فوق العرش ہونے میں عرش کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تو اس طرح نہیں جیسے کوئی میز پر بیٹھا یا تخت پر بیٹھا اس سے متصل ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ وہ عرش پر بدوں اتصال کے ہے فوق العرش ہونے میں وہ عرش کا محتاج نہیں (کنزالعمال ج۱ ص۳۳۴) میں یہ روایت ملاحظہ ہو۔

اس میں اس کے بیٹھنے کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ ڈھکو کا اپنا اضافہ ہے۔

ان اللّٰہ فوق عرشه وعرشه علیٰ سماواته وارضه مثل قبة وانّه لیئط به اطیط الرحل بالرکب.

اب رافضی کا ترجمہ حدیث ملاحظہ ہو۔

جب خدا عرش پر بیٹھتا ہے تو وہ اس طرح چرچراتا ہے جیسے نئی زین سوار کے بیٹھنے سے چرچراتی ہے۔

عرش کا کانپنا یا اس کا چرچرانا اس کے رعب وجلال کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اسے اس کے وزن اور بیٹھنے سے جوڑنا یہ ہرگز صحیح نہیں یہ تو مخلوق کی شان ہے۔ قرآن شریف میں یہ ضابطہ دیا گیا ہے۔

لیس کمثله شیء مخلوق میں کسی چیز کو اس کی مثل نہیں کہہ سکتے۔ اطیط الرحل بالراکب میں بھی تشبیہ مطلق اطیط میں ہے بیٹھنے میں نہیں اور اسے بھی (اطیط کو) متشابہات میں سے کہا گیا ہے۔ حدیث میں بیٹھنے کا لفظ سرے سے موجود نہیں ہے۔ یہ ڈھکو کا محض ایک اپنا افتراء ہے۔

اللہ کے لئے اگر قرآن میں ید (ہاتھ) عین (آنکھ) وجہ (چہرہ) کے الفاظ پر ہم بدوں تاویل ایمان رکھ سکتے ہیں تو کیا اس کے لئے قدم کے لفظ میں بھی وہی موقف اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنے عام قارئین کے لئے اللہ رب العزت کی صفات پر علماء دیوبند کا موقف بیان کر دیں پھر آپ فیصلہ کریں کہ یہ رافضی ایک من گھڑت عقیدہ اہل سنت کے ذمہ لگانے میں کس قدر راستباز ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں عقیدہ اہل سنت ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثانی لکھتے ہیں:۔

خدا تعالیٰ کی صفات وافعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ نصوص قرآن وحدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خدا کو حی، سمیع، بصیر، متکلم کہا گیا اور انسان پر بھی یہ الفاظ اطلاق کئے گئے تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوئیں ایک وہ آلہ جسے آنکھ کہتے ہیں اور جو دیکھنے کا مبدأ اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوا مخلوق کو جب بصیر کہا تو یہ مبدء اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوئیں اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کر لیں لیکن یہ ہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا گیا تو یقیناً وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مراد نہیں ہو سکتیں جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار (دیکھنے) کا مبدأ اس کی ذات میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے آگے یہ کہ وہ مبدأ کیا ہے اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ لیس کمثله شیء وهو السمیع البصیر نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبداء وغایت کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء عقل حقائق میں خوض کر کے پریشان ہو (الاعراف ص۲۰۹)

اس سے ہمارے قارئین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ رافضی نے تجلیات صداقت صفحہ ۱۱ پر توحید اہل سنت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سراسر غلط ہے دھوکہ اور فریب ہے۔ اہل سنت کا اصل عقیدہ آپ ابھی ملاحظہ فرما چکے۔

آگے دیکھیں ڈھکو اہل سنت کے عقیدہ رسالت میں بھی اسی راہ پر چلا ہے اس نے یہاں یہ سرخی قائم کی ہے۔

”سنیوں کے ہاں شان رسالت“ اب ہم اس کی بھی ذرا تفصیل کئے دیتے ہیں۔

رافضی نے اہل سنت کے عقیدہ رسالت کا یہ نقشہ کھینچا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ان کے ہاں شان رسالت یہ بیان کی گئی ہے۔ (معاذ اللہ)

چالیس برس تک آنحضرت اپنی قوم کے مذہب کفر پر تھے(تجلیات صداقت ص ۱۲)

رافضی کا جھوٹ ملاحظہ کرنے کے لئے آپ پہلے امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) کی زبان سے اہل سنت کا عقیدہ شان رسالت سن لیں اس کے بعد آپ ان کے اس عقیدے کو دوسری صدی سے مسلسل کریں۔امام فخر الدین رازی ماضل صاحبکم وماغوی پ ۲۷ النجم پر لکھتے ہیں۔

ماضل ای ماکفرولا اقل من ذلک فماغسق.(جلد ۲۸ ص ۲۴۲)

ترجمہ: ''حضورؐ نہ گمراہ ہوئے۔نہ آپ سے کبھی کفر صادر ہوا اور نہ آپ کبھی اس سے کم درجے کی گمراہی میں رہے۔نہ اندھیرے میں۔''

ای ماضل حین اعتزلکم وماتعبدون فی صغره.

ترجمہ: ''جب سے آپ نے اپنی صغرسنی میں تم سے اور تمہارے معبودوں سے کنارہ کشی رکھی۔کبھی کسی غلط راہ پر نہیں چلے۔''

فلم یکن اولاًضالاًولاغاویاً وصار الآن منقذاًمن الضلالةو مرشداً وهادیاً.

ترجمہ: ''آپ (دعوے نبوت سے) پہلے بھی نہ گمراہ رہے نہ کہیں بہکے رہے۔آپ اب (وحی کے بعد) دوسروں کو گمراہی سے نکالنے والے ہوئے اور رشد وہدایت کی راہ بتانے والے ہوئے۔''

آپ آگے یہ بھی لکھتے ہیں:۔

ان اللّٰہ تعالیٰ یصون من یرید ار ساله فی صغره عن الکفر والمعائب القبیحة کالسر قة والزناواعتیاد الکذب.

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ جسے رسالت کی ذمہ داری دیتے ہیں اسے صغرسنی سے ہی کفر اور قبیح برائیوں سے جیسے چوری، زنا اور جھوٹ بچائے رکھتے ہیں۔''

اب اس کے خلاف ڈھ گو کا جھوٹ ملاحظہ ہو وہ کن الفاظ میں یہ الزام گھڑتا ہے۔

''چالیس برس تک آنحضرتؐ اپنی قوم کے مذہب (کفر) پر رہے۔''

رافضی نے بڑی ڈھٹائی سے مذہب کے آگے لفظ کفر بریکٹ میں ڈال دیا ہے اور عوام کو یہ تصور دیا ہے کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ حضور اعلان نبوت سے پہلے معاذ اللہ کفر پر تھے۔حضورؐ کا یہ دعویٰ ضرور تھا کہ آپ ملت ابراہیم پر ہیں لیکن آپ کا ساتھ ساتھ یہ بھی دعویٰ تھا کہ آپ شرک میں ہرگز ملوث نہ ہوئے تھے۔ وما کان من المشرکین۔ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ مشرکین حضرت ابراہیمؑ کے طریقے سے منحرف ہو کر شرک کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔

قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ اعلان کرتا ہے:

ان اولیٰ النّاس بابراهیم للذین اتبعوه وهٰذا النبی والذین آمنوا واللّٰه ولی المؤمنین. ٥ (پ ۳ آل عمران ۶۸)

ترجمہ: ''بے شک لوگوں میں حضرت ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو ان کے پیچھے چلے اور یہ نبی (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والے سب مومنین اس ابراہیمی طریقے پر ہیں اور اللہ ان مومنین کا دوست ہے۔''

اس سے معاذ اللہ حضورؐ کے اپنی قوم کے مذہب پر ہونے کا عقیدہ کشید کرنا اس ڈھ گو کی بدنیتی اور مغالطہ دہی ہے۔جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اہل سنت عقائد کی سب سے پہلی کتاب امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) کی مختصر تالیف فقہ اکبر ہے۔اس میں ان کے اس عقیدے کو دیکھیں:

والانبیاء علیهم السلام کلهم منزهون عن الصغائر والکبائر والکفر و القبائح والفواحش. (ماخوذ از شرح فقه اکبر ص ۶۷)

اس کے بعد امام طحاویؒ کی کتاب العقیدۃ الطحاویہ ہے جو داخل درس ہے۔اس میں حضرت امام طحاوی بھی اہل سنت کا یہ بنیادی عقیدہ لکھتے ہیں:

ونومن بالملئکة والنبیین والکتب المنزلة علی المرسلین ونشهدانهم کانوا علی الحق المبین. (العقیده الطحاویه ص ۱۰)

ہم یہاں دوسرے ہزار سال کے مقتدر علمائے احناف سے حضرت امام اعظم کے اس عقیدے کی مزید تصدیق نقل کرتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے ہزار سال میں تمام اکابر علمائے احناف فقہ اکبر کو واقعی حضرت امام کی تالیف مانتے رہے اور اہل سنت میں سے کسی نے ان کے عصمتِ نبوت کے اس عقیدے سے انحراف نہیں کیا۔

ا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے استاد شیخ احمد ملاجیون (۱۰۷۵ھ) تفسیرات احمدیہ میں لکھتے ہیں:۔

فالحق انه لا خلاف لاحدفی ان نبینا لم یر تکب صغیرةولا کبیرة طرفة عین قبل الوحی وبعده کما ذکره ابوحنیفه فی الفقه الاکبر. (تفسیرات احمدیہ ص ۳۷)

ترجمہ: ''حق یہ ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ہمارے نبی پاک نے وحی سے پہلے اور بعد میں آنکھ جھپکنے کے برابر بھی کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ نہیں کیا۔'' اسے امام ابوحنیفہ نے فقہ اکبر میں بیان کیا ہے۔

۲۔ ضلع مظفر گڑھ (پاکستان) کے آفاقی شہرت کے جید عالم حضرت علامہ عبد العزیز فرہاروی (۱۲۳۹ھ کے بعد وفات) لکھتے ہیں:۔

فالمتوارث من لدن آدم الیٰ نبینا ومولانا اشرف الخلق محمد رسول اللہ ﷺ انه لم یبعث نبی قط اشرک باللہ طرفة عین و علیه نص الامام ابوحنیفة فی الفقه الاکبر. (نبراس علیٰ شرح العقائد ص ۴۵۲)

ترجمہ: "حضرت آدم سے حضرت خاتم جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک یہ عقیدہ متواتر چلا آرہا ہے کہ ایسا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا جس نے آنکھ جھپکنے کے برابر عرصہ میں بھی کسی شرک کا ارتکاب کیا ہو۔"

آپ کی ایک تالیف حزام الکلام بھی ہے اس میں بھی آپ نے ان تمام متکلمین کا رد کیا ہے جو اس کے خلاف گئے ہیں۔

للمتکلمین فیها کلمات غیر مرضیة والمختار عندی انهم معصومون عن وساوس الشیطان و عن الکذب والکبائر عمداً او سهواً قبل النبوة وبعدها.

(حزام الکلام ص ۳۳)

ترجمہ: "بعض متکلمین نے اس میں کچھ ناپسندیدہ باتیں بھی کہی ہیں مگر میرے ہاں مختار وہی ہے کہ سب انبیاء کرام جملہ وساوس شیطانیہ سے اور جھوٹ سے اور کبیرہ گناہوں سے عمداً ہوں یا سہواً، نبوت سے پہلے کے ہوں یا بعد کے، پاک ہیں۔"

رافضی کا اس باب میں دوسرا جھوٹ قصہ غرانیق

الزام: رافضی لکھتا ہے:۔

ایک مرتبہ آپ خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے کہ شیطان نے آپ کی زبان پر بتوں کی تعریف کے یہ اشعار جاری کردیئے۔ جنہیں سن کر کفار خوش ہوگئے۔

تلک الغرانیق العلیٰ ...... وشفاعتهن لترتجیٰ

ترجمہ: "وہ بلند درجہ کے بت ہیں اور ان کی شفاعت کی امیدیں باندھی جاتی ہیں۔"

استغفر اللہ العظیم۔

یہ بات عقلاً اور نقلاً غلط ہے شیطان پیغمبر کی بات میں اپنی بات تو ملا سکتا ہے لیکن وہ اسے پیغمبر کی زبان پر نہیں

لاسکتا یہ ناممکن ہے کہ حضور نے شرک کے یہ کلمات اپنی زبان سے کہے ہوں قرآن کریم میں ہے:

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته فینسخ اللہ مایلقی الشیطان. (پ ۱۷ الحج ۵۲)

ترجمہ: "اور ہم نے تجھ سے پہلے جو بھی رسول یا نبی بھیجا تو اس نے خدا کی بات کہی شیطان نے اس کی بات میں اپنی بات ملادی پھر اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے وہ بات جو شیطان نے بڑھائی اور محکم رکھتا ہے اپنی بات کو اور وہ حکمتوں والا سب خبر رکھتا ہے۔"

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی بات میں شیطان اپنی بات بڑھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی آیات کی حفاظت فرماتے ہیں اور نبی کی زبان سے خلاف حق بات کبھی نہیں نکلتی۔

سو یہ بتوں کی تعریف کی بات ہرگز رسول کی تلاوت میں نہیں آسکتی نہ نماز کے اندر نہ نماز کے باہر اور یہ روایت کسی طرح بھی لائق قبول نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

لایصح لکونه لا یجوز علی النبی ذلک ولا ولایة الشیطان علیه فی النوم۔

(فتح الباری ج ۹ ص ۳۶۹)

ترجمہ: "یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ نبی پر اس طرح شیطان کا تسلط نہیں ہوسکتا اور نہ شیطان نیند میں پیغمبر پر ولایت (قبضہ) پاسکتا ہے۔"

اور آگے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

وماقیل من ان ذلک لسبب القاء الشیطان فی اثناء قراءة رسول اللہ ﷺ لاصحة له عقلاً ولا نقلاً. (فتح الباری ج ۹ ص ۵۹۸)

ترجمہ: اور یہ جو کہا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی تلاوت کے دوران القاء شیطان سے ہوا یہ ہرگز صحیح نہیں نہ عقلاً اور نہ نقلاً۔

علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) اس آیت پر لکھتے ہیں:۔

فاخبر اللہ تعالیٰ فی هذا الآیة ان سنته فی رسله اذا قالوا قولاً زاد الشیطان فیه من قبل نفسه فهذا نص فی ان الشیطان زاده فی قول النبی لا ان النبی قاله

(عمدة القاری ج ۱۹ ص ۲۶)

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے کہ اللہ کی سنت اپنے رسولوں کے بارے میں یہی رہی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بات کہی تو شیطان نے اس میں اپنی طرف سے بات ملادی یہ آیت اس پر نص ہے کہ مذکور واقعہ میں شیطان نے بتوں کی تعریف کے وہ کلمات نبی کی بات میں بڑھائے نہ کہ نبی نے اپنی زبان سے وہ کہے۔ یہ جواب اس مفروضہ پر ہے کہ غرانیق کی وہ روایت صحیح ہو۔ علامہ عینی نے اس روایت کے موضوع ہونے پر جو بحث کی ہے وہ ہم آگے لا رہے ہیں۔‘‘

علامہ شہاب الدین قسطلانی (۹۲۳ھ) بھی شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں:۔

واما قول الکرمانی وماقیل ان ذلک کا ن سبباً لسجود هم لا صحة له عقلاً ولانقلاً فهو مبنی علی القول ببطلان القصة فی اصلها وانهاموضوعة وقد سبق مافی ذلک الله هوالموفق. (ارشاد الساری ج ۱۱ ص ۱۰۲)

رہی یہ بات کہ جب یہ روایت سرے سے ثابت نہیں تو اسے کچھ مفسرین نے ذکر کیوں کیا ہے؟ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے جواب میں امام فخر الدین رازی کا ایک بیان ہدیہ قارئین کردیں آپ لکھتے ہیں کہ:۔

عرفناعلیٰ سبیلِ الاجمال ان هٰذا القصة موضوعة. اکثر مافی الباب ان جمعاًمن المفسرین ذکروها لکنهم مابلغوا حدالتواتر وخبر الواحد لایعارض الدلائل النقلیةوالعقلیةالمتواترة. (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۳۷)

ترجمہ: ’’ہم اجمالاً جان پائے کہ یہ قصہ من گھڑت ہے اب زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کچھ مفسرین نے اسے ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اسے تواتر کے ذکر میں نہیں لا سکے اور خبر واحد سے (اگر یہ ہو)‘‘ دلائل نقلیہ متواترہ اور دلائل عقلیہ کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

اصولاً تو ان حوالوں کا جواب آ ہی گیا ہے۔ تاہم اس رافضی کی غلط بیانی واضح کرنے کے لئے ہم ان کی کچھ تفصیل کئے دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی کے قاضی بیضاوی (۷۹۱ھ) آیت امامت کے تحت لکھتے ہیں:۔

و فیه دلیل علی عصمة الانبیاء من الکبائر قبل البعثة وان الفاسق لا یصلح للامامة. (بیضاوی ص ۱۰۴)

ترجمہ: ’’اس میں انبیاء کرام کے قبل بعثت بھی کبیرہ گناہوں سے محفوظ رہنے کی دلیل ہے اور اس پر بھی کہ فاسق امامت کے لائق نہیں رہتا۔‘‘

آئیے اب نویں صدی میں چلیں۔ حافظ بدر الدین العینی (۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:۔

قلت الذی ذکر أهو اللائق بجلالة قدرالنبی ﷺ فانه قد قامت الحجةواجتمعت الامة علیٰ عصمته و نزاهته عن مثل هذه الرزیلة وحاشاه ان یجری علی قلبه اولسانه من ذلک عمداً ولا سهواً اوان یکون للشیطان علیه سبیلٌ. (عمدة القاری ج ۱۹ ص ۶۶)

ترجمہ: ’’میں کہتا ہوں کیا یہ بات حضور کی شان کے لائق ہے؟ سب امت اس قسم کی رذیل باتوں سے آپ کی عصمت اور حفاظت پر اجماع کر چکی ہے اور یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ آپ کی زبان پر کوئی اس قسم کی بات ارادۃً یا بھول کر آجائے یا یہ کہ شیطان کو اس پر کوئی راہ ملے۔‘‘

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲) بھی لکھتے ہیں:۔

لا یصح لکونه لا یجوز علی النبیؐ ذلک ولا ولایة الشیطان علیه فی النوم. (فتح الباری ج ۹ ص ۳۶۹)

ترجمہ: ’’یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ ایسا حملہ نبی پر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی شیطان اس پر غلبہ پاسکتا ہے۔

آئیے اب ہم آپ کو دسویں صدی میں لے چلیں۔

علامہ قسطلانی (۹۲۳ھ) بھی شرح صحیح البخاری میں یہی لکھتے ہیں:۔

واما قول الکرمانی وما قیل ان ذلک کان سببا لسجود هم لا صحة له عقلًاولا نقلاًفهو مبنی علیٰ القول ببطلان القصه فی اصلهاوانها موضوعةوقد سبق مافی ذلک. (ارشادالساری ج ۱۱ ص ۱۰۲)

ترجمہ: ’’کرمانی نے جو کہا ہے کہ یہ اس کی آواز ان کے سجدہ کرنے کا سبب بنی یہ عقلاً اور نقلاً کسی طرح صحیح نہیں۔ سو یہ بات اس پر مبنی ہے کہ یہ قصہ جھوٹا اور موضوع ہے اور اس میں یہ بات پہلے بھی کچھ ہو چکی ہے۔

مسلمان اور مشرکین سب سجدہ میں گر گئے

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ مسلمانوں اور مشرکوں کے مخلوط مجمع میں تلاوت فرمائی اور ایک مقام پر سب کے سب سجدہ میں گر گئے امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں:۔

عن ابن عباسؓ سجدالنبی ﷺ بالنجم و سجد معه المسلمون والمشرکون

والجن و الانس (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۲۱)

قرآن کریم کی کچھ وہ آیات ہیں جن پر سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سورہ النجم کی اس آخری آیت کو آپؐ نے تلاوت کیا۔ یہ سورت مجمع عام میں پڑھی گئی تھی۔ اس میں مشرکین کے بتوں کا بھی اس طرح ذکر آیا ہے۔

افرایتم اللٰت و العُزی ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ. الکم الذکر وله الانثی. تلک اذاقسمۃضیزیٰ. ان ھی الااسماء سمیتموھاانتم وآباء کم ماانزل اللہ بھامن سلطان ط ان یتبعون الاالظن وماتھوی الانفس ج ولقد جاء ھم من ربھم الھدی. (پ النجم ۱۹)

مسلمانوں نے تو فاسجدوا للہ واعبدو اپر سجدہ کیا اور مشرکین نے اپنے ان بتوں کے نام سنے اور ان کی تعظیم میں وہ سجدہ میں گر پڑے صحیح بخاری کی اس روایت میں کہیں یہ قصہ غرانیق منقول نہیں مشرکین پہلے سے ان بتوں کی مدح وثنا کرتے چلے آرہے تھے۔ شیطان نے اس مخلوط مجمع کا فائدہ اٹھا کر حضورؐ کے لب ولہجہ کا ایہام پیدا کر کے تلک الغرانیق العلیٰ و شفاعتھن لترتجی کے الفاظ کہے تو مشرکین نے یہ بات بنالی کہ (معاذ اللہ) حضورؐ نے بتوں کی تعریف کی ہے قرآن پاک میں جس طرح یہاں بتوں کا ذکر کیا گیا ہے کیا کوئی دیانتدار شخص اسے بتوں کی مدح کہہ سکتا ہے ؟ رافضی کے کہے پر کچھ تعجب نہ کیجئے ڈھگو اسے ہی کہتے ہیں جو گری ہوئی بات کرے۔

علماء اسلام اسی وقت سے اس بات کی تردید کرتے چلے آرہے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں سوائے زنادقہ و ملحدین کے کسی نے اس غلط قصے کو قبول نہیں کیا محمد بن اسحٰق بن خزیمہ نے اس پر ایک کتاب لکھی اور اسے ایک موضوع روایت قرار دیا ہے امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے کہا ہے کہ یہ قصہ کہیں ثابت نہیں اور اس عہد کے تمام علمائے اہل سنت نے یہی کہا ہے جو اس بات کو جائز سمجھے کہ نبی کی زبان سے کبھی بتوں کی تعظیم نکل سکتی ہے وہ کافر ہے مسلمان کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا چھٹی صدی کے جلیل القدر امام فخر الدین رازی اس قصے کو قرآن وحدیث کے خلاف لکھتے ہیں:۔

واماالسنۃفھی ماروی عن محمد بن اسحق بن خزیمه انه سئل عن ھذہ القصه فقال ھذا وضع من الزنادقةوصنف فیه کتاباًوقال الامام ابوبکر احمدبن الحسین البیھقی (۴۵۸ھ)ھذہ القصة غیرثابتة من جھة النقل...فقد روی البخاری فی صحیحه ان النبیؐ قراء النجم وسجد فیھاالمسلمون والمشرکون والانس والجن ولیس فیه حدیث الغرانیق. (تفسیر کبیر ج ۸ سورہ الحج ص ۲۳۷)

پھر امام رازیؒ نے یہ بھی لکھا ہے:۔

ومن جوز علی الرسول تعظیم الاوثان فقد کفر (ایضاً)

ترجمہ: "اور جس نے بھی حضورؐ پر کبھی بتوں کی تعظیم کی نسبت کی کافر ہو چکا۔"

طبری کی روایات از خود کوئی وزن نہیں رکھتیں جب تک ان کے پیچھے کوئی قوت سند نہ ہو۔

علامہ بدر الدین العینی (۸۵۵ھ) شرح صحیح البخاری میں لکھتے ہیں:۔

وقال ابن العربی ذکر الطبری فی ذلک روایات کثیرة باطلة لا اصل لھاوقال عیاض ھذاالحدیث لم یخرجه احد من اھل الصحة ولا رواہ ثقة بسند سلیم متصل.

ترجمہ: "ابن العربی کہتے ہیں طبری نے اس پر بہت سی باطل مرویات نقل کی ہیں ان کی کوئی اصل نہیں اور قاضی عیاض کہتے ہیں اس حدیث کو کسی صحیح روایت کرنے والے نے روایت نہیں کیا۔"

اور یہ بھی لکھتے ہیں:۔

من تکلم بھٰذہ القصة من التابعین والمفسرین لم یسندھااحد منھم ولا رفعھا الیٰ صاحبه واکثر الطرق عنھم فی ذلک ضعیفة و قال بعضھم ھذا الذی یذکرہ ابن العربی و عیاض لا یمشی علیٰ القواعد فان الطرق اذاکثرت وتباینت مخارج جھا دل ذلک ان لھا اصلاًانتھیٰ.

ترجمہ: "تابعین اور مفسرین میں سے جس نے بھی اس قصے کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی نے اسے مسند بیان نہیں کیا اور نہ اسے کسی کہنے والے تک پہنچایا ہے اور اکثر طرق ان میں سے ضعیف ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جو بات ابن عربی اور قاضی عیاض نے کی ہے۔ قواعد پر پوری نہیں اترتی کیوں کہ طرق روایت جب بہت ہو جائیں اور اس کے کئی مخارج ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہوگی بس اس کی اگر کوئی اصل ہو سکتی ہے تو بس یہی کہ مشرکین نے بھی اپنے بتوں کے ذکر پر سجدہ کیا اور آگے زندیقوں اور ملحدوں نے بات کہاں کی کہاں پہنچادی۔"

علامہ بغوی الشافعی (۵۱۶ھ) صاحب معالم التنزیل

علامہ بغوی ہرگز اس عقیدے پر نہیں جو اس رافضی نے ان کی طرف منسوب کیا ہے انہوں نے سورہ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں اکثر مفسرین سے یہ نقل کیا ہے کہ کبھی ایسا ہوا کہ پیغمبر نے تلاوت کی اور شیطان نے اس کی تلاوت میں اپنی بات ڈال دی تا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ بھی پیغمبر نے ہی پڑھا ہے؟ کتاب میں اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی تھی۔ افسوس اس ڈھگو رافضی نے وہ پیغمبر کی طرف کر دی ہے۔

علامہ بغوی کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

واکثر المفسرین قالوا معنی قوله (تمنّیٰ) یعنی تلاو قرأ کتاب الله تعالیٰ القی الشیطان فی امنیّته یعنی فی تلاوته. (معالم التنزیل ج ۳ ص ۲۴۷)

یعنی پیغمبر نے تلاوت کی اور اللہ کی کتاب قرأت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں اپنی بات ملا دی اب شیطان کی بات کو پیغمبر کی طرف منسوب کرنا کہ اس نے اسے اپنی تلاوت میں شامل کرلیا تھا یہ کسی صحیح العقیدہ مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا اگر یہ مانا جائے تو اس پر سوال اُٹھتا ہے:۔

کیف یجوز الغلط فی التلاوة علیٰ النبی ﷺ وکان معصوماً من الغلط فی اصل الدین وقال جلّ ذکرہ فی القرآن لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه. (فصلّت ۴۲)

ترجمہ: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پیغمبر تلاوت میں غلطی کرجائے اور حضور اکرم ﷺ تو اصل دین میں غلطی سے معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (فصلت ۴۲) کہا ہے آپ کی طرف ابلیس کسی طرف سے نہیں آسکتا نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے (کسی مکر اور حیلہ سے آپ پر قابو نہیں پاسکتا)''

اہلِ سنت کا عقیدہ عصمت نبوت کا یہی ہے اب اس کے ہوتے ہوئے اس بات کو کیسے مانا جاسکتا ہے کہ حضورؐ نے نماز میں ان بتوں کی تعریف کی جیسا کہ اس رافضی نے لکھا ہے۔

پھر علامہ بغوی نے کہا ہے کہ لوگوں نے اس سوال کے مختلف جواب دیئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے خیال سے جوابات لکھے ہیں:۔

ایک جواب: **ان الرسول لم یقرأولکن الشیطان ذکر ذلک بین قرأته فظن المشرکون ان الرسول قراہ وقرأہ۔**

دوسرا جواب:۔ ایک اونگھ کی حالت میں حضورؐ کے لہجہ میں یہ الفاظ شیطان نے نکالے اور آپ کو اس کی خبر تک نہ ہو پائی۔

تیسرا جواب:۔ سہو کے طور پر شیطان آپ کی زبان پر یہ کلمات لایا اور حضور اسی وقت اس پر جاگ اُٹھے اور اس کی تردید کردی۔

چوتھا جواب:۔ یہ عمل ایک ۔۔۔۔ شیطان کا ہے جسے سفید چمڑی والا کہا جاتا ہے یہ عمل حضورؐ کا اپنا عمل نہ تھا۔

صورت حال کچھ بھی ہو یہ بات یقینی ہے کہ حضورؐ نے قطعاً اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے اور رافضی نے بغوی کے نام سے جو بات تجلیات میں لکھی ہے غلط ہے۔ بغوی نے اپنا عقیدہ حضورؐ کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

کان معصوماً من الغلط فی اصل الدین قال جلّ ذکرہ لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه .

قرآن کریم نے اسے خود القاء شیطان کہا ہے اور اس کے مٹانے کی بھی ذمہ داری لی ہے اب رافضی ہیں کہ اسے خانخواہ حضورؐ کے نام لگا رہے ہیں اور اہل سنت اس کی تردید کر رہے ہیں اور ڈھکو رافضی اسے اہل سنت کا عقیدہ رسالت بتلا رہا ہے۔

فینسخ الله مایلقی الشیطان ثم یحکم الله ایاته والله علیم حکیم لیجعل مایلقی الشیطان فتنةً للذین فی قلوبهم مرض والقاسیة قلوبهم ان الظالمین لفی شقاق بعید. (الحج ۵۳)

ترجمہ: ''پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا پھر پکی کرتا ہے اپنی باتیں اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے تاکہ وہ کرے اسے جو شیطان نے ملایا ہے فتنہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں روگ ہے اور ان کے دل سخت ہیں اور ظالم لوگ تو مخالفت میں دور پہنچے ہوئے ہیں۔''

خدارا انصاف کیجئے اور دیکھئے رافضی نے کس طرح ایک غلط بات کو ایک واقعہ کی شکل دے دی ہے اور کس بے دردی سے اسے علامہ بغوی کا عقیدہ اور پھر پورے اہل سنت کا عقیدہ بتلایا ہے حضورؐ پر یہ الزام لگانے میں کہ آپ نے نماز میں معاذ اللہ ان الفاظ سے بتوں کی تعریف کی تھی اس رافضی نے اس میں علامہ بغوی کے ساتھ قاضی بیضاوی کا نام بھی لیا ہے آیئے رافضی کے اس جھوٹ کی کچھ اور تفصیل بھی دیکھ لیں۔

قاضی ناصر الدین بیضاوی (۶۹۱ھ) کی یہ عبارت ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

وفیه دلیل علیٰ عصمة الانبیاء من الکبائر قبل البعثة وان الفاسق لا یصلح للامامة. (بیضاوی ص ۱۰۴)

ترجمہ: ''اس میں انبیاء کرام کے بعثت سے پہلے بھی ہر کبیرہ گناہ سے محفوظ ہونے کی دلیل ہے اور اس پر بھی کہ فاسق منصب امامت کے لائق نہیں ہے۔''

آیئے اب ہم آپ کو اس سے اگلی صدی میں لے چلیں حافظ بدر الدین العینی (۸۵۵ھ) کی شرح صحیح بخاری کی یہ عبارت آپ پہلے دیکھ آئے ہیں۔

قد قامت الحجة واجتمعت الامة علیٰ عصمته و نزاهته عن مثل هٰذه الرذیلة و حاشاه ان یجری علیٰ قلبه اولسانه شئی من ذلک عمداً ولا سهواً اوان یکون للشیطان علیه سبیل. (عمدۃ القاری ج ۱۹ ص ۲۶)

ترجمہ: ”حجت اس پر قائم ہو چکی اور امت آپ کے معصوم ہونے اور آپ کے اس قسم کے رذائل سے محفوظ ہونے پر اجماع کر چکی اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کے دل یا آپ کی زبان پر کوئی ایسی بات عمداً یا سہواً چلے یا شیطان کو آپ کی طرف کوئی راہ چلے۔“

دسویں صدی کے مجدد حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کا یہ استدلال ملاحظہ ہو۔

والمختار المنع لانامامور ون بالاقتداء بهم فی کل مایصدر منهم من قول اوفعل فکیف یقع منهم مالاینبغی ویومر بالاقتداء. (الخصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۳۳۵)

ترجمہ: ”ہمارا اختیار کردہ عقیدہ یہی ہے کہ ان سے گناہ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ ہم ان کی پیروی کرنے کا حکم دیئے گئے ہیں ہر اس بات میں جو ان سے صادر ہو وہ ان کا کوئی قول ہو یا عمل ہو بس ان سے کیسے کوئی بات واقع ہو سکتی ہے جو نہ چاہیے اور حکم ہو ان کی پیروی کا...... یہ دو باتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔“

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امت کو گناہ پر آنے کا حکم دیا جا رہا ہے اگر ان سے کوئی گناہ صادر ہو تو امت اس میں ان کی پیروی کر کے گناہ ہی کا تو ارتکاب کرے گی۔ بھلا ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ لھٰذا ان کا معصوم ہونا ضروری ٹھہرا۔

علامہ شعرانی (۹۷۳ھ) مبحث ۳۱ کا ترجمۃ الباب اس طرح لکھتے ہیں:

عصمة الانبیاء علیهم السلام من کل حرکة اوسکون او قول اوفعل ینقص مقامهم الا کمل.

ترجمہ: ”انبیاء ہر اس حرکت سکون اور قول و فعل سے معصوم ہیں جس سے ان کے کامل مقام پر کچھ حرف آئے۔“

اور پھر ان کی زبان سے ائمہ اصول کا یہ متفقہ فیصلہ بھی پڑھیں:

قال ائمةالاصول الانبیاء علیهم السلام کلهم معصومون لایصدر عنهم ذنب ولو صغیره سهواً ولا یجوز علیهم الخطاء فی دین الله قطعاً وفاقاً للاستاذابی اسحق الا سفرائنی وابی الفتح الشهر ستانی والقاضی عیاض

(الیواقیت والجواهر فی بیا ن عقائد الاکابر ج ۲ ص ۲)

ترجمہ: ”ائمہ اصول نے کہا ہے کہ انبیاء کرام سب کے سب گناہوں سے پوری طرح معصوم ہیں ان سے کوئی گناہ کو کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو سہواً بھی صادر نہیں ہوا۔ اللہ کے دین میں ان سے کوئی غلطی نہیں ہو پاتی اس پر امام ابو اسحٰق الاسفرائنی ابوالفتح الشہرستانی اور قاضی عیاض سب متفق ہیں۔“

آیئے اب ہم آپ کو گیارہویں صدی میں لے چلیں۔

محدث کبیر ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) نے شرح فقہ اکبر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے عقیدہ عصمت نبوت کی ان الفاظ میں شرح کی ہے:

والانبیاء علیهم السلام کلهم منزهون عن الصغائر والکبائر والکفر والقبائح والفواحش وهی اخص من الکبائر فی مقام التغائر کمایدل علیه قوله سبحانه و تعالٰی الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش والمراد بها نحوالقتل والزنا واللواطة والسرقة وقذف المحصنة والسحرو الفرار من الزحف والتمیمة واکل الربا ومال الیتیم وظلم العباد وقصد الفساد و فی البلاد.

(شرح فقه اکبر ص ۶۷ طبع کانپور)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ)

واجب است احترام و تنزیهه ساختن ایشان از سمت نقص وعصمت ایشان ازجمیع گنا هاں خورد و بزرگ پیش از نبوت و پس ازوے همیں است قول مختار وآنچه بعضے مفسراں واهل قصص واخباراز ایشاں نقل کرده صحیح نیست(اشعة اللمعات ج ۱ ص ۲۹)

ترجمہ: ”انبیاء کا احترام کرنا اور انہیں کسی نقص کے داغ سے محفوظ ماننا اور تمام گناہوں سے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے نبوت ملنے سے پہلے کے ہوں یا بعد کے انہیں بچا ہوا ماننا واجب ہے (اہل سنت کے ہاں) یہی قول مختار ہے اور یہ جو بعض مفسرین اور قصہ گوؤں اور مورخین نے اس کے خلاف کوئی باتیں کہی ہیں وہ ہرگز درست نہیں ہیں۔

اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ساری کائنات میں اور مخلوقات میں سب سے اولیٰ اکمل اور اعظم ہیں آپ کی شان میں اگر کوئی کسی درجہ کی تنقیص کرے تو وہ زندیق کے حکم میں ہے۔ علامہ خفاجی (۱۰۶۰ھ) شفاء قاضی

عیاض کی شرح میں حضور اکرم ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

هو اكمل الخلق واعظمهم...... فحكمه حكم الزنديق.

(نسيم الرياض شرح شفاء قاضی عياض جلد ۴ ص ۳۹۲)

آپ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا حکم کیا ہے۔

ان نقول مہمہ اور صدی وار شہادتوں کی موجودگی میں اہل السنۃ والجماعۃ پر قصہ غرانیق کے واقع ہونے کا الزام لگانا بہتان وزور اور کذب وافتراء سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا اہل سنت ایسی ہر بات کو اسلام کے مقام رسالت کے خلاف قرار دیتے ہیں اگر کسی شخص نے ایسا کہہ دیا ہو تو یہ اس کا اپنا موقف ہو سکتا ہے اسے اہل سنت کا مذہب کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔

اب ہم یہاں رافضی سے مخاطب نہیں ہوتے پوری شیعہ قوم کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اگر تم میں کسی عالم کے دل میں کچھ بھی خدا کا خوف باقی ہے تو خدارا انصاف کرو کہ جس جماعت کا عصمت انبیاء پر یہ عقیدہ ہو جس پر ہم اسلام کی چودہ صدیوں کی شہادت پیش کر چکے اور ان کے علماء محققین سے قصہ غرانیق کے وضعی اور جعلی ہونے پر قوی شہادتیں پیش کر چکے انہیں اس عقیدے کا ملزم بنانا کہ ان کے ہاں شان رسالت نماز میں بتوں کی تعریف کرنے سے مجروح نہیں ہوتی کیا دنیائے علم میں اس سے بڑھ کر کسی ظلم کو پیش کیا جاسکے گا؟ جو اس رافضی نے مولانا کرم دین دبیر پر لازم کیا ہے۔ اگر دنیا سے انصاف کا لفظ اُٹھ نہیں گیا تو ہمارے قارئین فیصلہ کریں کہ مذہب اہل سنت کو بدنام کرنے کے لئے یہ بدبودار پیمانہ تحقیق جو یہ رافضی اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اس کی اس سے بدتر مثال کیا کہیں مل سکتی ہے؟ ہم اس پر اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ کوزہ سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔

اب آیئے کچھ حوالے تیرھویں صدی کے ان علماء اہل سنت کے بھی ملاحظہ کریں جن کے نام لے کر اس رافضی نے اپنی عاقبت سیاہ کی ہے۔

۱۔ تیرھویں صدی کے علامہ صاوی (۱۲۴۱ھ)

۲۔ علامہ عبدالعزیز پرہاروی صاحب نبراس شرح شرح العقائد (۱۲۳۹ھ)

۳۔ علامہ ابن عابدین شامی (۱۲۵۳ھ)

۴۔ علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی (۱۲۹۱ھ)

یہ اسلام کے پہلے چودہ سو سال کا عقیدہ عصمت نبوت پر اجماع ہے اس کے خلاف کسی کی بھی کوئی بات اسلامی دنیا میں نہیں سنی گئی نہ سنی جائے گی۔ چھٹی صدی سے چودھویں صدی تک کے حوالے آپ کے سامنے آچکے۔ اب پہلی پانچ صدیوں سے بھی اس پر شہادت لے لیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) کا عقیدہ فقہ اکبر کے حوالے سے آپ پہلے

دیکھ چکے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے بعد امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) نے بھی یہی بات کہی۔ آپ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

ايمارجل مسلم سب رسول الله ﷺ او كذبه او عابه او تنقصه فقد كفر بالله تعالىٰ وبانت عنه امرأته (ماخوذ از رد المحتار ج۳ ص ۳۱۹)

ترجمہ: ”جس کسی مسلمان نے حضورؐ کی شان میں کوئی بری بات کہی یا آپ کی کسی بات کو جھٹلایا یا آپ کا کوئی عیب نکالا یا آپ کی تنقیص کی وہ کافر ہوگیا اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی۔“

حضرت امام ابوجعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) کے العقیدۃ الطحاویہ آپ پہلے ان کا عقیدہ عصمت رسالت پڑھ آئے ہیں اب اس کی مزید تفصیل حاصل کریں۔

ان جميع ما انزل الله فى القرآن و جميع ماصح عن النبى ﷺ من الشرع والبيان كله حق ص ۱۰۔

آپ شرح معانی الآثار کتاب الکراھیہ باب الاستغفار میں بھی لکھتے ہیں:۔

فهذا كان رسول الله ﷺ يقوله لانه معصوم من الذنوب.

(طحاوی ج ۲ ص ۴۰۴)

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ یہی کہتے رہے کیونکہ آپ تمام گناہوں سے معصوم ہیں۔“

جب آپؐ ہر گناہ سے پاک ٹھہرے تو ظاہر ہے آپ سے شرک جیسے اکبر کبائر کا العیاذ باللہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چوتھی صدی کی شہادت ہے آپ اور آپ کے بعد کے آنے والے اہل سنت اکابر میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

اب پانچویں صدی میں چلیں علامہ راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) لکھتے ہیں:۔

وعصمة الانبياء حفظه اياهم اولاً بماخصهم به من صفاء الجوهر ثم اولاهم من الفضائل الجسمية والنفسية ثم بالنصر و تثبيت اقدامهم ثم بانزال السكينة عليهم و بحفظ قلوبهم و بالتوفيق.

ترجمہ: ”انبیاء کی عصمت ان کی خدا کی طرف سے ہر قسم کے گناہ سے حفاظت ہے اولاً اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جوہر میں وہ صفائی رکھ دی ہے (کہ گناہ آپ کے قریب نہیں پھٹکتا)۔

(۲) پھر انہیں جسمانی اور نفسی فضائل سے نوازا ہے۔

(۳) پھر گناہوں سے دور رہنے میں ان کی نصرت فرمائی ہے۔

(۴) پھر انہیں ثابت قدمی عطا کی ہے۔

(۵) پھر اپنی طرف سے ان پر سکینہ اتارا ہے۔

(۶) پھر ان کے دلوں کی حفاظت کی ہے اور۔

(۷) انہیں اپنی توفیق سے نوازا ہے۔

چھٹی صدی میں قاضی عیاض (۵۴۴ ھ) سے بھی آپ یہی بات سنیں گے:۔

قال قاضی عیاض واعلم ان الامة مجتمعةعلیٰ عصمة النبی ﷺ من الشیطان فی جسمه و خاطره ولسانه (تفسیر خازن ج ۲ ص ۲۷۱)

ترجمہ: ”جان لو کہ حضور ﷺ کی پوری امت آپ کے بدن مبارک، قلب مبارک اور زبان مبارک کے ہر شیطانی اثر سے محفوظ و معصوم ہونے پر مجتمع ہے۔“

اب اگلی صدی کی ایک اور شہادت بھی لے لیں۔

ساتویں صدی کے جلیل القدر مفسرِ قرآن علامہ ابوحیان اندلسیؒ (۶۵۴ ھ) لکھتے ہیں۔

ویعلم قطعاً ان الانبیاء علیهم السلام معصومون من الخطایا لا یمکن وقوعهم فی شئی منها ضرورة اذلوجوزنا علیهم شیاءً من ذلک لبطلت الشرائع ولم نثق بشئی مما یذکرون انه اوحی اللّٰه به الیهم فماحکی اللّٰه تعالیٰ فی کتابه علیٰ ماارادہ اللّٰه تعالی وماحکی القصاص مما فیه غض منصب النبوة طرحناه. (البحر المحیط ج ۷ ص ۳۹۳)

ترجمہ: ”یہ بات قطعی طور پر جانی جا چکی کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ہر غلطی سے محفوظ رہے ضروری درجے میں ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انبیاء کوئی غلطی کر جائیں اگر ہم انبیاء سے کوئی گناہ ہونا جائز قرار دیں تو یہ سارا نظام شرائع باطل ہو جاتا ہے اور کسی چیز کا جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کی ہے اعتبار نہیں رہتا نہ اس کا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کہا اور اس کا ارادہ فرمایا اور جو قصہ گوؤں نے باتیں بنائی ہیں جن میں منصب نبوت کو نظر انداز کیا گیا ہے ہم نے اسے پھینک دیا ہے (ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے)“

اس صدی کے حضرت علامہ نسفی (۷۰۱ ھ) سے بھی اس کی تائید سن لیں۔

انّهم معصومون من الکفر قبل الوحی وبعده بالاجماع (شرح عقائد نسفی)

یہ کتاب مدارس کی درسی کتاب ہے اور اہل سنت کے تقریباً تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

اس پر ہم اہل سنت کے عقیدہ عصمت انبیاء اور ڈھگو رافضی کے کذب وزور اور افتراء کی بحث ختم کرتے ہیں۔

رافضی کے نقشہ میں...... سنیوں کے ہاں مقامِ صحابہؓ

رافضی نے جس طرح اہل سنت کے بغض میں ان کے عقیدہ توحید اور عقیدہ شان رسالت پر نہایت قبیح پیرائے میں جھوٹ باندھے ہیں' اہل سنت کے عقیدہ شان صحابہ پر بھی اس کا قلم اسی بے دردی اور کذب وزور سے چلا ہے۔

ہم آپ کو اس ڈھگو کی اس تیسری مشق الحاد پر بھی مطلع کرتے ہیں' اس کی تحقیق میں اہل سنت کے ہاں مقام صحابہ کیا ہے؟ اس پر اس نے ذیل کی سرخی جمائی ہے۔ (تجلیات ص ۱۳)

سنیوں کے ہاں شانِ صحابہ

رافضی نے یہاں پہلے اہل سنت کی کس کتاب کا حوالہ دیا ہے؟ قرآنِ کریم کا، الحمد للہ! اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے عقیدے میں قرآن کریم صرف سنیوں کی کتاب ہے ورنہ وہ اسے ایک مشترکہ عقیدہ کے نام سے بھی سامنے لا سکتا تھا، لیجئے ہم یہاں اس کے اس الزام کی مزید کچھ وضاحت کئے دیتے ہیں۔

ا۔ منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرہ

اتنا ہی عنوان ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفر اور اسلام کا مقابلہ ہے باطل اور حق کی آویزش ہے ایسا نہیں یہاں یرید الدنیا سے صرف یہ مراد ہے کہ بعض لوگ دنیوی متاع (مال غنیمت) کی خوشی میں اچھل پڑے اور پھسل گئے خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ ہم میں کوئی آدمی دنیا کا طالب بھی ہے۔ سو یہاں من یرید الدنیا سے مراد یہی مال غنیمت کی خوشی ہے ایمان سے نکلنا مراد نہیں ہے نہ یہ حق اور باطل کی آویزش ہے یہاں صرف مالک حقیقی نے اپنے بندوں کو ان کی ایک لغزش پر متنبہ کیا ہے دونوں طرف کے لوگ مومن تھے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عین اسی موقع پر معاف کر دیا۔ خدا تعالیٰ اسے بالکل معاف کر چکا اب کسی کو جائز نہیں کہ ان پر اس حرکت کی وجہ سے طعن وتشنیع کرے اور کسی فعل شنیع کا ارتکاب کرے۔

اگر رافضی یہاں اس آیت کے آگے کے پورے الفاظ ہی نقل کر دیتا تو وہ بات صاف کرنے کے لئے کافی تھے۔ دیکھئے قرآن کریم نے کس طرح یہیں ان کے ایمان کی شہادت دی ہے:۔

منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرہ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم ولقد عفاعنکم واللّٰہ ذو فضل علی المومنین. (پ ۴ آل عمران ۱۵۲)

ترجمہ: ’’کوئی تم میں سے چاہتا تھا دنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت۔ پھر تم کو الٹ دیا ان پر تاکہ تم کو آزمائے اور بیشک وہ تم کو معاف کر چکا اور اللہ کا فضل ہے ایمان والوں پر۔‘‘

اس میں صریح لفظوں میں ان مال تجارت کے طالبین کو مومن کہا ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کے ایمان کی گواہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مال غنیمت کی خوشی میں لیے مسلمانوں کا مسجد سے نکل آنا کسی قاعدہ سے اسلام سے نکلنا نہیں سمجھا جاتا اس دور تربیت میں ایسے کئی اور واقعات بھی ان سے صادر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ’’ان فی اصحابی منافقین‘‘ رافضی

پہلے ان منافقین کا پتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیا گیا تھا۔ پھر آپ پر ان چودہ پندرہ اشخاص کی کچھ علامات کھول دی گئیں۔ غالباً یہ وہی تھے جنہوں نے تبوک سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گھاٹی سے گرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ حضور اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سازش کی خبر دے دی۔

حضورؐ نے ان کو بلا کر ان کی آپس میں ہونے والی باتوں کی انھیں خبر دی۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ان کے بارے میں فرمایا:

فی اصحابی اثنا عشر منافقا فیھم ثمانیۃ لا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط. (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۹ عن حذیفہؓ)

میرے صحابہ میں بارہ منافق ہیں جن میں آٹھ ایسے ہیں کہ وہ کبھی جنت میں نہ جا سکیں گے۔

اور انجام کار وہ نکال بھی دیے گئے اور کچھ ان میں سے مر بھی گئے ہوں گے۔ اب اس روایت سے مہاجرین صحابہ کے ایمان پر شک کرنا کسی شریف آدمی کو زیبا نہیں دیتا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

انّہ اعلم باعیان اربعۃ او خمسہ عشر منافقاً وھذا تخصیصھم یقتضی انہ اطلع علی اسمائھم و اعیانھم کلھم. (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۸۴)

ترجمہ: ’’آپ کو چودہ یا پندرہ منافقوں کا علم دیا گیا۔ یہ تخصیص بتلاتی ہے کہ آپ کو ان سب کے ناموں اور ان کی شخصیتوں کا پتہ دے دیا گیا تھا۔‘‘

قرآن کریم نے بتلا دیا کہ یہ لوگ چند گنتی کے دن رہیں گے پھر منافقین جڑ سے کاٹ دیے جایں گے خدا کا معاملہ پہلے بھی یہی رہا ہے کہ وہ باطل کو پنپنے نہیں دیتا۔ حضورﷺ کی امت پر بھی یہ منافق غلبہ کبھی نہ پا سکیں گے۔

وممن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینہ مردوا علی النفاق لا تعلمھم نحن نعلمھم سنعذبھم مرتین ثم یردون الی عذاب عظیم. (پ ۱۱ التوبہ ۱۰۱)

ترجمہ: ’’اور جو اعراب آپ کے گرد ہیں ان میں اور مدینہ والوں میں بھی کچھ منافق ہیں جو نفاق پر ڈٹے ہیں۔ آپ ان کو نہیں جانتے‘ ہم جانتے ہیں۔ ہم جلد انہیں دو بار پکڑیں گے۔ پھر وہ برے عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے۔‘‘

ثمانیۃ منھم تکفیھم الدبیلۃ واربعۃ لم احفظ ما قال الشعبۃ منھم.

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۶۹)

ترجمہ: ’’مرے ساتھ والوں میں بارہ آدمی منافق ہیں۔ یہ اس وقت تک جنت میں نہیں جائیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ سے نہ گزر جائے۔ آٹھ کا کام تو دبیلہ ہی کر دے گا۔‘‘

آگ کا ایک شعلہ ان کے شانوں کے درمیان سے اٹھے گا اور ان کے سینوں سے پار ہو جائے گا۔

امام بیہقی نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے بد دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی‘ اے اللہ ان کو دبیلہ میں مبتلا کر‘ آگ کی ایک چنگاری میں جو ان کے دلوں کی رگ پر لگے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ (تفسیر مظہری ج ۵ ص ۳۴۹)

لئن لم ینتہ المنفقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجا ورونک فیھا الا قلیلا ملعونین اینما ثقفوا اخذوا و قتلوا تقتیلا. سنۃ اللّٰہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا.

ترجمہ: ’’اگر منافق نہ رکے اور وہ لوگ بھی جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑانے والے تو ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ پھر وہ آپ کے اس شہر میں بھی آپ کے ساتھ نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔ بھٹکارے ہوئے۔ جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے ان پر مار دھاڑ ہوگی۔ یہی میرا طریقہ رہا ہے ان سے۔ رہا جو پہلے گزرے (رسالت لے کر) اور آپ بھی میرے اس طریقہ میں (کہ منافقوں کو نہ رہنے دوں گا) کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔‘‘

اس ڈھ گو۔ نے یہاں صحابہؓ پر یہ چار حملے بڑی بے دردی سے کیے ہیں۔

۱۔ رافضی نے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں یہ سنی عقیدہ نقل کیا ہے کہ معاذ اللہ آپ شرک کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس پر اس ڈھ گو کے یہ حوالے دیکھیں۔

الشرک فیکم اخفیٰ من دبیب النمل (در منثور)

ایمان کے مقابل شرک جلی ہے شرک خفی نہیں۔ رافضی کہتا ہے آنحضرت نے ابوبکرؓ صاحب کو خطاب کر کے فرمایا تم لوگوں میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی طریقہ سے چلتا ہے اور اس پر در منثور ج ۴ ص ۵۴ اور کنز العمال کا حوالہ دیا ہے۔ پھر آگے حضرت عمرؓ پر بھی اس نے اسی طرح اپنے ہاتھ دکھائے ہیں۔

۳۔ یا حذیفہ باللہ انا من المنافقین۔ من قول عمرؓ

منافق اپنا کفر چھپانے والے کو کہتے ہیں جب وہ اسے ظاہر کریں گے تو اسے کافر کہیں گے نہ کہ منافق منافقین نشهد انک رسول اللہ کہیں تو بھی وہ جھوٹے ہیں۔ سورۃ المنافقون۔ یہ اسلئے نہیں کہ آپ العیاذ باللہ اللہ کے رسول نہیں۔ جھوٹ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کیونکہ وہ دل سے یہ گواہی نہیں دے رہے تھے۔

ایسا نفاق کہ کوئی خود کہے کہ میں منافق ہوں نفاق عملی تو ہوسکتا ہے نفاق اعتقادی نہیں نفاق اعتقادی والا اپنا نفاق جانتا ہے اور وہ اپنا نفاق چھپاتا ہے ظاہر نہیں کرتا اور نفاق عملی میں تواضع پسند لوگ اپنے اخلاص کا دعویٰ نہیں کرتے اپنے اعمال کو ظاہر کا درجہ ہی دیتے ہیں۔ نفاق عملی کے لیے حضورؐ کی یہ صریح حدیث موجود ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اختلاف میں آئے تو گالیوں پر اتر آئے اور اسے امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

اب اگر حضرت عمر نے کہا اے حذیفہ میں قسم دیتا ہوں کہ میں منافقوں میں سے ہوں (میزان الاعتدال ج ا ص ۳۶۵) تو یہ جملہ صرف ایک تواضع پر دلالت کر رہا ہے نفاق اعتقادی پر نہیں جو چیز ایمان کے بالمقابل ہے وہ نفاق اعتقادی ہے اگر کا لفظ ہم نے صرف اس لئے کہا ہے کہ یہ الفاظ حضرت عمر سے کہیں ثابت نہیں آپ پر یہ جھوٹ باندھا گیا ہے۔

میزان الاعتدال میں ہے:

ثم انه ساق من رواية قول عمر يا حذيفة بالله انا من المنافقين قال هذا محال اخاف ان يكون كذباً. (میزان ج ۳ ص ۱۵۸)

ترجمہ: اس نے پھر حضرت عمرؓ کی روایت بیان کی اے حذیفہ بخدا میں منافقین میں سے ہوں اس نے کہا یہ نہیں ہوسکتا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ جھوٹ ہو۔

حضرت حذیفہ تو حضورؐ کے بعد نفاق کا وجود ہی نہیں مانتے چہ جائیکہ وہ کسی سے یہ جملہ سنیں کہ میں منافق ہو گیا ہوں۔ سو جس روایت میں حضرت حذیفہ کے حوالے سے یہ بات ملے وہ کسی طرح صحیح تصور نہ ہوگی۔

۴. ومن المنهزمين عمر الا انه لم يكن في اوائل المنهزمين ولم يبعد.

یہ آخری الفاظ ولم یبعد کہ آپ دور نہ گئے تھے' خود بتلاتے ہیں کہ آپ وہاں نیا مورچہ بنانے کی سوچ میں گئے تھے' بھاگنے والا اپنے گھر جاتا ہے نیا مورچہ نہیں بناتا۔ یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس سے آپ پر کوئی الزام نہیں آتا۔

صحابہ کرام میں تواضع بہت تھی

ایک مرتبہ حضرت حنظلہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے راستہ میں ملے حضرت صدیق اکبر نے پوچھا کیا حال ہے فرمایا نافق حنظلة یعنی حنظلہ منافق ہو گیا ہے پوچھا کیوں؟ تو حضرت حنظلہ نے کہا۔

اذا كنا عند رسول الله ﷺ كنا عنده كانا نرئ الجنة والنار رؤية عين واذا فارقنا نافسنا الاموال والا ولا د وقال ابوبكر وانا كذلك.

ترجمہ: "یعنی جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری یہ حالت ہوتی ہے گویا جنت اور جہنم کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں پھر آپؐ سے جدا ہو کر اموال و اولاد میں لگ جاتے ہیں اور یہ حالت نہیں رہتی۔ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اگر یہ نفاق ہے تو ہم بھی منافق ہیں چلو حضور ﷺ سے چل کر دریافت کریں۔"

صحابہ کی خشیت وشدت حرص کی کچھ حد ہے کہ تغیر حالت کو بھی نفاق سمجھنے لگے وہ چاہتے تھے کہ جو حالت حضور ﷺ کے سامنے ہوتی ہے وہی حالت ہمیشہ رہے اور اس کے تغیر سے انہیں اپنے ضعف ایمان کا اندیشہ ہوتا تھا آج ہماری یہ حالت ہے کہ تغیر احوال سے تو کیا اندیشہ ہو تغیر اعمال سے بھی نہیں ہوتا کبھی جماعت فوت ہو جاتی ہے، کبھی نماز قضا ہو جاتی ہے، کبھی غیبت و نگاہ بد میں مبتلا ہیں اور اپنے کو صاحب نسبت اور صاحب کمال سمجھتے رہتے ہیں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہوتا کہ یہ حالت کیسی ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عشق میں کمی ہے عشق کامل ہو تو بات بات میں اندیشہ اور خوف ہوتا ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی　　با سایہ ترا نمی پسندم

(یعنی عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں میں تیرا سایہ کے ساتھ ہونا بھی پسند نہیں کرتا)

ان کا اندیشہ بھی ویسا ہی تھا حضرت حنظلہؓ کو اپنے اوپر نفاق کا خوف ہوا تھا وہ نفاق کو عام سمجھ گئے حالانکہ نفاق نام ہے اظہار الایمان وابطان الکفر کا (یعنی کفر کو چھپانے کا) مگر چونکہ اس حالت کو فی الجملہ اس سے مشابہت تھی اس لئے خوف ہوا اور فی الجملہ مشابہت یہ تھی کہ جو حالت حضور ﷺ کے سامنے کچھ اور پیچھے کچھ ہو تو جتنا حضور ﷺ کے سامنے ہوتا تھا بعد میں اس میں کمی ہونے سے اندیشہ نفاق کا گو نفاق کامل نہ سہی ناقص ہی سہی کیونکہ جس طرح ایمان کے بہت سے مراتب ہیں اسی طرح نفاق کے بھی مراتب ہیں نفاق دون نفاق (نفاق کم درجہ کا نفاق) وکفر دون کفر (کم درجہ کا کفر ہے) مگر عاشق کے نزدیک ناقص کا احتمال بھی خطرناک اور اندیشہ ناک ہے اب دونوں حضرات طبیب کامل سید الاطباء الروحانیین کے پاس پہنچے اور حضور ﷺ سے عرض کیا آپؐ نے فرمایا:۔

واللہ لو کنتم بعدی کما تکونون عندی لصافحتکم الملائکۃ علی الفرش ولکن یاحنظلۃ ساعۃ ساعۃ (او کماقال)

ترجمہ: ''بخدا اگر تم میرے پیچھے بھی ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے ہوتے ہو تو تم سے فرشتے بستروں پر مصافحہ کرتے لیکن اے حنظلہ ایک وقت اِس طرح کا ہوتا ہے ایک وقت اُس طرح کا۔''

یہاں علماء قشر کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت حنظلہ کی موجودہ حالت کامل نہ تھی گو نفاق بھی نہ تھا کامل حالت وہی ہے کہ جو حضور ﷺ کے پیچھے بھی ویسے ہی رہے جیسے آپؐ کے سامنے ہوتی تھی حتیٰ کہ فرشتے مصافحہ کرنے لگتے مگر محققین نے فرمایا ہے کہ نہیں۔۔۔حالت موجودہ ہی کامل تھی کیونکہ ہر چیز کا کمال جدا ہے انسان کا کمال یہی ہے کہ اس میں بشریت کامل ہو جیسے روٹی کا کمال ہے اس میں سیلان نہ ہو بلکہ رطوبت کم ہو جائے۔ سیلان پانی کا کمال ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کو جس حکمت کیلئے پیدا کیا ہے اس حکمت کا ظہور جس انسان سے ہو وہ تو انسان کامل ہے وہی عالم ناسوت میں رکھا جائے گا اور جس میں ملکیت کا غلبہ ہو جائے وہ عالم ملکوت میں پہنچا دیا جائے گا تو حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ بشریت کا مقتضاء یہی ہے کہ جو تم کو پیش آیا ہے کہ کبھی حضورؐ کامل کبھی حضور ضروری۔ کیونکہ غیبت محضہ تو کاملین کو ہوا ہی نہیں کرتی اور حضرت حنظلہ کے قول نافسنا الاموال والاولاد سے غیبت محضہ کا ہو جانا مراد نہیں بلکہ اس درجہ حضور نہ رہنا مراد ہے۔ جیسا رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہوتا تھا سو حضورؐ کے مراتب مختلف ہیں کبھی کاملین کو اعلیٰ درجہ کا ظہور ہوتا ہے کبھی اس سے کم) اگر تمہاری ہمیشہ وہی حالت رہے جو میرے سامنے ہوتی ہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے یعنی تم میں ملکیت غالب ہو جاتی اور تم ملائکہ سے جا ملتے اور اس حالت میں تم انسان کامل نہ ہوتے لہذا موجودہ حالت ہی کامل ہے۔

یہ تقریر ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی۔۔۔واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کیونکہ اگر یہ حالت جو حضرت حنظلہ نے بیان فرمائی تھی ناقص حالت ہے تو اس سے حضرت صدیق اکبرؓ کا بھی ناقص ہونا لازم آتا ہے کیونکہ انہوں نے یہ حالت سن کر فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ کی نسبت نقص کا وہم بھی نہیں ہو سکتا اور اگر یہ نقص ہوتا تو حضورؐ اس کی تکمیل کا طریق ارشاد فرماتے لیکن آپ نے تو اس حالت کی تقریر فرمائی اور قصہ ہی ختم کر دیا اور فرمایا کہ یوں ہی ہونا چاہئے معلوم ہوا کہ تغیر حالت نقص نہیں اور ایمان کے لئے حضور کا ہمیشہ یکساں ہونا لازم نہیں ہے۔ (وعظ حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ تحصیل المرام ص ۲۴)

میرے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا۔۔۔تو اب حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی۔ اس کا ابطال لازم آتا تو اس

غیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہو گیا تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی بمقابلہ عقل کے۔۔ (وعظ۔ آثار العبادہ ص ۱۷)

۴۔ رافضی کہتا ہے حضرت عائشہ نے کہا:

انّ عثمان ابطل الحدود و توعد الشهود. (انساب الاشراف ج ۵ ص ۳۳)

ترجمہ: ''عثمانؓ نے نظام حدود بیکار کر دیا ہے۔ گواہوں کو گواہی دینے سے ڈراتے رہے۔''

''الانساب والاشراف'' حدیث کی کتاب نہیں جس کے حوالے سے ڈھگو نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ نہ اس نے الانساب والاشراف سے اس کا کوئی حوالہ ساتھ دیا ہے' جہاں سے اس نے یہ روایت لی ہو۔ پھر آگے روایت کی سند مطلوب ہوتی ہے جو اس نے نقل نہیں کی۔ اب آپ ہی سوچیں' کیا ان جیسے حوالوں سے حضرت عثمانؓ کی عظمت کو جو اہل سنت کے ہاں تواتر اور قطع ویقین سے ثابت ہے کیا مجروح کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ڈھگو نے انساب الاشراف سے حضرت عائشہؓ کے نام سے یہ روایت اس طرح نقل کی ہے۔

احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری روایت کرتا ہے:

''ابو اسحٰق کہتا ہے مجھے مسروق (۶۲ھ) نے بتایا کہ ولید بن عقبہ نے قے کی تو اس پر شراب پینے کے الزام میں چار آدمی حضرت عثمان کے پاس گئے۔ (۱) ابو زینب (۲) جندب بن زہیر (۳) ابو حبیبہ الغفاری اور (۴) صعب بن جثامہ اور انہیں ولید کے شراب پینے کی خبر دی۔ آپ نے جندب بن زہیر سے پوچھا:

أانت رایت اخی یشرب الخمر؟ (انساب الاشراف ج ۶ ص ۱۴۴ طبع بیروت)

ترجمہ: کیا تو نے خود میرے بھائی کو شراب پیتے دیکھا ہے؟

اس نے کہا: **معاذ اللہ، ولکنی أشهد انی رأیته سکران یقلسها وانی اخذت خاتمه من یده وهو سکران.**

ترجمہ: ''ایسا نہیں، لیکن میں نے اسے نشہ میں دیکھا، اس کے پیٹ سے کوئی چیز اوپر آ رہی تھی، میں نے اس کے ہاتھ سے اس کی انگوٹھی بھی اتاری اور اسے پتہ نہ چلا۔''

آپ نے اس کی اس شہادت کو شراب پینے کی چشم دید شہادت نہ ہونے کی وجہ سے قبول نہ کیا اور گواہوں کو جھوٹا کہا کہ جب ان کے پاس چشم دید شہادت نہیں، وہ کیوں اس بات کو پھیلا رہے ہیں۔ ابو اسحٰق کہتا کہ ہے کہ پھر یہ لوگ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے تو آپ نے ان کی اس شہادت کو کافی سمجھا اور کہا کہ عثمانؓ نے حدود باطل کر دی ہیں اور گواہوں کو ڈرا دیا ہے۔

ابواسحٰق حضرت عائشہؓ سے یہ الفاظ روایت کر رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس نے حضرت عائشہؓ کا زمانہ نہیں پایا، نہ وہ آپ سے ان الفاظ کے سننے کا خود مدعی ہے۔ پھر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ چار شخص حضرت عثمان کے پاس گئے تھے تو آپ نے صرف جندب بن زھیر سے کیوں پوچھا، کہ کیا تم نے خود ولید کو شراب پیتے دیکھا ہے؟ اور اس نے معاذ اللہ کہہ کر اپنے دیکھنے کا اس طرح انکار کیوں کیا؟

اس فرضی روایت کے لیے اتنا جاننا کافی رہے گا کہ اس میں جن چار شخصوں کو گواہ بنا کر حضرت عثمان کے پاس بھیجا جا رہا ہے اس میں ایک نام صعب بن جثامہ ہے جس کی وفات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں ہو چکی تھی۔ اب جعلسازوں نے اسے حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ایک مقدمے کا گواہ بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اس روایت کے جعلی ہونے کے لیے کیا اتنی بات کافی نہیں؟

حافظ ابن عبدالبر (۴۶۲ھ) صعب بن جثامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

مات فی خلافة ابی بکر . (الاستیعاب ج ۲ ص ۱۹۸)

پھر چشم دید گواہی میں اور قرائن سے الزام ثابت کرنے میں جو فرق ہے اسے نہ بھی ملحوظ رکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس سے ایک حد نافذ ہونے سے رہ گئی۔ اس سے حضرت عثمانؓ پر ابطل الحدود کا الزام کیسے آ گیا کہ آپ نے کئی حدیں نافذ نہیں کیں۔ پھر اگر حضرت عثمان کے عہد میں حدود ویسے ہی روک دی گئی تھیں تو پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر پر حضرت ام المومنین آبدیدہ کیوں ہو گئیں۔ انہیں تو اس پر اطمینان کا سانس لینا چاہیے تھا۔ آگے یہی مورخ بلاذری (۲۷۹ھ) لکھتا ہے:

و خرجت عائشة رضی اللّٰه عنها باکية علٰی قتل عثمانؓ فقال لها عمار بن یاسر کنت بالامس تحرضین علیه ثم انت الیوم تبکینه و جاء علی الی امراة عثمان فقال لها من قتل عثمان رحمه اللّٰه ...... فقال محمد لم تکذب فقد دخلت واللّٰه علیه وانا ارید قتله فقد ذکر ابی فقمت عنه وانا تائب.

(انساب الاشراف. البلاذری ۲۷۹ھ. ص ۱۸۷ ج ۲)

اس پس منظر اور جعلی گواہوں پر کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایسی غلط بات کہی ہو کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں حدود کو باطل کر رکھا اور گواہوں کو ڈرا رکھا تھا۔

پھر اس ایک واقعہ پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ولید پر بالآخر شراب نوشی کی حد قائم کی گئی اور حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو حد لگانے سے نہ روکا تو اس سے یہ الزام از خود غلط ٹھہرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے (معاذ اللہ) نظام حدود باطل کر رکھا تھا۔ بلاذری ہی اس روایت سے آگے جا کر لکھتا ہے پھر حضرت علیؓ نے اس پر حد لگا دی تھی۔

وجلده بسوط له شعبان اربعین جلدة ولم ینزع جبته.

(انساب الاشراف ج ۲ ص ۱۴۵)

اب کیا کوئی صاحب انصاف حضرت عثمانؓ کے بارے میں کسی ایک واقعہ میں بھی کہہ سکتا ہے کہ معاذ اللہ آپ نے اسلام کے نظام حدود کو باطل کر رکھا تھا؟

پھر اس روایت کے ان الفاظ کو ذرا اور غور سے پڑھیں تو کیا ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقامت حدود کا کھلا اقرار نہیں ہے؟ اگر ان کے عہد میں بھی حدود اسلامی نافذ نہ تھیں تو پھر کیا کوئی ذی عقل حضرت عثمانؓ پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ انہوں نے حدود کا نظام روک دیا ہے۔ ان کے خلاف تو ابطال حدود کی بات تبھی کہی جا سکتی ہے کہ اس سے پہلے سلطنت میں حدود قائم ہوں۔

پھر اس روایت کا اگلا جملہ بھی اس پہلے جملہ کی تردید کر رہا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے وتوعد الشهود کہ آپ نے گواہوں کو ڈرا رکھا ہے۔ یہ کس لیے؟ کہ وہ شہادت نہ دیں۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ نظام حدود قائم ہوں ورنہ گواہوں کی شہادت درست یا غلط ہونے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ یہ دوسرا جملہ بتلا رہا ہے کہ آپ پر ابطل الحدود کا الزام سرے سے غلط ہے ورنہ توعد الشهود کی بات کبھی نہ کہی جاتی۔ اس روایت کے دونوں جملے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اس کے دو جملوں میں یہ باہمی ٹکراؤ نہ ہوتا۔

پھر اس روایت میں بھی کسی نہ کسی پہلو سے واقدی آ نکلتا ہے۔ بلاذری کی محولہ بالا روایت کے لیے آپ واقدی کی آمد پر بھی نظر رکھیں۔

قال الواقدی وقد یقال ان عثمان ضرب بعض الشهود اسواطاً.

(انساب الاشراف ص ۱۴۴)

اب ہمارے قارئین واقدی سے بھی کچھ تعارف کرتے چلیں۔ خطیب بغدادی امام شافعیؒ سے نقل کرتے ہیں:

کتب الواقدی کذب "واقدی کی ایسی روایات سب جھوٹ ہیں۔"

علامہ شبلی بھی لکھتے ہیں:

"واقدی کو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں۔" (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۸)

واقدی کذاب اپنی جگہ نا قابل اعتبار تو تھا ہی لیکن جس صیغہ مجہول سے اس نے یہ بات کہی ہے (وقد یقال) اس نے اس بات کو اور بھی کمزور کر دیا ہے۔ اثنا عشریوں کے پاس بس اسی قسم کی روایتیں ہیں جن سے صحابہ کی عزتوں سے کھیلتے

ہیں اور رشد راشدین سے منہ پھیرتے انہیں کچھ بھی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔

علامہ نور اللہ شوستری کا صریح اقرار موجود ہے کہ حضرت علیؓ اپنے دور خلافت میں کسی مسئلہ میں حضرات خلفاء ثلثہ کے خلاف نہ جاسکتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اگر کبھی بھی کہیں ابطال حدود کیا ہوتا تو حضرت علیؓ ان کے خلاف ضرور اٹھتے مگر تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے کبھی اور کہیں حضرت عثمانؓ کے خلاف لشکر کشی نہ کی۔ شریف رضی آپ کا ایک خطبہ آپ سے اس طرح نقل کرتا ہے:

واللہ لا سلمن ما سلمت امور المسلمین ولم یکن فیھا جور الاعلیٰ خاصۃً التماساً لاجر ذلک. (نھج البلاغہ ج اول خطبہ ۷۲)

ترجمہ: "خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور نظم ونسق سے رہیں گے اور صرف میری ذات زیادتی کا نشانہ بنتی رہے میں انہیں (ان خلفاء کو) تسلیم کیے رہوں گا۔ اس پر مجھے اللہ کے ہاں اجر کی امید ہے۔"

ابطال حدود میں کن کے حقوق پامال ہوتے ہیں؟ عوام کے۔ تو غور کیجئے اگر محولہ بالا روایت جو حضرت ام المومنین کی زبان سے حضرت عثمانؓ کے خلاف گھڑی گئی ہے، کچھ بھی درست ہوتی تو حضرت علی مرتضیٰ خدا کی قسم کھا کر نہ کہتے کہ خلفاء ثلثہ کے وقت میں مسلمانوں کے حقوق پوری طرح محفوظ تھے اور کہیں ابطال حدود نہ ہو پایا تھا۔ حضرت علیؓ کی اس شہادت کے ہوتے ہوئے ہم اس وضعی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ہم اس پر حضرت عثمانؓ کے خلاف کی گئی ان بحثوں کو ختم کرتے ہیں۔ ڈھکو نے یہاں اصحاب ثلثہ پر کی گئی ان جروح سے اپنا قلم روک لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہماری ان گزارشات کو سمجھنے کی استعداد اور توفیق دے۔ اب اس نے مسائل کی طرف رخ کیا ہے اور یہ وہ امور ہیں جن پر آج تک بہت کچھ دونوں طرف سے لکھا جا چکا ہے۔ ڈھکو نے بھی یہاں صرف وہی کچھ لکھا ہے جس کے جوابات علمائے اسلام کی طرف سے بارہا دیے جا چکے ہیں۔ مولانا کرم دین دبیر کے جوابات کو بھی ڈھکو کہیں توڑ نہیں سکا۔ ڈھکو نے ان ابواب میں اگر کوئی ایسی بات کہی ہے جو اس سے پہلے اس کے بزرگ نہیں کہہ سکے تو ہم ڈھکو یا اس کے ہم خیال ذاکرین سے درخواست کریں گے کہ ان کی ایک فہرست اس کتاب سے چن کر ہمیں بھیج دیں ہم ان کا جواب بھی (اگر کوئی ایسی بات نکلی) اس کتاب کے آخر میں بطور تتمہ لگا کر اس ڈھکو پر یہ آخری حجت بھی پوری کر دیں گے۔ اب بال ان کے گول میں ہے۔ جب یہ ادھر آئے گا تو ہم اسے آرام سے پھر ان کی طرف عطائے توبہ لقائے تو کہہ کر دھکیل دیں گے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

باب اوّل

تجلیاتِ آفتاب

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ اٹھائیس آیات

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد.

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ پہلی آیت

والذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اٰووا و نصروا اولئک ھم المؤمنون حقاً. لھم مغفرۃ ورزق کریم. (پ ۱۰ الانفال ۷۴)

ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور وہ لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مومن، ان کے لیے بخشش ہے اور روزی عزت کی۔"

مہاجرین کی ان تین صفات کے پہلے تین خلفاء اور پھر اسی تسلسل میں چوتھے بھی مظہر کامل ٹھہرے۔ ان اٹھائیس آیات میں لفظ ایمان تقریباً ہر آیت میں موجود ہے، ان پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ چند علمی مباحث آپ کے سامنے لا رہے ہیں۔ ان کی روشنی میں آئندہ ان اٹھائیس منزلوں میں چلنا آسان ہوگا۔ ہم باب اول میں صرف پہلی آیت اور اس کے متعلقہ مضامین پر بحث کریں گے۔ **واللہ ھو الموفق لما یحبہ و یرضی بہ۔**

اہل سنت ہی وہ امت مسلمہ ہیں جو صفحہ کائنات پر آفتاب ہدایت اور ماہتاب رسالت کی دو تیز روشنیوں میں اس تیز رفتاری سے چلے کہ دیکھتے دیکھتے دنیا کی سب سے بڑی علمی، سیاسی، اخلاقی اور روحانی قوت بن گئے جو لوگ ان کی ان فتوحات سے پریشان تھے انہوں نے پوری کوشش کی کہ جس طرح بھی بن آئے خلافت راشدہ اور خلافت امویہ کے رہوار عمل کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دیا جائے تاہم یہ دنیا جب تک ستاروں کی روشنی میں چلتی رہی مسلمانوں نے آفتاب ہدایت اور ماہتاب رسالت کے دونوں چراغ روشن کیے رکھے۔ حضور خاتم النبیینؐ اور حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی تعلیم بھی یہی رہی

کہ یہ دونوں چراغ جلتے رہیں۔ حضور اکرمؐ نے صحابہؓ کو ان دونوں امانتوں کا امین بنایا اور فرمایا:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ نبیہ.

(موطا امام مالک ۳۶۳)

ترجمہ : ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جب تک ان دو سے تمسک کروگے گمراہ نہ ہوگے۔
اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔''

حضرت علیؓ کی وصیت نمبر ۲۳ علامہ رضی نے نہج البلاغہ میں اس طرح رقم کی ہے' آپ نے فرمایا:

وصیتی لکم ان لا تشرکوا باللہ شیاً و محمد صلی اللہ علیہ وسلم والہ فلا تضیعوا سنتہ اقیموا ھذین العمودین و اوقدوا ھذین المصباحین و خلاکم ذم.

(نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۲۴)

ترجمہ : ''میری تمہیں وصیت ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ضائع نہ کرنا' توحید و سنت کے ان دو ستونوں کو گرنے نہ دینا اور کتاب و سنت کے ان دو چراغوں کو روشن رکھنا پھر ہر برائی تم سے جاتی رہی۔''

آپ کی یہ وصیت کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہی کی تلقین ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے لیے کتاب و سنت سے تمسک کی تعلیم دی ہے۔ آپؓ نے سنت کو نکال کر اس کی جگہ یہ روایت نہیں سنائی کہ اس امت کا ماخذ علم قرآن اور اہل بیت ہیں۔ اہل بیت سے محبت بے شک ہر مومن کے دل میں سمائی ہے لیکن اس کا درجہ حضور اکرمؐ کی سنت کے بعد ہے۔ اسلام میں علم کے اصل ستون کتاب و سنت ہیں۔ اب جو شخص بھی کہے کہ اسلام کی دو وزنی چیزیں کتاب اللہ اور عترت رسول ہیں تو لازماً یہ روایت ضعیف ہوگی۔ جس روایت میں بھی سنت کو دوسرے ماخذ علم کا درجہ نہ دیا جائے اس روایت کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ حضرت علیؓ مرتضیٰؓ ارشاد فرماتے ہیں:

واقتدوا بھدی نبیکم فانہ افضل الھدی واستنوا بسنتہ فانھا اھدی السنن وتعلموا القرآن فانّہ احسنُ الحدیث. (نھج البلاغہ ج اول خطبہ ۱۰۸)

ترجمہ : ''اور تم اپنے نبی کی سیرت پر چلو کہ یہ بہترین سیرت ہے اور آپ کی سنت پر چلو وہ بہترین راہ عمل ہے اور قرآن کا علم حاصل کرو وہ بہترین کلام ہے۔''

دیکھیے حضرت علیؓ اسلام کے ماخذ علم قرآن و سنت کو قرار دے رہے ہیں یا اسلام کی دو بڑی چیزیں قرآن اور اہل بیت کو ٹھہرا رہے ہیں؟ حق یہ ہے کہ سنت کو اسلام کے ماخذ علم سے کسی طرح بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ پھر اس ارشاد پر بھی غور فرمائیں:

متمسکون بحبل القرآن یحیون سنن اللہ وسنن رسولہ. (ایضاً ج ۲۔ خطبہ ص ۱۹۰)

ترجمہ : ''وہ خدا کی رسی قرآن سے تمسک کرتے ہیں اور پیغمبر کی سنتوں کو زندگی بخشتے ہیں۔

پھر آپ نے یہ بھی کہا :

ولکم علینا العمل بکتاب اللہ تعالیٰ ...... وسیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والقیام بحقہ والنعش بسنتہ . (ایضاً ج ۲ ص ۱۰۰)

ترجمہ : ''اور تم پر اور ہم پر اللہ کی کتاب پر عمل لازم ہے۔ اور حضورؐ کی سیرت پر آپ کے حق کا قیام اور آپ کی سنت کا اہتمام۔''

جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں باری باری گیارہ چراغ روشن ہوئے صرف ایک اندھیرے میں رہا جس کی وجہ سے صداقت ہمہ گیر پیرائے میں سامنے نہ آ سکی' اگر وہ اندھیرے میں نہ جاتے تو ایک دنیا ان سے مستفید ہوتی' اور اگر وہ گئے ہی تھے تو اتنا زیادہ عرصہ وہاں نہ رہتے اس سے شاید یہ دنیا صداقت کی کچھ تجلیات دیکھ پاتی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ غار میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہم ان کے اس دینی تصور کو تجلیات صداقت میں کہیں شمار نہیں کر سکتے۔ تجلی وہی ہے جس میں جلوہ ہو۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تجلیات اب تک لوگوں کے سامنے ہیں۔ وہاں روشن سویرا ہے اور غار کی تنہائی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اگر وہ باہر ہوتے تو ہم ان کی قدم بوسی کرتے۔ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جن میں قرآن اترا تھا اور وہ حضور کے اولین مخاطب تھے۔

اس متفق علیہ اصول نے مسلمانوں کے سامنے یہ راہ تجویز کر دی کہ قرآن فہمی میں وہ سنت پر چلیں کہ جب یہ آیات اتریں تو انہیں کس معنی و مفہوم میں سمجھا گیا تھا۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ پہلی آیت

مولانا کرم الدین دبیر نے آفتاب ہدایت کی اٹھائیس کرنیں روشن دکھائی ہیں اور قرآن کریم سے اٹھائیس آیات کی نشاندہی کی ہے جو صحابہ کرامؓ اور ان کے پیشوا خلفاء راشدین کی صداقت کا کھلا نشان ظاہر ہو رہی ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے پارہ ۱۰ سورہ الانفال کی یہ آیت پیش کی ہے:

والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولئک ھم المؤمنون حقّا. لھم مغفرۃ ورزق کریم. (پ ۱۰ . الانفال ۷۴)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں ٹھکانہ دیا اور ان کی مدد کی وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مومن ہیں۔''

پیش نظر رہے یہاں ایمان کا لفظ دو دفعہ وارد ہے (۱) والذین آمنوا اور (۲) اولئک هم المؤمنون حقا۔ پہلے سے ظاہر میں ایمان لانا مراد ہے اور دوسرے میں اس کی اندر کی حقیقت کا پتہ دیا جا رہا ہے۔ سو ظاہرا ایمان لانے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جب کہ ان کے اندر کی خبر بھی ساتھ دی گئی ہو۔

قرآن پاک کے بتلائے کھلے پانچ نشان

قرآن پاک نے یہاں آخرت میں مغفرت اور رزق کریم (جنت) پانے والوں کے یہ پانچ کھلے نشان بتلائے ہیں۔ عربی میں نشان (آیت) اسے کہتے ہیں جو ایک کھلی کتاب ہو۔ جس کو ہر شخص دیکھ سکے۔ چھپے نشان کبھی نشان شمار نہیں ہوتے نہ وہ کسی کو رہنمائی بخشتے ہیں۔ قرآن پاک کے پانچ کھلے نشان یہ ہیں جن میں تین مہاجرین کے ہیں اور دو انصار کے ہیں۔

(۱) ایمان لانا (۲) مکہ سے ہجرت کرنا

(۳) اللہ کی راہ میں جہاد کرنا (۴) مہاجرین کو مدینہ میں پناہ دینا

(۵) اور ان کی نصرت کرنا

ان پانچ میں پچھلے چار عمل وہ ہیں جو محسوسات میں سے ہیں۔ (۱) ہجرت (۲) جہاد (۳) دوسروں کو ٹھکانہ دینا (۴) اور ان کی مالی و سماجی نصرت۔ یہ وہ اعمال ہیں جو کھلے طور پر دیکھے جا سکتے ہیں اور وہ لوگوں نے دیکھے۔ صرف پہلا عمل ہے جو دل کا عمل ہے؛ جب یہ کھلے چار عملوں کے ساتھ جوڑا گیا تو اب یہ بھی کوئی چھپا عمل نہیں رہا۔ یہاں ظاہراً ایمان قبول کرنا (اسلام لانا) مراد ہے اور وہی چیز محسوسات میں شمار ہو سکتی ہے یہاں جو چیز بطور نشان بتلائی گئی ہے۔ اسے ایک مخفی حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ قرینہ بتلاتا ہے کہ یہ پانچ کھلے نشان ہیں اور یہ ان لوگوں کے نشان ہیں جو آخرت میں مغفرت اور جنت پائیں گے۔

یہ ظاہراً ایمان لانے والے اگر چار اگلی شرطوں کو بھی پا گئے تو اب ان کے اندر کے ایمان کی بھی تصدیق ہو گئی۔ اولئک هم المؤمنون حقاً میں ان کے اسی ایمان کی خبر دی گئی ہے۔ جب ایک ہی آیت میں ایمان کا لفظ دو دفعہ آیا ہے تو ایک جگہ اس کا ظاہری پیرایہ مراد ہے اور دوسری جگہ اس کے اندر کی حقیقت کی ایک الٰہی خبر دے دی گئی ہے۔

یہ اسی طرح ہے جس طرح قرآن پاک کی اس آیت میں ایمان کا لفظ دو دفعہ ہے۔ پہلے رسماً ایمان لانا مراد ہے اور دوسری جگہ حقیقت میں ایمان پر ہونا۔ عمل کی قید اس دوسرے پیرائے میں وارد ہوئی ہے اور اسے ایمان حقیقی سے جوڑا گیا ہے۔

ان الذين آمنوا والذين هادوا والنصارىٰ والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم. (پ ۲ البقرة ۶۲)

ترجمہ: "بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے، یہودی ہوئے، عیسائی ہوئے اور صابئین ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو انہیں ملے گی اس کی مزدوری ان کے رب کے پاس سے۔"

ان الذين آمنوا والذين هادوا والصابئون والنصارىٰ من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحاً فلا خوف عليهم ولاهم يحزنون. (پ ۵ المائدہ ۶۹)

ترجمہ: "بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے، یہودی اور عیسائی ہوئے ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر (صحیح معنیٰ میں) ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

سو قرآن پاک کے بتلائے پانچوں کھلے نشان وہ ہیں جنہیں ظاہراً دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی اندرونی تصدیق اس ذات نے کر دی جو ظاہر و باطن کی ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس نے فرمایا:

اولئک هم المؤمنون حقا۔ وہی ہیں سچے مومن۔

مومن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ خدا ان کے اندر کی بات سامنے لے آئے۔ دنیا ظاہر پر قائم ہے اور ہمیں دنیوی سالات میں فیصلہ کرتے وقت ظاہر کو ہی دیکھنا ہوتا ہے جہاں یہ پانچ نشان حسی طور پر آپ کے سامنے آئیں اور اگلے چار ان پہلے نشانوں کی بھی تصدیق کریں تو عقیدے میں قرآن کی بتلائی ہوئی ان کے اندر کی بات اولئک هم المؤمنون حقا (پ۱۰ الانفال) بصدق دل قبول کرنی چاہیے۔ اہل حق ہمیشہ سے اس ایمان کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔

رافضی کی قرآن کے کھلے نشانوں کو بے نشان کرنے کی کوشش

مولانا دبیر کی پیش کردہ آیت میں والذین آمنوا سے مراد ظاہری طور پر اسلام کو قبول کرنا ہے۔ اس ظاہر کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حقیقت ایمان بتلا دیا ہے۔ قرآن کے ارشاد اولئک هم المؤمنون حقا کہنے کے بعد اب ہمیں پہلے امنوا پر ایمان کی تصدیق کے لیے کوئی اور شرط بڑھانے کا حق نہیں۔

نمونہ ظاہر سے لیا جاتا ہے اندر سے نہیں

آپ بازار میں کسی ایک رنگ کا اور کپڑا لینے جائیں تو دوکاندار سے کہتے ہیں کہ اس رنگ کا کپڑا دے یا کسی سنار کو کہا اس جیسا سونا دو اور وہ نمونے کا سونا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ نمونہ ظاہر سے لیا جاتا ہے۔ یہ کسی باطنی حقیقت کا نام

نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے کہ(دعوت اسلامی کے دوسرے دور میں) کچھ ایسے لوگوں نے حضورؐ پر ایمان لانے کی شہادت دی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو خبر دی کہ وہ جھوٹے ہیں۔ واللّٰه يشهد انهم لكذبون۔

(پ۲۸ المنافقون)

منافقوں کو کہا گیا کہ ایمان میں نمونہ سابقین اولین (جو دعوت اسلامی کے پہلے دور میں داخل دائرہ اسلام ہوئے) سے لاؤ' ان جیسا ایمان لاؤ' یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ ان کا ظاہر ایمان ہی ان کے اندر کی خبر ہو۔ نمونہ ظاہر سے ہی لیا جاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سابقین اولین اپنے ایمان میں اس مقام پر تھے کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اور یہ بعد میں اسلام لانے کے مدعی ان پہلوں کو بے وقوف کہتے تھے' ان پر تنقید کرتے تھے اور ان میں سے ایک کو بھی مومن کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔

واذا قيل لهم امنوا كما امن النّاس قالوا انؤمن كما امن السفهاء الا انّهم هم السفهاء ولكن لا يعلمون. (پ ا البقرہ ۱۳)

ترجمہ : ''اور جب ان منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ تم اس طرح کا ایمان لاؤ جس طرح کا ایمان ان پہلے ایمان لانے والوں کا ہے تو یہ کہتے ہیں کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں۔ خبردار بے وقوف یہ خود ہیں'' (جو ان کے ظاہر ایمان کو نہیں مانتے)

یہ لوگ بنا بر نفاق حضورؐ کے پاس آتے جاتے اور بظاہر نمازیں بھی پڑھتے تھے لیکن یہ حضورؐ کے ہم نشین نہ ہوتے تھے۔ حضورؐ کی یہ معیت نہ پاتے تھے۔ ان کی معیت اپنے ساتھیوں سے ہی رہتی تھی وہ انہیں کہتے تھے انا معكم ہم تمہاری معیت میں ہیں۔ صحابہؓ حضورؐ کے ہم نشین اور ہم مجلس رہتے تھے۔ انہیں قرآن کریم میں والذين معه (پ۲۶ الفتح) میں حضورؐ کی معیت میں رہنے والے کہا گیا ہے۔ منافقین جب صحابہؓ کو بے وقوف کہتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ ان میں بیٹھتے اٹھتے نہ تھے' نہ وہ ان کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ سو ان کا حضورؐ اور صحابہؓ کے پاس آنا جانا تو رہا لیکن یہ حضورؐ کے ہم نشین اور آپ کی مجلس میں بیٹھنے والے کبھی نہ سمجھے گئے۔ یہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو علی الاعلان بیوقوف کہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جو ان پہلے ایمان لانے والوں کو ان بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ ٹھہرایا تو یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ صحابہؓ کا ایمان ظاہر و باطن میں ایک سا ہو' صحابہؓ کے اس ظاہر ایمان میں ایمان کی حقیقت جلوہ گر نہ ہوتی تو انہیں دوسروں کے لیے نمونہ ایمان نہ بنایا جاتا۔ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر بھی ملتا ہے کہ یہ منافق صحابہؓ کے ہم نشین ہونے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان سے منہ پھیر کر رہتے تھے اور صحابہؓ سے منہ پھیرنے پر اللہ تعالیٰ نے انہیں آخرت میں پکڑے جانے کی وعید سنائی ہے۔

فان امنوا بمثل ما امنتم به فقداهتدوا وان تولّوا فانما هم فى شقاق فسيكفيكهم اللّٰه وهو السميع العليم. (پ ا البقرہ ۱۳۷)

ترجمہ: ''پس اگر وہ ایسا ایمان لائے جس پر کہ تم ایمان لاچکے تو بے شک وہ ہدایت پاگئے اور اگر وہ (ان سے) پھر گئے تو وہ مخالف ہیں سو اللہ تعالیٰ جلدی ان سے نبٹ لیں گے اور وہ سننے والا ہے' جاننے والا ہے۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ظاہر ہے کہ نمونہ ظاہر رنگ سے لیا جاتا ہے۔ چھپے امور کبھی نمونہ نہیں ٹھہرائے جاتے۔ صحابہؓ کا ظاہر ایمان ہی ان کے باطن ایمان کی خداوندی خبر ہے۔ ان کے اندر کے ایمان کی تصدیق میں کہا گیا **اولئک هم المومنون حقا** یہ لوگ اللہ سے ایمان لائے ہوئے ہیں۔

سو مولانا دبیر کی یہ پیش کردہ پہلی آیت صحابہؓ کے ایمان کی ایک ایسی خبر ہے جو کسی پہلو سے رافضی سے جھٹلائی نہیں جاسکی اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اب وہ مختلف کڑیاں اکٹھی کرے اور ظاہر ہے کہ نص کڑیوں کی محتاج نہیں ہوتی۔

رافضی یہاں قرآن کی مختلف کڑیاں ملانے میں لگ کیسے گیا ہے۔ ایمان خالص اور غیر خالص کی بحث چھیڑ کر اس نے پھر اسے ایک مخفی حقیقت بنا دیا ہے' وہ لکھتا ہے:

''قرآن مجید کی مختلف کڑیاں باہم ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول ثواب کی پہلی شرط خالص ایمان ہے۔ (تجلیات ص۳۹)''

ناظرین! یہاں ''معلوم ہوتا ہے'' کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ یہ کوئی واضح اور روشن بات نہیں۔ یہ رافضی کی اپنی نظر ہے اور اس کے ہاں یہ صرف ایک نظری مسئلہ ہے۔ ہمارے ہاں مومن کا ایمان ایک قطعی مسئلہ ہے وہ یہ کہ ایک ہی آیت میں جب ایمان کا لفظ دو دفعہ آئے تو پہلے سے مراد ظاہراً ایمان لانا اور دوسرے سے مراد اس کی حقیقت صادقہ ہوتی ہے۔ مولانا دبیر کی پیش کردہ آیت میں پہلے امنوا میں اگر خالص ایمان کی شرط لگائی جائے تو پھر اس کی خبر **اولئک هم المؤمنون حقا** بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ اس خبر نے ان کے ایمان کی تصدیق کردی کہ وہ خالص ایمان کی دولت سے مالا مال تھے۔

رافضی اس آیت کا جواب دینے میں بالکل تہی دامن رہے ہیں۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ وہ بس اب کڑیاں ہی ملاتے رہیں۔ اور اپنے اس موقف کو وہ صرف ایک نظریاتی درجہ میں رکھیں اسے اس صورت میں قرآن کا قطعی فیصلہ نہ کہا جاسکے گا۔ یہ بس ایک ایسی بات ہے جو انہی کو معلوم ہو رہی ہے۔

رافضی کو ہمارا پہلا کھلا انعامی چیلنج

قرآن کریم کی سورہ انفال کی زیر بحث آیت میں لفظ امنوا سے اگر کسی صحابی رسولؐ ' ائمہ اہل بیت کے کسی بزرگ یا مفسرین تابعین میں سے کسی مقتدر عالم نے خالص ایمان کی شرط لگائی ہو اور اولئک هم المؤمنون حقا کو ان کے اندر کے ایمان کی خبر نہ مانا ہو تو ایسا ایک صحیح حوالہ پیش کرنے پر اس رافضی کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔

اب آیئے قرآن کے ہر کھلے نشان کو بے نشان کرنے کی رافضی کوشش کا ذرا اور تجزیہ کریں' رافضی لکھتا ہے:

''حصول ثواب کی پہلی شرط خالص ایمان ہے۔'' ایمان ایک کیفیت قلبی ہے جس کا تعلق باطن سے ہے۔ لفظ خالص کی شرط لگا کر اسلام لانے کے ظاہری عمل کو اس نے بالکل بے اعتبار کر دیا ہے۔ پھر عمل صالح کے ساتھ اخلاص کی شرط لگا دی۔ اخلاص بھی ایک اندرونی حال ہے' ظاہر میں اس کی شہادت کون دے سکتا ہے؟ استقامت کے لیے خاتمہ بالخیر کی شرط لگا دی۔ کسی کا خاتمہ ایمان پر ہو رہا ہے یا نہ' یہ بھی ایک اندرونی حال ہے اس کا پتہ ظاہر میں کوئی نہ دے گا۔

رافضی نے یہ تین شرطیں لگا کر قرآن کے کھلے تین نشانوں کو اس طرح بے نشان کر دیا کہ اب وہ حضرت عثمانؓ ہوں یا حضرت علیؓ ' حضرت فاطمہؓ ہوں یا حضرت عائشہؓ ' حضرت ابوذرؓ ہوں یا حضرت ابوہریرہؓ ' کسی کا نہ کوئی ایمان ثابت کر سکتا ہے نہ عمل صالح' نہ کسی کی استقامت علی الاسلام کی اس طرح شہادت دی جا سکتی ہے کہ اس کے خاتمہ بالخیر پر کوئی یہاں کی شہادت ہو سکے۔ نستغفر الله من سوء الفهم دیکھئے رافضی نے کس طرح پوری آیت کی آیت ظاہر استدلال سے اڑا دی۔

اب جب یہ نشان ہی بے نشان ہو لیے اور رافضیوں کے ہاں کسی ظاہری حقیقت کا کوئی اعتبار نہ رہا تو رافضی نے اصحاب ثلثہ کے بارے میں یہ بھڑ ہانک دی کہ ان میں ان تینوں صفات میں سے ایک بھی موجود نہیں۔ یہاں نہ خالص ایمان ہے اور نہ خالص ہجرت۔ اور جہاد کا تو فقدان عیاں راچہ بیان۔ (دیکھئے ص ۴۲)

سابقین اولین کے چند نام جو نمونہ ایمان ٹھہرائے گئے

یہ چیز بدیہی ہے کہ جو صحابہ نمونہ ایمان ٹھہرائے گئے وہ پہلے سے دائرہ اسلام میں موجود تھے۔ ان کا ظاہر ایمان ہی کے ان باطن کی تصدیق تھی۔ تبھی تو وہ نمونہ ایمان ٹھہرائے گئے اور جو لوگ منافقانہ طور پر اظہار اسلام کر رہے تھے وہ بعد کے لوگ تھے۔ اسلام کے دور اول کے لوگ نہ تھے۔ سو یہ جاننا نامناسب نہ ہو گا کہ سابقین اولین کون تھے جن کے ایمان کی بطور نمونہ تصدیق کی گئی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کوشش سے ان حضراتؓ نے پہلی صف اسلام میں جگہ پائی:

(۱) حضرت عثمانؓ (۲) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۳) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۴) حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ (۵) حضرت زبیر بن العوامؓ (۶) حضرت زید بن حارثہؓ۔ پہلے اسلام لانے والوں میں یہ پانچ [illegible] سے ہیں۔ ان کے بعد (۷) حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اسلام لائے اور پھر (۸) سعید بن زید داخل دائرہ اسلام ہوئے۔ یہ آٹھ حضرات عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت علیؓ بھی اگرچہ پہلے اسلام لائے لیکن آپؓ نے اپنے اسلام کا اظہار ایک سال بعد میں فرمایا۔ حضرت عمرؓ چالیسویں نمبر پر ایمان لائے۔ آپ اسلام میں اس طرح چالیسویں ہیں جس طرح قرآن کریم میں چالیسویں سورت المؤمن ہے۔ یہ دس عشرہ مبشرہ ہوئے۔

یہ سابقین اولین ہیں جن کے ایمان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایمان کے باب میں ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اور یہی حضرات دعوت اسلامی کے دوسرے دور میں حضورؐ کے پاس نئے آنے والوں کے لیے نمونہ ایمان ٹھہرائے گئے۔ سو ان کا ایمان اپنے ظاہر سے ہر حال میں واجب التسلیم رہے گا ورنہ انہیں نمونہ بنانے کی یہ آسمانی دعوت بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔

قرآن کی آیتوں کا جواب بے سند قصوں سے

جب صحابہؓ ایمان لائے' انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں انہوں نے جانی اور مالی جہاد کیا اور اللہ نے ان کے ظاہر میں ایمان لانے کو ان کے باطن کا ایمان ٹھہرایا۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سب کے پیشوا اور سرخیل رہے' ان کا ایمان پوری ملت اسلامیہ میں خبر مستفیض کی طرح چمکا اور پھیلا۔ جنگ بدر اور جنگ احد میں یہ تینوں حضرات ان تینوں صفات کا پورا مظہر رہے۔ اب ان کے ایمان خالص اور عمل صالح کو چند بے سند قصوں اور انہیں کسی رافضی کی کج فہمی سے ملیامیٹ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ظاہری حقیقت کی نفی کے لیے اس کے کسی باطنی حال کا ثبوت بھی ویسی ہی پختہ اور قطعی دلیل سے چاہیے جیسے اس کے ظاہری حال پر اس کے ظاہر سے سند لائی گئی تھی۔ اب آیئے اس رافضی کے ان دور سے پھینکے تیروں کو ہم کچھ قریب سے بھی ملاحظہ کریں۔

حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کی نفی کے لیے رافضیوں کا بے مایہ سرمایہ

۱۔ بحیرہ راہب کے خواب سے استدلال کرتے ہوئے رافضی لکھتا ہے کہ آپ نے (معاذ اللہ) دنیوی طمع و لالچ میں آ کر حسب ظاہر اسلامی کلمہ پڑھا۔ (ص ۴۲)

الجواب: نہ اس خواب میں یہ ہے کہ ابوبکرؓ صرف ظاہری طور پر کلمہ پڑھیں گے نہ بحیرہ راہب کے بیان میں حسب ظاہر کے یہ الفاظ ملتے ہیں' نہ حضرت ابوبکرؓ اتنے بے سمجھ تھے کہ دو سال کی حکومت کی خاطر عمر بھر حضورؐ کے ساتھ ان سختیوں اور تکلیفوں میں اس طرح ساتھ رہیں جس طرح سایہ اصل کے ساتھ چلتا ہے اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا قرآن کی ان کھلی شہادتوں کو خوابوں اور بے سند قصوں سے رد کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر کوئی خواب بھی کسی کے لیے رغبت اسلام کا

سبب بن جائے تو اس سے کسی کے صحیح عقیدے سے ایمان لانے کی نفی نہیں ہوتی۔ ان دونوں میں تبائن کی نسبت نہیں ہے۔

رافضی لکھتا ہے:

''چونکہ بحیرہ راہب نے ملکی فتوحات اور غنائم کی خبر دی تھی اس لیے آپ بظاہر سایہ کی طرح آنخضرتؐ سے چمٹے رہے۔'' (ص۴۲)

مگر وہ یہ سوچ نہ پایا کہ ان ملکی فتوحات میں قوم اور ملک کی سربلندی موعود تھی یا ان سے حضرت ابوبکرؓ کی ذاتی شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ غنائم جو مسلمانوں میں تقسیم ہوتی تھیں وہ ان مجاہدین کے حصہ میں آتی تھیں یا حضرت ابوبکرؓ انہیں اپنی ذات پر صرف کرتے تھے۔ قوم اور ملک کے فوائد کو ایک ذات کے ذاتی مفادات قرار دینا اور وہ بھی دو سال کے لیے کیا اس سے بڑی بدگمانی کبھی کسی کے نصیب میں آئی ہوگی۔ قرآن کریم نے درست فرمایا:

ان بعض الظن اثم کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک گناہ ہے جس میں ایک پورے کا پورا فرقہ ملوث ہے۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد
عیب نماید ہنرش درنظر

پھر وہ اپنی طرف سے یہ بات بھی لکھتا ہے: ''راہب کی پیشگوئی پر آپ کو پورا یقین تھا۔'' (ص۴۲)

اب یہ کہنا کہ آپ کو راہب کی اس فتوحات اور تقسیم غنائم کی پیشگوئی پر پورا یقین تھا اور حضورؐ کی اس پیشگوئی پر یقین نہ تھا کہ تم قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے' اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو بدگمانی کی آخری سرحد بھی عبور کر چکا ہو اور یہ رافضی کا نصیب ہی ہے کہ اسے کھلے دن میں سورج نظر نہیں آ رہا۔

حضورؐ نے بھی تو فرمایا تھا:

اذا هلک کسریٰ فلا کسریٰ بعده واذا هلک قیصر فلا قیصر بعده والذی نفسی بیده لتنفقنّ کنوزهما فی سبیل الله. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹۶)

ترجمہ: ''جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو آگے اس کے جانشین نہ ہوں گے اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو اس کے بعد اور کوئی قیصر نہ ٹھہر سکے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں بانٹو گے۔''

کیا یہ بات باور کرنے کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو بحیرہ راہب کی بتلائی فتوحات اور تقسیم غنائم کا تو پورا یقین تھا اور حضورؐ کی بتائی فتوحات قیصر و کسریٰ کی ہلاکت اور مسلمانوں میں ہونے والی تقسیم غنائم کا یقین نہ تھا کیونکہ وہ اندر سے حضورؐ پر

ایمان نہ لائے تھے (معاذ اللہ)۔ ان کا ایمان صرف بحیرہ راہب پر تھا' وہ حضورؐ پر اندر سے یقین نہ کیے ہوئے تھے۔ ان کے ظاہر ایمان کی نفی کرنے کے لیے کیا روافض کے اس طرح کے گمان کافی ہو سکتے ہیں: ہرگز نہیں۔ کسی ظاہری قطعی بات کی نفی کرنے کے لیے کوئی باطنی بات قطعی درجے میں سامنے آنی چاہیے۔ خیالات اور وھمات سے قطعیات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کوئی خبر واحد کسی متواتر حقیقت کو توڑ سکتی ہے۔

مومنوں اور رافضیوں میں سوچ کا فرق

قرآن کریم میں اللہ کے بندوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ جب کوئی بات سنتے ہیں تو وہ اس کے اچھے مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں' اس کے برے مطلب کی طرف نہیں جھکتے۔:

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه. اولئک الذین هداهم الله واولئک هم اولوا الالباب پ۲۳ الزمر ۱۸.

ترجمہ: ''سو خوشی سنا میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات' پھر چلتے ہیں اس کے اچھے مطلب پر۔ وہی ہیں جن کو راہ دی اللہ نے اور وہی ہیں عقل والے۔''

بحیرہ راہب کے قصے میں کہیں یہ نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حضورؐ پر دل سے ایمان نہ لائیں گے' نہ بحیرہ کی پیشگوئی میں نہ حضرت ابوبکرؓ کے بیان میں...... مگر رافضی کی بدگمانی کی انتہا دیکھیے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیوی طمع و لالچ میں آ کر آپ نے حسب ظاہر اسلامی کلمہ پڑھا۔'' (ص۴۲)

ظاہر ہے جب تک اس کی نفی ویسی پختہ اور قطعی دلیل سے نہ ہو پائے۔ جس درجہ میں آپ کا ظاہر کلمہ اسلام سامنے آتا ہے اور پھر وعدوں کے یقین اور حضورؐ کی رسالت کے یقین میں کوئی نسبت تبائن بھی نہیں تو اس مکڑی کے جالے سے کچے سہاروں سے حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے اپنے اور حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کی ایک جملہ میں اس طرح خبر دی ہے علامہ طبرسی (۶۲۰ھ) بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

امنت قبل ان امن ابوبکر. (کتاب الاحتجاج ۲۰۶)

ترجمہ: ''میں ایمان لایا اس سے پہلے کہ ابوبکرؓ ایمان لائے۔''

یہ ایمان لانے میں اولیت اور آخریت بتلاتی ہے کہ دونوں کا ایمان ایک ہی نوع کا تھا پھر یہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں حضرت ابوبکرؓ کے ایمان اور اسلام دونوں کی تصدیق ہے اور آپ نے اپنے اور حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کو

ایک لفظ میں جمع کیا ہے تو کیا حضرت علیؓ کا ایمان بھی (معاذ اللہ) اس طرح ظاہر کلمہ اسلامی سے تھا کہ آپ یہ جانتے ہوئے کہ حضورؐ کا کوئی بیٹا نہیں ہوگا جو آپ کا جانشین ہو سکے میں آپ کا چھوٹا داماد ہوں گا اور مجھے آپ کی جانشینی ملے گی غدیر خم میں میری جانشینی کا اعلان ہوگا اس لیے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے (معاذ اللہ) ایسا ہرگز نہیں اس قسم کے حالات سے جب آپ کے ایمان اور اخلاص میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ آپ معاذ اللہ امیدوں سے صف اسلام میں داخل ہونے تھے تو پھر حضرت ابوبکرؓ سے ایمان میں بھی کسی امید کے ہوتے ہوئے آپ کے دل میں ایمان نہ ہونے کی دلیل نہیں لی جا سکتی۔

حضرت یوسفؑ کو اگر یقین ہوا کہ گیارہ ستارے مجھے سجدہ کریں گے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ حضرت یعقوبؑ پر ظاہراً ایمان لائے ہوئے تھے اندر سے وہ صرف اس کے منتظر رہے کہ کب میرے بھائی ضرور تمند ہو کر میرے سامنے پیش ہوتے ہیں اور مجھے بادشاہی ملتی ہے۔

کیا حضرت آدمؑ نے اس لیے توبہ کی تھی کہ انہیں زمین پر خلافت ملے گی یا ان کی توبہ خلوص قلب سے تھی۔

رافضی حضرت آدمؑ سے بھی پورے بدگمان ہیں اور کھلے طور پر ان میں کفر کی جڑ ثابت کرتے ہیں۔ (علامہ کلینی (۳۲۸ھ) حضرت امام جعفر صادقؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اصول الکفر ثلثة الحرص والاستکبار والحسد فاما الحرص فان ادم حین نهی عن الشجرة حمله الحرص علی ان یاکل منها و اما الاستکبار فابلیس حیث امر بالسجود لادم. (اصول کافی جلد ۲ ص ۵۱۷ شرح کافی جلد ۴ حصه دوم ص ۱۲۳)

ترجمہ: کفر کی جڑیں تین ہیں۔ (۱) حرص (۲) الاستکبار (۳) حسد۔ حرص آدم میں تھی۔ جب انہیں درخت کے قریب جانے سے روکا گیا تو انہیں حرص نے کہا کہ اس کا پھل کھائیں اور تکبر سو یہ ابلیس نے کیا۔

ہم اہل سنت حضرت آدم کو اس بات پر کفر کا مرتکب نہیں مانتے ہو سکتا ہے کہ یہ اثنا عشریوں کا عقیدہ ہو کہ انبیاء نبوت سے پہلے معصوم نہیں ہوتے اور خطا در کنار رہی وہ کفر کی جڑ تک پہنچ جاتے ہیں۔

استغفر اللہ العظیم۔

ہم بحیرہ راہب کے اس قصے کو طول نہیں دیتے اس کے لیے اس رافضی نے دسویں صدی ہجری سے آگے کے چار حوالے دیے ہیں اور ان میں سے ایک بھی نہیں جس نے اس واقعہ کی سند اپنے سے بحیرہ راہب تک متصل کی ہو۔ کیا اس قسم کی روایات سے حضرت ابوبکرؓ کے حضورؐ پر ایمان لانے کے تواتر اور قطع و یقین کو توڑا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس سے ہر

صاحب علم حیا کرے گا۔ لکڑی کے جالے میں گھر بنانا کسی دانشور کا کام نہیں ہے۔

ان اوهن البیوت لبیت العنکبوت . لو کانوا یعلمون. (پ ۲۱ العنکبوت ۴۱)

ترجمہ: ”بے شک سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ اسے جانے ہوتے۔“

حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کی نفی پر دوسرا رافضی حملہ

رافضی لکھتا ہے:

”وہ اسلام بھی لائے مگر آنحضرتؐ پھر بھی ہمیشہ یہی فرماتے رہے الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل کہ شرک تم میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی چلتا ہے۔“ (تجلیات ۴۳)

یہاں رافضی کے لفظ ہمیشہ پر غور فرمائیں۔ آپ کب اسلام لائے؟ جب حضورؐ مکہ میں تھے۔ اس کے بعد آپ پورے تیس سال حضورؐ کے ساتھ رہے۔ اگر حضورؐ نے پورے تیئس سال میں ہر سال ایک دفعہ بھی یہ کہا ہو تو لفظ ہمیشہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ رافضی کم از کم اس پر تیس مواقع کی نشاندہی کرے جب حضورؐ نے آپ کو ایسا کہا ہو اور اگر وہ تیئس تو درکنار تین ایسے مواقع بھی پیش نہ کر پائے تو قارئین خواہ وہ کسی عقیدے کے ہوں اس رسوائے زمانہ کتاب (تجلیات صداقت) پر لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے سوا اور کوئی کلمہ خیر نہ کہہ سکیں گے۔

ایک علمی نکتہ

اگر یہ روایت کہیں صحیح متصل سند سے مروی بھی ہو تو اس میں الشرک فیکم کے جمع کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ اس میں حضور اکرمؐ عام مسلمانوں کو شرک خفی سے بچنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ یہاں حضورؐ کا مقصد صرف اس کی خبر دینا نہیں اس سے روکنا تھا جو پیغمبر کی تربیت کا ایک تقاضا تھا۔ اس سے آپ کا مقصد کسی ایک کو صف ایمان سے نکالنا ہرگز نہ تھا۔

اگر اس روایت میں صرف حضرت ابوبکرؓ کی ذات مراد ہوتی تو آپ جمع کی ضمیر سے الشرک فیکم نہ کہتے۔ ایک کے لیے الشرک فیک کی تعبیر اختیار کرتے۔ آنحضرتؐ یہاں جمع کی ضمیر اس طرح لائے ہیں جس طرح حضرت علیؓ اپنے لیے جمع کی ضمیر لائے۔ اس میں بھی آپ کی ذات مراد نہ تھی۔ آپ نے تمام مسلمانوں کی طرف سے ایک عام بات کہی کہ ہم ایسا کرتے رہے۔

ولقد کنا مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نقتل اباءنا وابناء نا واخواننا واعمامنا و ما یزیدنا ذلک الا ایماناً وتسلیما. (نهج البلاغه ج ۱ ص ۱۰۰)

ترجمہ: ”اور جب ہم حضورؐ کے ساتھ تھے ہم اپنے باپوں بیٹوں بھائیوں اور چچوں کو خود قتل کرتے

تھے اور اس سے سوائے اس کے نہیں کہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔"

اب اسے یہ مراد لینا ایک سینہ زوری ہوگی کہ معاذ اللہ حضرت علیؓ نے ابو طالب یا عبدالمطلب کو قتل کیا تھا' آپ نے اپنے بیٹوں کو قتل کیا تھا' آپ نے اپنے بھائی جعفر کو قتل کیا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ حضرت علیؓ ایک قومی سطح پر اپنی بات کہہ رہے ہیں جو آپ کی ذات سے ہرگز ظہور میں نہ آئی تھی۔ اسی پیرایہ میں حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو مخاطب کر کے عام مسلمانوں کو کہا کہ تم میں شرک خفی پایا جاتا ہے۔ کسی اپنے کو مخاطب کر کے دوسروں کو سمجھانا شروع سے دانشوروں کا عمل رہا ہے۔

شرک خفی کہیں ایمان سے متصادم نہیں ہوتا

شرک کے کئی درجے ہیں۔ جس طرح نفاق بھی نفاق عملی اور نفاق اعتقادی میں منقسم ہے' جھوٹ بولنا اور وعدہ جھوٹا کرنا' یہ نفاق عملی تو ہے نفاق اعتقادی نہیں جس سے انسان جنت میں داخلے کے لائق نہیں رہتا۔ تعویذات میں بے جا دلچسپی شرک خفی میں آتی ہے۔ یہ وہ شرک جلی نہیں جس سے مسلمان کا نکاح ٹوٹ جائے یا مسلمان اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔

عام مسلمانوں میں شرک خفی چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ کمزور چال چلتا ہے۔ شرک کا یہ درجہ ایمان سے متصادم نہیں اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جس شخص میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ کمزور ہو وہ خلافت کے لائق نہیں رہتا۔ اتنا صریح شرک تو یزید میں بھی نہ تھا ورنہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علیؓ بن حسینؑ زین العابدین اس کی حکومت کو کسی درجہ میں قبول نہ کرتے۔ محمد بن یعقوب الکلینی امام زین العابدین کے بارے میں لکھتا ہے: آپ نے یزید کو کہا تھا۔

فقال له علی بن الحسین علیهما السلام قد اقررت لک بما سالت انا عبد مکره لک فان شئت فامسک وان شئت فبع فقال له یزید لعنه الله اولٰی لک حقنت دمک ولم ینقصک ذلک من شرفک.

(فروع کافی کتاب الروضه جلد ۳ ص ۱۱۰ لکھنؤ)

ترجمہ: امام زین العابدین نے اسے کہا جو تو مجھ سے چاہتا ہے میں مانتا ہوں میں تیرا مجبور کردہ غلام ہوں مجھے چاہے تو اپنے پاس رکھ چاہے تو کسی اور کو دے دے یزید نے اسے کہا تو نے بہتر پہلو اختیار کیا اپنی جان بچالی اور اس میں تیرے خاندانی شرف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یزید اس وقت بھی حضرت امام زین العابدین کے خاندانی شرف کا قائل تھا انھیں حضرت فاطمہؓ کا لخت جگر اور اولاد رسول مانتا تھا اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ ایمان کسی درجے میں اس کے دل میں ہو گو قتل حسین کی ذمہ داری سے کہ یہ واقعہ فاجعہ اس کی حکومت میں واقع ہوا اسے فارغ نہیں کیا جاسکتا۔

شرک خفی کی یہ روایت درجہ صحت تک نہیں پہنچتی

روایت **الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل** پر یہ رافضی کوئی سند پیش نہیں کر سکا۔ اس نے تفسیر ابن کثیر اور کنز العمال کا حوالہ دیا ہے اور ان دونوں میں اس روایت کی کوئی متصل سند نہیں ملتی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب پیغمبر نے اسے اخفی کہا تو اسے صریح شرک نہیں کہا جاسکتا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کی باتوں اور کمزور روایتوں سے وہ لوگ جن کا **مبشر بالجنّه** ہونا متواتر درجے میں ثابت ہے' کیا ان کے ایمان کی دیواریں گرائی جاسکتی ہیں؟ کسی کو ایمان سے نکالنے کے لیے صرف وہ روایت چاہیے جو متواتر ہو اور یقینی درجہ اسناد میں ہو۔ اور اس کی دلالت بھی اپنے مدعا پر قطعی طور پر واضح ہو۔ ظاہر ہے کہ رافضی اپنے دعویٰ پر اس درجہ کی کوئی روایت نہیں لا سکا۔ نہ اثنا عشریوں کے سرمایہ علم میں کوئی ایسی روایت موجود ہے۔

ہم اس کی مزید کچھ تفصیل کیے دیتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ ایمان کے مقابل شرک جلی ہے شرک خفی نہیں۔ رافضی کہتا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل . (در منثور ج ۴ ص ۵۴)

ترجمہ: "شرک تم لوگوں میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی چلتا ہے۔"

حضورؐ کے اس ارشاد میں روئے سخن عام مسلمانوں سے ہے مشرکین سے نہیں۔ رافضی مذکور بھی تسلیم کرتا ہے:

"وہ اسلام بھی لائے ہوئے تھے مگر آنحضرتؐ پھر بھی ہمیشہ ہی فرماتے رہے الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل" (سطر اول ص ۴۳)

اب سمجھ لیجیے کہ یہ شرک خفی ہے جسے شرک اصغر بھی کہتے ہیں۔ یہ شرک ایمان کے منافی نہیں۔ جب شرک کا لفظ ایمان کے مقابلہ میں آئے تو اس سے شرک اکبر مراد ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

ولا تنکحوا المشرکات حتّٰی یؤمن ...... ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم . (پ ۲ البقره ۲۲۱)

ترجمہ: اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ...... اور بیٹیاں مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ مومن غلام بھی ہو تو اس مشرک سے بہتر ہے جو آزاد ہو گو وہ تمہیں اچھا لگے۔"

یہاں لفظ شرک ایمان کے مقابل ہے سو یہاں شرک جلی مراد ہے۔ یہ مشرکین دائرہ اسلام میں جگہ نہیں پاتے جو

شرک خفی مسلمانوں میں پایا جائے وہ کسی کو حوزہ اسلام سے باہر نہیں کرتا' نہ اس سے کسی مسلمان کا نکاح حرام ٹھہرتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے بارہا اس شرک سے بھی امت کو روکا ہے اور یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے تاہم اس سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

احادیث میں شرک خفی کا ذکر

احادیث میں شرک خفی کا ذکر اور بھی کئی ناموں سے ملتا ہے۔

۱۔ حضرت محمود بن لبیدؓ کہتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اخوف ما اخاف علیکم الشرک الاصغر قالوا وما الشرک الاصغر یا رسول اللہ قال الریاء یقول اللہ عز و جل لھم یوم القیٰمة اذا جزی النّاس باعمالھم اذھبوا الیٰ الذین کنتم تراؤرن فی الدنیا فانظروا ھل تجدون عندھم جزاء . (مسند امام احمد ج ۹ ص ۱۶۰ طبع دوم ج ۵ ص ۴۲۸ طبع اول)

ترجمہ: "مجھے سب سے زیادہ تمہارے بارے میں شرک اصغر کا خوف ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، حضورؐ شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ریا شرک اصغر ہے۔ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیں گے' ریا والوں کو کہیں گے تم ان لوگوں کی طرف جاؤ جن کو دکھانے کے لیے دنیا میں نیک اعمال کرتے تھے۔ دیکھو کیا تم ان سے کوئی جزا پاسکتے ہو؟"

ریا ایک عمل ہے' یہ کوئی اعتقاد نہیں مگر اسے بھی شرک کہا گیا ہے۔ تاہم جاننا چاہیے یہ کونسا شرک ہے؟ یہ شرک اصغر ہے۔ اس کا مرتکب نفس ایمان سے نہیں نکلتا۔ نہ کوئی مسلمان اس شرک خفی سے مرتد ہوتا ہے۔ بالاخر اس کے مرتکب کے لیے بھی جنت موعود ہے۔ ذرہ بھر ایمان رکھنے والا بھی بالاخر جنت میں جائے گا۔

عبدالرحمٰن بن سعدی کہتے ہیں کہ ہر وہ قول اور فعل جو شرک کا زینہ بن سکے شرک اصغر ہے' کسی مخلوق کی شان میں ایسا غلو کرنا جو عبادت کے درجے میں نہ ہو یہ بھی شرک اصغر ہے۔ جیسے غیر اللہ کی قسم کھانا یا ریاکاری سے کام لینا۔

(القول السدید ص ۲۴)

حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں ہم حضور اکرمؐ کے دور میں ریا کو شرک اصغر کہتے تھے۔

۲۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آنکلے۔ آپ نے فرمایا:

الا اخبرکم بما ھوا خوف علیکم عندی من المسیح الدجال قال قلنا بلیٰ فقال الشرک الخفی ان یقوم الرجل یصلی فیزین صلوٰته لما یری من نظر رجل.

(سنن ابن ماجہ ص ۳۱۰)

ترجمہ: "کیا میں تمہیں اس چیز کی خبر نہ دوں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خوفناک ہے؟ صحابہؓ نے کہا کیوں نہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ شرک خفی ہے۔ ایک شخص نماز پڑھنے کھڑا ہو اور اپنی نماز بہت سنوار کر پڑھے کہ کوئی شخص اسے اس طرح دیکھ رہا ہے۔"

یہ شرک خفی ہے۔ شرک کا ایک درجہ اس سے بھی زیادہ خفی ہے۔ وہ اخفی ہے۔ وہ انسانی رگوں میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہو کر چلتا ہے۔ انسان کو خود پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ کس حال سے گزر رہا ہے۔

۳۔ حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

ان اخوف ما اخاف علیٰ امتی الاشراک باللہ اما انی لست اقول یعبدون شمساً ولا قمراً ولا وثناً ولکن اعمالاً لغیر اللہ وشھوة خفیة. (ایضاً)

ترجمہ: "مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ ڈر اللہ سے شرک کرنے کا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سورج اور چاند یا کسی بت کی عبادت کریں گے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے نہیں اوروں کے دکھانے کے لیے اعمال بجالائیں گے۔ ریا کے مرتکب ہوں گے اور انہیں ایک مخفی خواہش کا سامنا ہوگا۔"

اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت کھلے الفاظ میں شرک کے دو پیرائے بیان فرمائے ہیں۔ ایک شرک جلی جو انسان کو ایمان سے نکال دیتا ہے اور ارتداد اس کی گردن میں لا ڈالتا ہے۔ اور دوسرا شرک خفی جس سے انسان ایمان سے نہیں نکلتا مگر ہوسکتا ہے کہ کبھی یہ شرک خفی اس کے شرک جلی میں جانے کا زینہ بن جائے۔

۴۔ عرب میں لوگ پرندوں کے اڑنے سے بھی شگون لیتے تھے۔ کوا آگے سے اڑ جائے تو اسے آئندہ منزل میں ناکامی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔

اذا کان الغراب دلیل قوم — سیھدیھم طریق الھالکین

ترجمہ: "جب کوا کسی قوم کی رہنمائی کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ وہ انہیں اس رستے پر لے جائے گا جس پر ہلاک ہونے والے چلتے رہے۔"

یہاں کوے کی رہنمائی سے مراد سیاہ لباس رہنمایان قوم ہیں۔ یہ اس کی بحث کا موقع نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی شرک فرمایا ہے مگر یہ ایسا شرک ہے جو عام ہے تقریباً ہر کسی میں پایا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ توکل کرنے والے کو اس کے اثرات سے بچالیتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

الطیرة من الشرک وماْمنا الا ...... ولکن اللّٰہ یذھبه بالتوکل. (مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۳۶ طبع دوم ج ۱ ص ۳۸۹، المستدرک طبع اول ص ۱۷، سنن ابن ماجہ ص ۲۵۳)

ترجمہ: ''شگون لینا بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ ہم سے ہر ایک اس میں گھرا ہے لیکن جو توکل سے کام لے خدا پر بھروسہ کرے اللہ تعالٰی اس سے اسے نکال دیتے ہیں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چھوٹے درجے کے شرک کے لیے مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ اختیار فرمائے ہیں۔ (۱) شرک اصغر (۲) شرک خفی (۳) شرک اعمال۔ ایک موقعہ پر آپ نے اسے (۴) شرک سرائر بھی فرمایا ہے۔

۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کہتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا ایھا النّاس ایاکم و شرک السرائر قالوا یا رسول اللّٰہ وما شرک السرائر قال یقوم الرجل فیصلی فیزین صلٰوته جاهداً لمایری من نظر الناس الیه فذلک شرک السرائر. (سنن کبری للبیھقی ج ۲ ص ۲۹۱ قال الذھبی اسنادہ حسنؒ . المھذب ج ۲ ص ۲۶۱)

ترجمہ: ''اے لوگو! تم شرک سرائر سے بچو۔ صحابہؓ نے پوچھا حضور شرک سرائر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ایک شخص نماز کے لیے کھڑا ہو اور وہ اپنی نماز کو اس لیے سنوار کر پڑھے کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ (یہ کھلا نہیں) ایک اندر کا شرک ہے۔ (جو اس کی فطرت بنا ہے)''

۶۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حلف بغیر اللّٰہ فقد کفر و اشرک. (مسند امام احمد ج ۲ ص ۴۷۵ . المستدرک ج ۱ ص ۱۸ . جامع ترمذی ج ۲ ص)

ترجمہ: ''جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے کفر کا عمل کیا اور شرک بھی کیا۔''

دیکھیے حضورؐ نے اس شرک کو کفر کے درجے کا عمل بھی فرما دیا مگر یہ وہ کفر نہیں جو انسان کو ایمان سے نکال دے۔ ہاں جو پورے غور و فکر سے اس شرک کا مرتکب ہو تو یہ عمل اسے شرک جلی تک بھی لے جا سکتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی چیز کی بھی قسم کھانے سے انسان حلف بغیر اللہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک دوسری روایت میں حضور اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں:

من حلف بشئی دون اللّٰہ تعالیٰ فقد اشرک وقال الآخر فھو شرک.

(مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۷۴)

ترجمہ: ''جس نے اللہ کے سوا کسی چیز کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ دوسرے راوی نے کہا اس کا وہ عمل شرک ہے۔''

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

ان الرقی والتمائم والتولة شرک.

(مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۰ طبع دوم ج ۱ ص ۳۸۱ سنن ابن ماجہ طبع اول ص ۲۵۲)

ترجمہ: ''بے شک جھاڑ اور پھونک اور تعویذ باندھنا اور محبت کے منتر یہ سب شرک ہیں۔''

حضور اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا:

من علق تمیمة فقد اشرک.

(مسند امام احمد ج ۶ ص طبع دوم ج ۴ ص ۱۵۶ المستدرک طبع اول ج ۴ ص ۲۱۹)

ترجمہ: ''جس نے کسی تقدیر سے بچنے کا تعویذ باندھا اس نے شرک کیا۔''

یہ تب ہے کہ یہ اعمال مصیبت آنے کو روکنے کے لیے کیے جائیں۔ ان تعویذات سے تقدیر کے فیصلوں کو روکنا مقصود ہو۔ لیکن اگر کوئی مصیبت واقع ہو جائے تو پھر تعویذ شرک نہیں یہ دوا اور علاج میں شمار ہوں گے۔ حضرت ام المومنین کہتی ہیں:

التمائم ما علق قبل نزل البلایا واما ما علق بعد نزول البلایا فلیس بتمیمة.

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۳۵۰)

ترجمہ: ''شرک وہ تعویذ ہیں جو مصیبت اترنے سے پہلے لٹکائے جائیں۔ جو مصیبت اترنے پر باندھے جائیں وہ ان تعویذات کے حکم میں نہیں۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں، علامہ داؤدی اور حافظ ابن عبدالبر مالکی کی رائے بھی یہی ہے۔

(فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۷۹)

۸۔ حضرت ابوسعد بن ابی فضالہ انصاری کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا جمع اللّٰہ الاولین والآخرین لیوم القیٰمة لیوم لا ریب فیه نادیٰ مناد من کان اشرک فی عمل عمله للّٰہ فلیطلب ثوابه من عند غیر اللّٰہ فان اللّٰہ اغنی الشرکاء عن الشرک. (سنن ابن ماجه ص ۳۳۰)

ترجمہ: ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں' سب پہلوں پچھلوں کو جمع کرے گا ایک بلانے والے کی آواز آئے گی جس نے اپنے اس عمل میں جو اس نے اللہ کے لیے کیا تھا کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا تو وہ اس کی جزا اس سے چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب شریکوں کے شرک سے بے پرواہ ہے۔

۹۔ حضرت معاذ بن جبل حضور اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں' آپ نے فرمایا ریا معمولی سا بھی ہو وہ شرک ہے۔

الیسیر من الریاء شرک و من عاد اولیاء اللّٰہ فقد با رز اللّٰہ بالمحاربة ان اللّٰہ یحب الاتقیاء الاخفیاء الذین اذا غابوا لم یفتقدوا وان حضروا لم یعرفوا قلوبھم مصابیح الھدیٰ. (سنن ابن ماجه ص المستدرک ج ۱ ص ۴)

ترجمہ: ''ریا تھوڑا سا بھی ہو تو وہ شرک ہے جس نے اللہ والوں سے عداوت کی وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو جو گمنامی میں رہیں پسند کرتا ہے۔ جب وہ غائب ہوں تو ڈھونڈے نہیں جاتے۔ حاضر ہوں تو پہچانے نہیں جاتے۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں۔''

۱۰۔ حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں' میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

من صلی یرأی فقد اشرک و من صام یرأی فقد اشرک و من تصدق یرأی فقد اشرک. (مسند امام احمد ج ٦ ص ٨٢ طبع دوم ج ۴ ص ١٢٦ ج ١)

ترجمہ: ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا وہ بھی شرک کا مرتکب ہوا اور جس نے دکھاوے کا صدقہ کیا وہ بھی شرک میں مبتلا ہوا۔

ہم نے یہاں یہ دس روایات تواتر قدر مشترک کے لیے درج کی ہیں۔ سو یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضورؐ نے شرک جیسا سخت لفظ کبھی عمل کے لیے بھی استعمال کیا ہے یہ عمل کسی کو دائرہ اسلام سے باہر نہیں کرتا اور خود لسان نبوت سے اسے شرک اصغر کہا گیا ہے۔ سو اس قسم کا کوئی عمل اگر کسی صحابیؓ سے ثابت ہو تو اس سے کسی طرح ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ رافضی بعض صحابہؓ سے ایمان کی نفی کرنے کے لیے اس قسم کی روایات کو دلیل بناتا ہے۔ سو اس میں اب کسی کو شک نہ رہنا چاہیے کہ اس قسم کے حوالوں سے ان بزرگوں سے ایمان کی نفی نہیں کی جاسکتی جن کا ایمان کھلے طور پر تصدیق رسالت کی خبر دے رہا ہے۔ صرف خارجی ہیں جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو داخل صف کفار کرتے ہیں اور یہ رافضی بھی خارجیت کی راہ سے ان مومنین کے ایمان کے انکار کے درپے ہیں۔ جو شرک اصغر سے بھی کھلے مومنوں سے ایمان کی نفی کے درپے ہیں۔

حافظ ابن کثیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیت کریمہ **فلا تجعلوا للّٰہ اندادا** کی تفسیر روایت کرتے ہیں۔

اس میں کئی امور اس خفیف کفر میں داخل ہیں جو چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ خفی پیرائے میں چلتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

(فلا تجعلوا للّٰه انداداً) قال الانداد هو الشرک اخفی من دبیب النمل علیٰ صفاة سوداء فی ظلمة اللیل وهو ان یقول واللّٰه وحیاتک یا فلان و حیاتی ویقول لولا الکلبة هذا لاتانا اللصوص البارحة ولولا البط فی الدار لاتی اللصوص وقول الرجل لصاحبه ما شاء اللّٰه وشئت و قول الرجل لولا اللّٰه و فلان لا یجعل فیها فلان هکذا کله شرک و فی الحدیث ان رجلاً قال لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما شاء اللّٰه وما شئت قال أجعلتنی للّٰه نداً نعم القوم انتم لولا انکم تنددون تقولون ما شاء و شاء فلان قال ابوالعالیه فلا تجعلوا للّٰه انداداً ای عدلاء شرکاء.

ترجمہ: ''آیت (سو تم نہ بناؤ اللہ کے برابر کسی کو) اس میں اس سے مراد وہ شرک ہے جو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے' جو رات کے اندھیرے میں ایک سیاہ چٹان پر چل رہی ہو وہ شرک یہ ہے کہ کوئی کسی کو یوں کہے کہ خدا اور تیری زندگی کی قسم' مجھے تیری اور اپنی زندگی کی قسم یا اس طرح کہے کہ اگر یہ کتا ہمارے ہاں نہ ہوتا تو چور دن دھاڑے ہم پر آ چڑھتے یا یہ کہ اگر گھر میں یہ بطخ نہ ہوتی تو چور آ جاتے اور یہ قول کہ کوئی اپنے ساتھی کو کہے جو خدا چاہے اور تو چاہے یا کوئی کہے اگر اللہ تعالیٰ اور فلاں آدمی نہ ہوتا تو تو فلاں آدمی کو اس میں اس طرح نہ ڈالتا۔ یہ سب باتیں شرک ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے کہا جیسے اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ حضورؐ نے کہا کیا تو مجھے اللہ کا شریک بنا رہا ہے۔ تم بہت اچھی قوم ہو اگر تم اس طرح شرک نہ کرو۔ تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں تم نہ کرو کسی کو اللہ کے برابر عدیل اور شریک۔''

شرک خفی کی یہ باتیں مسلمانوں میں عام ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔ اس لیے حضورؐ نے ان سے شرک کے لفظ سے روکا ہے۔ یہ باتیں پند و نصائح کے قبیل سے ہیں نہ یہ کہ خارجیوں کی طرح ان سے کفر و اسلام کے فاصلے قائم کیے جائیں۔ رافضی نے حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کو مجروح کرنے کے لیے شرک خفی کی یہ جو روایت لکھی ہے کہ تم میں شرک چیونٹی کی چال سے زیادہ مخفی چلتا ہے' اس سے کوئی شخص ایمان کے دائرہ سے نہیں نکلتا اور نہ کسی کے ہاں اس پر مرتد کا حکم لگتا ہے۔ تاہم اس روایت میں حضورؐ نے خاص حضرت ابوبکرؓ کی بات نہیں کی' اس میں فیکم جمع کی ضمیر ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام مسلمانوں کی ایک بات کہی گئی ہے گو اس وقت مخاطب آپ تھے' حضورؐ نے جب دوسری مرتبہ اس بات کو

دہرایا تو بھی اخفی فیکم من دبیب النمل میں جمع کی ضمیر لائے۔ یہ نہ کہا اخفی فیک من دبیب النمل۔ افسوس کہ شرک خفی کی اس بات کو ایمان کے مقابل لانے میں رافضی کو کچھ حیا نصیب نہ ہوئی۔

ہم نے یہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلاف رافضی کے پیش کردہ تین حوالوں کو بالکل بے جان کر کے رکھ دیا ہے اور اسلام میں یہ بات تواتر معنوی سے ملتی ہے کہ شرک خفی ایمان کے مقابل نہیں۔ وہ صرف شرک اکبر ہے جس سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے۔

رافضی کا حضرت ابوبکرؓ کے ایمان پر تیسرا حملہ

رافضی اس تذبذب کا شکار ہے کہ حضرت ابوبکرؓ شیطانی تسلط میں تھے یا کسی وقت ان پر شیطان غالب آ جاتا تھا۔ وہ بیک وقت یہ دو متضاد باتیں کہتا ہے۔ دعویٰ تسلط کا کیا ہے اور دلیل میں بعض اوقات کا غلبہ بتلا رہا ہے۔ یہ فیصلہ اثنا عشری علماء کریں گے کہ رافضی ان دو باتوں میں سے کس میں صحیح ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں غلط ہیں یہ روایت سرے سے آپ سے کسی متصل سند سے ثابت نہیں۔ مولف نے ابن قتیبہ کا حوالہ دیا ہے مگر اس کی طرف سے کوئی سند پیش نہیں کی۔ اس کی یہ دو متعارض باتیں اس کی اپنی عبارت میں دیکھیں۔

"اور ان پر شیطانی تسلط کا یہ عالم تھا کہ خود کہا کرتے تھے ان لی شیطانا یعترینی فاذا ضغت فسددونی میرا ایک شیطان ہے جو بعض اوقات مجھ پر غالب آ جاتا ہے۔"

بعض اوقات کی تصریح بتلاتی ہے کہ پھر آپ اس تسلط سے باہر نکل آتے تھے۔ ورنہ بعض اوقات کا لفظ اپنی حقیقت کھو بیٹھتا ہے۔ پھر آپ کو ہمیشہ حق وسداد کی تلاش رہتی تھی۔ ورنہ آپ اپنے ساتھیوں کو یہ تلقین نہ فرماتے کہ اگر مجھ میں کوئی کجی دیکھو تو مجھے درست عمل بتا دیا کرو۔

بعض اوقات کے تسلط سے بچنے کی آپ کی تدبیر

یہ بات کیا بتاتی ہے؟ یہ کہ آپ ایک لمحہ کے لیے بھی شیطانی تسلط میں نہ رہنا چاہتے تھے۔ اس روایت میں یہ الفاظ بھی ساتھ ہیں کہ ایسے اوقات میں تم فوراً مجھے ٹوک دیا کرو۔ یہ بات اس روایت میں ساتھ ہی ہے۔ کیا اس سے کھلا نتیجہ نہیں نکلتا کہ آپ ان بعض اوقات میں بھی شیطان کے زیر تسلط نہ رہے۔ پوری قوم کو حق دے دیا کہ جب تم مجھے کسی بات میں غلط دیکھو تو فوراً مجھے سیدھی راہ پر ڈال دو۔ آپ نے مجمع عام میں یہ بات کہی جس میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے حق گو بھی موجود تھے۔ یہ بات بتاتی ہے کہ آپ کبھی بھی شیطان کے زیر تسلط نہیں رہ پائے اور آپ نے کھلے بندوں اپنے سے کسی ایسی بات کے صادر ہونے پر لوگوں کو ٹوکنے کے لیے کہا تھا۔

اصل روایت میں ان لی شیطانا یعترینی کے الفاظ نہیں

حضرت ابوبکرؓ کا اصل خطبہ جو آپ نے خلیفہ منتخب ہونے پر دیا، یہ تھا:

ایها الناس فانی قد ولیت علیکم ولستُ بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی والصدق امانة والکذب خیانه الضعیف فیکم قوی عندی حتی ارجع علیه حقه ان شاء الله والقوی فیکم ضعیف حتی اخذ الحق منه ان شاء الله لایدع قوم الجهاد فی سبیل الله الا خذلهم الله بالذل. اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فاذا عصیت الله ورسوله فلاطاعة علیکم

(البدایه والنهایه جلد ۵ ص ۲۴۸ و طبقات لابن سعد جلد ۳ ص ۱۲۹)

ترجمہ: اے لوگو میں تم پر والی بنایا گیا ہوں اور میں تم سے بالا نہیں ہوں۔ اگر میں نیکی سے چلوں تو تم میری حکومت کی مدد کرو اور اگر میں غلطی کروں تو مجھے صحیح راہ پر لے آؤ سچائی امانت ہے اور دروغ گوئی خیانت ہے تم میں جو کمزور ہے وہ میرے لیے قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوا دوں اور جو تم میں طاقتور ہے وہ میرے لیے کمزور ہے حتیٰ کہ میں اس سے دوسرے کا مارا حق واپس لے سکوں جو قوم بھی اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑتی ہے اللہ اس پر ذلت لگا دیتے ہیں اس وقت تک میری اطاعت کرنا جب تک میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں رہوں تم میری اطاعت میں رہو اور جب مجھ سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف ہو تو اس میں تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔ اس روایت میں ان لی شیطانا یعترینی کے الفاظ نہیں ہیں کتاب الامامہ والسیاسہ میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں۔ فاذا ضغت فسددونی جو شیطان کے غالب آنے کی نفی کر دیتے ہیں جب آپ نے خود عوام سے اس دخل شیطانی کے خلاف مدد مانگی تو پتہ چلا کہ شیطان آپ پر تسلط نہیں پا سکا اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے شیطان کو کہی تھی۔ ان عبادی لیس لک علیهم سلطان (پ۱۵ الاسراء ۶۵ پ۱۴ الحجر) سو یہ کسی طرح شیطان کے غالب آنے کی دلیل نہیں ہے۔

اس خطبہ کے راوی حضرت انس بن مالکؓ ہیں اور ان کی روایت میں یہ الفاظ سرے سے نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے الفاظ بطور تواضع کہے جاتے ہیں۔ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان کی آمد حدیث میں بھی موجود ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما منکم من احد الا وقد وکل اللہ بہ قرینہ من الجن . (قالوا وایاک یا رسول اللہ قال) وایای الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلایامرنی الا بخیر. (رواہ مسلم)

ترجمہ: "تم میں کوئی ایسا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کوئی شیطان لگایا ہوا ہے اور میرے ساتھ بھی ایک لگا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی' وہ مسلمان ہو گیا۔ اب وہ جن سوائے خیر کے کوئی بات نہیں کہتا۔"

یہ تب ہے کہ فاسلم میں میم پر زبر پڑھیں۔ علامہ خطابی اسے رفع سے پڑھتے تھے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو جاتا ہے کہ میں اس کے غلط عمل سے بچ جاتا ہوں۔ فاسلمُ اب وہ مجھے خیر کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

یہ حضور رحمۃ للعالمین کی عصمت کی شان ہے کہ آپ کا موکل جن خود بھی شر کو چھوڑ گیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سامان ضلالت بھی ہدایت بن جاتا ہے۔ محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم فرماتے ہیں:

"جہاں منبع شر بھی گردن تسلیم خم کر دے وہاں پھر شر کی گنجائش کس راستہ سے نکل سکتی ہے۔ جس کی معصومیت کا اثر معصیت کی قوتوں پر بھی اتنا گہرا پڑتا ہو کہ وہ بھی موثر ہونے کی بجائے خود اس سے متاثر ہو کر رہ جائیں اور اس لیے اس کی معصومیت کے ساتھ انقیاد و تسلیم کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہے۔ ان کی عصمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔"

اس طرح اللہ کے اور مقبولین بھی اللہ کی فرمانبرداری کرتے شیطان کو لاغر کر دیتے ہیں۔ حضورؐ کا یہ ارشاد آپ پڑھ آئے ہیں:

ان المؤمن یضنی شیاطینہ کما یضنی احدکم بعیراً فی السفر. (رواہ احمد)

ترجمہ: "بے شک مومن اپنے شیاطین کو اس طرح لاغر کر دیتا ہے جیسے کوئی تم میں سے اونٹ کو تھکا دے۔"

سو کبھی پیغمبر بھی جس طرح اپنی ادنیٰ فروگذاشت کو غایت انقیاد باری میں گناہ کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ گناہوں سے پاک ہیں تو حضرت ابوبکرؓ بھی اگر اسی تواضع میں کہہ دیں کہ **ان لی الشیطان یعترینی فاذا زغت فسددونی** تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ ذرا اس جذبے کو ملاحظہ فرمائیں کہ خلیفہ رسول کس طرح بہ صلائے عام کہہ رہا ہے کہ مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں' میری کسی بات کو ذرا ٹیڑھا پاؤ تو مجھے فوراً ٹوک دو تا کہ اللہ کے ہاں میں اس طرح پہنچوں کہ حضورؐ کی عصمت کا سایہ آپ کے ثانی اثنین پر بھی کمال پرتو ڈالے ہو۔

حضورؐ کا یہ فرمانا کہ میرا شیطان مسلمان ہو چکا' ایک نہایت آگے کا مقام ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے لیے یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے۔ آپؓ نے بطور تواضع کہا کہ میں اپنے شیطان کے حملے سے مامون نہیں ہوں۔ تم مجھے بچاؤ کہ کہیں اس کی زد میں نہ آ جاؤں۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ شیطان کے دخل سے کوئی بات نہ کر پائے جن کے مشیروں میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے وارثان حق ہوں وہ بھلا کسی غلط بات پر کیسے جمے رہ سکتے تھے۔ آپ کا **سددونی** فرمانا بطور تواضع ہے۔ جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنے لیے الزاماً گمراہ ہونے کا اقرار کیا تھا۔ حالانکہ آپ ہرگز گمراہ نہ تھے۔ آپ نے یہ بات صرف الزاماً کہی۔

فان ابیتم ان تزعموا الا انی اخطأت وضللت فلم تضللون عامۃ امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والہ بضلالی وتاخذونھم بخطئی وتکفرونھم بذنوبی.

(نہج البلاغۃ ج۲ص ۱۱)

ترجمہ: "پس اگر تم ہر چیز سے انکار کرتے ہو سوائے اس کے کہ میں نے واقعی غلطی کی ہے اور میں گمراہ ہو گیا ہوں تو تم میری اس غلطی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری امت کو کیوں گمراہ قرار دے رہے ہو اور ان پر میری خطا کا مواخذہ کر رہے ہو اور انہیں میرے گناہوں سے کافر قرار دے رہے ہو۔"

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضور اکرم ﷺ کی امت کا اجماع معصوم ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ساری امت کسی غلط بات پر اجماع کر لے صحابہ کرام جب قرآن پاک کی موجودہ ترتیب پر سب متفق ہوئے تو یہ اس بات پر برہان قاطع ہے کہ موجودہ جمع قرآن پر بیشک عصمت کا سایہ موجود تھا۔

ایک اور موقعہ پر تو آپ نے بلا کسی شرط کے ارشاد فرمایا کہ تم کبھی مجھے حق بات کہنے سے نہ رکو۔ یہ کب ہو سکتا ہے؟ جب کوئی خلاف حق بات تم مجھ میں دیکھو یا تم مجھے کسی خطاء پر پاؤ تو فوراً مجھے اس پر ٹوک دو۔ آپ نے کہا:

فلا تکفوا عن مقالۃ بحق او مشورۃ بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطی ولا امن ذلک من فعلی الا ان یکفی اللہ من نفسی ماھوا ملک بہ منی.

ترجمہ: "تم کبھی حق بات کہنے اور مجھے صحیح مشورہ دینے سے نہ رکو۔ میں اپنی ذات میں خطاء سے بالا نہیں ہوں (معصوم نہیں ہوں) اور مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو' میں اس سے بے خوف نہیں ہوں بدوں اس کے کہ اللہ مجھے کافی رہے اور وہ میرا میری ذات سے زیادہ مالک ہے (وہ مجھے بچالے گا)۔"

یہ حق بات کہنے کی بات کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ اس لیے کہ کبھی مجھ سے اس کے خلاف کوئی بات نکلے تو مجھے فوراً

ٹوک دو۔ اب اس میں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بات میں کیا فرق رہا۔ معلوم ہوا اس طرح کی تواضع سے کہی باتوں سے کسی فرد کے لائق خلافت ہونے کی نفی نہیں ہوتی' نہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان باتوں سے مقام خلافت سے گرتے ہیں نہ حضرت علیؓ مرتضیٰ...... حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ فاذا ضفت فسددونی تو یہ الفاظ ایسے نہیں کہ ان سے حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کی سفید چادر پر کوئی چھینٹا دکھایا جا سکے۔ یہ الفاظ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تو ملتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لن ینجی احداً منکم عمله (قال رجل ولا ایاک یا رسول الله قال) ولا ایای الا ان یتغمدنی الله منه برحمة ولکن سددوا. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۶)

ترجمہ: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہ دلائے گا اور نہ مجھے بھی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی طرف سے رحمت سے ڈھانپ لے لیکن تم نیکی پر لگے رہو۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سددوا کے الفاظ وہی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بارے میں کہے ہیں۔

وہ زیغ بیشک عیب ہے جس کے انسداد کی خواہش نہ ہو

اسلام میں صرف وہ زیغ عیب ہے جس کے انسداد کی خواہش نہ ہو' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اگر یہ کہا فاذا ضفت فسددونی ''میں اگر کہیں ٹیڑھا چلوں تو مجھے ٹوک دو'' مجھے صحیح بات پر لے آؤ تو اس کا حاصل یہی ہے کہ آپ ایک پل کے لیے بھی غلط بات پر نہ رہنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زیغ عیب نہیں رہتا جب کہ انسان اس میں لٹکا نہ رہے۔ حضرت ابوبکرؓ حاکم ہو کر حضرت عمرؓ ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسے ماتحتوں کو کہہ رہے ہیں کہ مجھے میری غلطی پر فوراً ٹوک دو۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ان حضرات نے اس پر عمل نہ کیا ہوگا اور اگر انہوں نے کہیں آپ کو کسی بات سے روکا تو اس کا کوئی ثبوت چاہیے کہ آپ نے ان کی بات کو قبول نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا زیغ ہرگز عیب نہیں رہتا اور اگر انہوں نے آپ کو کبھی کسی بات پر نہ روکا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ہمیشہ شیطان کے غالب آنے سے محفوظ رہے۔ ورنہ کبھی تو ان کے روکنے کی کوئی صورت سامنے آتی۔

شیطان کا تسلط وہی ہے جس سے نکل نہ سکیں

شیطان کے حملے کا نام تسلط نہیں۔ وہ حملے میں کامیاب ہو کر اپنی بات منوا لے تو یہ اس کا تسلط ہے۔ ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حواء کو درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ حضرات یہ بات بھول گئے کہ ابلیس ان کا دشمن ہے' یہ اس کی باتوں میں آ گئے مگر جب انہیں اس پر ٹوکا گیا تو یہ فوراً اس کے فریب سے نکل گئے سو ان پر اس کا تسلط نہ ہو پایا۔ قرآن کریم میں ہے:

فدلّٰهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سوأتهما وطفقا یخصفان علیهما من ورق الجنة ط وناداهما ربهما الم انهکما عن تلکما الشجرة واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین. قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین. (پ ۸ الاعراف ۲۳)

ترجمہ: پھر مائل کیا اس نے دونوں کو فریب سے پھر جب چکھا دونوں نے درخت۔ کھل گیا ان پر ایک دوسرے کا پردہ اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے لپیٹنے لگے اور ان کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے منع نہ کیا تھا تم کو اس درخت سے اور کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو شیطان تمہارا دشمن ہے کھلا۔ دونوں نے کہا اے رب ہمارے ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اگر تو نہ بخشے ہم کو اور نہ کرے ہم پر رحم تو ہم رہیں گے نقصان اٹھانے والے۔

سو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اگر کہا کہ جو شیطان میرے ساتھ پیدا کیا گیا اگر وہ مجھ پر تسلط کرے تو فوراً مجھے ٹوک دو اور مجھے صحیح بات پر متنبہ کرو۔ تو آپ بھی اس کے تسلط سے نکل آئے اور آپ سے کبھی کوئی شیطانی بات صادر نہ ہو پائی۔

اللہ تعالیٰ نے جو ابلیس کو کہا تھا کہ ان عبادی لیس لک علیهم سلطان (پ۱۴ الحجر ۴۲) تو اس سے مراد وہ تسلط ہے جس سے کوئی نکل نہ پائے اور جس تسلط سے کوئی ہمت کر کے نکل آئے یا کسی دوسرے کی نشاندہی سے وہ اپنے آپ کو اس سے نکال لے تو وہ شیطان کے زیر تسلط نہیں رہا۔ تسلط یہی ہے کہ کوئی شخص شیطان کی بات مان لے اور اس میں رہے۔ ابلیس کا خود اپنا اقرار یہی ہے۔ وہ اس کے تسلط سے نکل پانے والوں کو کبھی اپنے قبیلے' نہیں کہتا۔

وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلومونی ولوموا انفسکم. (ابراهیم ۲۲)

ترجمہ: ''اور میرا کچھ تم پر تسلط نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے بلایا تم کو (غلط کاموں کی طرف) سو تم نے میری بات مان لی۔ سو جو شخص مجمع عام میں کہے کہ میں کوئی غلط کام کروں تو فوراً مجھے اس پر روک دو وہ بھلا کیسے اس کے زیر تسلط رہ سکتا ہے۔ وہ اس کا قرین ضرور ہے مگر یہ اسے کہیں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ حافظ ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں:

وکل انسان فانه معه قریناً من الملئکة وقریناً من الشیاطین فقرینه من الملئکة یأمره بالخیر ویحثه علیه وقرینه من الشیاطین یأمره بالشر.

(جامع الاصول ج ۸ ص ۵۴۵)

ترجمہ: "اور ہر انسان کے ساتھ ایک قرین فرشتوں میں سے ہوتا ہے اور ایک شیاطین میں سے۔
پہلا اسے ہمیشہ خیر کی توجہ دلاتا ہے اور اسے اس کی ترغیب دیتا ہے اور دوسرا شیاطین میں سے ہے وہ
اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسی طرف اسے توجہ دلاتا ہے۔"

سو شیطان کا تسلط انہی پر ہو سکتا ہے جو اسے دوست رکھیں اور جو اسے دور کرنے کے لیے اپنے دوستوں کو آواز دیں تا کہ کوئی غلط بات ان سے صادر نہ ہو سکے۔ انہیں شیطان کے زیر تسلط یا اس کے دوست نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے دوست وہی ہیں جو ایک ناقابل معافی گناہ کے مرتکب ہوں۔

انما سلطانه على الذين يتولونه والذين هم به مشركون . (پ ۱۴ النمل ۱۰۰)

ترجمہ: "شیطان کا تسلط انہی لوگوں پر ہے جو اسے دوست رکھیں اور وہ جو اسے اللہ کے ساتھ شریک کریں۔"

اب جو شخص شیطان کے خلاف فسددونی کی کھلی آواز دے رہا ہے اسے شیطان کا دوست کہنا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس میں دیانت اور شرم نام کو بھی نہ ہو۔

یاد رہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف نسبت کردہ الفاظ **ان لی شیطانا یعترینی فاذا ضغت فسددونی** کسی صحیح اور متصل الاسناد روایت سے ثابت نہیں اور اتنی کمزور بات سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی جو اپنی جگہ متواتر روایات اور قطعیات سے کے قبیل سے ہو۔ البتہ ضد کا کوئی علاج نہیں۔

شیطان کے حملے میں کوئی اپنی ذات سے نہیں جیت سکتا

شیطان اور اس کا پورا قبیلہ مومنین پر اس طرح گھات لگاتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ پھر اس کی حفاظت مانگیں جسے وہ بھی دیکھ نہ پائے۔

انه يراكم هو وقبيله من حيث لا ترونهم . (پ ۸ الاعراف ۲۷)

ترجمہ: "وہ اور اس کا لشکر تمہیں ایسے دیکھتا ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں پاتے۔"

شیطان جب کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ ڈالے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ اسی وقت خدا کی پناہ میں آئے اپنے طور پر اس سے نہ بچ سکے گا جب تک کسی بڑی طاقت کا سہارا نہ لے۔ حضورؐ نے فرمایا:

يأتي الشيطان احدكم فيقول من خلق كذا من خلق كذا حتى يقول من خلق ربك فاذا بلغه فليستعذ بالله ولينته . (متفق عليه)

ترجمہ: "تم میں سے کسی پر شیطان اترتا ہے اور کہتا ہے اس کو کس نے پیدا کیا۔ اس کو کس نے پیدا

کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس پر آ جاتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ اس پر آ جائے تو چاہیے کہ بندہ اللہ کی پناہ میں آئے اور اس سوال کے جواب سے رک جائے۔"

انسان اس شیطانی غلبے سے نکل نہیں سکتا جب تک وہ اس پر باہر سے مدد نہ مانگے۔ شارحین حدیث لکھتے ہیں:

ليس له قوة المغالبة مع الشيطان و مجادلته فيجب عليه ان يلتجي الى مولاه ويعتصم بالله من الشيطان الذى اوقعه فى هذا الخاطر الذى لا اقبح منه فيقول بلسانه اعوذ بالله من الشيطان الرجيم ويلوذ بجنانه الى جنابه ان يدفع منه شره وكيده فانه مع اللطف الالهى لا اضعف منه ولا اذل. (مرقات ج ۱ ص ۱۳۶)

ترجمہ: "انسان کو شیطان اور اس سے مجادلہ میں قوت غالبہ حاصل نہیں ہے سو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مولیٰ اللہ عزوجل کی طرف التجا کرے اور شیطان کے ضرر سے جس نے اسے اس وہم میں ڈال دیا کہ اس سے زیادہ کوئی بری شے نہیں۔ اللہ سے اعتصام کرے اور دل سے اس کے حضور پناہ ڈھونڈے کہ وہ اس سے شیطان کے شر و مکر کو دور کرے کیونکہ لطف الٰہی کے ہوتے کوئی اس سے زیادہ کمزور اور عاجز نہیں ہے۔"

سو اگر یہ صحیح بھی ہو کہ حضرت ابوبکرؓ نے شیطان کے اس غلبے پر فوراً اپنے ساتھیوں سے روکنے ٹوکنے کی درخواست کی تو یہ شیطان کے حملے سے نکلنے کے لیے مومن کے دل کی ایک فوری صدا ہے۔ یہ اس ظالم سے کوئی سمجھوتہ کرنے کی ادا نہیں۔ یہ صرف پیغمبر کا مقام عصمت ہے کہ آپ کا قرین من الجن آپ کے آگے زیر ہو چکا۔

حضرت ابوبکرؓ پر کیے گئے ان تین حملوں کا جواب آپ کے سامنے آ چکا۔ چونکہ اسی قسم کے بے جان حملوں سے وہ حضرت عمرؓ سے بھی ایمان کی نفی کرتا ہے سو نا مناسب نہ ہوگا کہ ہم ان میں بھی رافضی کی پوری قلعی کھول دیں۔

اب آئیے حضرت عمرؓ کے خلاف بھی رافضی کی اس قسم کی باتوں کا کچھ تجزیہ کریں۔

حضرت عمرؓ کے ایمان پر رافضی کے پانچ حملے

۱۔ حضرت عمرؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اسلام لانے سے پہلے ان کے برے انجام سے ڈرایا تھا کہ وہ (حضرت عمرؓ) اگر آپ کی مخالفت سے نہ رکے تو ان کا انجام بھی ولید بن مغیرہ جیسا ہوگا۔

آپ نے اس انجام سے ڈر کر اسلام قبول کیا۔ رافضی لکھتا ہے:

"یہ دھمکی سن کر فوراً عمرؓ نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا۔ یہ ہے عمرؓ صاحب کے اسلام لانے کی اصل رام کہانی جو علماء اہل سنت کی زبانی پیش کر دی گئی ہے۔"

رام کہانی جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے رام چندر کے بارے میں ایسی ہی کہانیاں وضع کر رکھی ہیں۔ رافضی اس کہانی کو رام کہانی بھی کہتا ہے اور پھر اس سے استدلال بھی کرتا ہے۔ اس سے اس کی ذہنی پریشانی اور کھل جاتی ہے۔

اب اس کی پیش کردہ پوری روایت ملاحظہ ہو۔ حضورؐ نے ان کی برہنہ تلوار کو جھنجوڑ کر فرمایا:

ما انت بمنته یا عمرؓ حتی ینزل اللّٰہ بک من الخزی والنکال ما انزل بالولید بن المغیرة فقال عمرؓ اشهد ان لا الہ الا اللّٰہ.

ترجمہ: "اے عمر! معلوم ہوتا ہے تم اس وقت تک اس حرکت سے باز نہ آؤ گے جب تک تمہارے بارے میں ذلت و رسوائی کی وہی باتیں خدا نازل نہ کردے جو ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل کی ہیں۔ یہ دھمکی سن کر فوراً عمرؓ نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا۔"

رافضی **فقال عمرؓ اشهد ان لا الہ الا اللّٰہ** کا ترجمہ یہ کرنے کی بجائے کہ حضرت عمرؓ نے کلمہ پڑھا' یہ ترجمہ کرنے میں بڑی خوشی اور چالا کی محسوس کرتا ہے کہ یہ دھمکی سن کر فوراً عمرؓ نے کلمہ شہادت زبان پر جاری کیا۔ (ص ۴۲) اس سے وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ نے دل سے یہ کلمہ نہ پڑھا تھا۔ اس کا استدلال اس سے ہے کہ کلمہ زبان پر جاری کیا۔ اور اس نے اسے دل سے نہ پڑھا تھا یہ صرف اس کی زبان پر ہی رہا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ دل سے مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس روایت سے اس نے ان کے ایمان کی پوری نفی کردی ہے اور اپنے شیعہ حلقہ اعتقاد میں بڑا علمی کمال کر دکھایا ہے۔

قارئین کرام! ذرا غور کریں یہ رافضی جن الفاظ سے اپنی دلیل لا رہا ہے کیا وہ اس روایت کے الفاظ ہیں یا خود اس رافضی کے اپنے داخل کردہ ہیں۔ خود ایک بات کہہ کر پھر خود ہی اپنے الفاظ سے استدلال کرنا اس سے بڑی شاطرانہ چال شاید اب تک کوئی کھلاڑی نہ چلا ہو مگر اسے دیکھیے۔

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

ہم رافضی کے اس استدلال کے جواب میں قرآن کریم کی اس آیت پر عمل کرتے ہیں:

واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً. (پ ۱۸ الفرقان ۶۳)

ترجمہ: "اور جب بات کرنے لگیں ان سے جاہل لوگ تو وہ انہیں سلام کہہ دیتے ہیں۔"

نااہل کی حجت سے جان چھڑانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

اس روایت کی صحت سند بھی دیکھیے

مولف نے اس پر صرف امام سیوطی (۹۱۱ھ) علامہ ابن حجر مکی (۹۷۳ھ) اور ایک شیعی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ اس شیعی کتاب سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ رہے پہلے دو حوالے ان میں کوئی ایسی سند نہیں جو ان مولفین سے حضرت عمرؓ یا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ خود رافضی اسے ایک رام کہانی کہتا ہے اور پھر اسے اصل بھی کہتا ہے۔ رام کہانی کو تاریخی حقیقت سمجھنا ڈھکو جیسے لوگوں کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ ہے عمرؓ صاحب کے اسلام لانے کی اصل رام کہانی جو علماء اہل سنت کی زبانی پیش کردی گئی ہے۔ نہ وہ جوان کے بڑے ہوا خواہ بڑے طمطراق سے بیان کرتے ہیں کہ ہمشیرہ کے پاس گئے اور قرآن کے کچھ اجزاء سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ کلمہ اسلام پڑھ لیا۔" (ص ۴۴)

رام کہانی کسے کہتے ہیں؟ ہندوؤں کی بات کو۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ کی پہلی کتابوں میں آپ کے اسلام لانے کا یہ واقعہ کس طرح لکھا ہے۔ اس کے لیے قارئین تاریخ میں ذرا پیچھے چلیں۔ سیرت ابن ہشام (۲۱۸ھ) جلد اول کے چار صفحے (۳۶۷ سے ۳۷۰ تک) مطالعہ کریں پھر تاریخ الکامل لابن اثیر (۶۳۰ ھ) جلد دوم ذکر اسلام عمرؓ بن الخطاب میں ۳۲ اور ۳۳ دیکھیں' پھر حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) کی کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۳ کے صفحہ ۸۰ میں اس بحث کو دیکھیں کہ کعبہ میں مسلمانوں کو نماز جہر سے پڑھنے کا موقع سب سے پہلے کب ملا؟ ان تحقیقات کا حاصل دیوبند کے عظیم ادیب اور مورخ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (۱۳۴۸ھ) نے ان لفظوں میں دیا ہے۔ اس کے مقابل اس ہندو کی رام کہانی کچھ وزن نہیں رکھتی۔

حضرت علامہ حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اسے اس طرح بیان کرتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کا واقعہ کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے۔ گھر سے تلوار لے کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر کے چلے تھے۔ راستہ میں ایک شخص نے پوچھا کہ اس طرح تلوار لیے کہاں جاتے ہو؟ کہا اس شخص کے قتل کے لیے جاتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ ان کے دین کی علی الاعلان مذمت کی۔ اس شخص نے کہا کہ اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہارے بہنوئی اور بہن دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر غصہ میں بھرے' بہن کے گھر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور حضرت خبابؓ دونوں کو کلام الٰہی کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے خبابؓ کی آواز سن لی۔ دروازہ کھلوایا اور پوچھا تم دونوں کیا پڑھتے تھے۔ دونوں نے انکار کیا۔ کچھ نہیں۔ کہا نہیں میں نے سنا ہے کہ تم مسلمان ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی کو مارنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بہن نے چھڑانا چاہا تو ان کو بھی زخمی کر دیا۔ بہن نے کہا بے شک ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ تم جو چاہو کرو۔ حضرت عمرؓ بہن کو خون آلودہ دیکھ کر نرم ہوئے اور کہا۔ یہ کاغذ جو تم پڑھتے تھے مجھے دو۔ انہوں نے کہا تم مشرک نجس ہو اور نجس کلام الٰہی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور سورہ طٰہٰ کو جو اس میں لکھی ہوئی تھی پڑھ کر کہا۔ یہ کیسا اچھا کلام ہے۔ خبابؓ جو اندر چھپے ہوئے تھے حضرت عمرؓ کے یہ

الفاظ سن کر باہر نکلے اور کہا:

''مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تمہارے بارے میں قبول فرمالی ہے۔ آپؐ نے کل دعا کی تھی' الٰہی دین اسلام کو دو شخصوں میں سے ایک کے مسلمان ہونے سے تقویت پہنچا' ابوجہل بن ہشام یا عمرؓ بن خطاب سے۔ ان میں سے ایک شخص مسلمان ہو جائے۔''

حضرت عمرؓ نے حضرت خباب سے کہا مجھے آپ کی خدمت میں لے چلو کہ مسلمان ہو جاؤں۔ وہاں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔'' (اشاعت اسلام مولفہ مولانا حبیب الرحمٰن عثانی ص ۳۸)

رافضی کا اپنے خبث باطنی پر شرمناک اصرار

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا اصل واقعہ جس میں ان کا اپنی ہمشیرہ کے ہاں جانا مذکور ہے۔ آپ نقول مہمہ سے دیکھ چکے۔ تاہم اگر رافضی کے نقل کردہ شاذ حوالے پر بھی نظر کی جائے تو رافضی کے خبث باطن کی نہایت مکروہ شکل سامنے آئے گی۔ اس روایت پر ذرا ایک تنقیدی نظر کریں۔ رافضی لکھتا ہے:

''جب عمرؓ صاحب تلوار حمائل کیے ہوئے بارگاہ نبوی میں پہنچے تو آنحضرتؐ باہر تشریف لائے اور عمرؓ کے دامن اور برہنہ تلوار کو جھنجھوڑ کر فرمایا:

ما انت بمنتهٍ یا عمرؓ حتی ینزل اللّٰہ بک من الخزی والنکال ما انزل بالولید بن المغیرہ فقال عمرؓ اشهد ان لا اله الا اللّٰه.

''تم اس وقت تک اس حرکت سے باز نہیں آؤ گے جب تک تمہارے بارے میں ذلت و رسوائی کی وہی باتیں خدا نازل نہ کر دے جو ولید بن مغیرہ کے بارے میں اس نے نازل کی ہیں۔''

(تجلیات ص ۴۳)

یہاں ان الفاظ پر غور کیجئے:

''تم اس وقت تک اس حرکت سے باز نہیں آؤ گے'' سے مراد کونسی حرکت ہے؟ (۱) حضورؐ کے خلاف برہنہ تلوار لہرانا (۲) آپؐ پر اسلام نہ لانا۔ ظاہر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دھمکی پہلی بات سے باز نہ آنے کے لیے تھی۔ نہ کہ اسلام نہ لانے پر آپؐ نے انہیں یہ دھمکی دی تھی۔ دین بدلنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ رافضی سمجھتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کلمہ اس دھمکی کی وجہ سے پڑھا تھا۔ اس کند ذہنی اور کج فہمی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں وہ باتیں نہ اتریں جو ولید بن مغیرہ کے بارے میں اتری تھیں۔ یہ بدوں اس کے نہیں ہو سکتا کہ آپ اب برہنہ تلوار لہرانے کے عمل سے رک گئے تھے۔ ورنہ قرآن پاک میں آپ کے بارے میں ویسی باتیں ضرور نازل ہوتیں۔ ولید بن مغیرہ کے بارے میں کونسی آیات اتری تھیں وہ ذیل میں دیکھئے:

ولا تطع کل حلّاف مهین همّاز مشّاء بنمیم منّاع للخیر معتد اثیم عتلّ بعد ذلک زنیم. (پ ۲۹ سورہ ن)

ترجمہ: ''اور تو کہا نہ مان کسی زیادہ قسمیں کھانے والے کا' بے قدر کا' طعنے دینے والے چغل خور کا' بھلے کام سے روکنے والے کا' حد سے بڑھنے والے گناہ گار کا' اجڈ کا اور ان سب کے پیچھے بدنام کا۔''

پھر ص ۴۴ پر اس رافضی نے بڑے مزے لے لے کر یہ آیت حضرت عمرؓ پر صادق کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ حضور کی یہ وعید حضرت عمرؓ کے اس عمل سے باز نہ آنے سے مشروط تھی۔ اب جب یہ الفاظ آپ کے بارے میں نازل نہ ہوئے تو اس سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ آپ اپنے اس عمل سے واقعی باز آ گئے تھے جس پر حضورؐ نے آپ کو یہ دھمکی دی تھی۔ جب آپ کی وہ حالت نہ رہی تو وہ وعید بھی واقع نہ ہو سکی۔ مقدم بات کتنی کھلی اور واضح ہے لیکن اس رافضی کو سمجھ نہیں آ رہی۔ اس کی کند ذہنی کا کیا کریں۔ صحابہؓ کے خلاف رافضیوں کے بغض کا شعلہ کہیں ٹھنڈا نہیں ہو پاتا۔

رافضی اس بات کا مدعی ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دھمکی دی تھی مگر قابل غور بات یہ ہے کہ آیا اس سے وہ مشابہت ختم ہو گئی اور وہ حقیقت بھی بدل گئی جس کی بنیاد پر آنحضرتؐ نے آپ کو مذمت والی آیات کے نازل ہونے کی دھمکی دی تھی یا وہ وجہ و حقیقت بدستور قائم رہی تھی۔ (ص ۴۴)

جاہل سے جاہل شخص بھی اتنی سمجھ ضرور رکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی حقیقت ہوتی تو اس کے اثرات بھی قائم رہتے اور پھر وہ آیات ضرور اترتیں۔ پیغمبر کی بات کیسے غلط ہو سکتی ہے۔

رافضی کا یہ کہنا کہ آیا اس سے وہ مشابہت ختم ہو گئی یہ ایسی چیز کے ختم ہونے کا پوچھ رہا ہے جو شروع ہی نہ ہو پائی تھی، کیسی جہالت کی بات ہے۔ تشبیہ میں ایک ایک بات مشبہ پر پوری اترے یہ بات کسی جاہل سے بھی سننے میں نہ آئی ہو گی مگر کفر کا لاوا ہے کہ بیان کے ہر موڑ پر اس کی گاڑی یہیں آ کر رکتی ہے۔

اس میں رافضی یہ اشارہ بھی دے گیا کہ حضور آیات کے نازل ہونے سے پہلے ان کے نزول کا پہلے سے منصوبہ بناتے تھے (معاذ اللہ)۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عمرؓ کے خلاف یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ ان کے خلاف سخت آیات ترتیب دیں اور انہیں ان کی دھمکی دیں۔ کیا یہ قرآن کریم کے الٰہی کلام ہونے کے خلاف ایک کھلا زندقہ نہیں؟ حضورؐ پہلے سے

قرآن کے بارے میں کوئی امید نہ باندھتے تھے' کہ خدا یہ بات بتائے گا نہ آپ نے خدا کا نام لے کر کبھی کوئی ایسی بات کہی تھی۔ قرآن کریم میں ہے۔

وماکنت ترجو ان یلقی الیک الکتاب الا رحمة من ربک فلا تکونن ظهیراً للکافرین. (پ۲۰پ القصص ۸۱)

ترجمہ: "اور آپ پہلے سے امید باندھے ہوئے نہ تھے کہ اتاری جائے آپ کی طرف کتاب مگر یہ مہربانی ہے ترے رب کی۔"

جب پوری کتاب کے بارے میں آپ نے کوئی امید نہ باندھی تھی تو کیا انہی آیات کی آپ امید باندھے ہوئے تھے جن کے بارے میں خود خدا کا فیصلہ تھا کہ نہ اتریں گی اور نہ حضورؐ ان کے اترنے کا عقیدہ رکھتے تھے پھر ایسی فرضی باتوں سے عقیدے گھڑنا رافضیوں کا ہی نصیب ہے۔ مومنین تو اپنے عقیدے' کتاب وسنت کی قطعی دلالتوں سے لیتے ہیں۔ وھمات اور بدگمانیوں پر عقیدوں کی بنیاد نہیں رکھتے۔ حضورؐ کو اللہ رب العزت نے اس طرف متوجہ کیا تھا کہ جب اپنے ساتھ نہیں لگتے تو اب دور والوں کو اپنا بنا لیجئے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"اپنی قوم کو اپنا نہ سمجھ جنہوں نے تجھ سے بدی کی اب جو تیرا ساتھ دے وہی تیرا اپنا ہے۔"

(موضح القرآن)

جو بات ابولہب اور ابوجہل کی برات نہ تھی وہ حضرت عمرؓ کا نصیب بن گئی:

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضورؐ کی اس دھمکی پر اگر حضرت عمرؓ اسلام لے آئے تو کیا یہ خود اس بات کی دلیل نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا رسول ہونے کو آپؓ اپنے دل میں جگہ دے چکے تھے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان پر رافضی کا دوسرا حملہ

رافضی کہتا ہے' حضرت عمرؓ اہل کتاب میں سے تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی وہ اپنے سابقہ مذہب کی طرف ہی مائل رہتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

"تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار اسلام کے بعد بھی ان کا قلبی میلان اپنے سابقہ مذہب ہی کی طرف رہتا تھا...... ایک مرتبہ عمرؓ بن الخطاب تورات کا ایک نسخہ لائے اور بارگاہ نبویؐ میں اسے پڑھنا شروع کیا...... آنحضرتؐ نے قسم کھا کر فرمایا:

والذی نفس محمد بیده لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموه وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل. (مشکوٰة ص ۲۴)

ترجمہ از رافضی: مجھے اس خدائے قدیر کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے اگر اس وقت جناب موسیٰ ظاہر ہو جائیں تو تم یقیناً مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کر دو گے اور اگر ایسا کرو گے تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔" (تجلیات صداقت ص۴۴)

رافضی کی یہ ایک نئی تحقیق ہے کہ قریش مکہ دین تورات پر تھے اور ان کے ہاں بھی تورات عام پڑھی جاتی تھی۔ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حضرت عمرؓ کا قلبی میلان اپنے سابقہ مذہب ہی کی طرف تھا۔ اس سے اس رافضی کا مقصد آپ پر منافقت کا الزام ہے کہ آپ اسلام میں مخلص نہ تھے' تورات برابر پڑھتے تھے۔

منافق کون ہوتا ہے جو اپنے کفر کو چھپائے اور اسلام کو ظاہر کرے۔ یہاں حضرت عمرؓ حضورؐ کے سامنے کھلے بندوں تورات پڑھ رہے ہیں اور وہاں حضرت ابوبکرؓ بھی موجود ہیں۔ اب کیا کوئی پڑھا لکھا آدمی اسے منافقت کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ آپ میں منافقت ہوتی تو وہ چھپ کر تورات کی تلاوت کرتے نہ کہ برسر عام۔

حضرت عمرؓ کو تورات کے یہ چند اوراق بنو قریظہ کے کسی شخص نے دیے تھے اور آپؓ یہ حضورؐ کو دکھانے کے لیے لائے تھے۔ تلاوت یا طور عبادت کے لیے نہیں۔

علامہ شعبی حضرت عبداللہ بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں:

قال جاء عمرؓ بن الخطاب الی النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال یا رسول اللہ انی مررت باخ لی من قریظه فکتب لی جوامع من التوارٰة الا اعرضها علیک.

(رواه احمد و الدارمی)

ترجمہ: "حضرت عمرؓ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا حضورؐ میں اپنے بنو قریظہ کے ایک ساتھی کے پاس سے گزرا اس نے میرے لیے تورات کی بعض اچھی باتیں لکھ دیں۔ کیا میں وہ آپ کے سامنے پیش کروں۔"

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ اسے تلاوت کے لیے نہ لائے تھے' حضورؐ کو دکھانے کے لیے لائے تھے اور حضورؐ کی آپ پر ناراضگی بھی اس کی تلاوت پر نہ تھی ان اوراق کے لانے پر تھی۔ آپ کے یہ الفاظ **امتهوکون فیها یا ابن الخطاب!** اے ابن الخطاب کیا اپنے دین کے بارے میں تم بھی کچھ حیرت میں مبتلا ہو؟

(رواہ احمد عن ابن عباسؓ وابن حبان عن جابرؓ)

اوراگر یہ سب پس منظر نہ بھی معلوم ہوتو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اسے صرف قرآن کی موافقت میں دیکھنا چاہتے ہوں تاہم جب آپؓ نے اس سے بھی حضورؐ کو ناراض ہوتے دیکھا تو فوراً کہا:

رضینا باللّٰہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد رسولاً ۔ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: ''ہم راضی ہوئے اپنے رب سے اور دین اسلام سے اور حضورؐ کے ایک رسول ہونے پر۔''

فالحمد للّٰہ علٰی ذلک ۔آپ کے یہ کہتے ہی حضورؐ کے چہرے سے وہ اثر زائل ہوگیا اور ان کا ایمان حضورﷺ کے پررونق چہرے سے تصدیق پاگیا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس وقت شاید یہ معلوم نہ ہو کہ تورات اب کلیۃً منسوخ ہوچکی ہے اور وہ دونوں (قرآن اور تورات) پر ایمان رکھتے ہوں اور سمجھتے ہوں کہ شاید اس کے کچھ احکام باقی رکھے گئے ہیں۔

والذین یؤمنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک . وبالاخرۃ ھم یوقنون.

(پ ۱ البقرہ)

ترجمہ: ''وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں قرآن کریم پر اور جو وحی آتی رہی آپ سے پہلے اور وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔''

تاہم یہ صحیح ہے کہ ان کا یہ خیال تعلیم نبوی کے خلاف تھا۔حضور اکرمؐ کا موقف یہ تھا کہ اب موسیٰ علیہ السلام بھی اگر دنیا میں تشریف لے آئیں تو وہ اپنی نبوت پر عمل نہیں کریں گے' میری اتباع کریں گے۔صحابہ اپنے دور تربیت میں کوئی غلط کام کریں اور اصلاح ارشاد نبوت پر چھوڑ دیں تو یہ منافقت ہرگز نہیں' زیادہ سے زیادہ ایک مسئلہ سے ان کی ناواقفی ہے اور اس ناواقفی کے بعد ان کا حضورؐ کی تعلیم سے صحیح اعتقاد پر لوٹنا اللہ کے ہاں یقیناً لائق قبول ہے اور اس کی جھلک حضورﷺ کے چہرے پر دیکھی گئی۔

انما التوبۃ علی اللّٰہ للذین یعملون السوء بجھالۃ ثم یتوبون من قریب فاولئک یتوب اللّٰہ علیھم وکان اللّٰہ علیماً حکیماً . (پ ۴ النساء ۱۷)

ترجمہ: ''توبہ قبول کرنی اللہ کو انہی کی ہے جو کوئی برا کام کریں نادانی سے پھر توبہ کریں قریب سے (جلدی) تو ان کو اللہ تعالیٰ معاف کردیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں اور وہ حکمت والے ہیں۔''

حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر تم موسیٰ کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم راہ راست سے دور ہو جاؤ گے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت تک صحابہ حاضرین حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ سب راہ راست پر تھے۔ورنہ حضورؐ یہ نہ کہتے کہ اگر تم

موسیٰ کی پیروی کروگے تو صحیح رستے سے یقیناً بھٹک جاؤ گے۔سو آپ کا یہ ارشاد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ایمان اور ان کے صادق العمل ہونے کی ایک کھلی شہادت ہے۔انہیں گمراہ صرف اسی صورت میں کہا جاسکتا تھا کہ اگر وہ تورات پر عمل کرنے لگیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی چھوڑ جائیں۔لو محال پر داخل ہوتا ہے۔اس وقت یہ بات محال سمجھی جا رہی ہے کہ صحابہؓ تورات کی پیروی کریں اور حضورؐ کو چھوڑ دیں۔یہ بات ناممکنات سے نہ ہوتی تو آپ اسے حرف لو سے بیان نہ کرتے۔

حرف لو کے تحت تینوں باتیں ہیں۔۱۔ ظہور موسیٰ ۲۔اتباع موسیٰ اور (۳) حضورؐ سے علیحدگی اور ان تینوں پر لضللتم کا نتیجہ مرتب فرمایا۔تو یہ بات صحیح ہے کہ ان تین امور کے بعد تم یقیناً راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔یہ صحیح نہیں کہ ظہور موسیٰ پر تم یقیناً مجھے چھوڑ دو گے اور ان کی اتباع کرنے لگ جاؤ گے۔رافضی نے اسی لیے یہ غلط ترجمہ کیا ہے کہ صحابہؓ کے حضورؐ کو چھوڑ جانے کو کسی طرح یقینی بنائے۔

چنانچہ رافضی اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

''آنحضرتؐ نے اپنے اس حلفیہ بیان سے ان حضرات (حضرت عمرؓ) کے اسلام وایمان کا بھانڈا بالکل چوراہے پر پھوڑ دیا ہے۔''

یہاں اس رافضی نے ان کے اسلام اور ایمان دونوں کی نفی کی ہے۔اور یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اسلام اور ایمان ایک ہیں۔کسی کو جب مسلمان کہا جائے تو ایمان کا بھی اقرار کرنا لازم ہو جاتا ہے۔یہاں رافضی کی یہ تحقیق ایک نئی تحقیق ہے کہ قریش مکہ اہل کتاب میں سے تھے او. وہ تورات پر عقیدہ رکھتے تھے۔اور وہ تورات کی تلاوت کرتے تھے۔پاگلوں کے سینگ نہیں ہوتے کہ فوراً پہچان لیے جائیں۔

اہل علم سے مخفی نہیں کہ اس قسم کی فروگزاشتوں سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔نہ ایسی باتوں کے ذکر سے کسی کے کفر کا گمان کیا جاسکتا ہے۔ حضورﷺ کا انھیں ایک شرط سے لضللتم کی خبر دینا بتلا دیتا ہے کہ اس وقت تک آپ اور آپ کے دوسرے ساتھی سب صادق الایمان تھے۔ورنہ لضللتم کے کوئی معنی باقی نہیں رہ جائے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان پر رافضی کا تیسرا حملہ

رافضی نے حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ پر **شک فی النبوۃ** کا الزام لگایا ہے۔ اور اس شک کو حضور اکرمؐ کی تکذیب تک کھینچا ہے تاکہ اس سے آپ کے ایمان کی نفی پر دلیل پکڑی جاسکے۔حالانکہ شک اور تکذیب میں اصولی فرق ہے۔شک ایک وسوسے کے درجے میں بھی ہوسکتا ہے' جو آئے اور نکل جائے۔شک کو باقی رکھنے سے تکذیب تک نوبت پہنچتی ہے۔منافقین کی صفت مطلق شک نہیں اس شک کو آخر تک پہچانا ہوتا ہے۔منافق اسی تردد میں گھومتے رہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے:

وارتابت قلوبهم فهم فی ریبهم یترددون . (پ ۱۰ التوبہ ۴۵)

ترجمہ: "اور شک میں پڑے ہیں دل ان کے۔ سو وہ اپنے شک میں ہی بھٹک رہے ہیں۔"

بہرحال مطلق شک کو تکذیب کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔

قرآن کریم میں حضورؐ کو یہ کہا گیا ہے کہ:

فان کنت فی شک مما انزلنا الیک فسئل الذین یقرأون الکتاب من قبلک لقد جاءک الحق من ربک فلا تکونن من الممترین (پ ۱۱ یونس ۹۴)

ترجمہ: "پھر اگر آپ اس کتاب کے بارے میں جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی کسی شک میں ہوں تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے کے اہل کتاب ہیں۔ بے شک آپ کے پاس خدا کی طرف سے حق آ پہنچا ہو۔ آپ ہرگز شک کرنے والوں سے نہ ہوں۔"

وہ کس درجہ کا خیال تھا جسے یہاں شک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تفصیل طلب ہے تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ یہاں شک تکذیب کے معنی میں نہیں ایک خیال ہے جو آیا اور گیا' اس سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔ کسی کو اس درجے میں خیال آیا کہ یہ کائنات تو بے شک اللہ نے بنائی ہے لیکن اللہ کو کس نے بنایا؟ اس قسم کا کسی کو خیال آئے تو فوراً کہے امنت باللہ ورسلہ۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لا چکا۔ اللہ تعالیٰ اسے تکذیب سے بچائے رکھیں گے۔ یقین کیجئے اس درجے میں جو خیال آئے اس سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا:

لا یزال الناس یتساءلون حتی یقال هذا خلق الله الخلق فمن خلق الله؟ فمن وجد من ذلک شیاء فلیقل امنت بالله ورسله . (متفق علیه)

ترجمہ: "لوگ برابر سوال کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بات اس پر آئے' خدا نے خلق کو پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ جو کوئی اپنے دل میں یہ بات پائے اسے کہنا چاہیئے' میں اس پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لا چکا۔"

خیال کے اس درجے کو کیا شک کہا جاسکتا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ کو خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ یہ واقعہ قرآن کریم سورہ البقرہ میں مذکور ہے:

رب ارنی کیف تحی الموتیٰ قال اولم تؤمن (پ ۳ البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: "اے میرے رب! مجھے دکھا تو کس طرح مردوں کو پھر سے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کیا تو اس پر ایمان نہیں لا چکا۔"

معلوم ہوا اس درجہ کا خیال ایمان کے منافی نہیں۔ اس میں صرف طمانیت کی طلب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اگر ایسا دیکھنا چاہا تو یہ ایک شدید درجے کا اشتیاق تھا۔ آپ اطمینان قلب چاہتے تھے اور ایسا چاہنا ایمان کے خلاف نہیں۔ حقیقت میں یہ شک نہیں تاہم اگر تم اسے شک کہو تو حضور فرماتے ہیں پھر یہ بات ہم پر بھی آئے گی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نحن احق بالشک من ابراهیم اذ قال رب ارنی کیف تحی الموتیٰ قال اولم تؤمن قال بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی. (صحیح بخاری ج ا ص ۴۷۷' صحیح مسلم ج ا ص)

ترجمہ: "ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کا حق رکھتے ہیں' انہوں نے بھی تو اطمینان قلب کے لیے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ مجھے دکھاؤ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا۔؟"

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں' اس حدیث کے معنی میں بہت اختلاف ہے۔ ایک یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ حضورؐ نے تواضعاً ایسا کہا تھا' اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع نہ دی تھی کہ آپ حضرت ابراہیم سے افضل ہیں۔
(فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵)

تاہم اس میں کسی شارح کا اختلاف نہیں کہ اس قسم کا خیال آنے سے جو حضرت ابراہیمؑ کو آیا' ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔

حضرت عمرؓ نے بھی مزید اطمینان چاہنے کی اگر کسی بات کو شک سے تعبیر کیا تو اس سے ان کے ایمان کی بھی نفی نہیں ہوتی ورنہ آپ حضورؐ کے پاس جا کر فوراً اس وسوسے کا ازالہ نہ کرتے۔ الحمدللہ کہ وہ تردد اسی وقت زائل ہو گیا اور سچائی کا سورج چڑھ کر رہا۔ محققین کا مدار حکم آخری بات ہوتی ہے نہ کہ کوئی بے ساختہ کہی پہلی بات۔

وہ کونسا شک ہے جو ایمان کے منافی ٹھہرے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **العبرة بالخواتیم** کہ آخری باتوں پر فیصلہ کرو۔ سو اگر کسی کا آخری عمل شک ہی رہا تو یہ شک بے شک تکذیب پر منتج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کا ازالہ کر چکا تو بے شک اس کا آخری عمل ایمان رہا۔ اب ایمان سے اس کو تہی دامن نہ کیا جاسکے گا۔ ہاں جو اسی شک میں مرے وہ ایمان قطعی سے محروم رہا۔ قرآن کریم نے ایمان والوں سے ان کے آخر تک ریب میں رہنے کی نفی کی ہے۔ اگر کوئی اپنے کسی وسوسے اور ریب سے خود نکل چکا تو اس سے ایمان کی نفی نہ کی جاسکے گی۔ مندرجہ ذیل آیت پر نظر کیجئے۔ اس آیت میں **امنوا** کے ساتھ **ثم لم یرتابوا**

کی قید ہے۔ جس کے ایمان کی یہ آخری خبر ہو ظاہر ہے کہ اس سے پہلے اگر کسی پر ریب کی حالت آئی بھی ہو اور پھر وہ اس ریب سے نکل آیا ہو تو اب اس کا آخری عمل ثم لم یرتابوا ہی رہا۔ آگے صرف اعمال صالحہ درکار ہیں۔ ایمان اس کا بے شک قائم ہو چکا۔

انما المؤمنون الذی امنوا باللّٰہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ اولئک ھم الصادقون (پ ۲۶ الحجرات ۱۵)

ترجمہ: ''مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاچکے' پھر وہ کسی شک میں نہ پڑے اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے جہاد کیا۔ یہ مومن صادقین میں شمار پاگئے۔

یہ سب تفصیل صرف اسی صورت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی وہ شک کی روایت اسناداً صحیح اور مرفوع متصل ہو اور حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ جن کا ایمان قطعی آیات اور متواتر روایات سے ثابت ہو اور وہ لسان نبوت سے مبشر بالجنۃ کی شہرت پاچکے تو اس قسم کی کمزور اور شاذ روایات سے کوئی صاحب علم ان کے ایمان کی نفی کی جرات نہ کر سکے گا۔ ہاں کسی کی ضد کا کوئی علاج نہیں۔

حضرت عمرؓ کے ایمان پر رافضی کا چوتھا حملہ

اس رافضی نے حضرت عمرؓ کے ایمان پر چوتھا حملہ ان کے اپنے اقرار نفاق کا کیا ہے۔ سو پیش تر اس کے کہ ہم اس کی تفصیل کریں ایک اصولی بات ہدیہ قارئین کیے دیتے ہیں۔

نفاق کی دو قسمیں ہیں (۱) نفاق اعتقادی (۲) نفاق عملی۔

نفاق اعتقادی وہ ہے جس میں دل میں تصدیق رسالت نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی کے دل کی بات کو جانچا نہیں جا سکتا۔ سو جب تک کسی سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو واقعی تکذیب رسالت کا نتیجہ دے' ہم کسی مسلمان کو نفاق اعتقادی کا الزام نہیں دے سکتے اور اسے منافق نہیں کہہ سکتے۔ رہا نفاق عملی تو اسے سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں:

ایۃ المنافق ثلث وان صام و صلی وزعم انہ مسلم (۱) اذا حدث کذب و (۲) اذا وعد اخلف (۳) اذا اؤتمن خان . (صحیح مسلم باب الوسوسہ ۷۹)

ترجمہ: ''منافق کی تین علامتیں ہیں۔ گو وہ روزے رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلم کہتا ہو' بات نقل کرے تو اس میں جھوٹ ملائے' وعدہ کرے تو اس نیت سے کہ اسے پورا نہیں کرنا' اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔''

پھر اس نفاق عملی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا:

اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً و من کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا اذا اؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر. (صحیح البخاری ج ۱ ص ۱۰)

ترجمہ: ''یہ چار باتیں جس میں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت بھی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ جیسے وہ کسی بات میں جھگڑے تو گالی پر اتر آئے۔''

اس حدیث میں اس نفاق سے نکلنے کی تدبیر یہ بتائی گئی کہ وہ اس خصلت نفاق کو ترک کر دے یہ نہیں کہ وہ کلمہ اسلام پڑھے' توحید و رسالت کی گواہی دے۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے اس گناہ پر ایمان سے نکلا نہ تھا (جیسا کہ خوارج کہتے ہیں) ورنہ اس خصلت سے نکلنے کی راہ اسے چھوڑنا نہ ہوتی۔ دوبارہ کلمہ اسلام پڑھنا ضروری ہوتا۔

ایسے گناہوں سے مومن ایمان سے نہیں نکلتا سو اگر کسی میں نفاق عملی پایا جائے تو اسے ایمان سے نہیں نکالا جا سکے گا۔ امام بخاریؒ نے اس پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔

باب المعاصی من امر الجاھلیۃ ولا یکفر صاحبھا بارتکابھا الا بالشرک ...... فسماھم المؤمنین. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۹)

ترجمہ: ''گناہ جاہلیت کے آثار ہیں لیکن اس کے کسی مرتکب سے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی سوائے شرک کے...... اللہ تعالیٰ نے ان باہمی قتال کرنے والوں کو مومنین کہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپس میں لڑنے والوں کو بھی مومن کہا ہے۔ معلوم ہوا باہمی قتال گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں اور اس سے کوئی ایمان سے نہیں نکلتا:

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا. (پ ۲۶ الحجرات ۹)

سو ظاہر ہے کہ نفاق عملی سے کسی کے ایمان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز ایمان کے منافی ہے وہ نفاق اعتقادی ہے انہی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وماھم بمؤمنین کہ یہ لوگ (اس درجہ کے منافق) ہرگز ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں۔

ومن الناس من یقول امنّا باللّٰہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین ٥ یخادعون اللّٰہ والذین امنوا . (پ ۱ البقرہ)

ترجمہ: ''اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان

لائے وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اس کے رسول برحق اور ان لوگوں کو جو پہلے ایمان لائے ہوئے ہیں' دھوکہ دے رہے ہیں یعنی ان کے پاس حقیقت ایمان نہیں صرف دعوے ایمان ہے اور ایمان ایک حقیقت کا نام ہے یہ کسی علامت عملی کا نام نہیں۔"

نفاق کا حکم عہد رسالت کے بعد باقی نہیں رہا

حضرت حذیفہؓ بن یمان منافقین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دان سمجھے جاتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ منافقین پر پردہ رکھنے کا حکم صرف حضور اکرم کی دنیوی زندگی تک محدود تھا۔ اور آپ نے بھی آخر میں ان سے اس پردے کو اٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد صرف دو طرح کے لوگ ہی رہے۔ (۱) مومنین اور (۲) کافرین۔ منافقین اب کسی درجے میں نہ رکھے جا سکیں گے۔ یا یہ مومنوں میں شمار رہیں گے یا کافروں میں۔ ان کی اب کوئی تیسری صف تسلیم نہ کی جا سکے گی۔ آپ نے فرمایا:

عن حذیفة قال انما النفاق کان علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فاما الیوم فاما الکفر او الایمان. (رواه البخاری ج ۲ ص ۱۰۵۴. مشکٰوة ص ۱۸)

ترجمہ: "نفاق ایک مستقل حقیقت میں صرف حضور اکرمؐ کے عہد میں تھا (آپ کے بعد اس کا کفر و ایمان سے ورے کوئی علیحدہ حکم نہیں)" آج یا کافر ہیں یا مومن (بس دو ہی طبقے ہیں)۔

هو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مؤمن. (پ ۲۸ التغابن)

فمنهم من امن ومنهم من کفر (پ ۳ البقره ۲۵۳)

سلیک بن الغطفانی کہتے ہیں:

قالوا خرج علینا حذیفة و نحن نتحدث فقال انکم لتکلمون کلاماً ان کنا لنعده علی عهد رسول اللهؐ النفاق. (مسند امام احمد ج ۹ ص ۷۷)

وعن ابی الرقاد العیسی عن حذیفةؓ قال ان الرجل یتکلم بالکلمة علیٰ عهد النبی صلی الله علیه وسلم فیصیر بها منافقاً. (ص ۸۰)

جب حضرت حذیفہؓ کسی اعتقادی منافق کو پذیرائی یا پردہ دینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تو ظاہر ہے کہ اب ان کے پاس صرف عملی منافقوں کے نام ہی چھپے ہو سکتے تھے۔ وہ کسی اعتقادی منافق کو اب اس خفیہ یادداشت میں جگہ نہ دیتے تھے۔ نہ حضورؐ کا انہیں کوئی حکم تھا کہ میرے بعد بھی منافقوں کے نام چھپائے رکھیں۔ آیئے اب اس رافضی کے الزام کا ایک تنقیدی جائزہ لیں۔ حضرت عمرؓ نے اگر حضرت حذیفہؓ سے کسی وقت پوچھا کہ حضورؐ کی بتلائی ہوئی فہرست میں کہیں میرا نام تو

نہیں تھا۔ تو حضرت حذیفہؓ نے انہیں صاف بتلا دیا تھا کہ نہیں۔

روینا عن امیر المؤمنین عمرؓ بن الخطابؓ انه قال لحذیفة اقسمت علیک بالله أنا منهم؟ قال لا ولا ابرؤ بعدک احداً. (البدایه ج ۵ ص ۱۷ ج ۱۸)

ترجمہ: "امیر المومنین حضرت عمرؓ سے روایت ہے' آپ نے حضرت حذیفہؓ سے کہا' تجھے میں خدا کی قسم دیتا ہوں تو بتا کیا میں ان میں سے تو نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔ اور میں آئندہ کسی کو اس اندیشے سے نہ نکال سکوں گا۔"

حضرت حذیفہؓ کے سامنے نفاق کا اظہار کس معنی میں؟

رافضی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ خود حضرت حذیفہؓ سے کہہ دیا:

یا حذیفة بالله انا من المنافقین۔ (میزان الاعتدال ج۱ ص ۳۶۵)

ترجمہ: "اے حذیفہؓ بخدا میں منافقین میں سے ہوں۔"

ظاہر ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس میں مراد صرف نفاق عمل ہے۔ نفاق اعتقادی والے تو اپنے اندر کی کسی کو خبر نہ دیتے تھے۔

حضرت حذیفہؓ کے ہاں اب نفاق اعتقادی کا کوئی وجود نہیں وہ عقیدہ میں اب کفر و ایمان کے سوا کسی تیسری صف کے قائل نہ تھے۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے ہاں اگر نفاق کا کسی درجہ میں کوئی احتمال ہو سکتا تھا تو وہ صرف نفاق عمل ہی ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔ ایک مومن بھی کسی درجے میں کسی نفاق عمل کا مرتکب ہو سکتا ہے' جس پر وہ آئندہ اپنے رب العزت سے معافی کا درخواستگار رہتا ہے۔

حضورؐ کے عہد میں منافق اپنا کفر چھپانے والے کو کہتے تھے۔ جب وہ اسے ظاہر کر دے تو اسے کافر کہا جاتا تھا' منافق نہیں۔ اب وہ منافق کیسے رہا؟ منافقین نشهد انک رسول الله بھی کہیں تو وہ اپنے اس دعویٰ شہادت میں جھوٹے ہیں۔ حضورؐ کا رسول ہونا برحق ہے لیکن وہ حضورؐ کی رسالت کی شہادت دل سے نہیں دیتے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے کہا' یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ والله یشهد ان المنافقین لکاذبون۔ (پ۲۸ المنافقون)

اب اگر حضرت عمرؓ نے کہا' اے حذیفہؓ بتا کہ میں منافقین میں سے تو نہیں ہوں۔ تو اب یہ سوال محض ایک نفاق عملی کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے آپ نے تواضعاً ایسا کہا ہو۔ تواضع پسند لوگ کبھی اپنے اخلاص کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اس زمانے کے کسی شخص نے اس سے حضرت عمرؓ پر کفر کا الزام نہیں دھرا۔ تاہم یہ رافضی اگر اس کتاب (میزان الاعتدال) کی تیسری جلد کی یہ عبارت بھی دیکھ لیتا کہ یہ ایک صریح جھوٹ ہے تو شاید اسے بھی اس سے آپ کے ایمان کی

نفی کرتے کچھ شرم ضرور محسوس ہوتی۔ کوئی اگر خود کہے کہ میں منافقین میں سے ہوں تو اب نفاق کہاں رہا؟ نفاق چھپی بات کو کہا جاتا ہے نہ کہ کھلی بات کو۔ اور یہاں آپ خود اس بات کو ظاہر کر رہے ہیں جس کے چھپانے کا کوئی ارادہ کرے۔

تاہم صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ آپ جیسا صاحب علم کبھی ایسے تضاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

ثم انه ساق من رواية قول عمرؓ يا حذيفة بالله انا من المنافقين قال هذا محال اخاف ان يكون كذباً . (ميزان الاعتدال ج ٣ ص ٥٨)

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ ایک موضوع روایت ہے جس کے سہارے رافضی حضرت عمرؓ کے ایمان پر حملہ کر رہا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔

تواضع میں اپنے آپ میں نفاق کا اندیشہ محسوس کرنا عیب نہیں

ایک مرتبہ حضرت حنظلہؓ نے کہا' نافق حنظلہ کہ حنظلہ منافق ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اظہار سے نفاق ہو بھی تو وہ جاتا رہا۔ بات کھل گئی ہے۔ اب یہ اندیشہ کس بات کا کیا جا رہا ہے؟ حضرت حنظلہؓ نے اس کی وجہ حدیث میں خود بیان کی ہے۔ دیو بند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے اس حدیث پر ایک نہایت پر مغز تقریر فرمائی ہے حضرت مولانا تھانویؒ نے اسے محفوظ کر لیا اور اپنے وعظ بعنوان تحصیل المرام میں اور کچھ حصہ اپنے ایک دوسرے وعظ بعنوان آثار العباد میں بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: اسے ہم مقدمہ میں بھی ذکر کر آئے ہیں مقام کی مناسبت سے ہم یہاں بھی اسے پیش کیے دیتے ہیں۔

یہ اپنے آپ کو منافق کہنا انتہائے تواضع انکساری اور جذب کے پیرائے میں ہے۔ اس نفاق کا احساس کفر کی رو سے نہیں انتہائے خوف باری کے لیے ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے کہ اگر حضرت عمرؓ بھی کہیں تو اسے تواضع اور حالت جذب پر محمول کیا جائے گا نہ کہ اسے معاذ اللہ نفاق اعتقادی کہا جا سکے۔

ایک مرتبہ حضرت حنظلہؓ حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ سے راستہ میں ملے۔ حضرت صدیق اکبر نے پوچھا کیا حال ہے۔ فرمایا: نافق حنظلة یعنی حنظلہ منافق ہوگیا۔ پوچھا کیوں؟ تو کہا

اذا كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم كنا عنده كانا نرى الجنة والنار رؤية عين واذا فارقنا نافسنا الاموال والاولاد وقال ابوبكرؓ وانا كذلك.

ترجمہ: ''جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری یہ حالت ہوتی ہے۔ گویا جنت اور جہنم کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ سے جدا ہو کر اموال و اولاد میں لگ جاتے ہیں اور یہ حالت نہیں رہتی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اگر یہ نفاق ہے تو ہم بھی منافق ہیں۔ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چل کر دریافت کریں۔''

صحابہ کی خشیت وشدت حرص کی کچھ حد ہے کہ تغیر حالت کو بھی نفاق سمجھنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی ہے وہی حالت ہمیشہ رہے اور اس کے تغیر سے ان کے ضعف ایمان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ تغیر احوال سے تو کیا اندیشہ ہوتا تغیر اعمال سے بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ کبھی جماعت فوت ہو جاتی ہے کبھی نماز قضا ہو جاتی ہے۔ کبھی غیبت ونگاہ بد میں مبتلا ہیں اور اپنے کو صاحب نسبت اور صاحب کمال سمجھتے رہتے ہیں۔ ذرا بھی اندیشہ نہیں ہوتا کہ یہ حالت کیسی ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عشق میں کمی ہے۔ عشق کامل ہو تو بات بات میں اندیشہ اور خوف ہوتا ہے۔

باسایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بد گمانی

ترجمہ: ''عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں میں تجھ سایہ کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتا''۔

ان کا اندیشہ بھی ویسا ہی تھا۔ حضرت حنظلہؓ کو اپنے اوپر نفاق کا خوف ہوا تھا۔ وہ نفاق کو عام سمجھ گئے۔ حالانکہ نفاق نام ہے اظہار الایمان وابطان الکفر کا (یعنی ایمان کو ظاہر کرنے کا اور کفر کو چھپانے کا) مگر چونکہ اس حالت کو فی الجملہ اس سے مشابہت تھی۔ اس لیے خوف ہوا اور فی الجملہ مشابہت یہ تھی کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی وہ پیچھے نہ رہتی تھی اور نفاق میں بھی یہی ہوتا ہے کہ سامنے کچھ اور پیچھے کچھ۔ تو جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتا تھا بعد میں اس میں کمی ہونے سے اندیشہ نفاق کا ہوا۔ گو نفاق کامل نہ سہی ناقص ہی سہی کیونکہ جس طرح ایمان کے بہت سے مراتب ہیں اسی طرح نفاق کے بھی مراتب ہیں۔ نفاق دون نفاق (نفاق کم درجہ کا نفاق) وکفر دون کفر (کفر کم درجہ کا کفر ہے) مگر عاشق کے نزدیک ناقص کا احتمال بھی خطرناک اور اندیشہ ناک ہے۔ اب دونوں حضرات طبیب کامل سید الاطباء الروحانیین کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والله لو كنتم بعدى كما تكونون عندى لصافحتكم الملائكة على الفرش ولكن يا حنظلة ساعة ساعة (او كما قال)

''بخدا اگر تم میرے پیچھے بھی ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے ہوتے ہو تو تم سے فرشتے بستروں پر مصافحہ کیا کرتے لیکن اے حنظلة ایک وقت اس طرح کا ہوتا ہے ایک وقت اس طرح کا۔''

یہاں علماء قشر کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت حنظلة کی موجودہ حالت کامل نہ تھی۔ گو نفاق بھی نہ تھا' کامل حالت وہی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی ویسے ہی رہتی جیسے آپ کے سامنے ہوتی تھی۔ حتی کہ فرشتے مصافحہ کرنے لگتے مگر

محققین نے فرمایا ہے کہ نہیں...... حالت موجودہ ہی کامل تھی کیونکہ ہر چیز کا کمال جدا ہے۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ اس میں بشریت کامل ہو جیسے روئی کا کمال یہ ہے کہ اس میں سیلان نہ ہو بلکہ رطوبت کم ہو جائے۔ سیلان پانی کا کمال ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کو جس حکمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس حکمت کا ظہور جس انسان سے ہو وہ تو انسان کامل ہے۔ وہی عالم ناسوت میں رکھا جائے گا اور جس میں ملکیت کا غلبہ ہو جائے وہ عالم ملکوت میں پہنچا دیا جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ بشریت کا مقتضاء یہی ہے کہ جو تم کو پیش آیا ہے کہ کبھی حضور کامل ہے کبھی حضور ضروری۔ کیونکہ غیبت محضہ تو کاملین کو ہوا ہی نہیں کرتی اور حضرت حنظلہ کے قول نافسنا الاموال والاولاد سے غیبت محضہ کا ہو جانا مراد نہیں بلکہ اس درجہ کا حضور نہ رہنا مراد ہے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتا تھا۔ سو حضور کے مراتب مختلف ہیں۔ کبھی کاملین کو اعلیٰ درجہ کا ظہور ہوتا ہے کبھی اس سے کم۔ اگر تمہاری ہمیشہ وہی حالت رہے جو میرے سامنے ہوتی ہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے یعنی تم میں ملکیت غالب ہو جاتی اور ملائکہ سے جا ملتے اور اس حالت میں تم انسان کامل نہ ہوتے۔ لہٰذا موجودہ حالت ہی کامل ہے۔

یہ تقریر ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی۔ واقعی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کیونکہ اگر یہ حالت جو حضرت حنظلہ نے بیان فرمائی تھی ناقص حالت ہے تو اس سے حضرت صدیق اکبرؓ کا بھی ناقص ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ حالت سن کر فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اور حضرت صدیق اکبر کی نسبت نقص کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ نقص ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تکمیل کا طریق ارشاد فرماتے لیکن آپؐ نے تو اس حالت کی تقریر فرمائی اور قصہ ہی ختم کر دیا اور فرمایا کہ یوں ہی ہونا چاہیے۔ معلوم ہوا کہ تغیرِ حالت نقص نہیں اور ایمان کے لیے حضورؐ کا ہمیشہ یکساں ہونا لازم نہیں ہے۔ (وعظ۔ تحصیل المرام ص ۲۴)

حضرت حکیم الامت نے یہ بھی فرمایا:

> ''میرے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضورؐ کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا...... تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دیے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اس کا ابطال لازم آتا تو اس غیبت پر تاسف و قلق کرنا گو اس ابطالِ حکمت کی تمنا کرنا ہے جو کہ غیر محمود ہے تو اس ذہول و غیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہو گیا تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی یہ مقابلہ

عقل کے۔'' (وعظ۔ آثار العبادہ ص ۱۷)

حضرت امیر خسرو (۷۸۶ھ) تو اس سے بڑھ کر کفر کا لفظ اپنے پر وارد کرتے ہیں اور کوئی ان پر کفر کا فتویٰ نہیں دیتا۔ یہاں کافر انکار دین کے معنی میں نہیں ہے۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق مے گوید کہ خسرو بت پرستی مے کند
آرے آرے مے کند با خلق اورا کار نیست

اہل تصوف کے ہاں تواضع اس درجہ تک بھی جا سکتی ہے مگر صحابہ صرف لفظ نفاق تک گئے کیونکہ یہ لفظ نفاق عملی کے لیے بھی شریعت میں وارد ہے۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں حضورؐ کا ایک اپنا ارشاد بھی نقل کر دیں جب آپ ایک مقام سے آگے بڑھتے تو اپنا پچھلا مقام آپ کو ایک پردہ نظر آتا۔ رافضی گو اس سے متمتع نہ ہو پائے لیکن ہو سکتا ہے ہم اپنے بھائیوں کو کسی درجہ میں ان لطیف مقامات کی کچھ سیر کرا دیں۔ اس میں اور کئی لوگوں کا بھلا ہوگا اسے بھی حضرت تھانویؒ کی زبان سے سنیے:۔

حضرت الاغر المزنی روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وانہ یغان علیٰ قلبی وانی لاستغفر اللّٰہ فی الیوم ماۃ مرۃ.

(رواہ مسلم . ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۴۳۸)

ترجمہ: ''میرے دل پر ایک پردہ سا چھا جاتا ہے اور میں ایک دن میں سو دفعہ استغفار کرتا ہوں۔''

میری آنکھوں کے سامنے بھی کبھی ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ میری استغفار بھی صرف مجازی نہیں رہتی بلکہ آدم علیہ السلام کی طرح اس میں حقیقت کی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ استغفار کو صرف معصیت میں منحصر سمجھنا بہت نادانی ہے ورنہ یہاں لفظ غین (بادل) کی بجائے صرف معصیت کا لفظ کیوں نہ فرما دیا گیا۔

خوب یاد رکھیے خطرہ معصیت سے نہیں خطرہ اس سے ہے کہ معصیت کے بعد استغفار نہ ہو اور جب استغفار نہ ہو تو صرف معصیت میں معصیت رہ جائے گی۔ (ایضاً)

حضرت عمرؓ کے ایمان پر رافضی کا پانچواں حملہ

حضورؐ کی آواز پر اپنی آواز بلند کر دی۔ حضورؐ نے **قوموا عنی** کہہ کر انہیں بزم نبوت سے نکال دیا۔ رافضی لکھتا ہے:

"کتب حدیث وتاریخ گواہ ہیں کہ قرطاس کے واقعہ ہائلہ کے وقت عمرؓ صاحب نے علاوہ دیگر گستاخیوں کے یہ بے ادبی بھی کی تھی (کہ حضورؐ کی آواز سے اپنی آواز اونچی کی) جس کی وجہ سے آنحضرتؐ نے قوموا عنی (میری بزم نبوت سے اٹھ جاؤ) فرما کر ان کو اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ ایسے گستاخ اور طرید رسول کو ہم کس طرح آنکھیں بند کر کے مومن کامل مان لیں۔"

(تجلیات صداقت ص ۴۵)

الجواب: رافضی کا یہ سراسر جھوٹ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی معمول کی آواز سے آواز اونچی کی اور حضورؐ نے آپ کو کہا قوموا عنی اور یہ کہ آپ نے انہیں اپنی بزم نبوت سے نکال دیا۔

۱۔ حدیث وتاریخ کی کسی کتاب میں یہ صحت سند سے ثابت نہیں کہ آپ نے حضورؐ کی آواز سے اپنی آواز اونچی کی ہو۔

۲۔ حضرت عمرؓ ایک تھے اور قوموا جمع کا صیغہ ہے۔ اس سے حضرت عمرؓ کو طرید رسول ٹھہرانا رافضی کا اپنا خبث باطن ہے، کسی جگہ صحت سند سے ایسا ثابت نہیں۔ یہاں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ کے لیے تعظیماً یہ جمع کے الفاظ کہے گئے ہیں۔

۳۔ رافضی نے یہ بات نہیں بتائی کہ وہاں جھگڑا کرنے والے کون لوگ تھے؟

۴۔ یہ جھگڑا حضرت عمرؓ کے حسبنا کتاب اللہ کہنے کے بعد ہوا یا پہلے؟ پھر کیا حضرت عمرؓ نے بھی اس جھگڑے میں حصہ لیا؟ آپ نے تو یہ کہا تھا کہ حضور ﷺ کو تکلیف نہ دی جائے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ.

۵۔ جھگڑنے والے دو فریق کون سے تھے اور حضرت عمرؓ کیا ان میں سے کسی میں شریک ہوئے؟

۶۔ حضور اکرمؐ نے کاغذ اور قلم کس سے طلب کیا تھا۔ حضورؐ کے لکھنے کا فریضہ کون سرانجام دیتے تھے؟

۷۔ حضورؐ کا یہ حکم کہ کاغذ اور دوات لاؤ، صحابہ میں سے کس کو تھا؟ اس وقت کون اس کا مامور تھا؟

۸۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے اس وقت کہاں تھے آپ کا کردار اس وقت کیا رہا؟ وہ کاغذ لائے یا نہ؟

۹۔ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کے اس بیان پر کہ آپ پر تکلیف کی شدت ہے، کیا فرمایا؟

۱۰۔ کیا حضورؐ نے وہ وصیت فرما دی جو آپ لکھوانا چاہتے تھے یا اپنے ساتھ ہی لے گئے؟

ان آخری آٹھ باتوں کی تنقیح کے بغیر قارئین کے سامنے رافضی کے اس جھوٹ کی پوری تصویر نہیں آ سکتی۔ اب

ہم نمبر ۳ سے اس تنقیح کا آغاز کرتے ہیں:

(۳) حدیث کی کتابوں میں جھگڑا کرنے کی ذمہ داری اہل بیت پر ڈالی گئی ہے۔

فاختلف اھل البیت فاختصموا منھم من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللہؐ کتابا ...... ومنھم من یقول ما قال عمرؓ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۳)

ترجمہ: "سو اہل بیت آپس میں مختلف ہو گئے اور جھگڑ پڑے۔ کچھ کہتے تھے کاغذ حضورؐ کے سامنے پیش کر دو۔ حضور تمہارے لیے کوئی تحریر لکھ دیں اور اہل بیت میں کچھ حضرت عمرؓ کے ہم خیال تھے کہ حضورؐ پر تکلیف کا وقت ہے۔ حضور سے بات زبانی سمجھ لو۔"

اس سے نمبر ۴ اور نمبر ۵ کی بھی تنقیح ہو گئی کہ جھگڑا کرنے والے دونوں فریق اہل بیت میں سے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان میں کوئی حصہ نہ لیا۔

(۶) حضورؐ نے کاغذ اور دوات اہل بیت سے طلب کیے تھے اور انہی کا آپس میں اختلاف ہوا تھا کہ کاغذ اور دوات آپ کے حضور پیش کیے جائیں یا نہ۔ کاغذ اور دوات ان کے پاس ہی رکھے تھے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ قربوا کہ انہیں حضورؐ کے قریب کر دو۔ دوسرا حضرت عمرؓ کی بات سے متفق تھا، کاغذ اور دوات کہیں دور سے نہ لانے تھے وہ وہیں تھے صرف انہیں حضورؐ کے قریب کرنے کی بات تھی۔ آپ نے یہ بات عام نہ کہی تھی صرف حضرت علیؓ کو کہی تھی کہ کاغذ لاؤ اور وہی ایسے امور میں حضورؐ کے سیکرٹری ہوتے تھے۔ صلح نامہ حدیبیہ میں لکھنے والا کون تھا؟ اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن الفراری نے جب حضورؐ سے ایک تحریر چاہی تو آپؐ نے کس کو لکھنے کے لیے بلایا تھا۔

قالوا فاکتب لنا علیک کتابا قال فدعا بالصحیفۃ ودعا علیاً لیکتب۔

(سنن ابن ماجہ ص ۳۰۴)

ترجمہ: "انہوں نے کہا ہمارے لیے آپ اپنے ذمہ کی ایک تحریر لکھ دیں۔ آپؐ نے کاغذ منگایا اور حضرت علیؓ کو بلایا کہ آپ یہ تحریر لکھ سکیں۔"

اس وقت بھی حضورؐ نے جو حکم دیا تھا کہ کاغذ اور قلم لاؤ تو کسے یہ حکم دیا تھا؟ حضرت علیؓ خود کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ کاغذ لانے کا حکم مجھے دیا تھا:

عن علی بن ابی طالبؓ قال امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبق یکتب فیہ مالا تضل امتہ من بعدہ. (مسند امام احمد ج ۱ ص ۱۹۵)

ترجمہ: "حضرت علیؓ کہتے ہیں نبی اکرمؐ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کے پاس کاغذ لاؤں۔ آپ اس میں وہ نصیحت لکھ دیں کہ آپ کی امت اس کے بعد کہیں گمراہ نہ ہو سکے۔

اس میں نمبر ۷ کا جواب بھی ہو گیا۔ اب آگے چلیے۔

(۸) حضرت علیؓ کو اس وقت دھیان نہ رہا کہ کاغذ اور دوات وہیں تھے' انہیں صرف حضورؐ کے قرب کا خیال تھا۔ حضرت علیؓ نے سمجھا کہ کاغذ اور قلم دوات گھر سے لانے ہوں گے۔ حضرت علیؓ نے سمجھا کہ اگر میں لینے گیا تو کہیں میرے پیچھے حضور کی وفات نہ ہو جائے۔ سو آپ اہل بیت کے اس گروہ میں تھے جو قلم دوات نہ لانے کے حق میں تھے۔ آپ اس میں حضرت عمرؓ کے حامی تھے۔ آپ خود کہتے ہیں:

فخشیت ان تفوتنی نفسه قلت انی احفظ واعی قال اوصیکم بالصلٰوۃ والزکٰوۃ وما ملکت ایمانکم. (مسند احمد)

ترجمہ: ''مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں آپؐ میری عدم موجودگی میں وفات نہ پا جائیں۔ میں نے کہا' حضورؐ میں زبانی یاد رکھوں گا۔ اس پر آپؐ نے اپنی وہ وصیت فرمادی کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی رکھنا اور غلاموں کا دھیان رکھنا ان سے کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ واقعہ قرطاس میں حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ **حسبنا کتاب اللّٰه** پر دونوں حضرات ایک تھے۔

(۹) حضورؐ نے حضرت عمرؓ کے اس بیان پر کہ آپ تکلیف میں ہیں' کیا فرمایا؟ حضور نے فرمایا:

دعونی فالذی انا فیه خیر اوصیکم بثلٰث (صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۳)

ترجمہ: ''میری فکر نہ کرو میں جس حالت میں بھی ہوں خیر سے ہوں' میں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔''

(۱) مشرکین جزیرہ عرب میں سکونت نہ رکھیں (۲) بیرونی وفود کو اس طرح آنے دینا جس طرح میں انہیں آنے دیتا رہا (۳) تیسری بات میں مہلب اور قاضی عیاض کی روایتیں مختلف ہیں۔ مہلب کہتا ہے یہ وصیت جیش اسامہ کی روانگی کے بارے میں تھی اور قاضی عیاض کہتے ہیں تیسری بات غالباً یہ تھی کہ میری قبر کو عبادت گاہ نہ بنالینا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ نے جو بات کہی تھی **ان رسول اللّٰه غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللّٰه** وہ از راہ خیر خواہی کہی ہے۔ تبھی تو آپ نے جواب میں کہا' نہیں میری فکر نہ کرو میں خیر سے ہوں۔ حضورؐ اگر اسے اپنی بغاوت سمجھتے تو یہ بات نہ کہتے' حضرت ابن عباسؓ کی بھی یہی رائے تھی۔ **اشتد برسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وجعه۔** کیا یہ حضرت عمرؓ کی کھلی حمایت نہیں؟

(۱۰) آپ نے وہ وصیت فرمادی جو آپ لکھانا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

بھی یہ تجویز مان لی تھی کہ اب کاغذ اور قلم دوات کی ضرورت نہیں۔ آپؐ زبانی وصیت کے لیے تیار ہو گئے اور پھر آپ نے وہ وصیت فرمادی جو آپ لکھوانا چاہتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا مشرکین کو حجاز میں نہ رہنے دیا جائے' بیرونی وفود کی پذیرائی کی جائے اور جیش اسامہ روانہ کیا جائے اور ایک دفعہ یہ وصیت بھی فرمائی کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی رکھنا اور غلاموں کا پورا دھیان رکھنا۔

نماز کی پابندی سے مراد حضرت ابوبکرؓ کی امامت کو باقی رکھنا تھا اور زکوٰۃ کی پابندی سے مراد ادائے زکوٰۃ میں حضرت ابوبکرؓ کی حمایت تھی اور غلاموں کے دھیان سے مراد مسلم فتوحات کی صحت کا اشارہ تھا تبھی تو آپ نے جنگی قیدیوں سے حسن سلوک کا حکم دیا۔

اس وصیت کی کتنی جہات اور تفصیلات کیوں نہ ہوں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ولی سلطنت کی نامزدگی کی تجویز ہرگز نہ تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا وصیت لکھوانا چاہتے تھے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ آپ کی امت آپ کے بعد اپنی پہلی راہ سے کہیں بھٹک نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ راہ کتاب وسنت کی راہ تھی جس پر حضورؐ نے امت کو عملاً چلا رکھا تھا اور آئندہ چلنے کی نصیحت کر رکھی تھی۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر وہ باتیں بتلا دیں کہ آپ کی امت اب آگے بھٹک نہ پائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ فرمائیں:

یبیّن اللّٰه لکم ان تضلوا واللّٰه بکل شئی علیم (پ ۶ النساء ۱۷۶)

ترجمہ: ''بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے کہ تم گمراہ نہ ہو سکو' اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

یہ قرآن کے بارے میں کہا گیا کہ اس سے تم گمراہ نہ ہو سکو گے۔ **حسبنا کتاب اللّٰه** میں اس کی تصدیق ہے۔ اب کیا اس کے بعد بھی امت کے گمراہ ہونے کا کیا کوئی اندیشہ رہ جاتا ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو نہ بھٹکنے کے لیے کتاب وسنت کی یہ راہ پہلے سے بتلا نہ رکھی تھی؟

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب اللّٰه و سنة رسوله.

(موطا امام مالک)

ترجمہ: ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں تاکہ تم گمراہ نہ ہو سکو۔ جب تک تم ان دو سے تمسک کرو۔''

وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ (۱) اللہ کی کتاب اور (۲) اس کے رسول کی سنت۔

اس میں بھی انہیں یقین دہانی کرائی گئی کہ جب تک تم کتاب اللہ اور سنت نبوی سے تمسک کرو گے تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اب رہے سیاسی امور' ان کو بھی حضورؐ نے کھول کر بیان کر دیا۔

(۱) جزیرہ عرب (حجاز) میں صرف مسلم آبادی رہے' اس میں کسی دوسرے عقیدے کو بسنے نہ دیا جائے۔

(۲) دوسرے ملکوں سے اچھے تعلقات رکھے جائیں' ان کے وفود کو مدینہ میں پوری پذیرائی دی جائے۔

(۳) جیش اسامہ کو روانہ کیا جائے' اسے روکا نہ جائے۔

اگر حضورؐ اپنے بعد کے لیے کسی کو خلیفہ نامزد کرتے تو یہ ایک نئی تجویز ہوتی اسے مالا تضل امته کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ امت قرآن وسنت کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ اب کبھی گمراہ نہ ہوں گے' اس باب میں مطمئن تھی کہ اب وہ گمراہ نہ ہوں گے۔ جانشین نامزد کرنے کو ہم کسی طرح مالا تضل اُمته کا موضوع نہیں ٹھہرا سکتے اور حضورؐ نے وہ موضوع وصیت زبانی بتلا بھی دیا اور امت کو پالیسی کے اعتبار سے تین باتوں کی وصیت کر دی۔ اور پھر خلافت کے بعد ہم نے عملاً بھی دیکھا کہ اس میں امت کا کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ اصول ہر ایک کے ہاں مسلم رہا کہ نظام سلطنت شورائی رہے گا۔ اگر کسی کو بھی یہ خیال ہوا کہ اسے شوریٰ میں بلایا نہیں گیا تو یہ ایک جزوی بات ہے۔ یہ اصول کا اختلاف نہیں ہے۔

سو یہ صحیح ہے کہ عقد سلطنت میں حضورؐ کے بعد مسلمان کسی اصول میں نہیں بھٹکے۔ سعد بن عبادہؓ نے سقیفہ میں جو میٹنگ بلائی وہ بھی بتلاتی ہے کہ وہ بھی شوریٰ کو ہی عقد سلطنت کا زینہ سمجھتے تھے ورنہ وہ مشورہ کے لیے کبھی جمع نہ ہوتے۔ اس وقت تک یہ عقیدہ پیدا نہ ہوا تھا کہ اسلام میں رہبر سلطنت خدا خود مقرر کرتا ہے اور نبوت کے بعد اب امامت خدا کی طرف سے قائم کی جائے گی۔

حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کو دو شخصوں کے بلانے کا حکم دیا

حضورؐ نے عقد سلطنت کے لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے باپ اور بھائی کو بلائیں کہ آپ کچھ لکھ دیں تاکہ کوئی ابوبکرؓ پر سبقت لے جانے کی نہ سوچے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع دی کہ خدا کی طرف سے (تکویناً) اور مومنین کرام کی طرف سے (تشریعاً) ابوبکرؓ کے سوا کسی پر رضا عام نہ ہو گی۔ تو آپؐ نے پھر اسے رہنے دیا۔

عن عائشه قالت قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مرضه ادعی لی ابابکر اباک و اخاک حتی اکتب کتاباً فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول انا اولیٰ ...... ویابی الله والمؤمنون الا ابابکر. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳)

ترجمہ: "ام المومنین کہتی ہیں' مجھے حضورؐ نے اپنے ایام علالت میں کہا' میرے سامنے اپنے باپ اور اپنے بھائی کو بلاؤ میں کوئی تحریر لکھ دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی اور امیدوار سامنے آئے اور کہے میں اس خدمت کے زیادہ لائق ہوں۔ پھر آپ نے الہام الٰہی سے خبر دی کہ اللہ اور مومنین ابوبکرؓ کے سوا باقی ہر ایک کا انکار کر دیں گے۔ (یعنی سعد بن عبادہ یا کسی اور پر امت متفق نہ ہو سکے گی)

رافضی حضرت عمرؓ پر پانچویں حملے میں اپنے حواس ہی کھو بیٹھا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کاغذ اور قلم لانے میں اختلاف کرنے والے دونوں طرف اہل بیت کے آدمی تھے۔ حضرت عمرؓ اس سے پہلے اپنی بات کہہ چکے ہوئے تھے۔ ایک گروہ اہل بیت سے کاغذ قلم لانے کے حق میں تھا اور دوسرا گروہ اس بات کو درست سمجھتا تھا جو حضرت عمرؓ نے کہی تھی۔ حضورؐ نے بھی اسی بات کو درست جانا جو حضرت عمرؓ نے کہی اور دوبارہ کاغذ اور قلم طلب نہ کیے' زبانی وصیت فرما دی۔ اور حضرت علیؓ بھی قلم دوات نہ لانے میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے قوموا کن کو کہا؟ یہ جمع کا صیغہ ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ کون تھے جو وہاں سے اٹھا دیے گئے۔ رافضی حضرت عمرؓ کو طرید رسول کہنے میں جھوٹ بولنے کی لذت لے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب یہ سطور لکھ رہا تھا تو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ رافضی نے ان لوگوں کی کوئی فہرست پیش نہیں کی جو وہاں بارگاہ رسالت سے اٹھا دیے گئے اور طرید رسول کہلائے۔

تاہم اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکلتا ہے کہ حضورؐ کا اس وقت مجلس پر پورا کنٹرول تھا۔ جسے چاہیں بیٹھنے دیں اور جسے چاہیں نکال دیں۔ آپ اگر اس وقت بالکل بے بس کر دیے گئے تھے اور معاذ اللہ غلبہ رسالت کی بساط الٹ چکی تھی تو آپ کا کسی گروہ کو یہ فرمانا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ کیسے درست سمجھا جا سکتا ہے۔ رافضی نے اس سے بھی حضرت عمرؓ کے ایمان کی نفی پر استدلال کیا ہے' اس سے آپ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ رافضی کس طرح بوکھلایا ہوا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا یہ حملہ حضرت عمرؓ پر اتر رہا ہے یا اہل بیت پر جو اس وقت حضورؐ کے سامنے آوازیں بلند کر رہے تھے (معاذ اللہ) یا کسی اور پر۔

حضورؐ کا یہ فرمانا کہ میں اس وقت بہتر حالت میں ہوں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جن حضرات نے یہ کہا تھا کہ حضورؐ پر تکلیف کی شدت ہے' آپ نے ان کی بات خیر خواہی کی سمجھی تھی' مخالفت کی نہیں اور یہ کہنے والے صرف حضرت عمرؓ ہی نہ تھے بعض اہل بیتؓ بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے اور حضرت علیؓ بھی ان میں سے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ پر کیے گئے چار حملے اور حضرت عمرؓ پر کیے گئے یہ پانچ حملے آپ کے سامنے آ چکے اور ان کے جوابات بھی آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔

اب آیئے ہم آپ کو حضرت عثمانؓ کے پاس لے جائیں' آپ خود انہیں بھی ایک کامل مومن محسوس کریں گے۔

رافضی کا حضرت عثمانؓ ذوالنورین کے ایمان پر پہلا حملہ

رافضی جس سائیکل پر چڑھا آرہا ہے اس کے دو پہیے ہیں ایک غلط بیانی اور دوسرا بدگمانی۔

اور یہاں تو اس کی سائیکل بالکل ہی پنکچر ہوگئی ہے۔ غلط بیانی کے لیے بھی کچھ مواد چاہیے' حوالے چاہئیں' اور یہ کہ معترض بات کو صحیح رخ سے موڑ کر غلط رخ پر ڈالنے میں کچھ مشق رکھتا ہو۔ لیکن بدگمانی کے لیے کچھ بھی درکار نہیں' یہ محض ایک گمان ہی گمان ہے۔ جس کے لیے رافضی کے پاس کوئی کمزور حوالہ بھی نہیں ہوتا اور وہ اسی سائیکل پر سوار غلط بیانی اور بدگمانی دونوں کو ملائے دوڑ رہا ہے' یہ صرف پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کے دونوں پہیوں سے ہوا نکل چکی ہوئی ہے۔

کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ دلائل قطعیہ سے ہوتا ہے' دلائل ظنیہ سے نہیں اور وہ روایت جو مروی عنہ تک ثقہ راویوں سے نہ پہنچے اور متصل نہ ہو وہ دلائل ظنیہ میں بھی شمار نہیں ہوتی۔ ایمان ایک اندر کی بات ہے جسے باہر اس کے اسلام میں ہی دیکھا جاسکتا ہے اور جس نے کسی کے ظاہراً اسلام لانے کو اس کی دلیل ایمان نہ مانا ہو اس کے لیے بہت آسان ہے کہ باہر بیٹھا اپنے خیال سے کسی پر کفر کے کارتوس چلائے۔ یہ تو صرف اسی کو پتہ چلے گا جو اسے غور سے پڑھے کہ یہ سب چلے ہوئے کارتوس تھے۔ ریت کے سراب میں آکر سائیکل کے یہ دونوں پہیے غلط بیانی اور بدگمانی کے ڈوب جاتے ہیں اور سوار سمجھتا ہے کہ شاید یہ یونہی ٹوٹے ہوں یا پانی میں ڈوبے ہوں۔

رافضی کی غلط بیانی کا پہلا پہیہ

رافضی لکھتا ہے:

''خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۱۳۱ طبع مصر میں باسناد ابن عساکر (۵۷۱ھ) لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ عورتوں کے بڑے شائق تھے۔'' (تجلیات صداقت ۲۵)

عورتوں کا شائق ہونا کوئی عیب نہیں۔ یہ عیب سمجھا جاتا تو حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے ہوتے ہوئے ابوجہل کی بیٹی سے شادی کا شوق نہ رکھتے۔ کیا یہ ایک اور عورت کا شوق نہیں؟ اس طرح نہ حضرت سیدہؓ حضرت علیؓ سے ناراض ہوتیں۔ نہ خارجی عقیدے کے لوگ حضرت علیؓ کے خلاف استدلال کرتے کہ جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اس نے رسول پاک کو ناراض کیا اور جس نے رسول پاک کو ناراض کیا اس نے اللہ کو ناراض کیا اور نہ ہمیں اس پر خارجیوں سے بحث کرنی پڑتی۔ اسے غلط بیانی ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ رافضی نے اس پر ابن عساکر سے ثقہ راویوں کی کوئی متصل سند پیش نہیں کی اور ظاہر ہے کہ عقائد کے باب میں اس قسم کی روایت کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی کہے کہ پھر علامہ سیوطی یا ابن عساکر نے اسے کیوں روایت کیا۔ اس کی بات اس لیے لائق جواب نہ سمجھی جائے گی کہ ان دونوں میں سے کسی نے اسے عقائد کی بحث میں روایت نہیں کیا اور رافضی اسے عقائد کی بحث میں لا رہا ہے۔

رافضی کی بدگمانی کا دوسرا پہیہ

رافضی لکھتا ہے:

''بعض مورخین کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جناب عثمانؓ اسلام کو حقیقی دین سمجھ کر اسلام نہیں لائے تھے بلکہ بعض مسلمان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے جنسی جذبہ کے پیش نظر کلمہ پڑھا تھا۔'' (تجلیات صداقت ص ۴۵)

یہ صرف بدگمانی ہے جس کے لیے رافضی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس نے بعض مورخین کہہ کر ایک اور جھوٹ بولا ہے' کسی بات کو واضح اور بیان کب کہا جاتا ہے؟ جب اس پر سب مورخین متفق ہوں لیکن رافضی خود ہی انہیں بعض مورخین لکھتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کو واضح بھی کہہ رہا ہے؟

پھر رافضی اس بات پر بھی کوئی بات نہیں کہہ سکا کہ آپ کو اس جنسی جذبہ کو پورا کرنے کے لیے مسلمان عورتوں کا ہی کیوں شوق تھا۔ جب حضرت عثمانؓ اسلام لائے تو وہ پانچویں یا چھٹے مسلمان تھے۔ اس وقت مسلمان عورتیں تھیں ہی کتنی جو آپ مسلمان عورتوں کی خواہش میں کلمہ پڑھنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ قریش میں اس وقت کتنی عورتیں ہوں گی جن سے آپ اپنا شوق پورا کرسکتے تھے۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ محض عورتوں کے شوق میں صف اسلام میں آگھستے۔

رافضی کا اہل بیت اور خود حضورؐ پر شرمناک حملہ

رافضی لکھتا ہے:

''اور جناب رقیہؓ بنت رسول (بقول اہل سنت) جمال باکمال کی مالک تھیں۔ عثمانؓ کو ان سے شادی کرنے کا شوق دامن گیر ہوا...... عثمانؓ صاحب اسلام لے آئے اور گوہر مقصود سے دامن بھرا یعنی رقیہؓ سے ان کی شادی ہوگئی۔ (تجلیات ص ۴۵)

ان کا یہ شوق کس نے پورا کیا؟ (معاذ اللہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے...... جنہوں نے (بقول رافضی) اپنے گھر پلنے والی بچی حضرت عثمانؓ کے سپرد کردی۔ اس سے حضورؐ کے وقار پر کیا بار آتا ہے۔ شاید رافضی نے کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ پھر لکھتا ہے:

''جو صاحب صرف حسب دلخواہ عورتوں سے شادی رچانے کی خاطر اسلام لے آئے ہم کس طرح ان کو کامل الایمان مان سکتے ہیں؟''

یہاں رافضی کے لفظ 'صرف' پر ذرا توجہ دیں۔ اس عبارت میں اس لفظ 'صرف' پر غور فرمائیں۔ اس پر رافضی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ مسلمان عورتوں سے شادی کرنے کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ آپ خود اندر سے ایمان لا چکے تھے اور آپ اب چاہتے تھے کہ مسلمان عورتوں سے ہی نکاح کریں۔ جب دونوں باتیں جمع ہوسکتی ہیں تو پھر اپنی طرف سے اس

عبارت میں صرف لانا اگر بدگمانی نہیں تو اور کیا ہے۔

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس رافضی کو کچھ حیا آ ہی گئی کہ حضرت عثمانؓ کے ایمان کو کسی درجے میں قبول کر لیا۔ صرف ان کے کامل ایمان ہونے کی نفی کی کہ ان کا ایمان تو مانا جا سکتا ہے مگر ان کو کامل الایمان ماننا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ حضرت عثمانؓ کی مالی قربانیوں کو دیکھ کر کوئی شخص ان کے کامل الایمان ہونے میں شک نہ کر سکے گا۔

رافضی کا حضرت عثمانؓ کے ایمان پر دوسرا حملہ

''اور اسلام لانے کے بعد بھی حالت یہ تھی کہ جناب عائشہ ام المومنین کا فتویٰ ان کے حق میں یہ تھا اقتلوا نعثلاً فانه كفر او فجر (اس بوڑھے کو قتل کر دو یہ کافر ہو گیا ہے' نہیں تو فاجر تو ہو ہی گیا ہے)''

جب حضرت عثمانؓ اسلام لائے اس وقت حضرت عائشہؓ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں کہ آپ کی کسی بات کو حضرت عثمانؓ کی اس وقت کی حالت کہا جا سکے۔

اس پر رافضی نے جو چھ حوالے دیے ہیں۔ ان میں ایک حوالے میں بھی مولف اس روایت کو حضرت ام المومنین تک ثقہ راویوں کی سند متصل نہیں پہنچا سکا۔ رہی یہ بات کہ اگر یہ بات بے بنیاد تھی تو ان مولفین نے اسے نقل کیوں کیا؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے اسے عقائد کی بحث میں پیش نہیں کیا ہے۔

ثانیاً اس روایت میں لفظ فانه كفر بتاتے ہیں کہ آپ پہلے ایمان لائے ہوئے تھے تبھی تو اب آپ کی تکفیر کی گئی اگر وہ پہلے سے ہی ایمان نہ لائے تھے تو اب ان پر کفر کا الزام چہ معنی دارد۔ پھر راوی اپنے دعوے کفر پر برقرار نہیں رہا۔ او فجر کے لفظ پر آ گیا اور ظاہر ہے کہ گناہ ایمان کے منافی نہیں اس کا ایک مومن سے بھی صدور ہو سکتا ہے۔ ہاں خارجی اسے نہیں مانتے۔ تعجب اس پر ہے کہ رافضی یہاں خارجی کیوں بن رہا ہے؟

اگر یہ واقعی حضرت ام المومنین کا فتویٰ تھا تو حضرت حسنؓ اور حسینؓ نے جب وہ حضرت عثمانؓ کے گھر کا پہرا دے رہے تھے' اس وقت انہوں نے اس فتویٰ کی تردید کیوں نہ کی۔ کیوں نہ کہا کہ ہم ام المومنین کے فتوے کو نہیں مانتے۔ ہم ان ظالموں کو حضرت عثمانؓ کے گھر نہ گھسنے دیں گے۔ اگر اس روایت میں کچھ بھی وزن ہو تو پھر یہ بھی جانیں کہ آپ کے اسلام لانے اور حضرت ام المومنین کے اس فتوے میں کیا نصف صدی کا فاصلہ تو نہیں؟ اس حوالہ کو پیش کرنے والا رافضی کیا انہیں پچاس سال تک مومن مانتا ہے اور پھر ان پر اب کفر کا الزام دھر رہا ہے۔

فتویٰ وہی درست ہے جو واقعات کے مطابق ہو۔ حضرت عثمانؓ معاذ اللہ اگر کافر ہو چکے تھے تو وہ کونسا جملہ کفر تھا جو آپ نے کہا اور پھر اس پر فتویٰ کفر جاری ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ جب حضرت عثمانؓ کے قتل کے خلاف اٹھے اس وقت

انہیں یہ کیوں نہ بتلایا گیا کہ ان کے خلاف حضرت ام المومنین نے یہ فتویٰ دیا تھا اس لیے انہیں قتل کیا گیا۔ ان قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہرگز کوئی فتویٰ نہ تھا۔ ایک غلط روایت تھی جو رافضیوں نے چلا دی اور اہل حق نے جلا دی۔

رہا حضرت امیر المومنین کی لاش سے کی گئی بے حرمتی کا طعنہ تو اسے کوئی وہ شخص جس نے ظالموں کے اس عمل کو دیکھا اور پڑھا ہو جو انہوں نے کربلا میں حضرت حسینؓ کی لاش سے کیا اور کس طرح مستورات کی بے حرمتی کی گئی ہرگز اسے امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے ایمان کی نفی پر محمول نہ کرے گا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش سے جو بدسلوکی کی گئی اسے جاننے والے لوگ ان کمینہ حرکات کو کبھی ان کے ایمان کی نفی نہیں ٹھہراتے۔

رافضی جب ظاہری دلائل سے بالکل بے خود ہو جاتے ہیں تو وہ جھٹ انسان کے مخفی امور کا سہارا لیتے ہیں کہ شاید اندر کی کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے ہم ظاہر کے اس طلسم کو توڑ سکیں جو قرآن پاک کی آیات قطعیہ سے صحابہؓ کے اندرونی ایمان کی ایک نہیں خبروں پر خبریں دے رہا ہے۔

رافضی کا حضرت عثمانؓ کے ایمان پر تیسرا حملہ

رافضی لکھتا ہے:

مہاجرین نے جو خط اہل مصر کے نام لکھا تھا اس میں یہ الفاظ موجود تھے:

فان كتاب الله قد بدل و سنة رسول الله قد غُيّرت.

(تجلیات ص ۴۶ بحوالہ ابن قتیبہ ص ۲۹' ۳۱' ۳۲)

ترجمہ: ''قرآن کریم بے شک بدلا جا چکا ہے اور سنت رسول بھی اپنی جگہ سے ہٹا دی گئی ہے۔''

اس حوالے میں یہ باتیں لائق تنقیح ہیں

(۱) مہاجرین کہاں جمع ہوئے تھے جہاں انہوں نے یہ خط لکھا؟

(۲) کون کون مہاجر صحابہؓ ان میں شامل ہوئے تھے' وہ کب جمع ہوئے؟ تعداد اور تاریخ درکار ہے۔

(۳) آپ نے کتاب اللہ کے جو احکام بدلے کیا وہ اس خط میں ہیں؟ تو انہوں نے کیا کسی کو وہ احکام بتلائے اور انہیں ملنے گئے؟

(۴) جو سنتیں تبدیل کی گئیں وہ کون کون سی تھیں۔ وہ اس خط میں کیوں نہیں لکھی گئیں؟

(۵) یہ خط اہل مصر کے نام ہی کیوں لکھا گیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہ' حضرت زبیرؓ اور امیر معاویہؓ میں سے کسی کے نام کیوں نہ لکھا گیا۔

(۶) یہ مہاجرین ہی کیوں جمع ہوئے تھے' کیا انصار کو ان سے اس باب میں کوئی اختلاف تھا؟

(۷) پھر اگر یہ خط واقعی لکھا گیا تھا تو یہ صرف اہل مصر کو بغاوت پر ابھارنے کے لیے لکھا گیا ہوگا۔ جب مہاجرین کا کسی دن اور کسی جگہ اس کے لیے جمع ہونا کہیں نہیں ملتا تو ظاہر ہے کہ اس خط کا لکھنے والا عبداللہ بن سبا یہودی ہی ہوگا جو مختلف صوبوں میں بغاوت کی فضا پیدا کر رہا تھا۔ اور حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسے زندہ جلا دیا تھا۔

اہل دانش کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ ایسی کمزور تاریخی روایات سے عقائد ہرگز ثابت نہیں ہوتے' نہ کسی کے گرد اس طرح کے فرضی حوالوں سے کفر و ایمان کے فاصلے کھینچے جاسکتے ہیں۔

رافضی کی ایک اور دھکا زوری دیکھئے

''مہاجرین کی اس معتبر شہادت کے بعد مزید کسی گواہ کی گواہی کی ضرورت نہیں۔'' (تجلیات ص ۴۶)

یہ شہادت جس کا کوئی سر پیر نہیں اور نہ اس پر کوئی سند پیش کی گئی ہے۔ اس سے کسی مقدمہ کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے اور پھر اسے ایسا معتبر سمجھنا کہ اس پر اور کسی گواہ کی گواہی کی ضرورت نہیں کیا کسی پڑھے لکھے آدمی کا کام ہوسکتا ہے۔ ہم نے خلفاء ثلثہ کے خلاف رافضی کے پیش کردہ جملہ حوالوں کی حقیقت ناظرین کے سامنے پیش کردی ہے۔ رافضی صرف اس سائیکل پر چڑھا جا رہا ہے جس کے غلط بیانی اور بدگمانی کے دونوں پہیوں سے ہوا نکلی ہوئی ہے اور اسے پتہ تک نہیں ہے۔

آنکس کہ نداند و نداند کہ ندا ند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

ا۔ کسی کے ایمان پر یقینی اطلاع پانا بڑا مشکل کام ہے

شیعہ خلفائے ثلثہ پر کیے گئے ان بارہ حملوں کی وجہ سے اثنا عشری کہلانے میں بہت لذت محسوس کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خارجیوں کی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھ نہیں پائے۔ اندر کی حقیقت کسی کے کھلے اقرار سے ہی کھل سکتی ہے۔ جب تک اس کی نفی کے لیے کوئی یقینی بات سامنے نہ آئے۔ اس کے ایمان کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ اثنا عشری اپنی ان واردات سے خارجیوں کے بہت قریب ہو جاتے ہیں سو ہم یہاں ایمان و عمل اور ان کی باہمی نسبت پر بھی کچھ ضروری بحثیں ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

ایمان و عمل کی نسبت میں چند ضروری مباحث

ا۔ ایمان کا مورد دل ہے۔ جسے بندہ خود ہی جانتا ہے اور خدا کے سوا کوئی دوسرا اسے نہیں جانتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کی اس کیفیت قلبی کی اطلاع دے دے۔ اور یہ اطلاع بھی کسی محفوظ پیرائے میں ہو۔ کسی عام آدمی کا خواب نہ ہو'

نہ کسی نے کوئی غیبی آواز سنی ہو۔ یہ قابل اعتماد ذریعہ پیغمبر کی وحی کے سوا گو وہ وحی خفی کیوں نہ ہو نہیں ہوسکتا۔ ان الفاظ کی دلالت بھی اپنے موضوع پر واضح ہونی چاہیے۔ کھینچ تان کر کسی لفظ میں اپنے معنی داخل کرنا کوئی تحقیقی کام نہیں ہے اور نہ دانشور کبھی اس راہ میں چلے ہیں۔

حضور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہو چکا ہے۔ اب کسی کے ایمان پر یقینی اطلاع پانا بہت مشکل کام ہے۔ کوئی کسی کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ وہ مومن ہے یا کافر۔ الہام ولی بھی دلائل شرعیہ میں سے نہیں لہٰذا اب کسی کے ایمان پر حکم کرنے کی راہ اس کے ایمانیات کے ظاہری اقرار کے سوا اور کوئی نہیں رہ جاتی بشرطیکہ اس سے ایمانیات میں سے کسی امر کا واضح انکار ہمیں یقینی پیرائے سے نہ ملے۔ نقل میں یقینی پیرایہ تواتر روایت اور استفاضہ عام ہی ہے۔ یہ تواتر طبقہ ہو یا تواتر اسناد یا تواتر قدر مشترک' ختم نبوت کے بعد یقینی اطلاع کے لیے یہ تواتر ضروری ہے۔ اور اس کا مبداء بھی حسی ہونا چاہیے۔ یہی ایک بنیادی یقین ہے جس سے کفر و ایمان کے فاصلے طے کیے جاسکتے ہیں۔

ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے جسے صرف زبان سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ایمان کی بنیادی تعلیمات میں اقرار باللسان و تصدیق بالقلب سے کون واقف نہیں۔ ذاتی اقرار ایمان ہی کسی کو اسلام کی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو مومن کے اندر پہلے ایمان نام پاتی ہے اور ظاہر کے پہلو سے اسے ہی اسلام کہا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں لفظ علیحدہ علیحدہ آئیں تو ان کی حقیقت ایک ہو جاتی ہے اور جب یہ اکٹھے آئیں تو یہ دو لفظ اپنے اپنے معنی میں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

اب جہاں کہیں خدا اور رسول کی طرف سے ان دونوں میں فرق کیا گیا ہے وہاں ان میں بے شک فاصلہ ملحوظ رہے گا جیسا کہ آیت قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم میں وارد ہے۔ اس کے سوا ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں ہوں گے۔ اور ہر کسی کا اقرار اسلام اس کے اندر کے ایمان کی شہادت تسلیم کیا جائے گا۔ بشرطیکہ کوئی شخص ایمانیات میں سے کسی امر کا انکار نہ کرے۔ جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے۔ ایمان اور اسلام کو ایک ہی صورت میں سامنے کیا گیا ہے۔

فاخرجنا من کان فیها من المومنین ٥ فما وجدنا فیها غیر بیت من المسلمین (الذاریات ۳۵' ۳۶)

ترجمہ: ''بس ہم نے اس میں جو بھی مومن تھا اسے اس سے نکال لیا اور اب ہم نے وہاں ایک کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔''

یہاں قرآن میں مومنین کا ترجمہ مسلمین سے بہت واضح پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے صاف سمجھا جاتا

ہے کہ ایمان اور اسلام کی حقیقت ایک ہے۔

اسلام کا کلیہ یہی ہے۔ اسلام اور ایمان ایک ہیں۔ اندر کے اعتبار سے اس کا نام ایمان اور باہر کے اعتبار سے اس کا نام اسلام ہے۔ اس کلیہ کے خلاف کوئی جزئی ہو تو وہ اپنے مورد پر بند رہے گی' اسے کلیہ نہیں بنایا جاسکے گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اقرار باللسان کے بعد بندہ سے ایمانیات میں سے کسی کا انکار صریح پیرایہ میں نہ ملے۔ اگر کسی سے کوئی ایسا سرزد ہو جیسا کہ مرزا غلام احمد کے پیروؤں سے ملتا ہے تو اب انہیں ایمان اور اسلام دونوں ناموں سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ایسے لوگ اگر ایک بڑی تعداد میں بھی ہوں گے تو وہ غیر مسلم اقلیت قرار پائیں گے۔ ایمان اور اسلام کے الفاظ اکٹھے آئیں تو معنی مختلف ہوں گے اور علیحدہ علیحدہ استعمال میں آئیں تو ہم معنی ہوں گے۔ الایمان والاسلام واحد۔

۲۔ اندر کا ایمان اقرار باللسان سے ہی پہچانا جائے گا

اسلام میں اعمال علامات میں سے ہیں۔ کسی کو نماز پڑھتے پائیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی مسلمان ہے۔ لیکن جب اسلام کی حقیقت زیر بحث آئے گی تو اسے صرف نماز پڑھنے پر مسلمان نہ ٹھہرایا جائے گا' اس کی حقیقت وہی تصدیق قلبی ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ حقیقت ایک ہے باعتبار ظاہر اسے اسلام کہیں گے اور باعتبار باطن اسے ایمان کہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں امت مسلمہ کو بارہا **یا ایھا الذین اٰمنوا** سے آواز دی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آواز ظاہر نام سے دی جاتی ہے کسی چھپی حقیقت کے پہلو سے نہیں۔ سو صحابہؓ وہ لوگ تھے جن کا ظاہر باطن ایک تھا اور یہ انہی کا حق تھا کہ انہیں ظاہراً بھی ایمان والے کہہ کر آواز دی جائے۔

اعمال ایمان کی علامت تو ہو سکتے ہیں حقیقت نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علامات کا اعتبار اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت نہ کھلے۔ قرآن کریم نے بارہا اعمال کو ایمان کے علاوہ ایک مستقل پیرائے میں ذکر کیا ہے۔

والعصر ان الانسان لفی خسر o الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحت ...... (الایہ)

سو ایمان کسی کے اقرار باللسان سے ہی معلوم کیا جاسکتا ہے' اس اندرونی حقیقت تک پہنچنے کی اس کے سوا اب کوئی اور راہ نہیں ہے۔

قرآن کریم نے اس اندر کی حقیقت کو باہر لانے کے لیے کچھ باہر کے نشانات بھی بتلائے ہیں۔ جو ایمان کی علامات کہلاتے ہیں جن سے کسی کے اندر کو جھانکا جاسکتا ہے۔ اقرار کلمہ کے ساتھ یہ علامات دکھائی دیں تو یہ وہ راہ ہے جس سے کسی کے ایمان کی خبر دی جاسکتی ہے۔

انما المومنون الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم اٰیاتہ زادتھم ایماناً و علی ربھم یتوکلون الذین یقیمون الصلوۃ ومما رزقناھم ینفقون اولئک ھم المومنون حقالھم درجات عندربھم و مغفرۃ ورزق کریم. (پ ۹ الانفال ۳)

(ترجمہ) ایمان والے وہ ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ہیبت کھاتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جائیں ان پر اللہ کی آیات تو اور قوت پکڑتا ہے ان کا ایمان اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے دیا ان کو وہ اس سے خرچ کرتے ہیں وہی ہیں سچے ایمان والے ان کے لیے درجے ہیں اللہ کے ہاں اور معافی ہے اور روزی عزت کی۔

خلفاء ثلثہ کی یاد خداوندی کی مجالس رات کی تنہائیوں میں اللہ کی یاد اور ساری ساری رات اللہ رب العزت کی عبادت میں لگے رہنا کیا یہ وہ ظاہری علامات نہیں جو قرآن کریم کے اس بیان کی رو سے ان کے اندر کے ایمان کی خبر دے رہی ہیں اور کیا قرآن کریم نے ان ظاہری اعمال کو ان کے اندر کے ایمان کی جلی پیرائے میں خبر نہیں کیا؟

اولئک ھم المومنون حقا. یہ اعمال گو ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں لیکن یہ ایمان کی علامات ضرور ہیں جہاں یہ علامات پائی جائیں گے پھر ان کے ایمان کا کسی پیرائے میں انکار نہیں کیا جاسکے گا معانی تک پہنچنا اور الفاظ کے واسطہ سے ہی ہوتا ہے ایمان تک پہنچنے کے لیے پھر کسی اور امر باطن کی شرط لگائی جائے تو قرآن کریم کا اس پر ان کے ایمان کی خبر دینا بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

۳۔ خارجیوں کے ہاں اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل ہیں

خارجی عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے نکل جاتا ہے' وہ مومن نہیں رہتا۔ وہ اس درجے کے گناہ گار کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے۔ خارجیوں نے جب تحکیم کو گناہ کبیرہ قرار دیا تو انہوں نے اس کے مرتکبین حضرت علیؓ' حضرت معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ تینوں کو کافر قرار دیا۔ ان کے ہاں ایمان کی پہچان یہی ہے کہ اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہ ہو۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کو قتل کرنے کی سازش کی تو ساتھ ہی حضرت معاویہؓ کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سو خارجی حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ حضرت حسینؓ اور یزید سب کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتے ہیں۔ خارجی وہی ہیں جو تحکیم کے دونوں گروہوں کو کافر سمجھتے ہوں۔ یزید کے مدح سراؤں کو یزیدی تو کہا جاسکتا ہے لیکن انہیں خارجی کہنا تاریخ کے خلاف ہے۔ خارجی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو کافر کہتے تھے اور ان دونوں کے قتل کے درپے تھے لیکن چونکہ یہ حضرت علیؓ کے گروہ سے نکلے تھے اس لیے ان کی علمی بحثیں زیادہ ان سے رہیں۔ حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ ان سے مناظرہ کرتے تھے۔

۴۔ رافضیوں کے ہاں بھی ایمان کی تصدیق اعمال سے ملتی ہے

۱۔ اہل سنت کے ہاں ایمان کی تصدیق اقرار باللسان سے ہے بشرطیکہ اب وہ اس زبان سے اسلام کے مومن بہ امور میں سے کسی کا انکار نہ کرے ورنہ اس کا اقرار باللسان جاتا رہے گا۔ تاہم کسی کے ایمان کا پتہ اس کے اقرار باللسان سے ہی مل سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راہ نہیں جس سے اس کے اندر جھانکا جاسکے۔

۲۔ خارجیوں کے ہاں ایمان کی تصدیق اس سے ہے کہ اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہ ہو۔ ان کے ہاں اعمال صالحہ کے بغیر کوئی شخص مومن شمار نہیں کیا جاسکتا' نہ اسے مسلمان سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ رافضی بھی اس اختلاف میں خارجیوں کے ساتھ ہیں' وہ بھی ایمان کا وجود بدون اعمال صالحہ نہیں مانتے۔ مولف تجلیات صداقت لکھتا ہے:

''ایمان ایک کیفیت قلبی ہے جس کا تعلق باطن کے ساتھ ہے......اس کے وجود کی تصدیق کرنے کے لیے عمل صالح کا ہونا ضروری ہے۔'' (تجلیات صداقت ص ۴۰)

ان تینوں کے عقیدے آپ کے سامنے ہیں۔ ان میں اہل سنت ایک طرف' شیعہ اور خارجی دوسری طرف ہیں۔ شیعہ عوام کو اگر پتہ چلے کہ ان کے علماء کبار خود خارجی ذہنیت کے ہیں تو وہ محرم الحرام میں ان پر کبھی اتنی بخششیں نہ کریں۔

۱۔ اہل سنت کے ہاں دل کا ایمان اقرار باللسان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اعمال صالحہ ایمان کی زینت ہیں لیکن ایمان کا ثبوت نہیں۔ نہ ان کے نزدیک ایمان اعمال صالحہ پر موقوف ہے نہ گناہ گار مومن کسی گناہ سے ایمان کی حدود سے نکلتا ہے۔ کوئی مسلمان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو' مسلمانوں پر اس کی نماز جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے اور باپ کی جائداد میں گناہ گار بیٹا بھی نیکوں کے ساتھ برابر کی میراث کا مستحق ہے۔ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کافر اور محروم الارث قرار نہیں پاتا۔

۲۔ خارجیوں اور شیعوں کے ہاں ایمان کا وجود اعمال صالحہ پر موقوف ہے۔ اس پر رافضی نے قرآن کریم کی چار آیات پیش کی ہیں۔ مگر ان سب میں ایمان کے بعد دوسرے نمبر پر اعمال صالحہ کا ذکر ہے جس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اعمال صالحہ ایمان کے وجود میں داخل نہیں ان کا وجود ایمان کے وجود کے علاوہ ہے۔

براہ راست جنت میں داخلہ اعمال صالحہ سے ہی ملے گا

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اعمال صالحہ جنت میں داخلہ کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ داخلہ جنت وہ ہے جو کسی کو جہنم میں جانے کے بغیر براہ راست نصیب ہو۔ لیکن جو گناہ گار مسلمان ہیں وہ بھی اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالآخر جنت میں ضرور جائیں گے اور یہ بات اہل سنت کے ہاں متواتر درجے کی احادیث سے ثابت ہے۔ رافضی نے جو چار آیات پیش کی ہیں ان میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بھی جنت میں نہ جاسکے گا اور

ظاہر ہے کہ اس کے بغیر رافضی کی یہ بات قابل قبول نہیں ٹھہرتی کہ ایمان کا وجود اعمال صالحہ پر موقوف ہے۔

گناہ بے شک سزا سے بھی اترتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں۔ ذات واجب پر کسی دستور کی تعمیل ضروری نہیں' نہ اس کے لیے کوئی دستور العمل ہے نہ اس پر عدل واجب ہے۔ چاہے تو فضل کرے اور چاہے تو عدل فرمائے۔ عدل اور فضل دونوں اس کے ہاتھ میں ہیں' اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس نے گناہوں کے اترنے کے یہ دروازے کھلے رکھے ہیں۔

۱۔ توبہ واستغفار۔ حضرت آدمؑ سے شجرہ ممنوعہ کے قریب جانے کا بار اسی راہ سے اترا تھا۔

۲۔ نیکیوں کی کثرت کا پلڑا جھک جائے تو گناہ ویسے ہی جاتے رہیں گے۔ **ان الحسنات یلھبن السیئات ذلک ذکریٰ للذاکرین** پ۱۲ھود۱۱۴۔

۳۔ **شفاعت الشافعین باذن رب العالمین**۔

۴۔ مغفرت از فضل عام۔ **یغفر ما دون ذلک لمن یشاء** (پ۵النساء)

اسے **لمن یشاء** سے وابستہ رکھا تاکہ ہر شخص اس مغفرت پر پورے یقین سے امید نہ لگائے رہے۔

۵۔ اہل سنت کے ہاں گناہ گار مسلمانوں سے ایمان کی نفی نہیں کی جاسکتی

اہل سنت کے ہاں گناہ گار مسلمانوں سے ایمان کی نفی نہیں کی جاسکتی اور بعض ضروریات دین کا انکار کر کے اعمال صالحہ بجالانے والوں کو اسلام میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ لیکن شیعوں اور خارجیوں کے ہاں گناہ گار مسلمان ایمان سے تہی دامن ہیں۔ اور وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اہل سنت کے ہاں گناہ گار مسلمانوں کی نماز جنازہ بھی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

افسوس کہ رافضیوں نے خارجیوں سے موافقت کرلی

اسلام میں پیغمبروں کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ امتی کتنے ہی درجے کا کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی اس سے کوئی غلطی یا گناہ ہو ہی جاتا ہے۔ بلند پایہ بزرگوں کی نیکیاں اتنی ہوتی ہیں کہ ایسی خطائیں کبھی ان کے نامہ اعمال میں جگہ نہیں پاتیں' مٹا دی جاتی ہیں۔ اب ان کے کسی ایسے عمل کو اٹھالو اور پھر اس سے ان کے ایمان کی نفی کردو تو یہ خارجی طریق عمل ہے اب انہیں اس سے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔

رافضیوں نے خلفائے ثلثہ کے ایمان کا انکار کرنے کے لیے ان سے منسوب کچھ اعمال اس طرح اٹھائے' پہلے ان پر کچھ غلط بیانی کا مسالہ لگایا پھر اس پر بدگمانی کا لاوا ڈالا اور اپنے جاہل عوام کو یہ لقمہ تبلیغ مہیا کیا کہ یہ حضرات تو سرے سے مومن ہی نہ تھے۔ معلوم نہیں مسلمانوں نے کیوں انہیں اپنا سربراہ بنالیا۔ تم اہل سنت سے یہی کہو کہ ان کا ایمان ثابت کرو۔ جب ایمان کے لیے عمل صالح کی شرط لگاؤ گے تو اگر ان سے کسی ایک عمل میں بھی کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اب ان سے

خلافت کی قمیص اتارنا تمہارے لیے بہت آسان ہو جائے گا۔ اعمال میں زیادتی اور کمی کا اعتبار صرف ان کے ہاں ہو سکتا ہے جو انہیں مومن مانے ہوئے ہوں۔ خارجی عقیدے میں جب وہ کسی کبیرہ گناہ سے مومن ہی نہ رہے تو ان کے اعمال تلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ان کے ہاں ان گناہوں اور کوتاہیوں سے ان کے ایمان کی نفی جائز ہوگی۔ اہل سنت کے عقیدے میں کسی گناہ کبیرہ سے کسی کے ایمان کی نفی نہ ہو سکے گی۔ کفر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے ضروریات دین میں سے کسی کا انکار ثابت ہو۔

یہ وہ راہ ہے جو یہ رافضی اپنے جاہل عوام کو دکھا رہا ہے کہ خلفائے ثلثہ (معاذ اللہ) ایمان سے تہی دامن تھے۔ کسی میں کوئی غلطی ثابت کر دی اور کسی کی کسی کوتاہی کو نمایاں کر دیا۔ اسی خارجی عقیدے سے یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ حضرت ام المومنین بھی مومنہ نہ تھیں۔ وہ ماں تو تھیں لیکن مومنہ نہ تھیں۔ یہ بات صحیح نہیں۔ ایسا ہوتا تو انہیں ام المؤمنین کہنے کی عزت نہ دی جاتی۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان کا سرمایہ ہوں اور سب ایمان والوں کی جڑ ہوں۔

٦۔ ایمان کے بعد کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ایمان کو ختم نہیں کرتا

اہل سنت اپنے عقائد پر اپنی کتابوں سے دلائل لانے کے مکلف ہیں جب کسی کا ایمان ثابت ہو جائے تو اب اس کے اعمال پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں جب تک کہ وہ کھلے بندوں ایمانیات میں سے کسی امر کا انکار نہ کرے۔ اور وہ انکار بھی اس طرح قطعی طریق سے ثابت ہو جس طرح پہلے اس کا اقرار ضروریات دین قطعی پیرائے میں معلوم تھا۔ وضعی حکایات سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ایمان لانے کے بعد استقامت از خود قائم سمجھی جائے گی۔ جب تک اس کا ایمان کسی کفر سے نہ ٹوٹے وہ کفر انکار کے پیرایہ میں ہو یا الحاد کے پیرایہ میں' اس سے دیوار اسلام کھڑی نہیں رہ سکتی۔ ضروریات دین میں تاویل کفر کے داخلے کو نہیں روک پاتی۔ سو ایمان کے بعد استقامت کسی مستقل دلیل سے ثابت نہیں کی جاتی نہ اس کا کسی سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے مستقل دلیل سے تلاش کرنا کسی صاحب علم کا کام نہیں۔ اعمال کی کمزوریوں سے اگر وہ واقعتاً ثابت بھی ہوں تو ان سے استقامت کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اعمال کی کمزوریوں میں پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ کہیں یہ بات دور تربیت کی تو نہیں۔ دور تربیت کی کوئی غلطی ان کے آئندہ کے اعمال صالحہ کی نفی نہیں کرتی۔ بالخصوص جبکہ اللہ تعالیٰ نے رضی اللہ عنہ کا تاج ان کے سروں پر رکھ دیا ہو۔

صرف یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کسی مومن سے آئندہ ایمان کی نفی تو کہیں ثابت نہیں۔ استقامت کے لیے مستقل دلیل لانے کی کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جب ایک دفعہ نکاح منعقد ہو گیا تو جبکہ طلاق یا کسی کا ارتداد ثابت نہ ہو اس نکاح کو قائم ہی مانا جائے گا۔ نکاح کی استقامت کے لیے مستقل دلیل نہ مانگی جائے گی۔

٧۔ استقامت بھی تکمیل تربیت کے بعد کی دیکھی جائے

رافضی نے اعمال صالحہ کی بحث کے بعد صفحہ ٤٠ پر یہ سرخی قائم کی ہے۔

"تیسری شرط استقامت اور خاتمہ بالخیر ہے۔"

ظاہر ہے کہ اعمال کی بحث میں وہ یہاں استقامت عملی کا خواہاں ہے لیکن افسوس وہ یہاں عہد رسالت کے دور تربیت کو یکسر بھول گیا۔ وہ نہیں جانتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جو لوگ دائرہ اسلام میں آئے وہ آتے ہی درجہ کمال میں نہ آ گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری توجہ اور تربیت سے ان کے دلوں کا تزکیہ کیا۔ انہیں کتاب و سنت کی تعلیم دی اور انہیں وہ خیر امت بنایا جو دوسرے سب لوگوں اور اقوام عالم پر اسلام کی محنت کریں۔ کیونکہ آئندہ کسی پیغمبر کی بعثت نہ ہونی تھی۔ اسی امت نے نبوت کا کام چلانا تھا۔ ارشاد ہوا:

كنتم خير امة اخرجت للناس. (پ٤ آل عمران ١١٠)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے سامنے لائے گئے ہو۔"

جب یہ لوگ حضورؐ سے تربیت پا گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں رضی اللہ عنھم کی خبر دی پھر بھی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مقام عصمت پا گئے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے کوئی بڑی غلطی بھی کی تو وہ پھر سنبھل گئے اور توبہ کے ساتھ اپنے کھوئے مقام کو پھر سے پا لیا۔

خود حضورؐ کی زندگی میں دیکھئے کہ انہیں مقام عصمت حاصل نہ تھا۔

١۔ مثلاً ایک صحابیؓ رسولؐ نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھاتے سورت قل یا ایھا الکافرون پڑھی اور اس میں چاروں لا بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے حکم دے دیا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ وہ جڑ ہی اکھاڑ دی جس کے باعث یہ غلطی ہوتی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس صحابیؓ کا یہ عمل اس دور کا ہے جب صحابہ کی تربیت ہو رہی تھی۔ حضورؐ کے شاگردوں سے جب کوئی غلطی ہوتی' حضورؐ ان کی تربیت فرماتے اور انہیں اپنے حلقہ شاگردی سے نہ نکالتے۔ تکمیل تربیت کے بعد ان سے استقامت کی امید بے شک کی جا سکتی ہے۔ یہ کسی صحابی رسولؓ کا عمل تھا کہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھا دی۔ ہم اس وقت اس کی تحقیق میں نہیں جاتے۔

٢۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا۔ یہ نکاح منشاء رسالت کے خلاف تھا۔ حضورؐ کے منع فرمانے سے حضرت علیؓ اس سے رک گئے۔ انہیں پتہ چل گیا کہ جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اس نے بالآخر خدا کی ناراضگی مول لی۔ یہ کب کی بات ہے؟ جب صحابہؓ اپنے اپنے دور تربیت میں تھے۔ پھر جب حضرت علیؓ مرتضیٰ کے سر پر رضی اللہ عنھم کی دستار آئی' پھر انہوں نے کبھی حضرت فاطمہؓ کو ناراض نہ کیا۔ یہ ناراضگی فاطمہؓ کی روایت اس دور سے پہلے کی ہے۔

٨۔ جلی انکار اسلام کے بغیر کسی سے اس کے خاتمہ بالخیر کی نفی نہیں کی جا سکتی

رہا خاتمہ بالخیر تو اس کے خلاف کوئی بات تبھی کہی جاسکتی ہے کہ اس سے اس آخری وقت میں جلی طور پر انکار اسلام صادر ہوا اور وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں نہیں اس وقت ہو جب اس کے ہوش وحواس قائم تھے۔ اس وقت کے نازک حالات کو صرف اللہ رب العزت ہی دیکھتے ہیں۔ یہاں کسی عمل کے ترک سے کسی کے کوحق نہیں کہ کسی سے خاتمہ بالخیر کی نفی کردے اور دوسروں سے اس کی استقامت کے دلائل طلب کرے۔

۹۔ عہد رسالت کے بعد بھی صحابہؓ خیر امت رہے

ا۔ حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے جب شام پر چڑھائی کی تو گورنر شام حضرت معاویہؓ حسب سابق خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ کے وفادار رہے اور بحیثیت گورنر حضرت عثمانؓ انہوں نے حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کا حکم ماننے سے گریز کیا۔ حالانکہ اس وقت خلیفہ راشد حضرت علیؓ تھے۔ جنگ صفین میں حضرت عائشہؓ جنگ کے لیے نہ آئی تھیں بطور ماں بیٹوں میں مصالحت کرانی پیش نظر تھی۔ سو اس میں مسلمانوں کا آپس میں لڑنا درست نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کے آپس میں لڑنے سے کوئی مومن ہونے کی حدود سے نہ نکلا۔ اور اس واقعہ صفین سے ان میں سے کسی کے ایمان کی نفی نہ سمجھی گئی۔ قرآن کریم میں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ ایمان والے بھی آپس میں لڑ سکتے ہیں اور اس سے وہ کافر نہیں ہو جاتے:

فان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما . (۲٦ الحجرات ۹)

ترجمہ: ”اگر مومنوں کی دو جماعتیں آپس میں قتال کریں تو تم ان دونوں میں صلح کرادو۔“

اس میں ادھر بھی اشارہ ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان دونوں میں نہ ہوں۔ چنانچہ بعد میں ایسے مومنین بھی تھے جو ان دونوں میں سے کسی کی طرف نہ تھے۔ پھر بھی دونوں حضرات حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ اپنے اپنے سفر آخرت سے پہلے جنگ بندی کا اعلان کر پائے۔ ۴۰ھ کو عام الھدنہ (صلح کا سال) اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا آخری عمل یہ رہا کہ وہ آپس میں لڑنے سے دست بردار ہو گئے۔ حضرت علیؓ ۴۱ھ میں شہید ہوئے اور اس حالت میں شہید ہوئے کہ وہ اس وقت کسی مسلمان کے خلاف حالت جنگ میں نہ تھے۔

پھر حضرت معاویہؓ بھی اپنے سفر آخرت سے پہلے حضرت حسنؓ کے ساتھ صلح کر چکے تھے۔ اور یہ صلح وہ عظیم صلح تھی جس نے خود لسان نبوت سے حقیقت کی سند پائی تھی۔ یہ کوئی دکھاوے کی صلح ہوتی یا کسی داؤ یا دباؤ کا نتیجہ ہوتی تو حضور کی زبان سے اس کے لیے مومنین کی صلح کے الفاظ صادر نہ ہوتے۔ حضورؐ نے فرمایا:

لعل اللّٰہ یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین.

ترجمہ: ”ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے حسنؓ کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے۔“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد صحابہؓ اگر کبھی آپس میں لڑ بھی پڑے تو تربیت رسالت کا اثر پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ باقی رہا کہ وہ پھر آپس میں اکٹھے ہو گئے اور حضور بھی فرما گئے تھے العبرۃ بالخواتیم کہ آخری باتوں سے سبق لیا کرو۔ درمیان میں کسی سے کوئی نادانی صادر ہو تو اسے جانے دو؛ اسے موجب طعن نہ بنالینا' نہ اس سے کفر و اسلام کے فاصلے قائم کرنا۔

جنگ جمل سے حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی نکل گئے تھے

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ پہلے بے شک حضرت علیؓ مرتضیٰ کے خلاف اٹھے، لیکن جونہی میدان جنگ میں آپ کی حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی تو وہ دونوں جنگ سے کنارہ کش ہوئے۔ جب ایک بدبخت نے علیحدہ بیٹھے حضرت زبیرؓ کو بے خبری میں شہید کر دیا تو حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے اسی وقت اس قاتل کو جہنمی ہونے کی خبر دی۔ آپؓ نے اس وقت حضرت طلحہؓ کے ہاتھ کو چوما اور فرمایا کہ اس ہاتھ نے احد کے دن حضورؐ کے چہرے پر آنے والے تیروں کو روکا تھا۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو اس وقت شرپسندوں سے نکلنا کیسے نصیب ہوا۔ یہ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے چکے تھے۔ یہ دونوں حضرات عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ یہ تربیت رسالت کا اثر تھا کہ آپ اس نازک وقت میں شرپسندوں کو سمجھ گئے اور خلیفہ راشد کے مقابلہ سے کنارہ کش ہوئے۔ حضرت طلحہؓ کی قبر مبارک سے ان کی جو کرامت ظاہر ہوئی وہ ان کے جنتی ہونے کا کھلا نشان ہے۔ (دیکھئے المصنف لعبدالرزاق ج ص ۲۴۸)

حضرت عائشہؓ صدیقہ نے بھی بصرہ نکلنے پر اظہار افسوس فرمایا

حضرت ام المومنین بصرہ میں حضرت علیؓ سے لڑنے نہ آئی تھیں وہ بحیثیت ماں کے اپنے بیٹوں کو آپس کی جنگ سے نکالنے اور ان میں صلح کرانے کے ارادہ سے نکلی تھیں۔ اور آپ نے اپنے اس ارادے کا بارہا اظہار بھی فرما دیا تھا۔ تاہم شرپسندوں نے اس صلح کی مجلس کو ایک جنگ میں بدل دیا تھا اور حضرت علیؓ بھی ان شرپسندوں سے نکلنے میں بڑی دقت محسوس کرتے تھے۔

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کا موقع پر اظہار حق

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے حضرت زبیرؓ کے رجوع کو قبول فرمایا۔ حضرت طلحہ شہیدؓ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ دونوں طرفوں کے جنازے ایک سے پڑھائے۔ بغاوت کرنے والوں کو بھی اپنے بھائی کہا اور فرمایا

اخواننا بغوا علینا . (قرب الاسناد س ۴۵)

”یہ ہمارے ہی بھائی ہیں جو ہم پر چڑھ آئے تھے۔“

یہاں لفظ اخوت بتا رہا ہے کہ آپ انہیں مومن سمجھتے تھے صرف مسلم نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اخوت کو ایمان سے جوڑا گیا ہے نہ کہ فقط اسلام سے۔

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم. (پ۲۶ الحجرات)

ترجمہ: "بے شک یہ مومن ہی ہیں جو آپس میں بھائی ہیں سو اپنے بھائیوں کو ہمیشہ ملائے رکھو۔"

اس میں یہ بھی بتلایا گیا کہ باوجود باہمی قتال کے وہ مومن ہی سمجھے جائیں گے اور ان کی صلح بھی مومنین کی صلح سمجھی جائے گی۔ ان سے ایمان کی نفی کسی طرح نہ کی جا سکے گی۔

حضرت عائشہؓ کی پہلی عزت بدستور قائم رہنے کا اعلان

حضرت علیؓ نے واقعہ صفین کے بعد اعلان فرمایا:

ولها بعد حرمتها الاولىٰ والحساب على الله. (نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۶۳)

ترجمہ: "آپ کا احترام اس واقعہ کے بعد بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔"

اس اختلاف کو آپ نے اس لیے زیادہ اہمیت نہ دی کہ آپ اسے غلط فہمی اور شبہات پر مبنی ایک کارروائی سمجھتے تھے، اسے نصوص کا انکار نہ سمجھتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

انما اصبحنا نقاتل اخواننا في الاسلام على ما دخل فيه من الزيغ والاعوجاج والشبهة والتاويل. (ایضاً ج ۲ ص ۳)

ترجمہ: "ہم اپنے مومن بھائیوں سے اسلام میں بھی لڑ پڑے کیونکہ ان میں کجروی ٹیڑھا پن اور شبہ و تاویل راہ پا گئے تھے۔"

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ شبہ و تاویل سے جو اختلاف پیدا ہو جائے اس سے کسی کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی جیسا کہ خوارج نے سمجھ رکھا ہے۔ مومن سب آپس میں بھائی بھائی رہتے ہیں۔

۱۰۔ دورانِ تربیت ہونے والی خطاؤں پر فیصلے کا حق کسے ہوتا ہے؟

اس وقت ان مباحث کی پوری تفصیل پیش نظر نہیں۔ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ صحابہؓ سے حضورؐ کے دوران تربیت اگر کچھ خطا بھی ہوئی تو دیکھا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا کارروائی کی۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اور اس کے رسول پاک سے اپنی آواز بلند کرے۔ اور اگر کسی سے حضورؐ کی وفات کے بعد کوئی خطا صادر ہوئی تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس آخری عمل پر رہا۔ یا ان نفوس قدسیہ کو فیضان صحبت رسول پھر انہیں ان کے پچھلے مقام پر لے آیا اور ہم مکلف ٹھہرے کہ العبرة بالخواتيم کے تحت ہم ان کے آخری عمل سے ان کا مقام طے کریں۔

نامناسب نہ ہوگا کہ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے ہم یہاں چند مثالیں بھی عرض کر دیں۔

۱۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو ان کے بنو قریظہ کے کسی دوست نے تورات کے کچھ ورق دیئے، آپ انہیں حضور اکرمؐ کو دکھانے کے لیے لے آئے اور آپ کے سامنے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ آپؐ اس پر ناراض ہوئے اور آپ کے چہرہ انور پر کچھ اس کے اثرات آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اس طرف توجہ دلائی "ما ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ حضرت عمرؓ اسی وقت حضورؐ کی ناراضگی سے اللہ کی پناہ میں آئے اور کہا:

اعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله رضينا بالله رباً وبالاسلام ديناً و بمحمد نبياً

(رواہ الدارمی، ترجمان السنہ ج ۱ ص ۳۴۶)

ترجمہ: "میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے۔ ہم بطور رب اللہ سے راضی ہیں۔ اس کے سوا ہمارا اور کوئی رب نہیں۔ اسلام سے ہم بطور دین راضی ہیں۔ (دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین نہیں ہے) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم بطور نبی راضی ہیں (ہمارا آپ کے سوا کوئی اور نبی نہیں۔ ہم آپ کے بعد کسی اور نبوت کو کوئی پذیرائی نہیں دیتے۔)"

حضرت عمرؓ کے پہلے اور دوسرے عمل کو دیکھیے۔ حضرت عمرؓ نے جب حضورؐ کے سامنے اپنے دین محمدی کا پورا اقرار فرمایا تو حضورؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا، نہ انہیں اپنے دائرہ تربیت سے نکالا۔ اپنے چہرہ سے خوشی کا اظہار فرمایا۔ حدیث میں ہے:

فسرّى عن النبي صلى الله عليه وسلم (رواه احمد)

"آپ کے چہرے سے ناراضگی کے وہ آثار زائل ہو گئے۔"

اب یہاں رافضی اور سنی کی دو علیحدہ علیحدہ راہیں ہو گئیں۔ رافضی آپ کے پہلے عمل کا رونا روئے گا اور لوگوں کو حضرت عمرؓ سے دور کرنے کے لیے اس کا بار بار چرچا کرے گا۔ اور سنی آپ کی پچھلی بات پر دھیان دے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریری حدیث کی رو سے حضرت عمرؓ کے ایمان کی اسی طرح پوری تصدیق کرے گا جس طرح حضورؐ کے چہرہ پر آپ کے اس اظہار ایمان سے خوشی کے آثار لوٹ آئے تھے۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اگرا اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا:

ان ضعفت فقوموني (يا فسددوني).

تو اس سے رافضی سمجھے گا کہ آپؓ نے کبھی غلط راہ پر نکلنے کا خدشہ ظاہر فرمایا اور کہا کہ شیطان کبھی مجھ پر چڑھائی کرتا ہے تو ایسے موقع پر مجھے ٹوک کر صحیح بات بتلا دیا کرو۔ اب آپ کی آخری بات کیا رہی، شیطان کی چڑھائی سے بچ نکلنے کی تدبیر کرنا اور پہلی بات یہ کہ شیطان کبھی مجھ پر بھی چڑھائی کرتا ہے۔ یہاں پھر رافضی اور سنی کی دو راہیں علیحدہ علیحدہ

ہو گئیں۔ رافضی پہلی بات پر اٹھے گا کہ ان سے غلطی صادر ہو سکتی تھی اور سنی دوسری بات پکڑے گا کہ آپ سے جب کبھی کوئی ایسی بات نکلے آپ فوراً اس سے بچ نکلنے کی راہ تلاش کرتے تھے۔ یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے کہ آپ کی پیدائش پر جو شیطان آپ کا قرین ہوا وہ مسلمان ہو گیا۔ اور وہ آپ کو خیر کے سوا اور کسی راہ پر نہیں لا سکتا۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنے خطبہ میں یہ اعلان فرمایا تو آپؓ نے اس حدیث کی رو سے اسے اپنے لیے مناسب جانا کہ مس شیطان کا کوئی اثر مجھ پر غلبہ کرے تو میرے دینی بھائی اسی وقت میری مدد کے لیے نکل آئیں اور مجھے ٹوک دیں۔

ما من بنی آدم مولود والا یمسّه الشیطان حین یولد فیستهل صارخاً من مسّ الشیطان غیر مریم وابنها.

ترجمہ: ''اولاد آدم میں ہر بچے کو شیطان وقت پیدائش چھوتا ہے۔ سو وہ بچہ شیطان کے چھونے سے ایک زور کی آواز نکالتا ہے۔ ماسوائے حضرت مریم اور ان کے بیٹے کے۔''

ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کی انکساری اور تواضع کے پیرائے میں کہی ایسی باتیں ہرگز ان کے ایمان اور تقویٰ کی نفی نہیں کرتیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے فرمایا:

فلا تکفوا عن مقالة بحق او مشورة بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطی.

(نہج البلاغة ج ۲ ص ۲۲)

ترجمہ: ''مجھے حق بات کہنے سے یا انصاف کا مشورہ دینے سے باز نہ رہنا کیونکہ میں اپنی ذات میں خطا سے بالا نہیں ہوں۔''

یہ بحث ہم کچھ پہلے بھی کر آئے ہیں۔ یہاں اس اصولی بحث میں اسے پھر لانے کی ضرورت تھی۔ ہم یہاں صرف ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ کے دل میں جب ایک خطرہ گزرا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تصرف سے اسے آپ کے دل سے نکالا۔ اس پر غور کیجئے۔ کیا یہ حضرت عمرؓ کی پہلی حالت تھی یا دوسری اور ہم حضرت عمرؓ کا مقام معلوم کرنے کے لیے کیا ان کے اس پہلے خطرے کا چرچا کریں گے جو آپ کے دل میں گزرا یا بعد کے اس اطمینان کا ذکر کریں گے جو حضورؐ کے اس روحانی تصرف سے آپ کے دل پر اترا۔ یہاں حدیث العبرة بالخواتیم کے تحت آپ کی دوسری حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔

احد کے دن صادر ہونے والی لغزش

سیدنا حضرت عثمانؓ ذوالنورین جنگ احد کے دن بزدلی سے اپنی جگہ سے نہ ہٹے تھے' یہ محض ایک لغزش تھی جو اس دن کچھ لوگوں سے ظہور میں آئی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اسے اس کے پورے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

ا۔ جنگ احد وہ جنگ ہے جس میں پچاس مجاہدین درے پر ٹھہرائے گئے تھے کہ دشمن کہیں پیچھے سے حملہ نہ کردے۔ مجاہدین وہاں مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔ دشمنوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی ہے اور اب ان کے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ حضورؐ نے انہیں جو ہدایات دے رکھی تھیں ان کے سمجھنے میں انہوں نے اجتہاد کیا اور غلطی کھا گئے اور انہوں نے درہ چھوڑ دیا۔ مشرکین نے وہاں سے عقبی حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی۔ جنہوں نے کبھی کسی جنگ کا نقشہ دیکھا ہو یا اس پر غور کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ ایسے موقع پر گھبراہٹ ایک یقینی امر ہے اور ایسے موقع پر فوج یا اس کا کوئی حصہ پیچھے ہٹ کر پھر سے دشمن کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے پیچھے ہٹنا نہیں کہتے۔ اور کبھی ایسے موقع پر بھگدڑ بھی مچ جاتی ہے اور صورت حال کسی کے بس میں نہیں رہتی۔

جنگ احد میں اس عقبی حملے سے جو شکست ہوئی یہ پوری قوم کی شکست تھی اور اسے حضرت طلحہؓ اور حضرت علیؓ جیسے عظیم بہادر بھی روک نہ سکے اور حضورؐ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔ دشمنوں کے تیر حضورؐ کے چہرے پر آ رہے تھے اور حضرت طلحہؓ کا ہاتھ انہیں روک رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے معرکہ جمل میں ان کے اس ہاتھ کو اس تاریخی یاد سے چوما تھا۔ اب کیا کوئی شخص یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ کی خدمت کا یہ موقعہ حضرت طلحہؓ کی بجائے حضرت علیؓ نے کیوں نہ لیا۔ یہ اپنی اپنی برات ہے جو ہر کسی کو اپنے موقع پر نصیب ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے خیبر میں جو ہمت دکھائی یہ ان کی برات تھی۔ تاہم احد کے دن یہ طور وفا حضرت طلحہؓ کی قسمت میں رہا۔

حالات کی اس گردش میں اگر کچھ لوگ بھاگ نکلے تو اسے فرار نہیں کہا جا سکتا۔ یہ جو ہوا مجاہدین سے درہ چھوڑنے کی غلطی سے ہوا۔ اس کی وجہ سے حالات یہاں تک پہنچے کہ لڑتے ہوئے اپنے اور پرائے کا بھی اعتبار نہ رہا۔ کچھ لوگ اس گھبراہٹ میں بھاگ نکلے تو قرآن نے اسے ایک لغزش کہا ہے جو ان سے کسی بے وفائی سے نہیں ان کی کسی پچھلی تقصیر کی وجہ سے ظہور میں آئی۔ وہ تقصیر کیا تھی۔ اسے مختلف زاویوں سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن پاک نے اسے کسی جگہ نہیں کھولا۔ خدا جانے وہ کیا بات تھی تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں بے وفائی کی کوئی جھلک نہ تھی۔ نہ اس کی وجہ کوئی ان کی اپنی بزدلی تھی۔ اس میں یہ دو باتیں ہمیشہ پیش نظر رہیں:

ا۔ احد کے دن جو بھاگے وہ مومنین ہی رہے

جن کو احد کے دن خدا نے بھاگ نکلنے سے معافی دی وہ بایں ہمہ مومن رہے اور یہ معافی ان کے لیے فضل خداوندی کا موجب ہوئی۔ یہاں الفاظ **ذو فضلٍ علی المؤمنین** پر غور کریں۔ یہ انہی کو مومن کہا گیا ہے جن سے یہ

لغزش ہوتی تھی۔

ولقد عفا عنکم واللّٰہ ذو فضل علی المؤمنین. (پ ۴ آل عمران ۱۵۲)

ترجمہ: ”اور بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ ان مومنین پر بہت فضل کرنے والے ہیں۔“

معلوم ہوا جنگ میں کسی بشری کمزوری سے کوئی ایمان سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا پیار ان سے اٹھ گیا ہے۔ میدان احد سے جب عبداللہ بن ابی منافق اپنے تین سو ساتھیوں کو نکال کر لے گیا تو مومنین میں سے بھی قبیلہ خزرج کے بنی اسامہ اور قبیلہ اوس کے بنی حارثہ اس کے ساتھ نکلنے لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو عبداللہ بن ابی منافق کے ساتھ جانے سے بچا لیا۔ گو ان کا کچھ ارادہ ہو چکا تھا مگر اللہ نے انہیں اپنی ولایت میں رکھا۔ قرآن کریم میں ان کی اس کمزوری کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

اذ همّت طائفتان منکم ان تفشلا واللّٰہ ولیھما وعلی اللّٰہ فلیتوکل المومنین

(پ ۴ آل عمران ۱۲۲)

ترجمہ: ”اور جب قصد کر گئے تم میں سے دو گروہ کہ کمزوری دکھائیں اور اللہ ان کا دوست تھا اور ایمان والوں کو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔“

دیکھئے اس آیت میں گو ان کی بزدلی اور کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ان کے بارے میں کہنا کہ میں ان کا دوست ہوں اس سے بڑھ کر ان کی عظمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ وہ کمزوری ہے جس پر باعتبار انجام سینکڑوں طاعتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

”گو اس آیت میں ان پر چشمک کی گئی لیکن ان میں بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے اس آیت کا نازل نہ ہونا ہم کو پسند نہ تھا کیونکہ واللّٰہ ولیھما کی بشارت عتاب سے بڑھ کر ہے۔“ (ص ۸۵)

اس آیت میں ان کو باوجود اس بشری کمزوری کے مومن کہا گیا ہے۔ ان سے اس بزدلی کے باعث ایمان کی نفی نہیں کی گئی نہ انہیں اپنی محبت کے دائرہ سے باہر کیا گیا ہے۔

امام فخر الدین الرازی (۶۰۶ھ) ذو فضلٍ علی المؤمنین پر لکھتے ہیں:

ھٰذہ الآیة دالة علی ان صاحب الکبیرة مومن لانا بیّنا ان ھٰذا الذنب کان من الکبائر ثم انه تعالیٰ سماھم المومنین فھٰذا یقتضی ان صاحب الکبیرة مومن بخلاف ما تقوله المعتزلة . (تفسیر کبیر ج ۹ ص ۳۲)

ترجمہ: ”یہ آیت بتا رہی ہے [illegible] کبیرہ کہا ہے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے مرتکبین کو مومن کہا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ایسا گناہ کرنے والے مومن ہی رہتے ہیں (ان کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی) ہاں معتزلہ اس کیخلاف رہے ہیں۔“

سو احد کے دن منتشر ہونے والوں کی اس غلطی کو کسی طرح ان کے ایمان کی نفی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھاگ نکلنے والے اور پھر معافی پانے والے پھر بھی یا ایھا الذین امنوا سے ہی مخاطب کیے جاتے رہے ہیں۔

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان . انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللّٰہ عنھم . ان اللّٰہ غفور حلیم . (آل عمران ۱۵۵)

ترجمہ: ”تم میں سے (مومنین میں سے) جو لوگ اس دن جگہ سے ہٹ گئے انہیں شیطان نے ان کی کسی پہلی غلطی کے سبب اس لغزش میں ڈالا اور بے شک اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والے اور حلم والے ہیں۔“

اس آیت میں لفظ **استزلھم الشیطان** پر مزید غور کریں۔ لفظ زلت سے کون واقف نہیں۔ یہ اس لغزش کو کہتے ہیں جو گناہ کے درجے کو نہ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زلت کہہ کر اور کمزور کر دیا ہے۔ سو یہ وہ گناہ کبیرہ نہ رہا جسے حدیث میں **تولی یوم الزحف** کہا گیا ہے۔

تولی یوم الزحف انفرادی فعل ہے لیکن کسی جنگ میں کسی گروہ پر یہ حالت وارد ہونا اور عارضی طور پر اسے شکست ہو جانا' یہ اس درجہ میں نہیں کہ اس سے انہیں دائرہ ایمان سے خارج کیا جائے۔ قرآن کریم میں اسے جمع کے صیغے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا.

اس پر شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

”مخلصین سے بھی بعض اوقات کوئی چھوٹا بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق بڑھتی ہے' ایک گناہ کی نحوست سے شیطان کو موقع ملتا ہے کہ دوسری غلطیوں اور لغزشوں کی طرف آمادہ کرے۔ جنگ احد میں بھی جو مخلص مسلمان ہٹ گئے تھے' کسی پچھلے گناہ کی شامت سے شیطان نے بہکا کر ان کا قدم ڈگمگا دیا۔ چنانچہ ایک گناہ تو یہی تھا کہ تیر اندازوں کی ایک بڑی تعداد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پابندی نہ کی۔ مگر خدا کا فضل دیکھو کہ اس

کی سزا میں کوئی تباہ کن شکست نہیں دی بلکہ ان حضرات پر اب کوئی گناہ نہ رہا۔ حق تعالیٰ کلیۃً ان کی تقصیر معاف فرما چکا۔ کسی کو طعن و ملامت کا حق نہیں۔" (ص ۹۱)

بھاگنے والے کعب بن مالکؓ کے چلانے سے واپس آ گئے

مومنین کے افراتفری میں بھاگنے کی حالت قرآن کریم میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

اذ تصعدون ولا تلوٗن علٰی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم فاثابکم غماً بغم لکیلا تحزنوا علٰی ما فاتکم ولا ما اصابکم واللّٰہ خبیر بما تعملون ٥ ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاساً یغشی طائفۃ منکم. (پ ۴ آل عمران ۱۵۳)

ترجمہ: "جب تم چڑھے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول پکارتا تھا تمہیں تمہارے پیچھے سے۔ پھر پہنچا تم کو غم بدلے غم کے تا کہ تم غم نہ کرو اس پر جو ہاتھ سے نکل جائے اور اس پر جو مصیبت تمہیں آگے آئے اور اللہ کو خبر ہے تمہارے کام کی۔ پھر تم پر اتارا اس نے تنگی کے بعد امن۔ یہ ایک اونگھ تھی کہ اس نے ڈھانپ لیا تم میں سے بعض کو۔"

اس پر شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"یعنی تم بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں کو چڑھے جا رہے تھے اور گھبراہٹ میں پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت خدا کا پیغمبر بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا تم کو اس قبیح حرکت سے روکتا تھا اور اپنی طرف بلا رہا تھا مگر تم تشویش و اضطراب میں آواز کہاں سننے والے تھے۔ آخر جب کعب بن مالک چلائے تب لوگوں نے سنا اور واپس آ کر اپنے نبی کے گرد جمع ہو گئے۔ تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے تم پر تنگی آئی، غم کا بدلہ غم سے ملا۔" (ص ۹۰)

یہ دوسرا غم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہونے سے تمہیں پہنچا۔ تم نے نبیؐ کے دل کو آزردہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہارے دلوں کو اس خبر سے غم دیا۔ پھر خدا کی طرف سے ایک امن کی اونگھ اتری۔

۲۔ قرآن کریم کی اس تفصیل سے یہ باتیں مزید کھلیں

۱۔ ان مومنوں کا وہاں سے بھاگنا بناء بر گھبراہٹ تھا، بناء بر منافقت نہ تھا۔ ورنہ وہ پھر حضورؐ کے گرد آ جمع نہ ہوتے۔ یہ بھاگنا ان کا پہلا عمل تھا اور حضورؐ کے گرد پھر سے جمع ہونا دوسرا۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرا عمل پہلے کو ختم کرتا ہے **العبرۃ بالخواتیم۔**

۲۔ حضورؐ کی وفات کی خبر سے کن لوگوں کے غم میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ مومنین کے دلوں میں۔ کفار و منافقین

کے لیے تو یہ خوشی کی خبر تھی۔ سو یہ آیات ان کے ایمان صادق پر خود گواہی دے رہی ہیں۔

۳۔ جو مومنین احد کے دن گھبراہٹ میں بھاگے یہ ایک ان کی بشری کمزوری تھی۔ جب اس کی سزا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہیں اس دنیا میں دے دی اور وہ سزا بھی انہیں ان کی نبی کریم سے محبت کی صورت میں دی گئی تو اب ان پر طعن لانا ایک اپنی بدبختی ہے۔

۴۔ جو لوگ پھر سے حضورؐ کے ساتھ آ لگے وہ اس امتحان میں قرآن پاک کی رو سے کامیاب ہوئے۔ **ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم** (پ۴ آل عمران ۱۵۲)

پہلے مشرکین ان کے آگے سے بھاگے جا رہے تھے، اب یہ مومنین ان کے آگے سے بھاگے، اللہ تعالیٰ نے اس کا سبب ان کی کسی پہلی تقصیر کو قرار دیا اور اسے ان کی ایک لغزش کہا، گناہ نہ کہا۔ اب یہ کہنا کہ وہ اس لیے بھاگے کہ ایمان سے خالی تھے، قرآن کی صریح نص (**ولقد عفا عنکم واللّٰہ ذو فضل علی المومنین**) کے خلاف ہے۔ لیبتلیکم کی رو سے یہ بھی ایک امتحان تھا جو پھر سے حضورؐ کے ساتھ آ ملے وہ اس دوسرے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

۵۔ گھبراہٹ میں بھاگ نکلنے کو قرآن نے ان کی صرف ایک لغزش قرار دیا ہے اور **ولقد عفا اللّٰہ عنھم** کے انتہائی تاکیدی پیرائے میں انہیں معاف کیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے غفور و حلیم ہونے کا ایک اظہار قرار دیا ہے۔ تو اب کسی کو جائز نہیں کہ ان پر اس حرکت کی وجہ سے ان پر کوئی طعن و تشنیع کرے۔

محدثین لکھتے ہیں:

ومن المعلوم ان المعفو عنہ خارج عن المعیبۃ.

ترجمہ: "اور یہ چیز شریعت میں جانی جا چکی ہے کہ معافی پانے والا کسی عیب کا محل نہیں رہتا نہ اس پر اسے کوئی طعن و تشنیع کی جا سکتی ہے۔"

روافض کے بغض و عناد کی انتہا

یہ رافضی لکھتا ہے:

"کسی جرم کی سزا معاف ہو جانے سے وہ جرم جرم ہونے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ مثلاً ایک آدمی نے چوری کی اور اس کا یہ جرم ثابت بھی ہو گیا مگر اس کو معافی دے دی گئی اور شرعی حد اس پر جاری نہیں ہوئی تو اس سے چوری چوری ہونے سے خارج نہیں ہو جاتی اور نہ چور چور ہونے سے خارج ہوتا ہے۔ اور جو بدنامی اس آدمی کی اس وجہ سے ہوئی تھی وہ دور نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس جنگ میں اصحاب جرم فرار کی سزا سے بچ گئے مگر اس سے فرار کا داغ تو نہیں مٹا،

وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیےان کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن گیا۔" (تجلیات ص ۵۰)

معافی کسے کہتے ہیں کہ سزا کا ہر پیرایہ اس قصوروار سے اٹھالیا جائے اور اسے کلیۃً معاف کیا جائے۔ اب اگر اس کو طعن و تشنیع پھر بھی کرتے رہیں تو یک گونہ سزا اس پر جاری رہی۔ چوری باب حدود میں سے ہے۔ یہ قانون شہادت سے ثابت ہو جائے تو اس پر کبھی معافی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے حدود میں نرمی برتنے سے منع کیا ہے۔ یہ جنگ میں گھبراہٹ سے افراتفری میں بھاگ نکلنا داخل حدود نہیں اور اس صورت عمل کو حدود پر قیاس کرنا غلط ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ یہاں معاف کرنے والا کون ہے؟ خدا کی طرف سے کسی کے لیے معافی کا اعلان ہزاروں طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔ معلوم نہیں وہ قابل قبول ٹھہریں یا نہ۔ لیکن خدا کی معافی کا اعلان اور وہ بھی ایک بڑی تاکید سے' یہ وہ اعزاز ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس کا انکار کر سکے۔ اللہ کے معاف کرنے پر بھی اس کو طعن و تشنیع کی سزا دیتے رہنا خداوندی فیصلے سے یقیناً ایک بغاوت ہے اور سوائے اس کے نہیں کہ یہ معترض کی ایک اپنی شقاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی معافی کے ملنے پر ہزاروں طاعتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

جب حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا اور اس سے حضرت فاطمہؓ ناراض بھی ہوئیں تو جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کام منشاء رسالت کے خلاف ہے' تو باوجودیکہ حضرت فاطمہؓ نے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اس غلط ارادے پر معاف نہ کیا تھا لیکن جب آپ نے عملاً وہ ارادہ ترک کر دیا تو کیا صحابہؓ میں سے کسی نے آئندہ حضرت علیؓ کو اس پر طعن و تشنیع کیا؟ ہرگز نہیں۔ کیا کسی نے اسے آپ پر کلنک کا ٹیکہ کہا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت عثمانؓ پر اگر کسی نے کبھی اس گھبراہٹ پر زبان کھولی تو صحابہؓ نے قرآن کے اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر معاف کر چکا ہے' اسے ایسا کہنے سے روک دیا۔ اور اگر کہیں اسے ایک غلطی شمار کیا تو صرف الزامی درجے میں۔ اب اس غلطی کو جرم کے درجے میں لانا کسی خوش نصیب کا کام نہیں ہوسکتا۔

عفو یہ ہے کہ کوئی چیز جڑ سے مٹ جائے۔ عفت الدیار محلها و مقامها کب کہا جاتا ہے مشکوٰۃ کے شروع میں دور جاہلیت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے وطرق الایمان قد عفت آثارها و خبت انوارها۔

حضورؐ نے تو اسے کسی درجے میں بھی لائق حرج نہیں ٹھہرایا۔ حضرت علیؓ نے اسے آپ کی غلطی کہا تو اس پر حضورؐ نے کسی تائید کا اظہار نہ فرمایا بلکہ کہا:

یا علی اعیانی ازواج الاخوات ان یتحابوا. (تفسیر کبیر ج ۹ ص ۴۲)

ترجمہ: "اے علی! اس بات نے کہ ہم زلف کبھی تو آپس میں محبت سے رہیں' مجھے تھکا دیا ہے۔"

حضورؐ نے اسے ناپسند کیا کہ حضرت علیؓ اپنے ہم زلف کی کوئی عیب چینی کریں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے آپ کو اس سے روک دیا:

فقال علیه الصلوٰة والسلام مه۔ (تفسیر کبیر ج ۹ ص ۵۰)

ترجمہ: "اے علی! یہ بات نہ کہہ۔"

حضورؐ کے منع کرنے پر کیا حضرت علیؓ کی یہ غلطی قائم رہی؟ نہیں خطائے بزرگاں گرفتن خطاء است۔

سو جب حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کی کسی عیب چینی کا حق نہیں تو اور کون نادان ہے جو اس کی جرات کر سکے۔

ہم مزید لفظ عَفَتْ پر بحث نہیں کرتے۔ یہاں زیر بحث صرف حضرت عثمانؓ کا ایمان ہے۔ کیا وہ اپنے اس عمل سے ایمان سے باہر نکلے؟ ہم کہتے ہیں کہ کوئی مومن کسی بڑے سے بڑے گناہ سے بھی ایمان سے خارج نہیں ہوتا پھر جبکہ اس گناہ کو آسمانی عفو کا اعزاز بھی مل چکا ہو تو کون نادان ہوگا جو اسے کسی مومن کے ایمان سے نکلنے کی دلیل کہے اور سمجھے۔

رافضی اپنے اس عقیدے سے کہ حضرت عثمانؓ اپنے اس عمل سے معاذ اللہ ایمان سے نکل گئے' خارجی عقیدے پر آ گیا ہے ان کے ہاں گناہ کبیرہ کا مرتکب واقعی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن گیارہ اماموں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ خارجی اپنے اس عقیدے میں سچے ہیں۔ بارہ اماموں میں سے کوئی بھی خارجی عقیدے کا ہو تو رافضی اس کا نام پیش کریں۔

رافضی کا جھوٹا دعویٰ کہ ان کا عمل فرار آئندہ بھی قائم رہا

رافضی لکھتا ہے:

"علاوہ ازیں ان حضرات سے اس کے بعد بھی برابر یہ گناہ کبیرہ سرزد ہوتا رہا...... ان کے حمایت کار اس آسمانی عفو کی آڑ لے کر کہاں کہاں اس کو سپر بنائیں گے۔" (تجلیات ص ۵۰)

رافضی نے یہاں اپنے اس الزام کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تک پھیلا دیا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ جب احد کے دن حضورؐ کے شہید ہونے کی غلط خبر اڑا دی گئی تھی تو ساتھ ہی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی وہاں للکارا گیا تھا اور یہ دونوں حضرات وہاں موجود تھے۔ اس سے آپ اس کی بدنیتی اور بوکھلاہٹ کا اندازہ لگائیں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر لگائے اپنے اس الزام پر آسمانی معافی سے کس قدر پریشان ہے۔ ہم سردست اپنی گفتگو صرف حضرت عثمانؓ پر بند رکھتے ہیں۔ یہاں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی آپ سے آئندہ بھی کبھی ایسا ظہور میں آیا؟

یہاں رافضی خاص حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی اور شہادت نہیں لا سکا۔ بیعت شجرہ میں نہ ہونے کا الزام لگا کر لکھتا ہے:

"اس سے پہلے جنگ احد میں فرار کر چکے تھے۔ خیر وہ تو خدا نے معاف کر دیا۔ مگر آئندہ کے لیے یہ تہدید شدید ضرور فرما دی تھی:

وان تتولوا كما توليتم من قبل يعذبكم عذاباً اليما . (پ ٢٦ الفتح ١٦)

ترجمہ: 'اور اگر تم پلٹ جاؤ جیسا کہ تم پلٹ گئے تھے اس سے پہلے' تو اللہ دے گا تم کو ایک عذاب دردناک۔" (تجلیات ص۵۶)

رافضی نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"اگر اب بھی اس طرح فرار کیا جس طرح اس سے پہلے (جنگ احد میں) کیا تھا تو خدا تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔"

رافضی نے اس آیت کو جنگ احد سے صرف اس لیے جوڑا ہے کہ اس نے دعویٰ کر رکھا ہے کہ ان (حضرت عثمانؓ) سے اس کے بعد بھی برابر یہ گناہ کبیرہ سرزد ہوتا رہا۔ (ص۵۰)

اسے اپنے تسلسل الزام کو قائم رکھنے کے لیے اس آیت کو اپنے محل سے نکالنا ضروری تھا اور وہ اس نے کر دکھایا۔

رافضی کی اس موقع پر تحریف قرآن

یہ آیت سورۃ فتح میں ہے اور من قبل (اس سے پہلے) حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے نہ کہ جنگ احد کی طرف۔ حدیبیہ سے واپس ہو کر حضورؐ کو چڑھائی کرنے کا حکم ہوا تھا۔ حق تعالیٰ نے حضورؐ کو خبر دی کہ وہ بدو جو حدیبیہ نہیں گئے تھے اب خیبر کے معرکہ میں تمہارے ساتھ چلنے کو کہیں گے کیونکہ وہاں خطرہ کم اور غنیمت کی امید زیادہ ہے۔ آپ ان سے فرما دیں کہ تمہاری اس استدعا سے پیشتر اللہ ہم کو کہہ چکا ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہ جاؤ گے۔ ہاں ان کے ہاں آگے بہت سے معرکے پیش آنے ہیں' بڑی جنگجو قوموں سے مسلمانوں کے مقابلے ہوں گے۔

قرآن پاک کے وہ الفاظ جو رافضی نے پیش کیے ہیں' یہاں کے متعلق ہیں نہ کہ یہ جنگ احد کا ایک تسلسل ہے۔ ہم قرآن کریم کی یہاں پوری آیت لکھے دیتے ہیں تا کہ اس رافضی کی خیانت یا کم علمی آپ کے سامنے کھل کر آ سکے۔

قل للمخلفين من الاعراب ستدعون الى قوم اولى بأس شديد تقاتلونهم او يسلمون فان تطيعوا يؤتكم الله اجراً حسناً وان تتولوا كما توليتم من قبل يعذبكم عذاباً اليما. (پ ٢٦ الفتح ١٦)

ترجمہ: "آپؐ کہہ دیں پیچھے رہ جانے والے بدووں سے آئندہ تم بلائے جاؤ گے ان لوگوں سے لڑنے کے لیے جو سخت لڑنے والے ہوں گے۔ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو گئے ہوں گے۔ پھر اگر تم حکم مانو گے تو اللہ دے گا تمہیں اچھا بدلہ اور اگر تم پھر گئے جیسے تم اس سے پہلے پھر گئے تھے تو دے گا اللہ تمہیں ایک دردناک عذاب۔"

اس پر شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:

"یعنی جیسے پہلے حدیبیہ جانے سے پیچھے ہٹ گئے۔ اگر آئندہ ان معرکوں سے پیچھے ہٹے تو اللہ سخت دردناک عذاب دے گا۔ شاید آخرت سے پہلے دنیا میں ہی مل جائے۔"

(تفسیر عثمانی ص۶۸۲ طبع ریاض)

دیکھیے رافضی نے حدیبیہ کی بات کس طرح احد پر لگا دی تا کہ احد کے بھاگنے کو نہ صرف قائم رکھ سکے بلکہ اسے آگے تسلسل دے سکے۔ جب کسی میں دیانت نہ رہے تو حیا بھی جاتی رہتی ہے اور پھر بے حیاء جو چاہے کرے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ **ان مما ادرک النّاس من امر النبوة الاولى اذا لم تستحى فاصنع ماشئت ۔**

(مسند امام احمد ج۹ ص۷۵)

احد میں دور جا نکلنے والوں نے واپسی کی سعادت پالی

احد کے دن جو صحابہؓ خالد بن ولیدؓ کے عقبی حملہ میں فوراً الٹے رخ مڑنے لگے تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آنا ان کا مقدر رہا۔ اسے فرار کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ فرار یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ یہ واپس نہ آئے ہوں۔ پھر جب یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں بڑی نرمی اور لطف و کرم سے پذیرائی بخشی۔ نہ انہیں ڈانٹا اور نہ انہیں اس پر شرمندہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کی اس نرمی پر آپ کی مدح فرمائی اور اسے حضورؐ کے خلق عظیم کا ایک جلی اظہار بتلایا۔ امام فخر الدین الرازیؒ لکھتے ہیں:

واعلم ان القوم لما انهزموا عن النبى صلى الله عليه وسلم يوم احد ثم عادوا لم يخاطبهم الرّسول بالتغليظ والتشديد وانما خاطبهم بالكلام اللّين ثم ...... زاد فى الفضل والاحسان بان مدح الرّسول علىٰ عفوه وتركه التغليظ عليهم.

(تفسير كبير ج ٩ ص ٥٠)

ترجمہ: "جان رکھو کہ جب احد کے دن پوری قوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طرف جا نکلی اور پھر سب حضورؐ کے پاس لوٹ آئے تو حضورؐ نے انہیں غصے اور سختی سے خطاب نہیں کیا' بہت نرم پیرائے میں ان سے بات کی...... اللہ نے ان پر فضل و احسان کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انہیں معافی دینے پر اور ان پر سختی نہ کرنے پر آپ کی مدح کی۔

جب ساری قوم اس دن شکست کھا گئی اور ہزیمت کا شکار ہوئی تو پائے رسالت کا ثبات اور استقلال اپنی مثال آپ تھا۔ آپ بھاگنے والوں سے نفرت نہ کھا گئے تھے انہیں واپس لوٹنے کی آواز دے رہے تھے۔ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیدیں انہی سے وابستہ کی ہوئی تھیں۔ جب حالات ذرا سنبھلے اور وہ لوگ ہوش میں آئے تو سب سے پہلے حضورؐ کی طرف کون لوٹا اسے رافضی اس طرح بیان کرتا ہے:

"ابوبکرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب احد کے دن تمام لوگ رسول خدا کو چھوڑ کر چلے گئے تو میں سب سے پہلے رسولؐ کے پاس آ گیا تھا۔" (تجلیات صداقت ص ۴۸ بحوالہ تاریخ خمیس ج ۱ ص ۴۳۱)

رہے حضرت عمرؓ تو وہ بقول رافضی زیادہ دور گئے ہی نہ تھے اور نہ وہ پہلے نکلنے والوں میں سے تھے۔ رافضی لکھتا ہے:

"احد کے دن منجملہ بھاگنے والوں کے ایک عمرؓ بھی تھے مگر وہ پہلے بھاگنے والوں میں سے نہ تھے اور نہ ہی زیادہ دور گئے تھے۔" (ایضاً)

یہ عبارت بتلا رہی ہے کہ یہ فرار نہ تھا۔ سنبھل کر پھر سے مرکز میں لوٹنا تھا اور محاذ بنانا تھا قرآن کریم اس طرح پھر سے قوت پکڑنے سے نہیں روکتا۔

یا ایها الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفاً فلا تولوهم الادبار ومن یولهم یومئذ دبره الا متحرفاً لقتال او متحیزاً الٰی فئة فقد باء بغضب من اللّٰه.

(پ ۹ الانفال ۱۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو جب تم جہاد میں کافروں کے سامنے آؤ تو انہیں پیٹھ نہ دکھانا' جو شخص بھی جہاد میں ان سے منہ پھیرے ماسوائے دو باتوں کے ایک یہ کہ (۱) اپنے فن کا مظاہرہ کرے' اپنا ہنر دکھلائے دوسرے یہ کہ (۲) دوبارہ جماعت بندی کرے' تو وہ منہ پھیرنے والا بے شک اللہ کے غضب میں آ گیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جائے بازگشت ہے۔"

اللہ کا غضب کن پر ٹوٹتا ہے جو بزدلی سے جنگ سے فرار کریں اور اللہ کی رحمت اور آسمانی معافی کن پر اترتی ہے جو مخالفت کے ارادے سے پیچھے نہ ہٹے ہوں اور اگر کسی کو افراتفری میں ہوش میں نہ رہے تو کسی کو کسی پر نالش کا حق نہیں رہتا جیسا کہ احد کی افراتفری میں حضرت حذیفہؓ نے اپنے والد یمان کی دیت کسی پر نہ ڈالی تھی تو ایسے حالات میں پیچھے ہٹنا خطا تو ہے لیکن احد میں پھرنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے وفائی میں پیچھے نہ ہٹے تھے۔ شیطان نے انہیں صرف ایک مغالطہ ڈالا تھا کہ تم ابھی اس لائق نہیں کہ خدا سے جا ملو کچھ دن اور رہ لو اور پوری توبہ کرو۔ اسے فرار من الزحف نہیں کہا جا سکتا۔

قال الزجاج انهم لم یتولوا علٰی جهة المعاندة ولا علٰی جهة الفرار من الزحف رغبة منهم فی الدنیا وانما ذکرهم الشیطان ذنوباً کانت فیهم فکرهوا لقاء اللّٰه

الا علٰی حال یرضونه ما...... والا بعد الاخلاص فی التوبة وهٰذا خاطر خطر ببالهم وکانوا مخطئین فیه. (تفسیر کبیر ۹ ص ۴۳)

ترجمہ: "زجاج کہتا ہے کہ وہ لوگ اس دن حضورؐ سے کسی دشمنی پر پیچھے نہ ہٹے تھے نہ ہی جنگ سے فرار کے طور پر دنیا کی رغبت میں انہوں نے ایسا کیا تھا سوائے اس کے نہیں کہ انہیں شیطان نے ان کے کچھ پہلے پائے گناہ یاد دلائے اور انہیں اس حال میں اللہ کے حضور حاضر ہونے میں شرم آئی۔ وہ اس حال میں خدا سے ملنا چاہتے تھے کہ خدا ان سے خوش ہو اور یہ کہ وہ پورے اخلاص سے توبہ کی منزل سے گزریں۔ یہ خطرہ ان کے دلوں میں گزرا اور یہ ایک خطا تھی جو ان سے اس دن صادر ہوئی۔

احد کے دن معافی پانے والوں پر اللہ کی رحمت برسی نہ کہ ان پر اللہ کا غضب بڑھکا۔ حضورؐ ان کے ساتھ نہایت، نرم دلی اور عفو و کرم سے پیش آئے۔

فبما رحمة من اللّٰه لنت لهم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر. (پ ۴ ۲ آل عمران ۵۹)

ترجمہ: "یہ ایک خدا کی رحمت تھی کہ آپ ان کے لیے نرم رہے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کو چھوڑ جاتے۔ سو آپ ان سے معافی کا برتاؤ کریں۔ ان کے لیے استغفار چاہیں اور انہیں اپنے مشوروں میں لیں۔"

جنگ احد کی لغزش ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ تھی۔ جو بات کفر کے باعث صادر ہو اس پر معافی نہیں ہو سکتی نہ اس پر قلم عفو چلتا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں:

واعلم ان هٰذه الاٰیة دلت علٰی ان تلک الزلة ما کانت بسبب الکفر فان العفو من الکفر لا یجوز. (ایضاً ص ۴۳)

ترجمہ: "جان لے کہ یہ آیت بتلا رہی ہے کہ وہ لغزش بسبب کفر نہ تھی کیونکہ کفر سے معافی کسی طرح جائز نہیں۔"

حضرت عثمانؓ بھی احد کے دن بہ پیرایہ لغزش دور رہے تھے

حضرت عثمانؓ پر کسی نے ہزیمت احد کا اعتراض کیا تو آپؐ نے اس کا نام صرف ایک خطا رکھا اور اس پر خدا کی طرف سے معافی ہونے کی آیت پڑھ دی۔ یہ روایت بصیغہ مجہول مروی ہے۔ جب تک اس کی صحیح سند نہ ملے اسے آپ کا

اقرار خطا نہیں کہا جاسکتا اور پھر جب آپ بھی حضورؐ کی طرف لوٹ آئے تو یہ آپؓ کا فرار نہ رہا۔ فرار وہی ہے کہ جو جائے پھر واپس نہ آئے۔

رافضی کہتا ہے کہ آپ تین دن کے بعد واپس آئے (تجلیات ص۴۹ سطر۴) ہم کہتے ہیں دیر آید درست آید کے قاعدہ سے دیر سے آنے والوں کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ جب آپ دو انصاری ساتھیوں سعدؓ اور عقبہؓ کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں واپس آئے تو آپؐ نے بس اتنا ہی کہا کہ تم بہت دور نکل گئے تھے؟ کیا حضورؐ نے اسے فرار کہا؟ ان حضراتؓ سے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا؟ نہیں تو کچھ انصاف کریں' اسے اب فرار کیسے کہا جاسکتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ یہ خطا اس درجے کی نہیں کہ اس سے ان کے ایمان کی نفی کی جاسکے۔ اب ہم ایک اہم گزارش پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کے ایمان و ہجرت اور جہاد کا بیان

۱۔ جنگ احد کی حالت اضطراب میں حضرت عثمانؓ کے دور نکل جانے کے باوجود آپؓ کے مومن ہونے پر قرآن کی شہادت گزر چکی ہے۔ اس دن اس لغزش میں آنے والے سب مومن بتلائے گئے۔

ولقد عفا عنكم ط والله ذو فضل على المؤمنين . (پ ۴ آل عمران ۱۵۲)

ترجمہ: ''اور بے شک اللہ تعالیٰ تم سب سے اسے معاف کر چکا اور اللہ ایمان رکھنے والوں پر فضل کرنے والا ہے۔''

یہ اس دن لغزش کھانے والے مومنین میں سے ہی تو تھے:

ان الذين تولوا منكم يوم التقى الجمعان انما استزلهم الشيطان ببعض ما كسبوا . (پ ۴ آل عمران ۱۵۵)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم میں سے احد کے دن جو لوگ پھر گئے تھے ان سے یہ اس طرح عمل میں آیا کہ شیطان نے انہیں کسی بات پر مغالطہ دے رکھا تھا۔''

۲۔ ہجرت میں حضرت عثمانؓ اگر سب خلفائے راشدین سے بڑھ گئے تو یہ ایک جزوی فضیلت تھی جو آپ کو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں پر ملی۔ انہوں نے ایک ایک ہجرت کی اور حضرت عثمانؓ نے دو ہجرتیں کیں۔ ایک مکہ سے حبشہ کو اور ایک مکہ سے مدینہ کو۔

هاجر الهجرتين وصلى القبلتين .

رافضی خلفائے ثلثہ کی ہجرت سے یوں جان چھڑاتا ہے:

''حقیقت تو یہ ہے کہ ایمان ثلثہ کی حقیقت واضح کر دینے کے بعد ہجرت کے موضوع پر مزید خامہ

فرسائی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہجرت ایمان کی فرع ہے یعنی اگر کسی کا ایمان خالص و کامل ہے تو اس کی ہجرت بھی کامل اور خالص ہوگی اور اگر کسی کا ایمان ہی مشکوک یا معلوم العدم ہے تو پھر اس کی ہجرت بھی ویسی ہی ہوگی۔'' (تجلیات ص۴۶)

اب جبکہ ہم حضرت عثمانؓ کے ایمان پر قرآن کریم سے لفظ مومنین دکھا چکے تو ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا ایمان بھی خالص تھا اور ان کی دونوں ہجرتیں بھی اللہ کے ہاں درجہ قبولیت پا چکی ہیں۔ ہم خارجیوں کے اس عقیدے سے کبھی مصالحت نہیں کر سکتے کہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے مومن ایمان سے نکل جاتا ہے۔

رافضی نے بھی بڑی ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد آپ کے ایمان پر صرف شک کے چھینٹے ہی گرائے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب کسی کو زیر بحث لایا جائے اور پھر بات میں کہیں شک پیدا ہو تو شک کا فائدہ ملزم کو ہی پہنچتا ہے۔ جب رافضی اس میں بھی ناکام رہا تو اس نے آپ سے ایمان کی نفی کے لیے اس کے معلوم العدم ہونے کا سہارا لیا۔ اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سے پوری زندگی کوئی ایسا عمل صادر نہیں ہوا جس سے آپ کے ایمان کی نفی کی جاسکے۔ رہی بعض مشکوک کمزوریوں کی نشاندہی تو ظاہر ہے کہ یہ خارجی عقیدہ ہے کہ مومن کسی بڑے گناہ کے ارتکاب سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔ رافضیوں کو عثمانؓ دشمنی میں خارجیوں کے ساتھ نہ ملنا چاہیے۔

حاصل این کہ تجلیات کی مذکورہ بالا عبارت میں رافضی کا وہ طمطراق بالکل نکل چکا ہے جس سے وہ حضرت عثمانؓ کے خلاف نفی ایمان کی آواز لگانے کے لیے نکلا تھا۔

جو خود کو کہتے تھے توپچی وہ چلے ہوئے کارتوس نکلے

۳۔ ایمان اور ہجرت کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی شانِ جہاد پر بھی ایک نظر کیجئے

جہاد میں آپ کن اونچی بلندیوں پر پہنچے' انہیں معلوم کرنے سے پہلے آپ جہاد کے ان دو پہلوؤں پر ضرور نظر رکھیں (۱) جہاد جانی اور (۲) جہاد مالی۔

اللہ تعالیٰ مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید کر چکے ہیں اور ان کی قیمت بصورت جنت انہیں دے دی گئی۔ قرآن کریم میں ہے:

ان الله اشترىٰ من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة ط يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون. (پ ۱۱ التوبه ۱۱۱)

ترجمہ: ''بے شک اللہ نے خرید لیں مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس کے بدلے ان کے لیے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر وہ مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہاد میں مومن اللہ کی راہ میں جان بھی دیتے ہیں اور مال بھی۔

جانی جہاد میں حضرت عثمانؓ کی اللہ اور اس کے رسول کے ہاں پذیرائی

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں دامادوں (۱) حضرت عثمانؓ اور (۲) حضرت علیؓ کو ایک ایک دفعہ جہاد کے موقع پر اپنے گھروں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہنے دیا۔ حضرت عثمانؓ کو جنگ بدر کے موقع پر اور حضرت علیؓ کو جنگ تبوک کے موقع پر۔ حضرت علیؓ اس سے خوش نہ تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے حضورؐ سے کہا اتخلفنی فی النساء والصبیان۔ آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں کے لیے خلیفہ بنا رہے ہیں؟ رہے حضرت عثمانؓ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس اجر الٰہی کی ان الفاظ میں بشارت دی:

ان لک اجر رجل ممن شھد بدراً وَسھمہٗ. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۳)

ترجمہ: ''آپ کو اس شخص کے برابر اجر ملے گا جو جنگ بدر میں شریک ہوا اور غنیمت سے بھی ایک پورا حصہ۔''

اجر کہاں ملتا ہے اللہ کے ہاں؟ اس میں حضرت عثمانؓ کو خاتمہ بالایمان کی خبر دی گئی کہ ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں گے اور اللہ کے ہاں آپؓ کو جنگ بدر میں شمولیت پانے والوں کا اجر ملے گا۔

پھر آنحضرتؐ نے غنائم بدر سے حضرت عثمانؓ کو دیگر مجاہدین بدر کے برابر حصہ دیا۔ خطیب تبریزی لکھتا ہے:

ولم یشھد بدراً لانہ تخلف بمرض رقیّۃ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وضرب لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیھا بسھم. (الاکمال ص ۲۰۲)

ترجمہ: ''آپ بدر میں نہ آسکے کیونکہ آپ حضرت رقیہؓ کے بیمار ہونے کے سبب پیچھے رہے تھے اور حضورؐ نے (اسے آپ کی حاضری کا درجہ دیتے ہوئے) آپ کو مال غنیمت سے ایک مجاہد کا حصہ بھی دیا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جو اس برابر کے اجر کی بشارت دی اور آپ کو غنائم بدر میں بھی شامل کیا تو اس سے پتہ چلا کہ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں حضرت عثمانؓ کی جنگ بدر میں پوری شرکت ہو چکی۔ اور آپؓ نے بدوں حاضری یہ سعادت پائی۔ یہ اسی طرح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بدوں اس کے کہ حضرت اسماعیلؑ ذبح ہوں آپ کو بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا پورا ثواب مل گیا اور قرآن کریم نے بتلایا کہ آپ نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ **قد صدقت الرؤیا انا کذٰلک نجزی المحسنین۔**

۲۔ جنگ احد میں حضرت عثمانؓ سے گھبراہٹ میں جو لغزش ہوئی اس کے بارے میں رافضی بھی تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔

رافضی لکھتا ہے:

''پہلے جنگ احد میں فرار ہو چکے تھے خیر وہ تو خدا نے معاف کر دیا۔'' (تجلیات ص ۵۶)

اس میں بے شک آپ کی ایک لغزش کا ذکر ہے لیکن اس سے دو باتوں کا بھی پتہ چلا:

(۱) حضرت عثمانؓ کافروں میں سے نہ تھے نہ وہ حضرات جنہوں نے ایک غلط فہمی میں درے کا مورچہ چھوڑ دیا تھا کافروں میں سے تھے۔ فوجیوں سے دوران جنگ کبھی غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کے اس عفو سے وہ بدستور مسلمانوں میں شامل رہے اور ان مسلمانوں میں ان کا شمار رہا جن سے حضورؐ اپنے انتظامی امور میں آئندہ بھی مشورہ کرتے رہے اور یہ سب حکم الٰہی کے تحت تھا۔

فاعف عنھم واستغفرلھم وشاورھم فی الامر. (پ ۴ آل عمران ۱۵۹)

ترجمہ: ''انہیں معاف کر دیں۔ ان کے پردہ پوشی چاہیں اور امور سلطنت میں انہیں برابر اپنی شوریٰ میں رکھیں۔''

جب یہ لوگ اس لغزش کے باوجود شوریٰ میں رہے' انہیں اس سے نکالا نہ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے رب کا حکم مانے ہوئے تھے اور وہ گناہ کبیرہ سے بچنے والے تھے۔ یہ ایک اتفاقی خطا تھی جو ان سے ان کی پہلی کسی غلطی کے نتیجہ میں صادر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جو دلوں کی باتیں جاننے والا ہے اس نے انہیں حضورؐ کی مجلس شوریٰ سے نہ نکالا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ مومن تھے اور مومن ہی رہے۔ قرآن پاک کی رو سے مومنین کا مشورہ اپنے ہی لوگوں سے (مومنین سے) ہو سکتا ہے نہ کہ کافروں سے۔

وما عند اللہ خیر وابقیٰ للذین اٰمنوا وعلیٰ ربھم یتوکلون ○ والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش واذا ما غضبواھم یغفرون ○ والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقناھم ینفقون (پ۲۵ الشوریٰ ۲۸)

ترجمہ: ''اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر ہے اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے وہ باقی رہنے والا ہے اور وہ لوگ کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اور حیاء ان کا امتیاز ہے اور وہ غصے میں بھی ہوں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے انہیں جو دیا وہ خرچ کرتے ہیں۔''

اس سے پتہ چلا کہ اسلام میں مشورہ کے اہل وہ لوگ ہیں جو ان صفات سے موصوف ہوں:

(۱) ایمان رکھنے والے (۲) گناہ کبیرہ سے بچنے والے (۳) حیا رکھنے والے

(۴) اپنے غصے کو دبانے والے (باغیوں تک سے درگزر کیا) (۵) اپنے رب کا حکم ماننے والے

(۶) نمازیں قائم کرنے والے (۷) اہل شوریٰ میں شمار ہونے والے اور

(۷) اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے

سو احد کے دن جو کچھ ان لوگوں سے صادر ہوا وہ محض ایک لغزش تھی جو ایک گھبراہٹ کی حالت میں ان سے صادر ہوگئی۔ یہ حقیقۃً گناہ کبیرہ نہ تھا۔ گو ظاہراً ایسا نظر آئے ورنہ اللہ تعالیٰ انہیں حضورؐ کی مجلس مشاورت میں باقی رہنے نہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا وشاورھم فی الامر ۔ کس قدر اہل سعادت ہیں وہ لوگ کہ ان کی لغزش بھی ان کے لیے (۱) ایمان (۲) گناہ کبیرہ سے بچنا (۳) حیا میں ممتاز ہونا (۴) خرچ کرنے میں امتیاز پانا اور اپنے حملہ آوروں تک سے درگزر کرنا' ان کے خلاف جوابی کاروائی نہ کرنا جیسی اعلیٰ صفات ثابت کر گئی۔ تاریخ کا مطالعہ رکھنے والا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ سب صفات حضرت عثمانؓ میں امتیازی درجے میں پائی گئی تھیں۔

(۲) حضرت عثمانؓ مشرکین میں سے نہ تھے۔

پہلے یہ قانون یاد رکھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لیے مغفرت مانگنے سے روک دیا تھا۔ قرآن کریم میں ہے' آپ کے یہ ہرگز لائق نہیں کہ آپ مشرکین کے لیے استغفار چاہیں' یہاں مشرکین کا لفظ کافروں کو بھی شامل ہے:

ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربیٰ من بعد ما تبین لھم انھم اصحاب الجحیم. (پ ۱۱ التوبہ ۱۱۳)

ترجمہ: ''یہ نبی کے لائق نہیں اور نہ اہل ایمان کو زیبا ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار چاہیں' گو وہ مشرکین آپ کے اہل قرابت میں سے کیوں نہ ہوں۔ بعد اس کے کہ ان کے لیے یہ بات کھل گئی کہ وہ جہنمی ہیں۔''

پھر آپ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جو لوگ احد کے دن اس لغزش کے مرتکب ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے اپنے رب سے استغفار کا حکم دیا تھا:

فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر . (پ ۴ آل عمران ۱۵۹)

ترجمہ: ''سو آپ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لیے استغفار چاہیں اور ان سے مشورہ لیں کام میں اور پھر جب آپ عزم کر لیں کسی کام کا تو اب بھروسہ کریں اللہ پر۔''

یہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو انہی لوگوں کی معافی کا حکم دیا ہے' جنہیں وہ خود پہلے معاف کر چکا۔

ولقد عفا اللہ عنھم . (آیت ۱۵۵)

''اور اللہ تعالیٰ ان کو بے شک معاف کر چکا۔''

حضورؐ کا ان کے لیے استغفار اس بات پر نص ہے کہ اس دن اس غلطی کا ارتکاب کرنے والے ہرگز کفر و شرک سے آلودہ نہ ہوئے تھے۔ اہل ایمان میں سے رہے' خدا کا اپنا فیصلہ ہے کہ وہ کبھی کافروں کو مسلمانوں کے پاؤں اکھاڑنے کا موقع نہیں دیتا کہ ان کو جڑ سے لے بیٹھے۔

ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً . (النساء ۱۴۱)

ترجمہ: ''اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو مسلمانوں پر راہ۔''

سو احد کے دن درہ کا مورچہ چھوڑنے والے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدلی ہرگز منافقین میں سے نہ تھے۔ وہ اس لائق رہے کہ حضورؐ ان سے اپنی انتظامی مہمات میں برابر مشورہ لیتے رہے۔ حضورؐ کے صحابہؓ میں وہ اہل الرای کے اونچے درجہ پر فائز تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ دے دے۔ قرآن کا فیصلہ ہے: ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

جب اللہ تعالیٰ نے خود معاف کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ کا حضورؐ کو یہ کہنا کہ ان کے لیے آپ استغفار چاہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ یہاں حضورؐ کو ان کے لیے استغفار کا حکم دینا ظاہراً سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اسے اس طرح سمجھئے: مغفرت دو طرح سے ہے۔ ایک جنت میں جانے کے لیے اور ایک جنت میں داخلے کے بعد۔ جنت میں داخلے کے بعد جو مغفرت ہے وہ پردہ پوشی کے معنی میں ہے کہ جنت میں معافی پانے والوں کے گناہوں کی یاد بھی دوسرے اہل جنت کے ذہنوں سے اٹھا لی جائے۔ کامل انعام یہ ہے کہ وہ اس طرح وہاں رہیں جس طرح ان کی ماؤں نے انہیں جنم دیا ہے۔ آج ان کی سب آلودگیاں ڈھل چکیں۔ دنیا میں حاجی بھی اس یقین سے واپس لوٹتے ہیں کہ گویا وہ آج پیدا ہوئے ہیں اور ان کے کندھوں پر اب کسی گناہ کا بار نہیں رہا۔

اہل جنت کو یہ تحفہ بھی ملے گا کہ ان کی گزشتہ تقصیرات پر ایسا پردہ آئے کہ ان کی کوئی یادداشت کسی کے ذہن میں باقی نہ رہے۔

عہد ماضی عذاب ہے یا رب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

قرآن کریم میں اہل جنت کا یہ ذکر ملاحظہ فرمائیں۔ انہیں وہاں کس مغفرت سے نوازا جائے گا؟ اس نوع مغفرت سے جو ہم نے گزارش کی ہے۔

ولھم فیھا من کل الثمرات ومغفرۃ من ربھم . (پ ۲۶ محمد ۱۵)

ترجمہ: ''اور انہیں وہاں پر ہر طرح کے میوے حاصل ہوں گے اور مغفرت (پردہ پوشی) حاصل ہوگی اپنے رب کی طرف سے۔''

شیخ الاسلام اس آیت پر لکھتے ہیں:

''یعنی سب خطائیں معاف کر کے جنت میں داخل کریں گے۔ وہاں پہنچ کر کبھی خطاؤں کا ذکر بھی نہ آئے گا جو ان کی کلفت کا سبب بنے۔'' (ص ۶۷۵)

سو یہاں مغفرت سے مراد پردہ پوشی ہے جس طرح مغفر (خود) سر پر کیے جانے والے حملے کو روکتا ہے۔ غفارہ (زرہ) سینے پر آنے والے حملے سے روکتی ہے۔ مغفرت وہ انعام الٰہی ہے کہ احد کے دن غلطی کرنے والوں کی یہ بات بھی کہیں دہرائی نہ جائے گی۔ قرآن پاک میں اگر اسے ذکر کیا گیا ہے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر معافی کی تصریح بھی موجود ہے۔

جس طرح آج کسی کو یہ حق نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کا ذکر ان کی توبہ قبول کیے جانے کے بغیر کرے یا حضرت علی مرتضیٰؓ نے جو حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا اور اس سے حضرت فاطمہؓ آپؓ سے ناراض ہوئیں اس کا ذکر عام کرے اور یہ نہ کہے کہ حضرت علیؓ نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا اور حضرت فاطمہؓ کی ناراضگی دور فرما دی تھی۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کے بارے میں کسی ایمان والے کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ گو

''خدا نے ان لوگوں کا یہ جرم معاف کر دیا...... مگر اس سے فرار کا داغ تو نہیں مٹا۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن گیا۔'' (تجلیات ص ۵۰)

یہ بغض کی انتہا ہے جس میں رافضی سر اپا ڈوب چکے۔

ان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
و ان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

وہ غلطی ان لاکھوں طاعات پر سبقت لے گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی اس قدر رحمتیں اتریں۔ پورے قرآن میں کسی شخص کے گناہوں کی معافی اس انداز میں نہیں اتری جس انداز میں حضرت عثمانؓ کی یہ فروگذاشت ان کی اگلی سعادت کا نشان بنی اور یہاں تک ان کی مغفرت چاہی گئی کہ آئندہ اسے یادوں سے بھی اٹھا لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قسم کے پیرایہ میں کہا:

فاشھد ان اللہ عفا عنہ وغفرلہ.

ترجمہ: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر کیا ہے اور ان کی پردہ پوشی بھی کر دی ہے۔''

کیا یہ دونوں باتوں کی تصدیق نہیں؟ (۱) **فاعف عنھم** (۲) **واستغفرلھم۔**

واقعہ احد کے بعد حدیبیہ میں حضرت عثمانؓ کی بیعت جہاد

حدیبیہ کے موقع پر سب صحابہؓ نے اپنے ہاتھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت جہاد کی۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس دن حضور کی بیعت اپنے ہاتھ سے نہیں حضورؐ کے ہاتھ سے کی۔ حضورؐ نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس طرح حضرت عثمانؓ کی بیعت لی کہ آپ کا دایاں ہاتھ آپ کے بائیں ہاتھ کے اوپر تھا۔ یہ پیرایۂ بیعت اس بات کی ضمانت ہے کہ حضرت عثمانؓ سے آئندہ کسی معرکہ جہاد میں کوئی کمزوری صادر نہ ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں عیب کا داغ آپ کے دائیں ہاتھ پر نہیں پیغمبر کے دائیں ہاتھ پر آئے گا۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی بدنصیب حضورؐ کے ہاتھ پر کسی قسم کی کوئی جرح کرے۔ حضرت عثمانؓ نے پھر ہمیشہ اپنے دائیں ہاتھ کی اس طرح عزت کی کہ کبھی اسے اپنے ستر پر نہ لگایا۔ اسے آپؓ ہمیشہ حضور کا ہاتھ سمجھتے رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے کسی شخص نے حضرت عثمانؓ پر یہ کلمات جرح کہے:

انہ تغیب عن بیعۃ الرضوان ولم یشھدھا .

''آپ بیعت رضوان سے غائب رہے اس میں آپ حاضر نہ تھے۔''

تو آپؓ نے فرمایا:

ان تغیبہ عن بیعۃ الرضوان فلو کان احد اعزّ ببطن مکۃ من عثمانؓ لبعثہ مکانہ فبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عثمانؓ وکان بیعۃ الرضوان بعد ماذھب عثمانؓ الی مکہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ الیمنٰی ھذہ ید عثمانؓ فضرب لھا علٰی یدہ فقال ھذہ لعثمانؓ (فقال لہ ابن عمرؓ اذھب بھا الآن معک) (بخاری ج ۱ ص ۵۲۳)

ترجمہ: ''آپ کا بیعت رضوان سے غائب رہنا اس لیے تھا کہ کوئی اہل مکہ کے ہاں حضرت عثمانؓ سے زیادہ عزت کے لائق نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا ہوتا تو آپ حضرت عثمانؓ کی بجائے اسے ان کے ہاں

بھیجتے اور بیعت رضوان آپ کے مکہ جانے کے بعد وقوع میں آئی تھی۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھا اور کہا یہ عثمانؓ کی بیعت ہے۔ یہ بات بتا کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس اعتراض کرنے والے کو کہا' یہ جواب اب تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

حضرت انسؓ کہتے ہیں:

فکانت ید رسول اللّٰہ لعثمانؓ خیراً من ایدیھم لانفسھم. (رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۵۶۱)

ترجمہ: "حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کی قائم مقامی میں حضور اکرمؐ کا ہاتھ سب حاضرین کے ہاتھوں سے بڑھ کر تھا۔

اس دن حضرت عثمانؓ کا ہاتھ کیا حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں پر بھی سبقت لے گیا۔ یہ اس بحث کا موقعہ نہیں تاہم جس طرح حضورؐ کا ہاتھ بے وفائی کے ہر تصور سے پاک ہے حضرت عثمانؓ اس موقع پر اس مقام کو پا گئے۔ اب آئندہ اس ہاتھ پر بے وفائی کا بھی کوئی چھینٹا نہ پڑ سکے گا۔

افسوس کہ رافضی آپ کی احد کے دن کی لغزش کو آپ کی پوری زندگی میں مسلسل پھیلے دکھا رہا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی اکیلے مکہ جانے کی ہمت

اہل مدینہ اور اہل مکہ بڑی خونی جنگیں لڑ چکے تھے۔ بدر اور احد کے معرکوں کے بعد کسی مسلمان کا مکہ جانا بڑی ہمت رکھتا ہے۔ گو عربوں میں دستور تھا کہ سفیر قتل نہیں کیے جاتے تاہم جس بے جگری سے حضرت عثمانؓ مکہ گئے وہ ان کے عظیم حوصلے اور بہادری کی تاریخی تصدیق ہے۔ اتنے خونریز معرکوں کے بعد مشرکین سے کسی بھی ردعمل کی امید کی جا سکتی تھی۔

پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں جس جرأت سے فوجوں اور سپہ سالاروں کو جنگوں میں بھیجا اور حوزہ اسلام کی پوری جرأت اور بہادری سے حفاظت کی۔ یہ واقعاتی شہادتیں بتلاتی ہیں کہ آپ پر اب کسی کو بزدلی اور کمزور ہمتی کا الزام لگانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

پھر آپ نے اپنے آخری دنوں میں جس ہمت اور عزیمت سے موت کا استقبال کیا شاید پوری اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں اور دکھائی نہ دے۔ ہم یہاں آپ کی اس بے نظیر ہمت اور بہادری کو خراج تحسین ادا کیے بغیر آگے نہیں چل سکتے۔ جنگ احد میں جو کچھ پیش آیا وہ ایک افراتفری میں پیدا ہونے والا حادثہ تھا جس پر ہم پوری بحث پہلے کر آئے ہیں۔

افراتفری میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کا قتل بھی درگزر کر دیا گیا

جنگ احد میں یہ خبر ملی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ اب افراتفری کا یہ عالم تھا کہ اپنے پرائے کا بھی امتیاز نہ رہا تھا اور

آپس میں ہی ایک دوسرے پر تلواریں چلنے لگی تھیں۔ حضرت حذیفہؓ بن یمانؓ کے والد بھی اسی ہنگامے میں مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے لیکن یہ سب کچھ بے خبری اور افراتفری میں ہوا۔ حضرت یمان کو قتل کرنے والے کافر نہ تھے۔ حضرت حذیفہؓ نے دور سے آواز دی کہ یہ میرے والد ہیں مگر افراتفری میں وہ سنی نہ جا سکی اور اگر سنی بھی گئی تو سمجھی نہ جا سکی اور حضرت یمانؓ شہید ہو گئے۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۶)

اب حضرت حذیفہؓ کی شان معافی دیکھئے' صحابہ نے جب کہا خدا کی قسم ہم نے ان کو پہچانا نہیں تھا تو آپؓ نے انہیں وہی بات کہی جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو کہی تھی:

یغفر اللّٰہ لکم وھو ارحم الراحمین. (پ ۱۳ یوسف ۹۲)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تم سب کو بخشے۔ وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

حضورؐ نے یمانؓ کا خون بہا بیت المال پر ڈالنا چاہا' یہ قتل خطا تھا۔ مگر حضرت حذیفہؓ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہوا افراتفری کے عالم میں ہوا سو آپ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ میں اس پر دیت لوں۔ مگر چونکہ یہ حقوق کا مسئلہ تھا' حضورؐ نے ان کی دیت دینی چاہی۔ گو حضرت حذیفہؓ نے اپنا حق معاف کر دیا۔

(دیکھئے فتح الباری ج ۷ ص ۲۷۹)

اللہ کو ان کی یہ معافی اتنی پسند آئی کہ اس نے ان سب سے جن سے احد کے دن غلطی ہوئی اپنی گرفت اٹھا لی اور سب کو معاف کر دیا۔ جن فوجیوں نے حضورؐ کے حکم کے خلاف درہ چھوڑ دیا تھا انہیں بھی آپ نے کوئی سزا نہ دی۔ سو اس سے انکار نہیں کہ افراتفری میں ہونے والے کئی امور صرف نظر کے لائق ہوتے ہیں اور ان پر کسی کو مجرم نہیں گردانا جاتا' نہ اس بنا پر کبھی وفاداروں اور غیر وفاداروں میں فاصلے قائم کیے جاتے ہیں۔ قریب رہنے والوں کو ان کی حوصلہ مندی پر بے شک داد دو لیکن اس میں کسی دوسرے کی منقصت کی راہیں نہ ڈھونڈو۔ وقت کی نزاکت کا احساس ہر شریف معاشرے میں ہمیشہ کیا گیا ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم کا آپس میں معاملہ ہمیشہ خیرخواہی کا رہا

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں' جنگ احزاب میں رات بہت ٹھنڈی ہوا چلی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی اور جب ہم میں سے کسی نے ہاں نہ کی' آپؐ نے پھر دوسری دفعہ بھی وہی کہا یہاں تک کہ آپؐ نے پھر تیسری دفعہ کہا:

الا رجل یاتینی بخبر القوم جعله اللّٰه معی یوم القیٰمة.

ترجمہ: "ہے کوئی شخص جو مجھے مکہ والوں کی خبر لا دے؟ جو یہ کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے میرے ساتھ جگہ دیں گے۔"

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر بھی ہم میں سے کسی نے ہاں نہ کی یہاں تک کہ حضورؐ نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ اب میرے لیے کوئی اور چارہ کار نہ تھا:

فلم یجبہ منا احد فقال یا حذیفۃ فاتنا بخبر القوم فلم اجد بداً اذ دعانی باسمی ان اقوم قال اذھب فاتنی بخبر القوم ولا تذعرھم علی فلما ولیت من عندہ جعلت کانما امشی فی حمام حتی اتیتھم. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۷)

ترجمہ: ''پھر بھی ہم سے کسی نے آپ کی بات پر ہاں نہ کی' پھر آپ نے مجھے کہا: اے حذیفہؓ تو وہاں کی رپورٹ لا۔ اب میرے لیے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کیونکہ حضورؐ نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی تھی۔ آپ نے مجھے کہا تو جا اور انہیں میرے اوپر اور نہ چڑھانا۔ پھر جب میں حضورؐ سے جدا ہوا تو میرا حال یہ تھا گویا حمام (خوشگوار گرم ہوا) میں چل رہا ہوں یہاں تک کہ میں وہاں جا پہنچا۔''

مسند امام احمد کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حضورؐ نے کہا:

من رجل یقوم فینظر لنا ما فعل القوم یبشر لہ رسول اللہؐ الرجعۃ اسئل اللہ ان یکون رفیقی فی الجنۃ.

ترجمہ کون ہے جو تیار ہو اس خبر لادے کہ ان لوگوں نے کیا کر رکھا ہے اسے اللہ کا رسول بشارت دیتا ہے واپسی کی میں خدا سے مانگتا ہوں کہ وہ اسے جنت میں میرا رفیق کرے

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں:

فما قام رجل من القوم مع شدۃ الخوف وشدۃ الجوع وشدۃ البرد فلما لم یقم احد دعانی رسول اللہ فقال یا حذیفۃ فاذھب فادخل فی القوم فانظر ما یفعلون.
(مسند احمد ج ۹ ص ۹۳. کنز العمال ج ۱۰ ص ۲۰۳)

لوگوں میں سے کوئی نہ اٹھا شدت خوف سے اور شدت بھوک سے کڑی اور سردی ہے جب کوئی نہ اٹھا تو حضورﷺ نے مجھے (حذیفہ کو) نام لے کر آواز دی حذیفہ تم جاؤ اور دیکھو کہ ان لوگوں نے کیا تیاری کر رکھی ہے؟

پھر کیا ہوا اسے آپ کی زبان سے سنیئے:

وہاں میں نے ابوسفیانؓ کو دیکھا' وہ آگ کی طرف پشت کیے ہوئے تھا۔ میں نے ایک تیر اپنے کمان کے

درمیان رکھا اور اسے ابوسفیانؓ پر چلانے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں مجھے حضور کی بات یاد آ گئی کہ انہیں مجھ پر اور نہ چڑھانا اور اگر میں اس پر تیر چلا دیتا تو میں اسے مار سکتا تھا۔ پھر میں واپس لوٹا اور پہلے کی طرح ہی گرم ہوا میں چلتا آ رہا تھا۔ میں واپس آیا اور حضور کو ان کے حالات کی خبر دی۔ اس سے فارغ ہوتے ہی میں پھر اسی پہلی ٹھنڈی فضا میں تھا سو حضورؐ نے مجھے اپنی وہ چادر اوڑھائی جو آپ نماز میں اپنے اوپر رکھتے تھے۔

کنز العمال میں اتنا اضافہ ہے کہ جب حضورؐ آواز دیتے رہے کہ کون شخص ہے جو جائے اور قریش کی خبر لائے کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے کہا کہ حضرت حذیفہؓ کو اس کام پر روانہ فرمائیں۔ حضورؐ نے ان کی رائے پسند فرمائی اور حضرت حذیفہؓ کو ان کا نام لے کر آواز دی اور وہاں جانے کے لیے کہا۔

اس روایت میں جہاں یہ نہیں کہ حضرت علیؓ اس وقت کیوں نہ اٹھے یہ بھی کہیں نہیں کہ حضورؐ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو جانے کا کہا تھا اور پھر حضرت عمرؓ کو جانے کا کہا تھا اور دونوں نے اس پر معافی چاہی۔ یہ بات کہیں اس میں نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی اس روایت کے مقابلے میں ایک دوسری روایت

رافضی کہتا ہے:

''تیسری مرتبہ فرمایا: یا ابا بکر تم جا کر خبر لاؤ۔ ابوبکرؓ نے کہا استغفر اللہ ورسولہ میں خدا اور رسول سے معافی چاہتا ہوں۔ پھر فرمایا ان شئت ذھبت یا عمرؓ اگر چاہو تم چلے جاؤ۔ عمرؓ نے بھی کہا استغفر اللہ ورسولہ۔ اور پھر حذیفہؓ سے فرمایا اور وہ لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور تعمیل کی۔'' (تجلیات صداقت ص ۵۲)

رافضی نے اپنی اس روایت پر درمنثور ج ۵ ص ۱۸۵ اور اس کے ساتھ مسند امام احمد ج ۵ ص ۳۹۲۔ کنز العمال ج ۵ ص ۲۷۹۔ مواہب اللدنیہ ص ۱۱۸۔ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۶۹۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۵۲ کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ان کتابوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بار بار کی پکار پر اپنا نام پیش کیا ہو۔ یہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام محض اس لیے ڈالا گیا ہے کہ کسی طرح حضرت حذیفہؓ کو ان پر ترجیح دی جا سکے اور رافضی نے یہ نہ سوچا کہ اس طرح تو ان کی ترجیح حضرت علیؓ پر بھی ثابت ہو جائے گی جسے وہ خود ماننے کے لیے شاید کبھی تیار نہ ہو۔

البتہ درمنثور میں اس زیادتی پر یہ حوالہ دیا گیا ہے:۔

ناظرین کرام! اس روایت کے رواۃ پر ذرا تحقیقی نظر ڈالیں اور پھر رافضی کو علم دیانت کی داد دیں کہ وہ کس طرح صحیح مسلم کی روایت کے مقابلے میں ان کتابوں کی سند لا رہا ہے۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار
أفرس تحت رجلک ام حمار

رافضی نے یہاں مسند احمد اور کنز العمال کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ہم ان دونوں کتابوں کی روایت اوپر دے آئے ہیں۔ ان میں کہیں اس قصے کا ذکر نہیں ہے کہ حضور اکرمؐ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخبری کی اس خدمت کے لیے بھیجا تھا اور سلطنتوں کا عمومی عمل بھی یہی ہے کہ چھوٹے اور چھپے کاموں پر بڑے لوگوں کو نہیں بھیجا جاتا۔ سو رافضی کی پیش کردہ در منثور کی روایت درایۃً بھی قابل قبول نہیں اور روایۃً بھی ہم اسے کوئی وزن نہیں دے سکتے در منثور میں کس حوالے سے نقل کیا گیا ہے اور اس کی سند ساتھ نہیں دی گئی۔ جب اس کی کوئی سند نہیں دی گئی تو ہم اس حوالے کو کیسے مستند کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم صحیح مسلم سے صحیح سند کے ساتھ روایت پیش کر چکے کہ حضورؐ کا وہ حکم براہ راست حضرت حذیفہؓ کو تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کہنے کے بعد نہ تھا۔ ان دو روایتوں کے تقابلی مطالعہ سے قارئین کو شیعہ محققین کے علم کی آخری گہرائی پوری طرح نظر آ جاتی ہے۔

یہاں کوئی مومن کسی بدحواسی کی جرأت نہ کرے

اس قسم کی روایات میں کوئی صحیح العقیدہ مسلمان پورے صحابہؓ پر یہ الزام قائم نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کی اس پکار پر وہ جواب کیوں نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کو حذیفہؓ کا نام لے کر یہ حکم دینا پڑا۔ کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کہاں تھے؟ حضرت علیؓ کہاں تھے؟ کسی نے بدحواسی نہ کی نہ کسی نے یہ عقیدہ بنایا کہ حضرت حذیفہؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں پر سبقت لے گئے۔ جنگوں کے موقعوں پر اجتماعی عمل (ہوم ورک) ہوتا ہے اور ذمہ داریاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ وہاں عقیدوں کے فیصلے نہیں ہوتے کہ اندر سے کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔ عقائد نصوص سے لیے جاتے ہیں۔ واقعات سے نہیں۔ نہ کسی کے اندر جھانکا جاتا ہے۔ خارجی کتنے بدبخت ہیں جو یہ کہتے نہیں رکتے کہ احد کے سید الشہداء کا رتبہ حضرت حمزہؓ لے گئے اور حضرت علیؓ نہ لے جا سکے۔ حق یہ ہے کہ اس دن دونوں کی جرأت اور جانبازی ایک سی تھی۔ دونوں بنو ہاشم میں سے تھے اور ان میں خاندانی رشتہ میں بھی حضرت حمزہؓ حضورؐ کے زیادہ قریب تھے۔ علم الٰہی میں یہ بات طے تھی کہ خلافت راشدہ میں بنو ہاشم کا بھی حصہ ہو۔ اس لیے اللہ رب العزت نے اپنے تکوینی فیصلے میں اس دن حضرت علیؓ کو اپنی حفاظت میں رکھا۔ آپ غازیوں میں ممتاز رہے اور حضرت حمزہ سید الشہداء کا مقام لے گئے۔ قمر رسالت کے ہالہ میں ہر ستارہ ایک اپنی تابانی رکھتا ہے۔ کسی مومن کو زیبا نہیں کہ ان میں مقابلہ آرائی سے کسی کی منقصت کرے۔ اور ایسے واقعات میں تبرا کا لاوا اگلے۔ صحابہؓ کا آپس میں معاملہ ہمیشہ خیر خواہی اور نیک گمانی کا رہا ہے۔ ہم ان سب کے بارے میں اہل تولا سے ہیں اہل تبرا میں سے نہیں ہیں۔ احد کے دن حضرت علیؓ شیعہ ہو جاتے تو خلافت راشدہ میں بنو ہاشم کوئی

حصہ نہ پا سکتے تھے۔

آسمانی عفو سے صرف وہی غلطی معاف نہیں ہوئی پورے گناہ ڈھل گئے

غزوہ تبوک میں تین آدمیوں سے پیچھے رہ جانے کی غلطی ہوئی ان کے پیچھے رہنے کی وجہ کوئی ایمانی کمزوری نہ تھی، ان سے ایک اتفاقی لاپرواہی ہو گئی تھی۔ جب انہیں آسمانی عفو کی دولت ملی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ آپؐ نے حضرت کعب بن مالکؓ کو معافی کی ان لفظوں میں بشارت دی۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو یبرق وجھہ من السرور "ابشر بخیر یوم مرّ علیک منذ ولدتک امک" (البدایہ ج ۵ ص ۲۵)

ترجمہ: "آج اس اچھے دن کی بشارت لو! ایسا دن تجھ پر کبھی نہیں آیا جب سے کہ تیری ماں نے تجھے جنا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ دن حضرت کعبؓ کی تمام نیکیوں کے اوقات اور عبادات کے لحاظ سے بڑھ گیا۔ اور یہ آسمانی معافی آپ کی سب نیکیوں پر سبقت لے گئی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آسمانی معافی صرف اسی غلطی کو ہی معاف نہیں کرتی، اس سے اس کے پوری زندگی کے گناہ ڈھل جاتے ہیں۔ جیسے کہ آج اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو۔ رب کریم کا جب عفو و کرم موجزن ہوتا ہے تو اب کوئی پچھلا داغ باقی نہیں رہتا۔

آپؓ پر احد کے دن فرار ہونے کا الزام کس نے لگایا؟

جنگ احد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لڑی گئی لیکن حضور کی حیات طیبہ میں کبھی یہ نہ سنا گیا کہ حضرت عثمانؓ احد کے دن جنگ سے فرار کر گئے تھے۔ نہ حضورؐ نے کبھی یہ بات کہی اور نہ کسی صحابی نے اسے کہیں اپنے چشم دید واقعہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ نہ حضرت عثمانؓ نے کبھی اسے کسی سے ذکر کیا کہ یہ واقعہ کس طرح وقوع میں آیا تھا۔ حضورؐ نے آپؓ سے صرف اتنی بات کہی تھی:

لقد ذھبتم فیھا عریضۃ. (تفسیر کبیر جلد ۹ ص ۵۰)

ترجمہ: "بے شک اس دن تم بہت دور تک نکل گئے تھے۔"

افراتفری کے عالم میں یہ دور تک چلا جانا ایک تعجب تو ہے لیکن یہ فرار نہیں، فرار تو تب ہے کہ یہ واپس نہ آئے ہوں۔ جنگ احد کے تیس سال بعد تک یہ نامانوس صدا اس وقت تک کہیں نہ سنی گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ احد کے دن بعض صحابہ

کی تولی (درہ چھوڑنے یا رخ پلٹنے) اور اس پر انہیں معافی ملنے کا ذکر قرآن میں ملتا ہے لیکن اسے کہیں حضرت عثمانؓ کے فرار سے ذکر نہیں کیا گیا نہ اس کا پتہ کسی خبر متصل سے ملتا ہے۔ جب آپ اپنے دور خلافت کے آخری سال میں تھے اور ایک یہودی عبداللہ بن سبا نفاق کی چادر لیے حضرت عثمانؓ کے خلاف صوبہ بہ صوبہ پراپیگنڈہ کر رہا تھا تو اس کا مصر کا ایک تربیت یافتہ مدینہ آیا اس نے یہ بات کہی۔ اس وقت وہاں حضرت عبداللہ بن عمرؓ موجود تھے۔ آپؓ نے اسے الزاماً تسلیم کرتے ہوئے اس پر صحابہؓ کو معافی ملنے کی آیت پڑھ دی۔ اب جہاں بھی فرار کی یہ روایت پہنچی اسی راہ سے پہنچی۔

اب کون شرح صدر سے کہہ سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے واقعی احد کے دن جب درے کی جانب سے خالد بن ولید نے مسلمانوں پر حملہ کیا' اس سے اس درہ میں افراتفری پیدا ہو گئی تھی کہ مسلم فوجی پلٹ کر خود اپنے ہی لوگوں پر حملہ آور ہو گئے تھے تو یہ کمزوری آپؓ نے دکھائی تھی۔ اتنے بڑے آدمی سے یہ واقعہ ظہور میں آیا ہوتا تو آپ کے خلیفہ چنے جانے کے دن بھی کہیں اس کا اظہار کیا گیا ہوتا۔ اب آپ دیکھیں یہ خبر سب سے پہلے کب سنی گئی؟

صحیح بخاری میں ہے:

جاء رجل من اهل مصر و حج البيت فرای قوماً ملبوساً فقال من هولاء القوم فقالوا هٰولاء قريش قال فمن الشيخ قالوا عبد اللّٰه بن عمرؓ قال يا ابن عمرؓ انی سائلک عن شئی فحدثنی هل تعلم ان عثمانؓ فر يوم احد ...... فقال لهٗ ابن عمرؓ اذهب بها الآن معک. (صحيح بخاری جلد۱ص۵۲۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے جواب کے آخر میں جو اسے نصیحت کی اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ اسے پہچان گئے تھے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو ان تین موقعوں پر قصوروار قرار دینے آ رہا ہے۔ آپ نے اسے اطمینان بخش جواب دے کر فرمایا' ان جوابوں کو اپنے ساتھ مصر لے جا' یہاں تک کہ جو عیب حضرت عثمانؓ پر لگا رہا ہے وہ وہم تجھ سے نکل جائے۔

شارح بخاری علامہ قسطلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اذهب بالاجوبة التی اجبتک بها الآن معک حتی يزول عنک ما کنت تعتقد عن عيب عثمانؓ. (ارشاد الساری ج)

اس سے پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس میں ایک مختلف عقیدے والے کو جواب دے رہے تھے اور ظاہر ہے کہ مخالف کو جواب کبھی الزامی بھی دیا جاتا ہے کہ تیرے کہنے پر اگر مان ہی لیا جائے کہ وہ احد کے دن میدان سے چلے گئے تھے تو بھی یہ عیب نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اس کی عام معافی فرما چکے ہیں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

ان السائل کان ممن يتعصب علٰی عثمانؓ فاراد بالمسائل الثلٰث ان يقرر معتقده فيه. (فتح الباری ج ؟ ص ۲۰۱)

سو ظاہر یہی ہے کہ آپ نے یہ جواب الزاماً دیا ہے۔ آپ کی قسم احد کے دن منتشر ہونے والوں کی اس عمومی معافی پر تھی جو قرآن میں ان کے حق میں آئی ہے' کسی ایک فرد کے بارے میں نہیں۔ اگر تاریخ میں یہ کوئی واقعی بات ہوتی تو حضرت عثمانؓ ایک مجمع عام میں یہ بات کھل کر نہ کہہ سکتے تھے۔ لیکن آپؓ نے ایک خطبہ میں کھل کر یہ بات کہی:

اما بعد فان اللّٰه بعث محمداً صلی اللّٰه عليه وسلم بالحق فکنت ممن استجاب للّٰه ولرسوله وامنت بما بعث به و هاجرت الهجرتين و صحبت رسول اللّٰه صلی عليه وسلم و بايعته فواللّٰه ما عصيته ولا غششته حتی توفاه اللّٰه عز و جل ثم ابابکر مثله ثم عمرؓ مثله ثم استخلفت. (صحيح بخاری ج ۱ ص ۵۲۲)

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچائی کے ساتھ بھیجا اور میں ان میں سے تھا جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانی اور میں ان سب باتوں پر ایمان لایا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کر بھیجے گئے تھے۔ میں نے دو ہجرتیں کیں اور میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی اور میں نے آپ سے بیعت کی۔ بخدا میں نے کبھی حضورؐ کی نافرمانی نہیں کی نہ کبھی میں نے آپ کو کوئی دھوکہ دیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔ پھر میں نے حضرت ابوبکرؓ سے بھی اسی طرح وفا کی۔ پھر حضرت عمرؓ کا بھی میں اسی طرح پورا وفادار رہا۔ پھر مجھے خود خلافت کی ذمہ داری دی گئی۔''

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ احد کے دن بھی حضرت عثمانؓ سے کوئی بے وفائی ظہور میں نہ آئی تھی۔ ورنہ وہ اس طرح ڈٹ کر اپنی سیرت بیان نہ کرتے۔ رہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اسے اس طرح ذکر کرنا سو یہ ایک الزامی پیرائے میں تھا کہ اے مخالف اگر تو یہی کہہ رہا ہے تو بھی یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس لغزش پر معافی دے چکے ہیں۔ صحیح بخاری کی یہ حدیث اس پر صریح ہے کہ آپؓ نے حضورؐ کی وفات تک آپ کے کسی حکم کی نہ کھلے مخالفت کی اور نہ چھپے تو اب کیسے مانا جا سکتا ہے کہ آپ نے احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کی نافرمانی کی ہو یا چھپ کے کہیں بھاگ نکلے ہوں۔ سو احد کے دن یہ فرار کی داستان صرف ایک الزامی درجہ رکھتی ہے۔ جس کا واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ نے ایک کھلے مجمع میں یہ بات کہی اور کسی صحابی نے وہ مہاجر ہو یا انصار میں سے اس کی تردید نہ کی۔

حضرت علیؓ بھی وہاں موجود تھے۔ جب حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ ولید پر شراب کی حد جاری کریں۔ حضرت علیؓ کا اس موقع پر آپ کے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنا اور آپ کے حکم کی تعمیل کرنا بتلاتا ہے کہ آپ پوری عمر کبائر سے محفوظ رہے۔ اور کبھی حضورؐ کے کسی حکم کی کھلی اور چھپی مخالفت نہ کی۔

اب ہم آپ کے اس کھلے بیان کے بعد اس مجہول الاسم مصری کی فرار احد کی بات کیسے تسلیم کرلیں۔ اگر اس کی کچھ بھی حقیقت ہوتی تو حضرت علیؓ یہاں کبھی خاموش نہ رہتے۔ آپ کے اس خطبہ کے دوران ہی آپ کی تردید کردیتے کہ کیا احد کے دن آپؓ نے حضورؐ کی نافرمانی نہ کی تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

لم الف علی اسمه ولا علی اسم من اجابه من القوم ۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۱)

جب نہ سائل کا کوئی نام جانے نہ ان لوگوں کا جو اسے جواب دے رہے ہیں تو کیا اس سے اتنے بڑے آدمی پر فرار کی تہمت لگائی جاسکتی ہے؟

سو صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرار احد کو صرف الزاماً تسلیم کیا تھا کہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کردیا اور اس پر مغفرت فرمادی۔ حضورؐ کی زندگی میں اس واقعہ کا کہیں مذکور نہ ہونا بتلاتا ہے کہ یہ ہرگز کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ نامانوس صدا تو بعد میں سنی گئی اور اس کی بھی نص قرآن سے اسی وقت تردید کردی گئی۔

جنگ احد میں حضورؐ کے گرد کون کون محافظ رہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احد کے دن محافظین ہر موقعہ پر ایک سے نہیں رہے۔ کسی وقت سات، کسی وقت گیارہ اور ایک وقت دو بھی رہے اور آپ کے مختلف حالات اور مختلف مواقع پر محافظین مختلف رہے۔ حضورؐ خود ایسے ثابت قدم تھے کہ آپ کسی کے محتاج نہ تھے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، اس ذات عالی کی قسم جس نے حضور اکرم کو حق دے کر بھیجا۔ اس دن کتنا ہی صبر آزما مرحلہ کیوں نہ آیا، آپ کا قدم مبارک ایک بالشت بھی کبھی اپنے مقام سے پیچھے نہ ہٹا اور آپ خود بھی دشمن کے سامنے آتے رہے۔

فوالذی بعثه بالحق ما زالت قدمه شبراً واحداً وانه لفی العدو و یفئ الیه طائفه من اصحابه مرة و تفترق مرة فربما رایته قائماً یرمی عن قوسه و یرمی بالحجر حتی انحاذوا عنه. (دلائل النبوه ج زرقانی ج ۲ ص ۳۴)

ترجمہ: ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا۔ آپ کا قدم ایک بالشت بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ آپ دشمن کے سامنے بھی آتے رہے۔ آپ کی طرف آپ کے صحابہؓ آتے اور کبھی

وہ آپ سے دور بھی جا نکلتے۔ میں نے آپ کو اپنی کمان سے تیرے چلاتے بھی دیکھا اور آپ کو پتھر پھینکتے بھی دیکھا۔ یہاں تک کہ دشمن آپ کے آگے چلے جاتے۔“

صحیح بخاری سے پتہ چلتا ہے کہ احد کے دن آپ پر ایک ایسا موقعہ بھی آیا کہ آپ کے ساتھ صرف دو ساتھی ہی رہ گئے۔ یہ دو جان نثار کون تھے؟

حضرت طلحہؓ (۳۶ھ) اور حضرت سعد بن ابی وقاص (۵۵ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

عن ابی عثمانؓ قال لم یبق مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی بعض تلک الایام التی قاتل فیھن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم غیر طلحه و سعد. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۷)

ترجمہ: ”ابوعثمانؓ سے روایت ہے کہ ایام احد میں حضورؐ کے ساتھ ایک وقت حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ کے سوا کوئی نہ رہا تھا۔

کسی بدبخت نے اس دن یہ نہ کہا کہ دیکھو حضرت علیؓ بھی حضورؐ کے ساتھ نہ رہے (استغفر اللہ) یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت طلحہؓ لے گئے۔ ورنہ فضیلت میں حضرت علیؓ ان سے آگے تھے۔

قیس بن ابی حازم کہتے ہیں:

رایت ید طلحة التی وقیٰ بھا النبی صلی اللہ علیه وسلم قد شلت ۔ (ایضاً ج ۱ ص ۵۲۷)

ان دو (حضرت سعد اور حضرت طلحہ) میں بھی حضرت طلحہ اول نمبر رہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ جب غزوہ احد کا ذکر کرتے تو کہتے:

کان ذلک الیوم کله لطلحة.

(مسند ابی دائود الطیالسی . فتح الباری ج ۷ ص ۲۷۸)

ترجمہ: ”یہ سارا دن طلحہ کا ہی رہا (اس دن طلحہ سب سے آگے نکلے)“

اہل سنت حضرات اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت علیؓ کی کوئی منقصت نہیں سمجھتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے تو خود حضرت طلحہؓ کی شان میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے اور حضرت علیؓ مرتضی نے طلحہؓ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر اس سے برکت لی۔ انگلیاں کٹیں تو آپ کی زبان سے بلاساختہ آہ نکلی۔ ورنہ آپؓ حضرت عیسیٰ کے جلو میں اوپر آجاتے اور آسمان میں جا پہنچتے۔

لو قلت بسم اللّٰہ لرفعتک الملئکۃ والناس ینظرون الیک ...... حتی تلج بک فی جو السماء. (سنن نسائی ج ۲ ص ۵۹ والبیھقی ج)

ترجمہ: "اے طلحہ اگر تو حس کی بجائے بسم اللہ کہہ دیتا تو تجھے فرشتے اوپر اٹھا لیتے اور لوگ تجھے دیکھتے یہاں تک کہ تو فضائے آسمانی میں جا داخل ہوتا۔"

دیکھنے والے جسد کو دیکھتے ہیں یا روح کو؟ روح تو دیکھی نہیں جاتی۔ معلوم ہوا یہ رفع روحانی کا بیان نہیں رفع جسمانی کا ہے تبھی تو فرمایا کہ لوگ تجھے اوپر جاتے دیکھتے اس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم بھی جب اوپر اٹھائے گئے تو آپ کا یہ رفع جسمانی تھا اور یہ آپ کا جسد ہی تھا جسے کافروں سے بچاؤ کا آسمانی وعدہ دیا گیا تھا۔

حضرت سعدؓ کی منقبت اور فضیلت

حضرت سعد صحابہ میں سب سے بڑے تیرانداز تھے۔ احد کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکش کے سارے تیر ان کے آگے رکھ دیے اور انہیں فرمایا انہیں چلاؤ میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں یہ شرف اور کسی صحابی کو نہیں ملا کہ حضورؐ نے اپنے ماں اور باپ دونوں کو کسی کا فدیہ بنایا ہو اور ان کا کسی کے لیے اس مقدس پیرایہ میں ذکر کیا ہو۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ فرماتے ہیں:

ما سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یجمع ابویہ لاحد غیر سعد.

(صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۵۲۷ جلد دوم صفحہ ۵۸۱)

حضرت علیؓ مرتضیٰ اگر ذرا بھی حضرت سعدؓ سے چشمک رکھتے تو کبھی اس طرح ان کی برتری ذکر نہ فرماتے۔ یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت سعدؓ کو ان پر حاصل تھی۔ گو فضیلت میں حضرت علیؓ ان سے آگے تھے۔

(نوٹ) حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کے غالباً ذہن میں نہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عزت وتشریف حضرت زبیرؓ کو بھی دی ہے۔ حضرت زبیرؓ کہتے ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من یأت بنی قریظہ فیاتینی بخبرھم فانطلقت فلما رجعت جمع لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابویہ فقال فداک ابی وامی. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۷)

ترجمہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کون ہے جو بنی قریظہ میں جائے اور مجھے ان کے حالات سے مطلع کرے۔ میں گیا' میں جب واپس لوٹا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماں باپ کو جمع کے پیرائے میں میرے فدا کار بتایا۔"

(نوٹ) اس سے ضمناً یہ بھی پتہ چلا کہ حضورؐ کے والدین کریمین خدا کی خاص رحمت سے اسلام کی دولت پا گئے تھے۔ مومنین کا فدیہ مومن ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ کافر۔ یہ عزت کے کلمات کسی غیر مومن سے نہیں کہے جا سکتے۔ یہ لسان رسالت سے حضرت سعد کے اندر کے ایمان کی تصدیق ہے پھر جس طرح اس حدیث میں حضرت سعدؓ کے شرف کا بیان ہے اس میں خود حضور کے والدین کریمین کی بھی تکریم ہے۔ اس میں لسان رسالت سے ان کے مومن ہونے کا اشارہ نکلتا ہے۔ فافھم وتدبر۔

احد کے دن ایک وقت حضور کے گرد صرف سات فدائی کھڑے تھے

عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افرد یوم احد فی سبعۃ من الانصار ورجلین من قریش فلما رھقوہ قال من یردھم عنا ولہ الجنۃ اوھو رفیقی فی الجنۃ فتقدم رجل من الانصار فقاتل حتی قتل ثم رھقوہ ایضاً فلم یزل کذلک حتی قتل السبعۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لصاحبیہ ما انصفنا اصحابنا. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۷)

ترجمہ: "حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ احد کے دن ایک دفعہ حضور اکرمؐ سات انصار اور دو قریشیوں کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔ پس جب مشرکین نے آپ کو گھیر لیا تو آپ نے فرمایا جو شخص ان کو ہم سے دور کرے گا اسے جنت ملے گی یا فرمایا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ ایک انصاری بڑھا اور وہ ان سے لڑا۔ یہاں تک کہ وہ شہید ہو گیا۔ پھر انہوں نے آپ کو گھیرے میں لیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہاں تک کہ ساتوں انصاری شہید ہو گئے۔ آپ نے اس پر اپنے دو ساتھیوں سے فرمایا ہم نے اپنے انصار ساتھیوں سے انصاف نہیں کیا۔"

یہاں اصحاب کا لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں لغوی معنی میں ہے اس سے پتہ چلا کہ حضورؐ کبھی یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں بھی کہہ دیتے تھے جن لوگوں نے حضورؐ کے بعد بدعات اختیار کیں۔ وہ صرف حضورؐ کی امت کے لوگ ہوں گے وہاں اگر کہیں اصحابی کا لفظ ملے تو اسے اپنے اصطلاحی معنی پر محمول نہ کیا جائے گا اس روایت میں احد کے دن حضورؐ کے سات فدا کاروں کا ذکر ہے۔

اس قسم کی روایات پڑھتے یہ وسوسہ کسی کے ذہن میں نہ آنا چاہیے کہ ان فدا کاروں میں حضرت علیؓ کا نام کیوں نہیں ملتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین میں اس دن حضرت علیؓ مرتضیٰ کا نام اس لیے نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد ان کا علم حضرت علیؓ کے سپرد کیا تھا اور آپ اس وقت مصروف جہاد تھے اس

لیے یہاں نہ آ سکے۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۱)

اس سے پہلے کچھ وقت کے لیے آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ (سیرت النبی ج ا ص ۳۷۸)

اس حدیث میں حضور اکرمؐ نے اپنے جنگ احد کے محافظین کو رفیقی فی الجنۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔ حضورؐ نے یہ بشارت سنائی کہ جو ہم سے ان دشمنوں کو ہٹائے گا وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

پھر ایک مدت بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کا نام لے کر آپ کو رفیق فی الجنۃ کا اعزاز دیا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد پہرہ دینے والوں سے اور دشمنوں کو آپ سے ہٹانے والوں میں نہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لکل نبی رفیق و رفیقی فی الجنۃ عثمانؓ بن عفان. (رواہ ترمذی)

ترجمہ: ''ہر نبی کا (جنت میں) ایک رفیق ہوگا اور میرے ساتھی جنت میں عثمانؓ ہوں گے۔''

یہ مقام تو تبھی کسی مومن کو ملتا ہے کہ اس نے عمر بھر کبھی حضورؐ کی نافرمانی نہ کی ہو' نہ کبھی اس نے حضورؐ کو کوئی دھوکہ دیا ہو۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے آخری دنوں میں مجمع عام میں یہ دونوں باتیں کہیں اور اس مجمع میں کسی صحابی نے اس پر انکار نہ کیا جس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کے وفادار مصطفیٰ ہونے کے اس عظیم اعزاز پر پورے صحابہ کا اجماع تھا کہ آپ نے زندگی بھر حضورؐ کی کبھی نافرمانی نہ کی تھی اور احد کے دن آپ ارادۃً حضورؐ سے نہ...... تھے۔

حضورؐ کے کل محافظین چودہ رہتے' کبھی ان میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی تاہم مہاجرین اور انصار سب ایک دوسرے سے بڑھ کر حضور کے جاں نثار تھے۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم جنگ احد کے موقع کا طبقات ابن سعد میں دیا گیا خاکہ بھی ہدیہ قارئین کر دیں۔ سیرت نگاروں نے سات مہاجرین اور سات انصار کے اسماء گرامی یہاں ذکر کیے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین کرام			
	اسماء مہاجرین		اسماء انصار
(۱)	حضرت ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہ	(۱)	حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ
(۲)	حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ عنہ	(۲)	حضرت خباب بن المنذر رضی اللہ عنہ
(۳)	حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	(۳)	حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
(۴)	حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	(۴)	حضرت حارث بن ؟ رضی اللہ عنہ
(۵)	حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ	(۵)	حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ
(٦)	حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	(٦)	حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ
(۷)	حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	(۷)	حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ

یہ چند وضاحتیں بھی یہاں ملحوظ رہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام یہاں نہ ہونے پر ہم پہلے کچھ بحث کر آئے ہیں۔

۲۔ یہ چودہ حضرات اپنی اپنی ضرورت پر کہیں چلے بھی جاتے اور جلدی واپس آ جاتے۔

۳۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت میں بارہ محافظین اس دن حضورؐ کے ساتھ رہے۔

۴۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں اس دن حضورؐ کے گیارہ محافظین آپ کے ارد گرد رہے۔

۵۔ حضرت انسؓ کی روایت میں ایک موقع پر سات انصاری اور مہاجرین آپ کے گرد رہے۔

یہ سب کمی بیشی حالات اور ضرورات کے مطابق ہوتی رہی۔ ان حضرات کی جانثاری اور جاں سپاری میں کبھی کوئی غیر حاضری نہیں رہی۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بہ وقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

بعض اہل سیر نے ان گیارہ میں یہ نام بھی ذکر کیے ہیں۔ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ ' حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ' حضرت زبیر بن عوامؓ ' حضرت ابودجانہ اور حضرت طلحہؓ۔ (سیرت النبی ج ۲ ص ۳۷۸)

ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ میدان احد میں

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں' میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ وہ پانی کے مشکیزے اپنی کمر پر رکھ کر لاتیں اور زخمیوں کو پانی پلاتیں۔ آپ کہتے ہیں:

ولقد رایت عائشۃ بنت ابی بکر و ام سلیم وانھما لمشمرتان اری قدم سوقھما تنقز ان القرب علٰی متونھما تفرغانہ فی افواہ القوم ثم ترجعان فتملانھا ثم تجیئان فتفرغانہ فی افواہ القوم. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۳۸)

ترجمہ: ''اور میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا۔ دونوں اپنے دامن اٹھائے ہوئے پانی کے مشکیزے پشتوں پر اٹھائے ہوئے زخمی لوگوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ پھر چلی جاتی تھیں اور وہ مشکیزے بھرتیں اور پھر زخمیوں کو پلاتیں۔''

حضرت عمرؓ کہتے ہیں ام سلیطؓ (ایک انصاری عورت) بھی پانی اٹھا کر لاتی رہیں۔

قال عمرؓ فانها کانت تزفرلنا القرب یوم احد قال ابو عبد اللّٰہ تزفر تخیط.

(ایضاً ج ۱ ص ۴۰۳، ج ۲ ص ۵۸۲)

امام بخاریؒ کہتے ہیں تزفر کا معنیٰ سینے کا بھی ہیں تزفر تخیط جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مشکیں سیتی بھی تھیں حضرت معوذ کی بیٹی ربیع بھی کہتی ہیں۔

کنا نغزو مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فنسقی القوم ونخدمهم ونداوی الجرحیٰ نرد القتلیٰ الیٰ المدینة. (رواہ البخاری ج ۱ ص ۴۰۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احد کے دن زخمی ہوئے۔ حضرت سہل بن سعد (۹۱ھ) سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے کہا:

واللّٰہ انی لاعرف من کان یغسل جرح رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومن کان یسکب الماء و بما دووی (قال) کانت فاطمة بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تغسله وعلیٰ یسکب الماء بالمجن فلما رأت فاطمة ان الماء لا یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتها فالصقتها فاستمسک الدم.

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۴)

ترجمہ: ”بخدا میں جانتا ہوں کون حضورؐ کے زخم دھو رہا تھا اور کون پانی ڈال رہا تھا اور کس چیز سے آپ کا علاج کیا گیا۔ حضرت فاطمہؓ آپ کے زخم دھوتی تھیں اور حضرت علیؓ ڈھال سے پانی ڈالتے تھے۔ جب حضرت فاطمہؓ نے دیکھا کہ دھونے سے خون بند نہیں ہو رہا تو آپ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا اسے جلایا اور پھر اسے زخم پر لگایا۔ اس سے خون رک گیا۔“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ احد میں کیا حضرت ابوبکرؓ اور کیا حضرت علیؓ کیا حضرت عائشہ اور کیا حضرت فاطمہؓ یہ سب حضرات بلا کسی باہمی اختلاف اور امتیاز کے حضور کے گرد برابر وفا کا پہرہ دیتے رہے۔ اب باوجودیکہ مسلمان خلاف حکم درہ چھوڑنے والوں کی وجہ سے شکست کھا چکے تھے مگر پھر بھی مشرکین مکہ ان سے مرعوب تھے۔ مشرکین کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رعب ڈال رکھا تھا اور وہ فیصلہ کن مرحلہ میں آئے بغیر مکہ روانہ ہو گئے۔ پھر رستہ میں انہیں اپنی اس غلطی کا احساس ہوا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے دل میں یہ خطرہ ڈال دیا کہ ہوسکتا ہے وہ پھر لوٹیں۔ آپؐ نے صحابہ کو کہا کہ کون ہیں جوان کے پیچھے جائیں۔ انہیں معلوم ہو کہ اب مسلمان ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ آپ کی اس آواز پر ستر آدمیوں نے لبیک کہی۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیر تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے بھتیجے حضرت عروہ سے

بات کر رہی تھیں:

یا ابن اختی کان ابوک منهم الزبیر و ابوبکرؓ لما اصاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما اصاب یوم احد فانصرف عنه المشرکون خاف ان یرجعوا فقال من یذهب فی اثرهم فانتدب منهم سبعون رجلا, قال کان فیهم ابوبکرؓ والزبیر.

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۴)

ترجمہ: ”اے میرے بھانجے تیرا والد زبیر بھی ان میں سے تھا اور حضرت ابوبکر بھی۔ جب حضورؐ کو احد کے دن وہ تکلیف پہنچی۔ پھر مشرکین واپس چل دیے۔ حضورؐ کو اندیشہ گزرا کہ شاید کہ وہ پھر لوٹیں۔ آپؐ نے فرمایا کون ان کے پیچھے جاتے ہیں۔ سو حاضرینؓ سے ستر آدمی تیار ہوئے ان میں حضرت ابوبکرؓ تھے اور حضرت زبیرؓ بھی۔“

یہ دو بزرگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ تو سرفہرست رہے اور کون کون مشہور حضرات تھے جو حکم رسالت پر ان مشرکین کے تعاقب میں جانے کے لیے تیار ہوئے۔

حافظ شہاب الدین القسطلانی (۹۲۳ھ) لکھتے ہیں:

وعمرؓ و عثمانؓ و علی و عمار و طلحة و سعد بن ابی وقاص و ابو حذیفة و ابن مسعود و عبد الرحمٰن بن عوف.

عشرہ مبشرہ میں سے آٹھ ان ستر میں شامل تھے

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ اس وقت وہیں حلقہ رسول میں موجود تھے اور آپ کے حکم پر مکہ جانے والوں کے تعاقب کے لیے حاضر کھڑے تھے۔ اب آپ ہی سوچیں یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ آپ احد کے دن میدان سے چلے گئے تھے۔ اگر کہیں اس کے خلاف کوئی بات ملتی ہے تو وہ الزاما درجے کی ہوسکتی ہے کہ فرار بھی کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس دن اپنی جگہ چھوڑنے والوں کو معاف کر چکا۔ سو اس بات کو مطاعن میں لانا کسی طرح بھی درست نہیں ٹھہرتا۔

پھر یہ معرکہ بھی مسلمانوں کا کوئی آخری معرکہ تو نہیں تھا۔ آخری معرکہ جس میں آپؐ خود تشریف لے گئے' معرکہ تبوک تھا۔ اس میں تو حضرت عثمانؓ اس درجہ آگے نکلے کہ کوئی آپ کا ہمسر نہ رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں وہ اعلان فرمایا کہ اس کے بعد وہ شاید ہی حضرت عثمانؓ کے سوا اس امت میں کسی کا نصیب رہا ہو۔

آخری جہاد میں حضرت عثمانؓ کی آفاقی سبقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو اسلامی جنگیں لڑی گئیں ان میں آخری معرکہ تبوک کا تھا۔ یہ وہ جنگ

ہے جس میں سب صحابہ کرام ماسوائے حضرت علیؓ کے اللہ کی راہ میں نکلے۔ آپ حضورؐ کے حکم سے پیچھے رکے لیکن تین صحابی کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع بغیر حضور کے اذن کے پیچھے رہے۔ قرآن کریم میں ان تین کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

وعلى الثلثة الذين خلفوا حتّٰى اذا ضاقت عليهم الارض بما رحبت وضاقت عليهم انفسهم وظنوا الا ملجأ من الله الّا اليه ثم تاب عليهم ليتوبوا. ان الله هو التوّاب الرحيم. (پ ۱۱ التوبہ ۱۱۸)

ترجمہ: ”اور ان تینوں شخصوں پر جو پیچھے چھوڑے گئے یہاں تک کہ ان پر زمین اپنی پوری کشادگی کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان پر ان کی جانیں بھی تنگ ہوگئیں اور وہ سمجھے کے اب کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف۔ پھر مہربان ہوا اللہ ان پر تا کہ وہ پھر آئیں، بے شک وہ ہے مہربان رحم کرنے والا۔“

ان تین کے معاملے کی بڑی تفصیل ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ یہاں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ پر یہ گھڑی بہت بڑی مشکل کی گھڑی تھی۔ تاریخ اسلام میں اس لشکر اسلام کو جیش العسرۃ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس آخری معرکہ اسلام میں حضرت عثمانؓ اس طرح نمایاں رہے کہ پہلے کی کوئی بات جو غلط یا صحیح آپ کی طرف منسوب ہو، آپ کی یہ آخری پوزیشن ان سب باتوں کو دھوگئی۔ احد کے دن درہ چھوڑنے والے بھی سب اسی رحمت خداوندی کے سایہ میں آگئے۔ یہاں توبہ کا لفظ قابل غور ہے۔

لقد تاب الله على النبىّ والمهاجرين والانصار الذين اتبعوه فى ساعة العسرة. (التوبہ)

اس میں ان صحابہ کرام کی دلجوئی اس طرح کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے نبی مکرم کو بھی ذکر کیا کہ سب آخر اسی چاند کا ہالہ ہی تو تھے۔

دست نبوت نے اس طرح حضرت عثمانؓ کو جرأت و ہمت بخشی کہ جنگ تبوک میں آپ سب پر سبقت لے گئے۔ ایسی مشکل گھڑی شاید مسلمانوں پر پہلے کبھی نہ آئی ہو۔ قرآن کریم میں اس کا پورا ذکر موجود ہے:

لقد تاب الله على النبى والمهاجرين والانصار الذين اتبعوه فى ساعة العسرة من بعد ما كاد يزيغ قلوب فريق منهم ثم تاب الله عليهم. انه بهم رؤف رحيم.

(پ ۱۱ التوبہ ۱۱۷)

اس مشکل کی گھڑی سے مراد غزوہ تبوک کا زمانہ ہے جس میں کئی طرح کی مشکلات ان کے لیے جمع تھیں (۱)

سخت گرمی (۲) طویل مسافت (۳) کھجور کا موسم (۴) عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی (۵) پھر ظاہری بے سرو سامانی کہ ایک ایک کھجور روزانہ دو دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی۔

سميت جيش العسرة لانها كانت فى زمان اشتداد الحر، والقحط و قلة الزاد والماء والمركب بحيث تعسر عليهم الخروج من بعد ما كاد يزيغ قلوب فريق منهم. (مرقات)

ترجمہ: ”اس کا نام جیش العسرہ (مشکلات میں گھرا لشکر) اس لیے رکھا گیا کہ اس وقت گرمی بہت تیز تھی، قحط کا دور تھا، کھانے پینے اور سواری کی بہت کمی تھی، اس طرح کہ ان کا اس وقت جنگ کے لیے نکلنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ ان میں کچھ لوگوں کے دل بھی راہ سے بھٹک جائیں۔“

کس قدر پرنور اور پاک وہ سماں تھا جب اللہ کا پیغمبر صحابہؓ کو اس کار خیر میں مدد کی آواز دے رہا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن خبابؓ کہتے ہیں کہ میں اس وقت حضورؐ کے پاس تھا۔ جب حضرت عثمانؓ یہ گوئے سبقت لے گئے، آپ کہتے ہیں:

شهدت النبى صلى الله عليه وسلم وهو يحث على جيش العسرة فقام عثمانؓ فقال يا رسول الله على مائة بعير باحلاسها واقتابها فى سبيل الله ثم حضّ على الجيش فقام عثمانؓ فقال يا رسول الله على مأتا بعير باحلاسها واقتابها فى سبيل الله ثم حض على الجيش فقام عثمانؓ فقال علىّ ثلثمائة بعير باحلاسها واقتابها فى سبيل الله فانا رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل عن المنبر وهو يقول: ما علىٰ عثمانؓ ما عمل بعد هذه ما علىٰ عثمانؓ ما عمل بعد هذه.

(جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۱۱)

ترجمہ: ”میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود تھا اور آپ اس جیش عسرہ کی تیاری کی ترتیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ اٹھے اور انہوں نے کہا حضور! میرے ذمہ اللہ کی راہ میں سو اونٹ مع اپنے ساز و سامان کے۔ پھر حضورؐ نے اس لشکر کی تیاری کی اور آواز لگائی۔ پھر حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور کہا میرے ذمہ اللہ کی راہ میں دو سو اونٹ مع اپنے ساز و سامان کے۔ حضورؐ نے جیش عسرہ کی تیاری کے لیے ایک اور آواز لگائی پھر حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور کہا میرے ذمہ اللہ کی راہ میں تین سو اونٹ اپنے ساز و سامان کے ساتھ۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ اپنے منبر

سے اترے اور آپؐ نے فرمایا: عثمانؓ پر اب کوئی بار نہیں۔ وہ جو بھی اس کے بعد کر پائے عثمانؓ پر کوئی گرفت نہیں۔ اس عظیم نیکی کے بعد وہ جو بھی کرے (اس کا نیکیوں کا پلہ ہی بھاری رہے گا)۔"

اس مشکل گھڑی میں پورے لشکر اسلام کی تیاری کس کے مال سے ہوئی؟ حضرت عثمانؓ کے مال سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بلکہ خود حضورؐ پر اس دن خوشی کی لہریں کس کے مال سے چلیں؟ حضرت عثمانؓ کے مال سے۔ اور حضورؐ نے کس کی اس نیکی کو اس کی آئندہ کی سب تقصیرات (اگر وہ ہوں بھی) کا کفارہ قرار دیا۔ پچھلے گناہ تو معاف ہوتے ہی ہیں۔ یہ سب اگلی تقصیرات کے اترنے کی بشارت کس کو دی جا رہی ہے؟ حضرت عثمانؓ کو۔ حضرت عثمانؓ نے خود اپنے محاصرے کے وقت بھی اپنی ان خدمات کو اور حضورؐ کی اس بشارت عظمیٰ کو دہرایا اور سب حاضرین کے لیے سوائے اقرار کے چارہ نہ تھا۔ آپ نے کہا:

انشدکم باللّٰہ والاسلام ھل تعلمون انی جھزت جیش العسرۃ من مالی (قالوا اللھم نعم) (سنن نسائی ج ۲ ص ۶۵ والترمذی ج ۲ ص ۲۱۱)

ترجمہ: "میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں' کیا تم جانتے ہو کہ اس تنگی کے لشکر کی تیاری کیا میں نے اپنے مال سے نہ کی تھی؟ سب نے کہا ہاں۔

سو اب اگر کہا جائے کہ اس دن اسلام کے آخری معرکہ میں جس میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ سب صحابہ پر آفاقی سبقت لے گئے۔ حضورؐ نے ان کو جو آئندہ کی بشارت دی وہ یقیناً اللہ کے اذن سے تھی سو اس دن خدا بھی پوری صف صحابہ میں سب سے زیادہ حضرت عثمانؓ پر مہربان تھا۔ اس دن حضرت علیؓ بھی اگر جنگ تبوک میں نکلے ہوتے تو وہ بھی حضورؐ ہی کے پیرایہ میں حضرت عثمانؓ پر خوش ہوتے کہ آج اس آخری لشکر اسلام کے دولہا حضرت عثمانؓ ہی رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اس مصری نے جو حضرت عثمانؓ سے شدید تعصب رکھتا تھا' حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر حضرت عثمانؓ کے بارے میں تین سوال کیے تو اسے بدر' احد اور حدیبیہ کے بعد جنگ تبوک پر سوال تک کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح حضرت عثمانؓ پر خوشی کا اظہار فرمایا کہ آپ میں جذبہ جہاد کی چنگاری اس طرح روشن ہوئی کہ آپ اپنے دور خلافت میں برابر جہادی لشکر بھیجتے رہے اور ۸۰ سال کے بڑھاپے میں بھی شوق جہاد کا خون آپ کی رگوں میں جوانوں کی طرح دوڑتا رہا۔ جب فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ جیسا بہادر بھی افریقہ کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کر رہا تھا' حضرت عثمانؓ نے دوسرا سپہ سالار بھیج کر افریقہ کو اسلام کی عزت بخشی اور چند گھنٹوں میں ہی ایک سعادت مند فوجی اپنے سپہ سالار کے پاس جو حضرت عثمانؓ کا رشتہ دار بھی تھا شاہ افریقہ کا سر لے کر آ گیا۔

حضرت عثمانؓ کی اپنے دور خلافت میں جہادی مہمات

۱۔ لیبیا کی فتح:

فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ نے مصر پر پورا تسلط پانے کے بعد طرابلس کو فتح کیا۔ مصر کی فتح حضرت عمرؓ کے دور میں ہوئی تھی لیکن لیبیا کی فتح حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور میں ہوئی۔

۲۔ ٹیونس کی فتح

حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن ابی سرح کو ۲۷ھ میں ٹیونس کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ آپ طرابلس کے رستے ٹیونس کی طرف بڑھے۔ یہاں ایک لاکھ بیس ہزار رومی فوج موجود تھی۔ لشکر اسلام میں (۱) شباب اہل الجنۃ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور (۲) یہ چار عظیم عبداللہ بھی شامل تھے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۷۳ھ)　　(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو (۶۳ھ)

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیر (۷۳ھ)　　(۴) حضرت عبداللہ بن جعفر (۸۰ھ)

رومی کمانڈر گرے گوری حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔ مسلمانوں کو عظیم فتح ہوئی اور ایک ایک سوار کو تین تین ہزار اور پیادہ سپاہیوں کو ایک ایک ہزار دینار ملے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زیر سایہ یہ خدمات بتلاتی ہیں کہ اس وقت تک ان حضرات کی آسمانی امامت کا کہیں تصور تک نہ تھا۔ حضرات حسنین کریمین حضرت عثمانؓ کی قیادت میں برابر فوجی مہمات سرانجام دے رہے تھے۔

۳۔ الجزائر کی فتح:

حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اب مسلمانوں کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن ابی سرح الجزائر کو فتح کر کے جبل طارق تک جا پہنچے۔ یہ مراکش کا آخری سرا ہے۔ اب مسلمان مراکش تک جا پہنچے تھے۔

۴۔ اندلس کی فتح:

حضرت عثمانؓ نے دو عبداللہ اندلس کی طرف روانہ کیے۔ اس سے مسلمانوں کے لیے سپین کا دروازہ کھل گیا۔ یہ سپہ سالار یہ تھے:

(۱) حضرت عبداللہ بن نافع بن الحصین رضی اللہ عنہ

(۲) حضرت عبداللہ بن نافع بن عبدالقیس رضی اللہ عنہ

علامہ اقبال نے اس وقت کی عظیم یاد تازہ کی ہے اور حضرت عثمانؓ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

اندلس کی وادیوں میں گونجی اذان ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

۵۔ قبرص کی فتح:

بحیرہ روم کا بیڑا ان کے بحری مرکز قبرص Cyprus میں تھا۔ شام کے ساحل کے قریب ہونے کی وجہ سے رومیوں کا یہ بحری بیڑہ مسلمانوں کے لیے ہر وقت کا ایک عظیم خطرہ تھا۔ اس وقت شام کے گورنر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے لیے بحری جنگوں کی تربیت کی ضرورت محسوس کی۔ حضرت عمرؓ نے انہیں اس وقت کے حالات میں قبرص کی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔

حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حضرت امیر معاویہؓ نے پھر ایک تفصیلی خط لکھا اور آپؓ نے انہیں اجازت دے دی۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ کی رگوں میں شوق جہاد عظیم پیرایہ میں موجزن تھا۔ اور اگرچہ اس بحری مہم میں زیادہ خراج تحسین حضرت معاویہؓ کو جاتا ہے لیکن جب تک یہ عزائم خلافت کے زیر سایہ نہ اٹھیں۔ اس وقت تک امیر معاویہؓ بھی کسی طرح پیش قدمی نہ کر سکتے تھے۔ آپ دل و دماغ کی پوری قوتوں سے اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کا ایک وفادار سپاہی سمجھتے تھے۔ تاہم اس سے کوئی دانشور انکار نہیں کر سکتا کہ قبرص کی فتح حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ہی ظہور میں آئی اور اس کا سہرا حضرت عثمانؓ کے سر ہی رہا۔ اس عمرؓ میں اس عزم و ہمت پر وقت کے سب سپہ سالار حیران تھے۔

۶۔ جزیرہ ارواڈ کی فتح:

یہ قسطنطنیہ کے قریب بحر روم میں ایک جزیرہ ہے اس کی فتح میں بھی زیادہ توجہ حضرت معاویہؓ کی کارفرما رہی۔

۷۔ سسلی کا جنگی معرکہ:

اس جزیرے کی عہد قدیم میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ اس میں یونانیوں' رومیوں اور فنیقیوں کی عظیم جنگی مہمات ہوتی رہی ہیں۔ یہاں پہلی جنگی کارروائی حضرت عثمانؓ کے حکم سے ہوئی اور اس پر پورا قبضہ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں ہوا۔ آپ نے اسے تین سو بحری کشتیوں سے فتح کیا۔ آپ اس طرف حضرت عثمانؓ کے تین سو اونٹوں کی گنتی سے تین سو کشتیوں سے چلے اور اس وقت مسلمانوں کا اس طرف رخ کرنا ان کے لیے ایک سنگ میل بن گیا اور اس سے ان کے لیے آئندہ فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ رافضیوں کو اصل غم اس بات کا ہے کہ مسلم فاتحین اپنے شوق جہاد میں بر و بحر میں کیوں دوڑے اور انہوں نے اسلام کے نام پر یہ عظیم کارنامے کیوں سر انجام دیے۔ اس کے برعکس انہوں نے دل کی

بھڑاس نکالنے کے لیے ان واقعات کے خلاف اپنے پیروؤں کو تلقین کی کہ یہ حضرات ان جنگی فتوحات میں حق پر نہ تھے اور پھر اس کے برعکس یہ لوگ اپنی امام بارگاہوں میں انہیں بھگوڑے بھگوڑے کہہ کر امت مسلمہ کا سینہ چیرتے رہے۔ ڈھکو رافضی نے بھی خلفاء ثلثہ کے جنگوں سے نہ ڈرنے کا اس طرح کھلے بندوں اعتراف کیا ہے:

''ان حضرات نے جو ملکی فتوحات کیں یہ (۱) حدود مملکت کی توسیع (۲) ہوس اقتدار کو پورا کرنے کے لیے اور (۳) دونوں ہاتھوں سے مال و دولت سمیٹنے کے جذبہ کے ماتحت تھیں جن کے لیے ثلثہ کی زندگیاں وقف تھیں۔ اے کاش یہ لوگ ملکی فتوحات نہ کرتے۔'' (تجلیات ص ۱۰۲)

خدا کا شکر ہے کہ رافضی نے اتنا تو مان لیا کہ یہ لوگ جنگی کارروائیوں سے ڈرنے والے نہ تھے۔ حدود سلطنت کے معرکوں کے لیے ان کی زندگیاں وقف تھیں۔ اب یہ بات ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ ان لوگوں کا اپنی امام بارگاہوں میں بیٹھ کر ان خلفاء اسلام کو بھگوڑے بھگوڑے کہنا صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہے۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ شاید اس رافضی کو پتہ نہیں کہ چاند کی طرف منہ کر کے تھوکنے والا خود اپنے ہی منحوس چہرے کو تھوک آلود کرتا ہے۔

اس پر ہم ان کے حضرت عثمانؓ کے خلاف کیے گئے اعتراضات کی بحث ختم کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کی ایک عام بات کہتے ہیں کہ صحابہؓ میں کسی کا کمال کسی دوسرے صحابی کے لیے کبھی وجہ ملال نہیں رہا۔

صحابہؓ میں کسی کا کمال کسی دوسرے صحابی کے لیے کبھی موجب حسد نہیں رہا

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے سب صحابہؓ کو عمل کے ستارے بنایا ہے۔ جس طرح ستارے کی روشنی اپنی اپنی ہوتی ہے، صحابہ کے کمالات بھی اپنے اپنے تھے اور وہ سب قمر رسالت کا ہالہ بنے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی صلاحیتوں کو سمجھتے تھے اور جہاں جہاں کسی کو مناسب سمجھتے اسے اس کام پر لگا دیتے۔ ہجرت کی رات آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیا اور حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلایا۔ کون کس جگہ کے مناسب ہے' یہ فیصلہ آپ کی نظر کرتی تھی۔ جو لوگ جرنیل کی قیادت کے لیے تھے انہیں یہ فرض سونپا جاتا کہ فوج کو لڑانا کس طرح ہے' لڑانے والے جانباز ایک اپنا امتیاز رکھتے تھے۔ سب مل جل کر احکام بجالاتے اور کسی کا کمال کسی دوسرے کے لیے کبھی کوئی سبب ملال نہ بنتا تھا۔

جنگ احد کے مشورے میں حضورؐ کے ساتھ حجرہ میں کون گئے؟

جنگ کہاں لڑی جائے' مدینہ کے اندر یا باہر۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اس میں آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی تھے۔ بڑے کاموں میں حضورؐ ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اب یہاں کسی صحابیؓ نے شکایت نہ کی کہ ہمیں بھی ساتھ لیا جائے۔ نہ حضرت عثمانؓ نے' نہ حضرت علیؓ نے۔ نہ حضرت طلحہؓ نے۔ حضورؐ کے

اس موقع پر ابو بکرؓ و عمرؓ کو ساتھ رکھنے پر کسی کو کوئی ناگواری نہ ہوئی۔

معرکہ احد میں کس طرح صف بندی کی گئی

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

''آنحضرتؐ نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی' حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا۔ حضرت زبیر بن العوامؓ رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف سے احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے نہ آئے۔ اس لیے پچاس تیز اندازوں کا ایک دستہ وہاں متعین فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔''

(سیرت النبی ج ۱ ص ۳۷۳)

یہ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں:

''شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا۔ ہر طرف پہرے بٹھا دیے گئے۔ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے' اسید بن حضیرؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ شہر کے اطراف و جوانب میں بھی پہرے بٹھلا دیے گئے۔'' (طبقات ابن سعد ۲ ص ۲۵)

ان میں اگر حضرت علیؓ کہیں دکھائی نہیں دیے تو یہ ہرگز ان کے لیے کوئی وجہ منقصت نہیں۔ آپ میدان جنگ کے ایک جانباز سپاہی تھے' اگر آپ کو کہیں قیادت نہ دی گئی تو یہ آپ کے لیے کوئی وجہ عیب نہیں۔ عام جنگ میں حضرت حمزہؓ' حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ نے کیا صفوں کی صفیں نہ چیریں۔ ہر صحابی اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں پورا وفادار تھا۔

آج تلوار کا حق کون ادا کرتا ہے؟

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا! کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟ اس سعادت کے لیے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہؓ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھے اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے (جب یہ دشمن کے مقابلے میں ہو)۔''

حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشیں گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی۔ (یہ قائد قریش ابوسفیان کی بیوی تھی) آپ نے یہ تلوار اس کے سر پر رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کی شان کے خلاف ہے کہ عورت پر آزمائی جائے۔ حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے جس طرف بڑھتے تھے صفوں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں اسباع غبشانی سامنے آ گیا' پکارے کہ او ختانۃ النساء کے بچے کہاں جاتا ہے۔ یہ کہہ کر تلوار ماری اور وہ خاک پر ڈھیر تھا۔'' (ایضاً ص ۳۷۶)

آپ اہل سنت میں کسی کو یہ کہتے نہ سنیں گے کہ اس معرکہ میں ابو دجانہؓ حضرت علیؓ پر سبقت لے گئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کسی صحابی کا کوئی کمال اور اس کی کوئی سبقت دوسرے کسی صحابی کے لیے ہرگز کوئی وجہ ملال نہیں رہی ہے۔ اسلام کی کھیتی کو سب برابر پانی دیتے جا رہے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ فوج کو لڑانے میں اور صف بندی کرنے میں ایک بے مثال جرنیل تھے اور حضرت علیؓ مرتضیٰؓ ایک جانباز سپاہی کی حیثیت میں اور دشمنوں پر لوٹ لوٹ کر حملہ کرنے میں حیدر کرار تھے۔ اور یہ وہ وصف ہے کہ آپ کے سوا اور کسی دوسرے جوان میں شاید ہی دیکھا گیا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ جنگ بدر میں حضور کے ساتھ بیٹھے رہے

بدر کی تمام مورچہ بندی حضورؐ نے کی تھی اور اس دن آپؐ نے ہی مومنین کو ان کے مختلف مورچوں میں بٹھایا تھا۔

قرآن کریم میں ہے:

واذ غدوت من اهلک تبوئ المؤمنين مقاعد للقتال والله سميع عليم.

(پ ۴ آل عمران ۱۲۱)

ترجمہ: ''اور صبح کو جب آپ اپنے گھر سے نکلے مومنین کو لڑائی کے ٹھکانوں پر بٹھلانے' اور اللہ تعالیٰ سب سنتے اور جانتے ہیں۔''

اس آیت میں جنگ بدر کے ۳۱۳ مسلم فوجیوں کے مومن ہونے کی آسمانی خبر واضح طور پر موجود ہے۔ نہ ماننے کی ضد کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کہاں بیٹھے؟ عریش بدر پر ہو۔ تا کہ پورے معرکے پر نظر رہے۔ نائب رسول بھی وہاں بیٹھا سارے معرکہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جنگ احد کہاں لڑی جائے' اس کا فیصلہ کرتے وقت بھی آپؓ حضورؐ کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

رافضی کو اس پر اعتراض ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنے ساتھ وہاں کیوں بٹھا رکھا تھا؟ وہ لکھتا ہے:

''ہاں جناب ابوبکرؓ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ وہ عریش پر آنجناب کے ساتھ بیٹھے ہوئے دور سے جنگ کا نظارہ کررہے تھے۔'' (تجلیات ص ۴۸)

سربراہان سلطنت نائب کو ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ حضورؐ کی شروع سے نظر تھی کہ شاید آپ ہی آپ کے بعد آپ کے جانشین بنیں۔

دیکھئے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت میں رافضی نے وہ جہت اعتراض اختیار کی ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ پر ہی نہیں اس کا اعتراض حضورؐ پر بھی برابر لوٹتا ہے۔ کیا پورے میدان جنگ کی نگرانی کرنا جنگ میں شرکت نہیں سمجھا جاتا اور کیا اہم مواقع پر والی سلطنت کے ساتھ ولی عہد نہیں بیٹھتا۔ سو آپ کا وہاں بیٹھنا حضورؐ کی ہی ایک نظر کرم تھی اور پوری امت کے لیے ایک نشان دہی تھی کہ حضورؐ کی نظر میں حضرت ابوبکرؓ کا کیا مقام ہے۔

صرف تلوار چلانا ہی جہاد نہیں تلوار بنانا بھی جہاد ہے

اسلحہ کا استعمال ہی جہاد نہیں اسلحہ کی فیکٹریاں بنانا اور ہتھیاروں کو میدان جنگ میں لانا بھی جہاد ہے۔ فوج ہی مجاہدین نہیں جرنیل اور سپہ سالار بھی مجاہدین میں آتے ہیں۔ جو قاعدین (بیٹھ رہنے والوں) میں نہیں وہ اپنے اپنے درجے میں سب مجاہدین میں سے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ مورچہ بندی کرنے میں زیادہ ممتاز رہے تو حضرت طلحہؓ اور حضرت علیؓ جانبازی میں اپنے مقام میں سبقت لے گئے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰہ تعالیٰ یدخل بالسہم الواحد ثلثہ نفر الجنۃ (۱) صانعہ یحتسب فی صنعتہ الخیر (۲) والرامی بہ (۳) ومنبلّہ . (مشکوۃ ص ۳۳۷)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کے سبب تین تین افراد کو جنت میں جگہ دیں گے۔ بنانے والے کو' چلانے والے کو اور پکڑانے والے کو۔''

یہ تینوں تو تیر چلانے والے نہیں لیکن جہاد میں تینوں حصہ لے رہے ہیں۔

زید بن خالد الجہنی کہتے ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من جہز غازیا فی سبیل اللّٰہ فقد غزیٰ و من خلف غازیاً فی اہلہ فقد غزیٰ.

(ترمذی ج ۱ ص ۱۹۶)

ترجمہ: ''جس نے اللہ کی راہ میں ایک غازی کی تیاری کرادی اس نے خود غزوہ میں حصہ لیا اور جس نے اپنے گھر میں ایک غازی چھوڑا اس نے بھی گویا خود غزوہ میں حصہ لیا۔''

ان احادیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو جتنا مال حضرت عثمانؓ کا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے میں لگا تو شاید ہی کوئی دوسرا صحابیؓ حضرت عثمانؓ کے مجاہد ہونے میں ان کا ہمسر ہو سکے۔ اس جزوی فضیلت میں بے شک حضرت عثمانؓ ایک آفاقی سبقت پا گئے اور آپ کی خلافت میں بھی مسلمان اس قدر جہاد میں آگے بڑھے کہ افریقہ تک جا پہنچے۔

جنگ احد میں کیا حضرت علیؓ ہر لمحہ حضورؐ کے ساتھ رہے؟

امام رازیؒ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو ان سات مہاجرین میں ذکر کیا ہے جو ہمہ تن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین میں رہے۔ آپ لکھتے ہیں:

واما الذین ثبتوا مع الرّسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم فکانوا اربعۃ عشر رجلاً سبعۃ من المہاجرین و سبعۃ من الانصار فمن المہاجرین ابوبکرؓ و علی و عبد الرحمٰن بن عوف و سعد بن ابی وقاص و طلحۃ بن عبید اللّٰہ و ابو عبیدہ بن الجراح و الزبیر بن العوام. (ج ۹ ص ۴۲)

ترجمہ: ''جو لوگ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ وہ چودہ تھے۔ سات مہاجرین میں سے اور سات انصار میں سے۔ مہاجرین میں سے یہ سات حضرات عشرہ مبشرہ کے بھی ممتاز افراد تھے۔''

یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت مصعب بن عمیر شہید ہوئے تو حضورؐ نے ان کا پرچم حضرت علیؓ کے سپرد کیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲) سو اب اگر یہ حضورؐ کے ساتھ کھڑے دکھائی نہیں دیتے تو اس کی یہ وجہ تھی کہ آپ ایک دوسرے مورچہ پر مصروف جہاد تھے۔

بعض ارباب سیر نے آنحضرتؐ کے محافظین میں مہاجرین کے یہ سات نام دیے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق' حضرت عمرؓ بن الخطاب' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت ابوعبیدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اور یہ بھی لکھا ہے:

''حضرت علیؓ کا نام اس لیے یہاں نہیں ملتا کہ مصعب بن عمیر کے شہید ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حضرت علیؓ کو عطا فرمایا تھا اور آپ مصروف جہاد وقتال تھے۔'' (ایضاً ص ۱۹۹)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

''حضرت علیؓ مرتضیٰؓ سے مروی ہے کہ جب کفار نے مسلمانوں پر غلبہ کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم میری نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میں نے آپ کو مقتولوں اور شہیدوں میں جا کر تلاش کیا مگر آپ نظر نہ آئے تو میں نے اپنے آپ سے کہا ممکن ہے حق تعالیٰ نے ہمارے فعل کی بناء پر ہم پر غضب فرمایا ہو اور اپنے نبی کو آسمان پر اٹھا لیا ہو۔" (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۱۰ اردو ترجمہ)

حضرت علیؓ کا جنگ احد کے دن کونسا فعل ہو سکتا ہے جس کے بارے میں آپ کو خدشہ ہوا کہ حق تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ احد کے دن جب سب صحابہ اپنی جگہ سے ہل گئے تو یہ ایک پوری امت کا فعل ہے جو اس دن افراتفری میں مسلمانوں سے وقوع میں آیا۔ ممکن ہے حضرت علیؓ یہاں اپنا فعل نہ بیان کر رہے ہوں تاہم یہ ضرور ہے کہ حضرت علیؓ مرتضیٰؓ پر بھی اس دن ایک ایسا وقت آیا کہ حضورؐ ان کی آنکھوں سے اوجھل رہے۔

رافضی نے یہاں ایک وضعی روایت کا سہارا لیا ہے کہ حضرت علیؓ اس دن اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ نہیں ملے۔ اس نے وہ یہ روایت لکھی ہے۔ ہم اسے رافضی کے اپنے الفاظ میں بھی پیش کرتے ہیں۔

"مدارج النبوۃ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تو چرا بہ برادران ملحق نہ گشتی، تم اپنے بھاگنے والے بھائیوں میں کیوں شامل نہ ہوئے؟ آنجناب نے عرض کیا لا کفر بعد ایمان ایمان کے بعد کفر نہیں۔ جبریل نے زمین پر اتر کر علی کی ہمدردی اور جانثاری کی یوں داد دی کہ یا رسول اللہ هذه المواساة یہ ہمدردی و ایثار ہے۔" (تجلیات صداقت ۴۹)

اس سے رافضی نے یہ استدلال کیا ہے کہ علیؓ اس دن دوسرے صحابہؓ کی طرح حضورؐ سے لحہ بھر کے لیے بھی جدا نہ ہوئے تھے۔ رافضی نے یہ روایت مدارج النبوۃ کے حوالے سے بڑے طمطراق سے نقل کی ہے لیکن افسوس کہ اس نے اگلے صفحہ سے یہ بات ساتھ نقل نہیں کی کہ یہ وضعی روایت ہے، جو کسی طرح لائق قبول نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"امام ذھبی جو فن اسماء الرجال کے امام ہیں وہ میزان الاعتدال میں اس کی تضعیف و تکذیب کرتے ہیں۔" (مدارج النبوہ ج ۲ ص ۲۱۲ اردو ترجمہ)

اس سے قارئین کرام خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ رافضی جعلی روایات لانے میں کس درجہ دلیر واقع ہوا۔ اگلے ہی صفحہ یا سطر میں تردید ہوتی ہے اور یہ آدمی بات نقل کرتے کچھ علمی شرم محسوس نہیں کرتا۔

علمی طور پر بھی یہ جواب حضرت علیؓ کا نہیں ہو سکتا

سیدنا حضرت علیؓ مرتضیٰؓ اہل سنت عقیدہ رکھتے تھے، خارجی نہ تھے۔ اور یہ جواب خارجی عقیدے کے مطابق ہے۔ اہل سنت عقیدے کے مطابق بڑے سے بڑا گناہ بھی (ماسوائے شرک اکبر کے) کفر نہیں۔ اس سے ایمان کی نفی نہیں

ہوتی۔ اس جواب میں احد کے دن اپنی جگہ چھوڑنے کو گناہ نہیں کفر بتلایا گیا ہے۔ ہم اہل سنت کیسے مان لیں کہ یہ غلط جواب حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے دیا ہوگا۔ اب تک تو کوئی اثنا عشری مجتہد اس پر کوئی سند متصل پیش نہیں کر سکا۔ سوا سے کسی قیمت پر بھی عقیدے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اہل سنت خارجیوں کا کسی قیمت پر ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اثنا عشری ڈھکو اندر سے خارجی ہو ہم اس پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

پھر ذرا اس سوال پر بھی غور کریں تو چرا بہ برادراں ملحق نگشتی (تو اپنے بھائیوں سے کیوں نہ آملا) حضورؐ نے ان سب کو حضرت علیؓ کا بھائی بتایا ہے۔ اب غور کیجئے، آپؐ حضرت علیؓ کو بھاگنے والوں کا بھائی کیسے کہہ سکتے تھے اور اگر اسلامی اخوت مراد ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھاگنے والے اتنی بڑی خطا کے باوجود اب بھی دائرہ اخوت میں ہی رہے ہیں، دائرہ کفر میں نہ گئے تھے۔ پھر حضرت علیؓ کا جواب لا کفر بعد ایمان کیا خود اس سوال کی تردید نہیں؟ کہ پہلے وہ یقیناً ایمان پر تھے۔ کچھ تو ہوش کے ناخن لیجئے۔

اور اگر اس سے برادری کی اخوت مراد تھی تو حضرت علیؓ قریش میں سے تھے اور قریش مکہ آپ کی برادری کے تھے۔ اس صورت میں سوال کا مطلب یہ ہوگا کہ اے علیؓ جب تو نے مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو تو اپنے بھائیوں (قریش مکہ) سے کیوں نہ جا ملا؟ اس صورت میں آپ کا جواب درست ٹھہرتا ہے کہ میں ایمان لانے کے بعد اب کفر میں کیوں جا ملوں۔ اس پر پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ تو حضرت علیؓ کی استقامت علی الاسلام ہے اسے حضرت جبریل نے هذه مواساة (یہ ہمدردی ہے) کیسے کہہ دیا۔ جبریل سے اس علمی غلطی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ قرآن پاک میں فرشتوں کے بارے میں صاف آتا ہے لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون (التحریم)

پھر رافضی اسے ایثار بھی کہہ رہا ہے۔ ایثار (دوسرے کو اپنے پر ترجیح دینے کو کہتے ہیں) یہ باب احسان سے ہے۔ حضرت علیؓ اس دن اگر حضورؐ کے ساتھ رہے تو کیا آپ حضورؐ پر احسان کر رہے تھے یا حضورؐ کی خدمت کے لیے کھڑے تھے؟ اور اگر احسان ہی جتلا رہے تھے تو کیا آپ کو اس وقت یہ آیت یاد نہ تھی۔

قل لا تمنوا علیّ اسلامکم بل اللہ یمنّ علیکم ان ھداکم للایمان.

ترجمہ: "آپ ان سے کہہ دیں کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ جتلاؤ۔ یہ خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں اسلام کی راہ پر لگایا۔"

الحاصل رافضی نے یہ جو روایت پیش کی ہے۔ پنبہ کجا کجا نہم کی مصداق ہے۔ اسے حضرت علیؓ کا جواب کہنا حضرت علیؓ کی بے ادبی ہے۔ رافضی کے اس استدلال کا صحیح جواب وہی ہے کہ یہ روایت ایک جعلی روایت ہے اور رافضی جہاں سے یہ حوالہ لا رہا ہے اسی کتاب میں آگے خود اس کو جھوٹ کہا گیا ہے اور اس روایت کی تکذیب کی گئی ہے۔

ڈھکو رافضی نے مولانا محمد کرم الدین دبیر کی پیش کردہ پہلی آیت کے جواب میں بہت سی باتیں جو اس آیت کا موضوع نہ تھیں، کہی ہیں۔ ہمیں مجبوراً اس آیت کے ذیل میں ان کا جواب دینا پڑا ہے۔ تاہم اگلی آیات میں ہم ان غیر متعلقہ مباحث سے حتی الوسع اجتناب کریں گے تاکہ ہمارے قارئین جان لیں کہ سنی شیعہ اختلافات میں کس طرح قرآن اس مسلسل اسلام کا ساتھ دے رہا ہے جو حضور اکرمؐ سے بلافصل حضرت ابوبکرؓ صدیق اور دیگر خلفاء راشدین کے تسلسل سے چلا۔ اب ہم مقدمے کا دوسرا باب دوسری آیت سے شروع کرتے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز اس میں مولانا دبیر کی پیش کردہ ستائیس آیات پر ڈھکو کی تحریرات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔ ایمان سے متعلق اصولی مباحث ہم اس پہلی آیت میں لا چکے ہیں۔ اب ہم اگلی آیات میں یہ بحثیں نہ لائیں گے جس کو ان کی ضرورت ہو وہ سورہ انفال کی اس آیت کی طرف لوٹے اور اس کے ضمن میں اپنا جواب پالے۔ واللہ ھو الموفق۔

باب دوم

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ دیگر آیات اور رافضی کی ان میں رکیک تاویلات

پہلی آیت پر ہم مفصل بحث پہلے باب میں کر آئے ہیں۔ اس باب میں ہم ایمان کو پھر سے بحث میں نہ لائیں گے تاکہ تکرار نہ ہو پائے۔ ان آیات میں جہاں ڈھکو نے ایمان کی بات پھر سے اٹھائی ہے اس کا جواب آپ پہلی آیت کے قواعد کلیہ میں دیکھ لیں۔

مولانا کرم الدین دبیرؒ نے اپنے دعوے پر دوسری یہ آیت پیش کی ہے:

والذین ھاجروا فی سبیل اللہ من بعد ما ظلموا لنبؤنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الآخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون. (پ ۱۴ .النحل ۴۱)

ترجمہ: ''اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی بعد اس کے کہ انہوں نے ظلم اٹھایا۔ ہم ان کو ٹھکانہ دیں گے دنیا میں اچھا اور آخرت کا ثواب تو اس سے بھی بڑا ہے اگر یہ جانتے ہوتے۔''

استدلال : اس آیت میں ان مہاجرین کاملین کی شناخت کا ایک نشان بتلایا ہے وہ یہ کہ ان کی قابل قدر سچی جانفشانی اور مخلصانہ خدمت کا معاوضہ ان کو دنیا میں بھی عطا ہوگا۔ لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ (آفتاب ہدایت)

جواب رافضی : اس قسم کے خدائی دعوے چند شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔

جواب الجواب : کھلے وعدوں میں مخفی شرائط لانا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ کھلی بات میں شرائط بھی کھلی ہونی چاہئیں۔ رافضی کو چاہیے تھا کہ اس قسم کے اور بھی کچھ دعوے قرآن سے دکھاتا جو پورے نہ ہوئے ہوں۔ اس قسم کے وعدوں کو خدائی وعدے کہہ کر اس نے خدائی وعدوں کی سخت توہین کی ہے۔ وہ کیا خدا ہے کہ کھلے وعدوں میں مخفی شرطیں رکھتا ہے۔ ایمان ایک فعل قلبی ہے اور یہ ایک اندرونی حقیقت ہے۔ استقامت بھی ایک نقطہ نہیں ایک پھیلی باطنی حقیقت ہے۔ عمل صالح بھی ایک نہیں زندگی پورے اعمال سے بنتی ہے۔ کوئی کھلا وعدہ ایسی مخفی حقیقتوں سے مشروط نہیں کیا جاتا جو وعدے

پورے نہ کرنے ہوں مخفی شرائط کے بہانے ان کے پورا نہ ہونے کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔

مرزا غلام احمد نے خدا کے نام سے بات کہی تھی کہ محمدی بیگم سے اس کا نکاح ہوگا۔ جب اس کی یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی تو قادیانیوں نے کہا ایسی پیشگوئیاں مخفی شرائط سے مشروط ہوتی ہیں۔ محمدی بیگم کے رشتہ دار نیک عملوں پر آ گئے تھے اس لیے خدا نے ان سے یہ وعید اٹھا لی اور یہ وعدہ پورا کرنا انہیں معاف کر دیا۔

کیا اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے گا کہ اس خاتون کا مرزا غلام احمد کے نکاح میں آنا ایک عذاب تھا جو ان لوگوں کے نیک ہونے پر محمدی بیگم سے اٹھا لیا گیا اور اس طرح یہ عذاب ٹل گیا۔

مرزا غلام احمد نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ جب لڑکی پیدا ہوئی تو کہا اس پیش گوئی میں کچھ خفیہ شرائط تھیں' یہ مطلب تھا کہ آئندہ حمل میں لڑکا ہوگا۔

پھر قرآن نے یہاں جو وعدہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے وہ تو پورا ہو گیا۔ جو وعدے عملاً پورے ہو جائیں ان کے بارے میں کوئی شخص نئے مخفی شرائط ترتیب نہیں دیتا۔ رافضی کے علم و فہم پر رحم آتا ہے۔ ایک پورے ہو گئے ہوئے وعدے میں مخفی شرطیں لگا رہا ہے تا کہ ان سے کوئی بات ثابت نہ ہو پائے۔

دنیا نے خلفائے ثلثہ کو عزت و اقتدار پر آئے دیکھا اور اللہ تعالیٰ کے اس انعامی وعدے کا انہیں عملاً حصہ مل گیا' یہ ایمان پرور نظارہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دشمن رونے پر آ گئے اور اب تک رو رہے ہیں۔

(۲) دنیوی اچھائی لغۃً دنیا کے ہر اچھے پہلو پر منطبق ہو سکتی ہے وہ مسند خلافت اور دنیوی اقتدار کو بھی شامل ہے۔ یہ لفظ حسنہ دنیوی اچھائی کی لفظی دلالت ہے۔ یہ کوئی تفسیر نہیں ہے۔ افسوس کہ رافضی اسے تفسیر سمجھ رہا ہے۔

(۳) آیت مذکورہ میں اللہ رب العزت نے صحابہؓ سے ایک انعامی وعدہ کیا کہ انہیں دنیا میں وہ ایک اچھا ٹھکانہ دے گا۔ اس نے یہ وعدہ ان پیغمبروںؑ سے نہیں کیا تھا جو بقول رافضی قید و بند میں مبتلا رہے یا قتل کر دیے گئے۔ جب ان سے وہاں کوئی ایسا وعدہ نہیں ملتا تو اس کے ان پر پورا نہ ہونے کا رافضی کو گلہ نہ کرنا چاہیے۔ ان کی دنیوی حسنات ان کی پاکیزہ زندگی تھی جو بطور انعام ان کو نہ ملی تھی۔ یہ ان کی فطرت نبوت تھی نہ کہ یہ ان کی قربانیوں کا کوئی صلہ تھا۔

(۴) خلفاء ثلثہ کی خلافت صرف ان تین ہی کی خلافت نہ تھی۔ یہ اس تمام امت مسلمہ کی عزت و شوکت تھی جو ان تین حضرات کے ذریعہ قائم ہوئی اور جو ان کے ساتھ رہے اور ان کی بیعت کی' ان سب کو ملی۔ ان کے ادوار خلافت میں جو اموال و غنائم ان میں تقسیم ہوئے اور نظام خلافت کو چلانے کے لیے جو ہزاروں عہدے دار اپنی اپنی مسند عزت پر رہے۔ یہ ان سب مہاجرین کی عزت و شوکت تھی۔ جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ سو قرآن کریم کا یہ وعدہ صرف ان تین حضرات پر ہی پورا نہ ہوا ان کے تمام تابعین و مخلصین بھی درجہ بدرجہ یہ انعام الٰہی پا گئے۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ ان سب سے ہوا

تھا اور یہ سب وہ موعود انعام الٰہی پا گئے۔ اور دنیا نے ان سب کی یہ کامیابی دیکھی اور اللہ کا یہ وعدہ ان سب پر پورا ہوا۔

(۵) مولانا دبیرؒ نے یہ کہا تھا کہ یہ حضرات آنحضرت ﷺ کی زندگی میں آپ کے مقرب خاص اور حضوری رہے۔ اس کے جواب میں رافضی لکھتا ہے کہ پیغمبر نے اپنے آخری لمحات حیات میں انہیں اپنی بزم رسالت سے اٹھا دیا تھا۔ یہ خود اقرار ہے کہ وہ واقعی پوری زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضوری رہے۔ رہی یہ بات کہ آپ نے آخری لمحات انہیں اٹھا دیا' یہ صحیح نہیں۔ اگر آخری وقت میں آپ نے انہیں اٹھا دیا تو آپؐ نے اس کے ساتھ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کو کیوں نہ چھوڑ دیا اور حضرت عائشہؓ اس بزم رسالت سے کیوں نہ نکالی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ نے ان اہل بیت کو وہاں سے نکالا تھا جو آپس میں جھگڑ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ خلفاء ثلثہ نہ تھے۔ نہ حضرت فاطمہؓ تھیں نہ حضرات حسنین کریمین تھے اور نہ حضرت ام المومنین تھیں۔

بخاری شریف میں جھگڑا کرنے والوں کو اہل بیت میں سے لکھا ہے:

فاختلف اهل البيت فاختصموا فمنهم من يقول قربوا يكتب لكم ...... قال رسول الله قوموا. (صحيح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸)

ترجمہ: ''اہل بیت اختلاف کرنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے' انہی میں وہ تھے جو کہتے تھے آپ کے سامنے کاغذ لاؤ' آپ اس میں وصیت لکھ دیں۔ اور انہی میں وہ تھے جو دوسری رائے رکھتے تھے۔ حضورؐ نے ان سب جھگڑنے والوں سے کہا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔''

رافضی کا جھوٹ یاد رکھیں' وہ کہتا ہے آپؐ نے حضرت عمرؓ کو نکال دیا تھا۔

کاش کوئی اس سے پوچھے کہ پھر آپ کہاں چلے گئے تھے۔ پھر اس دوران کیا حضرت علیؓ یا کوئی اور بزرگ حضورؐ کے پاس قلم کاغذ لے آئے تھے؟ اب انہیں اس سے روکنے والا کون تھا اور یہ حضرات اس کے تابع کیوں ہوئے؟

(۶) یہ حقیقت کہ انہیں کرسی خلافت کا اعزاز نصیب ہوا' اسے رافضی نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ سب انعامی وعدہ لنبوئنهم فی الدنيا حسنة کے تحت ہوا اور پورا ہوا۔ اب رافضی اس بحث پر آ گیا ہے کہ خلفاء ثلثہ کس طرح اس انعامی وعدہ کا مصداق بنے۔ یہاں ان اسباب سے بحث خروج عن البحث ہے۔ وہ اسباب جو بھی ہوں' ان پر نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہوا کہ اصحاب ثلثہ اور ان کے ساتھی اس عزت و اقتدار کو پا گئے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا اور خدا کی بات پوری ہو کر رہی۔

(۷) مولانا دبیرؒ نے کہا تھا کہ قرآن نے یہ کہا ہے:

''جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ان کے مظلوم ہونے کے بعد ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے۔''

جواب از رافضی: اصحاب ثلثہ اس اعزاز کے حاصل کرنے میں منفرد نہیں بلکہ یزید ولید اور مروان ومتوکل بھی اس شرف میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

جواب الجواب: یہ انعامی وعدہ مہاجرین سے کیا گیا تھا کہ انہیں ان کی قربانیوں کا صلہ اس دنیا میں ملے گا اور وہ پھر اس انعام کے مصداق بنے۔ یزید و ولید اور مروان ومتوکل میں سے کوئی مہاجر نہ تھا۔ نہ ان میں سے کسی نے ہجرت کی۔ تو یہ انعام پانے میں خلفائے ثلثہ کے شریک کیسے ہوگئے۔ افسوس کہ رافضی کو تاریخ کا اتنا علم بھی نہیں کہ یہ لوگ مہاجر نہ تھے افسوس کہ وہ انہیں بھی مہاجر سمجھے بیٹھا ہے۔

(۸) جو ملکی فتوحات کسی انعامی وعدہ کے نتیجہ میں واقع ہوں اور وہ وعدہ بھی قرآن کریم میں ہو اور وہ پورا بھی ہوا ہو تو وہ یقیناً صداقت کی دلیل ہیں۔ ہاں مطلق اقتدار پر ہوتا جیسا کہ ان دنوں کفار یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیے ہوئے ہیں یہ اقتدار واقعی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔

ہاں جو کافر نہ ہوں صرف فاسق کے درجے میں ہوں اور خدا ان سے دین کی کوئی خدمت لے لے تو اللہ تعالیٰ انہیں اس خدمت کے صلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ انعام دیں گے۔ پھر ذاتی عمل میں اگر کسی کا دین میں کوئی حصہ نہیں مگر ایمان ہے اور وہ اپنی کسی قومی خدمت میں کوئی مہم سرانجام دے تو وہ بھی اس کے ثواب سے محروم نہ رکھا جائے گا لیکن یہ سب آخرت میں ہوگا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یّرہ۔ (پ ۳۰ الزلزال ۷)

ترجمہ: ''سو جس نے ذرہ بھر بھلائی کی وہ اسے دیکھ لے گا۔''

حضرت بلالؓ کی منادی لا یدخل الجنۃ الاّ نفس مسلم میں جنت میں براہ راست داخلہ مراد ہے جو جہنم میں جائے بغیر ہو اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں مگر ذاتی عمل میں فاسق و فاجر ہیں وہ اپنے برے اعمال کی سزا پانے کے بعد بالآخر جنت میں بوجہ ایمان ضرور جائیں گے۔ اگر گناہ گار نے کبھی بخشش نہ پائی ہو جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے تو اس سے عقیدہ شفاعت کا کھلا انکار لازم آتا ہے۔ ہم گناہ گار مومنین کے کسی نہ کسی دن جہنم سے نکلنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ صرف کفار کی صفت ہے کہ وہ کبھی جہنم سے نکل نہ سکیں گے۔ وماھم بخارجین من النّار۔

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ تیسری آیت

الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حقٍ الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ۔ (پ ۱۷ الحج ۴۰)

ترجمہ: ''وہ لوگ جنہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا بغیر کسی وجہ کے سوائے اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

جواب از رافضی: یہ آیت مطلق ہے۔ اس سے دوسرے شرائط وقیود کا لحاظ کیے بغیر استدلال کرنا درست نہیں۔

جواب الجواب: یہ آیت قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے۔ اس میں کوئی مخفی شرائط بڑھائی نہیں جاسکتیں۔ اس میں ہجرت کا لفظ بھی نہیں کہ نیت زیر بحث لائی جائے۔ یہاں ہجرت کے لیے اخرجوا کا لفظ ہے جو ایک ظاہری عمل ہے اور عمل بھی ایسا کہ ان کا اپنا اختیار کردہ نہیں۔ وہ ان پر مشرکین مکہ نے مسلط کیا تھا۔ انہوں نے انہیں نکالا تھا اور یہ دنیا نے دیکھا کہ کون کون مکہ سے نکلے اور پھر وہ مدینہ میں آبسے اور وہ انعام الٰہی پا گئے جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں وعدہ دیا تھا۔ رافضی کا اس میں مخفی شرائط بڑھانا ایک اعتراف شکست ہے۔ اخلاص کی شرط لگا کر جو ایک باطنی امر ہے اور اس کی نفی میں کسی کے پاس کوئی قطعی اور صریح دلیل نہیں تو اس کمزور بہانے سے اسے (اس آیت کو) اپنے ظاہر سے نکالنا نہیں تو اور کیا ہے۔ مطلق میں قیود اسی پایہ ثبوت کے ہونے چاہئیں جو پایہ ثبوت اس آیت کا ہے۔

ان لوگوں نے جب ربنا اللہ کہا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے صرف اپنے عقیدہ توحید کا اظہار کیا تھا۔ خدا پر ایمان لانا پورے دین پر ایمان لانا ہی سمجھا جاتا ہے۔

وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللّٰہ العزیز الحمید۔ الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض۔ (پ ۳۰ البروج)

ترجمہ: ''اور ان سے انہوں نے بدلہ نہ لیا مگر اس بات کا کہ وہ ایمان لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا۔ جس کی بادشاہی ہے آسمانوں پر اور زمین میں۔''

یہ کن کی صفت بتلائی گئی ہے؟ مومنین کی۔ یہ ایک دینی محاورہ ہے کہ خدا پر ایمان سارے دین کو ماننے کا ہی ایک دوسرا نام ہے۔

رافضی مخفی شرطوں کے سائے میں

رافضی جب مولانا دہیرؒ کی کسی دلیل سے لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ مرزا غلام احمد کی طرح مخفی شرائط کے سائے میں آبیٹھتا ہے۔ مولانا دہیر کا اس آیت سے استدلال اتنا مضبوط ہے کہ رافضی پھر مخفی شرطوں کے سائے میں آبیٹھا ہے۔ لکھتا ہے:۔

''منجملہ دیگر شرائط کے ایک شرط اخلاص فی العمل ہے اور یہ شرط یہاں مفقود ہے۔''
(تجلیات صداقت ص ۶۰)

اخلاص ایک اندر کی بات ہے اور اس سے بڑی آسانی سے کسی سے اس کی نفی کی جاسکتی ہے۔

وہ لکھتا ہے:

"جن لوگوں کو کفار نے مکہ سے نکالا اور وہ ہجرت کر کے مدینہ آئے وہ تمام مخلص نہ تھے...... چنانچہ خداوند عالم انہی صحابہؓ کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرة"

رافضی کو غلط فہمی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے بارے میں اتری ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں اتری تھی۔ حضورؐ نے مال غنیمت کو حلال قرار دیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

احلت لی الغنائم (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۹۹)

پھر اس دن جو مال غنیمت کی طرف لپکے انہیں بھی مومنین کے دائرہ میں ہی رکھا گیا ہے اس آیت کے آخری لفظ کو دیکھیں۔

منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرہ. ثم صرفکم عنهم لیبتلیکم ولقد عفا عنکم واللّٰہ ذوفضل علیٰ المؤمنین. (پ ۴ آل عمران ۱۵۲)

ترجمہ: "کوئی چاہتا تھا تم میں دنیا (کہ مال غنیمت جلد ملے) اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت (کہ حکم رسول کی پابندی کریں) پھر تم کو الٹ دیا ان پر سے تا کہ پھر تم کو آزماوے اور بے شک اس نے تم کو (جلدی کرنے والوں کو) معاف کر دیا اور اللہ فضل کرنے والا ہے مومنین پر۔"

یہاں مومنین کن کو کہا؟ انہی قصور کرنے والوں کو۔ سو غنائم اپنی ذات میں ہرگز کوئی قابل نفرت چیز نہیں ہیں نہ ان کی طرف دیکھنا دین سے نکلنا ہے۔

حضورؐ اہل بیت کے لیے اس مال سے خمس وصول کرتے تھے۔ اس کی طلب اور خواہش کوئی گناہ نہیں ہے۔ نہ یہ اخلاص کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے:

واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للّٰہ خمسه وللرّسول ولذی القربیٰ

(پ ۱۰ الانفال ۴۱)

ترجمہ: "اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے تو اللہ کے واسطے سے ان میں سے پانچواں حصہ اور اس کے رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے۔"

سو غنیمت کی طرف جلد لپکنے والوں کو غیر مخلص کہنا کسی طرح درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں مومنین میں رکھا تو وہ اپنے عقیدہ توحید میں مخلص ہی رہے۔ اس میں شک کی کوئی راہ نہیں ہے۔

وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین له الدین. (پ ۳۰ البیّنه)

ترجمہ: "اور انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کی پورے اخلاص سے بندگی کریں۔

اخلاص کا تعلق عقیدہ توحید سے ہے نہ کہ مال غنیمت سے۔ سو یہ حق کسی کو نہیں پہنچتا کہ مال غنیمت چاہنے والوں کو ایمان سے لا باہر کرے۔

اگر مال غنیمت کوئی ناپاک مال ہوتا تو حضورؐ اپنے اہل قرابت کو اس سے کچھ نہ دیتے۔

جنگ احد میں کچھ مومنین مال غنیمت پر جلدی لپکے حالانکہ انہیں حضورؐ کا حکم یہ تھا کہ وہ کسی صورت میں درہ کو نہ چھوڑیں۔ کچھ وہ تھے اور کچھ اسے آخر میں وصول کرنے کے امیدوار رہے۔ مگر تھے دونوں مومنین۔ قرآن کریم **منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرہ** میں سے کسی گروہ کو کافر نہیں ٹھہراتا۔ اس سے پہلے دنیا کی طلب صرف کافروں کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہؓ نے جانا کہ مومنین میں بھی طالب دنیا کسی درجہ میں ہو سکتے ہیں۔ جیسے کچھ لوگ مال غنیمت پر پہلے جا لپکے۔ یہ طلب دنیا مومنین میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ سو صحابی کی اس وضاحت کے بعد کوئی بد بخت ایسا نہ ملے گا جو مال غنیمت کی طرف جلدی جانے والوں کو بالکل ایمان سے ہی نکال دے' مومنین نہ مانے' معاذ اللہ انہیں کافر جانے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔

ما کنت اری ان احداً من اصحاب رسول اللّٰہ یرید الدنیا حتّٰی نزلت فینا یوم احد منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرہ.

(اخرجه احمد و ابن ابی شیبه والطبرانی والبیهقی)

ترجمہ: "میرا خیال تھا کہ حضورؐ کے صحابہ میں کوئی طالب دنیا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ احد کے دن ہم میں یہ آیت اتری کہ تمہیں میں سے ہیں جو غنیمت کے جلدی طالب بنے اور انہیں میں سے وہ ہیں' دیر سے اس کے امیدوار تھے۔"

آپ نے انہیں کافر نہیں ٹھہرایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے دنیا میں خوشحالی کی درخواست کی تھی:

واکتب لنا فی هٰذه الدنیا حسنة و فی الآخرة انا هدنا الیک. (پ ۹ الاعراف ۱۵۵)

ترجمہ: "اور ہمارے لیے دنیا میں اچھائی فرما اور آخرۃ میں بھی۔ ہم تیری طرف راہ پائے ہوئے ہیں۔"

دنیا میں خوشحالی مانگنا اگر کوئی عیب ہوتا یا خلاف اخلاص ہوتا تو آج ہر مومن کی زبان پر یہ دعا نہ ہوتی:

ربنا اٰتنا فی الدّنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النّار. (پ ۲ البقرہ ۲۰۱)

دنیا کی خوشحالی کسی کے لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں مگر آخرت کی خوشحالی ہر مومن کے لیے مقرر ہے۔

تاہم یہ کہنا کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ آئے وہ تمام مخلص نہ تھے جیسا کہ رافضی نے کہا ہے، ہرگز درست نہیں۔

یہ ڈھکو کی عادت ہے کہ جب مولانا دبیر کی دلیل سے لاجواب ہوتا ہے تو وہ اس قسم کے باطنی سہارے ڈھونڈتا ہے۔

قوم موسیٰؑ کو یہ دنیا کی خوشحالی نہ ملی۔ یہ حضورؐ کے صحابہؓ کا نصیب رہی

جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ رب العزت سے اپنی قوم کے لیے یہ دنیا کی عزت وشوکت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ آنحضرتؐ کے صحابہ کے لیے لکھ دی گئی ہے۔

فساکُتبها للذین یتقون ...... الذین یتبعون الرّسول النبی الامیّ الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل . (الاعراف ۱۵۷)

ترجمہ: ”سو ان کو لکھ دوں گا انہیں جو ڈر رکھتے ہیں ...... جو پیروی کریں گے اس نبی اُمّی کی جسے لکھا پاتے ہیں وہ اپنے ہاں تورات میں اور انجیل میں۔“

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ تورات وانجیل اور قرآن کریم میں یہ تقدیر الٰہی رہی کہ حضورؐ کے صحابہ کو ان کی عظیم قربانیوں کے صلہ میں دنیا بھی ملے گی۔ انہیں یہیں عزت وشوکت سے نوازا جائے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم یہ عزت وشوکت نہ پاسکی۔ اسی دن سے یہودی حضور اکرمؐ کے صحابہ کے خلاف ہیں۔ عبداللہ بن سبا یہودی مسلمانوں میں داخل ہوا تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں کسی طرح تفرقہ پھیلائے اور اسلام کے نظام خلافت میں رخنہ ڈالے۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے اس کے خلاف سخت کارروائی کی۔

میدان جہاد میں اگر کچھ لوگ مال غنیمت کی طرف جلد لپکے تو اسے ضبط جہاد میں ایک ضعف تو کہا جاسکتا ہے لیکن اس سے ان کی ہجرت مجروح نہیں کی جاسکتی، نہ ان کے ایمان کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ جن کا ایمان کھلے طور پر ثابت ہو انہیں ایمان سے خارج کرنے کے لیے بھی کوئی قطعی دلیل چاہیے۔ کسی کے کسی عمل میں کمزور پڑنے سے اس کے ایمان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مومنین ایمان لاتے ہی پورے تزکیہ یافتہ نہیں ہوجاتے

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں یہ بات داخل کی کہ آپ مومنین کا تزکیہ کریں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ مومنین شروع سے ہی تزکیہ یافتہ یا تعلیم یافتہ نہ تھے۔ یہ فیضان رسالت تھا کہ ان حضرات کی آپؐ نے تربیت فرمائی۔ انہیں کتاب وسنت کے راز بتلائے اور یہ حضرات مومنین پوری دنیا کے استاد بن گئے۔ اگر ایمان لاتے ہی تزکیہ کی دولت مل جاتی تو قرآن کریم حضور کے ذمہ یہ نہ لگاتا کہ آپؐ

مومنین کے دلوں کا تزکیہ بھی کریں اور انہیں علم کتاب سے بھی مالا مال کریں۔ قرآن کریم میں ہے:

لقد من اللّٰه علی المومنین اذ بعث فیهم رسولاً من انفسهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة . (پ ۴ آل عمران ۱۶۴)

ترجمہ: ”بے شک اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے پڑھتا ہے وہ ان پر اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو شرک وغیرہ سے اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور کام کی بات۔“

اب اگر بعض صحابہؓ کا پورا تزکیہ نہ بھی ہوا، وہ دوران تربیت ہی ہوں اور وہ احد میں مال غنیمت پر جلد لپکیں تو یہ اس سے یہ کیسے لازم ہوا کہ وہ مومنین نہیں تھے۔ مومنین کا تزکیہ پانا تو ایمان کے بعد کی ایک منزل ہے۔ سو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحابہؓ جنہوں نے احد کے دن درہ چھوڑا اور خالد بن ولیدؓ نے پیچھے سے عقبی حملہ کیا وہ یقیناً مومن تھے اور تزکیہ کے باب میں وہ ابھی دوران تربیت ہی تھے۔

تاہم وہ اتنے تربیت یافتہ ضرور تھے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو گمان تھا کہ یہ تزکیہ کی دولت پاچکے ہیں۔ لیکن جب یہ آیات اتری منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرہ تو انہیں تنبہ ہوا کہ ابھی تک دنیا ان کی نظروں سے پوری طرح نہیں گری۔ لیکن اس سے کوئی بد بخت یہ نتیجہ نہ نکالے گا کہ وہ معاذ اللہ ایمان کی دولت سے سرفراز نہ تھے۔

ہاں حضور جب سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے تو اس وقت بے شک آپ اپنے جملہ فرائض رسالت ادا فرما چکے تھے۔ آپ کے بعد صحابہؓ میں کوئی ایسا نہ تھا جو دنیا کا طالب ہو اور مال غنیمت کی چمک میں کوئی جنگ کا مورچہ چھوڑ دے۔

رافضی صحابہؓ سے ایمان کی نفی کرنے میں بالکل ناکام رہا

رافضی نے صحابہؓ سے ایمان کی نفی کرنے میں کن امور کا سہارا لیا ہے وہ کسی شاذ روایت سے ان کی کسی عملی کمزوری کا حوالہ دے کر استدلال کرتا ہے کہ یہ حضورؐ پر دل سے ایمان نہ لائے ہونگے، ان کی ہجرت بھی اخلاص سے نہ ہوگی۔ بھلا ایسی شاذ روایات سے کسی کے ایمان اور ہجرت کی نفی کی جاسکتی ہے؟

ہم قطع نظر اس سے کہ رافضی کے اٹھائے ایسے اعتراضات اور اس کی پیش کردہ شاذ روایات سرے سے غلط ہیں یا ان کی دلالت اپنے موضوع پر ہرگز واضح نہیں۔ ہم یہ بات سمجھ نہیں پائے کہ رافضی نے ان مومنین کرام کے بارے میں معصوم ہونے کا تصور کہاں سے باندھ لیا ہے؟ ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ ان سے اب کوئی خطا ہو ہی نہ سکے۔

ہمارے چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ مرتضیٰ کہتے ہیں، ہم اپنی ذات میں خطاء سے بالا نہیں ہیں۔ ہم سے کوئی غلطی ہو تو فوراً ہمیں اس پر متنبہ کردو۔

فانی لست فی نفسیٰ بفوق ان اخطی ولا امن ذلک من فعلی۔

(نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۲۲۷)

اتنے بڑے اساطین اسلام سے ایمان کی نفی کرنے کے لیے ویسے ہی روشن ثبوت کی ضرورت ہے، جس روشن پیرائے میں ان کے ایمان کی دھوم ہے۔

لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، ان حضرات سے ایمان کی نفی شاذ اور ظنی روایات سے نہیں کی جاسکتی اس کے لیے ویسے ہی کھلے دلائل چاہئیں جیسے کھلے پیرائے میں اہل سنت کے ہاں ان کا ایمان ثابت ہے۔

رافضی مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ دوسری آیت کے جواب میں ایک یہ سرخی باندھتا ہے۔

"خلفائے ثلٰثہ کی جہالت از کتاب اللہ"

تیسری آیت کے جواب میں اس کی یہ سرخیاں ملاحظہ ہوں۔ (۱) تمول ابوبکرؓ (۲) تمول عمرؓ (۳) تمول عثمانؓ (۴) اصحاب ثلٰثہ کے خشوع وخضوع کا بیان

کچھ غور کریں کہ ان روایات سے جن میں سے ایک بھی قطعی درجے میں ثابت نہیں ہوتی اور نہ ان میں کوئی کفر و ایمان کی بحث ہے۔ کیا ان بلند پایہ ہستیوں سے کسی کے ایمان کی نفی کی جاسکتی ہے؟ نہیں۔ قارئین اس پر حیران ہوں گے کہ رافضی اس مقام میں کیوں اتنا بوکھلایا ہوا ہے۔ وہ اپنے دعوے اور دلیل میں کہیں کوئی مطابقت نہیں دکھا سکا۔ اور پھر بھی دف بجائے جارہا ہے کہ صالح عمل ان سے ثابت نہیں۔ کیا کسی سے کسی عمل صالح کی نفی سے اس کے عدم ایمان پر استدلال ہوسکتا ہے؟ رافضی اگر دو چار حوالے موضوع کو سمجھے بغیر لے بھی آئے تو ان سے ان ہزار ہا نیکیوں کی نفی نہیں ہو سکتی جو یہ حضرات عمر بھر عمل میں لاتے رہے اور اس سے تو غالباً یہ رافضی بھی ناواقف نہ ہوگا کہ فیصلے کے دن اعمال تلیں گے اور انبیاء کے سوا ہر کسی کے میزان میں دونوں طرف اعمال ہوں گے۔ جس کی نیکیوں کا پلڑا جھک گیا پس وہ ہمیشہ کی زندگی پا گیا۔

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیۃ ٥ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ (پ ۳۰ القارعہ)

ترجمہ: "سو جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ رہے گا من مانے گزران میں اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں (نیکیوں کی) تو اس کا ٹھکانہ گڑھا ہوگا۔"

والوزن یومئذ الحق فمن ثقلت موازینہ فاولٰئک ھم المفلحون (پ۸ الاعراف ۸)

ترجمہ: "اور اس دن اعمال کا وزن میں آنا برحق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں سو وہی ہیں

نجات پانے والے۔"

اب ذرا اگلی آیات میں چلیں۔ رافضی چوتھی آیت کی بحث میں یہ سرخیاں جمارہا ہے۔

"حضرت علیؓ صدیق اکبر ہیں"۔ "حضرت علیؓ فاروق اعظم ہیں"۔ پانچویں آیت میں اس کی یہ سرخی ملاحظہ ہو۔

"حضرت علیؓ سابق الاسلام"۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پہلے دعوے میں کہ حضرات اصحابہ ثلٰثہ ایمان سے تہی دامن تھے، بری طرح ناکام ہے۔ اور اب وہ ان حوالوں میں سرگرداں ہے، جن میں نہ کوئی قطعی ثبوت ہے اور نہ ان حضرات میں سے کسی کے ایمان سے تہی دامن ہونے پر کوئی قطعی دلالت موجود ہے۔ تتمہ میں ہم ان شاء اللہ العزیز ان غیر متعلقہ حوالوں کا بھی نوٹس لیں گے۔ سردست ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مولانا دبیرؒ نے آفتاب ہدایت میں جن آیات سے خلفاء ثلٰثہ کی خلافت پر استدلال کیا ہے۔ یہ ڈھگو رافضی ان میں سے کسی آیت کے استدلال کو توڑ نہیں سکا۔

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ چوتھی آیت

للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً و ینصرون اللہ ورسولہ اولٰئک ھم الصادقون. (پ ۲۸ الحشر ۸)

ترجمہ: "واسطے ان مفلسوں کے وطن چھوڑنے والوں کے، جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے، ڈھونڈتے ہیں وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور مدد کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی۔ وہی لوگ ہیں سچے۔"

اس آیت کے جواب میں رافضی کہتا ہے:

"یہ صرف ان حضرات پر منطبق ہوتی ہے جو فقیر و نادار ہوں نہ کہ غنی مالدار (۲) ان کی ہجرت خدا کی رضا جوئی کے لیے ہو اور وہ (۳) جہاد کر کے خدا اور اس کے رسول کی نصرت کریں...... اصحاب ثلٰثہ میں ان تینوں صفات کا فقدان ہے۔" (دیکھئے تجلیات صداقت ص ۶۳)

الجواب: یہاں ان کے فقیر و نادار ہونے سے وقت ہجرت ان کا فقیر ہونا مراد ہے۔ ہجرت سے پہلے ان کے مالدار ہونے سے وقت ہجرت ان کے نادار ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اس آیت میں یہ الفاظ موجود ہیں اخرجوا من دیارھم و اموالھم جس سے ان کے پہلے مالدار ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے اموال سے بھی نادار کردیے گئے۔ اسی طرح ان کے بعد از ہجرت مالدار ہونے سے ان کے بوقت ہجرت فقیر و نادار ہونے کی نفی نہیں ہوجاتی۔ جس آیت میں انہیں فقراء کہا گیا ہے اس میں ان کے پہلے مالدار ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔ تیسری آیت کی بحث میں رافضی نے بلا سند کچھ حوالے دیے ہیں کہ خلفاء ثلٰثہ وقت وفات مالدار تھے اور ان حوالوں سے استدلال کیا ہے کہ وہ وقت ہجرت فقیر نادار نہ تھے۔ اور یہ

بات کسی طرح درست نہیں۔

اس سے قارئین حضرات رافضی کے بگڑے ذہنی توازن کا آسانی سے ایک جائزہ لے سکتے ہیں۔ وہ ان سے مہاجر ہونے کی نفی کرنے میں کس طرح اوندھے منہ گرا ہے۔

اگر کوئی ہجرت کے بعد کسی جہاد میں حصہ نہ لے سکا تو کیا اس سے اس کے اس سے پہلے شرف ہجرت کی نفی کی جا سکے گی؟ ہرگز نہیں۔ جہاد کے آخری معرکوں میں غزوہ تبوک بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں حضرت علیؓ مرتضیٰ شریک نہ ہوئے تھے۔ تو اب کیا ان سے شرف ہجرت کی نفی کی جائے گی؟ نہیں اس استدلال میں کوئی وزن نہیں کہ ان کے آخری عمل سے ان کی زندگی کے پہلے تمام جہاد کالعدم ہو گئے۔ انما العبرة بالخواتیم۔ ہجرت ایک مستقل عمل ہے اور جہاد ایک دوسرا عمل ہے۔ رافضی کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ

''شرف ہجرت کا حاصل ہونا جہاد کرنے پر موقوف ہے۔'' (دیکھئے تجلیات ص ۶۴ سطر ۵)

رافضی نے اپنے اس دعوے پر یہ آیت پیش کی ہے:

ثم ان ربک للذین هاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاهدوا و صبروا ان ربک من بعدها لغفور رحیم (پ ۱۴ النحل ۱۱۰)

ترجمہ: ''پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انہوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ انہوں نے مصیبتیں اٹھائیں پھر وہ جہاد بھی کرتے رہے اور حق پر قائم رہے۔ بے شک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں ثم جاهدوا کا عطف فتنوا پر نہیں هاجروا پر ہے۔ من بعد ما فتنوا ' هاجروا سے متعلق ہے۔ جنہوں نے ہجرت کی پہلے وہ کئی مصیبتوں میں مبتلا رہے تھے۔ اب انہوں نے ہجرت کی۔ یہ ہجرت ان کا ایک مستقل عمل ہے۔ جہاد کرنے پر موقوف نہیں کہ جہاد نہ کریں گے تو ان کی ہجرت بھی شمار میں نہ آئے گی۔ ہاں احکام خداوندی بجالانے کے لیے ہجرت کے بعد جہاد کی بھی ضرورت ہے۔ تاہم یہ درست نہیں کہ شرف ہجرت جہاد کرنے پر موقوف ہے۔ لنبوئنهم فی الدنیا حسنه کا وعدہ بے شک ہجرت پر موقوف تھا۔ اور دنیا گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ خلفائے ثلثہ پر پورا ہوا۔ جو اس یقین کے لیے کافی ہے کہ یہ حضرات ہجرت کا شرف پوری طرح پائے ہوئے تھے۔

ہم اس مقام پر اس ضعیف اور منکر روایت سے بحث نہیں کرتے جو رافضی نے حضرت علیؓ کے صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہونے پر پیش کی ہے۔ رافضی حضرات خلفاء ثلثہ کے ایمان کی نفی نہ کر سکنے میں اتنا بوکھلایا ہوا ہے کہ اب وہ اس قسم کے مباحث سامنے لا کر خروج عن المبحث کے سائے میں پناہ لینے کی کوشش میں ہے اور اس سے کوئی بات بنائے نہیں بن رہی۔

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ پانچویں آیت

آیئے اب ہم پانچویں آیت میں چلیں۔ اس میں سابقین اولین وہ مہاجرین میں سے ہوں یا انصار میں سے ان سب کے سروں پر رضی اللہ عنھم کا تاج رکھا گیا ہے۔

والسابقون الاولون من المهاجرین والانصار والذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه ...... ذلک الفوز العظیم . (پ ۱۱ التوبه ۱۰۰)

ترجمہ: ''وہ جو پہلے لوگ ہیں ہجرت کرنے والوں میں اور مدد کرنے والوں میں اور وہ لوگ جو خوبی سے ان کے پیچھے چلے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے ...... یہی ہے بڑی کامیابی۔''

یہ بات سابقون کی ہو رہی ہے اور اس میں وہ سب داخل ہیں جو پہلے اسلام لائے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ان میں یہ بحث نہیں کہ ان میں سابق فی الاسلام کون تھا؟ رافضی سرخی باندھتا ہے: ''حضرت علیؓ سابق الاسلام ہیں''۔ سابق واحد ہے اور سابقون جمع ہے۔ رافضی کو کچھ اس کی سمجھ ہونا چاہیے تھی۔ قرآن کریم کی یہ آیت السابقون الاولون کی فضیلت بیان کر رہی ہے جن میں حضرت ابوبکرؓ یقیناً شامل ہیں۔ وہ پہلے نمبر پر ہوں یا دوسرے نمبر پر۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کے سابقین میں سے ہونے کا انکار یا تامل ایک لمحے کے لیے بھی کسی نے نہیں کیا۔ رافضی یہاں اور کچھ نہیں کر سکا تو سابقون کی بجائے سابق کی بحث چھیڑ دی ہے۔ یہ بھی اس کی ایک بوکھلاہٹ ہے۔

ہم ان ضمنی باتوں میں الجھ کر قرآنی آیات سے نکلنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمیں خروج عن المبحث کی ضرورت ہے۔ حق یہ ہے کہ مولانا کرم الدین دبیرؒ کی پیش کردہ آیات میں سے رافضی ڈھکو کسی ایک آیت کو بھی مولانا دبیرؒ کے موقف سے ہٹی ہوئی نہیں بتلا سکا۔ اور اس آیت میں جہاد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوا ہجرت خود ایک مستقل عمل ہے جس سے قرب الٰہی ملتا ہے۔

رافضی کی بوکھلاہٹ کا ایک اور دلچسپ نظارہ

رافضی نے پانچویں آیت کے صحن میں ایک سرخی یہ قائم کی ہے: ''ہجرت حبشہ کا اجمالی تذکرہ''۔ حالانکہ پانچویں آیت میں بطور شرط ہجرت کا کوئی تذکرہ نہیں۔ مگر رافضی خلفائے ثلثہ سے ایمان کی نفی کرنے کی شکست میں اس قدر بوکھلایا ہوا ہے کہ وہ ہجرت حبشہ کے مہاجرین کی تعداد پر مختلف آراء جمع کر رہا ہے۔ کسی نے یہ تعداد ۸۰ کسی نے ۳۰۰ کسی نے ۸۲ اور کسی نے ۹۰ لکھی ہے۔ اور جب وہ ان اختلافات میں کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دے سکا تو کہتا ہے کہ:

''ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ابوبکرؓ و عمر اس جماعت مہاجرین اولین میں ہرگز شامل نہیں تھے۔'' (ص ۶۷)

وہ کچھ بھی انصاف سے بات لکھتا تو فقرہ یوں چاہیے تھا۔ "سب کا اتفاق ہے کہ ابوبکرؓ و عمر اور حضرت علیؓ اس جماعت مہاجرین میں ہرگز شامل نہ تھے۔ یعنی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں میں۔ اس ہجرت میں حضرت عثمانؓ یقیناً حضرت علیؓ پر سبقت لے گئے تھے۔

وہ اگر یہاں حضرت علیؓ کا نام بھی لکھ دیتا تو پھر وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر کوئی ترچھی نگاہ نہ ڈال سکتا تھا۔ پھر اسے یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ حضرت عثمانؓ بے شک اس ہجرت حبشہ میں مع اپنی اہلیہ کے شامل تھے۔ آپؓ دونوں ہجرتوں سے شرف یاب ہوئے اور یہ جزوی فضیلت ہے جو آپ کو دوسرے تینوں خلفاء راشدین پر حاصل رہی۔

اس آیت کی بحث میں رافضی پھر وہی اپنی بات کہتا ہے کہ یہ وعدے مطلق نہیں بلکہ صدق ایمان، عمل صالح، خلوص نیت اور استقامت کے ساتھ مشروط ہیں۔ یہ سب وہی مخفی شرائط ہیں۔ جن کے سہارے اثناعشری اب تک خلفائے ثلثہ کے ایمان کا انکار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم یہاں بھی وہی بات کہتے ہیں جو ہم پہلے کہہ چکے کہ کھلے وعدے مخفی شرائط سے مشروط نہیں ہوتے۔ معاشرے میں اسے بڑی اخلاقی پستی سمجھا جاتا ہے کہ وعدہ کھلا ہو اور شرطیں مخفی ہوں۔ یہ بات اللہ رب العزت کی شانِ کریمی کے خلاف ہے۔

ان تمام راہوں میں یہ پیش نظر رہے کہ اصل بحث حضرات خلفائے ثلثہ کے ایمان، ان کی ہجرت، ان کے جہاد اور ان پر انہیں وعدہ خلافت ملنے پر ہو رہی ہے۔ اب جب وہ وعدہ ان پر کھلے طور پر پورا ہوا اور پوری دنیا نے اس کا نظارہ دیکھا تو صدق تالی کے بعد اب مقدم کی شرائط میں سر مارنا کسی صاحبِ دانش کا کام نہیں ہو سکتا۔

رافضی نے یہاں حضرت علیؓ کے سابق الاسلام ہونے پر ایک یہ آیت بھی لکھی ہے:

والذین جاء بالصدق وصدق به اولئک هم الصادقون. (تجلیات صداقت ص ۲۶)

(ترجمہ از مولف) "جو صدق لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی صادقین ہیں۔"

اور دعویٰ کیا ہے کہ جاء بالصدق سے مراد رسول خدا اور صدق به سے مراد علی بن ابی طالب ہیں۔

اس صورت میں آیت یوں ہونی چاہیے تھی۔ **اولئک هما الصادقان** کیونکہ یہ دو فرد ہوئے اور قرآن کریم میں ہے **هم الصادقون** جمع ہے جو دو پر نہیں آتی۔ اور اگر صدق به سے مراد ایک نہیں کئی مراد لیے جا سکیں جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی رائے ہے تو پھر **اولئک هم الصادقون** ان سب کو شامل سمجھا جائے گا۔

الجواب : ہم اس کے جواب میں پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآن کریم میں نہیں ہے۔ یہ رافضی نے خود گھڑی ہے۔ اسے کاتب کی غلطی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح ہے اور یہ رافضی کا اپنا ترجمہ ہے۔

رافضی نے اس آیت پر تفسیر در منثور کا حوالہ دیا ہے اور اس کی تفسیر یہ نقل کی ہے:

والذی جاء بالصدق رسول اللّٰه والذی صدق به علی بن ابی طالب رضی اللّٰه عنه. یعنی جاء بالصدق سے رسول خدا اور صدق به سے مراد علی بن ابی طالب هیں. (در منثور ج ۵ ص ۳۲۸)

تفسیر در منثور میں بھی ہمیں یہ آیت نہیں ملی۔ البتہ اس میں مندرجہ بالا تفسیر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابن مردویہ کے حوالے سے منقول ہے۔ صاحب در منثور نے ابن مردویہ کی سند جو حضرت ابوہریرہؓ تک پہنچے نہیں لکھی اور نہ یہ کہیں ہے۔ صاحب در منثور نے آیت اس طرح لکھی ہے۔ اور یہ بے شک قرآن کریم میں موجود ہے۔ رافضی کی درج کردہ آیت اس موجودہ قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ قرآن کی آیت جسے ڈھگو نے تبدیل کیا ہے وہ یہ تھی۔

والذی جاء بالصدق وصدق به اولئک هم المتقون. (پ ۲۴ الزمر ۳۳)

ترجمہ: "اور جو لے کر آیا سچی بات اور سچ جانا جس نے اس کو وہی لوگ ہیں ڈر والے۔"

سو جس جس نے اسے سچ مانا وہ سب ڈر والے ہیں اور متقین مومنین ہیں۔ ان متقین مومنین میں سب سے اول کون رہا۔ اسے حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی روایت سے اسی کتاب میں اسی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ امام سیوطی نے اس کی تخریج تین حوالوں سے کی ہے:

واخرج ابن جریر الماور دی فی معرفة الصحابه و ابن عساکر من طریق اسید بن صفوان وله صحبة عن علی بن ابی طالب قال والذی جاء بالحق محمد صلی اللّٰه علیه وسلم و صدق به ابوبکرؓ رضی الله عنه. (الدرالمنثور ج ۵ ص ۶۱۵)

جاء بالصدق کے ساتھ یہ جاء بالحق ایک دوسری قرأت ہے۔ یہ حضرت علیؓ کی قرأت ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں جو یہ صدق اور حق اللہ سے لے کر آیا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جس نے آپ کی تصدیق کی وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہوا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں ہے کہ یہ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت ہے۔ لیکن آپ کے علاوہ اور بھی جو آپ کی تصدیق کرنے والے ہیں سب اس فضیلت میں داخل ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے تھے، حضرت علیؓ بھی اس میں داخل ہیں اولئک هم المتقون جمع ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بقول حضرت علیؓ یہ منقبت اور فضیلت حضرت ابوبکرؓ کی ہے اور اگر دونوں روایتوں میں سے ایک کو لینا ہے تو ہم اہل سنت حضرت علیؓ کی روایت کو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔ شیعہ یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو حضرت علیؓ کی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے اگر اپنے آپ کو سابق فی الاسلام کہا ہے تو اس سے ان کی مراد لڑکوں میں اولاً اسلام لانا ہے۔ جن پر ابھی نماز فرض نہ ہوئی تھی۔ وہ خود

کہتے ہیں میں اس وقت اسلام لایا جب میں غلام تھا ایک لڑکا تھا۔

سبقتکم الی الاسلام طراً
غلاماً ما بلغت اوان حلمی

نماز بالغ ہونے پر فرض ہوتی ہے۔ جب حضورؐ پر نماز تہجد فرض ہوئی تو آپ کے ساتھ جماعت میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ سب فرض کی ادائیگی میں حضرت علیؓ پر سبقت لے گئے۔ آپ پر تو اس وقت نماز فرض نہ تھی۔ قرآن کریم میں اس وقت کے نمازیوں کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

ان ربک یعلم انک تقوم ادنیٰ من ثلثی اللیل ونصفہ وثلثہ وطائفۃ من الذین معک. (پ ۲۹ المزمل ۲۰)

ترجمہ: ''بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو (نماز میں) کھڑا رہتا ہے۔ دو تہائی رات اور آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات اور کچھ لوگ تیرے ساتھیوں سے بھی۔''

اس سے معلوم ہوا اس وقت بھی بہت سے صحابہ حضورؐ کے ساتھ اس طرح نماز میں شامل ہوتے اور ان کے پاؤں کھڑے کھڑے سوج جاتے تھے اور یہ بات بلاشبہ ہے کہ ابھی حضرت علیؓ پر نماز فرض نہ ہوئی تھی۔ سوانا اول من صلیٰ میں ان کی سبقت اپنی عمر کے لڑکوں پر ہی ہوسکتی ہے اور لڑکے ان دنوں کب دو تہائی رات جاگنے والے تھے۔ یہ بات آپ خود سوچیں۔

رافضی کا ایک اور مفروضہ بھی اس کے اس موقف کی کھلی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضورؐ کی جماعت میں غیر مخلصین پہلے آئے تھے اور مخلصین بعد میں ان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

''جماعت رسول میں ایک خالص مخلص پاک دل گروہ ہمارے خاص حکم سے داخل کیا گیا اور اسی گروہ کو مومن کا لقب ملا۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۷)

جو گروہ کسی جماعت میں داخل کیا جائے یقیناً وہ بعد کے لوگ ہوتے ہیں۔ صحابہؓ اس سے پہلے جماعتِ رسول ہونے کا شرف پا چکے تھے۔ سبقت لے جانے والے سبقت لے گئے۔ گروہ کو عربی میں شیعہ کہتے ہیں اور یہ درست ہے کہ شیعہ اہل سنت کے بعد کی پیداوار ہیں۔

حضرت علیؓ نابالغوں میں پہلے اسلام لانے والے تھے۔ یہ بحث ہم نے یہاں ضمناً کر دی ہے ورنہ خلافت کی ذمہ داریاں بڑی عمر کے لوگوں پر بھی آتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ انہوں نے ہی ادا کیں۔ حضورؐ جب خود نبوت کے کام پر چالیس سال کی عمر میں لگے تو آپ کے جانشین بھی تو وہی ہونے چاہئیں جو کم از کم زندگی کی چالیس بہاریں پہلے دیکھ چکے ہوں۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے بھی خلافت اسی وقت قبول کی جب آپ چالیس سال سے زائد عمر کے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے انتخاب خلافت کے وقت حضرت علی کی عمر مبارک صرف ستائیس برس کی تھی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ اس عمر میں حضورؐ پر بھی سبقت لے جائیں اور چالیس سال کے ہونے سے پہلے ہی منصب خلافت پر آ جائیں۔

قرآن کریم نے منافقوں کی بات بتائی، رافضی نے وہ انصار پر لگا دی

قرآن کریم میں ان لوگوں کی بات جو دل سے اللہ اور قیامت پر ایمان نہ رکھتے تھے اور شکوک وشبہات میں مبتلا تھے ان الفاظ سے شروع کی ہے:

انما یستاذنک الذین لا یؤمنون باللّٰہ والیوم الآخر وارتابت قلوبھم فھم فی ریبھم یترددون. (پ ۱۰ التوبہ ۴۵)

پھر ان کی خدمت کا یہ سلسلہ آیت ۵۸ تک چلا گیا ہے۔ رافضی نے اس پر یہ سرخی جمائی ہے:-

''انصار میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول خدا پر اعتراض کیا کرتے تھے۔'' (تجلیات صداقت ص ۶۸)

رافضی نے یہاں منافقوں کی بات انصار پر لگا دی ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ بات منافقوں کی ہوسکتی ہے یا بعض بدوؤں کی جو ابھی تک مقام رسالت کو سمجھ نہ پائے تھے۔ انہیں اس طرح انصار پر منطبق کر دینا کسی مومن کا کام نہیں ہو سکتا۔ شیخ الاسلام نے ان آیات کا مصداق کون لوگ بتاتے ہیں اسے دیکھئے:

''بعض منافقین اور بعض اعراب (بدو) صدقات وغنائم کی تقسیم کے وقت دنیوی حرص اور خودغرضی کی راہ سے حضور کی نسبت زبان طعن کھولتے تھے کہ تقسیم میں انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔'' (تفسیر عثمانی ص ۲۵۹)

منافقین کی طرف سے تو یہ بات از راہ نفاق کہی گئی لیکن بعض بدو جو منافقین میں سے نہ تھے لیکن ابھی ان کی تربیت نہ ہوئی تھی وہ بھی یہ بات اپنی نادانی سے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے ابھی بن کا اصول پوری طرح نہ سمجھا تھا کہ نبی سے کوئی خیانت نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھانے کے لیے قرآن کریم میں یہ آیت اتاری:

ما کان لنبی ان یغل ومن یغلل یات بما غل یوم القیٰمۃ. (پ ۴ آل عمران ۱۶۱)

ترجمہ: ''اور یہ نبی سے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی طرح کی خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا اسے لے کر وہ میدان حشر میں آئے گا۔''

اس آیت میں کن لوگوں کو سمجھانا مقصود ہے۔ ان نادان مسلمانوں کو جن کی ابھی پوری طرح تربیت نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ اس آیت سے پہلے یہ الفاظ موجود ہیں۔ وعلی اللّٰہ فلیتوکل المومنون۔ (آیت ۱۶۰) اس دور تربیت میں اگر

ان سے کوئی ایسی بات صادر ہوئی تو اس کا منشاء نفاق نہیں ان کی نادانی اور نوجوانی رہی اور اس میں بھی فیصلہ حضورؐ پر ٹھہرتا ہے۔ آپ نے انہیں کافر ٹھہرایا یا ان کی اس نادانی پر صبر کیا اور ان کی صحیح خطوط پر تربیت فرمائی' اسے آگے دیکھیں پہلے ہی ان پر کفر نہ اتار دیں۔

حضورؐ نے جب ان کی تربیت فرما دی تو یہ سب لوگ پکار اٹھے قد رضینا ہم حضورؐ کے فیصلے اور تقسیم پر راضی ہیں۔ افسوس کہ رافضی نے ان نوجوان انصاریوں کا اعتراض تو نقل کیا لیکن پھر حضورؐ کا اس پر صبر فرمانا اور ان کی تربیت فرمانا اور پھر ان کا یہ کہنا کہ ہم آپ کی اس تقسیم پر راضی ہیں اسے نقل نہ کرنا اس کے رفض کی خبر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح بخاری کے اسی صفحہ پر موجود ہے۔ یہ اس کی علمی خیانت اور بغض باطنی کی ایک شرمناک مثال ہے۔ یہاں ہم وہ پوری روایت ہدیہ قارئین کیے دیتے ہیں۔

قال انس فحدث رسول الله صلى الله عليه وسلم بمقالتهم فارسل الى الانصار فجمعهم فى قبة من ادم ولم يدع معهم غيرهم فلما اجتمعوا قام النبى صلى الله عليه وسلم فقال ما حديث بلغنى عنكم فقال فقهاء الانصار اما روساؤنا يا رسول الله فلم يقولوا شيأ واما ناس منا حديثة اسنانهم فقالوا يغفر الله لرسول الله يعطى قريشاً و يتركنا وسيوفنا تقطر من دمائهم فقال النبى صلى الله عليه وسلم فانى اعطى رجالاً حديثى عهد ،كفر أتالفهم اما ترضون ان يذهب الناس بالاموال وتذهبون بالنبى الى رحالكم فو الله لما تنقلبون به خير مما ينقلبون به قالوا يا رسول الله قد رضينا فقال لهم النبى صلى الله عليه وسلم ستجدون اثرة شديدة فاصبروا حتى تلقوا الله ورسوله فانى على الحوض.

(صحيح بخارى ج ٢ ص ٦٢٠)

ترجمہ: ''حضرت انسؓ کہتے ہیں' حضور اکرمؐ کو ان کی بات بتائی گئی' آپؐ نے انصار کو بلا بھیجا۔ آپ نے انہیں ایک خیمے میں جمع فرمایا اور ان کے ساتھ کسی اور کو نہ بلایا۔ جب یہ سب جمع ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا' یہ کیا بات مجھے تم سے پہنچی ہے؟ انصار میں جو فقہاء تھے انہوں نے کہا حضور! ہمارے بڑوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی البتہ ہمارے بعض نوعمر لوگوں نے کہا۔ اللہ حضورؐ پر رحم فرمائے۔ آپ مکہ والوں کو تو دے رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں اور ہماری تلواروں سے ابھی تک مشرکین کا خون بہہ رہا ہے۔ اس پر حضور اکرمؐ نے فرمایا میں ان لوگوں کو دے رہا ہوں جو ابھی کفر چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں ان کی تالیف قلب کر رہا ہوں۔ اے انصار کیا تم اس سے راضی نہیں کہ اور لوگ تو مال لے کر جائیں اور تم خود اللہ کے نبی کو لے کر اپنے گھروں کو پہنچو۔ بخدا تم جو لے جا رہے ہو وہ اس سے کہیں بہتر ہے وہ جو یہ نئے آنے والے قریش اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس پر انصار نے کہا' یارسول اللہ! ہم (اس تقسیم پر) راضی ہیں۔ حضور اکرمؐ نے انہیں کہا' تم جلد ترجیح پاؤ گے' صبر کرو۔ یہاں تک کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے آملو جب میں حوض پر کھڑا ہوں گا۔''

اس روایت میں یہ چند امور واضح ہیں:

١۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس نادانی پر انہیں نہ اپنے سے علیحدہ کیا نہ انہیں منافق یا کافر ٹھہرایا۔ انصار میں جو فقہاء تھے انہوں نے بھی صرف نوعمر لوگوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان پر حضورؐ سے بدگمان ہونے اور آپ کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی تہمت نہ لگائی۔ فقہاء صحابہؓ ان کے اندر کے جذبات اور ان کے تصدیق رسالت کے خیالات سے پورے طور پر واقف تھے۔ انہوں نے ان کی یہ بات حضورؐ سے گزارش کی اور حضورؐ نے بھی اس کا انکار نہ فرمایا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے مسلمانوں میں کوئی پارٹی بازی قائم کر دی گئی ہو۔ بات بات میں فرقہ بندی کرنا صحابہ کے مزاج میں نہ تھا اور ان میں بے شک فقہاء بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے وہ مہاجرین میں بھی تھے اور انصار میں بھی۔

٢۔ حضورؐ نے جب انہیں بتایا کہ آپ ان کی مولفة القلوب کے طور پر مدد کر رہے تھے تو وہ حضور سے پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ ان کا ایمان جاگ اٹھا اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم حضورؐ کے فیصلے سے راضی ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ تصدیق رسالت میں کسی درجہ شک میں نہ تھے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے دامن رحمت میں لیے ہوئے تھے۔ آپؐ نے انہیں بتایا کہ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ گے تو آپ کی توجہ اور اعتناء ان کے ساتھ ہو گی۔ گویا وہ آپ کی معیت میں اپنے گھروں میں پہنچیں گے۔

٣۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسے موقع پر صبر کی تعلیم دی' بدگمانی پر آنے سے روکا اور انہیں خوشخبری دی کہ وہ حوض کوثر پر ساقی کوثر سے ملیں گے۔ یہ ان کے اندر کے ایمان کی شہادت ہے۔ حوض کوثر پر وہی پہنچنے کی سعادت پائے گا جو ایمان لے کر یہاں سے گیا ہو۔

٤۔ یہ ساری بگڑی بات اب کیسے درست ہو گئی؟ یہ اس طرح کہ ان میں فقہاء صحابہؓ موجود تھے جنہوں نے ان کو بھی سمجھایا اور حضورؐ کے سامنے بھی ان کی بات پوری صفائی سے رکھی۔ جب کسی قوم میں فقہاء موجود ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے خیر کا ارادہ کیا ہوا ہے۔

۵۔ ان کے اعتراض کرنے کے وقت کے ان کے اس جملہ پر بھی غور کریں۔ یغفر اللّٰہ لرسول اللّٰہ وہ اس وقت بھی حضور کے لیے دعا گو تھے۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ کی اس تقسیم پر آپ سے ناراض نہ ہو۔ وہ قریش کو یہ مال ملنے سے تو ناخوش تھے لیکن حضورؐ سے وہ ہرگز کسی درجہ میں ناخوش نہ تھے۔ ورنہ وہ آپ کے لیے اس طرح دعا گو نہ ہوتے۔

حضور اکرمؐ نے تو اس شخص کے ان الفاظ پر بھی صبر کیا جب اس نے کہا ما ارید بھٰذہ القسمۃ وجہ اللّٰہ تو ظاہر ہے کہ آپ ظاہر الفاظ کو نہ لیتے تھے‘ ان کے دلوں کو پڑھتے تھے۔ آپ کی لطیف طبیعت پر ان باتوں کا اثر تو ہوگا لیکن مقام نبوت کی الٰہی ذمہ داریوں پر آپ صبر کرتے اور پہلے پیغمبروں کی اس قسم کی مشکلات کو یاد کرتے۔ آپ کو جب کسی کے اس جملہ کی اطلاع دی گئی تو آپ کے چہرے پر اس کے اثرات آئے لیکن رحمۃ للعالمین نے کیا فرمایا۔ اسے صحیح بخاری میں دیکھیے۔

رحم اللّٰہ موسیٰ قد اوذی باکثر من ھذا فصبر۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۱)

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ موسیٰ پر مہربان ہو‘ آپ کو اس سے بھی زیادہ تکلیفیں دی گئیں۔‘‘

یعنی میری امت نے مجھے اتنا تنگ نہیں کیا جتنا موسیٰؑ کی امت انہیں تنگ کرتی رہی۔

آیئے اب ہم چھٹی آیت میں چلیں

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل۔ اولٰئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلاً وعد اللّٰہ الحسنیٰ۔ (پ ۲۷ الحدید)

ترجمہ: ’’برابر نہیں تم میں جس نے خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا۔ ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو خرچ کریں اس کے بعد اور لڑیں (کافروں سے) اور اللہ کا وعدہ جنت تو دونوں سے ہے۔‘‘

یہاں کن لوگوں کے مال خرچ کرنے کی تعریف کی جارہی ہے؟ ان لوگوں کے مال خرچ کرنے کی جن سے اسلام کی یہ پوری تحریک چلی۔ حضور اکرمؐ نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں۔ حضرت عثمانؓ نے غزوہ تبوک کی تیاری تین سو اونٹ مال تجارت سے لدے اس موقع پر حضورؐ کے سامنے پیش کیے۔ واقعی بڑے کاموں کے لیے بڑی بڑی رقموں اور مال سے لدے اونٹوں کی ضرورت تھی اور وہ اخراجات ان حضرات نے پورے کیے۔

مگر رافضی کہتا ہے کہ حضورؐ کے لیے خرچ کرنے والے صرف حضرت علیؓ تھے۔ آپ نے حضورؐ کے لیے کیا خرچ کیا‘ اس رافضی سے سنیں۔

رافضی لکھتا ہے:۔

’’آپ کے پاس (حضرت علیؓ کے پاس) کل ایک دینار تھا جسے تڑوا کر آپ نے دس درہم لیے اور ہر روز ایک درہم صدقہ دیتے اور آنحضرتؐ سے راز کی باتیں کرتے۔ دس مرتبہ آنحضرتؐ سے راز و نیاز کی باتیں کیں۔‘‘ (تجلیات صداقت ص ۷۰)

جس نے تحریک اسلام کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو کیا وہ تسلیم کر سکتا ہے کہ اس راہ میں خرچ کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایک درہم روزانہ سے زیادہ کبھی صدقہ نہ کر سکیں؟ قرآن پاک نے فتح مکہ سے پہلے جن خرچ کرنے والوں کی تعریف کی ہے وہ جس شان و شوکت سے کی ہے اس کا مطلب یہ کبھی نہیں لیا جا سکتا کہ ایک درہم کے صدقہ سے وہ حضورؐ کے پاس حاضر ہونے کا موقعہ پاتے تھے۔ کیا یہ ان لوگوں کی مدح ہے جو ایک درہم روزانہ سے زیادہ کچھ نہ دے سکتے تھے۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ کی مالی وسعت ان کی اس ایک بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ آپ پر عمر بھر کبھی زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔ حضرت سیدہ فاطمہؓ کا مہر ادا کرنے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے آپ کو اس کے لیے رقم مہیا کی تھی۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ خود فرماتے ہیں:

وما وجبت علّی زکوٰۃ مال   وھل تجب الزکوٰۃ علی الجواد

ترجمہ: ’’اور مجھ پر کبھی زکوٰۃ فرض نہ ہوئی‘ کیا کبھی سخی پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔‘‘

ان ہی کے مال سے حضورؐ نے تحریک اسلام کی پوری آبیاری کی‘ تاریخ کا کوئی طالب علم اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ دوسری طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات تواتر کے درجہ کو پہنچ رہے ہیں۔ حضرت ابو سعیدؓ الخدریؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

ان من امن الناس علی فی صحبتہ و مالہ ابوبکر۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶)

ترجمہ: ’’بیشک مجھ پر سب سے زیادہ احسان صحابیت میں اور مال خرچ کرنے میں ابوبکرؓ کا ہے۔‘‘

حضرت ابو ہریرہؓ بھی کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

ما لاحد عندنا ید الا وقد کافیناہ ما خلا ابابکر فان لہ عندنا یداً یکافیہ اللّٰہ بھا یوم القیٰمۃ وما نفعنی مال احد قط ما نفعنی مال ابی بکر۔ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: ’’ہم پر جس نے بھی کوئی احسان کیا ہم نے اس کا بدلہ اسے دے دیا سوائے ابوبکرؓ کے۔ اس کے ہم پر ایسے احسانات ہیں کہ اللہ ہی ان کا اسے بدلہ دیں گے قیامت کے دن۔ اور مجھے کسی کے مال نے اس قدر فائدہ نہیں دیا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے۔‘‘

سو یہ بات صحیح ہے کہ آپؓ نے کبھی ایک دینار سے حضورؐ کی خدمت میں دس مرتبہ حاضری نہ دی ہوگی۔

قرآن کریم میں فتح مکہ سے پہلے ان خرچ کرنے والوں اور جنگوں میں حصہ لینے والوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اور جنت میں صرف مومن ہی جاسکتے ہیں۔ سو یہ آیت ان حضرات کے ایمان کی کھلی شہادت ہے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ بھی کیا اور جنگیں بھی لڑیں اور حضرت ابوبکرؓ اس میں سب سے نمایاں تھے۔

رافضی جگہ جگہ یہ وضعی روایت پیش کرنے میں پیش پیش ہے کہ حضورؐ نے جنگ احد کے دن حضرت علیؓ سے کہا تم اپنے بھائیوں کے ساتھ دور کیوں نہ چلے گئے؟ تو آپ نے کہا آیا کافر شوم بعد از ایمان...... مرا بہ تو کار ست نہ بایاراں و برادران (بحوالہ مدارج النبوۃ ۲ ص ۱۶۷)

اس کتاب مدارج النبوۃ میں اس روایت کے بارے میں آگے یہ لکھا ہے:

امام ذھبی جو اسماء الرجال کے امام ہیں وہ میزان الاعتدال میں اس کی تضعیف و تکذیب کرتے ہیں۔

(ایضاً ج ۲ ص ۲۱۲ ترجمہ اردو)

پھر اس میں حضرت علیؓ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے آپ نے فرمایا:

''احد کے دن مجھ پر سولہ تلواروں کی واریں پڑیں جن میں سے چار واروں میں تو میں زمین پر آ گیا۔

کوئی بد بخت یہ نہ کہے کہ آپ جب اس دن مختلف موقعوں پر زمین پر گر پڑے تو آپ شیرِ خدا نہ رہے۔ جنگ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ لیکن اس قسم کے واقعات میں کسی کی شخصی عظمت اور صولت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ آپ کمزور تھے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

آپ کے چار دفعہ زمین پر گرنے سے آپ سے شجاعت کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہر دفعہ حضرت جبریلؑ کو بھیج دیتے تھے۔ وہ آپ کو زمین سے اٹھا کر پھر کھڑا کر دیتے تھے۔ یہ جبریل کے ذریعہ آپ کی نصرت قدسی تھی۔ یہ نہ کہا جائے کہ پھر تو ان کی یہ فتوحات تو بواسطہ جبریل وجود میں آتی رہیں۔ پھر یہ آپ کی اپنی بہادری تو نہ رہی۔ نہ ذوالفقار ہی ایسی تلوار تھی کہ جس کا نشانہ خطا نہ ہو۔ جبریل کی مدد اترے یہ بھی تو کوئی معمولی مقام نہیں۔ جنگ بدر میں تو تمام صحابہؓ کی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مدد کی تھی۔

اس آیت کے ضمن میں رافضی نے سورہ مجادلہ کی ایک آیت پیش کی ہے، وہ لکھتا ہے:

''یہ لوگ راہ خدا میں چند درہم بھی خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ آیت مبارکہ اتری:

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرّسول فقدموا بین یدی نجوٰکم صدقة .

(پ ۲۸ المجادلہ ۱۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب رسول سے تخلیہ میں کوئی بات کرنا ہو تو اس سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔''

رافضی لکھتا ہے:

''اصحاب رسول یکے بعد دیگرے ہر وقت اور دیر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیہ میں باتیں کرتے رہتے تھے جس سے آنحضرت کو اذیت ہوتی تھی...... حکم نازل کیا کہ تخلیہ سے پہلے کچھ مال بطور صدقہ دے دیا کرو۔ بناء پر مشہور دس روز تک یہ حکم برقرار رہا مگر تاریخ شاہد ہے کہ سوائے شاہ اولیاء علی مرتضیٰ کے اور کسی نے اس پر عمل نہ کیا۔ آپ کے پاس کل ایک دینار تھا جسے تڑوا کر آپ نے دس درہم لیے اور ہر روز ایک درہم صدقہ دیتے اور آنحضرتؐ سے راز کی باتیں کرتے حتیٰ کہ اس اثناء میں دس مرتبہ آنحضرتؐ سے راز و نیاز کی باتیں کیں مگر دوسرے صحابہ نے اس دوران تخلیہ کا نام بھی نہ لیا...... اس کے بعد خدا نے یہ فرما کر کہ ء اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجوٰکم صدقة۔ یہ حکم ہی منسوخ کر دیا۔'' (تجلیات صداقت ص ۷۰)

الجواب:

۱۔ یہ حکم کن لوگوں کو ہوا تھا؟ اصحابؓ رسول کو۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کس عنوان سے مخاطب کیا؟ یا ایھا الذین امنوا کے پُر افتخار خطاب سے۔ سو اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ جن لوگوں کو یہ حکم دیا گیا تھا اور وہ حضور کی مجلس میں بیٹھے رہنے سے حضور کو اذیت دیتے تھے وہ سب اہل ایمان تھے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ انہیں اے ایمان والو کہہ کر خطاب نہ کرتا۔ دیکھیے کہ کس طرح بہ نص قرآن ان حضرات کا ایمان ثابت ہو گیا۔

۲۔ پھر یہ حکم جس پر صرف حضرت علیؓ نے ہی عمل کیا اور دوسرے اس پر عمل پیرا نہ ہوئے۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے بالآخر کن کا ساتھ دیا کہ یہ حکم ہی اٹھا لیا۔ معلوم ہوا یہ ان حضرات کا اس پر عمل نہ کرنا اسے ہی اللہ تعالیٰ نے بالآخر باقی رکھا جس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات کس درجہ محبوبان درگاہ ایزدی تھے کہ ان کے موقف کو اس نے قبولیت بخشی اور اس حکم کو ہی اٹھا لیا۔

۳۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک دینار کو دس دن اسی کام کے لیے رکھا اور ان دس دنوں میں نہ کچھ کھایا نہ کچھ خریدا۔ دس دن بھوکے رہ کر حضورؐ سے راز کی باتیں کیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر صاحب سرّ رسول حضرت علیؑ کو ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ کا ٹائٹل حضرت حذیفہؓ کیوں لے گئے جنہیں بہ اتفاق امت صاحب سرّ رسولؐ مانا گیا ہے۔

۴۔ رافضی نے یہ جو کہا ہے کہ دوسرے صحابہ نے اس دوران تخلیہ کا نام بھی نہ لیا' غلط ہے کئی لوگ صدقہ دے کر حضورؐ کی خدمت میں تخلیہ میں باتیں کرتے رہے۔ تفسیر در منثور میں ہے:

واما اهل السرة فمنع بعضهم ماله و حبس نفسه الا طوائف عنهم جعلوا يقدمون الصدقة بين النجوىٰ . (در منثور ج ۶ ص ۲۷۲)

یہ لوگ انصار میں سے تھے۔ اگر ایسا بھی ہو تو بات تو غلط ہو ہی گئی کہ اس حکم پر سوائے حضرت علیؓ کے اور کسی نے عمل نہیں کیا۔ ایک مہاجر نے بھی اس پر عمل کیا جو بدری صحابہ میں سے تھا۔ مورخین اس کا نام معلوم نہ کر پائے۔ اگر اس سے مراد حضرت علیؓ ہی ہوں تو آپ کو اس عامی درجے میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

ويزعمون انه لم يفعل ذلک غير رجل من المهاجرين من اهل بدر فانزل الله ء اشفقتم. (ایضاً)

حضرت علیؓ خود اس حکم سے خوش نہ تھے

جب یہ آیت اتری کہ حضورؐ سے تخلیہ میں بات کرنے کے لیے پہلے کچھ صدقہ دے کر آیا کرو تو حضورؐ نے حضرت علیؓ سے مشورہ کیا کہ تخلیہ میں آنے کے لیے کتنی رقم صدقہ میں دی جانی چاہیے؟ کیا ایک دینار ہو جائے۔ حضرت علیؓ نے کہا **لا يطيقونه** ان کی اتنی بساط نہیں۔ آپؐ نے کہا تو نصف دینار ہو جائے۔ حضرت علیؓ نے کہا وہ اتنی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ آپؐ نے کہا تو تم ہی کہو کم از کم مقدار صدقہ کیا ہو؟ آپؓ نے کہا جو کے برابر صدقہ کافی سمجھا جانا چاہیے۔ اس پر حضورؐ نے حضرت علیؓ سے کہا **انک زهيد** تو بہت ہی چھوٹا آدمی نکلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ حکم اٹھا لیا کہ تم اس صدقہ سے ڈر گئے۔ حضرت علیؓ بڑے فخر سے کہتے تھے

فبى خفف الله عن هذه الامة .

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے اس امت سے یہ ذمہ داری اٹھالی۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ خود بھی اس حکم سے خوش نہ تھے۔ غالباً اسی وجہ سے دیگر اکابر صحابہ نے اس پر عمل نہیں کیا تاکہ غریب صحابہ کی اس سے دل شکنی نہ ہو کہ یہ صاحب مال ہونے کی بناء پر حضورؐ سے قریب ہو گئے اور عام نادار ہونے کی بناء پر حضورؐ سے یہ مقام حضوری پا نہ سکے۔ حضرت عثمانؓ جیسے مالدار کا اس آیت پر عمل نہ کرنا صرف مساکین اور نادار صحابہؓ کی دلجوئی کے لیے تھا جو لوگ تین سو اونٹ مال تجارت سے لدے ہوئے اللہ کی راہ میں دے سکتے تھے ان کے لیے ایک دینار کا صدقہ کیا وزن رکھتا ہے۔

حضرت علیؓ نے حضورؐ کی زبان سے اپنے لیے **انک زهيد** کے الفاظ تو سن لیے لیکن صدقہ کی مقدار کم سے کم

تجویز کی۔ ایسی کہ جس پر مساکین صحابہؓ بھی عمل کر سکیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔

(نوٹ) مشہور تابعی مفسر امام مجاہد کا قول ہے کہ یہ حکم کلیۃً منسوخ نہ ہوا تھا اس پر عمل نہ کرنے کی صرف اجازت مل گئی تھی۔

آپؒ کہتے ہیں:

اول من صنع ذلک على بن ابى طالب ثم نزلت الرخصة فاذ لم تفعلوا و تاب الله عليكم ...... والله خبير بما تفعلون. (پ ۲۸ المجادله ۱۳)

ترجمہ: ''سب سے پہلے جس نے اس پر عمل کیا وہ حضرت علیؓ تھے پھر اسے نہ کرنے کی بھی اجازت مل گئی، جب تم اس پر عمل نہ کر سکو اور اللہ نے تمہیں یہ رعایت دے دی ہے۔''

زهيد کے معنی عربی لغت میں

حضرت علیؓ جب مقدار صدقہ کو کم کرتے گئے تو حضورؐ نے فرمایا **انک زهيد** سو یہاں دیکھیے کہ عربی زبان میں **زهيد** کسے کہتے ہیں۔

هو زهيد الخلق وہ تنگ خو ہے۔ کم۔ حقیر۔ **ماءٍ زهيد** وہ وادی جو کم پانی لے **المزهد** کم بالوں والا۔

(دیکھئے مصباح اللغات ص ۳۴۸)

عن على بن ابى طالب قال لما نزلت يا ايها الذين امنوا اذا ناجيتم الرّسول فقدموا بين يدى نجوٰكم صدقة قال لى النبىؐ ما ترى ديناراً قلت لا يطيقونه قال فنصف دينار قلت لا يطيقونه قال فكم قلت شعيرة قال انک زهيد قال فنزلت ء اشفقتم. (الدر المنثور ج ۶ ص ۲۷۲)

رافضی کی ایک اور بے سند بات سنیے

''آنحضرتؐ بوقت ہجرت طعام رسانی کا انتظام کرنے کا حضرت علیؓ کو حکم دے گئے تھے۔ چنانچہ ان کے تشریف لے جانے کے بعد جب تک آنحضرت غار ثور میں قیام پذیر رہے۔ حضرت علیؓ ہی ان کے خورد و نوش کا بندوبست کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر در منثور۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۷)

الجواب: حضورؐ کا حضرت علیؓ کو یہ حکم دینا کہیں ثابت نہیں۔ حضرت علیؓ اس رات حضورؐ کے بستر پر سو رہے تھے آپ کے لیے کھانا لانے کہیں نہ گئے تھے۔ رافضی نے یہ بالکل بے سند بات کہی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ

حضرت علیؓ صرف حضورؐ کے لیے کھانا بھیجتے تھے یا حضرت ابوبکرؓ کے لیے بھی بھیجتے تھے۔ عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی کہ ایسی راز داری کے وقت دونوں کا کھانا علیحدہ علیحدہ آتا ہو۔ اور اگر حضورؐ ہی کہہ گئے تھے کہ دونوں کے لیے کھانا بھیجتے رہیں تو پھر رافضیوں کی یہ بات از خود ختم ہو جاتی ہے کہ ابوبکرؓ تو اتفاقاً راستے میں ملے تھے اور حضورؐ کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ سفر ہجرت میں غار ثور میں ٹھہرنا کیا یہ کوئی پہلے کا بنا منصوبہ تھا اور آپ حضرت علیؓ کو بتا گئے تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو آپؐ نے پہلے سے غار ثور کی صفائی کیوں نہ کرا لی تھی۔ غار ثور میں ٹھہرنے کا فیصلہ تو راستے کا ایک اتفاقی فیصلہ تھا اور وہ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ جانتے تھے جو بکریاں چراتے وہاں آتے جاتے رہے اور انہیں پہلے سے اعتماد میں لیا گیا تھا۔ حضرت علیؓ ایک معروف شخصیت تھے وہ کیسے اس غار میں آتے جاتے رہے ہوں گے اور کھانا لاتے رہے ہوں گے۔ اگر کھانا کسی کے ہاتھ بھیجتے تھے تو وہ کون تھا جس پر حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں کا برابر اعتماد رہا ہو؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟ وہ عامر بن فہیرہ ہی ہے جو حضرت ابوبکرؓ کا آزاد کردہ غلام تھا اور پہلے سے وہ اعتماد میں لیا ہوا تھا۔

رافضی نے درمنثور کا حوالہ دیا ہے۔ لیجیے ہم درمنثور کی اصل عبارت بھی پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سے آپ اس رافضی کی خیانت کا اندازہ لگائیں جو درمنثور کے حوالے سے اپنی بات چلا رہا ہے۔

وما کان احد یعلم مکان ذلک الغار الا عبد الرحمٰن بن ابی بکر و اسماء بنت ابی بکر فانھما کانا یختلفان الیھما و عامر بن فھیرۃ مولیٰ ابی بکر رضی اللہ عنہ فانّہ کان اذا سرح غنمہ مربھا فحلب لھما. (الدر المنثور ج ۳ ص ۴۳۶)

ترجمہ: ''کوئی شخص ماسوائے حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے اور بیٹی کے اس غار کو نہ جانتا تھا۔ یہ دونوں اور حضرت ابوبکرؓ کا آزاد کردہ غلام اس میں حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس آتے جاتے تھے۔ جب عامر بن فہیرہ کی بکریاں وہاں چرتے جا نکلتیں تو وہ ان دونوں کے لیے ان کا دودھ دھو لیتے تھے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غار میں حضرت ابوبکرؓ کے لیے قیامت کے دن اپنے درجہ معیت کی دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے وہیں آپ کو وحی کی کہ اس نے آپ کی دعا قبول فرما لی ہے۔

فرفع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدیہ وقال اللّٰھم اجعل ابابکر معی فی درجتی یوم القیٰمۃ فا وحی اللہ الیہ ان اللہ قد استجاب لک. (ایضاً ص ۴۳۴)

ترجمہ: ''حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور حضرت ابوبکرؓ کے لیے قیامت کے دن اپنے ساتھ رہنے کی دعا کی' اے اللہ! ابوبکرؓ کو میرے ساتھ قیامت کے دن بھی میری رفاقت میں دے۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضورؐ کو خبر دی کہ آپ کی دعا اللہ نے قبول کر لی ہے۔''

رافضی عامر بن فہیرہ کو درمیان سے نکال کر بڑی ڈھٹائی سے لکھتا ہے کہ حضرت علیؓ ہی ان دونوں کے خورد و نوش کا بندوبست کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر درمنثور۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی کسی وقت کھانا بھجوانے کا انتظام کیا ہو لیکن مستقل طور پر کھانا حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے ہی آتا رہا اور آپؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ ہی اسے لے کر آتے تھے۔ اب صرف اس لیے کہ اس سے اس سفر ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ کے پورے گھرانے کی خدمات کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور اس سے شیعہ حضرات کے عقیدے کی پوری چھت زمین پر آ گرتی ہے اس کے مقابل ایک دوسری روایت وضع کرنا کہ یہ سب خدمت حضرت علیؓ ہی بجالاتے رہے تاریخ اسے کسی درجہ میں قبول نہیں کرتی۔ شاذ بات کو کسی شاذ وقت کی کہانی ہی کہا جا سکتا ہے۔

رافضی کے بغض باطنی کا ایک اور شرمناک مظاہرہ

''ابوبکرؓ صاحب آنحضرت پر اپنا مال خرچ کرنے کی بجائے الٹا ان سے مال ہتھیاتے تھے۔ اونٹنی آنحضرتؐ کے ہاتھ صرف سو درہم نفع پر فروخت کی تھی۔'' (تجلیات ص ۱۷)

الجواب: رافضی نے اس مال ہتھیانے کے دعوے پر مدارج النبوہ کا حوالہ دیا ہے۔ ہم مدارج النبوہ کی عبارت نقل کر دینے میں اس بے تکی کا پورا جواب سمجھتے ہیں۔

''حضرت ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہ کے دو اونٹ تھے۔ جنہیں انہوں نے چار سو درھم میں خریدا تھا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آٹھ سو درہم (فی کس) میں خریدا تھا اور چار مہینہ پہلے سے انہیں خوب چارہ پانی دے کر موٹا تازہ کر رہے تھے۔ دونوں کو انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تا کہ ان میں سے ایک حضورؐ قبول فرمالیں۔ حضورؐ نے اسے قبول کیا مگر کہا کہ اس کی قیمت لینی ہوگی اور حضورؐ نے ایک اونٹ کو نو سو درہم میں خرید لیا۔ حضرت ابوبکرؓ سے اونٹ خریدنے میں ایک حکمت پنہاں تھی۔ باوجودیکہ باہم انتہائی صدق و اخلاص اور اتحاد و اتفاق موجود تھا اور اس سے پہلے بھی حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت کثرت سے اپنا مال خرچ کر چکے تھے لیکن اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ چاہا کہ راہ خدا میں کسی اور سے استمداد و استعانت کریں جیسا کہ آیت کریمہ کے مفہوم کا اشارہ ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً۔ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو اپنا ساجھی نہ بناؤ۔'' (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۹۶)

اس عبارت میں یہ باتیں خصوصیت سے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ نے ایک اونٹ ویسے ہی ہدیۃً حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا' قیمت لینے کا نہ کہا تھا۔

حضورؐ نے اسے بلا قیمت لینا منظور نہ کیا تھا۔ نئی قیمت بھی حضورؐ نے لگائی تھی۔ آپ جانتے تھے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اسے آٹھ سو میں خریدا تھا۔ چار ماہ اس کی مزید پرورش پر لگنے سے اس کی قیمت نو سو ہوگئی ہے۔ یہ سو درہم کی زیادتی بطور نفع نہ تھی۔ یہ اس پر خرچ ہو چکے تھے۔

۲۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے سے یہ دو اونٹ اسی ارادہ سے پال رکھے تھے کہ یہ سفر ہجرت میں کام آئیں گے۔ یہ آپ کی بصیرت تھی کہ پہلے سے دو اونٹوں کی ضرورت محسوس کی۔ ایک وہ جس پر آپؓ اور حضورؐ سوار ہوئے اور دوسرا جس پر عامر بن فہیرہ راستہ دکھانے کے لیے بیٹھتا تھا۔

قارئین سے ایک نہایت دردمندانہ گزارش

آپ نے اصل صورت حال ملاحظہ فرمالی۔ اونٹ بلا قیمت وصول نہ کرنے کا راز بھی آپ کے سامنے کھل گیا۔ اب آپ ایک دفعہ پھر رافضی کی مذکورہ بالا عبارت مطالعہ فرمائیں اور اسے مدارج النبوۃ میں تلاش کریں۔ آپ کو اس میں کہیں یہ بات نہ ملے گی کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ سے مال ہتھیا لیتے تھے۔ حضورؐ اپنے حلقوں میں کہیں مالدار معروف نہ تھے کہ آپ کہیں پیسے ہتھیانے والوں کا شکار ہوئے ہوں۔ رافضی اگر اپنے بغض کا لاوا اس طرح اگلنے پر مجبور ہے تو اس پر تعجب نہ کیجئے

؎ از کوزہ ہماں تراود کہ در دست

رافضی کی اس طرح کی مذبوحی حرکات سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد علمی تحقیق یا واقعی تاریخ پر نہیں یہ محض جذبات کا ایک کھیل ہے جو یہ لوگ ایک عرصے سے کھیلتے آ رہے ہیں۔ انگریز مورخین ان کی امتیازی اداؤں کے لیے Passion Plays کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بھی کسی کو ان کی ایک راہ کا کچھ پتہ دے گا وہ اسے ایک جذباتی کھیل کا نام ہی دے گا۔

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ ساتویں آیت

هو الذی ایدک بنصره وبالمؤمنین والف بین قلوبهم ...... یا ایها النبی حسبک الله ومن اتبعک من المؤمنین. (پ ۱۰ الانفال ۶۴)

ترجمہ: ”وہی ہے جس نے تیری تائید کی اپنی مدد سے اور مومنین کی مدد سے اور ان کے دل آپس میں جوڑ دیے۔ اے نبیؐ تجھے اللہ کافی ہے اور جو مومنین تیرے ساتھ چل رہے ہیں۔“

اس آیت سے یہ دو باتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ دشمنوں کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ اللہ کی نصرت اور مومنین کی ایک جماعت آپ کی حمایت میں موجود ہے۔ آپ کے دشمن آپ کا بال بیکا نہ کر سکیں گے۔

(۱) اللہ کی نصرت قضاء وقدر میں تیری فتح کا فیصلہ کیے ہوئے ہے۔

(۲) اسباب کی دنیا میں ایک فوج تیری حمایت میں کھڑی کر دی گئی ہے۔

یہاں اس فوج ظفر موج کو کفار ومشرکین کے مقابلہ میں لایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ حضورؐ کے ساتھیوں میں جمہور ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ حضورؐ کے ساتھ کوئی اقل قلیل دو چار یا آٹھ دس افراد ان کافروں کا مقابلہ کریں گے۔ یہاں اس الٰہی فوج کو کفار ومشرکین کی کثیر نفری کے مقابل پیش کیا گیا ہے۔ جنگ بدر میں کفار ومشرکین کے مقابل یہ الٰہی فوج تھی۔ ان کی تعداد اور بڑی دکھانے کے لیے فرشتے بھی ان کے ساتھ اتار دیے گئے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس الٰہی فوج کی ایک بڑی نفری دکھلانا مقصود تھا۔ حالات اور سیاق وسباق کے اس پورے تقاضے کے برعکس یہ ڈھگو رافضی یہ کہتا ہے:

”(حضورؐ کے ساتھیوں کی) اس بڑی جماعت میں مخلص مومنین کی ایک قلیل تعداد ضرور ایسی تھی جس کا دامن نقائص سے پاک تھا۔“ (تجلیات ج ۱ ص ۲۷)

اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ تیری نصرت ہم نے ایک اقل قلیل جماعت سے کر رکھی ہے۔

حالات بتاتے ہیں کہ جنگ احد میں کمزور مومنین نے درہ چھوڑ دیا تو حضورؐ کے قوی مومنین ساتھیوں میں سے کوئی اقل قلیل گروہ وہاں پہنچ کر خالد بن الولیدؓ کے عقبی حملے کو نہ روک سکا۔ کافروں کے مقابل حضورؐ کے یہ جمہور ساتھی ہی تھے جو اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ہارنے کے بعد پھر سے مسلمانوں کو پہاڑ پر جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر سے مسلمانوں کا پانسہ پلٹ گیا اور قریش ناکام مکہ واپس لوٹے۔

دنیا سے انصاف اگر رخصت نہیں ہو گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ **هو الذی ایدک بنصره وبالمؤمنین** میں مومنین سے مراد عام صحابہ نہ تھے، ایک اقل قلیل گروہ مراد ہے جنہیں رسول خدا کی نصرت وحمایت سونپی گئی تھی۔

مولانا دبیر کے استدلال پر ایک دفعہ پھر نظر کریں اور ڈھگو رافضی کی بیان کردہ صورت کا بھی تقابلی جائزہ لیں۔

آپ کا دل کہے گا کہ رافضی سے سوائے ضد کے مولانا دبیرؒ کا کوئی جواب نہیں بن رہا۔

مومنین سے مراد کیا یہاں ایک ہی خاندان کے لوگ نہیں ہو سکتے؟

اللہ تعالیٰ نے جن مومنین کو حضورؐ کی نصرت وحمایت میں کھڑا کیا ان کے بارے میں بتلایا کہ وہ پہلے آپس میں ایک نہ تھے، ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا جس نے ان کو آپس میں ایک کر دیا۔ قرآن کریم کے ان لفظوں پر غور کریں:

هو الذی ایدک بنصره و بالمؤمنین والف بین قلوبهم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبهم و لکن الله الف بینهم انه عزیز حکیم. (انفال ۶۳)

ترجمہ: ''وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے آپ کی اپنے طور پر اور مومنین کے ذریعہ مدد کی اور ان مومنین کے دل آپس میں جوڑ دیے۔ اگر آپ زمین کے پورے خزانے ان کے دل جوڑنے پر خرچ کرتے تو آپ انھیں ایک نہ کر سکتے یہ خدا ہے جس نے ان کے دلوں کو جوڑا اور اللہ تعالیٰ غالب ہیں حکمت والے۔

اب سوچیے، اگر مومنین سے یہاں مراد کوئی اقل قلیل گروہ ہے تو اس گروہ کے ان افراد کا پتہ دیا جائے جو پہلے آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اور پھر اسلام کی خاطر وہ ایک دوسرے کے دوست بنے۔ شیعہ اس اقل قلیل گروہ میں حضرت علیؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوذرؓ وغیرہم کا نام لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ یہ حضرات یا ان کے آباء آپس میں کبھی نہ لڑے تھے۔ پھر وہ لوگ کون ہیں جو پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اسلام نے انہیں بھائی بھائی کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جن کی حمایت و نصرت کا حضورؐ کو یقین دلایا گیا تھا۔ اگر یہ مختلف خاندانوں، خطوں اور قبائل سے آئے ہوئے عام مسلمان مراد نہیں تو ڈھکو رافضی ان کی نشان دہی کرے اور پھر ان کی ان جنگوں کا پتہ دے جو انہوں نے پہلے آپس میں لڑیں اور پھر حضورؐ کی دعوت سے وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

رافضی جب احساس کرتا ہے کہ اس سے مولانا دبیرؒ کے استدلال کا کوئی جواب نہیں بن رہا تو پھر وہ اپنی اسی ڈگر پر آ جاتا ہے جس کا جواب ہم کئی پیرایوں میں پہلے دے آئے ہیں۔ وہ خلفاء ثلثہ پر تبرا کر کے اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالتا ہے۔

مولف کے ممدور حسنؓ خاص یعنی اصحاب ثلثہ اس مقدس گروہ میں داخل نہیں۔ اگر جرأت ہے تو پہلے ان کو منافقین کے زمرہ سے نکالو اور مخلص مومنین کے گروہ میں داخل کرو۔ تب ہم غور کریں گے کہ یہ آیت ان پر منطبق ہوتی ہے یا نہ۔ (تجلیات ص ۴۷)

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ ابھی تک اس ڈھکو نے آیت پر غور نہیں کیا اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے یہ شیعہ کی وہی ایک پرانی ڈگر ہے جس پر وہ محض ضد کے سہارے اب تک چلے آ رہے ہیں اور ان کے اس وہم کا جواب گو ہم بیسیوں دفعہ پہلے دے چکے ہیں لیکن رافضیوں سے جب کوئی بات بن نہیں پڑتی تو وہ اپنی اسی پہلی گردان پر آ جاتے ہیں۔ کسی پر منافق کی تہمت لگانا بڑا آسان کام ہے کیونکہ باہر والوں کے لیے کسی کے دل کو پڑھنا بظاہر خاصا مشکل ہے۔ ڈھکو ان کے ظاہر کو چھوڑ کر جب ان کے باطن پر اپنے استدلال کی بناء رکھتا ہے تو وہ جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ کسی کے اندر کی بات تو وہی درست ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کی طرف سے بتائی گئی ہو۔ باقی سب اوہام ہیں۔

آفتاب ہدایت کی پیش کردہ آٹھویں آیت

محمد رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من الله ورضواناً. سیماهم فی وجوههم من اثر السجود.

(پ ۲۶ الفتح)

ترجمہ: ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ سب زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں، تو دیکھے ان کو رکوع میں سجود میں، اللہ کا فضل ڈھونڈتے اور اس کی رضا کے طلبگار۔ نشانی ان کی ان کے منہ پر سجدوں کے اثرات سے نمایاں ہو چکی ہے۔''

اس آیت میں معیت سے مراد دعوت اور محنت میں آپ کے ساتھ ہونا ہے۔ آپ کی جماعت میں آ کر آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ ڈھکو یونہی معیت کے شش اقسام میں گم ہو رہا ہے۔ حضورؐ کے گرد و پیش کے مسلمان سب دل سے آپ کے ساتھ تھے۔ اگر ان میں صرف ایک اقل قلیل حلقہ دل سے آپ کے ساتھ ہوتا اور دوسرے سب منافق ہوتے تو آیت کے الفاظ والذین امنوا معه ہوتے والذین معه نہ ہوتے۔ حضورؐ کی معیت مطلقہ انہیں حاصل تھی، ان کی پہچان کسی مخفی بات سے نہیں کھلے بندوں ان کے رکوع و سجود سے کرائی گئی۔ باہمی تراحم اسلامی سے کرائی گئی۔ انہیں کافروں سے سختی برتنے والوں کی پہچان دی گئی۔ پوری آیت میں ایک بات بھی کسی مخفی حالت سے وابستہ نہ کی گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ایمان ایک امر مسلم اور تسلیم شدہ درجے میں تھا۔ ان کے ظاہری اعمال کے یہ پیمانے ان کے باطن کی خبر دینے کے لیے کافی رکھے گئے۔ یہ حقیقت ڈھکو رافضی کو بھی تسلیم کرنی پڑی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیت مبارکہ میں جناب رسول خدا کے ساتھ حقیقی ربانی و روحانی معیت رکھنے والے افراد کاملہ و نفوس زکیہ کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔'' (تجلیات ج ۱ ص ۷۳)

بات بالکل واضح ہے مگر رافضی خواہ مخواہ معیت فی الذات اور رجعت فی الصفات کے الجھاؤ کا شکار ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کسی کے ہاں لائق تسلیم نہیں ہو سکتا کہ دعوت اسلام کو جو چار چاند لگے ہیں انہی پانچ چھ اقل القلیل اشخاص کی وجہ سے تھے جو منافقوں کے جم غفیر میں رہ کر رسول خدا کی نصرت اور اعانت کیا کرتے تھے۔ یہ رافضی لکھتا ہے:

''انہی کی بدولت اسلام کو چار چاند لگ گئے اور چہار دانگ عالم میں اس کے ڈنکے بجنے لگے اور کفر کے پرچم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گئے اور الا ان حزب الله هم الغالبون کے روح پرور مناظر دیکھے گئے۔'' (تجلیات ص ۴۷)

حضورؐ کے ساتھیوں کی یہ چار صفات والذین معه کے عنوان میں نمایاں ہوگئیں کہ جو لوگ آپ کے ساتھ تھے وہ ان تین پیرایوں میں ظاہر ہوئے۔

(۱) اشداء علی الکفار (۲) رحماء بینھم (۳) رکعاً سجداً

یہ صفات ان سب صحابہ کی تھیں مگر کسی صفت میں کوئی سبقت لے جائے تو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر حضورؐ نے اشدھم فی امر اللہ میں حضرت عمرؓ کو ممتاز رکھا رحماء بینھم میں حضرت ابوبکرؓ کو ممتاز کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دونوں باتیں والذین معه کی خبر بعد خبر نہیں ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

ارحم امتی بامتی ابوبکرؓ واشدھم فی امر اللہ عمر .

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے صحابہ اشداء علی الکفار یا رحماء بینھم میں سے نہ تھے۔ کسی ایک وصف میں نمایاں ہونا ان کی دوسری صفات فاضلہ کی نفی نہیں کرتا۔ اقضاھم علی سے بھی یہ مراد نہیں کہ آپ (معاذ اللہ) اشداء علی الکفار میں سے نہ تھے۔ ڈھکو رافضی نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذمہ یہ بات غلط لگائی ہے کہ ہر صفت کا موصوف علیحدہ علیحدہ ہے۔ والذین معه جمع کا صیغہ ہے۔ اگر ان میں بھی نمایاں معیت حضرت ابوبکرؓ کی رہی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے صحابہؓ والذین معه کی دولت نہ پائے ہوئے تھے۔

مفسرین ہر صفت کا مصداق ایک ایک شخص کو نہیں ٹھہراتے سب صحابہ علی العموم ان صفات جزیلہ کے حامل تھے۔ وہ اگر کسی ایک کو ایک ایک صفت میں اسبق مان لیں تو اس سے اشداء علی الکفار اور رحماء بینھم کے جمع ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ حضورؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ اشداء علی الکفار اور رحماء بینھم جمع ہیں، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو واضح طور پر ایک ایک صفت میں حامل سبقت قرار دیا۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ حضورؐ یا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو (معاذ اللہ) اشداء اور رحماء کے جمع ہونے کی خبر نہ تھی۔

رافضی ڈھکو کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ صحابہ اشداء علی الکفار تبھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بالفعل کافروں کو قتل کریں۔ حضورؐ نے بالفعل اتنے کافر قتل نہ کیے جتنے حضرت علیؓ نے کیے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ حضرت علیؓ کی شدت علی الکفار حضورؐ کی شدت علی الکفار سے زیادہ تھی؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اگر حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے زیادہ کافروں کو جہنم رسید کیا تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ حضرت علیؓ اشداء علی الکفار کی صفت میں معاذ اللہ حضرت عمرؓ سے آگے آ نکلے۔ ایسا ہوتا تو تاریخ میں یہ نقشہ نہ دکھائی دیتا کہ پہلے دور میں مسلمان باوجودیکہ ان میں حضرت علیؓ بھی تھے کعبہ میں کھلم کھلا نماز نہ پڑھ سکتے تھے لیکن جس دن حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے مسلمانوں نے کعبہ میں کھلم کھلا پہلی باجماعت نماز ادا کی۔ سو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کافروں کے دلوں پر حضرت عمرؓ کی شدت علی الکفار کا رعب سب سے زیادہ تھا۔ کاش کہ یہ

رافضی اس شدت کو سمجھنے میں اس آیت کو بھی دیکھ لیتا:

باسھم بینھم شدید تحسبھم جمیعاً وّقلوبھم شتّٰی ذلک بانھم قوم لا یعقلون.

(پ ۲۸ الحشر ۱۴)

ترجمہ: ''ان کی لڑائی آپس میں بڑی تیز ہے (لیکن مسلمانوں کے مقابل وہ ڈرے ہوئے ہیں) تو انہیں ایک خیال کرتا ہے (ایسا نہیں ہے) ان کے دل آپس میں مختلف ہیں، یہ اس لیے کہ وہ (دین کی) عقل نہیں رکھتے۔''

شدت کبھی مجموعی طور پر بھی دشمنوں کے لیے رعب بنتی ہے۔ کافروں کے دل ویسے ہی مرعوب کر دیے گئے تھے۔ حضرت عمرؓ جب کسی بات پر کھڑے ہو جاتے تو آپ کی صولت و شدت سے پورا ماحول کانپتا تھا۔ رافضی اس غم میں مارا جا رہا ہے کہ آپ کے ہاتھوں زیادہ آدمی قتل نہ ہوئے۔ جرنیل کی زیادہ قابلیت لڑانے میں ہوتی ہے لڑنے میں بعض دفعہ چھوٹے سپاہی بھی ان سے زیادہ نمبر بنا لیتے ہیں۔ لیکن رافضیوں کو انہیں بھگوڑے کہے بغیر سکون نہیں ملتا۔

آیئے اب ہم آپ کو نویں آیت میں لے چلیں

مولانا دبیرؒ نے صحابہؓ کی منقبت میں اسے بھی پیش کیا ہے:

لا تجد قوماً یّؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادّون من حادّ اللہ ورسولہ ولو کانوا آباء ھم او ابناء ھم او اخوانھم او عشیرتھم اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان وایّدھم بروح منہ ویدخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ. اولٰئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون.

(پ ۲۸ المجادلہ ۲۲)

ترجمہ: ''تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہوں کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی یا ان کا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں، وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لکھ دیا ہے اور انہیں روح القدس سے مدد دی ہے۔ انہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو چکا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ وہی لوگ ہیں اللہ کا گروہ۔ خوب سن لو کہ یہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پوری قوم کی مدح کی ہے جن کے دلوں میں ایمان ایک لکیر کی طرح ثبت ہو چکا تھا ان

کے قریبی رشتہ داروں میں کئی کافر تھے اور وہ حضورؐ کے اس درجہ وفادار تھے کہ آپ کے لیے وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے پوری طرح کنارہ کش تھے۔ شیعہ سمجھتے ہیں کہ اس قوم سے مراد عام صحابہ کرامؓ نہیں اس سے مراد پانچ چھ افراد کا اقل قلیل گروہ ہے۔ اس میں حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرات حسنینؓ، حضرت بلالؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت مقداد ہیں۔ یہاں انہی کو حزب اللہ کہا گیا ہے۔ اور یہی حزب اللہ دشمنوں کے مقابلہ میں حضورؐ کی فتح و نصرت کا سبب بنے۔ اللہ تعالیٰ انہی سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ یہاں ایک سائل یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کیا کبھی کسی جماعت کے پانچ چھ افراد کو پوری جماعت کی موجودگی میں قوم کہا گیا ہے؟ سکھوں کا محاورہ یہاں پیش نہ کریں کہ وہ ایک کو بھی ملتے ہیں تو کہتے ہیں ''فوجیں کہاں سے آئی ہیں؟'' ۔ ہم بات عربوں کی کر رہے ہیں۔ ان میں کبھی اقل قلیل گروہ کو ۹۸ فیصد دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک قوم نہیں کہا جاتا۔ پھر (۲) حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیارؓ، اور حضرت حسنؓ و حسینؓ کے باپ دادوں، بیٹوں اور خاندان میں کون کون دشمنان رسول تھے جنہیں چھوڑنے پر ان پانچ چھ افراد کی اس طرح مدح کی گئی ہے یا حضرت بلالؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ کے قریبی رشتہ دار کون تھے کہ یہ ان کے قتل کے درپے ہوئے اور اس پر ان کی مدح کی گئی۔ جب اس کے لیے دس نام بھی نہیں لیے جاسکتے تو کیا کسی انصاف پسند اور عقل مند سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہاں قوم سے مراد یہ پانچ چھ افراد تھے جو مدت العمر اپنے کسی بھائی یا قریبی عزیز کو مارنے کے درپے نہ ہوئے۔

جس طرح جنگ احد میں حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰنؓ کو مارنے کے درپے ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ھشام کو قتل کیا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو۔ اور پھر حضرت عمرؓ نے سب کو اپنے کافر رشتہ داروں کے مارنے کی تجویز دی۔ یہ آپ کا حضورؐ کی وفاداری کا وہ روشن اظہار تھا کہ اس کا اس وقت کوئی مخالف بھی انکار نہ کر سکا۔

اس قوم کے لیے ابدی فلاح کی بشارت

اس آیت کے آخر میں اولٰئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون کہہ کر ان کی ابدی فلاح کی بشارت دی گئی ہے۔ شیعہ کہتے ہیں یہ حزب اللہ (اللہ کا گروہ) حضورؐ سے آپ کے ایام علالت میں وصیت تک نہ لکھوا سکا۔ حضورؐ سے مسجد میں آپ کی مرضی کا امام بھی نہ رکھوا سکا۔ آپ کے جانشین کے انتخاب میں بھی شرکت نہ کر سکا اور آئندہ کے لیے قوم کی پوری قیادت ان میں سے کسی کے ہاتھ میں نہ رہی۔ یہ باتیں تسلیم کے لائق نہیں ہیں۔ جن پانچ چھ افراد کی یہ کمزور حالت ہو ان کی قرآن پاک میں اس شاندار پیرائے میں یہ مدح ہر سمجھدار فرد کے فہم سے بالا ہے۔ مگر شیعہ ہیں کہ اس پر یقین کیے بیٹھے ہیں اور ڈھگو رافضی ان کا صدر المحققین ہے۔

سو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن پاک میں یہاں پورے گروہ صحابہؓ کی مدح کی گئی ہے، خصوصاً حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ کی۔ حضرت عمرؓ کی اپنے اپنے عزیزوں کو قتل کرنے کی تجویز باقی سب کی وفاداری پر سبقت لے گئی۔

اس آیت میں گو حضرت عمرؓ کے نام کی تصریح نہیں لیکن ان کا حضورؐ سے اپنی وفا کا اظہار تاریخ کی ایسی قوی شہادت ہے جو انہی کا نصیب رہی۔ قرون وسطیٰ کے مفسرین اس آیت پر صاف لکھتے ہیں کہ کون کون سے صحابہؓ اس صفت میں ممتاز ہوئے۔

آیت کے چار عنوانوں کا مصداق ملاحظہ کیجئے:

آیت کے الفاظ (ولو کانوا آباء ھم) نزلت فی ابی عبیدۃ (او ابنائھم) نزلت فی الصدیق ھو یومئذٍ یقتل فیه ابنه عبد الرحمٰن (او اخوانھم) فی مصعب بن عمیر قتل اخاہ عبید بن عمیر یومئذٍ (او عشیرتھم) فی عمر قتل قریباً له یومئذٍ ۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۳۲)

آیت کے الفاظ (ولو کانوا آباء ھم) پر دھیان دیں۔ یہ آیت حضرت ابوعبیدہؓ کی شان میں اتری۔ اگلے الفاظ (او ابناء ھم) حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کے بارے میں اترے۔ آپ اس دن اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو قتل کرنے کے درپے تھے (مگر اس کی قسمت میں اسلام لانا مقدر تھا)۔ اگلے الفاظ (او اخوانھم) حضرت مصعب بن عمیرؓ جس نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو اس دن قتل کیا تھا، اترے۔ پھر (او عشیرتھم) کے الفاظ حضرت عمرؓ کے حق میں اترے جنہوں نے اس دن ۸ کے قریب کافر جہنم رسید کیے۔

سو اس کا حاصل یہی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عمرؓ کے بارے میں ہی اتری اور یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں ایمان پختہ طور پر لکھا جا چکا۔ یہی لوگ ہیں جو حزب اللہ ٹھہرے اور قرآن کریم نے انہی کو یہاں ایک قوم کہا ہے۔

شیخ الاسلام اس آیت پر لکھتے ہیں:

''صحابہؓ کی شان یہی تھی کہ اللہ و رسول کے معاملہ میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی۔ اس سلسلہ میں ابوعبیدہ نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ جنگ احد میں حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے مقابلے میں نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو، عمر بن الخطابؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو، علیؓ بن ابی طالب حمزہؓ، عبیدہ بن الحارثؓ نے اپنے اقارب عتبہ، شیبہ

اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ نے جو مخلص مسلمان تھے' عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ حکم دیں تو اپنے باپ کا سر کاٹ کر خدمت میں حاضر کروں۔ آپ نے منع فرمایا۔ رضی اللہ عنہم ورضواعنہ۔ (ص ۷۲۳)

رافضی ڈھکو مولانا دبیرؒ کے اس آیت سے استدلال کرنے پر بہت پریشان ہے۔ جب اس سے اس کا کوئی تحقیقی جواب نہیں بن پڑا تو اس نے الزامی جوابات کی راہ لی اور وہی فرسودہ باتیں اٹھائیں جن کا اہل حق بار ہا جواب دے چکے ہیں۔

عام صحابہؓ کی اپنی حالت آپ کے سامنے آ چکی۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پختہ ایمان کی آسمانی شہادت بھی آپ نے دیکھ لی لیکن اگر کچھ اور صحابہ جو حضور کے زیر تربیت تھے۔ ابھی اس مقام پر نہ آئے تھے تو اس سے ان اکابر کے ایمان پر کوئی دھبہ نہیں آتا۔ مثلاً حاطب بن ابی بلتعہ کا مکہ میں اپنے عزیزوں کو خفیہ خط بھیجنا' ایک ان کا عمل تھا جس پر حضرت عمرؓ بہت برہم ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جو دلوں کے حالات کو جانتا ہے اس سے ان کے ایمان کی نفی نہیں کی۔ انہیں یآیہا الذین امنوا سے خطاب کر کے ان کے ایمان کی تصدیق کر دی اور آئندہ کے لیے ان کی اصلاح بھی فرمادی۔

یآیہا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودة وقد کفروا بما جاء کم من الحق. یخرجون الرّسول وایاکم ان تؤمنوا باللّٰہ ربکم ان کنتم خرجتم جھاداً فی سبیلی وابتغاء مرضاتی تسرون الیھم بالمودة وانا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم ومن یفعلہ منکم فقد ضل سواء السبیل. (پ ۲۸ الممتحنہ ۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست۔ تم ان کو پیغام دیتے ہو دوستی کا اور وہ منکر ہیں اس سچے دین سے جو تمہارے پاس آیا ہے۔ وہ نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو رب ہے تمہارا۔ اگر تم نکلے ہو لڑنے کو میری راہ میں اور میری رضا کی طلب میں۔ تم ان کو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کا پیغام اور میں پوری طرح جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور تم میں جو بھی ایسا کرے تو وہ (مومن) بھول گیا اپنی سیدھی راہ۔''

یہ قصور سرزد بھی ہوں تو ان سے ایمان کی نفی نہ کی جائے گی۔ ان مومنین کی اصلاح کی جائے گی۔ دوران تربیت طلبہ سے کیا کیا نہیں ہو جاتا۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ دوران تربیت ان لوگوں کا ان سے تعلق رکھنا صرف از راہ قصور رہا۔ یہ از راہ کفر نہ تھا ورنہ یآیہا الذین امنوا سے ان کے ایمان کی تصدیق نہ کی جاتی اور پھر جب ان کی بھی اس آیت میں تربیت کی گئی تو اب

ان کا صداقت کا ستارہ بننا کوئی ناممکن بات نہ رہی۔ انما العبرة بالخواتیم۔ یہ خوارج کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ہم خارجی عقیدہ نہیں رکھتے۔ پھر اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ کافروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن سے تعلقات رکھنے سے نہیں روکا گیا۔ اس کو نہ سمجھنے سے اگر حاطب بن ابی بلتعہ سے غلطی ہوگئی تو حضورؐ نے ان کے ایمان کو باطل نہیں ٹھہرایا پھر آج کس کو حق پہنچتا ہے کہ ان سے ایمان کی نفی کرے۔ ان کا ایمان قرآن کی رو سے ثابت ہی ثابت ہے اور بار بار ان کے لیے یآیہا الذین امنوا کا خطاب وارد ہوا ہے۔

پھر حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے اس واقعہ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر منطبق کرنا کیا اس سے بڑھ کر اخلاقی بے حیائی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے کھلے پیرائے میں ان کے ایمان کی تصدیق کی ہے کہ اب چاند کی طرف تھوکنا اپنے چہرے کو ہی تھوک آلود کرنا ہے۔

جن کافروں سے تعلق رکھنے سے نہیں روکا گیا یہ وہ ہیں جو تم سے برسر پیکار نہیں۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین. (پ ۲۸ الممتحنہ ۸)

ترجمہ: ''اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جو تم سے تمہارے دین پر لڑے نہیں۔ اور نہ نکالا انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے کہ تم ان سے بھلائی کرو اور ان سے انصاف کا سلوک کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتے ہیں انصاف کرنے والوں کو۔''

پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عام میل جول اور لین دین بحث وتمحیص اور اخلاقی مروت دوسری قوموں سے رکھی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ تمہارے سیاسی مقابلے میں نہ نکلے ہوں۔ ان سے مدارات ممنوع نہیں۔ مودت اور موالات کے احکام اور ہیں۔ لیکن یہ ڈھکو رافضی ان سے کسی علمی مذاکرے کو بھی موت سمجھ رہا ہے۔ اس سے آپ اس کی قرآن سے دوری ملاحظہ کریں۔ وہ لکھتا ہے:

''یہودیوں کے ہاں جس دن تورات کا درس ہوتا تھا حضرت عمرؓ اکثر شریک ہوتے تھے۔

'(تجلیا ص ۸۰)' ت

دوسرے مذاہب کے جلسے میں جانا کہ ان کے موقف پر پوری اطلاع رہے اور اپنی قوم کو ان کے خیالات سے بچایا جاسکے' یہ اسلام میں ہرگز ممنوع نہیں۔ اگر یہ ان کی مودت کے باعث ہوتا تو آپ اسے حضورؐ سے اور عام مسلمانوں سے چھپاتے لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ ایک دفعہ حضورؐ کے سامنے بھی تورات دیکھ رہے تھے۔ اور اس میں جلوہ محمدی آپ کو کسی جہت سے مانع نہ ہوا۔ حضورؐ نے انہیں اس پر روکا کیونکہ اس میں تورات سے کچھ رہنمائی لینے کا پہلو بھی نکل سکتا تھا اور

یہ سب کچھ حضورؐ سے تعلیم وتزکیہ پانے کے دور میں ہوا۔ حضورؐ نے جب تربیت فرمادی تو پھر آپؓ کسی بھول سے بھی کبھی ان کے درس میں نہیں گئے۔

یہ صرف یہودی سمجھتے تھے کہ آپ از راہ محبت ہماری علمی مجلس میں آتے ہیں اور اب یہ ڈھ گو بھی یہودیت کے اس نئے اڈیشن میں ہی بات کہہ رہا ہے مگر حضورؐ نے اپنے منع کرنے میں یہ پہلو اختیار نہیں کیا کہ اے عمرؓ اس سے تم ان کے دائرہ مودت میں آجاتے ہو۔ آپؐ نے صرف دور تورات لے باقی نہ رہنے کی بات کہی کہ اب دور قرآن ہے اور ہدایت صرف حضورؐ کی اتباع میں ہے۔ اب موسیٰؑ کی پیروی میں ہدایت کی کوئی راہ نہیں دیکھی جاسکتی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً تعمیل حکم کی اور اپنے مطالعہ تورات کی کوئی توجیہ پیش نہ کی۔

حضرت عمرؓ کا جنگ بدر میں اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ہم مورخ اسلام حافظ ابن کثیرؒ سے اس کا حوالہ پیش کر آئے ہیں اور قرآن کریم نے بھی اس کی تصدیق کی ہے لیکن رافضی کی یہ بڑھ بھی ملاحظہ ہو:

''عمر صاحب کا جنگ بدر میں اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کرنا یہ صرف ایک افسانہ ہے۔''

(تجلیات ص۸۰)

ضد میں عقل بھی جاتی رہتی ہے

مولانا دبیرؒ نے حضرت عمرؓ کی اسارئ بدر کے بارے میں رائے صرف اپنے اس دعوے پر پیش کی تھی کہ آپ رضاء الٰہی اور حضورؐ کی وفاداری میں اپنے رشتہ داروں کا کچھ لحاظ کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کے قتل کے لیے صرف اذن رسالت کے منتظر تھے۔

مولانا دبیرؒ نے اس سے اس راوی کی تصویب نہ کی تھی۔ ہر مومن کے لیے حضورؐ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہے۔ مگر یہ ڈھ گو رافضی مولانا دبیرؒ کے موقف کو سمجھے بغیر ان کی اس رائے پر جرح کرنے پر آنکلا ہے۔ علم مناظرہ میں اسے موضوع سے نکلنا کہتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی سے کوئی جواب نہ بن سکے۔ ڈھ گو لکھتا ہے:

''یہ رائے ایسی سفا کانہ بہیمانہ اور خلاف شریعت تھی کہ خود صاحب شریعت نے اسے ٹھکرادیا۔''

(تجلیات ص۸۰)

یہ گویا اس رافضی کا اپنے قلم سے اقرار شکست ہے۔ اس آیت کے ذیل میں اس کی اور دوسری باتیں بھی تحقیق کی رو سے نہیں محض الزامی جواب کے طور پر ہیں اور ہم ان کا غلط ہونا پہلے کئی مقامات میں بیان کر آئے ہیں۔

رافضی کا ضمنی مسائل پر تبصرہ

(۱) مولانا دبیرؒ نے کہا تھا حضرت علیؓ ہر ہر معاملہ میں حضرت عمرؓ کے مشیر رہے۔

جواب رافضی : یہ سفید جھوٹ ہے۔ صرف جنگ قادسیہ اور غزوہ روم میں آپ سے مشورہ لیا گیا تھا۔ (ص۸۱)

شکر ہے رافضی نے کچھ بات تو مولانا دبیرؒ کی مان ہی لی کہ بڑی جنگوں میں واقعی ان سے مشورہ لیا گیا تھا اور وہ۔

(۲) مال غنائم سے حصہ دار بنے رہے۔

جواب رافضی : یہ بہت بڑا افتراء ہے۔

تاریخ کے طالب علم جب پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کو اپنے اپنے دور خلافت میں حسب دور رسالت فدک کی آمدنی بھیجتے رہے تو حضرت علیؓ خلافت ثلثہ کے مالی نظام میں حصہ بنے یا نہ؟ حضرت حسنؓ اور حسینؓ حضرت معاویہؓ سے وظیفہ لیتے رہے تو اسے ڈھ گو کے سوا اور کون اسے جھوٹ کہہ سکتا ہے۔

(۳) حضرت حسینؓ کی شادی خانہ آبادی

جواب رافضی : اس میں مورخین کا شدید اختلاف ہے۔ مشہور یہی ہے کہ آپ دور عمر میں آئیں۔

سو مولانا دبیرؒ نے اگر اس قول مشہور سے استدلال کرلیا تو ان کی یہ بات جھوٹ کیسے رہی۔ رافضی کے ہاں اگر محقق مورخ مولانا شبلی نعمانیؒ ہیں تو ان کی باقی تاریخی باتیں بھی تو رافضی کو مان لینی چاہئیں۔

(۴) تزویج فاطمہؓ کی تحریک پہلے حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ نے کی تھی۔

رافضی جب اسے مانتا ہے تو پھر وہ اس کے جواب کے درپے کیوں ہے۔ اسے اعتراض یہ ہے کہ پہلے ان کے لیے سلسلہ جنبانی نہ کیا گیا۔ تسلیم شدہ حقائق کا جواب دینا اگر محض خانہ پوری نہیں تو اور کیا ہے؟

(۵) حضرت علیؓ ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔

جواب رافضی : حضرت علیؓ اقتداء کی نیت نہ کرتے تھے (صرف دکھاوے کے لیے ایسا کرتے تھے گویا ان کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں)

یہ رافضیوں کی ضد ہے کہ ان مخفی امور پر بھی وہ دلیل مانگتے ہیں۔ ظاہر کو نہیں دیکھتے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح خارجی یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھتے' اقتداء کی نیت کرتے تھے۔ اس پر کوئی ثبوت پیش کرو۔ ظاہر باطن کا آئینہ ہے اور حضرت علیؓ بھی اس بلند اخلاقی قوت کے مالک تھے کہ اپنا ظاہر و باطن ہمیشہ ایک رکھتے تھے۔

آیئے اب ہم آپ کو مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ دسویں آیت پر لے چلیں

والذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللّٰہ باموالھم وانفسھم اعظم درجة عنداللّٰہ واولٰئک ھم الفائزون ۔ (پ ۱۰ التوبہ ۲۰)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اللہ کے ہاں وہ بڑا درجہ پا گئے اور وہ (دنیا میں بھی) اس عزت کو پہنچیں گے۔''

مولانا دبیرؒ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا تھا:

''ان آیات میں مہاجرین اور مومنین کا اعلیٰ رتبہ ہونا اور ان کا فائز الدارین ہونا بیان کیا گیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اصحاب ثلٰثہ اس آیت کے مصداق نہ بنے۔ جب کسی پیش گوئی کا مصداق ظاہر ہو جائے تو اس سے اس میں قطعیت آ جاتی ہے۔'' (آفتاب ہدایت ص ۶۹)

جواب رافضی: ''اس کا کوئی بھی منکر نہیں مگر یہ حکم عام ہے۔'' (تجلیات ص ۸۳)

رافضی کہتا ہے اس عام کی دلالت خاص اصحاب ثلٰثہ پر نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان صفات مذکورہ فی الایۃ سے اصحاب ثلٰثہ کے دامن خالی نظر آتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ حضرات اصحاب ثلٰثہ اس عموم میں کیوں داخل نہیں؟ عام کی دلالت اپنے جملہ افراد پر مسلّم عندالکل ہے۔ ہاں تم اگر ان تین کو اس عموم سے نکالتے ہو تو اس نکالنے کی ایسی قطعی دلیل تمہارے پاس ہونی ضروری ہے جس کی رو سے ان تین حضرات کو اس عموم سے نکالا جاسکے اور ظاہر ہے کہ شیعہ کے پاس ایسی کوئی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت وجہ موجود نہیں جس سے وہ ان اصحاب ثلٰثہ کو اس حکم عام سے نکال سکیں۔ ان کے ظاہراً ایمان لانے اور ہجرت کرنے کے تو شیعہ بھی منکر نہیں ہیں لیکن وہ انہیں (معاذ اللہ) منافق کہہ کر اس عموم سے نکالتے ہیں۔ مولانا دبیر اس آیت کے تحت یہی کہہ رہے ہیں کہ ان سے ایمان اور ہجرت کی صفات سلب کرنے کی تمہارے پاس کوئی قطعی دلیل موجود ہو تو پیش کرو۔ کسی ظنی اور کمزور یا وضعی حکایت سے تم انہیں اس عموم سے نہیں نکال سکتے۔ مولانا دبیر کے ان الفاظ کو دیکھیں:

''کیا اصحاب ثلٰثہ اس آیت کے مصداق نہ تھے؟ کونسا وصف اوصاف مذکورہ فی الآیۃ الکریمہ ان سے مسلوب کر سکتے ہو؟ (ص ۶۹)

سوال ان اصحاب ثلٰثہ کے اس عام دائرہ صفات میں آنے کا نہیں ان سے ان صفات کے سلب کرنے کا ہے اور ظاہر ہے کہ ڈھگو رافضی کے پاس ان سے ان اوصاف کے مسلوب ہونے کی کوئی قطعی الثبوت دلیل موجود نہیں ہے۔ رہے قصے کہانیاں، جھوٹے الزامات اور ظنی روایات تو تم ان سے اتنا بڑا کلامی مورچہ سر نہیں کر سکتے کہ ان سے ان صفات کے

مسلوب ہونے پر کوئی اس وزن کی دلیل لاسکو جس وزن کی عام دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ اور یہ بات تو اپنی جگہ واضح ہے کہ تم جن صحابہ کو اس حکم عام میں داخل سمجھتے ہو انہوں نے بھی تو خلافت میں ان اصحاب ثلٰثہ کا ہی ساتھ دیا تھا۔ کیا یہ دلیل ان تین کے اس دائرہ عام میں شامل ہونے کی خود ایک قوی شہادت نہیں ہے؟

مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ گیارہویں آیت

مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ گیارہویں آیت پر بھی یہ رافضی بری طرح دم بخود ہے:

ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنة ...... التائبون العابدون الحامدون السآئحون الراکعون الساجدون الاٰمرون بالمعروف والنّاھون عن المنکر والحافظون لحدود اللّٰہ. وبشّر المؤمنین. (پ ۱۱ التوبہ ۱۱۲)

ترجمہ: ''بے شک اللہ نے خرید لیں مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے ...... یہ لوگ کون ہیں؟ توبہ کرنے والے، بندگی کرنے والے، شکر کرنے والے، بے تعلق رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، حکم کرنے والے نیک بات کا اور روکنے والے برائی سے اور حفاظت کرنے والے اللہ کی حدود کی اور آپ خوش خبری دے دیں مومنین کو۔''

یہ سب مومنوں کی کھلی صفات ہیں۔ ان کے آئینہ میں ان کے اندر کا ایمان بھی پوری طرح دیکھا جاسکتا ہے۔

آخر میں وبشر المومنین کے الفاظ پر غور کریں۔ ایمان کو یہاں کہیں مخفی شرائط سے مشروط نہیں کیا گیا۔

اسلام ایک تحریک کی صورت میں اٹھا اور پورا عرب اس کی دعوت سے ہل گیا۔ مسلم امۃ ایک آزاد رقبہ اسلام میں ایک آزاد اسلامی سلطنت قائم کیے ہوئے تھی۔ وہاں یہ بشارت اترتی ہے کہ اللہ رب العزت ان مومنین کو ان کی جان و مال کے بدلے جنت دے چکا۔ مولانا دبیرؒ اسے سمجھتے ہیں کہ یہ بشارت جمہور صحابہؓ کی ہے جو اس وقت حضورؐ کے ساتھ اس شجر اسلام کی آبیاری کر رہے تھے اور یہ صفات انہی مومنین کی ہیں جو حضور کے ساتھ رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ قرآن کریم انہیں ہی مومنین ٹھہرا رہا ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ اصحاب ثلٰثہ اس زمرے میں نہیں آتے۔ یہاں ہر انصاف جو اس ڈھگو کی بات رد کرے گا کہ قرآن نے جس عام پیرائے میں اس وقت کے عام مسلمانوں کو مومنین کہا ہے تمہارے پاس قرآن کریم کی اس طرح کونسی کھلی آیت ہے جو ان تین سرداران امت کو اس دائرہ سے نکالتی ہے۔ وضعی روایات اور ظنی روایات سے انہیں اس دائرہ حقہ سے نہیں نکالا جاسکتا۔ شیعہ کے پاس اس سلسلہ میں جو مواد ہے ان میں کوئی حوالہ بھی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت

درجے کا نہیں۔

پھر قومی مسائل میں حکومت عام افراد قوم سے چلتی ہے صرف رشتہ داروں سے نہیں چلتی۔ کوئی عاقل اس آیت سے یہ نہ سمجھے گا کہ اس میں یہ آٹھ صفات صرف پانچ افراد امت حضرت علیؓ ' حضرت جعفرؓ ' حضرت بلالؓ ' حضرت ابوذرؓ اور حضرت مقدادؓ کی بیان ہو رہی ہیں باقی ساری امت تو دل سے مسلمان نہ تھی۔ (معاذ اللہ)

کوئی شخص اس منافقانہ بڑھ کو سننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں باقی ساری امت واقعی مومنین تھی مگر یہ تین حضرات مومن نہ تھے۔ اس پر پھر ڈھگو سے سوال کیا جاسکے گا کہ کیا یہی جمہور مومنین ان خلفائے ثلثہ کی خلافت میں سلطنت اسلام کے لیے ہر طرح قربانیاں نہیں دیتے رہے۔ یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے محلات پر پرچم اسلام لہرا گیا' مومنین کی یہ کیسی سلطنت تھی کہ جس کے سربراہ خود مومن نہ تھے۔ (معاذ اللہ)

پھر یہ آٹھ صفات جو ان مومنین کی قرآن نے بیان کی ہیں ان میں پہلی صفت التائبون ہے اور اس سے مراد کفر سے توبہ کر کے اسلام میں آئے لوگ ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ جو پہلے کفر میں کبھی نہ رہے تھے کس طرح ان صفات ہشتگانہ کا مورد بن گئے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر بھی کفر کا کوئی دور نہیں آیا کہ آپ کھلے بندوں التائبون کا مصداق بنے ہوں۔ ڈھگو رافضی نے اس پر بھی کوئی حوالہ نہیں پیش کیا کہ حضرت بلالؓ ' حضرت ابوذرؓ اور حضرت مقدادؓ حضور کے دعویٰ رسالت پر کتنا عرصہ کفر میں رہے۔ اگر ایسا نہیں تو قرآن پاک نے جس عام پیرایہ میں مومنین کی یہ آٹھ صفات بیان کی ہیں ان سے یہ پانچ افراد کیسے مراد لیے جاسکتے ہیں۔ حضرات حسنینؓ تو اس وقت اس ذمہ دارانہ زندگی میں نہ تھے۔ شیعہ حضرات کا یہ وہ ناقابل فہم موقف ہے جسے جمہور اہل دانش کبھی قبول نہیں کر پائے اور یہ اقل قلیل نادان بس اپنی ہی بارگاہوں میں یہ راگ الاپتے رہتے ہیں۔

ڈھگو رافضی نے یہاں تجلیات میں جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیارؓ کی قربانی کو بہت خراج تحسین پیش کیا ہے لیکن اسے اپنی بات اس پر ختم کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ حضرت جعفرؓ جان کی قربانی تو دے گئے لیکن جنگ جیت نہ سکے جب تینوں سالار شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولیدؓ آگے بڑھے اور جنگ جیت لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ میں یہ صورت حال کھلی تو آپؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اللہ کی تلوار کہہ کر ذکر کیا۔ یہاں جس طرح حضرت خالد بن ولید حضرت جعفرؓ پر یہ جزوی فضیلت لے گئے۔ اس کا انکار تو کسی صورت میں بھی نہ ہونا چاہیے تھا۔

آیئے اب ہم آپ کو بارہویں آیت میں لے چلیں

وجاهدوا فی الله حق جهاده هواجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملّة ابیکم ابراهیم هو سماکم المسلمین من قبل وفی هذا. (پ ۱۷ الحج ۷۸)

ترجمہ : ''اور محنت کرو اللہ کی راہ میں جیسے کہ چاہیے اس کی راہ میں محنت۔ اس نے تمہیں پسند کیا اور نہیں رکھی تم پر دین میں کوئی تنگی۔ دین تمہارے باپ ابراہیم کا ہے اور اس نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔ پہلے سے اور اس قرآن کی رو سے بھی۔''

اسلام اگر صرف ظاہری طور پر خدا کو ماننے کا نام ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ اس دین قیم کا نام کبھی اسلام نہ رکھتے۔ معلوم ہوا اسلام اندر کی حقیقت (ایمان) کے باہر آنے کا ہی دوسرا نام ہے۔

ان اصحاب ثلثہ نے جہاد کا اس طرح حق ادا کیا کہ کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور لوگ برضا و رغبت اس دین فطرت میں چلے آئے۔ کافر قومیں بلا جبر و اکراہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر یدخلون فی دین الله افواجا کی تاریخ اب پوری دنیا میں روشن ہوئی۔ یہاں تک کہ ڈھگو رافضی جیسے ملت یہود پر چلنے والے بھی ان یہود کے حق میں بول اٹھے:

''اے کاش یہ لوگ ملکی فتوحات نہ کرتے۔ انہی لوگوں اور ان کی مزعومہ فتوحات نے اسلام کو اغیار کی نظروں میں بدنام کیا اور ان کو یہ کہنے کا موقعہ ملا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔''

(تجلیات صداقت ۱۰۲)

ڈھگو رافضی نے یہاں تسلیم کیا ہے کہ اسلام جو پھیلا ہے وہ انہی اصحاب ثلثہ کی فتوحات سے پھیلا ہے۔ ان پانچ چھ افراد کی قربانیوں سے نہیں جنہیں وہ اپنے حلقہ کے بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن رافضی اس پر ایک حوالہ بھی پیش نہیں کر سکا کہ ان حضرات کی فتوحات میں کسی ملک کے کسی حصے میں کسی کو بجر و زور مسلمان کیا گیا ہو۔

باقی رہی یہ بات کہ مومن صرف وہی ہے جس سے ایک لحہ کے لیے بھی کوئی غلطی نہ ہوئی ہو یا اس سے کسی کمزوری کا صدور نہ ہوا ہو تو یہ عقیدہ ہم اہل سنت کا نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کوئی ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ خارجیوں کا ہے کہ مرتکب کبائر ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ اب اگر شیعہ بھی خارجیوں کے ساتھ لگ جائیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ رافضی ڈھگو لکھتا ہے :

''مومنین مجاہدین وہی ہیں جنہوں نے...... ایک لحہ کے لیے بھی غیر خدا کے سامنے اپنی گردنیں خم نہ کیں۔'' (تجلیات ص ۸۸)

جو شخص کسی غیر الٰہی نظام میں ایک لحہ کے لیے بھی چلا وہ خارجیوں اور شیعہ دونوں کے ہاں مومن مجاہد شمار نہیں ہو سکتا گو اس ایک لحہ کے سوا اس نے ہزاروں نیکیاں کیوں نہ کی ہوں۔ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پھر التائبون کہہ کر کن مومنوں کی شان بیان کی ہے۔ اہل سنت کے ہاں کفر سے توبہ کرنے والا اسلام میں آ کر خالد بن الولیدؓ جیسا فاتح عظیم ہو سکتا

ہے اس پر ایک لمحہ بھی کفر کا نہ گزرا ہو اس کی حقیقت ایک بھڑ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

آیئے اب ہم آپ کو تیرہویں آیت میں لے چلیں

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحاً قریبا. ومغانم کثیرۃ یاخذونھا. (پ ۲۶ الفتح ۱۸)

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ خوش ہوا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے تجھ سے درخت کے نیچے۔ سو جانا اللہ نے جو ان کے دل میں تھا' پھر اتارا ان پر اپنا سکون اور انعام دیا ان کو ایک قریب کی فتح اور بہت غنیمتیں جنہیں وہ پائیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان ظاہری انعامات سے ان کے اندر کی بات (ایمان) کی تصدیق کر دی۔ یہ وہ پاک لوگ تھے جن کا ایمان واسلام ایک تھا اور ایک دنیا نے ان کے ایمان کے یہ روح پرور نظارے دیکھے۔

(۱) یہاں ان تمام لوگوں کو جو بیعت شجرہ میں شامل ہوئے مومنین کہا گیا ہے۔ (۲) ان کی دلی سلامتی کی شہادت دی گئی ہے۔ (۳) ان کے دلوں پر اضطراب کی جگہ سکون اتار دیا گیا۔ (۴) فتح ان کے نام لکھی بتائی گئی ہے۔ (۵) انہیں کثیر مال غنیمت پانے والا بتایا گیا ہے۔

اللہ کے یہ وعدے ان پر پورے ہوئے' سب مورخین اس کے گواہ ہیں۔

کیا کوئی شخص یہاں سمجھ سکتا ہے کہ وہاں دل سے بیعت کرنے والے صرف پانچ چھ افراد ہی تھے۔ باقی سب (معاذ اللہ) منافق تھے اور اللہ تعالیٰ کا یہ اظہار رضا صرف پانچ چھ شخصوں کے لیے ہی ہوا تھا۔ کیا آئندہ مال غنیمت پانے والے یہ صرف پانچ چھ افراد ہی رہے تھے یا جب بھی موقعہ آیا پورا لشکر اسلام ان غنائم میں حصہ دار رہا۔ کیا یہ سب امور ان سب کے مومنین ہونے کی دلیل نہیں؟ اس بیعت شجرہ میں حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت خود دست نبوت نے کی جسے منافقانہ بیعت کہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سب بیعت کرنے والوں سے اپنی رضا کا اظہار فرمایا اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں تو یہاں کسی ادنیٰ تردد کی بھی راہ نہیں ملتی کہ آپ کی حضورؐ سے بیعت آپ کے ہاتھ سے نہیں خود دست نبوت سے ہوئی جس میں صرف ظاہر داری کا کوئی گمان نہیں ہو سکتا۔

اس بیعت شجرہ نے جن کو مومنین میں داخل کیا اب کسی کو اس زمرے سے نکالنا ہو تو اس کے لیے بھی ویسی ہی مضبوط دلیل چاہیے جو ان کے اس دائرہ مومنین میں ہونے کی اس عمومی پیرائے میں سب کے سامنے آ چکی۔ ہاں جس کے خلاف یقینی اجماع ہوا جیسے اجد بن قیس' وہ بوجہ اپنے نفاق کے اس عام بشارت سے نکالا گیا۔ مصر کا عبدالرحمٰن بن عدیس بھی

اگر اس گروہ میں تھا جو حضرت عثمانؓ پر حملہ آور ہوئے تو اس سے اس کا آپ کو قتل کرنا ثابت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محمد بن ابی بکرؓ کی طرح شرم سے پیچھے ہٹ گیا ہو اور کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے بعد میں کچھ ایسی نیکیاں ہوئی ہوں کہ ان سے اس کا مصری باغیوں کی قیادت کا گناہ دھل گیا ہو۔

سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا قاتل اگر ایمان لا کر جنت میں حضرت حمزہؓ سے جا ملے تو قاتل و مقتول جنت میں کیوں جمع نہیں ہو سکتے۔

پھر یہ بات بھی لائق غور ہے کہ عبدالرحمٰن بن عدیس بیعت شجرہ میں شریک نہ تھا کیونکہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں میں کوئی صحابی شامل نہ ہوا۔ مروج الذھب کی یہ روایت قطعاً لائق تسلیم نہیں۔ شیعہ کتابوں کے اس قسم کے حوالوں سے بیعت شجرہ کی قوت کو کمزور نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کے قاتل ابوالغادیہ کی بیعت شجرہ میں شرکت کسی سند متصل سے نہیں ملتی۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جب عام الحمد نہ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین نہ لڑنے کا معاہدہ ہوا تو وہ فئہ باغیہ جو پہلے حضرت عثمانؓ پر حملہ آور ہوئے پھر وہ حضرت علیؓ کے لشکروں میں آ گھسے اور پھر انہوں نے واقعہ تحکیم کے بعد حضرت علیؓ سے بھی خروج کیا تو یہ گروہ خوارج بھی کچھ دب گیا اور اب وہ فئہ باغیہ نہ رہا۔ حضرت عمارؓ کا قاتل اسی فئہ باغیہ میں سے تھا لیکن اس کے بیعت الشجرہ میں شامل ہونے پر کوئی متصل سند نہیں ملتی اور نہ صحابہؓ میں سے کوئی خوارج' معتزلہ' روافض اور جھمیہ وغیرہ کسی گمراہ فرقے میں شامل ہوا۔ حضورؐ نے بہتر گمراہ فرقوں کے مقابلہ میں جنہیں اہل حق کہا اس کی پہچان ہی یہ رہی کہ صحابہؓ اس میں تھے وہ فرقہ ناجیہ ما انا علیہ واصحابی کی شان فضیلت رکھتا ہے۔

شیعہ اصحاب ثلثہ کو بیعت شجرہ کی بشارت سے نکالتے ہیں مگر ان کے پاس ان کے اس سے نکلنے کی کوئی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ راہ موجود نہیں بجز چند قصوں کے جو نہ ثبوتاً کوئی سند رکھتے ہیں نہ دلالۃً ان میں اصحاب ثلثہ میں سے کسی کی صراحت موجود ہے اور نہ وہ ان میں سے کسی کی زندگی کا آخری عمل رہا جس کا انما العبرۃ بالخواتیم کی رو سے اعتبار کیا جائے۔ اس سے پہلے کسی کی کوئی غلطی بھی ہو تو اس کی نیکیوں کی کثرت اس کی خطاؤں کو بہا کر لے جا چکی۔ ان الحسنات یذھبن السیئات ذلک ذکریٰ للذاکرین۔ ان پر ان کی اسلامی زندگی کے کسی پر ارتکاب کفر کا الزام یہ وہ تمنا ہے جس کی تلاش میں شیعہ مجتہدین عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں مگر اب تک ان کے ہاتھ کوئی ایسی بات نہیں آئی جس کے حوالے سے وہ انہیں بیعت الشجرہ کے مومنین سے نکال سکیں۔ محض بدگمانیوں سے ان سے اس خصلت کو نہیں چھینا جا سکتا۔

اہل سنت اپنے اس موقف پر سختی سے قائم ہیں کہ مومن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ایمان سے نہیں نکلتا۔ سو

بیعت الشجرہ والوں سے کوئی بھی بڑا گناہ صادر ہو اس سے ان کے جنتی ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ ان کی نیکیوں کی کثرت میزان میں ان شاذ گناہوں کو بالکل اٹھا دے گی۔ یہ سمجھنا کہ جو لوگ خدا کی رضا کی دولت پا چکے ان سے کبھی کوئی غلطی نہ ہوگی درست نہیں۔ جو شیعہ حضرت حسنؓ کے حضرت معاویہؓ سے صلح کرنے کے خلاف اٹھے کیا ان کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اب حضرت حسنؓ جنتی نہیں رہے۔ جیسے یہ لوگ یقیناً غلطی پر تھے لیکن ان کا یہ عقیدہ ہرگز نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ سے وظیفے قبول کرنے کے گناہ پر اب یہ دونوں شہزادے حضرت حسنؓ اور حسینؓ شباب اہل جنت کے سردار نہیں رہے۔ (معاذ اللہ)۔

بدریوں کو جب کہا گیا **اعملوا ما شئتم** اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب سب کچھ ان کے لیے حلال ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ اب وہ جو بھی کریں جنت ان کو مل کر رہے گی۔ رہے ان کے بعد کے قصور وہ اس مغفرت عام میں بخشے گئے یا ترازو میں تل گئے اور اٹھ گئے۔ ان کی نیکیوں کا پلڑا بہت بھاری رہا۔ پیغمبر کی بات کسی طرح غلط نہیں ٹھہرتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لعل اللّٰہ اطلع علیٰ اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۲)

ترجمہ : ’’گویا اللہ ان تمام اہل بدر پر مطلع ہو چکا اور اس نے کہا' اب تم جو چاہو کرو میں تمہاری (اس نیکی کے وزن کثیر سے) بخشش کر چکا۔‘‘

اور فرمایا: **انہ قد شھد بدراً۔**

ترجمہ: ’’اس نے بدر میں حاضری دی تھی۔‘‘

پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے ایمان کی گواہی دی اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کیا:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاء کم من الحق. (پ ۲۸ الممتحنہ)

ترجمہ : ’’اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم انہیں مودت کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ کافر ہوئے اس حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے۔‘‘

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ بدری کی ایک غلط حرکت پکڑی گئی اور حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی تو حضورؐ نے اس کے بدری ہونے کے ناطہ سے اسے لائق معافی ٹھہرایا۔ سو یہ سعادت وہ نیکی ہے جو یہ سب حضرات پا چکے۔

حضرت عثمانؓ نے جب جنگ تبوک میں تین سو مال سے لدے اونٹ حضورؐ کی خدمت میں دیے تو آپ کا فرمان

ما علیٰ عثمانؓ ما عمل بعد ھذہ حرام کو حلال نہیں کرتا نیکیوں کی کثرت سے ان کی ہر آئندہ ہونے والی خطا کو دھو دیتا ہے۔ (رواہ الترمذی) اسی طرح بیعت شجرہ کے خوش نصیب اللہ تعالیٰ سے مقام رضا پا چکے۔ یہ اتنا بڑا مقام ہے کہ یہ ان کے آئندہ ہونے والی تمام خطاؤں کو دھو گیا۔ شیعوں کو نہ چاہیے کہ وہ یہاں خارجی عقیدہ اختیار کریں کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے مومن دائرہ ایمان سے نکل جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) ایسا ہرگز نہیں۔

مقام رضا کے بعد دلوں پر سکینہ کا نزول

سکینہ سکون سے ہے اور سکون بمقابلہ اضطراب ہے۔ جن صحابہؓ کے دلوں میں شرائط حدیبیہ کی رو سے کچھ بوجھ تھا جیسے حضرت عمرؓ اور کئی دوسرے صحابیؓ ' ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ سکون کی ہوا اتاری۔ یہ ان مومنین پر انعام باری ہے۔ علامہ ابو حیان اندلسی (۶۵۴ھ) لکھتے ہیں:

قیل من الھم والانصراف عن المشرکین و الانفۃ من ذلک علیٰ نحو ما خاطب بہ عمر وغیرہ و ھذا قول حسنؓ بترتب معہ بترتیب مع نزول السکینۃ والتحریض بالفتح القریب والسکینۃ تقریر قلوبھم وتذلیلھا لقبول امر اللّٰہ تعالیٰ. (البحر المحیط ج ۸ ص ۹۶)

ترجمہ: ’’یہ قول بھی ہے کہ غم اور مشرکین کو اس طرح چھوڑ آنا اور اس پر جو ظاہراً ناک نہ رہتی تھی اور ایسی حالت جس کا ذکر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے حضورؐ سے کیا تھا (یہ وہ بوجھ تھا جو ان کے دلوں پر تھا) یہ قول حسنؓ (اچھی بات) ہے اس پر دلوں پر سکینہ کا اترنا خوب چسپاں ہوتا ہے اور اس میں جلد ہونے والی فتح کی بھی تحریض ہے۔ یہ سکینہ کیا ہے؟ دلوں کا قرار پانا اور حکم الٰہی کے آگے دلوں کا کمزور پڑ جانا۔‘‘

شیخ الاسلام بھی لکھتے ہیں:

’’صلح اور شرائط صلح کی طرف سے دلوں میں جو رنج و غم اور اضطراب تھا فانزل السکینۃ علیھم اس پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔‘‘ (ص ۶۸۲)

بیعت رضوان پر شیعہ کے دو دعوے

۱۔ یہ رضاء خداوندی مشروط بعہد وفا تھی۔ شیعہ پھر اپنی خفیہ شرائط پر اترا ہے۔

جواب : اس پوری آیت میں کوئی حرف شرط موجود نہیں۔ آیت پر پھر سے نظر کر لیجئے سب بیعت کرنے والے یہ مقام

رضا پا چکے۔

لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھمفوانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحاً قریباً.

رافضی ہمیشہ اپنی تخلی شرائط کے سہارے اب تک قرآن کی ان روشن آیات کا سرے سے انکار کرتے رہے ہیں۔

اس بیعت میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں کی بیعت مستقل پیرایوں میں روشن رہی۔ حضرت عمرؓ اور چند دوسرے صحابہؓ کے دل میں شرائط صلح کی رو سے جو تردد تھا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر سکینہ اتارا۔ یہ انعام بالائے انعام ہے اور حضرت عثمانؓ کی بیعت حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے کی جس میں منافقت کا کوئی تردد نہیں ہو سکتا۔ سو اس یقین سے چارہ نہیں کہ اس بیعت میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو یہ مقام رضا اور نزول سکینہ کی دولت مل کر رہی۔ ولو کرہ الکافرون۔

بیعت کا توڑ ایک دوسرا عمل ہے جس کا وبال اپنی جگہ ہے

بیعت توڑنے پر ایک وعید ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی کچھ لوگ اپنے اس عہد کو توڑیں گے۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علٰی نفسہ ومن اوفٰی بما عاھد علیہ اللّٰہ فسیؤتیہ اجراً عظیما . (پ۲۶ الفتح ۱۰)

ترجمہ : ’’تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ ان کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔ پھر جو کوئی عہد توڑے سو وہ اسے توڑنے سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور جو پورا کرتا ہے وہ عہد جو وہ اللہ سے باندھ چکا تو اللہ تعالیٰ دے گا اسے اجر عظیم۔‘‘

اب اگر کوئی بیعت توڑے تو اس نئے عمل پر اس سے نیا برتاؤ ہوگا۔ یہ نہیں کہ اس کی پہلی بیعت بھی ایک نیکی کا عمل نہ تھا، محض منافقت تھی۔ اگر کچھ بیعت توڑنے والے ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بیعت کرنے والے پر بدگمانی کی جائے کہ یہ بھی اسے توڑ دے گا۔ ہر ایک کے اس دوسرے عمل پر ایک کھلی دلیل چاہیے جس سے یہ نکث بیعت نہ ہو۔ اس سے اتنی روشن دلیل اور آسمانی شہادت سلب کرنا یہ عامی اور اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا ظلم ہے اور فتنہ ہے۔ جو یہ آسمانی دولت پا گئے، اب کوئی مفسد ان سے یہ دولت چھین نہیں سکتا۔

بیعت سے جان چرانے والے صرف اعراب (دیہاتی) رہے وہ ساتھ چلے ہی نہ تھے

سیقول المخلفون من الاعراب ...... ومن لم یؤمن باللّٰہ ورسولہ فانا اعتدنا للکافرین سعیراً . (فتح ۱۳)

ترجمہ : ’’اب کہیں گے تجھ سے پیچھے رہ جانے والے گنوار، ہم کام میں لگے رہ گئے اپنے مالوں کے اور اپنے گھر والوں کے۔ سو ہمارا گناہ (اللہ سے) بخشوا دیں۔ آپ کہہ دیں کہ کس کا بس چلتا ہے اللہ کے ہاں اگر وہ چاہے تمہارا نقصان یا چاہے تمہارا فائدہ......اور جو یقین نہ لائے اللہ پر یا اس کے رسول پر تو ہم نے بے شک کافروں کے لیے تیار کی ہے دہکتی آگ۔‘‘

یہ وہ کمزور دیہاتی لوگ تھے جو پہلے سے ہی مدینہ میں بجز ایک شخص کے ساتھ نہ چلے تھے وہ سمجھتے تھے کہ لڑائی ہو کر رہے گی، حضور اور ان کے ساتھ نکلنے والے مسلمان واپس نہ لوٹیں گے، سب ختم ہو جائیں گے۔ قرآن پاک انہیں اس طرح جھنجھوڑتا ہے۔

بل ظننتم ان لن ینقلب الرّسول والمؤمنون الٰی اھلیھم ابداً وزین ذٰلک فی قلوبکم وظننتم ظن السوء وکنتم قوماً بوراً

ترجمہ : ’’کوئی نہیں، تم نے تو خیال کر رکھا تھا کہ اب حضورؐ اور (ان کے ساتھ کے) مومنین کبھی اپنے گھروں کو واپس نہ لوٹیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں میں بھلا نظر آ رہا تھا اور تم بڑی بڑی اٹکلیں دل میں لا رہے تھے اور تم لوگ تھے تباہ ہونے والے۔‘‘

شیخ الاسلام لکھتے ہیں :

’’مدینہ سے چلتے وقت منافق (بجز ایک جد بن قیس کے) مسلمانوں کے ساتھ نہیں آئے۔ بہانے کر کے بیٹھ رہے۔ دل میں سوچا کہ مٹھ بھیڑ ضرور ہو کر رہے گی۔ یہ مسلمان لڑائی میں تباہ ہوں گے۔ ایک بھی زندہ واپس نہ آئے گا کیونکہ وطن سے دور فوج کم اور دشمن کا دیس ہوگا ہم کیوں ان کے ساتھ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں۔‘‘ (ص ۶۸۰)

ان کے اس کردار سے ان کی وہی بیعت ٹوٹی جو انہوں نے قبول اسلام کی کی تھی۔ اس بیعت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مقام رضا کی بشارت نہ دی تھی۔ ہاں جو وہاں سے مکہ کی طرف چلے اور حدیبیہ میں انہوں نے حضورؐ سے موت پر بیعت کی تو وہ بے شک اللہ تعالیٰ سے مقام رضا پا گئے اور ان پر جن کے دلوں میں شرائط صلح حدیبیہ کا بوجھ یا اضطراب تھا ان پر سکینہ الٰہیہ اترا۔

ایک منافق جد بن قیس کا ساتھ دینا النادر کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ اس نے وہاں بیعت نہ کی تھی، وہ تو اپنی پہلی مسلمان ہونے کی بیعت بھی توڑ چکا تھا۔ سو اہل اسلام کا یہ دعویٰ کہ جن لوگوں نے بھی اس دن بیعت شجرہ کی وہ سب جنت کے اہل ٹھہرے، اپنی جگہ بالکل بے غبار رہا۔

وفی الحدیث عنہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یدخل النار من شھد بیعۃ الرضوان .

(البحر المحیط ج ۸ ص ۹۶)

آنحضرتؐ سے حدیث مروی ہے کہ وہ شخص کبھی دوزخ میں نہ جائے گا جس نے اس دن میں درخت کے نیچے مجھ سے بیعت کی۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''حدیث میں ہے کہ جن اصحاب نے حدیبیہ میں بیعت کی ان میں سے ایک بھی دوزخ میں نہ ہوگا۔''

یہ بیعت رضوان حضرت عثمانؓ کے بے گناہ خون پر لی گئی تھی۔ یہ اسلام کا وہ مقدس سفر تھا جس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل مسلمانوں کو تول دیا اور حضرت عثمانؓ کی شخصیت لائق رشک رہی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہجرت رسول پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کل مسلمانوں کی نصرت کے ساتھ تولا اور حضرت ابوبکرؓ کا پلڑا بھاری رہا۔

الا تنصروه فقد نصره الله اذ اخرجه الذین کفروا ثانی اثنین اذ هما فی الغار.

(پ ۱۰. التوبه ۴۰)

ترجمہ : ''اگر تم نہ مدد کرو گے اس رسول کی تو اللہ نے اس کی اس وقت مدد کی جب اس کو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو کا؟ جب وہ دونوں تھے غار میں۔''

یہاں پر سکینہ اترا تھا جس طرح بیعت رضوان میں حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھیوں پر سکینہ اترا تھا۔

۲۔ بیعت رضوان پر شیعہ رافضی کا دوسرا دعوی

دوسری بات جس کے شیعہ مدعی ہیں یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس بیعت سے منحرف ہو گئے تھے۔ آیئے اب ان کی اس غلط بیانی کا بھی ایک جائزہ لے لیں۔

علمی اور اخلاقی طور پر کتنی پست بات ہے کہ جد بن قیس جو اس دن بیعت کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اس پر نکث بیعت کا الزام لگایا جائے یہ صرف بایں طور لگ سکتا ہے کہ اب اس کی قبول اسلام والی بیعت بھی جاتی رہے سو یہ نہیں کہ اس نے اس وقت حضورؐ سے تحت الشجرہ بیعت کی تھی وہ ٹوٹی کیا روح القدس کی موجودگی میں کوئی منافق وہاں بیعت کر سکتا تھا؟

ڈھکو رافضی نے یہاں تین اور نام بھی لیے ہیں اور انہیں بیعت الرضوان کا اعزاز دیا ہے۔

ا۔ عبدالرحمٰن بن عدیس مصری :

اسے ان لوگوں کا سرغنہ بتلایا ہے جو حضرت عثمانؓ پر حملہ کرنے کے لیے مصر سے آئے تھے۔ یہ بلوہ میں شریک تھا

مگر بالفعل اس نے قتل کیا ہو اس پر ڈھکو نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ کیا اس میں یہ احتمال نہیں کہ وہ بھی محمد بن ابی بکر کی طرح پھر پیچھے ہٹ گیا ہو۔ کچھ بھی ہو اس عمل کو ایک گناہ کبیرہ یا بغاوت سے زیادہ اور کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ اس غلط فہمی کا مرتکب دائرہ ایمان سے نہیں نکلتا۔

گناہ کبیرہ کو مٹانے کے لیے اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو دو رعایتیں دی ہیں (۱) گناہ سے توبہ (۲) اور نیکیوں کی کثرت جو میزان عدل میں گناہوں کا پلڑا اٹھا دیں۔ اگر کسی شخص سے کوئی بڑا گناہ صادر ہوا اور دوسری طرف پیغمبرؐ سے اسے جنتی ہونے کی بھی خبر مل چکی ہو تو مومن کا کام یہ نیک گمان کرنا ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی دی ان دو رعایتوں میں کسی راہ سے اپنے گناہ سے خلاصی پا گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ اس کا جنت میں داخل ہونا ضرور ہوگا۔

آیئے اب اس حوالے کی ذرا اور تحقیق کر لیں۔

(۱) اس کا اس بد بخت گروہ میں شامل ہونا راویوں کی کسی سند متصل سے منقول نہیں ملتا۔ ڈھکو رافضی نے اس پر جو حوالہ دیا ہے اس میں اس کی کوئی ایسی متصل سند نہیں دی جو قطعی طور پر اسے بیعت رضوان کے اعزاز سے نکال سکے۔ محدثین کا یہ دعویٰ صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں کوئی صحابیؓ شریک نہ ہوا تھا۔ امام نوویؒ (۶۷۶ھ) کی تحقیق سے ابوعمرو کی رائے مسترد ٹھہرتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا انما العبرة بالخواتیم ۔ حافظ ابن کثیر (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:

لم یشارک فی قتله احد من الصحابة وانما قتله همج و رعاء من غوغاء القبائل و سفلة الاطراف والارذال تحزبوا وقصدوه من مصر فعجزت الصحابه الحاضرون عن دفعهم. (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۲)

ترجمہ : ''حضرت عثمانؓ کے قتل میں کوئی صحابی شریک نہیں ہوا۔ آپ کو قتل کرنے والے نچلے درجے کے لوگ تھے۔ یہ فساد پیدا کرنے والے قبائل اور جنگلی قسم کے رذیل لوگ تھے جو جتھہ بن کر آئے اور انہوں نے آپ پر حملہ کیا اور صحابہ حاضرین انہیں روکنے سے عاجز رہے۔''

پھر اگر بلوہ میں کوئی صحابیؓ شریک بھی ہوا تو کیا پھر اس کے پیچھے ہٹنے کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ تاکہ پیغمبر کی بات صحیح اترے کہ بیعت شجرہ کا اعزاز پانے والا کوئی شخص آگ میں نہ جائے گا۔ جب یہ حدیث شہرت کے درجے کو پہنچ چکی تو اب ہم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

حافظ ابن سعد لکھتے ہیں :

وکان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الذی خذلوہ کرھوا الفتنۃ وظنوا ان الامر لا یبلغ قتلہ فاندموا علٰی ما صنعوا فی امرہ.

ترجمہ: "اور حضورؐ کے صحابہؓ میں سے جنہوں نے آپؓ سے بدسلوکی کی انہوں نے بھی اسے برا جانا' انہیں گمان تھا کہ یہ مخالفت آپ کے قتل تک نہ پہنچے گی سو جب ایسا ہو گیا تو وہ اپنے کیے پر نادم ہوئے۔"

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کوئی صحابی آپ کے قتل میں بالفعل شریک نہ تھا۔ رہا کسی بلوے میں شامل ہونا تو وہ اپنے اس عمل پر بھی اظہار ندامت کر چکے۔ اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کی اس بات کے پورا ہونے میں کہ جس نے بیعت رضوان کا اعزاز پایا وہ کبھی آگ میں داخل نہ ہوگا' اس میں کسی صحابیؓ کا کوئی عمل اب رکاوٹ نہ بنے گا۔

۲۔ ابوالغاویہ یسار بن سُبع

حضرت علیؓ کے گروہ میں دو طرح کے لوگ تھے (۱) مخلصین جو پہلے حضرت ابوبکرؓ ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بیعت ہوئے تھے۔ (۲) وہ لوگ جو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں کسی وجہ سے شامل رہے' یہ حضرت علیؓ کی فوجوں پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ کو کہنا پڑا یملکوننا ولا نملکھم ۔ وہ ہمیں دبائے ہوئے ہیں ہم انہیں دبا نہیں سکتے۔ پھر بھی یہ ایک فتنہ کے درجے میں تھے۔ یہ کسی فئہ عظیمہ یا لشکر عظیمہ یا عسکر کے درجے میں نہ تھے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ حضرت علیؓ کے مخلصین میں سے تھے۔ انہیں حضرت علیؓ کے گروہ کے فئہ باغیہ نے قتل کر دیا اور کوشش کی کہ اس قتل کو حضرت معاویہؓ کے فئہ عظیمہ پر ڈال دیں۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہو پائے اور یہ بات یقینی درجے میں ثابت نہ ہو پائی کہ انہیں حضرت معاویہؓ کے فئہ عظیمہ نے قتل کیا ہے۔ حضرت معاویہؓ کی جماعت کے لیے فئہ عظیمہ کے الفاظ خود لسان رسالت سے ثابت ہیں۔

حضرت عمارؓ کو فئہ باغیہ نے قتل کیا یا فئہ عظیمہ نے

حضرت عمارؓ کو امیر معاویہؓ کے لوگ قتل کرتے تو ان کا یہ قتل برسر عام ہوتا۔ اس طرح چھپے نہ ہوتا کہ ان کے قاتلین میں اختلاف جا نکلے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک فئہ باغیہ نے قتل کیا تھا اور وہ کسی بڑے لشکر کے لوگ نہ تھے۔ یہ حضرت عثمانؓ کے خلاف اٹھنے والے حضرت علیؓ کے گروہ میں گھسے ہوئے فتنہ پرور لوگ تھے۔ انہیں باغی حضرت عثمانؓ کی نسبت سے کہا جاتا رہا نہ کہ اس سے حضرت علیؓ کی تردید مقصود تھی۔ یہ وہ حالات تھے کہ یہ قتل اب تک مخفی درجے میں ایک معمہ بنا چلا آیا ہے۔ اور اس پر کئی متضاد باتیں سننے میں آتی ہیں۔ یاد رکھیے کسی مختلف فیہ بات سے کسی دوسری مختلف فیہ

بات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کسی قطعی بات سے ہی کسی اختلاف کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

اگر ابوالغاویہ نے ہی حضرت عمارؓ کو شہید کیا تو ایک گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس ارتکاب میں کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ بالفعل آپ کو کس نے قتل کیا ہے۔

پھر یہاں اس بات کی بھی تحقیق درکار ہے کہ کیا ابوالغاویہ واقعی بیعت رضوان میں شریک تھا؟

حافظ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) نے الاستیعاب میں حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے الاصابہ میں اس کے بیعت رضوان میں شامل ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) نے اسے صیغہ تمریض سے اس کا ذکر کیا ہے۔

وقد قیل انہ من اھل بیعۃ الرضوان ذکر ذلک ابن حزم. (منہاج السنۃ ج۶ ص۲۰۵)

اب اہل ایمان کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ اگر ابوالغاویہ کو ہی حضرت عمار بن یاسرؓ کا قاتل ٹھہرانا ہے تو اسے بیعت رضوان کا اعزاز نہ دیا جائے تاکہ حضورؐ کا یہ فرمان صحیح اور یقینی رہے کہ بیعت رضوان کا شرف پانے والا آگ میں نہ جائے گا اور اگر اسے بیعت رضوان میں شامل کہنا ہے تو اسے حضرت عمارؓ کا قاتل نہ کہا جائے۔ تاریخ کا حوالہ غلط ہو سکتا ہے لیکن پیغمبر کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

ابوالغاویہ کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا جس پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت رضوان میں شامل نہ تھا۔ مقام بیان میں عدم بیان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

ادرک النّبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو غلام روی عنہ انہ قال ادرکت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانا یفع ارد علٰی غنمی. (الاستیعاب علٰی الاصابہ. ص ۱۵۱)

ترجمہ: "اس نے حضور اکرمؐ کو پایا درحالیکہ وہ ایک لڑکا تھا' اس سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور میں جوان تھا اور بکریاں چراتا تھا......"

اس نے کہا میں نے حضورؐ کو پایا اور میں ایک قریب البلوغ نوجوان تھا' اپنی بکریاں ہانکتا تھا۔ یہ جس طرح اپنی عمر کا ذکر کر رہا ہے اس سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ بیعت رضوان میں شامل نہ تھا۔ ورنہ وہ حضورؐ سے حضرت عثمانؓ کی بیعت لینا بھی نقل کرتا۔ خصوصاً جبکہ اسے حضرت عثمانؓ کے حامیوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ حاصل اینکہ وہ شاید ہی بیعت رضوان میں شامل ہوا ہو۔

پھر جنگ صفین (حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ) جنت اور جہنم کے لیے نہ تھی' اس میں نہ کفر و ایمان کے فاصلے قائم تھے۔ حضرت علیؓ اعلان کر چکے تھے کہ میں اور معاویہؓ عقیدے میں ایک ہیں۔ الامر واحد ۔ سو حضور اکرمؐ

کا حضرت عمارؓ کو کہنا تدعوهم الی الجنة ویدعونک الی النار ''تو انہیں جنت کی دعوت دے رہا ہوگا اور وہ تجھے آگ میں لا رہے ہوں گے۔''

تو اس میں جنت اور آگ سے مراد وحدت امت اور انتشار کی آگ ہے اور یہ صحیح ہے کہ اس وقت امت کا سکون انتشار میں بدل چکا تھا اور اسی وقت تک یہ انتشار رہا جب تک حضرت حسنؓ نے خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد نہ کر دی۔ اس صورت میں ضروری نہیں کہ ابوالغادیہ پھر کبھی اس آگ سے نکل ہی نہ پائے۔ حافظ ابن تیمیہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فنحن نشهد لعمار فی الجنة ولقاتله ان کان من اهل بیعة الرضوان بالجنة و اما عثمانؓ و علی و طلحة والزبیر فهم اجل قدراً من غیرهم و لوکان منهم ما کان فنحن لا نشهد ان الواحد من هؤلاء لا یذنب بل الذی نشهد به ان الواحد من هؤلاء اذا اذنب فان الله لا یعذبه فی الاخرة ولا یدخله النّار بل یدخله الجنة بلا ریب و عقوبة الاخرة تزول عنه اما بتوبة عنه و اما بحسناته الکثیرة واما بمصائبه المکفرة واما بغیر ذلک. (منهاج السنة ج ٦ ص ٢٥)

ترجمہ: ''اور ہم حضرت عمارؓ کے لیے جنت کی شہادت دیتے ہیں اور ان کے قاتل کے لیے بھی اگر وہ اہل بیعت رضوان میں سے تھا۔ رہے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تو وہ دوسروں سے بہت اونچے درجے کے ہیں۔ اگرچہ ان میں جو کچھ ہوا، ہوا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان میں سے کسی سے کوئی گناہ نہ ہوا۔ اس کی بجائے ہم کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی سے کوئی گناہ ہوا بھی تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی آخرت میں کوئی سزا نہ دے گا اور نہ اسے آگ میں داخل کرے گا۔ بلکہ یقینی طور پر اسے جنت دے گا اور آخرت کی سزا اس سے ٹل جائے گی۔ وہ سزا توبہ کی راہ سے اس سے اترے یا نیکیوں کی کثرت سے کہ ان کا پلڑا جھک جائے یا ان کے مصائب ان کے ان گناہوں کا کفارہ ہو جائیں یا اس کے علاوہ کسی اور راہ سے (ان کے لیے لسان رسالت کی تصدیق کے لیے جنت میں جانا ضروری ٹھہرتا ہے)۔''

اب آیئے آپ کو چودھویں آیت میں لے چلیں

لقد تاب الله علی النبی والمهاجرین والانصار الذین اتبعوه فی ساعة العسرة من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منهم ثم تاب علیهم. انه بهم رؤف رحیم.

(پ ١١ التوبه ١١٧)

ترجمہ: ''بے شک اللہ مہربان ہوا اس نبی پر اور ان مہاجرین وانصار پر جنہوں نے آپ کی اس مشکل وقت میں پیروی کی۔ بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان کے ایک فریق کے دل پھر جائیں۔ پھر وہ مہربان ہوا ان پر، بے شک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا۔''

اس آیت میں دو فریق کا ذکر ہے

(۱) ساعة العسرہ (جنگ تبوک) میں حضورؐ کی تابعداری میں رہنے والے مہاجرین وانصار۔

(۲) وہ لوگ جن کے دل بھٹکنے کے بالکل قریب تھے پھر اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہوا اور وہ حق پر قائم رہے۔

شیخ الاسلام اس آیت پر لکھتے ہیں:

''خدا کی مہربانیاں پیغمبر علیہ السلام پر بے شمار ہیں اور آپ کی برکت سے مہاجرین وانصار پر بھی حق تعالیٰ کی مخصوص توجہ اور مہربانی رہی کہ ان کو ایمان وعرفان سے مشرف فرمایا۔ اتباع نبویؐ جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے سرانجام دینے کی ہمت وتوفیق بخشی۔ پھر ایسے مشکل وقت میں جبکہ بعض مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے اور قریب تھا کہ رفاقت نبویؐ سے پیچھے ہٹ جائیں حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی اور دست گیری فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات و وساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو مضبوط اور ارادوں کو بلند رکھا۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ یہ دونوں فریق حقیقۃً ایک ہی تھے۔ تبھی تو دوسرے فریق کو اس طرح ذکر کیا فریق منهم (کہ یہ لوگ انہی میں سے تھے) اب جب وہ بھی ڈگمگانے لگے باوجودیکہ وہ حضورؐ کے ساتھ قائم رہے تو کون اتنا بے حیاء ہو سکتا ہے کہ اس دوسرے فریق کو منافقوں میں لا کھڑا کرے۔ یہ ڈھ گور رافضی اس آیت پر لکھتا ہے:

''جنگ تبوک تو لڑی ہی نہیں گئی تو اس میں اصحاب ثلثہ نے کیا کارنامے انجام دیے؟...... جس جنگ میں مسلمانوں اور کافروں کا آمنا سامنا ہوا ہی نہیں اس میں بڑے کارنامے کیا انجام دیے؟۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست۔'' (تجلیات ۹۶)

رافضی کو یہ بات خدا کو کہنی چاہیے کہ جو جنگ لڑی ہی نہیں گئی تو صحابہ کرامؓ کے دونوں طبقوں کی اس طرح کیوں مدح کر رہا ہے لیکن اس نے درست کہا کہ اس حیرت میں اس کی عقل جل چکی ہے۔ وہ بات کو کیسے سمجھ پائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی مدح یونہی نہیں کی ان کے دلوں کو پڑھ کر کی ہے کہ اگر جنگ لڑی جاتی تو یہ خدا کی مہربانی پائے ہوئے کبھی پیچھے نہ ہٹتے۔ کیا حضرت عثمانؓ کی تین سو اونٹوں کی قربانی اور اس پر حضور اکرمؐ کی خوشی کسی شمار میں نہ آئے گی۔

رافضی کی ایک اور بوکھلاہٹ ملاحظہ ہو:

''باقی رہا عثمانؓ کا مالی ایثار کرنا تو اصول مناظرہ کے مطابق مولف اور ان کے ہم مذہبوں کو اس کا قطعی ثبوت کتب شیعہ سے پیش کرنا چاہیے۔'' (تجلیات ص۹۶)

الجواب : حضرت عبدالرحمٰن بن خبابؓ نے یہ دعویٰ فرمایا کہ حضور اکرمؐ نے برسرِ عام حضرت عثمانؓ کی اس خدمت مالی کا اعلان فرمایا اور کسی صحابی نے مع حضرت علیؓ اس کا انکار نہ کیا۔ امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) نے یہ روایت جامع ترمذی میں سند صحیح سے نقل کی۔ اس وقت شیعہ اصول اربعہ کی پہلی کتاب اصول کافی ابھی مرتب نہ ہوئی تھی۔ اب ان کی دوسری کتابوں کا کوئی حوالہ دیا جائے' یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس وقت تک اثنا عشری مذہب ابھی بنا ہی نہ تھا۔ اب اس وقت کی کونسی شیعہ کتاب ہم پیش کریں؟

شیعہ اصول اربعہ کے مولفین (۱) ۳۲۹ھ (۲) ۳۸۱ھ اور (۳) ۴۶۰ میں فوت ہوئے۔ اہل سنت کی کتب میں یہ حدیث پہلے سے آ چکی تھی۔ اگر یہ غلط تھی تو ان اصول اربعہ میں اس کی تردید کیوں نہ کی گئی۔ تاریخ کی عام کتابوں میں اسے بلا کسی تردید کے نقل کیا گیا ہے۔

شیعہ جب اہل سنت پر ان کی کتابوں سے اعتراضات لاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی وضاحت اور ان کا جواب وہ اپنی انہی کتابوں سے دیں گے۔ یہ کونسا اصول ہے کہ شیعہ اعتراض تو ان کی کتابوں سے لائیں اور یہ اس کا جواب شیعہ کتابوں سے دیں۔ ڈھگو رافضی کی عقل کہاں گم ہوئی ہے۔ اہل سنت اثنا عشری شیعوں پر اعتراض تو بے شک ان کی اپنی کتابوں سے لاتے ہیں لیکن ان کے کتب اہل سنت سے لائے گئے اعتراضات کی وضاحت اور ان کے تحقیقی جوابات تو آخر انہی کتابوں سے پیش کیے جائیں گے جن سے شیعہ یہ سوالات اٹھاتے ہیں۔ سوالات سنی کتابوں سے ہوں اور جوابات شیعہ کتابوں سے یہ کونسا اصول مناظرہ ہے۔ ڈھگو اس سے بالکل بے خبر ہے ورنہ لوگ اسے ڈھ گو نہ کہتے۔

مولانا دبیرؒ نے کتاب آفتابِ ہدایت مسلمانوں کے لیے لکھی تا کہ وہ شیعہ کی پیدا کردہ غلط فہمیوں سے کہیں متاثر نہ ہوں۔ اس میں شیعہ کتب کے حوالے محض ضمنی دیے گئے ہیں۔ مولانا قرآن کریم کو ایک مرکزی دستاویز کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ مانتے ہیں کہ اثنا عشری شیعہ بھی قرآن کریم کو اس کی اس ترتیب میں واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب سمجھتے ہیں۔

ہم ڈھ گو رافضی سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ تمہاری کتب حدیث میں امام ترمذی کی اس پیش کردہ روایت کہ آپؓ نے جنگ تبوک میں تین سو اونٹ مال سے لدے ہوئے حضور کی خدمت میں پیش کیے تھے' کا کہیں رد کیوں نہیں کیا گیا۔ جب جامع ترمذی پہلے لکھی گئی تھی اور شیعہ اصول اربعہ بعد میں تو کیا ان شیعہ محدثین کے ذمہ نہ تھا کہ اس روایت کی

علمی طور پر تردید کرتے۔ جب انہوں نے اسے تسلیم کر لیا تو اب انہیں اس کا انکار نہ کرنا چاہیے۔

آیئے اب ہم پندرہویں آیت میں چلیں

ولقد نصرکم اللّٰہ ببدر وّانتم اذلۃ فاتقوا اللّٰہ لعلکم تشکرون. اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من الملٰئکۃ منزلین.

(پ ۴ آل عمران ۱۲۳۔۱۲۴)

ترجمہ : ''اور بے شک اللہ نے مدد کی تمہاری جنگ بدر میں اور تم کمزور تھے۔ سو ڈرتے رہو تم اللہ سے تا کہ تم (اس کا) شکر کر پاؤ۔ جب آپ کہہ رہے تھے ان مومنین سے' کیا یہ کافی نہیں تمہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتے اتار کر۔''

اس آیت میں جنگ بدر کے تمام شرکاء کو مسلمہ پیرائے میں مومنین کہا گیا ہے۔ اس میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بالفعل شامل تھے اور حضرت عثمانؓ بحکم رسالت اس جنگ کے شرکاء میں شمار رہے۔ کیونکہ حضورؐ نے انہیں ہر ایک کے برابر اس جنگ کی غنیمت سے حصہ دیا۔ اب ان تینوں میں سے کیا کسی کے مومن نہ ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

مگر ڈھ گو رافضی اپنی اس پرانی ڈگر پر یہ کہہ رہا ہے:

''شیخین کی اگرچہ اس جنگ میں شرکت ثابت ہے مگر ان کا کوئی جنگی کارنامہ پیش کرنے سے کتب فریقین قاصر نظر آتی ہیں۔'' (تجلیات ص۹۶)

اور اگر کوئی سنی ان کا کوئی کارنامہ پیش بھی کر دے تو ہم کہیں گے یہ تو تمہاری کتابوں میں ہے ہمیں ہماری کتابوں سے دکھاؤ۔ ملاں آں کہ چپ نباشد۔

قرآن کریم میں مومنین اس جنگ کے تمام شرکاء کو کہا گیا ہے یا کوئی خاص کارنامے سرانجام دینے والوں کو۔ حضورؐ نے بھی اس دن اتنے کافروں کو قتل نہ کیا ہو جتنے کافر اس دن حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارے گئے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ حضرت علیؓ کا درجہ حضورؐ سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں قائدانہ خدمات سپاہیانہ خدمات سے مختلف ہوتی ہیں۔ مگر رافضی انہیں سمجھ نہیں پاتے۔ اب یہ رافضی اس بات پر آ گیا ہے کہ انہیں عمومی معنی میں مومن کہا گیا ہے' خصوصی معنی میں نہیں۔ خصوصی معنی میں صرف وہی مومن ہیں جنہیں شیعہ مومن کہیں۔

جب اس پر ضد باندھی ہو کہ ماننا نہیں تو ایسے رافضیوں کو کون کوئی بات منوا سکتا ہے۔ ضد کا کوئی علاج نہیں۔

آیئے اب ہم سولہویں آیت میں چلتے ہیں

واذ غدوت من اهلک تبوّی المؤمنين مقاعد للقتال والله سميع عليم .

(پ ۴ آل عمران ۱۲۱)

ترجمہ: ''اور جب صبح آپ اپنے گھر سے نکلے' مومنین کو اپنے مورچوں میں بٹھانے کے لیے' اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں۔''

یہاں بھی جملہ شاملین جنگ کو مومنین کہا گیا ہے جو حضورؐ نے مختلف مورچوں پر بٹھائے۔ رافضی یہاں بھی یہ کہہ کر نکل جائیں گے کہ یہاں مومن عمومی معنی میں کہا گیا ہے خصوصی معنی میں کہا ہو تو دکھاؤ۔ تعصب اور ضد کی انتہاء ہے کہ جب تک یہ خود انہیں مومن نہ کہیں ان کا مومن ہونا کہیں ثابت نہ ہوگا۔ نعوذ باللہ من تلک الخرافات۔ آیتوں کا جواب تو ان سے بن نہیں آتا۔ ڈھ گور رافضی نے یہاں حضرت عثمانؓ کے خلاف کچھ جزوی مسائل اٹھائے ہیں۔ ہم جنگ احد سے ان کے پھر جانے کا جواب پہلے پوری تفصیل سے دے آئے ہیں اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ وہاں سے بھاگے نہ تھے ورنہ پھر وہ کیوں یہاں آ گئے اور حضورؐ نے بھی انہیں نکلنا کہا' بھاگنا نہ کہا کہ ''اے عثمانؓ تم بہت دور نکل گئے تھے''۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں چند جنگی اصول بھی ہدیہ قارئین کر دیں تاکہ سمجھا جا سکے کہ ایسے مواقع میں مسلم قائدین جو کچھ بھی کر گزرے یہ اس وقت کی آواز تھی ان سے کوئی جماعتی قوت ٹوٹنی نہ چاہیے۔

جنگوں کا ایک نازک مرحلہ' ایسے وقت مدبرین کو کیا کرنا چاہیے؟

قرآن کریم ایک جامع دستور حیات ہے جو جنگوں میں بھی زندگی کے کچھ اصول بتاتا ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا قرآن کریم کی تعلیم نہیں ہے۔ تم دشمن کو گھیرے میں لینے کے لیے اپنے مورچے چھوڑ سکتے ہو۔ اپنی قوت دوبارہ بنانے کے لیے تم اپنے آدمیوں کے پاس آ جمع ہو سکتے ہو۔ ان دو کے علاوہ کوئی صورت ہو تو اسے میدان چھوڑنا کہا جائے گا اور یہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

يا ايها الذين امنوا اذا لقيتم الذين كفروا زحفاً فلا تولوهم الادبار ۝ ومن يولهم يومئذ دبره الا متحرفاً لقتال او متحيزاً الى فئة فقد باء بغضب من الله .

(پ ۹ الانفال ۱۶)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم بھڑو کافروں سے میدان جنگ میں تو نہ پھیرو پیٹھ ان سے اور جو کوئی پھیرے پیٹھ اس دن ان سے مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو جنگ کا یا جا ملتا ہو اپنے مرکز میں پھر سے آتا'

تو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔''

اس آیت پر شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ موثر ہو یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے جدا ہو گئی وہ اپنے بچاؤ کے لیے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا چاہتی ہے تو ایسی پسپائی جرم نہیں' گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی محض لڑائی سے جان بچا کر بھاگنے کی نیت سے ہو۔''

جنگ احد میں درہ چھوڑنے سے مسلمان دونوں طرف سے کافروں کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ آگے کافروں کے مورچے تھے اور پیچھے درہ کی راہ سے آنے والے کافر حملہ آور۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ درمیان میں گھرے رہنے والے وہاں سے نکل کر کسی اور جگہ جمع ہوں یا یہاں دونوں طرف سے گھرے جانیں دے دیں۔ یہاں قرآن کریم ہدایت دیتا ہے کہ تم پیچھے ہٹ کر اپنی جمعیت پھر سے قائم کرو۔ اب اگر احد کے میدان میں بعض صحابہ افراتفری میں ادھر ادھر دوڑے تو اسے جنگ سے بھاگنا نہیں کہتے اور حالات بھی بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے وہاں پھر سے اپنی قوت جمع کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ دور نہیں گئے وہ لوگوں کو پھر سے جمع کرنے لگے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے اس دن حضورؐ کی حفاظت کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ حضورؐ پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ سوائے حضرت ابوبکرؓ کے کوئی آپؐ کے پاس نہ تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکست پھر سے فتح میں بدل گئی اور کافر مکہ کی طرف واپس ہوئے۔ اس افراتفری میں مسلمانوں کا پھر سے سنبھلنا ایک عجیب جنگی پوزیشن تھی جس کا احساس کفار مکہ کو بھی بہت بعد دور جا کر ہوا اور وہ پھر سے آنے کی سوچنے لگے مگر ان کو ہمت نہ ہو سکی۔ اس نازک صورت حال میں اس ٹوہ میں لگنا کہ کس نے کتنی پوزیشنیں بدلیں اور کتنے دشمن مارے یہ کوئی دانشمندانہ کارروائی نہیں ہے۔ شیعہ اسی افراتفری اور نازک صورت حال کو اپنی تخریبی سوچ کا موضوع بناتے ہیں اور صحابہ میں عمومی مومن اور خصوصی مومن کی تفریق پیدا کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی حکمت دیکھیں کہ اس نے اس موقع پر اپنی جگہ چھوڑنے والے جملہ مومنین کرام کو معاف فرمایا اور اس بحث کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کہ اس معرکے میں کون آگے رہا اور کون پیچھے۔ قوموں پر جب ایسا مرحلہ آتا ہے تو وہ اپنی عمومی قوت اور جماعتی زندگی کو کبھی پامال نہیں ہونے دیتیں۔ جنگ احد کے منہزمین سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق نے یہی برتاؤ کیا۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ سے بھی بس اتنا کہا کہ عثمان تم بہت دور نکل گئے تھے۔ یہ نہ کہا کہ تم بھاگ گئے تھے اور اگر وہ بھاگے ہوتے تو پھر کیوں آ جاتے۔ جس نے بھی حضرت عثمانؓ کے خلاف کوئی بات کی آپؐ نے اسے ناپسند فرمایا۔

حضرت عثمانؓ کے مدینہ پہنچ جانے کا مطلب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہاں آپ اس نئی صورت حال کا پھر سے جائزہ لے سکیں اور ممکن ہو تو کچھ اور لوگوں کو وہاں سے ساتھ لایا جا سکے اور جس طرح بھی ممکن ہو کچھ اور امداد فراہم کی جائے۔

احد میں اگر آواز لگ گئی تھی کہ حضورؐ شہید ہو گئے تو اس کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا تھا کہ اب دین حق ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اس پر کھڑے ہونے کی پھر سے کوئی اور تدبیر نہ ہو سکے۔ حضرت ابو بکرؓ صدیق نے اپنے خطبے میں بھی اس طرف توجہ دلائی کہ اگر حضورؐ وفات پا جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر واپس کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے' یعنی ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ حضرت عثمانؓ ایک مفکرؓ ہونے کی حیثیت میں اگر اس سوچ میں دور نکل گئے تو ایسے موقعوں پر ایسی صورتیں پیش آ ہی جاتی ہیں۔ بڑے لوگوں سے نیک گمانی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہاں ان کے خلاف بدگمانی کے لیے دلیل درکار ہے۔ بلا قرینہ و دلیل کسی کے بارے میں بدگمانی نہ چاہیے۔

حضورؐ کا فیصلہ سب فیصلوں پر حاوی ہے

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو شرکاء بدر میں شمار فرمایا اور ان کو دوسرے بدریوں کے ساتھ برابر کا حصہ دیا۔ اب کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے جنگ بدر میں نہ آنے کو ان کی کسی درجہ میں کمزوری بتلائے۔ جو شخص بھی پیغمبر کے فیصلے کو دل سے قبول نہ کرے اسے ہم کیسے مومن کہہ سکتے ہیں؟

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما. (پ ۵ . النساء ۶۵)

ترجمہ : ''سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے' پھر نہ پاویں اپنے جی میں کوئی تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں اسے پوری خوشی سے۔''

۲۔ جنگ احد میں جب صورت حال بدلی اور افراتفری میں بعض صحابہ ادھر ادھر منتشر ہوئے تو حضورؐ نے ان میں سے کسی کو فرار من الزحف کا مجرم نہ ٹھہرایا۔ حضورؐ نے اسے ناپسند کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اگر اسے فرار کے لفظ سے ذکر کیا تو یہ محض الزاماً کہا۔ کیونکہ وہ آپ کے کسی مخالف سے بات کر رہے تھے۔ وہ خود حضورؐ کی پیروی میں اسے فرار نہ سمجھتے تھے۔ بنو امیہ جنگ میں بہادر سمجھے جاتے تھے اسی لیے خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراءؓ نے جب از راہ تعجب کہا **ما فعل عثمانؓ یوم احد** تو اس پر حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو کسی درجہ میں قصوروار نہ ٹھہرایا۔ جو احد کے ذکر میں حضرت عثمانؓ پر کوئی اعتراض کریں۔ اب وہ لوگ کیسے مومن سمجھے جاسکتے ہیں۔ یہ ڈھ گو رافضی کہتا ہے:

''منجملہ احد کے بھگوڑوں میں ایک عثمانؓ بھی تھے جو سعد اور عقبہ نامی دو انصاری مردوں کے ساتھ بھاگے تھے اور بھاگتے بھاگتے دور نکل گئے تھے۔'' (ص ۴۹)

اس رافضی کو انهزم کا ترجمہ بھاگنا کرتے ہوئے کوئی علمی حجاب مانع نہ ہوا۔ ہزیمت شکست کو کہتے ہیں' شکست

میں پیچھے ہٹنا اور پھر آجانا یہ بھاگنا نہیں کہلاتا۔ ورنہ دور نکل جانے کو آگے حتی سے ذکر نہ کیا جاتا۔

حتی بلغوا موضعاً بعیداً ثم رجعوا بعد ثلثة ایام.

جب حضرت عثمانؓ حضورؐ کے پاس آئے تو کیا حضورؐ اس وقت مدینہ آ گئے ہوئے تھے' احد پر نہ تھے؟ جب ایسا نہیں تو ان کا یہ واپس آنا کیا میدان جنگ میں ہی لوٹنا نہ تھا؟

پھر یہ رافضی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھی ان بھاگنے والوں کا بھائی کہا۔ تو چرا بہ برادراں ملحق نہ گشتی۔ معلوم ہوا کہ یہ دور چلے جانے والے دائرہ ایمان میں ہی تھے جو ایک ہنگامی صورت حال میں دور جا نکلے۔ ورنہ حضور حضرت علیؓ کو ان کا بھائی نہ کہتے۔ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ حضورؐ نے ان نکلنے والوں کو تو کچھ نہ کہا کہ تم کیوں نکلے تھے۔ حضرت علیؓ کو ہی کہا کہ تم کیوں نہ نکلے اس صورت حال میں ایسا ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

ڈھ گو رافضی نے آگے حضرت علیؓ کا جو جواب نقل کیا ہے اس میں انہوں نے اسے کفر و ایمان کی بات ٹھہرایا تو حضرت جبریلؑ نے اس کی فوراً تردید کر دی کہ یہ محض ہمدردی کا ایک پیرایہ ہے۔ یہ کفر و ایمان کی بات ہوتی تو حضورؐ حضرت علیؓ کو ان نکلنے والوں کا بھائی نہ ٹھہراتے۔

یہ تفصیل ہم نے صرف طرداً للباب کی ہے ورنہ ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ رافضی کی پیش کردہ یہ روایت سرے سے صحیح نہیں۔ ہم حضرت علیؓ کو بھاگنے والوں کا بھائی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

پھر اس ڈھ گو نے اسی صفحہ پر آیات محکمات ۲ ص ۳۱۶ کے حوالے سے مسند امام احمد کی ایک روایت نقل کی ہے اور اس پر وہ مسند امام احمد سے حوالہ پیش نہیں کر سکا۔ شیعہ مذہب کا دارومدار ہمیشہ سے ایسی ہی جعلی روایتوں پر رہا ہے اور انہوں نے قرآن کی تفسیر بھی ہمیشہ اسی قسم کی روایتوں سے کی ہے۔ ہم پوری ذمہ داری سے کہتے ہیں کہ یہ روایت جعلی ہے۔

وما تخفی صدورهم اکبر.

حضرت عثمانؓ کے خلاف اظہار بغض کی تین اور باتیں

۱۔ ''عثمانؓ کو سفیر بنا کر بھیجنے کا انتخاب آنحضرتؐ نے نہیں کیا تھا۔'' (تجلیات ص ۹۴)

الجواب : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی تجویز پر حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنایا اور مکہ بھیجا۔ اب یہ کیا حضورؐ کا اپنا انتخاب شمار نہ ہوگا۔ حضورؐ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہیں' حضورؐ کے سامنے کوئی بات ہو اور آپ اس پر نکیر نہ کریں تو ہم اسے بھی حضورؐ کی بات سمجھتے ہیں۔ چہ جائیکہ آپؐ کا ایک بڑی سیاسی ضرورت پر حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجنا حضورؐ کا انتخاب نہ سمجھا جائے۔

پھر اس ترتیب انتخاب میں حضرت عمرؓ کا نام پہلے آنا بتلاتا ہے کہ حضورؐ کو بدر و احد کے معرکے کے گزرنے کے

بعد بھی حضرت عمرؓ کی دیانت وامانت پر پورا پہلے کا سا اعتماد تھا۔ اگر ان سے پہلے ان معرکوں میں کوئی بھی فروگزاشت ہوئی ہوتی تو آپ اس اعزاز واعلان سے اسلامی سفارت ان کے سپرد نہ کرتے۔ سفارت کے بعد تو پھر خلافت کا ہی ایک مقام رہ جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں متبادل تجویز حضرت عثمانؓ کی دی اور حضورؐ نے اسے قبول فرمایا۔ معلوم ہوا ان دونوں حضرات کی نظر میں حضرت عثمانؓ ایک وقیع سیاسی شخصیت تھے جو سیاست کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف سمجھے جاتے تھے ورنہ محض درویش کو کون سفارت پر بھیجتا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپؓ معرکہ احد میں بھاگنے والوں میں سے نہ تھے 'لشکر اسلام کی مدد کے لیے اب نئی تدبیر کیا ہوسکتی ہے اس سوچ میں آپ دور تک جا نکلے تھے اور پھر واپس آ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس سفارتی ذمہ داری پر اپنے بارے میں جو عذر حضورؐ کی خدمت میں پیش کیے انہیں حضورؐ نے قبول فرمایا اور ان کی متبادل تجویز منظور کر لی۔ یہ حضورؐ کا فیصلہ تھا۔ اب آپؐ تو حضرت عمرؓ کے عذر کو قبول فرمائیں اور رافضی اس پر انہیں بزدل ٹھہرائیں تو کیا یہ حضورؐ کے فیصلے سے ناراضگی کا اظہار نہیں؟ آپؓ نے جو عذر پیش کیے وہ حقیقۃً صحیح تھے اور منظور رسالت تھے جو دل سے اسے نہ مانیں قرآن کی رو سے وہ مومن نہیں ہوسکتا:

فلا وربک لا یؤمنون حتّٰی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلّموا تسلیماً.

۲۔ آنحضرتؐ کی حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت لینے کی مصلحت

''اگر ان کی طرف سے بیعت نہ ہوتی تو ان کو یہ عذر پیش کرنے کا موقع مل جاتا کہ انہوں نے تو فرار نہ کرنے کا عہد کیا ہی نہ تھا۔'' (تجلیات ص۹۴)

الجواب : حضرت عثمانؓ پر شیعوں کا سب سے مشہور الزام جنگ احد میں فرار کا ہے اور اس کا جواب ہم دے چکے ہیں۔ جنگ احد اس واقعہ حدیبیہ سے پہلے کی ہے۔ اگر اس الزام میں کوئی جان ہوتی تو حضورؐ حضرت عمرؓ سے کہتے کہ عثمانؓ نے احد کے دن کیا کیا تھا۔ مگر حضورؐ اسے فرار عثمانؓ نہ سمجھتے تھے۔ اب اس ڈھ گو کا یہ کہنا کہ یہ ان کے فرار کو روکنے کے لیے تھا۔ تاریخی اعتبار سے کتنی بے جوڑ بات ہے۔

جنگ بدر میں حضورؐ کا حضرت عثمانؓ کو ساتھ نہ لانا اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ مشرکین اپنے مقتولوں کی زیادہ ذمہ داری حضرت عثمانؓ پر نہ ڈالیں جیسا کہ انہوں نے یہ انتقامی کاروائی سید الشہداء حضرت حمزہؓ سے احد کے دن کی اور اس میں خدا کی حکمت تھی کہ مسلمانوں میں کوئی شخص تو باقی رہے جو اہل مکہ سے بعزت واحترام سیاسی گفتگو کر سکے۔

ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ مومنین سے نیک گمان رکھیں۔ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب کوئی بات سن پاتے ہیں تو اسے اچھے سے اچھے محمل پر محمول کرتے ہیں۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه.

حضرت عثمانؓ کی اپنے آخری دنوں کی بیعت بتلاتی ہے کہ جان دینا ان کے لیے کوئی بڑا مرحلہ نہ تھا۔

ہر بات میں بدگمانی کے کیڑے نکالنا یہ نصیب دشمناں ہے نصیب مومناں نہیں۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کے حبدار دجال کے ساتھ ہوں گے

یہاں لفظ حبدار بھی ڈھ گو کے علمی نوادرات میں سے ہے۔ عربی فارسی کی خوب ترکیب ہے حب (عربی) اور دار (فارسی) اسی طرح ہے جیسے مشکل کشا کا لفظ ہے۔

ترکیب فارسی و عربی سے یہ گرہ کھلی
مشکل کشا خدا ہے نہ مشکل کشا علی

حضرت عثمانؓ کے حامی صرف اس دور میں ایک گروہ کی صورت میں اس وقت تک رہے جب تک حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگیں رہیں۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد حامیان عثمانؓ کے نام سے کوئی گروہ موجود نہ تھا۔ مگر رافضی ڈھ گو بتلاتا ہے کہ خروج دجال کے وقت بھی حامیان عثمانؓ ایک گروہ کی شکل میں موجود ہوں گے۔ آیئے ذرا اس کی بھی کچھ تحقیق کر لیں۔ جس طرح حب دار کا لفظ اس سلطان المتکلمین کا اپنا تحفہ ہے۔ یہ روایت بھی اس ڈھ گو کی ایک اپنی کارروائی ہے۔ یہ روایت بھی آپ کو کہیں سند متصل سے نہ ملے گی۔ حافظ ذہبیؒ نے زید بن وھب کے ترجمہ میں یہ روایت اس طرح نقل کی ہے:

ومما یستدل به علٰی ضعف حدیثه روایته عن حذیفةؓ ان خرج الدجال تبعه من کان یحب عثمان. (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۱۵۸)

ڈھگو رافضی نے یہ الفاظ کہ یہ روایت صحیح نہیں خیانتاً چھوڑ دی ہے اور اسے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے فرمایا جب دجال خروج کرے گا تو اس کے وہی پیروکار ہوں گے جو عثمانؓ کے حب دار ہوں گے لیجئے یہ سعادت، مبارک ہو مبارک۔ (تجلیات صداقت ص۹۵)

یہ آخری الفاظ بھی ڈھگو کے اپنے ہیں روایت کے نہیں۔

اصلی روایت:

اول الفتن قتل عثمانؓ و آخر الفتن خروج الدجال والذی نفسی بیده لایموت رجل وفی قلبه مثقال خردل من حب قتل عثمانؓ الاتبع الدجال.

حافظ جلال الدین السیوطی نے اسے اس طرح روایت کیا ہے دیکھئے کشف التلبیس جلد۲ ص۱۴۔

ڈھگو رافضی کی اس خیانت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اثنا عشری مجتہد سب اس پائے کے ہوتے ہیں افسوس صد افسوس۔

ڈھگو رافضی کی ایک اور خیانت ملاحظہ فرمائیں

یہ بات سنی شیعہ اختلافات کو سمجھنے والوں پر کبھی مخفی نہیں رہی کہ شیعہ کے ہاں ظاہری طور پر اقرار شہادتین کرنے والے کلمہ گو مسلمان ہیں مگر انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے ہاں مومنین وہی ہیں جن کے دلوں میں ایمان آ چکا ہو۔ وہ ایمان اور اسلام کو ایک نہیں سمجھتے۔ مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ سولھویں آیت (پ ۴ آل عمران) میں احد کے جملہ شاملین کو مومنین کہا گیا ہے۔ ڈھگو رافضی نے اس کے جواب میں یہ سرخی پوری منافقانہ قوت سے سجائی ہے۔ ''لفظ مسلمین کا منافقین پر اطلاق''۔

بات شرکاء احد کے مومن ہونے کی ہو رہی ہے۔ قرآن پاک میں **تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال** کے الفاظ میں مولانا دبیرؒ کا استدلال بھی اس لفظ مومنین سے تھا۔ (آفتاب ہدایت ص ۷۵)۔ رافضی کی پیش کردہ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان کی عبارت میں بھی لفظ مسلمین جلی طور پر ڈھگو کے جواب کی تردید کر رہا ہے مگر ڈھگو اس عبارت سے منافقین پر لفظ مومنین کا اطلاق ثابت کر رہا ہے۔

چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈھگو نے حافظ ابن تیمیہ کی یہ عبارت اپنے اس دعویٰ پر کہ لفظ مومنین منافقین پر بھی آ سکتا ہے' اس طرح پیش کی ہے۔

قد اتفق العلماء علی ان اسم المسلمین فی الظاهر یجری علی المنافق ...... کان النبی یجری علیهم احکام الاسلام الظاهر.

اس عبارت میں لفظ مسلمین کھلے طور پر رافضی کی تردید کر رہا ہے بات مومنین کی ہو رہی تھی کہ یہ رافضی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ لفظ مومنین کبھی منافقین پر بھی آ جاتا ہے۔ لیکن ثبوت میں اسے کوئی عبارت ایسی نہیں ملی اور اس نے حافظ ابن تیمیہ کی وہ عبارت پیش کر دی جس میں لفظ مومنین سرے سے نہیں اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں لفظ مسلمین پیش کر رہا ہے۔

آیئے اب آپ کو ہم سترہویں آیت میں لے چلیں

وقذف فی قلوبهم الرعب یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المؤمنین. (پ ۲۸ الحشر)

ترجمہ: اللہ نے ان کے دلوں میں ہیبت ڈال دی اب وہ اپنے ہی ہاتھوں اور مومنین کے ہاتھوں اپنے گھروں کی توڑ پھوڑ میں لگے ہیں۔

یہودی جب مرعوب ہو کر نکلنے پر آئے تو خود اپنے باغوں اور قلعوں کو ملیامیٹ کرنے لگے۔ مولانا دبیر کہتے ہیں:

''جن مسلمانوں نے رسول پاکؐ کے حکم سے یہود کے گھروں کو برباد کیا خدا ان کے ایمان کی گواہی دیتا ہے۔'' (ص ۷۶)

جو یہودیوں کے گھروں کو گرا رہے تھے قرآن کریم نے انہیں مومنین کہا ہے۔

اب تک رافضی اس بات کے مدعی تھے کہ صحابہؓ جان دینے سے جی چراتے تھے۔ گھروں کا اکھاڑنا پچھاڑنا تو خطرہ جان تھا۔ رافضی اس میں بھی تمام صحابہؓ کو شریک کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان میں ان کے تین اکابر بھی آ جائیں گے۔ مولانا دبیرؒ کہتے ہیں کہ قرآن نے ان تمام حضرات کو جو یہود کی اپنی چیزوں کو اکھاڑنے میں مدد کر رہے تھے اور ان کی بستیاں برباد کر رہے تھے' مومن کہا ہے۔ اور ایمان صحابہؓ پر قرآن کی یہ بڑی شہادت ہے اور جن وضعی داستانوں اور قصوں سے رافضی ان تین کو اس عموم سے نکالتے ہیں وہ اپنے وزن میں اس درجہ کی ہرگز نہیں کہ ان سے ان تین صحابہؓ کو قرآن سے ملے کسی اعزاز سے نکالا جا سکے۔ ان بستیوں کو برباد کرنے میں مسلمانوں اور یہودیوں میں جنگ کی صورت حال نہ تھی۔ مسلمان ان کی چھتیں وغیرہ گرا کر خود انہیں کی مدد کر رہے تھے۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''وہ حرص وغیظ وغضب کے جوش میں مکانوں کے کڑی تختے کواڑ اکھاڑنے لگے تاکہ کوئی چیز جو ساتھ لے جا سکتے ہیں رہ نہ جائے اور مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ اس کام میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ ایک طرف وہ خود گراتے تھے دوسری طرف مسلمان۔ اور غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ہاتھوں جو تباہی اور ویرانی عمل میں آئی وہ بھی ان ہی بدبختوں کی بدعہدی اور شرارتوں کا نتیجہ تھی۔''

اس صورت حال میں کوئی لڑائی اور جانفشانی کا مرحلہ نہ تھا۔ اس میں کسی صحابیؓ کو بھی شمولیت سے انکار نہ ہو سکتا تھا۔ مگر خدا تعصب کا ستیاناس کرے رافضی اس میں بھی اصحاب ثلثہؓ کی شرکت نہیں مانتا۔ کیونکہ قرآن نے ان سب مسلمانوں کو مومن کہا ہے اور ڈھگو نہیں چاہتا کہ اصحاب ثلثہؓ پر لفظ مومن آ سکے۔

شیعہ بات کو یہاں سے نکال کر ایک بہت پہلی بات پر لے گئے ہیں جب مسلمان فتح خیبر کے لیے نکلے تھے اور ابھی خیبر فتح نہ ہوا تھا۔ مولانا دبیر کی پیش کردہ آیت میں قرآن کریم نے انہیں اس وقت مومن کہا ہے جب یہ تمام منزلیں طے ہو چکی تھیں اور یہود ان بستیوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور اس وقت وہ اپنے مکانوں کو توڑ پھوڑ رہے تھے۔ بھلا اس وقت کون کمزور سے کمزور مسلمان بھی ہوگا جو ان بستیوں میں آ کر ان کے مکانات گرانے میں ان کا ہاتھ بٹانے کو تیار نہ

ہو۔مگر خدا تعصب کا برا کرے، ڈھ گو رافضی یہاں بھی اصحاب ثلثہ کی شرکت ماننے کے لیے تیار نہیں کیونکہ قرآن نے انہیں مومن کہا ہے۔

حضرت مولانا دبیرؒ کے اس استدلال پر یہ ڈھ گو لکھتا ہے:

''یہاں مومنین سے مراد رجل واحد ہے اور وہ حضرت علیؓ ہیں۔خدا نے یہود کے گھروں کو اس بزرگوار کے ذریعہ برباد کیا تھا جس کے حق میں پیغمبر اسلام نے یہ اعلان کیا تھا:

لاعطین الرایه غداً رجلاً یحبه الله ورسوله. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۰۵)

رافضی نے یہاں اپنی شیعہ کتاب روضۃ الاحباب اور روضۃ الصفاء سے ان الفاظ میں یہ تبدیلی کی ہے:

لا عطین الرایه غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحبه الله ورسوله. (تجلیات ص ۱۰۰)

حدیث کی یہ عبارت صرف اس لیے بدلی گئی ہے کہ حضرت علیؓ کے لیے حیدر کرار کی اصطلاح ہموار کی جا سکے اور پھر غیر فرار کہہ کر ان بزرگوں کے خلاف بھڑاس نکالی ہے جن کے خلاف ایک شیعی عوف نامی نے یہ بات گھڑی:

''طبری کی روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی ہے لیکن فوج والوں نے خود ان کی نسبت یہی شکایت کی۔'' (تجلیات ص ۱۰۱ بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ص ۴۸۶)

میدان میں فوج لڑتی ہے امیر نہیں۔امیر انہیں لڑاتا ہے اور ترتیب دیتا ہے۔امیر تو شکایت کر سکتا ہے کہ فوج نے نامردی کی۔بھلا فوج بھی کبھی کہتی ہے کہ امیر نے ہمیں لڑایا ہی نہیں' بس ایک چکر لگا کر واپس آ گیا ہے۔ایسا کبھی نہیں ہوتا۔عوف نے یہ بات کیوں کہی اس لیے کہ وہ ایک رافضی اور شیطان تھا۔رافضی سے کیا آپ حضرت عمرؓ کی مخالفت کے سوا کچھ اور بھی سن سکتے ہیں؟

حافظ ابن حجر عسقلانی عوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

رایت داؤد بن ابی الهند یضرب عوفًا و یقول ویلک یاقدری کانت فیه بدعتان قدری شیعی وقال الانصاری وقال فی المیزان قال بندار وهو یقراهم حدیث عوف لقد کان قدریاً رافضیاً شیطاناً وقال مسلم فی مقدمة صحیحه واذا وازنت بین الاقران کابن عون وایوب مع عوف واشعث الحرانی وهما صاحبا الحسنؒ وابن سیرین کما ان ابن عون ایوب صاحباهما وجدت البون بینهما
وبین هذین بعیداً فی کمال الفضل وصحة العقل. (تهذیب التهذیب جلد ۸ ص ۱۶۷)

اب ڈھکو رافضی کی خیانت ملاحظہ ہو۔وہ تجلیات ص ۱۰۱ پر بڑے طمطراق سے یہ سرخی لاتا ہے:

''شیخین کا جنگ خیبر سے فرار'' ۔ پھر اس میں وہ علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ سے مذکورہ روایت لکھتا ہے اور اسے کوئی علمی اور اخلاقی حیا مانع نہیں ہوتی کہ وہ اس کتاب کی اگلی عبارت چھوڑ دیتا ہے جس میں اسے ایک شیعی روایت لکھا گیا ہے۔مولانا شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے' اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے۔اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں۔'' (سیرت النبی ج ۱ ص ۴۸۶۔سابق اڈیشن ج ۱ ص ۳۷۶)

حضرت علیؓ لڑنے میں اگر حضرت عمرؓ سے زیادہ تیز تھے تو کیا اس کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ حضرت عمرؓ کی نسبت نوجوان تھے اور آپ عمر رسیدہ تھے۔تاہم جب آپ جوان تھے تو یہ آپ کی ہیبت تھی کہ جس دن آپ مسلمان ہوئے مسلمانوں نے کھلے طور پر مسجد حرام میں نماز باجماعت ادا کی اور کسی کافر کو حضورؐ کے قریب آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔اس سے پہلے مسلمان بمع حضرت علیؓ چھپ کر نماز پڑھتے تھے کہ کہیں کوئی کافر حضورؐ کی طرف نہ بڑھ سکے۔

آیئے اب ہم آپ کو اٹھارہویں آیت میں لے چلیں

ولتکن منکم امّة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر واولئک هم المفلحون. (پ ۴ آل عمران ۱۰۴)

ترجمہ : ''چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو نیک کاموں کی دعوت دیتی رہے۔بھلائی کی باتوں کا رد کرے اور بری باتوں سے روکتی رہے اور وہی پہنچنے والے ہیں مراد کو۔''

فلاح کا تعلق آخرت کی نجات سے ہے دنیا میں سیدھی راہ ہدایت کہلاتی ہے اور آخرت میں کامیابی کو فلاح کہا جاتا ہے اور یہ صرف مومنین کا نصیب ہے' کافر اس سرحد کو پار نہ کر پائیں گے۔

اولئک علی هدی من ربهم واولئک هم المفلحون.

یہاں رافضی ڈھ گو کہتا ہے ''ملکی فتوحات دلیلِ ایمان نہیں ہیں۔'' اور اس پر یہ دلیل لاتا ہے:

''بعض اوقات خدا اپنے دین کی نصرت ایسے لوگوں سے بھی کرا دیتا ہے جن کا خود دین میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔'' (تجلیات ص ۱۰۱ بحوالہ صحیح بخاری مع فتح الباری)

یہاں حصہ نہ ہونے سے مراد ان کے عمل کی کمزوری ہے۔کافر یہاں ہرگز مراد نہیں اس کے بعض طرق میں رجل

فاجر کے الفاظ بھی ملتے ہیں تاہم یہ صحیح ہے کہ ڈھکو رافضی یہاں بھی اس حدیث کو سمجھ نہیں پایا۔

قائدین قیادت کرتے اور مقتدین نصرت کرتے ہیں۔ حضورؐ اپنے وقت میں دین کے قائد تھے اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ آپ کے وزیر تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے دور خلافت میں قائد تھے اور حضرت عثمانؓ ان کے سیکرٹری تھے۔ حضرت عمرؓ اپنے دور خلافت میں قائد تھے اور حضرت علیؓ ان کے سیکرٹری تھے۔ مقتدی نصرت کرتے ہیں اور قائدین قیادت کرتے ہیں۔
لقولہ تعالیٰ:

الا تنصروہ فقد نصرہ اللّٰہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذھما فی الغار.

جس طرح حضورؐ اپنے وقت میں قائد تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپ کی نصرت کرنے والے تھے۔

خلفاء ثلٰثہ اپنی فتوحات میں قائدین تھے اور دوسرے افراد امت ان کے پیرو اور نصرت کرنے والے تھے۔
انسان جب ارادۃً جھوٹ بولے تو اس کی عقل و مت ماری جاتی ہے۔ یہی حال اس رافضی کا ہے جو بڑے طمطراق سے کہتا ہے کہ ملکی فتوحات دلیلِ ایمان نہیں ہیں اور وہ نہیں سمجھتا کہ اہل سنت ان فتوحات کو ان کے دلائل ایمان میں نہیں شواہد ایمان میں لاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ مومنین پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ خلافت پورا ہوا۔

شیعہ ایسے مواقع استدلال میں ہمیشہ مخفی امور کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مثلاً اخلاص۔ کسی کے دل کی اس کیفیت کو خدا ہی جانتا ہے۔ جب خلفاء ثلٰثہ کی جہادی واردات اور ملکی فتوحات سامنے لائی جائیں تو بجائے اس کے کہ شیعہ ان کی جہادی قوتوں کا سکہ مان لیں وہ ان نازک مواقع میں جھٹ خفیہ امور کا سہارا لیتے ہیں کہ انہوں نے بے شک یہ بڑے جہاد کیے لیکن ان کے دلوں میں اخلاص نہیں تھا۔ ڈھکو لکھتا ہے:

''ان حضرات نے جو ملکی فتوحات کیں یہ ان ممالک میں روح اسلام پھونکنے کے لیے نہیں تھیں بلکہ حدود مملکت کی توسیع' ہوس اقتدار کو پورا کرنے اور دونوں ہاتھوں سے مال و دولت سمیٹنے کے جذبہ کے ماتحت تھیں جن کے لیے ثلٰثہ کی زندگیاں وقف تھیں۔'' (تجلیات ۱۰۲)

وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایسا بھی ہو تو کیا یہ فتوحات نہ تھیں۔ اور کیا ان میں لڑائیاں نہیں کی گئیں۔ اخلاص نہ بھی ہو تو کیا ان لڑائیوں میں جرأت اور مال و جان کی قربانیاں نہ دی گئی تھیں۔ بزدل اتنی بڑی بڑی جنگیں لڑ اور لڑا سکتے ہیں؟ کیا حضرت خالد بن ولید جیسے جرنیل کسی کمزور اور ڈرپوک حکمران کے حکم پر اس جرأت سے جانوں کی بازی لگا سکتے ہیں؟

پھر بھی جب دل کی بھڑاس نہ نکلی تو پھر فتوحات کو ہی چیلنج کر دیا۔ پہلے ان کی نیت پر حملہ تھا اب فتوحات بھی اسے بری نظر آنے لگیں۔

رافضی لکھتا ہے:

''ثلٰثہ کی فتوحات نے اسلام کو بدنام کیا۔ اے کاش یہ لوگ ملکی فتوحات نہ کرتے۔'' (ایضاً)

معلوم ہوا شیعہ کی اصل دشمنی مسلمانوں کی اس سیاسی قوت سے ہے جس سے انہوں نے اسلام کو دنیا کی ایک بڑی آواز بنا دیا تھا۔ قیصر و کسریٰ کو ان کے تصور سے چین کی نیند نہ ملتی تھی اور حضورؐ کی یہ پیش گوئی ان کے دنیا میں پھیلنے سے پوری ہو رہی تھی کہ میرا یہ دین دنیا کے ہر پکے اور کچے گھر میں پہنچ کر رہے گا۔

لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز او ذل ذلیل.

آیئے اب ہم آپ کو انیسویں آیت میں لے چلیں

یا ایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم. (پ۶ المائدہ ۵۴)

ترجمہ: ''اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی پھرے گا اپنے دین حق سے تو اللہ لائے گا ایک ایسی قوم (ان کے عوض یا مقابلہ میں) جنہیں وہ پیار کرتا ہے اور وہ اللہ سے پیار کرتے ہیں' نرم دل ہیں مومنین پر اور سخت ہیں کافروں پر' لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور وہ کسی کے الزام سے نہیں ڈرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہے دے اور وہ کشائش والا ہے' بہت جاننے والا۔''

مولانا دبیرؒ نے اس آیت پر سوال کیا تھا' بتاؤ یہ قوم کون تھی؟ رافضی کہتا ہے یہ جنگ خیبر کے ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خیبر فتح نہ کر سکے تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں پر اپنی محبت اتارنی تھی جو جنگ کے ابتدائی مرحلہ میں جنگ کو سر نہ کر پائے؟ یہ غلط ہے۔ اگر کوئی فرد یا جماعت کسی وقت فتح نہ کر پائے اور اپنے مرکز کی طرف لوٹے کہ کوئی نئی تدبیر اختیار کی جائے۔ تو حضورؐ کی خدمت میں حاضری اور مرکز کی طرف لوٹنے کو کوئی شخص مرتد ہونا نہ کہے گا۔ ارتداد عقیدے سے ہوتا ہے اور مرکز کی طرف لوٹنا ایک عمل ہے۔ کوئی شخص بدوں تبدیلی عقیدہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ مگر ڈھکو رافضی کس علمی بے باکی سے لکھتا ہے:

''جو لوگ جنگ خیبر میں میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے وہ مرتد ہیں۔'' (تجلیات ۱۰۳)

یہ محض ایک اپنے غصے کا اظہار ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ بھاگ گئے تھے تو وہ اپنے گھروں میں جاتے۔ حضورؐ کے پاس وہ کیوں آ گئے تھے؟ حضورؐ کے پاس آنے والوں کو کبھی بھاگنے والا نہیں کہا جا سکتا۔

رافضی کہنا یہ چاہتا تھا کہ وہ بھاگ آئے تھے مگر مرتد قرار دینے کے لیے اسے بھاگ گئے کہنا پڑا۔ تاریخ میں

سرے سے کوئی واقعہ نہیں کہ جنگ خیبر میں کچھ لوگ بھاگ گئے ہوں۔ حضورؐ کے پاس آنا کہ اب نئی تدبیر کی جائے' بھاگ جانا نہیں کہلاتا۔ ہم پیچھے ثابت کر آئے ہیں کہ بعض صحابہؓ کا حضورؐ کے خدمت میں واپس آنا ایک شیعی روایت ہے جس کے مجروح راوی کو اسماء الرجال میں شیطان کہا گیا ہے۔ مگر یہ رافضی شیطان کے اثر میں ایسا گھرا ہے کہ بار بار اسی غلط روایت پر آتا ہے۔

جنگ میں احساس ضعف اگر ایمان کے منافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس آیت میں مومنین کا لفظ نہ لاتے:

یا ایها النبی حرض المؤمنین علی القتال ...... الآن خفف الله عنکم وعلم ان فیکم ضعفا. (پ ۱۰ الانفال ۶۶)

ترجمہ: ''اے نبی! مومنین کو لڑائی کا شوق دلا...... اب بوجھ ہلکا کر دیا ہے اللہ نے تم پر سے اور اس نے جانا کہ تم (مومنین) میں سستی آ گئی ہے۔ سو اب کے بعد سو دو سو کے مقابلے میں اور ہزار دو ہزار کے مقابلے میں غالب آتے رہیں گے۔''

کیا یہاں مومنین کے ہی احساس ضعف کا ذکر نہیں۔ شیعہ کا یہ کس قدر بڑا ظلم ہے کہ وہ ان مومنین کو مرتد قرار دینے سے نہیں رکتے۔ جن سے کبھی بھی کسی درجے میں کمزوری ثابت ہوئی' اللہ تعالیٰ تو ان کی اس کمزوری کو ان کے ایمان کی وجہ سے لائق درگزر قرار دیتا ہے اور ڈھ گو رافضی انہیں مرتد قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔

۲۔ قرآن ایک عالمگیر علمی دستاویز ہے۔ کیا اس میں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اسلام سے مرتد ہونے والے ناکام ہوں گے اور حضرت علیؓ اور ان کے پیروکار غالب آئیں گے' وہ اللہ سے پیار کرتے ہوں گے اور اللہ ان سے پیار کرے گا۔ اگر یہ لوگ مرتدین پر غالب آ چکے تھے تو حضورؐ کے آخری وقت میں یہ حضور سے وصیت کیوں نہ لکھوا سکے۔ (۲) حضرت ام المومنینؓ کے تجویز کردہ امام نماز کے مقابل مسجد نبوی میں اپنا امام کیوں نہ رکھوا سکے۔ (۳) انصار کی سعد بن عبادہ کی قیادت میں انتخاب خلافت کی میٹنگ کیوں نہ رکوا سکے اور (۴) حضور کے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن ہونے اور پھر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے وہاں دفن ہونے کو کیوں نہ روک سکے اور (۵) اپنی اس سیاسی قوت سے فدک کی زمین کیوں حاصل نہ کر پائے۔ کیا یہی وعدہ ہے جو ان مومنین کو دیا جا رہا ہے؟ قرآن کی اس سے بڑھ کر اور تحریف کیا ہو گی۔

اگر اسی پوزیشن کا نام ہے **اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکافرین** ۔ تو انصاف کیجئے قرآن سے اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو گا۔ شیعہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور ان کے پیروؤں کا یہ غلبہ صرف پونے دو سال کے لیے یا ڈھائی سال کے لیے تھا۔ یہاں کوئی تبصرہ نگار یہ کہے بغیر نہ رہ سکے گا کہ اتنے قلیل وقت کی عزت کو قرآن کی اس آیت کی تفسیر کہنا کہاں باور کیا جا سکے گا۔

۳۔ تاریخ کی رو سے مرتد وہ لوگ ہوئے جو ختم نبوت کے منکر ہوئے اور وہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی جیسے لوگوں کی جماعتوں میں جا داخل ہوئے یا وہ لوگ جو زکوٰۃ کے منکر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ اور ان کے پیروؤں نے پوری شان جہاد سے ان تحریکوں کا قلع قمع کیا۔ یہاں پہنچ کر شیعہ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا اور وہ دبے الفاظ میں اپنے شیعوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرتے ہیں کہ اس وقت جہاد کے اس ختم نبوت کے معرکوں میں یہ حضرات دل سے مخلص نہ تھے۔ یہ ہوس اقتدار میں لڑتے رہے اور انہوں نے بڑی بڑی فتوحات کر لیں (پر تھے اندر سے بزدل)۔ قرآن کریم ان مرتدین سے لڑنے والوں کی شان یہ بتلاتا ہے **یجاهدون فی سبیل الله** اور یہ کہتے ہیں ان کے پاس اخلاص نہ تھا۔ بحث و مناظرہ میں اس قسم کے خفیہ امور کے سہارے کن لوگوں کا نصیب ہوتے ہیں جو دلائل کی دنیا میں بالکل بے نصیب رہے ہوں۔

آیئے ہم اب آپ کو بیسویں آیت میں لے چلیں

ومالهم الا یعذبهم الله وهم یصدون عن المسجد الحرام و ماکانوا اولیاء ہ ان اولیاء ہ الا المتقون ولکن اکثرهم لیعلمون . (پ ۹ الانفال ۳۴)

ترجمہ: ''اور ان میں کیا بات ہے کہ اللہ انہیں نہ پکڑے عذاب میں اور وہ روکتے ہیں مسجد حرام سے اور وہ اس کے اختیارات والے نہیں ہیں۔ اس کے اختیارات والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

اس سے پتہ چلا کہ جو لوگ کعبہ آنے والوں کو اس سے روکیں انہیں ہرگز اس کی ولایت حاصل نہیں ان پر خدا عذاب کیوں نہ اتارے۔ کعبہ کے متولی تو وہی ہونے چاہئیں جو پرہیزگار ہوں۔

اب اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ ہی کعبہ میں صاحب اختیار تھے۔ آپ ہی وہاں نماز کے امام تھے اور آپؓ ہی اس میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ کعبہ پر صاحب اختیار رہے۔ پھر کعبہ کی یہ ولایت حضرت عثمانؓ کے پاس رہی۔ اگر یہ حضرات اصحاب ثلثہ بھی مومن اور متقی نہ تھے تو خدا تعالیٰ نے قریش کی جاہلی ولایت کعبہ کو خلافت راشدہ کی اسلامی ولایت سے کیسے بدلا۔ قرآن کریم نے ولایت کعبہ کی اس متبادل قیادت ولایت کعبہ کے بارے میں فرمایا **ان اولیاء ہ الا المتقون** ۔ ہم خلفائے ثلثہ کا نام لے کر کہہ سکتے ہیں کہ جب کعبہ پر مشرکین کی ولایت نہ رہی تو اب یہ ذمہ داری متقی اور پرہیزگار حضرات کو ملی اور اس وقت سے لے کر آج تک اہل سنت عقیدے کے لوگ ہی خادم الحرمین چلے آ رہے ہیں۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں :

حرم شریف کے متولی صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہو سکتے ہیں۔ مشرک اور بدمعاش اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان میں سے اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولاد ابراہیمؑ ہیں، ہم حرم شریف کے متولی با اختیار ہیں، ہمارا اس پر موروثی حق ہے۔

مگر ڈھکو رافضی لکھتا ہے:

''اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو شخص جس طرح بھی مسجد حرام کی تولیت پر قابض ہو جائے تو وہ متقین کی فہرست میں شامل ہو جائے گا اگرچہ وہ منافقین غاصبین اور فاسقین کے زمرہ میں داخل ہو۔'' (تجلیات ص ١٠٣)

آپ نے کعبہ کے متولیوں کے بارے میں اثناعشریوں کا یہ عقیدہ دیکھ لیا۔

اگر بات یہی ہے تو پھر جاہلی غاصبین کو ہٹا کر اس میں اسلامی غاصبین کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کی نشاندہی ان لفظوں سے کی ہے ان اولیاءہ الا المتقون۔ اگر اتنی خونریز جنگوں کے بعد بھی مسجد حرام کی وہی قسمت رہی تو اتنے بڑے انقلاب نے کعبہ کو کیا دیا۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد اب کعبہ کے متولی وہی رہ سکتے تھے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔

آیئے اب آپ کو اکیسویں آیت میں لے چلیں

ومنھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اُذُنٌ قل اذن خیر لکم یؤمن باللّٰہ ویؤمن للمؤمنین ورحمة للذین امنوا منکم. (پ ١٠ التوبہ ٦١)

ترجمہ: ''اور ان میں وہ بھی ہیں جو بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ آپ کہہ دیں کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین رکھتا ہے مومنین کی بات پر اور تم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے لیے وہ رحمت ہے۔''

ڈھکو رافضی اس آیت پر لکھتا ہے:

''اس آیت کا شان نزول یہ بتاتا ہے کہ وہ رحمة للعالمین منافقین کی باتیں بھی سنتے اور بظاہر ان کی تصدیق بھی فرماتے تھے۔'' (تجلیات ص ١٠٥)

اثناعشریوں نے لفظ بظاہر کی ایسی مشق کر رکھی ہے کہ جہاں کسی بات میں لاجواب ہوئے انھوں نے فوراً بظاہر لا کر اپنی بات پوری کر لی۔

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو منافقین کان کہہ کر ایذا دیتے ہیں، آپ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں (وہ آپ کو غیب کی باتیں بتاتا رہتا ہے کہ یہ لوگ کیسے چل رہے ہیں اور اب یہ کیا کریں گے) اور مومنین کی بات ہی تسلیم کرتے ہیں (نہ کہ منافقین کی) اور ان کی اس عادت میں خود ایمان والوں کی ہی بھلائی ہے۔

یہاں صراحةً ان اصحاب کو جنہیں شیعہ منافقین میں جگہ دیتے ہیں مومنین کہا گیا ہے۔ رافضی لکھتا ہے:

''کچھ ناقص الایمان لوگوں نے اسلام و بانی اسلام کے خلاف کچھ باتیں کیں۔ اہل ایمان نے آنحضرتؐ کی خدمت میں ان لوگوں کی شکایت کی۔ انہوں نے حلفیہ بیان دے دیا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آپؐ نے ان کی تصدیق کر دی۔'' (ایضاً ص ١٠٤)

رافضی نے یہاں حضورؐ پر یہ الزام لگایا ہے کہ آپؐ نے ان کے جھوٹ کی تصدیق کر دی۔ کیا یہ خود حضورؐ پر الزام نہیں کہ آپ نے ایسا جھوٹ کہا۔ (معاذ اللہ) پھر حضورؐ پر ہی یہ جھوٹ کا الزام نہیں خود اللہ رب العالمین پر بھی یہ جھوٹ کا الزام لگا دیا کہ اس نے اس آیت میں منافقین کو مومنین کہا ہے: (استغفر اللہ العظیم)

یؤمن للمؤمنین ورحمة للذین امنوا منکم. (التوبہ ٦١)

اصحاب سے مشورہ کرنے کی حقیقت

رافضی لکھتا ہے:

''خدا تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو محض ان کے ہمراہیوں کی تالیف قلب کی خاطر یہ حکم دیا تھا کہ بعض امور حرب وضرب میں ان سے بھی بظاہر مشورہ کر لیا کریں تاکہ وہ خوش باش رہیں اور یہ نہ سمجھیں کہ رسولؐ ہم کو تو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے۔'' (ایضاً ص ١٠٥)

الجواب: قرآن کریم میں یہ بظاہر کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ اس رافضی کا قرآن پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فشاورھم کہہ کر آپ کو ان سے مشورہ کا حکم دیا ہے۔ یہ بات کہ بظاہر مشورہ کر لیا کریں، یہ شیعہ کی اپنی تحریف اور اختراع ہے جو قرآن میں نہیں ہے۔ پھر یہ الفاظ بھی قرآن میں نہیں ہیں، تاکہ وہ خوش باش رہیں۔ یہ بات کسی طرح لائق پذیرائی نہیں کہ خدا نے آپ کو حکم دے رکھا تھا کہ آپؐ منافقوں کو خوش باش رکھیں۔ آپؐ کو تو یہ حکم دیا گیا تھا:

یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم.

واغلظ علیھم کا یہ ترجمہ کرنا کہ آپ ان کو خوش باش رکھیں جھوٹ پر جھوٹ اور افتراء پر افتراء ہے۔

حضورؐ پر منافقوں کی زیادہ مدارات کرنے کا الزام

''آنحضرت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ منافقوں کے ساتھ مومنوں سے زیادہ لطف وکرم فرماتے تھے۔''
(تجلیات ص ١٠٥)

یہ بات بالکل غلط ہے جس طرح حضرت حسنؓ کبھی حضورؐ کے کندھوں پر آ چڑھتے' یہ رافضی بتائے کہ حضورؐ نے کبھی کسی منافق کے بچوں سے بھی یہ لطف ومدارات کی ہو۔ایک دفعہ کسی نے حضرت علیؓ کے خلاف کچھ نازیبا باتیں کیں۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کی دل جوئی اور اس کی اصلاح کے لیے ارشاد فرمایا **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** ۔ جس کا دوست میں ہوں' علی بھی اس کا دوست ہے۔بتایئے اس طرح کا لطف وکرم حضورؐ نے کبھی کسی منافق سے کیا ہو؟

ڈھ گو رافضی یہ بھی لکھتا ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کے بارے میں فرمایا:

''وہ منافق ہے اور اس کے نفاق کی وجہ سے میں اس سے اچھا سلوک کرتا ہوں تا کہ وہ دوسرے لوگوں کے ایمان کو خراب نہ کرے۔''

یہ رافضی حضورؐ کے اس ردعمل کا حاصل ان الفاظ میں نہیں لکھ پایا:

''یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے کے منافقین کبھی دوسرے لوگوں کے ایمان کو خراب نہ کر پائے تھے۔''

ابو بکرؓ الاصم کی تفسیر میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ حضورؐ منافقوں کے ساتھ مومنوں سے زیادہ لطف وکرم کا معاملہ فرماتے ہیں۔اس روایت میں یہ الفاظ کہاں ہیں؟ اس میں کہیں مومنوں سے تقابل مذکور نہیں۔ یہ الفاظ آپ کے سامنے ہیں:

انہ منافق اداری عن نفاقہ واخاف ان یفسد علی غیرہ. (تفسیر کبیر ج ۱۶ ص ۷۸)

اس حدیث کی سند ہمیں نہیں ملی۔تاہم اہل علم سے مخفی نہیں کہ منافقوں سے کچھ رعایت صرف کچھ وقت کے لیے تھی۔پھر آپ پر ایک ایسا وقت آیا کہ آپ نے ان منافقوں کو نام لے لے کر اپنی مجلس سے اٹھا دیا اور بات پھر یہاں تک پہنچی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو **یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین** کا حکم دے دیا اور یہ خوشخبری دی کہ

لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الا قلیلا. (پ ۲۲ الاحزاب ۶۰)

ترجمہ : ''اگر یہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔پھر یہ مدینہ میں تیرے ساتھ نہ رہ سکیں گے مگر بہت کم۔''

حضورؐ نے انہیں نمایاں کر کے اپنی مجلس سے اٹھا دیا اب حضور کی مجالس میں کہیں منافق چھپے نہ رہے۔حضورؐ نے ہرگز بے بسی کی حالت میں سفر آخرت نہیں فرمایا۔رافضی ڈھ گو کا ان حالات کو حضورؐ پر آخر وقت تک مسلط رکھنا اور پھر اس

امت پر غلبہ نفاق کا عقیدہ رکھنا نہ تاریخ اسلام اس کا ساتھ دیتی ہے نہ قرآن اس کی حمایت کرتا ہے۔حضورؐ دنیا سے تب گئے جب باطل اس سرزمین سے جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ **وجاء الحق وزھق الباطل** کے خلاف ہم کوئی عقیدہ نہیں رکھ سکتے۔

پھر فرمایا:

ماکان اللّٰہ لیذر المؤمنین علٰی ما انتم علیہ حتّٰی یمیز الخبیث من الطیّب.

(پ ۴ آل عمران ۱۷۹)

ترجمہ : ''اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی اس حالت میں نہ چھوڑے گا جس پر کہ تم اب ہو یہاں تک کہ وہ ہر پاک کو خبیث (منافقوں) سے جدا نہ کر دے۔''

رافضی لکھتا ہے :

''خدائے رحیم نے بانی ٔ اسلام کو بھیج کر گویا ان کو آتش جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نکال لیا اور جنت میں جانے کا رستہ دکھا دیا مگر یہ کس آیت یا حدیث کا ترجمہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد ان پر آتش دوزخ حرام کر دی گئی ہے۔'' (ایضاً ۱۰۷)

اللہ تعالیٰ نے جب ہر طیب کو خبیث سے جدا کر دیا تو یہ عقیدہ اس ڈھ گو نے کہاں سے نکال لیا کہ وہ منافقین سب مسلمان ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نکال لیا اور اگر اس سے مراد مومنین ہیں منافقین نہیں۔تو مومنین جہنم کے شعلوں میں گئے ہی کب تھے کہ اب انہیں نکال لیا۔

جب اللہ تعالیٰ کسی کو آگ سے نکال لے تو پھر اسے کبھی آگ میں نہیں بھیجتا۔کافروں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے آگ سے اس کی تاثیر چھین لی اور مومنین کے لیے اسے ایک نشان بنایا:

فانجاہ اللّٰہ من النار o ان فی ذلک لآیات لقوم یؤمنون (پ ۲۰ العنکبوت ۲۴)

ترجمہ: ''پھر اس کو بچا لیا اللہ نے آگ سے۔اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو خدا پر یقین رکھتے ہیں۔''

مگر دیکھیے رافضی کس بے باکی سے پوچھتا ہے' یہ کس آیت یا حدیث کا ترجمہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد ان پر آتش دوزخ حرام کر دی گئی۔ہم بھی پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کس آیت کا ترجمہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی آخرت کا عذاب جو کافروں کے لیے ہے کسی مسلمان کو بھی دیا جائے گا۔

سال سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع.

قرآن پاک میں ایک مقام پر یہ بھی ہے کہ ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ ظلمات سے نکال کر نور میں داخل کرتا

ہے۔ نور میں آنے والا نار میں چلا جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

حدیث میں ہے :

الاسلام یھدم ماکان قبلہ والھجرہ تھدم ماکان قبلھا.

ترجمہ : ''اسلام اپنے سے پہلے کے سارے گناہ گرا دیتا ہے اور ہجرت بھی پہلے کے گناہوں کو اتار دیتی ہے۔''

اسلام لانے پر جب پہلا بوجھ سب اتر گیا تو اب یہ آگ میں جانا کس جرم کی سزا میں ہو سکتا ہے۔ سب مومنوں کے لیے یہی ایک برتاؤ ہے کہ آگ سے نکلنے کے بعد پھر کسی کو آگ میں نہیں ڈالا جاتا۔ **ان فی ذلک لآیات لقوم یؤمنون** (العنکبوت)

ابوسفیان سے رشتہ لینے کا اعتراض

ابوسفیان سے رشتہ لینا ام المؤمنین ام حبیبہؓ کے ایمان کی دلیل کیوں نہیں؟ جب قرآن کا حکم ہے کہ

لا تنکحوا المشرکات حتّٰی یؤمنّ.

''کہ جب تک کافر عورتیں ایمان نہ لے آئیں تم ان سے نکاح نہ کرو۔''

آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کیا تو کیا یہ اس کے ایمان کی دلیل نہ ہوگی۔ سو کوئی مسلمان حضرت ام حبیبہؓ کے ایمان میں شک نہیں کرسکتا۔ پھر جب ابوسفیان نے خود دست رسالت پر اسلام قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی حضورؐ کو ان کے اخلاص کی خبر دے دی تو اب کوئی مومن حضرت ابوسفیان کے ایمان میں بھی شک نہ کرسکے گا۔

پھر حضورؐ نے بقول شیعہ لوگوں کے اپنی دو لے پالک بیٹیاں حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیں تو کیا یہ قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے **ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یؤمنوا** حضرت عثمانؓ کے ایمان کی قطعی دلیل نہیں۔ اس آیت میں کہیں یہ فرق نہیں کیا گیا کہ اپنی بیٹیوں کو تم کافروں کے نکاح میں نہیں دے سکتے۔ لیکن اپنی لے پالک بیٹیوں کو دے سکتے ہو۔ پھر ہم مسلمان حضرت علیؓ مرتضیٰ کو نفس نبی نہیں کہتے کیونکہ آپ کا نکاح حضرت سیدہ سے تبھی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نفس وجود میں مختلف ہوں ورنہ طالب علم ہم سے پوچھیں گے کہ پھر یہ نکاح کیسے ہو گیا۔

ہم جواباً کہیں گے ہم نے تو یہ شعر نہیں کہا ہے:

وہ یارِ نبی یہ نفسِ نبی
فرق بہت ان چاروں میں

ہم تو یہی کہتے آئے ہیں:

ابو بکر و عمرؓ عثمانؓ و علی ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی
ہم مسلک ہیں یاران نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

آیئے ہم اب آپ کو بائیسویں آیت میں لے چلیں

واذکروا نعمة اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا. وکنتم علٰی شفا حفرة من النّار فانقذکم منھا. (پ ۴ آل عمران ۱۰۳)

ترجمہ : ''اور یاد کرو انعام الٰہی اپنے اوپر کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے جوڑ دیے دل تمہارے اور تم ہو گئے اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی۔ اور تھے تم ایک آگ کے گڑھے کے کنارے پر۔ پھر اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔''

اس آیت میں بھی صحابہؓ کو خوشخبری دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگ سے نکالا۔ اگر یہ پھر جہنم کے گڑھے میں گر گئے اور حضورؐ کے بعد معاذ اللہ مرتد ہو گئے تو پہلی **انقاذ من النار** کی بشارت کیا بالکل معدوم نہ ہوگی؟ یہ عارضی چند دنوں کی بشارت کیا حیثیت رکھتی ہے کہ قرآن پاک میں اس کا اس شان اور صولت سے ذکر کیا جائے اگر پھر آگ میں جانا ہو تو محاورہ قرآن میں اسے **انقاذ من النار** کی شان سے نہیں نوازا جاتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آپ یہی لفظ سورہ العنکبوت میں پڑھ آئے ہیں:

من زحزح عن النّار وادخل الجنة فقد فاز وما الحیٰوة الدّنیا الّا متاع الغرور.

(پ ۴ آل عمران ۱۸۵)

ترجمہ : ''پھر جو کوئی ہٹایا گیا آگ سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا اور نہیں زندگانی دنیا کی مگر ایک دھوکے کی پونجی۔''

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے لیے آخرت کی جنت تو اپنی جگہ رہی وہ تو دنیا میں ہی اس جنت میں داخل کر دیے گئے جس میں حضورؐ آرام فرما ہیں اور یہ صورت حال ساری دنیا کے سامنے ہے کہ یہ تینوں ہستیاں ریاض الجنہ میں جگہ پائے ہوئے ہیں۔ دونوں کے ایک طرف حضورؐ کی قبر مبارک ہے دوسری طرف حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی قبر بنے گی۔ خوش بخت وہ ہیں دو جوان جو دو پیغمبروں کے درمیان کروڑوں انسانوں کا مورد سلام رہیں گے۔

ایمان لانے پر جنت مشروط بشرائط نہیں

اگر کوئی شخص ایمان لاتے ہی مارا گیا تو کیا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ معلوم ہوا یہ شرائط لوازم ایمان سے ہیں جنت میں داخلے کی شرائط نہیں ہیں۔ پھر ان میں استقامت علی الاسلام اور خاتمہ بالخیر تو مخفی امور میں سے ہے۔ ہر مومن کے

بارے میں یہی گمان ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان رہا اور اسلام پر ہی اس کی موت ہوئی۔

اعمال صالحہ گو بڑا درجہ رکھتے ہیں لیکن ایمان کی شرائط میں سے نہیں ہیں۔ پھر سب سے بڑا عمل تو نماز ہے اور نماز میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی نماز کل صحابہؓ سے آگے ہوتی تھی۔ جب حضرت ابوبکرؓ آگے ہوتے تھے اور حضرت علیؓ ان کے پیچھے اور جب حضرت عمرؓ آگے ہوتے تھے تو حضرت علیؓ ان کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ حج بھی ایک بڑا عمل ہے۔ حضورؐ نے ایک حج میں حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنایا اور حضرت علیؓ کو ان کے ماتحت رکھا۔ حضرت ابوبکرؓ جب مسجد نبوی میں امام نماز تھے تو ایک دفعہ حضورؐ نے اپنی نماز بھی حضرت ابوبکرؓ کی نماز میں شامل فرمائی۔ پھر حضورؐ کے بعد ان حضرات کے جہاد نے پوری دنیا سے خراج تحسین لیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو قطب کے درجہ میں تسلیم کیا تو کیا اب بھی کوئی مومن ان کے اعمال صالحہ میں کسی قسم کا شک کر سکتا ہے؟

رافضی منافقت سے نکل کر ارتداد کی آغوش میں

ڈھ گو رافضی بائیسویں آیت کے جواب میں اپنے پہلے دعویٰ منافقت میں چاروں شانے چت گرا دکھائی دیتا ہے اور اب وہ ارتداد کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحابہ کرام ایمان تو لائے تھے لیکن ازاں بعد پھر کفر میں چلے گئے۔ اس پر اس نے قرآن کریم کی چار آیتیں پیش کی ہیں جن میں کسی میں وہ کفر مذکور نہیں جو انہوں نے ایمان لانے کے بعد کیا ہو۔ معلوم ہوا اس سے وہ ارتداد مراد ہے جو حضورؐ کی وفات سے پہلے کہیں ہوا ہو۔ (۱) کسی کی منافقت کھل گئی اور وہ اب کھلے کفر میں آ گیا۔ (۲) یا کوئی پھر کفار و مشرکین میں جا ملا۔ ان آیات میں کفر بصیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں وہ کفر مراد ہے جو حضورؐ کے سفر آخرت سے پہلے کسی بد بخت کا نصیب رہا۔ آگے رافضی نے اپنے دعویٰ کی حمایت میں جو حدیثیں پیش کی ہیں ان میں اس ارتداد کا ذکر ہے جو حضورؐ کی وفات کے بعد کسی بد بخت کی عاقبت بنا۔ قرآن میں ماضی سے بیان ہونے والا کفر مطالعہ فرمائیں:

۱۔ ذلک بانهم امنوا ثم کفروا فطبع علی قلوبهم فهم لا یفقهون۔ (پ ۲۸ المنافقون ۳)

۲۔ ان الذین کفروا بعد ایمانهم ثم ازدادوا کفراً لن تقبل توبتهم۔ (پ ۳ آل عمران ۹۰)

تیسری آیت میں ارتداد کی خبر اس طرح دی گئی ہے کہ وہ ناکام ہو کر رہے گا اور جو لوگ اس ارتداد (انکار ختم نبوت اور انکار زکوٰۃ) کے خلاف اٹھیں گے وہ اللہ کو پسند ہوں گے اور غالب ہو کر رہیں گے۔

۳. یا ایها الذین امنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یأتی الله بقوم یحبهم ویحبّونه (پ ۶ المائدہ ۵۴)

چوتھی آیت میں صرف ایک امکانی صورت کا ذکر ہے نہ اس میں کسی ماضی کے وقوع کا ذکر ہے نہ کسی آئندہ واقع ہونے والے ارتداد کی خبر۔ اس کے ذیل میں حضورؐ کی اپنی زندگی کا ایک حادثہ مذکور ہے۔

۴. وما محمد الّا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم. (پ ۴ آل عمران ۱۴۴)

ان چاروں آیتوں میں اس امت کے کسی شخص کے ارتداد کی خبر نہیں کہ پیغمبر کی جانشینی کے موقع پر حضرت علیؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت بلال اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہم کے سوا سب مسلمان مرتد ہو جائیں گے۔ جب ان آیتوں سے رافضی کی کوئی بات نہ بنی تو اس نے احادیث کا رخ کیا۔ ان احادیث میں بھی کہیں حضورؐ کے ہم مجلس لوگ مراد نہیں۔ عام افراد امت ہیں۔ گو وہ کسی دور کے ہوں۔ انہیں آپ نے اصحابی صرف اس معنی میں کہا کہ وہ آپ کی امت کے لوگ ہیں۔

اس ڈھ گو رافضی نے یہاں جو احادیث پیش کی ہیں ان میں واضح ہے کہ یہاں ان سے امتی مراد ہیں (نہ کہ آپ کے صحابہؓ اپنی خاص اصطلاح میں)

اب آپ رافضی کی پیش کردہ ان حدیثوں پر ایک نظر کریں:

رافضی کی پیش کردہ احادیث

۱. یجاء برجال من امتی فیوخذ بهم ذات الشمال فاقول اصحابی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک.

ترجمہ: ''میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے، انہیں بائیں طرف سے پکڑا ہوگا۔ میں کہوں گا یہ تو میرے ساتھی ہیں (میری امت کے لوگ ہیں) کہا جائے گا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کیں۔''

اس میں پہلے رجال من امتی کہا ہے پھر ان کو آپؐ نے اصحابی فرمایا۔ اگر وہ لوگ آپ کے دور کے ہوتے تو ان کا پہلا تعارف اصحابی کے عنوان سے ہوتا۔ امتی کے عنوان سے نہ ہوتا۔ اب دوسری دفعہ آپؐ نے جو انہیں اصحابی کہا تو اب یہ لفظ پہلے کے لفظ امتی کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ پھر ان لوگوں کی پہچان یہ بتائی گئی کہ انہوں نے حضورؐ کے سامنے دین میں کوئی بگاڑ نہیں کیا۔ ان سے جو بھی خلاف دین بات ہوئی وہ حضورؐ کے بعد (اس امت میں کسی دور میں) واقع ہوئی۔ حضورؐ کو ان کا علم تک نہ ہو سکا۔ کوئی صاحب علم سمجھدار اس روایت سے اصحاب ثلثہ پر دین کے بگاڑ کا کوئی چھینٹا نہ گرا سکے گا۔

۲. یردن علیّ اقوام اعرفهم ویعرفوننی ثم یحال بینی و بینهم فاقول انهم منی فیقال انک لا تدری ما عملوا بعدک فاقول سحقاً سحقاً لمن بدل بعدی.

ترجمہ : "مجھ پر کچھ لوگ وارد ہوں گے' میں انہیں پہچانوں گا' وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ پھر مجھ میں اور ان میں پردہ ڈال دیا جائے گا' میں کہوں گا کہ یہ تو مجھ سے ہیں (میری امت کے لوگ ہیں) مجھے کہا جائے گا' آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا اعمال کیے' میں کہوں گا دور ہو جاؤ' دوری ان کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین بدلا۔

شیعہ اصحاب ثلثہ پر وہ الزام لگاتے ہیں جو ان سے حضورؐ کی زندگی میں حضورؐ کے سامنے صادر ہوئے اور یہاں حضورؐ کو کہا جا رہا ہے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی حضورؐ کے ساتھ گزری زندگی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس پر آپ انہیں سحقاً کہہ کر اپنے سے دور کر سکیں۔ سو یہ حدیث ہرگز ان کے کسی کردار سے متعلق نہیں۔

اصحاب ثلثہ تینوں قوم قریش سے تھے اور وہ ایک قوم تھی۔ یہاں حضورؐ نے جن لوگوں کی خبر دی وہ ایک قوم نہیں قوموں کی قومیں ہیں۔ انہیں حضورؐ نے اقوام کہہ کر ذکر فرمایا ہے (کئی قومیں) سو اس سے مراد آج تک کے اور قیامت تک کے وہ لوگ ہیں جو دین محمدیؐ میں کسی قسم کے بگاڑ کے مرتکب ہوئے۔ حضورؐ کا ان کو پہچاننا ان کے بعض آثار وضوء یا آثار لباس یا ان کے پیرایہ تعظیم رسالت سے ہوگا جس کی تفصیل حدیث میں نہیں کی گئی۔ ان کا حضورؐ کو پہچاننا اسی پیرایہ میں ہوگا جس طرح آج کوئی شخص حضورؐ کو خواب میں دیکھتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ حضور اکرمؐ ہیں۔

آیئے اب ہم آپ کو تیسویں آیت میں لے چلیں

لقد من اللّٰه علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین.

(پ ۴ آل عمران ۱۶۴)

ترجمہ : "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بڑا احسان کیا جو بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے وہ پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو (شرک سے) اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات اور اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔"

۱۔ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اصالۃً ان لوگوں کے لیے ہوئی جو پہلے کفر وشرک میں مبتلا تھے۔ اور ضمنی طور پر ان لوگوں کے لیے بھی جن پر کفر وشرک کا کوئی لمحہ نہیں آیا۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ ' حضرت خدیجہؓ ' حضرت علیؓ اور حضرات حسنین کریمین رضوان اللہ علیھم اجمعین۔ اس آیت کے ان الفاظ کی وجہ سے آپ کی بعثت اصالۃً ان لوگوں کی طرف تسلیم کی گئی ہے جو پہلے کفر میں تھے۔

"بے شک وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی (کفر وشرک) میں تھے۔"

۲۔ اس آیت میں مومنین انہی کو کہا گیا ہے جو پہلے کفر وشرک میں تھے۔ سو مومنین کا یہ معنیٰ کرنا کہ وہ کبھی کفر و شرک میں آلودہ نہ ہوئے ہوں' قرآن کریم کی اس دلالت کے خلاف ہے۔ حضرت عمرؓ ' حضرت سلمان فارسیؓ ' حضرت ابوسفیانؓ ایمان لا کر یقیناً مومنین سمجھے گئے تھے۔

۳۔ یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت ہے کہ آپؐ نے انہیں پاک کیا جو پہلے گندگی میں تھے۔ جو پہلے ہی گندگی سے بچے تھے انہیں پاک رکھنا معاشرت کا کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ حضورؐ نے قرآن انہی کو سنایا جو پہلے کافر تھے' انہی کے دل پاک کیے جو پہلے کفر وشرک میں تھے اور کتاب وحکمت کے موتی انہی پر بکھیرے جو پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ حضورؐ نے انہی لوگوں کو اٹھایا اور ایک امت کی امت بنا دیا۔

۴۔ یہ دعویٰ صف اسلام میں کبھی نہ کیا جا سکے گا کہ حضورؐ کی بعثت اصالۃً صرف اہل بیت کے لیے تھی۔ یہ نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی کسی گندگی میں نہ تھے۔ جمہور امت انہی گناہ گاروں سے بنی ہے۔ اب تک سید حلقوں میں یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ تم اہل بیت سے ہو یا امتی۔ سو اس آیت کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضورؐ کی بعثت اصل میں انہی گناہ گاروں کے لیے تھی۔ اگر ان لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ حضورؐ کی وفات کے بعد (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے تو تاریخ میں ثمرہ رسالت کے طور پر کچھ باقی نہیں رہتا۔ طبیب وہی حاذق سمجھا جاتا ہے جو پیچیدہ اور مزمن امراض کا علاج کر سکے' وہ کیا طبیب ہے جو صرف صحت مندوں کا ہی علاج کرے۔

۵۔ سب سے بڑی گندگی کفر وشرک ہے اور دوسرے سب گناہ اور بداعمالیاں اس سے کم ہیں۔ جب حضورؐ کی تعلیم وحکمت اور تزکیہ وتربیت سے اتنی بڑی گندگی اتر سکتی ہے تو اور گناہ جو یقیناً اس سے فروتر ہیں وہ حضورؐ کے فیض رسالت سے کیوں دھل نہیں سکتے۔ حضورؐ کی اس تدریجی محنت کے دوران اگر بعض صحابہ سے کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں صادر ہوئیں تو دوران تربیت اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ جب کفر کا گناہ دھل سکتا ہے تو ان کی یہ کوتاہیاں کیوں ان سے معاف نہیں ہو سکتیں جو حضور ﷺ کے سامنے ان سے سرزد ہوئیں۔ وہ دوران تربیت ان سے سرزد ہوئیں اور انہیں کوئی استاد اور معلم دل میں نہیں رکھتا۔ نہ ان پر کوئی انتقامی کارروائی کرتا ہے۔ بلکہ جو اس کے شاگردوں کی ان غلطیوں کو دہرائے ان کا یہ عمل اسے بہت گراں گزرتا ہے۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم. (پ ۱۱ التوبہ ۱۲۸)

ترجمہ : "بے شک آتے ہیں تمہارے پاس ایک رسول تمہیں میں سے' گراں ہے اس پر وہ تکلیف

جو تمہیں پہنچے، وہ حریص ہے تمہاری بھلائی پر، ہے وہ مومنین پر نہایت شفیق و مہربان۔"

پھر حضورؐ کی یہ محنت ان پر محبت خداوندی کا کیسا رنگ لائی، اسے اگلی آیت میں ملاحظہ فرمائیں۔

صحابہؓ کے ارتداد پر رافضی کا اصرار

صحابہؓ کے تھوک ارتداد پر ڈھ گو رافضی اس حد جنون پر آ پہنچا ہے کہ اس نے پہلے انبیاء کی تبلیغ کے نتائج بھی مایوس کن ٹھہرائے۔ اس نے تجلیات کے ۱۱۲ پر یہ سرخی باندھی ہے۔

"گزشتہ انبیاء کی تبلیغ اور اس کے مایوس کن نتائج"

اس میں وہ لکھتا ہے:

۱۔ حضرت نوح نے ساڑھے نو سو سال تک قوم کو بے مثال تبلیغ کی مگر نتیجہ کیا نکلا۔ فما امن معه الا قليل۔ سوائے چند آدمیوں کے کوئی ایمان نہ لایا۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ نے بڑی جدوجہد سے کام کیا مگر ان کے کوہ طور پر جاتے ہی قوم کی اکثریت گوسالہ پرستی کر کے مرتد ہو گئی۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کے بارے میں لکھتا ہے۔

۳۔ "بعینہ وہی صورت حال یہاں بھی درپیش ہے کیونکہ یہ قانون قدرت اور آئین فطرت ہے۔"

رافضی کی یہ تینوں باتیں غلط ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور کے لوگوں میں جہالت بہت تھی۔ دنیا بہت مختصر تھی اور اس وقت تک تعلیم و تربیت زندگی کا کوئی موضوع نہ تھا۔ اس لیے نتیجہ یہ رہا فما امن معه الا قليل۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے ساتھ آپ کی تعلیم و تزکیہ کی محنت بھی تھی۔ نتیجہ کیا رہا؟ سن لو

۱۔ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔

۲۔ ورايت النّاس يدخلون فى دين اللّٰه افواجا۔

۳۔ انّا فتحنا لک فتحاً مبينا۔

۴۔ اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى۔

۱۔ کیا کوئی پڑھا لکھا اور تعلیم یافتہ شخص رسالتِ محمدیؐ کے نتائج کو حضرت نوحؑ کی تبلیغ کے مایوس کن نتائج پر لا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم گوسالہ پرستی سے صرف ملحد ہوئی، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلیۃً علیحدہ

ہوئے ہوتے تو آپؑ کے طور سے آنے پر وہ ہرگز جمع نہ ہوتے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کے بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے بنی اسرائیل میں کوئی تفریق نہ ہوئی تھی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو جواباً کہا تھا : انی خشيت ان تقول فرّقت بين بنى اسرائيل ولم ترقب قولى ۔ (پ۱۶۔ طٰہٰ۹۴)

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جو سزا سنائی وہ بھی ان لوگوں نے قبول کی۔ وہ سزا اپنے آپ کو مارنے کی تھی۔

انكم ظلمتم انفسكم باتخاذكم العجل فتوبوا الىٰ بارئكم فاقتلوا انفسكم.

(پ ۱ البقرہ ۵۴)

تاہم اس سے انکار نہیں کہ بنی اسرائیل ایک بڑی قوم تھی جن میں کئی انبیاء اور بادشاہ بھی ہوئے۔

اذ جعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكاً واٰتاكم ما لم يؤت احداً من العالمين. (پ ۶ المائدہ . ۲)

بھلا ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے فما امن معه الا قليل کہ بہت تھوڑے لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے۔ کیا ان تھوڑے سے لوگوں کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے بارہ چشمے جاری کیے تھے؟ فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا ۔

علامہ تفتازانیؒ نے صحابہؓ کے مشاجرات کو کفر کے درجے تک نہیں پہنچایا، نہ کہا کہ ان میں سے ایک گروہ مرتد ہو گیا۔ شرح مقاصد کی عبارت میں ان الفاظ پر غور کیجئے:

يدل بظاهره علىٰ ان بعضهم قد حاد عن طريق الحق و بلغ حد الظلم والعتق .

(شرح مقاصد ۲ ص ۳۰۶)

اور پھر اس ڈھ گو رافضی کی دیانت اور علم کی داد دیجئے جو امت محمدیہ ﷺ کو مرتد ہونے سے کم کسی درجے میں لینے کے لیے تیار نہیں۔ علامہ تفتازانی تو ان اختلافات کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتا اور یہ رافضی ہے کہ صحابہؓ کو مرتد کہے بغیر اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

رافضی ڈھ گو کا ایک اور جھوٹ ملاحظہ کیجئے

وہ لکھتا ہے:

"ایک موقعہ پر ابوبکرؓ صاحب نے آپ سے استدعا کی کہ اس کے ایمان کے متعلق کچھ تصدیق فرما دیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ما ادرى ما تحدثون بعدى مجھے کیا خبر میرے بعد تم کیا کیا احداث اور بدعات پھیلاؤ گے۔" (موطا مالک ۳۰۷ دہلی)

(۱) حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے اپنے ایمان کی تصدیق چاہی' یہ جھوٹ ہے۔

(۲) حضورؐ نے آپ کو کہا کہ تم میرے بعد بدعات پھیلاؤ گے' یہ دوسرا جھوٹ ہے۔

اصل واقعہ بلاغیات مالک میں یوں ہے:

عن ابی النضر مولی عمر بن عبید اللّٰہ انه بلغه ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لشهداء احد هؤلاء اشهد علیهم فقال ابوبکرؓ الصدیق یا رسول اللّٰہ ألسنا باخوانهم اسلمنا کما اسلموا وجاهدنا کما جاهدوا فقال رسول اللّٰہؐ بلی ولا ادری ما یحدثون بعدی قال فبکیٰ ابوبکرؓ ثم بکیٰ ثم قال ائنّا لکائنون بعدک. (موطا امام مالک ص ۱۸۲ طبع دیوبند)

ترجمہ: ''آنحضرتؐ نے شہدائے احد کے بارے میں فرمایا کہ میں ان پر گواہی دوں گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہم ان شہدائے احد کے بھائی نہیں۔ ہم بھی اسی طرح اسلام لائے جس طرح یہ لائے تھے اور جہاد بھی ہم نے اسی طرح کیا جس طرح انہوں نے کیا (یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ شہید ہوگئے) آپ نے فرمایا کیوں نہیں (تم واقعی ان شہدائے احد کے بھائی ہو) لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ لوگ (میری امت کے یہ لوگ) میرے بعد کیا کریں گے۔ راوی کہتا ہے اس پر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے' پھر اور روئے اور پھر کہا کیا ہم آپ کے بعد رہیں گے؟

اس روایت سے یہ امور مستفاد ہوئے:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے اپنے ایمان کی تصدیق نہ مانگی تھی۔ ألسنا باخوانهم میں آپؓ نے عام صحابہ کے لیے ان کی شہداء احد سے اخوت اسلامی کی تصدیق چاہی تھی جو حضورؐ نے بلی (کیوں نہیں) کہہ کر فرما دی۔

یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت علیؓ مرتضیٰ نے کہا تھا **ولقد کنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقتل آبائنا و ابناء نا واخواننا و اعمامنا** ۔ (نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۰۰)

معلوم ہوا اس وقت تک ان صحابہؓ سے کوئی ایسی بات صادر نہ ہوئی تھی جو ان کو ملت اسلامی سے لا باہر کرے۔ صحابہؓ سے اس سے پہلے کسی بھی قسم کی کوئی غلطی ہوئی ہوتی تو حضورؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لفظ بلیٰ سے تصدیق نہ فرماتے۔ آپ نے ان سے دوران تربیت ہونے والی کمزوریوں کو دور تربیت سمجھا اور انہیں شہداء احد کی اخوت اسلامی سے نہ نکالا ان کے برابر رکھا۔

۲۔ حضورؐ نے جب عام صحابہؓ کے جہاد کی تصدیق فرما دی اور جہاد اخلاص کے بغیر نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ یہاں اسلمنا' امنا کے معنی میں ہے۔ ظاہری اقرار اسلام کے معنی میں نہیں۔ سو قرآن پاک میں جہاں جہاں مومنین کے جہاد کی عزت پانے کا تعلق ہے لسان رسالت نے ان سب کی تصدیق کر دی اور صحابہ کرامؓ کو ایمان اور جہاد کی فضیلت پانے والا سمجھا گیا۔

۳۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے بعد جن کو بدعات پیدا کرنے والے کہا انہیں ما یحدثون (صیغہ غائب) سے ذکر کیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ بات حضرت ابوبکرؓ اکیلے کی نہیں ہو رہی جیسا کہ ڈھ گو رافضی نے کہا ہے بلکہ یہ عام مسلمانوں کی ہے اور حضورؐ نے عام صحابہؓ کے ایمان اور جہاد کی تصدیق فرمائی ہے۔ اگر معاذ اللہ آپ بھی ان احداث کرنے والوں میں شامل ہوتے تو حضور صیغہ حاضر میں کہتے: ما تحدثون بعدی۔

حضورؐ سے پوچھا گیا **أأحد خیر منا اسلمنا و جاهدنا معک قال نعم** (رواہ احمد والدارمی)

اس میں حضورؐ نے سب صحابہؓ کے ایمان اور ان کے جہاد کی فضیلت پانے کا اثبات فرمایا۔ منافق یا مرتد صرف اسی کو کہا جا سکے گا جس کا منافق ہونا یا مرتد ہونا کسی مستقل دلیل سے معلوم ہوا ہو۔ عام وبا ارتداد کے نتیجہ میں کسی خاص فرد اسلامی سے ایمان نہ چھینا جا سکے گا۔

۴۔ ہر زندہ جب تک زندہ ہے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آئندہ کسی فتنے میں گھرے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں:

من کان مستناً فلیستن بمن قدمات فان الحیی لا تؤمن علیه الفتنة اولئک اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم کانوا افضل هذه الامة و ابرها قلوباً واعمقها علماً واقلها تکلفاً اختار هم اللّٰہ لصحبة نبیّه ولاقامة دینه. (مشکوۃ ص ۳۲)

ترجمہ: ''جس نے کسی کی پیروی کرنی ہو اسے چاہیے کہ ان کی پیروی کرے جو اس دنیا سے جا چکے کیونکہ کسی زندہ کے بارے میں اس کے فتنہ سے بچنے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (معلوم نہیں وہ کس حالت میں مرے) ایمان پر قائم رہے لوگ یہ صحابہ کرام ہی ہیں۔ یہ اس پوری امت کے بہترین لوگ تھے۔ دلوں میں یہ سب نیک جبلت پر تھے۔ علم میں یہ سب سے گہرے تھے اور بہت کم تکلف کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے اور آپ کے دین کو قائم کرنے کے لیے چنا تھا۔''

قبائل کے ارتداد سے ارتداد صحابہؓ پر دلیل لانا درست نہیں

ڈھکو رافضی لکھتا ہے :

"خلیفہ اول کے زمانہ میں ساٹھ قبیلے مرتد ہوئے اور دوسرے خلیفہ کے عہد میں بھی ایک قبیلہ مرتد ہوا"

تاہم اس رافضی نے یہ مان لیا ہے کہ یہ سب ارتداد قبیلہ قریش کے علاوہ تھا۔ قریش حضورؐ کے بعد ارتداد کی لپیٹ میں نہ آئے تھے۔ رافضی لکھتا ہے :

"حضرت ابوبکر نے اسامہ کے لشکر کو روانہ کیا تو تمام عرب مرتد ہو گئے اور ملک میں فساد کی آگ چاروں طرف پھیل گئی اور قریش کے سوا ہر ایک قبیلہ بالکل مرتد ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ہر طرف سے حضورؐ کے امیروں کے خطوط آتے تھے کہ عرب مرتد ہو گئے اور عموماً سب قبیلوں میں بغاوت پھیل گئی ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۰)

یہاں قریش کے سوا کے الفاظ نوٹ کیجئے' یہ فساد کی آگ وسیع تھی یا مختصر۔ اس کی کوئی چنگاری اصحاب ثلثہ پر نہیں آتی۔ پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ صحبت نشینان رسالت میں سے کوئی بھی اس آگ میں نہ گرا تھا۔

حضورؐ کے صحابہؓ میں سے کسی نے بھی ارتداد کا شکار ہونا ہوتا تو حضورؐ نے جب خبر دی تھی کہ آپ کی امت کئی فرقوں میں بٹ جائے گی تو یہ نہ کہتے کہ حق پر وہی لوگ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقہ پر چلیں گے۔ ان احداث پھیلانے والوں کو حضورؐ نے ہو جال من امتی کہہ کر مختلف افراد کہا۔ انہیں اصحابی کہنا عام افراد امت کے معنی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ اگر انہیں اصحابی کہا تو پھر آپ نے انہیں اصیحابی بھی کہا تا کہ اصحابی کے الفاظ اپنے اصطلاحی معنی میں نہ سمجھے جائیں۔ یہ ہو جال من امتی کے معنٰی میں لیے جائیں۔

بعض صحابہؓ میں جو جنگیں ہوئیں اور اختلافات ہوئے ان میں سے کوئی بھی حد ارتداد تک نہ پہنچا تھا۔ علامہ تفتازانی نے ان میں سے بعض کو اگر طریق حق سے نکلنا کہا ہے تو یہ بظاہر کہا ہے نہ کہ اسے حقیقت کہا جائے آپ لکھتے ہیں:

یدل بظاهره علی ان بعضهم قد جاحد عن طریق الحق.

پھر یہ ان کا آخری عمل بھی نہ تھا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا آخری عمل خلیفہ راشد حضرت علیؓ کے مقابلہ سے رجوع کرنے کا تھا۔ اور اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی۔ حضرت معاویہؓ کی وفات بھی ایسے حال میں ہوئی کہ آپ کسی مسلمان کے خلاف نبرد آزما نہ تھے، نہ کوئی مسلم گروہ آپ سے منحرف تھا۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں آپ کی بیعت کر چکے تھے۔ اور اس باہمی صلح کی لسان رسالت سے بھی ایک پیشگوئی چلی آئی تھی اور آپ اس صلح سے یقیناً بہت خوش تھے اور اسی سے آپؐ نے حضرت حسنؓ کو سید کا لقب دیا تھا۔

آیئے ہم آپ کو اب چوبیسویں آیت میں لے چلیں

واعلموا ان فیکم رسول الله لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم ولکن الله حبب الیکم الایمان وزیّنه فی قلوبکم وکرّه الیکم الکفر والفسوق والعصیان. اولئک هم الرّاشدون. فضلاً من الله ونعمة والله علیم حکیم.

(پ ۲۶ الحجرات ۷)

ترجمہ : "اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں تو تم پر مشکل پڑے۔ پر اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دلوں میں ایمان کی۔ اور کھپا دیا اسے تمہارے دلوں میں۔ اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی۔ وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ والے۔ اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا۔"

اس آیت میں ان صحابہؓ کے بارے میں جو چاہتے تھے کہ حضورؐ ہماری ہر بات مان لیا کریں فرمایا:

۱۔ ایسا ہو تو یہ صورت تمہارے لیے ہی کئی مشکلات پیدا کرے گی اور ضروری نہیں کہ تمہاری ہر رائے صائب ہی ہو خطا سے بالا کون ہے؟

۲۔ پھر ان صحابہؓ کی شان یہ بتلائی کہ ایمان ان کے دلوں کی مراد اور زینت بن چکا۔ اور کفر' فسوق اور اللہ کی نافرمانی ان کے لیے ناپسندیدہ بنا دی گئی دونوں مضمونوں کے ملانے سے یہ بات کھلی کہ پکے ایمان داروں کی بھی بعض تمنائیں اور آراء ایسی ہو سکتی ہیں جنہیں حضورؐ پسند نہ فرمائیں۔ سو اگر کسی صحابیؓ سے کوئی ایسی بات آئے جس کی حضورؐ تصویب نہ فرمائیں تو یہ سمجھ لینا کہ ایمان ان کے دلوں میں نہ گڑا تھا اور انہیں فسق وعصیان سے طبعی نفرت نہ تھی۔ یہ استدلال غلط ہوگا۔

ڈھکو رافضی کہتا ہے کہ اس میں حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ' حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوذرؓ کے ایمان کی خبر دی گئی ہے۔ بایں تجویز اسے چاہیے تھا کہ ان تینوں حضرات کی وہ باتیں بتاتا جن میں حضورؐ نے ان کی بات پسند نہ فرمائی ہو۔ وہ ایک بات بھی ایسی نہیں بتا سکا جس کی رو سے صرف یہی حضرات اس آیت کا مورد ہیں۔ تاہم بعض شیعہ نے حضرت علیؓ کے بارے میں حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی کچھ ایسی باتیں ضرور پیش کی ہیں مثلاً

۱۔ حضرت علیؓ نے چاہا کہ وہ ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کریں' حضورؐ نے اسے ناپسند کیا۔

۲۔ حضورؐ نے اپنے آخری ایام میں حضرت علیؓ کو کاغذ لانے کے لیے کہا' آپؓ نے حضورؐ کی خدمت میں کاغذ پیش نہ کیا کہ کہیں حضورؐ ان کی عدم موجودگی میں وفات نہ پا جائیں۔ محض اس اندیشہ سے آپ نے کاغذ لانے کی یہ ذمہ

داری پوری نہ کی۔

۳۔ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ نے حضورؐ سے ایک لونڈی دینے کی درخواست کی۔ حضورﷺ نے آپ کی یہ بات نہ مانی اور اس کی بجائے آپ کو تسبیح فاطمہؓ کی تعلیم دی۔

ہم اہل سنت سمجھتے ہیں کہ اس اختلاف آراء سے ان حضرات کے ایمان اور نفرت از فسق پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ہم صرف اس اختلاف آراء سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ایمان اور عدالت میں شک نہیں کر سکتے۔

یہ چند واقعات حضرت علیؓ مرتضٰی کے آپ کے سامنے ہیں لیکن یہ رافضی اپنے دعوے میں انہیں بھی ذکر نہیں کر سکا تا کہ پتہ چلے کہ وہ اس آیت کو سمجھ رہا ہے پھر حضرت ابوذرؓ سے بھی اس نے کوئی ایسی بات نقل نہیں کی اور آیت کو ان پر منطبق کر دیا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مومنین کی شان ان کے ایمان بڑھنے میں ہے

قرآن کریم مومنین کی شان یہ بیان کر رہا ہے کہ آیات الٰہی سن کر ان کا ایمان اور مضبوط ہوتا ہے۔

انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایماناً. (پ ۹ الانفال ۲)

ترجمہ: ''ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ہل جاتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جائیں ان پر آیات الٰہیہ تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان''

یہاں ایمان کا بڑھنا اس کے مضبوط ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ اس کے خلاف نہیں کہ ایمان ایک بسیط حقیقت ہے۔

ہاں یہ رافضی حضرت علیؓ مرتضٰی کے بارے میں لکھتا ہے کہ آپؓ نے کہا:

لو کشف لی الغطاء لما ازددتُ یقیناً. (نھج البلاغۃ)

''اگر حجاب اٹھا بھی دیے جائیں تو بھی میرے ایمان و یقین میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔''

یہ اس لیے تھا کہ آپ کا ایمان آخری نقطہ کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ سو یہ آیت ان پر بھی منطبق نہیں کی جا سکتی۔

ہم اس وقت اس روایت پر بحث نہیں کرتے تاہم اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ بقول رافضی حضرت علیؓ یہاں اس لفظ مومنین کا مورد نہیں ہیں (معاذ اللہ)۔ پھر ڈھ گو رافضی نے جتنی باتیں صحابہؓ کے بارے میں نقل کی ہیں۔

(قطع نظر از ثبوت روایت) ان میں سے کسی میں کسی کا کفر کی حد تک نکلنا مذکور نہیں۔ پھر معلوم نہیں شیعہ لوگ کس بل بوتے پر ان حضرات کے بارے میں کفر سے کم کسی مقام میں نہیں ٹھہرتے۔ ان کے ہاں ایمان ایسے کمزور تمسکات سے ہی قائم ہوتا ہے۔

۱۔ **الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل۔** یہ شرک خفی کا بیان ہے اور شرک خفی سے کفر ثابت نہیں ہوتا۔ سو ان کے دعوے اور دلیل میں مطابقت نہیں۔ پھر اس میں **فیکم** سے مراد عام امت ہے۔ اس کا مورد حضرت ابوبکرؓ کو نہیں بنایا جا سکتا۔ **لا دلالۃ للعام علی الخاص۔** پھر اس روایت کے راویوں اور ان کے اتصال کو بھی دیکھ لیں۔ **ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت، لو کانوا یعلمون۔**

۲۔ شک یقین کے مقابل ہے کفر کے مقابل نہیں۔ شک میں دونوں طرفیں سامنے ہوتی ہیں جس طرح کسی کا یہ یقین ہو کہ اللہ نے ہر چیز پیدا کی اور پھر خیال ادھر دوڑا کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا تو اس خیال سے کوئی شخص ایمان سے باہر نہیں آتا۔ حضورؐ نے اسے تعلیم دی کہ ایسے موقع پر وہ یہ کلمات ایمان کہے:

فمن وجد من ذلک شیاء فلیقل امنت باللّٰہ ورسلہ. (متفق علیہ)

ترجمہ: ''سو جو کوئی شخص ایسی بات محسوس کرے وہ یہ کہے میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا'' (پھر اس احساس کا کوئی اثر نہ رہے گا)

پھر آپؐ نے یہاں تک فرمایا:

یاتی الشیطان احدکم فیقول من خلق کذا و من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذا بلغہ فلیستعذ باللّٰہ ولینتہ. (متفق علیہ)

ترجمہ: ''شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے' سو کہتا ہے اس کو کس نے پیدا کیا۔ اس چیز کو کس نے پیدا کیا حتٰی کہ پھر وہ اس سوال پر آ جاتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا' سو جب وہ اس بات پر پہنچے تو مومن کو اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کرنا چاہیے اور وہ اس سوال پر آ کر رک جائے۔ (آگے کوئی جواب نہ دے)''

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ صریح الایمان ہے' سو اس سے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

پھر دیکھیے حضرت عمرؓ کی طرف شک کی نسبت' یہ ایک مخفی امر تھا یا یہ ایک کھلی بات تھی۔ اخلاقیات میں شک امر معیوب تبھی ہوتا ہے جب وہ ایک مخفی امر ہو۔ اس کا اظہار خود اس کے دفعیہ کے لیے ہوتا ہے اور یہاں ایسا ہی ہوا۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا یہ روایت از روئے سند اس درجہ کی ہے کہ اس سے کسی قطعی درجے میں معلوم ہونے والے امور تزلزل میں جا سکیں۔ نیز یہ بھی ذہن میں رہے کہ شک کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے مومنین پر کسی پیرایہ میں کفر کی

چڑھائی کی جاسکے' ہاں بدنیت کے لیے بدی پھیلانے کی ہزاروں راہیں کھلی ہیں۔ اعاذنا اللہ منھا۔ اور اس میں ڈھکو رافضی کا پورا کردار قارئین کے سامنے ہے۔

ڈھکو رافضی اس پر کوئی دلیل نہیں لا سکا کہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوذرؓ بھی کفر وفسوق کے خلاف نکلے ہوں۔ ان کا ربذہ اقامت کرنا ان کے وہاں اپنے جانے سے نہ تھا' وہ وہاں حکومت کی طرف سے بھیج دیے گئے تھے اور وہ وہاں حکومت سے نہ ٹکرائے تھے۔

ما شککت منذ اسامت الا یومئذ اگر صحیح روایت بھی ہو تو یہ آپ کا آخر القول نہ تھا۔ حضورؐ کے دست تصرف نے آپ کے دل پر سے ہر ایسا شائبہ دور کر دیا تھا **والعبرة بالخواتیم**۔ اب اس پر شک کا کوئی چھینٹا نہیں گرایا جا سکتا۔

علامہ کلینی بھی لکھتے ہیں **انما یوخذ بآخر امر رسول اللّٰہ**

(اصول کافی ج ۱ص ۱۶۷۔ فروع کافی ج ۴ص ۱۲۷)

پھر اس میں تو کسی مسلمان کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے کہ صحابہ سے جو امور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وجود میں آئے ان پر کوئی حکم لگانا صرف حضورؐ کا ہی حق ہے۔ یہ حق کوئی شخص اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔

آیئے اب ہم آپ کو پچیسویں آیت میں لے چلیں

فانزل اللّٰہ سکینته علیٰ رسوله وعلی المؤمنین والزمهم کلمة التقویٰ وکانوا احق بها واهلها وکان اللّٰہ بکل شئی علیما. (پ ۲۶ الفتح ۲۶)

اس آیت میں حدیبیہ کے مقام پر حضور اکرمؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے مومنین کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دیکھئے آیت ۱۸۔

لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرة.

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ بے شک راضی ہوئے ان مومنین سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔"

پھر ان سب پر سکینہ اترنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

فانزل السکینة علیهم واثابهم فتحاً قریباً ومغانم کثیرة یاخذونها.

پھر آیت ۲۶ میں بھی انہی مومنین پر سکینہ اترنے کا بیان ہے۔

اس آیت میں جو لوگ بھی درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے ان سب کو مومنین کہا گیا ہے۔ اس ایمان افروز

نظارے میں جو بھی دولتِ ایمان سے محروم ہو اس کے لیے مستقل دلیل چاہیے۔ عوامی نظارہ سب کے ایمان کی تصدیق کر رہا ہے۔ ڈھکو کے عقیدے کے مطابق بیعت کرنے والے تو سینکڑوں دکھائے جائیں اور ایمان والے ان میں صرف چند ہوں۔ یہ غیر مومنانہ سوچ قرآن کریم کے اس ایمان پرور ظاہری نقشے کو ایک ڈرامہ بناتا ہے جس میں ظاہر کچھ ہو اور حقیقت حال کچھ اور۔ کیا وہی لوگ حضورؐ سے بیعت کرنے والے نہ تھے جنہوں نے حضورؐ کی بلا فصل خلافت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا ساتھ دیا۔ اور کیا اللہ تعالیٰ نے انہی کو مومنین نہیں کہا؟ اور کیا انہی مومنین کو آئندہ فتوحات نہیں دیں؟ کیا آئندہ یہی غنائم کے پانے والے نہیں بتائے گئے؟ ان شواہد کے ہوتے ہوئے کیا ان جمہور اہلِ بیعت رضوان کے تینوں پیشواؤں (خلفائے ثلٰثہ) کے ایمان میں شک کی تل دھرنے کی بھی کوئی گنجائش ہے؟

اس آیت میں مومنین اور **الزمهم کلمة التقویٰ** کے الفاظ پکار پکار کر ان جمہور اہل بیعت رضوان کی خبر دے رہے ہیں مگر ڈھکو مولف یہ رٹ لگائے ہوئے کوئی علمی حجاب محسوس نہیں کر رہا۔

"بدقسمتی سے مولانا دبیر کے محبوب ثلٰثہ ایمان اور صفت تقویٰ سے تہی دامن نظر آتے" ہیں

(ص ۱۱۵)

یہاں یہ کن کی بدقسمتی کا ماتم کیا جا رہا ہے۔ انہی کی جنہیں یہ خلفاء ثلٰثہ ایمان سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں ڈھکو رافضی کی اس بدقسمتی پر اظہار افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ماتم اول وہلہ کے سوا کہیں جائز نہیں۔ جو شخص شک اور انکار میں فرق نہ کر سکے اسے کس درجے کا صاحب شعور کہا جا سکتا ہے؟ ہم اس پر فیصلہ کرنے کا حق قارئین کو دیتے ہیں۔ یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ شک صرف ایک وقتی اور آنی چیز ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی حقیقت دائمہ نہیں ہوتی۔ صرف ایمان اور کفر دو حقیقتیں ہیں جن کی اساس پر دنیا میں مومنین اور کافرین کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ ہاں ضد کا کوئی علاج نہیں۔ اس سے جو کفر پیدا ہوا اسے رفض کہتے ہیں۔

آیئے ہم آپ کو اب چھبیسویں آیت میں لے چلیں

الا تنصروه فقد نصره اللّٰہ اذ اخرجه الذین کفروا ثانی اثنین اذهما فی الغار اذ یقول لصاحبه لا تحزن ان اللّٰہ معنا. فانزل اللّٰہ سکینته علیه. (پ ۱۰ التوبه ۴۰)

ترجمہ: "اگر تم اس رسول کی مدد نہ بھی کرو تو بے شک اللہ آپ کی مدد کر چکا ہے۔ جب آپ کو کافروں نے جلاوطن کر دیا تھا جب کہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے۔ جس وقت دونوں غار میں تھے' ایک اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم کچھ غم نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، سو اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب پر اپنا سکینہ اتارا۔"

مولانا کرم الدین دبیرؒ نے اس آیت پر مختلف پہلوؤں سے بڑی ایمان افروز بحث کی ہے مگر افسوس کہ ڈھگو رافضی اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں لے سکا سوائے اس کے کہ ان کی پوری پوری عبارات نقل کر کے اپنی کتاب کا حجم بڑھاتا گیا ہے اور آخر میں لکھتا ہے

''مولف نے اپنے نامہ اعمال کی طرح یہاں پورے چودہ صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔'' (ص ۱۲۲)

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں ڈھگو رافضی کے چند جوابات سے اپنے قارئین کو بھی مطلع کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس رافضی کی کچھ اور بے چارگی واضح ہوتی جائے گی۔

۱۔ حضورؐ جب حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر ہجرت کے لیے روانہ ہوئے اور مشرکین کو جو آپ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے' یہ پتہ نہ چلا تھا کہ حضورؐ کدھر گئے ہیں تو ان کافروں کو آپ کے اس راز پر کس نے مطلع کیا؟ ڈھگو رافضی لکھتا ہے' حضرت علیؓ نے ایسا کیا۔ (استغفر اللہ العظیم) رافضی لکھتا ہے۔:

''شب ہجرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کے دولت سرا پر حاضر ہوئے' حضرت علیؓ چادر رسول اوڑھ کر بستر رسول پر دراز تھے' انہوں نے علی کو نبی سمجھ کر کہا یا رسول اللہ' حضرت علیؓ نے (پردہ کھول دیا) فرمایا وہ تو چاہ میمون کی طرف چلے گئے ہیں۔ چنانچہ ابوبکرؓ ان کے پیچھے گئے اور رستہ میں جا ملے حتی کہ پھر غار ثور میں داخل ہو گئے۔'' (ص ۱۲۳)

کیا حضرت علیؓ نے راز رسول مشرکوں کے سامنے کھول دیا تھا حضورؐ کی اس رازدارانہ روانگی کو ان مشرکین سے چھپائے رکھا تھا۔ ڈھگو رافضی لکھتا ہے:

''ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ شب ہجرت حضرت علیؓ چادر نبی اوڑھ کر بستر رسول پر سوئے ہوئے تھے اور کفار و مشرکین ان کو رسول سمجھ کر پتھر مار رہے تھے اچانک ابوبکرؓ آئے اور کہا یا رسول اللہ' حضرت علیؓ نے چادر سے سر نکال کر فرمایا' وہ تو بئر میمون کی طرف تشریف لے گئے۔ چنانچہ ابوبکرؓ ان کے پیچھے گئے اور پھر ان کے ہمراہ غار میں داخل ہو گئے۔'' (تجلیات صداقت ۱۲۳)

غور کیجئے کہ رافضی نے حضورؐ کے راز کو افشاء کرنے کا الزام کس پر لگایا؟ حضرت علیؓ پر۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ اس کا جواب رافضیوں کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت علیؓ نے آپ کا راز کافروں سے نہ کھولا تھا' حضرت ابوبکرؓ سے کھولا تھا اور وہ آپ کو کافر اور مشرک نہ سمجھتے تھے' حضورؐ کا جاں نثار ساتھی سمجھتے تھے۔ رافضی خود بھی جب اس بات کو سمجھ نہ پایا تو وہ ان الفاظ میں اپنی جہالت کا اقرار کرتا ہے:

''جب ابوبکرؓ کو کسی طرح (رافضی کی پہلی جہالت) آپ کے اس ہمسفر کی اطلاع ہوئی تو خدا معلوم

کس قصد سے (رافضی کی دوسری جہالت) آنحضرت سے جا ملے ...... اور آنحضرتؐ نے بھی افشائے راز کے خوف سے یا کسی اور مصلحت سے (رافضی کی تیسری جہالت) ان کو واپس نہ لوٹایا۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۲۳)

رافضی آگے جا کر لکھتا ہے' قرآن مجید سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے' **اذ اخرجه الذين كفروا** ...... واحد کی ضمیر بتلا رہی ہے کہ کفار نے صرف رسول خدا کو نکالا تھا۔ (ایضاً ۱۲۳)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کفار و مشرکین کا عناد صرف حضورؐ سے تھا۔ **واذ يمكر بك الذين كفروا ليثبتوك او يقتلوك او يخرجوك ويمكرون و يمكر الله۔** (پ۹ الانفال ۳۰) میں بھی واحد کی ضمیر ہی ہے۔ سو اس میں کوئی شک نہیں کہ کافروں نے صرف آپ کو ہی نکالا۔ لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو بھی آپ کے ساتھ کر دیا تھا۔ پوری آیت یوں پڑھیے۔ کیا آگے ثانی اثنین کے الفاظ نہیں ہیں؟ کیا شروع آیت میں نصرت رسول کا قصہ مذکور نہیں؟

الا تنصروه فقد نصره الله اذ اخرجه الذين كفروا ثاني اثنين اذهما في الغار اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا.

ترجمہ: ''اگر تم اس رسول کی مدد نہ بھی کرو تو بے شک اللہ آپ کی مدد کر چکا ہے۔ جب آپ کو کافروں نے جلاوطن کر دیا تھا جب کہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے۔ جس وقت دونوں غار میں تھے' ایک اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم کچھ غم نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

صاحبه کا لفظ خود بتاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ خود اپنے ارادے سے حضور کے ساتھ چلے تھے اور حضورؐ نے **ان الله معنا** کہہ کر انہیں اپنے ساتھ اس ضمیر جمع میں ملایا تھا۔ پہلے ساتھ چلنے کی حضورؐ نے صرف پیشکش کی تھی۔ تفسیر امام حسنؓ عسکریؒ کے ان الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

فانه ان انسك و ساعدك وازرك وثبت على تعاهدك وتعاقدك كان في الجنة من رفقاءك. (ایضاً ۱۲۴)

ترجمہ: ''وہ اگر تجھ سے انس کرے اور تیری مدد کرے اور تیرا ساتھ دے اور تیرے عہد اور جوڑ پر قائم رہے تو جنت میں بھی تیرے ساتھ ہوگا۔''

رافضی نے یہاں لفظ ان (بمعنی اگر) سے ایک اور بات چھیڑ دی ہے لیکن ہمارا استدلال امام حسن عسکری کی اس عبارت سے صرف اتنا ہے کہ حضورؐ نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کی پیش کش خود کی تھی جسے قبول کر کے آپ خود ان کے

ساتھ ہو لیے تھے۔ آپ کا ساتھ چلنا کوئی چوری چھپے کی کارروائی نہ تھی جیسا کہ یہ ڈھگو رافضی لکھ رہا ہے۔

رہی یہ بات کہ ان حرف شرط سے اگلا معاملہ بحث مشتبہ ہو جاتا ہے' یہ درست نہیں خصوصاً جب کہ حضرت ابوبکرؓ نے وہ تمام شرطیں پوری کر دکھائیں جن کے ساتھ حضور اکرمؐ نے آپ کو آپ کے رفیق فی الجنۃ ہونے کی بشارت دی تھی یا آپ کو کان، زبان اور اپنی آنکھ کے درجہ میں اپنے قریب کیا تھا۔

مولانا کرم الدین دبیر کی رافضیوں پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس نے ڈھگو رافضی کو اپنی کتابوں (جیسے حملہ حیدری) کے انکار پر مجبور کر دیا ہے اور اس کی یہ بے بسی خود اس کی اس کتاب سے واضح ہے۔ پھر اس کا اپنے اختیار کردہ موقف میں بار بار اپنی ناواقفی کا اظہار خود بتا رہا ہے کہ وہ ایک غلط سمت میں غوطے کھا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد اندھیرے کی پیداوار نہیں ہوتے' ان کی بناء دلائل قطعیہ اور یقینیہ پر ہوتی ہے اور ان سے یہ رافضی بالکل تہی دامن نظر آتا ہے۔

بزم رسالت میں آنے جانے والے

بزم رسالت کے ہم نشینوں اور محض آنے جانے والوں میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ منافقین آپ کے پاس آتے جاتے رہتے لیکن وہ آپ کے کبھی بزم نشین نہ ہوتے تھے۔ وہ آپ کے راز دان ساتھیوں کے جلو میں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ کھلے کافر انہیں حضورؐ کے صحابہؓ میں سے سمجھتے تھے۔ حضورؐ کے اپنے حلقہ میں ہمیشہ متواضع قسم کے لوگ ہی دیکھے جاتے تھے۔ منافقوں کے ہاں صحابہؓ کون سمجھے جاتے تھے جو آپ کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے۔

صحابہؓ اپنے اپنے حالات کے مطابق حضورؐ کے پاس پڑے درویشوں پر خرچ بھی کرتے مگر منافقین اپنے ہاں اس سکیم سے چلتے کہ ان لوگوں پر جو بزم رسالت کے ہم نشین ہیں' کبھی کچھ خرچ نہ کرو۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ منافق حضورﷺ کے ہم نشین ہرگز نہ ہوتے بس آنے جانے میں ہی رہتے تھے۔

هم الذين يقولون لا تنفقوا علٰى من عند رسول اللّٰه. (پ ۲۸ المنافقون ۷)

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جو (اپنے لوگوں سے) کہتے ہیں کہ تم ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو حضورؐ کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ منافقین حضورؐ کے پاس آتے جاتے تو تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنا اور بزم رسالت کے ہمنشین بننا یہ ان کا نصیب نہ تھا اور ان پر راہ اسلام میں کچھ خرچ کرنا یہ بھی ان کی برات میں نہ تھا۔

قرآن کریم میں ان کا حضورﷺ کے پاس صرف آنے جانے اور آپ سے بات چیت کرنے کا صرف ذکر ملتا ہے۔ ان کے حضورؐ کے پاس ڈیرہ ڈالے رہنے کی کوئی عام خبر نہیں ملتی۔

اذا جاءک المنافقون قالوا نشهد انک لرسول اللّٰه. (پ ۲۸ المنافقون)

منافقوں کا حضورؐ کے پاس آنا جانا تو رہتا لیکن وہ آپ کی معیت نہ پا سکے۔ ان کی معیت کافروں کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ انہیں بتلاتے **انا معكم** مگر قرآن کریم نے **اشداء علٰى الكفار** اور **رحماء بينهم** کی صفات رکھنے والوں کو **والذين معه** کہا ہے۔ اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ منافقین حضورؐ کی معیت کے لوگ نہ تھے اور ان کا حضورؐ کے پاس صرف آنا جانا ہوتا تھا، وہ شرارتیں کرنے تو آتے لیکن وہ بزم رسالت کے ہم نشین بنتے کبھی نہ دیکھے گئے۔

واذا قيل لهم اٰمنوا كما اٰمن النّاس قالوا أنؤمن كما اٰمن السفهاء. (البقرہ ۱۳)

پھر جب انہیں کہا جاتا کہ تم ایسے ایمان لاؤ جس طرح یہ حضورؐ کے پاس رہنے والے ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے یہ تو بے وقوف لوگ ہیں' ہم ان جیسا ایمان کیوں لائیں۔

پھر قرآن کریم میں ان کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہم ان بیوقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں' بتاتا ہے کہ وہ صحابہؓ کے ساتھ عام مخلوط نہ رہتے تھے اور اسلام کی اس پہلی سوسائٹی میں وہ کبھی جذب نہ ہو سکے۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں خاص خاص صحابہؓ کو خبر بھی دے رکھی تھی۔ مگر آپؐ نے انہیں اپنے حلقہ سے نکالنے کی اجازت نہ دی تھی کہ مخالفین یہ پراپیگنڈا نہ کریں کہ حضورؐ اپنے صحابہؓ کو مارتے ہیں۔ اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ کفار ان کو صحابی ہی سمجھتے تھے گو صحابہؓ کے ہاں یہ ہم نشینان بزم رسالت نہ سمجھے جاتے تھے۔ یہ بے آبرو درجے کے لوگ صحابہؓ میں کبھی ہم نشین کی منزلت کو نہ پہنچ سکے تھے۔ سو منافقین کو حضور اکرمؐ کے ساتھ کے لوگ کبھی نہیں کہا جا سکتا۔ حضورؐ کی طرف جو نسبت پا گیا وہ ہر مظنہ کفر و شرک سے نکل گیا جیسے کہ حضورؐ کے سفر ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ حضورؐ کے ساتھی ہونے کی نسبت جلیلہ پا گئے۔ **اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان اللّٰه معنا.** جب آپ نے اپنی اس نسبت کے حامل کو **ان اللّٰه معنا** کی بشارت دی اور آپ کو اپنی معیت میں رکھا تو اللہ رب العزت نے حضور اکرمؐ پر اپنا سکینہ اتارا۔

ڈھگو رافضی نے ص ۱۲۶ پر لفظ صاحب پر ایک سرخی باندھی ہے اور لفظ صاحب کے لیے وہ گندی مثالیں دی ہیں کہ آپ کسی ایمان والے سے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

۱۔ گدھے پر لفظ صاحب کا اطلاق' استغفر اللہ۔ ۲۔ قوم ثمود نے اپنے صاحب کو بلایا

۳۔ **فقال لصاحبه وهو يحاوره.** (پ ۱۵ الکہف) میں کافر اور مومن کو ایک دوسرے کو صاحب کہا گیا ہے۔

الجواب

ان الحمار مع الحمار مطيّة ۔۔۔ واذا خلوت به فبئس الصاحب

ترجمہ: ''گدھا گدھوں کی معیت میں تو بے شک ایک سواری ہے اور جہاں تو اور گدھا اکیلے ہوں تو وہ برا صاحب (ساتھی) ہے۔''

ڈھکو نہیں جانتا کہ دوسری صورت میں گدھے کا دولتیاں مارنا صحبت نا جنس کی وجہ سے ہے' اختلاف عقیدہ سے نہیں ہے۔ سو یہ مثال ایک جنس کے دو ساتھیوں پر پوری نہیں اترتی۔ اسی لیے یہاں ڈھکو نے ترجمہ میں مع الحمار کا ترجمہ نہیں کیا۔ یہ تو بئس الصاحب کی صورت ہے۔ وہ نعم الصاحب کب ہے، جب دونوں ایک جنس سے ہوں' ایک نوع کے ہوں اور یہاں دونوں حضرت ابوبکرؓ اور حضور ایک نوع کے تھے۔

دوسری مثال میں قومی مصاحبت کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی عملی مصاحبت نہیں ہوتی۔ زیر بحث مصاحبت ایک سفر کی مصاحبت ہے اور یہ ایک عملی مصاحبت ہے۔ اس شرف کو توڑنے کے لیے قومی مصاحبت کی مثال لانا درست نہیں۔

تیسری مثال میں بھی صاحب مصاحبت کے معنی میں نہیں۔ یہ دوسرے کے معنی میں ہے۔ یہ مثال دو شخصوں کی ہے جو اپنے اپنے حال میں تھے اور دونوں کی آپس میں مقابلہ کی بات ہو رہی ہے اور وہ دونوں کسی بات پر جمع نہ تھے سو یہاں لفظ صاحب دوسرے کے معنی میں ہے۔

قال له صاحبه وهو يحاوره أكفرت بالذى خلقك. (الکھف ۳۷)

ترجمہ: ''کہا اس کو دوسرے نے جب بات کرنے لگا' کیا تو منکر ہو گیا ہے اس سے جس نے بنایا تجھ کو۔'' (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

یہاں صاحب صرف ایک ملاقاتی ہے کسی دیر پا مدت کا ساتھی نہیں۔ **ما بصاحبهم من جنة** ۔ (الاعراف ۱۸۴) میں بھی ھم سے ایک قوم مراد ہے' کسی قوم کا ساتھی ہونا اتحاد نوعی ہے مصاحبت نہیں۔ **ماضل صاحبكم و ما غوى** میں بھی اتحاد نوعی مراد ہے' مصاحبت نہیں۔

قرآن کریم میں **اذ يقول لصاحبه** میں اتحاد نوعی بتلانا مقصود نہیں۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا شخصی طور پر حضور کا مصاحب ہونا ہے اور یہ بات بھی خدا کی ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ کا ساتھی کہہ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی حضورؐ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی معیت میں لے آئے۔ **لا تحزن ان الله معنا**۔ ان الفاظ نے واضح کیا کہ یہاں مصاحبت (صاحب) معیت کے معنی میں ہے۔ اتحاد نوعی کے لیے نہیں۔ خدا کو اس اتحاد نوعی میں نہیں لایا جا سکتا۔

سو یاد رہے کہ یہاں **اذ يقول لصاحبه** میں حضرت ابوبکرؓ شخصی طور پر حضورؐ کے سفر ہجرت کے ساتھی تھے۔ حضور اپنی اس معیت میں اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں یہ مصاحبت ایک ایسا شرف ہے جو کسی طرح توڑا نہیں جا سکتا۔ گدھے کو گدھے کی مثال ہی ملتی ہے۔

پیغمبر کی طرف صاحب کی نسبت کسی ایرے غیرے کی مصاحبت پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ حضرت یوسفؑ جب

قید میں تھے تو آپ نے اپنے جیل کے دو ساتھیوں کو اپنا ساتھی کہتے ہوئے سجن کا لفظ ساتھ کہا کہ کہیں اس سے کوئی مطلق مصاحبت مراد نہ لے لے۔ پیغمبر کی مطلق مصاحبت ایک بہت بڑا شرف ہے جو ہر کسی کا نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی خاص نسبت بیان کی جائے تو وہاں اس کی نشاندہی کر دی جائے گی۔ آپ نے کہا:

يا صاحبى السجن اما احدكما فيسقى ربه خمراً واما الآخر فيصلب.

(پ ۱۲ یوسف ۴۱)

ترجمہ: ''اے دو ساتھیو! قید خانہ کے...... ایک تم میں سے اپنے مالک کو پلائے گا شراب اور دوسرا سولی دیا جائے گا۔''

یہاں بتایا گیا کہ وہ دونوں صرف قید خانہ کے ساتھی تھے۔ حضرت یوسف کے کسی مشترکہ عمل میں ساتھی نہ تھے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ حضور کے سفر ہجرت میں ساتھی تھے۔

ثانی اثنین سے مرادِ خداوندی کیا تھی؟

ڈھکو رافضی لکھتا ہے:

''مطلب یہ ہے کہ غار میں آنحضرت تنہا نہ تھے بلکہ ایک اور شخص بھی ان کے ہمراہ تھا۔''

رافضی نے یہ مطلب ساتھ نہیں لکھا کہ اس کے ساتھ یہ مطلب بھی ہے کہ کوئی تیسرا شخص وہاں ان دو کے ساتھ نہ تھا۔ جب کوئی اور صاحب غار میں حضور کے ساتھ نہ تھا تو یہ بات اور واضح ہے کہ اس رات حضورؐ کے ساتھ غار میں ہونے کا شرف صرف ابوبکرؓ کا ہی نصیب رہا اور کوئی صحابی وہ حضرت علیؓ ہوں یا حضرت ابوذر' کوئی اور ان دو کے ساتھ نہ تھا۔

ڈھکو لکھتا ہے:

''پیش نظر رہے کہ اس مقام پر خدائے حکیم نے لفظ ثانی آنحضرت کے لیے استعمال فرمایا ہے۔''

(ص ۱۲۹)

جب ڈھکو یہ سطر لکھ رہا ہو گا تو کیا یہ سوال اس کے ذہن میں نہ ابھرا ہو گا کہ وہ اول کون تھا جس کے آپ ثانی ٹھہرتے ہیں۔ مگر اسے ہمت نہ ہوئی کہ یہاں حضرت ابوبکرؓ کو اول کہے۔

غار میں واقعی آپ پہلے گئے تھے کہ اسے حضورؐ کے لیے صاف کریں۔ کسی سوار کا خادم اگر آگے آگے چلے تو وہ صرف چلنے میں اول ہو گا' درجے میں نہیں...... درجے میں مالک ہی اول ہے۔ گو وہ دو میں دوسرا ہو لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا اس میں حضرت ابوبکرؓ کا کوئی شرف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غار میں داخل ہونے میں حضورؐ کا اول بنایا اور حضورؐ کو ثانی بنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثانی اثنین میں حضرت ابوبکرؓ ضرور شامل ہیں اور اس میں آپ کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

آپ بلافصل اس لفظ (ثانی اثنین) میں شامل ہیں۔ اور کسی صحابیؓ کو یہ شرف نہیں ملا کہ وہ حضورؐ کے ساتھ اس عمل میں بلافصل ٹھہرے۔ ثانی اثنین میں اگر کوئی فضیلت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے یہ نہ کہتے:

ما ظنك يا ابابكر باثنين الله ثالثهما. (صحيح بخاری ج ۱ ص ۵۶۱)

ترجمہ: ''اے ابوبکر تم ان دو کے بارے میں کیا سوچتے ہو جن کا تیسرا خدا ہو۔''

اس میں آپ نے انہیں تسلی دی کہ اللہ کی طرف سے جب مجھ پر سکینہ اترے گا تو تم بھی اس سے باہر نہ رہو گے۔ وہ ہم دو کا تیسرا ہے۔ اس صورت میں اول حضرت ابوبکرؓ ہے اور دوسرا حضور اکرم اور تیسرا خود اللہ رب العزت۔

تاہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی ثانی کہا جا سکتا ہے۔ دو میں ہر ایک دوسرے کا دوسرا ہوتا ہے۔ ثانی اثنین میں حضرت ابوبکرؓ کے دوسرے حضورؐ اور سکینہ اترنے میں حضرت ابوبکرؓ حضورؐ کے دوسرے تھے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکرؓ پر بھی ثانی کا لفظ بولا ہے۔

والثانی الثانی المحمود مشهده ...... و اول النّاس منهم صدق الرسلا.

ترجمہ: ''اور الثانی کون ہیں جن کی وہاں حاضری کی مدح کی جا رہی ہے؟ وہ بڑے لوگوں میں سے پہلے ہیں جنہوں نے حضورؐ کی تصدیق کر کے سب رسولوں کی تصدیق کر دی۔''

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

لا ريب ان الفضيلة التى حصلت لابى بكر فى الهجرة لم تحصل لغيره من الصحابة بالكتاب والسنة والاجماع. (منهاج السنة ج ۷ ص ۱۲۱)

ترجمہ: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو ہجرت میں جو فضیلت ملی کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں اور کسی کا نصیب نہ ہو سکی۔''

اب جو اس قطعی طور پر ثابت ہونے والی فضیلت کا بھی منکر ہو اسے کس طرح صف اسلام میں رکھا جا سکتا ہے؟

یہ آپ سوچیں ہاتف کی غیبی آواز نے تو یہاں ثانی اثنین کو دو رفیقوں اور دو مومنوں کا عنوان بھی دے دیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کو فلاح پانے والے بھی کہا ہے۔

جزى الله رب النّاس خير جزائه — رفيقين حلا خيمتى ام معبد
هما نزلا بالبر ثم تروحا — فافلح من امسى رفيق محمد
ليهن بنى كعب مكان فتاتهم — ومقعدها للمومنين بمصد

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۳۷)

ان اللہ معنا میں کونسی معیت مراد ہے؟

ہجرت کی رات مشرکین حضورؐ کے تعاقب میں تھے اور حضرت ابوبکرؓ حضورؐ کی خدمت اور حفاظت میں تھے۔

اس میں اگر حضرت ابوبکرؓ کو یہ فکر تھی کہ کہیں مشرکین مکہ یہاں نہ آ پہنچیں تو ظاہر ہے کہ جب حضورؐ حضرت ابوبکرؓ کو کہہ رہے تھے ان اللہ معنا تو یہاں معیت الٰہی سے مراد آپ کے عمل ہجرت کی کامیابی اور تعاقب کرنے والے مشرکین کی ناکامی تھی۔ اور وہ ہو کر رہی۔ اب یہ قارئین سوچیں کہ یہاں معیت کی مختلف قسمیں بیان کرنا اور قارئین کو ان بحثوں میں الجھانا خود اس ڈھکو مولف کی ذہنی وارفتگی کا مظہر نہیں تو اور کیا ہے۔

مولف اسی بوکھلاہٹ میں کہتا ہے' عین ممکن ہے کہ حضورؐ کا کہنا ان اللہ معنا اطلاق جمع بر واحد کے طور پر ہو' وہ یہ نہیں سمجھا کہ یہ اطلاق تعظیمی وہاں ہوتا ہے جہاں پہلے تثنیہ کہیں مذکور نہ ہو۔ ثانی اثنین کی صراحت کے بعد اطلاق جمع بر واحد کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ اس معیت میں جو فضیلت لپٹی ہے اس کا انکار بقول حافظ ابن تیمیہ کتاب وسنت اور پورے اجماع امت کا انکار ہے۔

مگر ڈھکو رافضی لکھتا ہے:

''آنحضرت مقصود بالذات اور ابوبکرؓ بالتبع اور بالعرض ہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ان کا طفیلی ہونا ثابت ہوگا اور یہ کوئی فضیلت نہیں ہے۔'' (ص ۱۳۰)

جب تمہاری قسمت میں ہی ان کی کسی فضیلت کا اقرار نہیں تو ہم تمہاری اس بدقسمتی پر افسوس کے کلمہ تأسف کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

اذ یقول لصاحبہ نے امت کو کیا اصول بخشا؟

ہجرت کی رات حضرت ابوبکرؓ کا غار میں حضورؐ کا ساتھی ہونا یہ آپ کا حضورؐ کے مشن میں آپ کا ساتھی ہونا ہے۔

اس سے صرف رفیق فی السفر مراد لینا درست نہیں۔ اس پر امت کے تمام جلیل القدر فقہاء متفق ہیں کہ جو حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا انکار کرے' ان کا صحابی رسول ہونا نہ مانے وہ اسلام سے خارج ہے۔ کیونکہ وہ اس قرآنی نص کا منکر ہے۔ **اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا۔**

اگر اس سے صرف رفاقت فی السفر مراد ہوتی تو اس پر اتنا واضح فتویٰ دینے کی آخر ضرورت کیا تھی۔ مدعیان اسلام میں اب تک کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس نے یہ کہا ہو کہ اس رات حضورؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ نہ تھے۔ کوئی اور تھا تو ایسا بے محل فتویٰ امت میں دینے کی ضرورت کیا تھی؟ جب کسی بات کا سرے سے کوئی مدعی ہی نہ ہو تو اس پر اتنی سخت کارروائی کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ سو یہ فتویٰ اس اعتقاد کے خلاف ہے کہ کوئی شخص شب ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ کو

حضورؐ کے مشن میں حضور کا ساتھی نہ مانے۔ فقہاء امت میں سے جس نے بھی یہ فتویٰ دیا کہ جو حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ کا صحابی نہ مانے وہ کافر ہے اس سوال پر دیا کہ کیا شیعہ صف اسلام میں داخل سمجھے جائیں یا نہ؟ ظاہر ہے کہ اس فتویٰ میں کسی عقیدے پر بھی زد پڑ سکتی ہے نہ کہ کسی واقعہ پر کہ اس رات آپؓ حضورؐ کے ساتھ تھے یا نہیں۔

دوسری صدی کے مشہور محدث امام سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) جنہیں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کی طالب علمی پر لگایا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا

من انکر صحبة ابی بکر فهو کافر لانه کذب القرآن. (منهاج السنة ج ۸۵ ص ۳۸۱)

ترجمہ: ''جو شخص حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا منکر ہو وہ کافر ہے کیونکہ اس نے قرآن کی بات جھٹلا دی۔''

اگر کسی کے دل سے ایمان رخصت نہیں ہو گیا تو خدارا بتایئے، کیا یہ قرآن کی کھلی تحریف نہیں کہ اتنا سخت فتویٰ صرف اس مفروضے پر دیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ کے آپ کے رفیق سفر ہونے کا انکار نہ کر سکے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ فتویٰ اس پر دیا گیا ہے کہ کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ کے صحابی رسول ہونے کا انکار نہ کر سکے۔ آپ کو صحابی ماننے کے لیے آپ کے ایمان کا اقرار ضروری ہے۔ اب جو شخص ایمان شیخین کا منکر ہو اس کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کو صحابی رسول مانتا ہے۔

امام سفیان کے مذکورہ بالا فتویٰ میں مطلق صحابیت ابی بکر کے منکر کو اسلام سے باہر دکھایا گیا ہے۔ اس فتویٰ میں آپ کے صرف ہجرت کی رات رفیق سفر ہونے کی کوئی قید نہیں۔

علامہ علی بن محمد الجزری (۶۳۰ھ) مطلق صحابیت کے انکار کو کفر ٹھہراتے ہیں۔ اس میں رفیق سفر ہونے کی کوئی قید نہیں لگاتے۔

ان قال قائل ...... ان ابابکر لم یکن صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم کفر فان القرآن العزيز نطق انه صاحبه. (اسد الغابه ج ۳ ص ۳۱۴)

ترجمہ: ''اگر کسی نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ حضور اکرمؐ کے صحابی نہ تھے تو اس نے کفر کیا کیونکہ قرآن کریم اس پر ناطق ہے کہ آپ حضور اکرم کے صحابی تھے۔''

علامہ عینی (۸۵۵ھ) بھی یہی کہتے ہیں:

من انکر صحبة ابی بکر فقد کفر لانکاره کلام الله ولیس ذلک لسائر الصحابة. (عمدة القاری ج ۱۶ ص ۱۷۳)

ترجمہ: ''جس نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا انکار کیا اس نے کفر کیا کیونکہ اس نے قرآن کا انکار کیا ہے۔ ایسی صراحت اور صحابہ میں سے کسی کی صحابیت کے لیے موجود نہیں۔''

سو اس آیت نے امت کو اس اصول پر کھڑا کیا کہ جو شخص ایمان ابی بکر کا منکر ہو اسے ہرگز مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں ایک دوسرے اصول کا بھی کچھ ذکر کر دیں جو ایمان کی تمام جزئیات میں کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ تمام فضائل و کمالات کی جڑ حضورؐ کی ذات گرامی ہے۔ کسی بڑے سے بڑے صحابی سے بھی وہ حضرت ابوبکرؓ ہوں یا حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ ہوں یا حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ ہوں یا حضرت حسینؓ جو بھی فضیلت اور کمال ملا وہ سب حضورؐ کی طفیل ملا۔ حضورؐ کے فضائل و کمالات بالاصل ہیں اور ان سب حضرات کے بالتبع اور بالعرض

اپنے ابا سے کون لایا جس نے پایا یہیں سے پایا

سو اس اصول کی روشنی میں جاننا چاہیے کہ سفر ہجرت میں اصل ذات اور شخصیت حضور اکرمؐ ہی تھے۔ مکہ سے نکلتے وقت مشرکین کا آپ کو نہ دیکھ پانا' یہ رستے میں کسی کا آپ کو نہ دیکھ سکنا غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تننا یہ صرف حضورؐ کی ہی خاطر تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کا ان تمام تحفظات میں حضورؐ کے ساتھ رہنا حضورؐ کے ہی طفیل تھا۔ خدا کی اصل حفاظت حضورؐ کے لیے تھی۔ حضرت ابوبکرؓ دوسرے درجے میں اس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ البتہ غار کی گھبراہٹ صرف حضرت ابوبکرؓ کو تھی اور وہ بھی اپنے لیے نہیں حضورؐ کے لیے کہ کہیں دشمن آپ کے پاؤں کو نہ دیکھ پائیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو تسلی دی اور اللہ نے آپ پر سکینہ اتارا۔ علمائے اسلام اب تک اس سے یہی سمجھتے آئے ہیں کہ حضورؐ پر یہ نزول سکینہ بالاصل تھا اور حضرت ابوبکرؓ پر بالتبع اور بالعرض۔ جب دونوں طرف اشخاص ہوں تو معاملہ بالذات اور بالعرض کا ہوتا ہے۔ ہاں اگر ایک پوری جماعت ساتھ ہو تو ان کے لیے عطاء خداوندی کا ذکر کھلے پیرایہ میں بھی ہو جاتا ہے۔

ڈھکو رافضی لکھتا ہے کہ اس رات سکینہ صرف حضورؐ پر اترا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اس وقت ضرورت کیا تھی؟ کیا حضورؐ معاذ اللہ کسی گھبراہٹ میں تھے؟ ڈھکو لکھتا ہے:

''اس آیت نے ابوبکرؓ کا نام مومنین کی فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے...... ورنہ ان پر بھی سکینہ نازل ہوتا۔'' (ص ۱۳۱)

الجواب

حضرت ابوبکرؓ پر برابر کی سطح پر سکینہ نہ اترنے سے ان پر سکینہ نہ اترنے کا استدلال کرنا درست نہیں۔ کیونکہ ان پر سکینہ بالاصل نہیں' حضورؐ کی طفیل اترا تھا اور انہی کو اس کی ضرورت تھی اور حضورؐ پر بھی وہ اسی وقت اترا تھا جب آپ حضرت

ابوبکرؓ کو تسلی دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سکینہ ساتھ ساتھ حضرت ابوبکرؓ پر بھی اتر رہا تھا۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی کیفیت سکون و اطمینان حضورؐ کے قلب مبارک پر اور آپ کی برکت سے ابوبکرؓ کے قلب مقدس پر نازل فرمائی۔'' (ص ۲۵۶)

رافضی کا لا تحزن سے غلط استدلال

ڈھکو رافضی کہتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو کہا تھا بلند آواز سے آہ و فغاں نہ کر۔ یہ جھوٹ قرآن کے الفاظ لا تحزن سے ایک کھلا مذاق ہے۔ رافضی نے اس پر قاضی بیضاوی کے الفاظ کان منزعجا سے استدلال کیا ہے۔ انزعاج بھی صرف ایک بے قراری کا نام ہے' شور کرنے کا نام نہیں۔ قرآن کے الفاظ لاتحزن ایک قلبی احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ غم دل کے ایک حال کو کہتے ہیں۔ آہ و فغاں زبان کے عمل کا نام ہے۔ قرآن کریم مومنین کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور وہاں شور و شغب کا کوئی تصور راہ نہیں پاتا۔

لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون. (پ۲۴ حم السجدہ ۳۰)

ڈھکو رافضی پہلے سے یہ ذہن بنائے بیٹھا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ (معاذ اللہ) ایمان سے تہی دامن تھے اس لیے ان کے حزن سے کوئی اچھا معنی مراد نہیں لیا جا سکتا۔ وہ اسے سورہ حم سجدہ کے ان الفاظ کی روشنی میں سمجھنے کو قیاس مع الفارق سمجھتا ہے۔ حالانکہ معنی صرف اسی فارق سے مختلف ہوتے ہیں جس پر دونوں فریق مختلف ہوں۔ کسی متنازعہ فیہ بات سے نہ کوئی استدلال کیا جا سکتا ہے' نہ کسی استدلال کو توڑا جا سکتا ہے۔

اس رافضی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ایک دفعہ مسجد حرام میں کفار حضورؐ کو پکڑ کر ریش مبارک سے کھینچ رہے تھے' اس پر اس نے یہ سرخی لگائی ہے۔

مشکل مقامات پر ابوبکرؓ رونے سے آنحضرتؐ کی امداد کیا کرتے تھے

اور اس کے تحت لکھا ہے:

''ایک دفعہ کفار نے مسجد الحرام میں آنحضرتؐ کو پکڑ کر سر و ریش سے کھینچنا شروع کیا۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر ابوبکرؓ ایک طرف کھڑے رہے اور رو رو کر کہا اتقتلون رجلاً ان يقول ربي الله. ''

(ص ۱۳۲)

اصل روایت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر اس بد بخت کو حضورؐ سے ہٹایا تھا۔ اس وقت آپؓ نے ان حملہ کرنے والوں کو کہا تھا اتقتلون رجلاً ان يقول ربي الله۔ کیا تم اس شخص کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ یہ کہتا ہے میرا

پالنے والا ایک اللہ ہے۔ اب آپ صحیح روایت ملاحظہ فرمائیں اور ڈھکو کی خیانت مجرمانہ ملاحظہ کریں:

عن عروة بن الزبير قال سألت عبد الله بن عمرو عن اشد ما صنع المشركون برسول الله صلى الله عليه وسلم قال رايت عقبه بن ابى معيط جاء الى النبى صلى الله عليه وسلم وهو يصلى فوضع ردائه فى عنقه فخنقه به خنقاً شديداً فجاء ابوبكرؓ حتى دفعه عنه فقال اتقتلون رجلاً ان يقول ربى الله وقد جاء كم بالبينات من ربكم. (صحيح بخارى ج ۱ ص ۵۲۰)

ترجمہ: ''عروہ بن الزبیر سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے پوچھا کہ مشرکوں نے حضورؐ سے سب سے زیادہ سخت کارروائی کیا کی؟ انہوں نے کہا' میں نے دیکھا کہ عقبہ حضورؐ کے پاس آیا اور آپ نماز پڑھ رہے تھے' اس نے اپنی چادر حضورؐ کے گلے میں ڈالی اور اسے نہایت سختی سے کھینچا۔ حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھے یہاں تک کہ اس ظالم کو آپ سے ہٹایا۔ آپ نے کہا' تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو اس پر کہ وہ یہ کہتا ہے' میرا رب اللہ ہے اور اس پر وہ اپنے رب کی طرف سے کئی معجزات دکھا چکا ہے۔''

اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر ظالم کے ہاتھوں کو اپنی قوت بازو سے روکا' یہاں تک کہ اس ناپاک کو حضورؐ سے دور کر دیا۔ مگر ڈھکو رافضی کا جھوٹ ملاحظہ کریں۔

ابوبکرؓ الگ کھڑے رہے اور رو رو کر صرف یہ کہا اتقتلون رجلاً ان يقول ربى الله۔ (ص ۱۳۲)

بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن

پھر اس کے چند سطور بعد لکھا ہے۔

اسی طرح جب سفر ہجرت میں سراقہ بن مالک دہانہ غار کے قریب آ پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم رونے پر خوب زور صرف فرمایا

ڈھکو نے ان مقامات پر سیرت حلبیہ اور دور منثور کے حوالے دیئے ہیں اور ظاہر ہے کہ دونوں حوالے قوی درجے کی روایات نہیں اور نہ ان مصنفین نے کسی درجے میں ان روایات سے یہ استدلال کیا ہے ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ ایسے اعتقادی امور میں مرسل و مجہول روایت قبول نہیں ہوتی۔ کاش کوئی اس ڈھکو سے پوچھے کہ پھر تو خود ایسی بے سروپا روایات کیوں استدلال میں لا رہا ہے۔ مولانا دبیر نے تفسیر قمی سے جو روایت پیش کی ہے وہ اسے الزامی طور پر لا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ الزامی طور پر کسی روایت کا محض ہونا ہی کافی ہے۔ ڈھکو اپنی طرف سے

یہ بات گھڑتا ہے کہ آنحضرت نے حضرت ابوبکرؓ کی توجہ کو دوسری طرف پھیرنے کے لیے جعفر طیار کی کشتی کا معجزہ دکھایا۔

یہ بات روایات میں سرے سے موجود نہیں' سیاہ جھوٹ اسے ہی کہتے ہیں جو محرم میں بولا جائے' سیاہ لباس اس پر خود دلالت کرتا ہے۔

حضورؐ نے خود یہ کشتی کا منظر حضرت ابوبکرؓ کو نہ دکھایا تھا' حضرت ابوبکرؓ نے خود آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھے بھی منظر دکھائیں اور حضورؐ نے ان کے کہنے پر ان کو یہ عزت دی۔ اب کیا کوئی عاقل یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ حضورؐ نے آپ کی توجہ پھیرنے کے لیے آپ کو یہ منظر دکھایا۔ سچ ہے جب کسی کی دیانت ماری جائے تو عقل بھی ساتھ ہی ماری جاتی ہے۔

لا تحزن ان اللہ معنا تسلی دینے کے الفاظ ہیں۔ انہیں ڈھکو تازیانہ لگانے سے تعبیر کر رہا ہے۔ عقل ماری جانے کی اس سے بڑی شہادت کیا ہوگی؟

فمسح اللہ علیٰ عینیه فراهم فقال له رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم انت الصدیق. (تفسیر قمی ص ۲۶۶)

ترجمہ: "سو حضورؐ نے آپ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ پس آپ نے بھی انہیں دیکھا۔ اس پر حضورؐ نے انہیں کہا تو صدیق ہے' میری تصدیق کر رہا ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ کے یہ نظارہ دیکھتے ہی حضورؐ کا آپ کو کہنا **انت الصدیق** کیا کسی طرح استفہام انکاری ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو تب ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کہتے' حضور! مجھے تو یہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اس پر آپ کہتے تو کیسا صدیق ہے جو میری تصدیق نہیں کر رہا' تو صدیق نہیں ہے (معاذ اللہ) ڈھکو کا اسے استفہام انکاری تجویز کرنا بھی اس کی کھلی شہادت ہے کہ اس کی عقل ماری جا چکی ہے۔

ڈھکو آیت **ذق انک انت العزیز الکریم** کو بھی سمجھ نہیں پایا۔ اس میں اس دوزخی کی اس عزت کا بیان ہے جو اس نے دنیا میں بنا رکھی تھی کہ اے فلاں اب اپنے انکار کا مزہ چکھ۔ تو دنیا میں بڑا عزت والا بنا پھرتا تھا۔ اس میں اس کے دو زمانے اس کے سامنے کر دیے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ نظارہ کرنا اور حضورؐ کا اس کے معا بعد آپ کو صدیق کہنا ایک ہی وقت کی بات ہے۔

حضرت علیؓ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضورؐ نے آپ کو بامر الٰہی صدیق کہا تھا۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں کہتے ہیں:

ذاک امرء سماہ اللہ تعالیٰ صدیقاً علیٰ لسان محمد صلی اللہ علیه وسلم.

(مستدرک حاکم ج ۳ ص ۶۵)

ترجمہ: "وہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی زبان سے ان کا نام صدیق رکھا ہے۔"

حضرت جبریلؑ نے ان الفاظ میں حضورؐ کو اس کی خبر دی تھی۔

فقال له جبریل یصدقک ابوبکرؓ وھو الصدیق.

(طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۷ . ریاض النضرہ ج ۱ ص ۸۰)

ترجمہ: "آپ کو حضرت جبریل نے کہا ابوبکر آپ کی تصدیق کر رہے ہیں اور وہ صدیق ہیں۔"

سب مہاجرین میں صرف آپ ہی ہیں کہ کوئی دوسرا لفظ ان کے نام کا جزو بنا رہا۔ آپ کی اس فضیلت کا کہیں انکار نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابومحجن الثقفی کا یہ شعر کس نے نہ پڑھا ہوگا

وسمیت صدیقاً وکل مھاجر　　　سواک یسمی باسمه غیر منکر

(شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴)

حضرت ابوبکرؓ صدیق کا صدیق ہونا آپ کے فضائل میں سے ہے۔ اس سے کوئی عقیدہ نہیں ثابت کیا جا رہا۔ آپ اس سے پہلے حضورؐ کی تصدیق رسالت کیے ہوئے تھے۔ امام زہری (۱۲۰ھ) کہتے ہیں:

من فضائل ابی بکر انه لم یکفر باللہ ساعة.

یہ بات حضرت ابوبکرؓ کے فضائل میں سے ہے کہ آپ نے ایک لحہ کے برابر بھی کبھی اللہ کا انکار نہیں کیا۔

جب یہ روایت فضائل میں روایت ہوئی ہے تو اسے خواہ مخواہ عقائد کا موضوع بنانا ڈھکو کی ایک کھلی عامی بوکھلاہٹ ہے۔

ڈھکو رافضی کا یہ ایک عجیب موقف ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کو پتہ چلا تھا کہ آپ جادوگر ہیں ورنہ پہلے تو آپ حضور اکرمؐ کو اللہ کا رسول مانے ہوئے تھے۔ وہ قمی کے ان الفاظ کو اپنی سند کہتا ہے:

فاضمر تلک الساعة انه ساحر. (ص ۱۳۳)

رافضی نے مولانا دبیر پر یہ الفاظ نقل نہ کرنے میں خیانت کا الزام لگایا ہے۔ یہ درست نہیں۔ مخالفین کی کتابوں سے اپنی کسی بات کی نشان دہی بے شک ایک وزن رکھتی ہے لیکن پوری روایت اپنی حمایت میں جائے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ وہ خود اس کے پورے مدلول کو مان لیں تو وہ مخالف ہی کیوں رہیں۔ مولانا دبیر کا استدلال لفظ صدیق کی تفسیر قمی سے صرف نشان دہی سے ہے۔ اب اگر اس کے بعد قمی یہ لکھ دے کہ حضرت ابوبکرؓ (معاذ اللہ) حضورؐ کو جادوگر سمجھتے تھے تو قمی کے اس جھوٹ سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو صدیق نہیں کہا تھا۔ صدیق کا لفظ تو بہر حال تفسیر قمی میں حضرت ابوبکرؓ کے لیے حضورؐ کی زبان سے موجود ہے۔ پھر مولانا دبیر کا ان الفاظ کو نقل نہ کرنا خیانت کیسے ہوگیا؟ اسے خیانت کہنا خود

ڈھکو کی ایک دھوکہ دہی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مہمانی کا انکار

غار ثور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے کا انتظام سب حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کے ہی سپرد تھا۔ حضورؐ مع حضرت ابوبکرؓ کے غار میں پہنچ چکے تھے اور قریش ابھی مکہ میں حضورؐ کی تلاش میں ہی لگے تھے۔ حضرت علیؓ وہیں بستر رسالت پر لیٹے تھے۔ رافضی سمجھتا ہے کہ وہ وہیں لیٹے لیٹے حضورؐ کے لیے غار میں آپ کے لیے طعام رسانی کرتے تھے۔

رافضی لکھتا ہے:

''عامر بن فہیرہ کے ذریعہ حضرت علیؓ نے (دونوں کی) طعام رسانی کا انتظام فرمایا تھا۔'' (ص ۱۳۳)

اگر یہ بات صحیح ہو تو کیا اس سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت علیؓ کو سفر ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ کی معیت پر پورا اعتماد تھا۔ تبھی تو آپ ان دونوں کے لیے کھانا بھجواتے تھے۔

رافضی کا یہ کہنا کہ غار میں طعام رسانی کی خدمت حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کے سپرد تھی' جھوٹ ہے' بالکل غلط ہے۔

مولانا شبلیؒ سیرت النبی میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے' شب کو غار میں ساتھ ہوتے۔ صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرتؐ سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اس طرح تین راتیں غار میں گزریں۔ صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا اور پھر آنحضرتؐ کی تلاش میں نکلے۔'' (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۷۲)

رافضی کا یہ دعویٰ کہ حضرت علیؓ مکہ میں حضورؐ کے بستر پر لیٹے لیٹے حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو غار میں کھانا بھجواتے' ایک ایسی بوکھلاہٹ ہے جو اس پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے کہ یہ ڈھکو علم کی بات تو ایک طرف رہی مولانا دبیر کے مقابلہ میں وہ عام عقل کی بازی بھی پوری طرح ہار چکا ہے۔ اور پھر بڑے طمطراق سے لکھتا ہے:

جھوٹ کے ہوتے نہیں پیر۔ ای دوست

آنحضرتؐ کو کندھے پر اٹھانے کی سعادت

ڈھکو رافضی نے ہجرت کی رات حضرت ابوبکرؓ کے حضورؐ کو اپنے کندھے پر اٹھانے کا انکار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے' ''یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔'' (ص ۱۳۴) ہم کہتے ہیں کہ سنی شیعہ دونوں کا اتفاق ہے کہ ایسا ہوا۔ یہ صرف اس ڈھکو کا انکار ہے۔

حتی حفیت رجلاہ فلما راھما ابوبکرؓ قد حفیتا حملہ علی کاھلہ وجعل یشتد بہ حتی اتی فم الغار. (سیرت حلبیہ ۲ ص ۳۶)

ترجمہ: ''یہاں تک کہ آپ کے دونوں پاؤں گھسنے سے سوج گئے۔ ابوبکرؓ نے دیکھا کہ یہ گھس گئے ہیں تو انہوں نے آپ کو اپنے کندھے پر اٹھالیا اور بڑی تیزی سے غار کے منہ تک پہنچے۔''

طبری کی روایت میں پاؤں کا زخمی ہونا بھی ملتا ہے تو اس سے حضرت ابوبکرؓ کے انہیں اٹھانے کی نفی نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے پاؤں مبارک کا یہ حال دیکھ کر ہی انہوں نے آپ کو اٹھایا ہو۔ ایسے کھلے تاریخی واقعہ کا انکار وہی کر سکتا ہے جو علمی شرافت کے کبھی قریب سے بھی نہ گزرا ہو۔

شیعہ کی کتاب حملہ حیدری میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

چو رفتند چندیں بد امان دشت	قدوم فلک سائے مجروح گشت
ابوبکرؓ آنکہ بدوشش گرفت	ولے ایں حدیث است جائے شگفت
کہ درکس چناں قوت آمد پدید	کہ بار نبوت تو اند کشید

(حملہ حیدری ص ۲۸ طہران)

ترجمہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ صحرا کے دامن میں چلے تو آپ کا (فلک پر چلنے والا) فلک سا قدم زخمی ہوگیا۔ ابوبکرؓ نے پھر آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ لیکن یہ حدیث تعجب کا موجب ہے کہ (کوئی نبی کو اٹھا نہ سکے گا) کیونکہ حضرت ابوبکرؓ میں ایسی طاقت آگئی کہ آپ نے نبوت کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔''

ڈھکو کو اتنا معلوم نہیں کہ گدھا سوار کو خود نہیں اٹھاتا' سوار خود اس پر پہنچتا ہے۔ یہاں حضورؐ کا رفیق ہجرت خود اپنے آقا کو اپنے کندھے پر بٹھا رہا ہے اور آپ کو اٹھائے جلدی جلدی غار کی طرف جا رہا ہے۔ یہ سب حضورؐ کی محبت اور آپ کے لیے جانفشانی کے جذبہ سے ہوا۔ معلوم نہیں اس ڈھکو کو گدھا کیوں بار بار یاد آتا ہے۔ اگر اس نے اس کو خود اٹھایا تو یہ اس کی

اپنی غلطی ہوگی۔ مولانا دبیر کی اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کے بستر پر لیٹنے سے ڈھکو کی عقل حیرت میں

ڈھکو نے اس چھبیسویں آیت کی بحث میں آخری سرخی یہ قائم کی ہے ''شب ہجرت حضرت امیر کا محیر العقول کارنامہ'' اور دعویٰ کیا ہے کہ اس سے کئی عقلیں حیرت میں گم ہوئیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس واقعہ میں کوئی حیرت کی بات ہو۔ جب حضورؐ نے انہیں لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کے لیے وہاں رکھا تھا تو اسی سے جہاں کافروں کو یہ مغالطہ دینا تھا کہ حضورؐ اپنے گھر میں ہی ہیں' وہاں یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس سے حضرت علیؓ کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ وہ اس بستر سے اٹھ کر لوگوں کو ان کی امانتیں دینے ضرور جائیں گے۔ کچھ بھی اندیشہ ہوتا کہ شاید کفار آپ کو شہید کر دیں تو آپ لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کی ذمہ داری کسی اور پر ڈالتے۔

اور اگر واقعی حضرت علیؓ کو یہ خطرہ تھا کہ شاید آپ حضورؐ کی جگہ شہید کر دیے جائیں گے تو اس سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ حضورؐ کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ گزری ہوگی کہ علیؓ میرے بعد میرے جانشین ہوں گے۔ کیونکہ جانشین کو ہر ایسے خطرے سے بچایا جاتا ہے۔ کسی بادشاہ اور اس کے ولی عہد کو کبھی ایک جہاز میں بیٹھنے نہیں دیتے۔ جس کو بنانا تھا کیا اسے اس رات ساتھ لے کر نہیں چلے اور کیا قرآن نے بھی اسے ثانی اثنین میں نہیں رکھا۔ آپ ثانی نہ سہی دو میں سے دوسرا تو ضرور تھے۔

افسوس کہ رافضی نے حضرت علیؓ کے اس مقام ولایت میں قرآن کی یہ آیت پیش کر دی اور کہا یہ اس عظیم فدا کاری پر حضرت علیؓ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

ومن النّاس من يشرى نفسه ابتغاء مرضات اللّٰه . واللّٰه رؤف بالعباد.

(پ ۲ البقرہ ۲۰۷)

ترجمہ: ''اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو بیچتا ہے اپنی جان اللہ کی رضا جوئی میں اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔''

ڈھکو رافضی اس بات کا مدعی ہے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے حق میں ان کی اس رات کی فدا کاری پر نازل ہوئی تھی۔ ڈھکو نے اس پر آٹھ حوالے دیے ہیں۔ ان میں کسی میں نہیں کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے اس رات بستر رسالت پر سونے کی فدا کاری پر نازل ہوئی تھی۔ ان کتابوں میں یہ بات تو ملتی ہے کہ حضرت علیؓ اس رات حضورؐ کے بستر مبارک پر سوئے تھے لیکن یہ کسی میں نہیں کہ یہ آیت خاص حضرت علیؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ڈھکو نے یہ سیاہ جھوٹ بولا ہے کہ اس نے محض نقل واقعہ کو آیت کا شان نزول بنا لیا ہے۔ مثلاً سیرت النبی میں اس واقعہ کے صرف یہ الفاظ ہیں:

''حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے۔ لیکن فاتح خیبر کے لیے یہ قتل گاہ فرش گل تھا۔''

اس نقل واقعہ کو وہ تحریفاً اس آیت کا شان نزول بتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ آیت حضرت صہیب رومیؓ کے بارے میں اتری تھی۔ صہیب رومیؓ ہجرت کے ارادہ سے حضورؐ کے پاس آ رہے تھے کہ رستہ میں آپ کو مشرکین نے گھیر لیا۔ حضرت صہیبؓ نے انہیں اپنا گھر اور اپنا تمام مال دے کر ان سے مدینہ جانے کی اجازت لی۔ اس پر یہ آیت ان جیسے مخلصین کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں:

''صہیب رومی آپ کی خدمت میں چلے گئے۔ اس پر یہ آیت مخلصین کی تعریف میں نازل ہوئی۔'' (تفسیر عثمانی ص ۴۰)

شان نزول میں اختلاف

علامہ ابو حیان اندلسی (۶۵۴ھ) لکھتے ہیں:

فقيل في الزبير والمقداد بعثهما رسول الله صلى الله عليه وسلم الى مكه ليحيطا خبيباً من خشبته و قيل في صهيب الرومي ...... وقيل في علي ...... وقال الحسنؓ نزلت في المسلم يلقى الكافر فيقول قل لا اله الا الله فلا يقولها ...... ويقول والله لا شرين فيقاتل حتى يقتل وذكر المفسرون غير هذا وقصصاً طويلا في اخبار هولاء المعينين الذين قيل نزلت فيهم الآية . (ج ۲ ص ۱۱۸)

ترجمہ: ''کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کے حق میں اتری۔ انہیں حضورؐ نے مکہ بھیجا کہ کسی طرح تکالیف میں خبیبؓ کے گرد آئیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت صہیبؓ کے حق میں اتری۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں اتری اور حضرت امام حسنؓ بصری نے کہا کہ یہ ہر اس مسلمان کے حق میں ہے جو کسی کافر کو ملے اسے کہے کہ تو لا الہ الا اللہ کہہ اور وہ یہ نہ کہے اور وہ کہے میں نے جان کی بازی لگا دی ہے اور وہ اس سے لڑ پڑتا ہے یہاں تک کہ مارا جائے۔ مفسرین نے یہاں ان حضرات کے اور کئی واقعات بھی ذکر کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ آیت ان سب کے بارے میں اتری ہے۔''

ان اختلافات کے ہوتے ہوئے ڈھکو رافضی کا اس آیت کو اپنے ولایت علی کے عقیدہ کی نص بتلانا کسی صاحب علم کا کام نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت کسی خاص معین شخص کے حق میں نازل نہیں ہوئی' یہ ان سب حضرات کو شامل

ہے جن کے نام اوپر گزرے ہیں۔

اس آیت سے دو آیت پہلے یہ آیت مذکور ہے:

ومن النّاس من یعجبک قولہ فی الحیوٰۃ الدنیا ویشھد اللّٰہ علیٰ ما فی قلبہ وھو الد الخصام. (پ ۲ البقرہ ۲۰۷)

ترجمہ: ''اور کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو اچھی لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کی بات پر حاضر و ناظر بتلاتا ہو اور وہ ہے سخت جھگڑنے والا۔''

اب اس کے مقابل وہ ہے جو اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ ایسے لوگوں کے حال پر بہت مہربان ہے۔''

یہ دونوں آیتیں عام ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان دونوں کے عموم میں دونوں درجوں کے تمام لوگ جن کے بارے میں اس آیت کا اترنا بتلایا گیا ہے آ جاتے ہیں۔ مفسر مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں:

والذی ینبغی ان یقال انہ تعالیٰ لما ذکر ومن النّاس من یعجبک قولہ کان عاماً فی المنافق الذی یبدئ خلاف ما اضمرنا سب ان یذکر قسیمہ عاماً من یبذل نفسہ فی طاعۃ اللّٰہ من ای صعب کان ...... وتندرج تلک الاقاویل التی فی الآیتین تحت عموم ھاتین الآیتین. (البحر المحیط ج ۲ ص ۱۱۸)

ترجمہ: ''یہاں یہ بات کہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کا ذکر کیا جن کی بات آپ کو بظاہر اچھی لگے اور یہ بات ہر منافق کے بارے میں عام ہے جو اس چیز کو ظاہر کرتا ہے' جو اس کے خلاف ہے جسے وہ دل میں رکھے ہے تو مناسب تھا کہ اس کے مقابل جو بات کہی جائے وہ بھی عام رہے ہر اس شخص کے لیے جو اپنے آپ کو اللہ کی طاعت میں لگائے' وہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو اور جو اقوال اس میں ملتے ہیں وہ سب ان دونوں آیتوں کے تحت جگہ پاتے ہیں۔''

اور اگر اس آیت کو کسی ایک مورد پر ہی ٹھہرانا ہے تو پھر ادھر چلیے جدھر اکثر مفسرین گئے ہیں۔

پانچویں صدی کے مقتدر مفسر علامہ بغوی (۵۱۶ھ) لکھتے ہیں:

قال اکثر المفسرین نزلت فی صھیب بن سنان الرومی. (معالم التنزیل ج ۲ ص ۱۳۲)

ترجمہ: ''اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت صہیب بن سنان الرومی کے بارے میں اتری ہے۔''

اب چھٹی صدی کے مفسر امام رازی (۶۰۶ھ) سے بھی سنیے:

واکثر الروایات ان الآیۃ نزلت فی صھیب الرومی ...... وقال الامامیۃ و بعض منا انھا نزلت فی علی کرم اللّٰہ تعالیٰ وجھہ. (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۹۲)

ترجمہ: ''اکثر روایات یہی کہہ رہی ہیں کہ یہ روایت حضرت صہیب رومی کے بارے میں اتری اور امامی لوگ اور بعض ہمارے بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت علیؓ کے بارے میں اتری۔

یہ اختلاف خود بتا رہا ہے کہ اسے کسی ایک فرد پر نص نہیں کہہ سکتے۔''

اب آٹھویں صدی کے مفسر جلیل حافظ ابن کثیرؒ سے بھی سن لیں (۷۷۴ھ) سن لیں:

قال ابن عباسؓ و انس و سعید بن المسیب و ابو عثمانؓ النھدی و عکرمہ و جماعۃ نزلت فی صھیب بن سنان الرومی ...... واما الاکثرون فحملوا ذلک علی انھا نزلت فی کل مجاھد فی سبیل اللّٰہ. (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۴۷)

ترجمہ: ''صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کہہ رہی ہے کہ یہ حضرت صہیب کے بارے میں اتری ہے اور اکثریت یہ کہتی ہے کہ یہ آیت ہر مجاہد فی سبیل اللہ کے بارے میں وارد ہے۔''

اب آپ ہی انصاف کریں' ڈھگو رافضی ولایت علی کو قرآن کریم سے ثابت کرنے میں کس قابل رحم حالت میں ناکام ہے۔ وہ حضرت علیؓ کو اس آیت کے ضمن میں لاتا تو ہمیں چنداں اعتراض نہ تھا لیکن اس کا یہ کہنا کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے حق ولایت میں اتری کس قدر کھلا جھوٹ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) بھی ضمناً حضرت علیؓ کو اس آیت کے عموم میں لاتے ہیں مگر ستم ظریفی ہے کہ یہ ڈھگو ان کے حوالے سے بھی کہہ رہا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ شیخ عبدالحق کے یہ الفاظ ملاحظہ کریں:

''اہل سیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس ضمن میں نازل ہوئی۔ وہ اس ضمن میں حضرت علیؓ کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں۔ ان شعروں میں حضورؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی رفاقت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ بھی جاں نثاری اور حفاظت کے موجب ہیں۔ سو یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کی شان کو بھی شامل اتری۔'' (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۹۳)

اور حضرت صہیب رومی کے طفیل بے شک یہ آیت حضرت بلالؓ' حضرت عمارؓ اور دیگر کئی فقرائے مہاجرین کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ کہنا کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے اس رات بستر رسالت پر سونے کے بارے میں اتری تھی' ایک سیاہ جھوٹ ہے جو محرم میں ہی سنا جا سکتا ہے۔

مولانا دبیر نے یہ لکھا ہے:

"شیعہ ایڑی چوٹی کا زور ماریں تو اس صراحت اور وضاحت سے وہ ولایت علیؓ تو کیا قرآن سے حضرت علی مرتضیٰؓ کا صاحب رسول ہونا بھی ثابت نہیں کر سکتے۔" (آفتاب ہدایت ص ۷۹)

اس کے جواب میں ڈھکو نے یہ جھوٹ بولا ہے کہ سورۃ بقرہ کی یہ آیت ۲۰۷ حضرت علیؓ کی شان ولایت کے بارے میں اتری تھی۔ افسوس کہ اس وقت ڈھکو کو یہ اصول یاد نہ رہا **لا دلالۃ للعام علی الخاص**۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ بات اس کے علم ہی میں نہ ہو۔

رافضی کا دل محسوس کر رہا تھا کہ اتنے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس سے کچھ نہیں بن سکا۔ سوچتے ہوئے کھسیانی بلی کھمبا نوچے اس نے ایک یہ بات کہہ دی کہ شاید اس سے کچھ کام بن جائے۔

باتفاق مفسرین آیت مباہلہ میں وانفسنا وانفسکم سے مراد حضرت علیؓ ہی ہیں۔ (ص ۱۳۵)

الجواب

نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب وہ حضورؐ کی تلقین سے حق قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اپنی بات پر عناداً ڈٹے رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بحکم الٰہی مباہلہ کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول نہ کیا اور وہ واپس نجران چل دیے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ مباہلہ عملاً نہیں ہوا۔ مباہلہ دو فریقوں کا مل کر اللہ کے حضور ﷺ بددعا کرنے کا نام ہے کہ جھوٹے پر خدا تعالیٰ کی لعنت برسے۔ قرآن کریم میں سورۃ آل عمران آیت ۶۱ میں دعوت مباہلہ اس عنوان سے دی گئی ہے کہ دونوں فریق اپنے بچوں اور اپنی بیویوں اور اپنے آپ کو لے کر اس بددعا کے لیے میدان میں آئیں۔ اگر وہ آپ کی دعوت مباہلہ قبول کرتے تو بے شک حضورؐ قرآن پر عمل کرتے۔ ازواج مطہرات، اپنی اولاد اور اپنے قریبی ساتھیوں کو ساتھ لے کر نکلتے۔ انسان کو ان سب میں سب سے زیادہ عزیز اولاد ہوتی ہے۔ حضور اکرمؐ ان کو بتلانے کے لیے کہ میں اولاد کو لے کر سامنے آ گیا ہوں۔ اگر تم دعوت مباہلہ قبول کرو تو آپ اپنی ازواج اور قریبی ساتھیوں کو لانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ آپ اپنی اولاد کو بطور نمونہ لے کر گھر سے باہر نکلے۔ آپ مباہلہ کے لیے نکلتے تو خدا کے حکم کے مطابق ازواج کو ضرور ساتھ لے کر نکلتے۔ جب مباہلہ ہوا ہی نہیں تو یہ بات ہرگز نہیں اٹھائی جا سکتی کہ آپ نے ازواج مطہرات کو ساتھ کیوں نہ لیا۔ شیخ الاسلام اس وفد نجران کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ تجویز پاس کر کے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حضرت حسنؓ حسینؓ فاطمہؓ اور علیؓ کو ساتھ لیے باہر تشریف لا رہے تھے یہ چار جن کو آپ لے کر باہر نکلے یہ سب حضورؐ کی اولاد تھے۔ حضرت فاطمہؓ آپ کی اولاد میں سے تھیں انہیں نساءنا کے تحت کسی طرح نہیں لایا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کو بھی نفس

رسول نہیں کہا جا سکتا اور نہ ان کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے نہ ہو سکتا تھا۔"

حاصل اینکہ ڈھکو رافضی مولانا دبیرؒ کے چھبیسویں آیت سے کیے گئے استدلال کو کسی جہت سے بھی توڑ نہیں سکا اور اس کا اس میں یہ بولا جھوٹ اس کی شکست کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو ستائیسویں آیت میں لے چلیں

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا. (پ ۱۸ النور ۵۵)

ترجمہ: "وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں کہ ان کو حاکم کرے گا زمین میں جیسا کہ وہ پہلے بھی حاکم کرتا رہا ہے اگلوں کو اور جما دے گا ان کے لیے دین ان کا جو پسند کیا اس نے ان کے واسطے اور ان کا ڈر ان کے لیے وہ امن میں بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے اور نہ شریک کریں گے کسی کو میرا اور جو اس کے بعد اس کا انکار کرے وہ لوگ فاسق ہوں گے۔"

حضورؐ کے عہد مبارک میں جو علاقے داخل قلمرو اسلامی ہوئے ان کی حکومت حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ سے خلافۃً ملی۔ روم اور فارس کی حکومتیں حضرت عمرؓ کو ان کافروں سے ملیں جن پر حضرت عمرؓ نے فتح پائی۔ اس کی تفصیلات ہماری کتاب خلفاء راشدین کی جلد دوم میں دیکھئے۔ پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو ممالک داخل قلمرو اسلامی ہوئے ان کی تفصیل بھی آپ اس میں حضرت عثمانؓ کی فتوحات میں دیکھیں۔

سو جو ممالک حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے فتح کیے وہ ان حضرات نے کافروں سے قبضہ میں لیے مگر انہوں نے ان کو بھی اسی ارض اسلام سے جوڑا جس کی حکومت حضرت ابوبکرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافۃً ملی تھی اور اس کل قلمرو اسلامی کا دارالحکومت مدینہ منورہ ہی رہا جو حضورؐ کا دار الھجرت اور دارالحکومت تھا۔ لیکن اب بوجہ خلافت نبوی اس کا نام دار الخلافہ ہو گیا تھا۔ یہ قلمرو اسلامی بڑھتی رہی اور ہندوستان، افغانستان، سپین، ترکی اور کئی دوسرے ممالک میں بھی اسلامی حکومتیں بنیں اور جب تک امۃ مسلمہ میں خلافت قائم رہی یہ کل فتوحات اسلامی اس رقبہ اسلامی کے ساتھ جمع رہیں جس کی حکومت حضرت ابوبکرؓ نے حضور اکرمؐ سے خلافۃً پائی تھی۔

سو اس خلافت سے مراد خلافت نبوت ہی لی جائے گی گو اس کے بعد بہت سے ممالک اور ریاستیں بدلاً عن الکفار کی راہ سے داخل قلمرو اسلامی ہوتی رہیں۔ نبی سے خلافت پانے اور کافروں سے حکومتیں لینے میں کوئی نسبت تباین

نہیں جب کافروں سے لیے گئے ممالک میں بھی اسی نبوی خطہ ارضی سے جوڑے گئے اور اس کے ماتحت قرار دیے گئے تو اعلیٰ کی پیروی میں کل سلطنت اسلامی خلافت نبوی شمار ہوگی۔ اس سباق کی روشنی میں ڈھکو رافضی کی مندرجہ ذیل بات میں کوئی وزن نہیں رہ جاتا۔

''یہاں خلافت سے اسلامی اصطلاحی خلافت مراد نہیں بلکہ لغوی معنٰی میں خلافت مراد ہے یعنی کسی فرد یا جماعت کا ان کے مُلک و مِلک پر تسلط ان کے دیار و امصار پر غلبہ۔'' (ص ۱۳۷)

ڈھکو رافضی نے یہاں خلافت کو لغوی معنٰی دینے میں گو بڑی غلطی کی ہے لیکن اس نے یہاں یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اس آیت سے مراد ان خلفاء ثلٰثہ کی حکومتیں ہی ہیں جو انہوں نے کافروں سے اپنے قبضہ میں لیں۔ رہی یہ پہلی بات کہ یہاں خلافت سے مراد خلافتِ نبوت نہیں دوسروں کے دیار و امصار پر تسلط و غلبہ مراد ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ ایسا ہوتا تو آیت مذکورہ میں خلافت پانے والوں کی صفات ذکر نہ کی جاتیں کہ وہ ایمان لائے ہوں گے' نیک اعمال کرتے ہوں گے۔ محض قبضہ ممالک کے لیے قابضین پر نیک اعمال کی شرط نہیں لگائی جاتی۔ رافضی یہاں اس قدر بوکھلاہٹ کا شکار ہے کہ مولانا دبیر کی بات کو وہ کسی طرح توڑ نہیں سکا۔

یہ وعدہ کن لوگوں سے کیا گیا ہے؟

۱۔ یہ وعدہ اس امت' دیا گیا ہے جو حضور کی دعوت سے وجود میں آئی۔ جب کسی قوم کے بارے میں کہا جائے کہ ان کی اپنی حکومت ہے تو یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان میں سے ایک ایک فرد حاکم ہے۔ عملاً ایک وقت میں ایک ہی حاکم ہوتا ہے اور اس کے تحت ان کے سارے افراد اہل حکومت شمار ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی اپنی حکومت ہے۔

۲۔ اسی طرح یہ بھی نہیں سمجھا جاتا کہ ان میں ایک حکمران ہی ہمیشہ کے لیے رہے گا۔ جب ان کی حکومت قائم رہے تو عملاً حکومت کرنے والے بھی اپنے اپنے وقت میں اقتدار پر آتے رہیں گے اور یہ پورا نظام عمل اور تسلسل ایک خلافت ہی سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ رافضی مسئلہ خلافت میں اس آیت سے اتنے پریشان ہیں کہ وہ تنکے کے سہارے غرق ہونے سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کا وہ تنکا یہ ہے کہ یہ وعدہ ان لوگوں سے نہیں جو عملاً حضورؐ کے عہد کے تھے اور ان میں قرآن اترا تھا۔ یہ وعدہ صرف حضورؐ سے تھا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حجاز نجد' یمن اور بحرین کی حکومت دے کر اپنا خلیفہ بنا دیا تھا۔ ڈھکو لکھتا ہے:

''خدا نے اپنے پیغمبر اور صحابہؓ سے جو وعدہ کیا تھا وہ آنحضرتؐ کی حیات میں اللہ نے پورا کر دیا تھا

...... اور مسلمان مرفہ الحال اور فارغ البال ہو گئے تھے۔'' (ص ۱۴۰)

جھوٹ اور خیانت کی حد ہوگئی ہے۔ حضور اکرمؐ اسامہ بن زیدؓ کی مہم روانہ فرمانے والے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اسے روانہ فرمایا اور یہ ڈھکو کہہ رہا ہے کہ مسلمان (حضورؐ کے عہد کی فتوحات سے ہی) مرفہ الحال اور فارغ البال ہو گئے تھے اب کسی سیاسی مہم کی ضرورت نہ رہی تھی۔

افسوس کہ ڈھکو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر یہ وعدہ صرف حضورؐ کے عہد تک کے لیے ہو تو اس میں وعدہ صرف حضورؐ سے کیا جاتا' امت سے نہ کیا جاتا۔ آیت میں وعدہ صحابہؓ سے کیا گیا ہے۔

وعد اللّٰہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض.

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے خلافت کا وعدہ ان سے کیا ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔''

پھر جب حضورؐ نے یہ بھی فرمادیا کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی' کیا اس میں صراحت نہیں کہ یہ خلافت صحابہ کرامؓ میں ہوگی۔ حضورؐ کا عہد حکومت اس میں مراد نہیں ہے۔ یہ تیس سال آپ کے بعد کا زمانہ ہے۔

اب ان کی تیسری تاویل ملاحظہ ہو۔ اسے وہ امام زین العابدین اور امام محمد باقر سے نقل کرتے ہیں:

''انہوں نے اس آیت کا مصداق امام مہدی اور ان کے اصحاب کو قرار دیا ہے۔'' (ص ۱۴۳)

یہ تاویل اس آیت کے شانِ نزول کے سراسر خلاف ہے۔ یہ آیت حضورؐ کے عہد کے لوگوں (صحابہ کرامؓ) کو تسلی دینے کے لیے اتری تھی۔ نہ یہ کہ یہ بشارت صرف اس دور کے لیے تھی جب قیامت کی علامات کھلے طور پر سامنے آ جائیں۔ ڈھکو رافضی خود لکھتا ہے:

''یہ آیت مبارکہ اسی وقت نازل ہوئی جب صحابہ کرامؓ نے (ہر وقت کی جنگ و جدل اور خوف و ہراس سے دل برداشتہ ہو کر) بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ **یا رسول اللّٰہ ! ابدا الدھر نحن خائفون ما اتی علینا یوم نضع السلاح** اس وقت خدا نے یہ آیت نازل فرمائی (کذا فی التفسیر الکشاف ج ۳ ص ۸۲)'' (تجلیات صداقت ص ۱۳۹)

قارئین کرام مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ اس ستائیسویں آیت پر خود غور فرمائیں اور مولانا دبیرؒ کی قوت استدلال کو دیکھیں اور اس کے جواب میں روافض کے ان تینوں مواقف کا جائزہ لیں۔ آپ کا دل و دماغ گواہی دے گا کہ تنکے کے سہارے جینے والا چاروں شانے چت بری طرح ڈوب چکا ہے۔

اس خلافت سے مراد خلافت کلی ہے یا جزئی؟

ڈھکو نے مولانا دبیرؒ کے مقابلے میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے، ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ خلافت کلی اضافی ہے۔ یعنی اس دور میں کفر کی جتنی بھی بڑی بڑی طاقتیں تھیں سب خلافت راشدہ کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں۔ قیصر و کسریٰ اور فراعنہ مصر سب اپنی بازی ہار چکے تھے۔ جہاں بھی تمدن روشن تھا سب متمدن علاقے مسلمانوں کا سکہ مان چکے تھے۔ اب اللہ کے نام کو کوئی برسر عام چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ نہ کسی علاقے میں بنی نوع انسان کسی ظلم میں گھرے ہوئے تھے۔ اسلام کی آواز صرف اس لیے ہے کہ کلمہ اسلام اونچا رہے' کوئی اسے چیلنج نہ کرے اور اللہ کے بندوں سے ظلم کی گرفت دور کی جا سکے۔ سب کو مسلمان کرنا ضروری نہیں' کسی کو جبراً مسلمان نہیں کیا جا سکتا **لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔** راشدین اسی رشد سے خلفاء راشدین مانے گئے سو اس آیت خلافت میں خلافت کلی اضافی ہے۔

یہ کہنا کہ خلافت کلی امام مہدی کے دور میں قائم ہو گی درست نہیں کیونکہ حضورؐ کی وفات سے لے کر امام مہدی کے ظہور تک جتنے لوگ بھی ہوئے حضرت مہدیؒ کی خلافت حضورؐ کی اس تمام امت دعوت کو تو محیط نہ ہو سکی جو امام مہدی سے پہلے فوت ہو گئے وہ مہدی کے اثر خلافت سے محروم ہی گئے۔ سو ان کے پیش نظر امام مہدی کی خلافت کو خلافت کلی نہیں مانا جا سکتا۔ وہ خلافت زمین کی نسبت سے تو خلافت کلی ہو سکتی ہے لیکن حضورؐ کی امت کی نسبت سے اسے خلافت کلی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

خلافت کلی یہ خلافت راشدہ ہی ہے جو حضورؐ کی تمام امت کو محیط ہوئی اور آج کے مسلمان ان تمام مسلمانوں کے سیاسی وارث ہیں جو پہلی چودہ صدیوں میں گزرے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ اس آیت خلافت میں خلافت کلی اضافی مراد ہے اور یہاں اضافی ہم اضافہ سے نہیں نسبت کے معنیٰ میں لے رہے ہیں۔

پہلے استخلاف سے مراد کیا ہے؟

آیت خلافت میں یہ جو تشبیہ ہے **کما استخلف الذین من قبلھم** اس کی تفصیل میں ڈھکو نے قرآن کریم سے دس آیات پیش کی ہیں اور ان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں خلافت سے مراد کافروں کو نیست و نابود کر کے ان کے املاک و اموال کا مسلمانوں کو وارث اور جانشین بنانا ہے۔ سو خلافت یہاں قبضہ اور تسلط کے معنیٰ میں ہے۔ خلافت نبوت مراد نہیں ہے۔

ڈھکو لکھتا ہے:

> ''خدا نے مسلمانوں کو تسلی دی کہ جس طرح پہلے میں پہلے کافروں کو نیست و نابود کر کے ان کے املاک و اموال کا وارث و جانشین مسلمانوں کو بناتا رہا اسی طرح اب بھی تمہارے دشمنوں کو مغلوب و مقہور کر کے تمہیں ان کا وارث بناؤں گا۔'' (ص ۱۴۱)

اہل سنت کو اس خلافت لغوی سے انکار نہیں' خلافت کے معنی بے شک بہ طریق بدل زمین کا قبضہ اور تسلط ہی ہیں لیکن جب یہاں خلافت پانے والوں میں کچھ شرطیں لگائی گئیں تو اب یہ محض خلافت لغوی نہ رہی۔ یہی خلافت نبوی قرار پائی۔ سو یہ حقیقت ہے کہ خلافت نبوی میں خلافت لغوی کی نفی نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی خلافت روحانی مراد نہیں ہے۔ اس میں فی الارض کے صریح الفاظ موجود ہیں۔ سو اسے خلافت ارضی کہنے سے بھی چارہ نہیں ہے۔ استاذنا المکرم مولانا محمد ادریس کاندھلوی (۱۳۹۴ھ) لکھتے ہیں:

> ''استخلاف کے معنٰی خلیفہ بنانے کے ہیں جس سے عرف عام میں بادشاہ بنانا مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ **یا داؤد انا جعلنک خلیفۃ فی الارض** میں لفظ خلیفہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہ اور فرمانروا بنانا مراد ہے اور حدیث میں ہے **سیکون فی آخر الزمان خلیفہ یحثوا المال حثیا** (الحدیث) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پرنور سے یہ وعدہ کیا کہ آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ کو زمین کا بادشاہ بناؤں گا۔'' (معارف القرآن ج ۵ ص ۱۴۷)

صحابہ کرامؓ سے بے شک خلافت ارضی کا وعدہ کیا گیا لیکن ساتھ ہی انہیں **ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم** کی بھی بشارت دی گئی کہ یہ خلافت ارضی ساتھ ہی خلافت نبوی بھی ہو گی۔ فقط خلافت لغوی مراد ہوتی تو آیت کے آخر میں اس کے انکار کو کفر اور فسق نہ ٹھہرایا جاتا۔ **ومن کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون۔**

ڈھکو نے ص ۱۳۹ کی آخری سطر میں حافظ ابن کثیر کا نام بھی لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے قارئین کو ابن کثیر کی رائے سے بھی متمتع کریں۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> **ھذا وعد من اللہ تعالٰی لرسولہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ بانہ سیجعل امتہ خلفاء الارض ای ائمۃ النّاس والولاۃ علیھم و بھم تصلح البلاد و تخضع لھم العباد ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امنا.** (ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰۹)

ترجمہ: ''یہ اللہ کی طرف سے اس کے رسول کے ساتھ وعدہ ہے کہ وہ اس کی امت پر خلفاء بنائے گا یعنی وہ لوگوں کے قائدین اور والی ہوں گے' ان سے ممالک اصلاح پائیں گے اور سب لوگ ان کے مطیع ہوں گے اور اللہ ان کے ڈر کو امن سے بدل دے گا۔''

امام فخر الدین الرازی (۶۰۶ھ) کی رائے بھی ملاحظہ کیجئے۔ ڈھکو نے **لا تحزن** کی بحث میں ان کا حوالہ بھی دیا ہے:

ومعلوم ان المراد بهٰذا الوعد بعد الرسول هٰؤلاء لان استخلاف غيره لا يكون الا بعده و معلوم انه لا نبی بعده لانّه خاتم الانبياء فان المراد بهٰذا الاستخلاف طريقة الامامة و معلوم ان بعد الرسول الاستخلاف الذی هذا وصفه انما كان فی ايام ابی بكر و عمر و عثمانؓ لان فی ايامهم كانت الفتوح العظيمة و حصل التمكين وظهور الدين والامن. (تفسير كبير ج ۲۴ ص ۲۲)

ترجمہ: ''اور یہ بات واضح ہے کہ اس وعدہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہی حضرات مراد ہیں کیونکہ دوسروں کی خلافت آپ کے بعد ہی ہوسکتی ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ آپ خاتم الانبیاء ٹھہرے۔ سو اس استخلاف میں حضورؐ کے بعد آپ کی جانشینی ہی ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ حضورؐ کے بعد خلافت کے جو اوصاف ذکر ہوئے وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار میں ہی سامنے آئے۔ انہی کے ایام میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں اور دین کو جماؤ حاصل ہوا' دین نے غلبہ اور عوام نے امن پایا۔''

ڈھکو رافضی کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کے عنوان اختیار کرنے سے یہ وعدہ خلافت کن لوگوں سے کیا گیا تھا۔ یا یہ کہ خلافت سے مراد خلافت کلی ہے یا جزئی۔ اور یہ کہ یہ وعدہ کب پورا ہوا۔ وہ قارئین کرام کو کسی مغالطہ میں نہیں کھینچ سکتا۔ خلافت امت دعوت میں چلے یا امت اجابت میں۔ خلافت قبضہ و تسلط پانے کے معنی میں ہو یا خلافت نبوت کے معنی میں۔ ان تمام صورتوں میں کوئی نسبت تبائن نہیں۔ ہم اہل سنت کے عہد متاخر کے دو اکابر مفسرین کا فیصلہ بدون فاصلہ نقل کرتے ہیں۔ مفتی بغداد حضرت علامہ محمود آلوسی (۱۲۹۱ھ) لکھتے ہیں:

وعن ابن عباسؓ و مجاهد عامه فی امة محمد صلی اللّٰه عليه وسلم واطلقا الامة وهی تطلق علیٰ امة الاجابة وعلیٰ امة الدعوة لكن الاغلب فی الاستعمال الاطلاق الاول فلا تغفل واذا كانت من بيانيه فالمعنی ان وعد اللّٰه الذين امنوا الذين انتم (ليستخلفنّهم فی الارض) ای ليجعلهم خلفاء متصرفين فيها تصرف الملوک فی ممالكهم او خلفاء من الذين كانوا يخافونهم من الكفرة بان ينصرهم عليهم يورثهم ارضهم والمراد بالارض علیٰ ما قيل جزيرة العرب وقيل ماراه عليه الصلوٰة والسلام من مشارق الارض ومغاربها ففی الصحيح زويت لی الارض فرايت مشارقها و مغاربها وسيبلغ ملک امتی ما زوی لی منها.

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ اور امام مجاہد سے مروی ہے کہ یہ آیت عام ہے امت میں۔ اور دونوں نے امت کو مطلق رکھا ہے۔ امت کا اطلاق امت اجابت اور امت دعوت دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس کا زیادہ استعمال امت اجابت پر ہے۔ اس اصول سے غافل نہ رہنا جب من بیانیہ ہے تو اس سے مراد وہی لوگ لیے جائیں گے جو اس وقت تم میں ہوں۔ سو اس وعدہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ انہیں (اس وقت ایمان لائے ہوئے لوگوں کو) ایسی خلافت دے گا جس میں وہ زمین پر ایسا تصرف کرسکیں جو بادشاہ اپنے ممالک میں کر پاتے ہیں یا یہ کہ انہیں ان کی جگہ حکومت دے گا جن سے وہ پہلے ڈرتے تھے انہیں ان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور انہیں ان کی زمین کا وارث بنائے گا۔ زمین سے مراد پورا جزیرہ عرب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کل مشرق و مغرب۔ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ میرے لیے پوری زمین لپیٹ دی گئی' میں نے اس کے مشارق بھی دیکھے اور مغارب بھی اور میری امت (اجابت) کے قدم وہاں تک پہنچیں گے جہاں تک یہ میرے لیے لپیٹ دی گئی۔''

پھر آگے یہ بھی لکھتے ہیں:

(كما استخلف الذين من قبلهم) وهم بنو اسرائيل استخلفهم اللّٰه عز و جل فی الشام بعد اهلاک الجبابره وكذا فی مصر علیٰ ما قيل من انها صارت تحت تصرفهم بعد هلاک فرعون و ان لم يعودوا اليها وهم من قبلهم من الامم المومنة الذين اسكنهم اللّٰه تعالیٰ فی الارض بعد اهلاک اعدائهم من الكفرة الظالمين.

(روح المعانی ج ۹ ص ۳۹۳)

ترجمہ: ''جیسے اس نے تم سے پہلے لوگوں کو شام کی زمین وراثت میں دی تھی۔ اس سے مراد بنو اسرائیل ہیں جنہیں جابر قوموں کے بعد وہاں حاکم بنایا گیا تھا اور اسی طرح مصر کی زمین فرعون کی ہلاکت کے بعد ان کے تصرف میں آئی۔ اگرچہ وہ وہاں پھر واپس نہ گئے اور وہ تم سے پہلے ان مومنین ہی سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں سکونت دی۔ اس کے بعد کہ ان کے دشمنوں اور کافر ظالموں کو وہاں ہلاکت دی۔''

اس سے بھی واضح ہے کہ آیت استخلاف میں خلافت ارضی کی نفی ہرگز نہیں اور اس خلافت ارضی سے خلافت

نبوت کی نفی بھی ہرگز لازم نہیں آتی۔

استاذنا المکرم شیخ المحدثین والمفسرین مولانا محمد ادریس الکاندھلوی (۱۳۹۴ھ) بھی خلافت لغوی اور خلافت نبوی کو اس طرح جمع کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی اور بادشاہت اور نبی کی خلافت اور جانشینی کی شہادت دے کر ان کی تسکین فرما دی ...... یہ وعدہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کو نعمتیں عطا فرمائیں گے۔ (اول) استخلاف فی الارض یعنی زمین میں ان کو نبی کا جانشین اور بادشاہ بنائیں گے اور (دوم) یہ کہ اللہ تعالیٰ ضرور بہ ضرور ان کے لیے ان کے دین کو جس کو خدا نے ان کے لیے پسند کیا مضبوط اور مستحکم کر دے گا...... (سوم) یہ کہ اللہ تعالیٰ ضرور بہ ضرور بدل دے گا ان کے خوف و ہراس کو امن و امان اور سکون و اطمینان سے یعنی مسلمانوں کے دلوں سے کافروں کا خوف نکل جائے گا...... یہ اللہ تعالیٰ کے تین وعدے ہیں جن کی بطور پیشگوئی خبر دی گئی ہے...... خلفائے راشدین کے زمانہ میں عبادت کا بازار خوب گرم ہوا اور کفر و شرک خوب ذلیل و خوار ہوا۔ اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور کفر و شرک بیخ و بن سے اکھڑ گیا۔"

(معارف القرآن ج ۵ ص ۱۴۵)

اللہ تعالیٰ نے حضور پرنور سے یہ وعدہ کیا کہ آپ کے بعد آپ کے صحابہ کو زمین کا بادشاہ بنائیں گے۔ (ص ۱۴۷)

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنی قوم کے لیے دعا کی:

واکتب لنا فی هذه الدنیا حسنة وفی الآخرة انا هدنا الیک (الاعراف ۱۵۶)

ترجمہ: "ہمیں اس دنیا میں بھی خوش حالی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم جھکے تیری طرف۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول نہ کی اور بتلایا کہ اس دنیا کی خوشحالی کا وعدہ تم سے نہیں کرتا۔ رہی آخرت کی خوشحالی تو وہ ہر سچے کو مل کر رہے گی۔

یہ دنیا میں خوشحالی کہ حکومت بھی ملے اور دین پر بھی پورا جماؤ حاصل ہو یہ انعام باری ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو پیغمبر آخر الزمان کی پیروی کریں گے۔

فساکتبها للذین یتقون ویؤتون الزکوة والذین هم بایٰتنا یؤمنون ○ الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل (پ ۹ الاعراف ۱۵۷)

ترجمہ: "یہ دنیا میں بھی خوشحالی ہو یہ میں ان کو دوں گا جو ڈر رکھتے ہوں گے (میرا) اور دیں گے (اپنے اموال میں سے) زکوٰۃ۔ وہ لوگ جو پیروی کریں گے اس رسول کی جو نبی امی ہوگا جسے وہ پائیں گے لکھا ہوا تورات اور انجیل میں۔"

پیغمبر آخر الزمان کی پیروی کرنے والے کون ہوں گے؟ جنہوں نے آپ کو دیکھا، آپ پر ایمان لائے اور آپ کی پیروی کی۔ جو آپ کے بعد کے لوگ ہوں گے وہ آپ کے احکام کی اطاعت تو کر سکیں گے، اتباع انہی کا نصیب ہے۔ جنہوں نے آپ کو دیکھا اور آپ کے پیچھے چلے۔

سو ان آیات میں پیغمبر آخر الزمان کے صحابہ کے ایمان، ان کے اعمال صالحات اور ان کے دنیا میں خوشحالی پانے کی خبر ہے اور یہ وہی بات ہے جو آیت استخلاف میں ہم پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ سورہ اعراف کی ان آیات نے سورہ نور کی آیت استخلاف کے وہی معنی بتائے ہیں جو مولانا دبیر نے اس آیت استخلاف کے بتائے ہیں۔

وعد اللّٰه الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنّهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضٰی لهم ولیبدلنّهم من بعد خوفهم امنا. (پ ۱۸ النور ۵۵)

ترجمہ: "اللہ نے وعدہ کیا ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے ان سے پہلے بھی (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی اور انہیں خوف کے بعد اللہ تعالیٰ امن عطا فرمائیں گے۔"

۲۔ للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من دیارهم واموالهم یبتغون فضلاً من اللّٰه ورضواناً وینصرون اللّٰه ورسوله اولئک هم الصادقون. (پ ۲۸ الحشر ۸)

ترجمہ: "یہ حق ہے ان حاجت مند مہاجرین کا جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب تھے اور نصرت کرتے تھے اللہ اور اس کے رسول کی، یہی لوگ ہیں جو صادقین ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو صادقون فرمایا ہے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اصل طاقت تھے۔ امام ابوبکر بن عیاش (۱۹۳ھ) کہتے ہیں، یہ سب حضرت ابوبکرؓ کو یا خلیفة رسول اللہ کہا کرتے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے جب ان کو صادقین کہا تو یہ اپنے اس قول (یا خلیفة رسول اللہ) میں بھی صادق سمجھے جائیں گے اور یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت

صادقہ کی ایک کھلی شہادت ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں' یہ استنباط خلافت نہایت عمدہ ہے۔

خاتمۃ الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی بھی امام ابوبکرؓ بن عیاش سے اسی طرح نقل کرتے ہیں:

ابوبکرؓ الصدیق خلیفه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی القرآن لان اللہ تعالٰی یقول للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من دیارهم واموالهم یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً وینصرون اللہ ورسوله اولئک هم الصادقون فمن سماه اللہ صادقاً فلیس یکذب وهم قالوا یا خلیفة رسول اللہ قال ابن کثیر استنباط حسن. (تاریخ الخلفاء ص ۶۶)

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ قرآن میں حضور اکرمؐ کے خلیفہ ٹھہرائے گئے ہیں کیونکہ اللہ تعالٰی فرماتے ہیں' یہ زمینیں ان محتاج مہاجرین کو ملیں گی جو اپنے گھروں اور اپنے اموال سے بے دخل کر دیے گئے' صرف اس لیے کہ وہ اللہ تعالٰی کا فضل اور اس کی رضا کے طالب رہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کرتے رہے۔ وہ لوگ صادقون ہیں۔ اب جن کو اللہ تعالٰی نے صادقین کہا ہے وہ کاذب نہیں ہو سکتے اور یہ سب مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ رسول کہتے تھے۔ سو یہ اپنے اس قول میں بھی صادق شمار ہوں گے۔ ابن کثیر کہتے ہیں' حضرت ابوبکرؓ بن عیاش کا یہ بہت لطیف استنباط ہے۔''

اللہ تعالٰی نے اس وقت کے تمام مومنین کو حکم دیا کہ تم ان مہاجرین کے ساتھ ہو جاؤ۔ سو یہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے حق ہونے کی ایک آسمانی شہادت ہے۔

یا ایها الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین. (پ ۱۱ التوبه ۱۱۹)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو اور تم رہو صادقین (مہاجرین) کے ساتھ۔''

حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کے توجہ دلانے پر سب انصار ماسوائے سعد بن عبادہ مہاجرین کے ساتھ ہو گئے تھے۔

''گو بعد میں آپ بھی امت کے اس فیصلے میں شامل ہو گئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔''

(دیکھئے تاریخ طبری جلد ۳ ص ۲۱۰ تحت اخبار سقیفہ تحفہ اثنا عشریہ ص ۵۶۲ مترجم مولانا عبدالمجید خان)

۳. **قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی بأس شدید تقاتلونهم او یسلمون فان تطیعوا یؤتکم اللہ اجراً حسناً وان تتولوا کما تولیتم من قبل یعذبکم عذاباً الیما. (پ ۲۶ الفتح ۱۶)**

ترجمہ: ''آپ ان لوگوں سے جو پیچھے رہے تھے (حدیبیہ جانے سے) کہہ دیں' آئندہ تم بلائے جاؤ گے ایک قوم کے مقابلہ میں جو بڑے سخت لڑنے والے ہوں گے تم ان سے لڑو گے یا وہ

مسلمان ہو جائیں گے۔ پھر اگر تم مانو گے (اس سلطنت اسلامی کا حکم) تو اللہ دے گا تمہیں بدلہ اس کا اچھا اور اگر تم پلٹ گئے جیسا کہ تم پہلے پلٹ گئے تھے تو اللہ تمہیں ایک دردناک عذاب دے گا۔''

اس میں یہ جملہ زیادہ قابل غور ہے **ستدعون الی قوم اولی بأس شدید** (تم بلائے جاؤ گے ایک سخت لڑنے والی قوم پر) وہ بلائے جانے والے کون ہوں گے؟ اس وقت کی سلطنت اسلامی کے کارکن؟ اس جہاد کا داعی اکبر کون رہا؟ حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ۔ تو یہ آیت حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کی خلافت صادقہ کی ایک بڑی شہادت ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

هذه الآیة حجة علی خلافة الصدیق لانه الذی دعا الی قتالهم.

(تاریخ الخلفاء ص ۶۵)

ترجمہ: ''یہ آیت حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کی خلافت کی حجت صادقہ ہے کیونکہ آپ ہی ہیں جنہوں نے ان مخلفین کو ایسے لوگوں کے خلاف نکلنے کو کہا تھا جو بہت لڑنے والے اولی بأس شدید تھے۔''

حضرت امام ابوالحسنؒ الاشعری (۳۲۴ھ) شیخ ابوالعباس بن شریح سے نقل کرتے ہیں:

خلافة الصدیق فی القرآن فی هذه الایة قال لان اهل العلم اجمعوا علی انه لم یکن بعد نزولها قتال دعوا الیه الا دعاء ابی بکر لهم وللناس الی قتال اهل الردة و من منع الزکوٰة قال فدل ذلک علی وجوب خلافة ابی بکر والفتراض طاعته اذ اخبر اللہ ان المتولی عن ذلک یعذب عذاباً الیما. (تاریخ الخلفاء ص ۶۶)

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کی خلافت قرآن کریم میں اس آیت میں ملے گی۔ سب اہل علم اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد کوئی ایسا قتال نہیں ہوا جس کی طرف یہ لوگ بلائے گئے ہوں مگر یہی کہ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں ان کے خلاف بلایا جو مرتد ہو گئے تھے اور وہ جنہوں نے زکوٰۃ روک لی تھی۔ سو اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت لازماً ثابت ہے اور ان کی اطاعت فرض قرار پائی ہے جبکہ اللہ نے بتلایا کہ اس سے جو پیچھے رہے گا دردناک عذاب پائے گا۔''

۴. **یا ایها الذین امنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یأتی اللہ بقوم یحبهم ویحبونه اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکافرین یجاهدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومة لائم. (پ ۸ المائده ۵۴)**

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جو لوگ تم میں سے پھر جائیں دین سے (جیسے کہ جھوٹے مدعیان نبوت

اور منکرین زکوٰۃ اٹھے) تو اللہ ان کے خلاف ایسے لوگ کھڑے کرے گا جو مومنوں کے لیے نرم ہوں گے اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اس میں) کسی کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

یہ صفت **اذلة علی المؤمنین** اور **اعزة علی الکافرین** قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر یہ صفت صحابہ کی ہی بتلائی گئی ہے۔

محمد رسول اللّٰہ والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینھم. (پ ۲۶ الفتح)

ترجمہ: "حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر نرم ہیں۔"

سو جو صحابہؓ ان مرتدین کے خلاف اٹھے ان کے سربراہ حضرت ابو بکرؓ ہی تھے۔

قال ابن کثیر و من خسر القوم بانھم فارس والروم فالصدیق ھو الذی جھز الجیوش الیھم و تمام امرھم کان علی ید عمر و عثمانؓ و ھما فرع الصدیق. (ایضاً)

ان چار قرآنی شواہد سے آیت استخلاف کی پوری تائید ملتی ہے کہ اللہ رب العزت کا یہ وعدہ صحابہ کرامؓ سے تھا اور وہ چڑھتے سورج کی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھوں پورا ہوا۔ حضورؐ کی خلافت انہی کو ملی۔ حضرت عمرؓ اور عثمانؓ انہی کے تسلسل سے آگے چلے۔ وہ ان کے لیے بمنزلہ فروع تھے۔ **کما صرح بذلک الامام السیوطی۔** جس طرح ہم نے قرآن کریم سے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پر یہ چند شواہد پیش کیے ہیں اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی آپ کی خلافت کے بیسیوں اشارات ملتے ہیں۔

ہم اس وقت آفتاب ہدایت کی ترتیب سے قرآنی آیات سے گزر رہے ہیں۔ اس لیے یہاں ہم ان حدیثی شواہد کا ذکر نہیں کرتے۔ مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ اٹھائیسویں آیت آگے آرہی ہے۔ واللہ ھو الموفق لما یحبہ ویرضی بہ۔

آیئے اب ہم آپ کو اٹھائیسویں آیت میں لے چلیں

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون.

(پ ۱۷ الانبیاء ۱۰۵)

ترجمہ: "اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں تورات کے بعد کہ اس خاص زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے۔"

اس آیت میں خلافت ارضی کا بیان ہے۔ پہلی کتابوں سے یہ بات چلی آرہی تھی کہ یہ ارض مقدس اللہ کے نیک بندوں کو دوسروں سے وراثتاً ملے گی۔ حضرت عمرؓ نے خلافت حضرت ابو بکرؓ سے پائی اور ان کے ہاتھوں ارض مقدس پر اسلام کا جھنڈا لہرایا۔ پھر ان سے حضرت عثمانؓ نے اسے وراثتاً پایا اور ان سے پھر یہ حضرت علیؓ کو وراثت میں ملی۔ یہ وراثت نسبی نہیں، اللہ کے نیک بندوں نے اسے وراثت نبوی میں لینا ہے۔ علمائے اہل سنت نے اس آیت کو آیت استخلاف کا ہی ایک مضمون قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"کامل وفادار بندوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو دنیا اور آخرت کی کامیابی اور اس (دنیا کی) زمین اور جنت کی زمین کا وارث بنائے گا۔ چنانچہ فرمایا **ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبة للمتقین** (اعراف رکوع ۱۵) **انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد** (المؤمن رکوع ۶) اور **وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم۔** (النور رکوع ۷)"

یہ ایسا حتمی اور قطعی وعدہ جس کی خبر اس نے اپنی کتب شرعیہ اور کتب قدریہ (قضا و قدر کے فیصلے) میں دی، لوح محفوظ اور ام الکتاب میں یہ وعدہ درج کیا اور انبیاء کی زبانی بار بار اعلان کرایا کہ داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور ۳۷-۲۹ میں ہے کہ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ چنانچہ اس امت کے کامل وفادار اور صادق بندے مدت دراز تک زمین کے وارث رہے۔ شرق و غرب میں انہوں نے آسمانی بادشاہت قائم کی۔ عدل و انصاف کے جھنڈے گاڑ دیے۔ دین حق کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی ان کے ہاتھوں پر پوری ہوئی۔

ان اللّٰہ تعالٰی زوٰی لی الارض فرایت مشارقھا و مغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا ما زوی لی منھا.

اور اسی قسم کی دوسری پیشگوئی امام مہدی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہو کر رہے گی۔ (ص ۴۴۱)"

شیخ الاسلام کی اس تفسیر سے واضح ہے کہ اہل سنت کے ہاں یہ وعدہ اس دنیا کی زمین کا ہے۔ اور جنت کی زمین تو ہر نیک کو ملے گی۔ سو ان دو قسم کے اقوال میں ہرگز کوئی نسبت تباین نہیں۔ دونوں زمینیں اللہ کے کامل وفادار بندوں کی میراث ہیں۔ پھر قرن اول کا قبضہ زمین (**لیستخلفنّھم فی الارض**) تو دنیا دیکھ چکی اور قیامت سے پہلے کا کل قبضہ زمین بھی اسی کا ایک دوسرا ظہور ہے۔ دونوں میں بھی کوئی نسبت تباین نہیں۔

قرن اول کا قبضہ بھی اپنے عالمی اثر میں بقول شیخ الاسلام شرق و غرب کو محیط رہا اور قرن آخر میں یہ پورے عالم پر ایک عملی قبضہ ہوگا۔ ان تینوں اطوار قبضہ کی ایک ہی حقیقت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے کامل وفادار بندوں کو وعدہ دیا ہے اور اسے پورا بھی کیا اور آئندہ بھی وہ اسے ظاہر کرے گا۔

مختلف اطوار قبضہ کو آپس میں ٹکراتا بتلانا یہ اہل حق کا کام نہیں۔ یہ انہی اہل حرمان کا کام ہے جو اس زمین میں قبضہ سے صدیوں سے بے نصیب چلے آ رہے ہیں اور صرف قرن آخر کے قبضہ پر وہ یقین رکھتے ہیں حالانکہ حضورؐ کی رسالت کا معجزہ اس کا قرن اول کا ظہور تھا اور یہ لوگ قرن آخر کے انتظار میں اس وعدہ کے پورا ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

قرن اول کے قبضے کی اساس پر اس امت کو قرن آخر کا قبضہ ملے گا۔ قرن اول کے لوگ اس پہلے قبضے کی اساس پر جنت کی زمین کا قبضہ بھی پائیں گے اور قرن آخر کے لوگ ان دونوں قبضوں کی اساس پر جنت کی زمین پائیں گے اور ان میں کوئی باہمی ٹکراؤ نہیں۔

مولانا دبیر کی طرف سے ایک شبہ کا جواب

''اگر کوئی فاسق بد مذہب شخص یا قوم تھوڑے دنوں کے لیے وہاں غاصبانہ قبضہ کر لے اور پھر کچھ دنوں کے بعد اسے وہاں سے دھتکار کر نکال دیا جائے تو وہ یرث کا مصداق ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یزید کا غاصبانہ قبضہ گنتی کے دن رہا۔ شریف نے اگر نصاریٰ کو وہاں دخیل کیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو یزید کا ہوا تھا۔'' (آفتاب ہدایت ص۹۹)

ڈھگو رافضی کا جواب ملاحظہ کریں

ہم بھی کہتے ہیں کہ امام زمان امام مہدی کے ظہور تک زمین پر ان لوگوں کا قبضہ چونکہ غاصبانہ ہے اس لیے وہ یرثھا کے مصداق نہیں ہوسکتے۔ جب حقیقی وارث ارض آئے گا تو وہ سب کو دھتکار کر نکال دے گا۔ (ص۱۴۶)

ڈھگو رافضی کی بوکھلاہٹ ملاحظہ کیجئے:

مولانا دبیر نے کہا تھا کہ اللہ کا جو وعدہ ہے کہ اس سرزمین کو صرف صالح بندگان خدا ہی وراثت میں لیں گے' اس پر فاسقوں کا چند روزہ غاصبانہ قبضہ خدا کے اس وعدہ سے نہیں ٹکراتا۔ مولانا دبیر نے یہ بات النادر کالمعدوم کے قاعدہ سے کہی تھی۔ مگر ڈھگو کی بوکھلاہٹ دیکھئے' اس زمین پر صدیوں کے غاصبانہ قبضہ کو وہ ایک عارضی قبضہ سمجھتا ہے اور آخری دور میں امام مہدی کے چند سالہ قبضے کو قرآن کے اس عظیم وعدے کا حقیقی مصداق قرار دیتا ہے۔ صدیوں کے قبضے کو ایک عارضی قبضہ قرار دینا انہی نادانوں کی علمی دنیا ہے۔

جواب الجواب

جب وعدہ خدا کا ہو جو ہر چیز پر قادر ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ غاصبین اسے اپنے صدیوں کے قبضے سے نہیں توڑ سکتے اور نہ خدا اپنی بات پورا کرنے میں ان کے غضب و ظلم سے کسی طرح عاجز آ سکتا ہے۔ پھر دیکھئے ڈھگو کس طرح اپنی بدقسمتی پر روتا ہے کہ ان غاصبین نے کس طرح خدا کو اپنے آگے عاجز کر کے رکھ دیا ہے۔

وہ لکھتا ہے:

''اس زمین کی بدقسمتی ہے کہ روز فتح سے لے کر آج تک ہمیشہ اشرار کے قبضہ میں نظر آتی ہے۔''
(ص۱۴۷)

اور ان غاصبین نے خدا کو اپنا وعدہ پورا کرنے سے بری طرح ناکام کر دیا ہے۔

ڈھگو رافضی اپنی قوم کو اب اس طرح تسلی دیتا ہے:

ؔ لکل اناس دوله یرقبونها و دولتنا فی آخر الدهر یظهر

ترجمہ: ''لوگ اپنی دولت کی (صدیوں سے) حفاظت کر رہے ہیں اور ہماری دولت دنیا کے آخر میں (صرف چند سالوں کے لیے) ظاہر ہوگی۔''

پھر ڈھگو مولانا دبیر کو اس طرح داد دیتا ہے:

''مولف کو عقل و خرد کی داد دینی چاہیے کہ جو ایسے (صدیوں کے) اقتدار اور تسلط کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے اور شیعوں کو صرف اس لیے عباد صالحین سے خارج کرتا ہے کہ ان کے پاس (ان کے امام کے پاس) انہیں اس زمین کی عنانِ اقتدار نہیں دلوا سکے۔''

گویا خدا کا یہ عظیم وعدہ جو تورات' انجیل اور اب قرآن میں اس شان سے نقل ہوتا آیا ہے اب وہ صدیوں سے قرآن میں بے کار پڑا ہے۔ استغفر الله العظیم جب خلفائے راشدین کا ارض حرمین اور ارض مقدس پر قبضہ تھا تو وہ صرف اسی حصہ زمین پر قابض نہ تھے۔۔ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تھے اور جیسا کہ شیخ الاسلام نے لکھا ہے' دین حق کا قبضہ چار دانگ عالم میں بج رہا تھا اور اب موجود دور میں اگر امریکہ' چین اور یورپ دنیا کی بڑی طاقتیں ہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ قرن اوّل میں اس وقت بھی امریکہ اور یورپ ہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے۔

ؔ بریں عقل و دانش بباید گریست

رافضی یہ لکھ کر مولانا دبیر کی پیش کردہ اٹھائیس آیات کے جواب سے فارغ ہوتا ہے:

"لازم آتا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یہ ہے کہ زمین کا یہ مختصر سا حصہ صالح بندوں کے قبضہ میں رہے اور باقی تمام زمین بے شک دہریوں' ملحدوں' کافروں اور فاسقوں کے زیر اقتدار رہے۔"

حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ ان اللہ لا یرضیٰ لعبادہ الکفر۔ (ص ۱۴۸)

جواب

یہ ہرگز لازم نہیں آتا جو تم سمجھ رہے ہو۔ صالحین امت کا قبضہ قرن اول میں بھی اپنے اثر وعظمت کے لحاظ سے پورے شرق وغرب پر تھا اور قرن آخر میں بھی جب حضرت عیسیٰ ابن مریم تمام دجالی قوتوں کو ختم کریں گے تو صلیب ٹوٹ جائے گی۔ سب اہل کتاب داخل صفوف اسلام ہو جائیں گے۔ اور اسلام اس وقت ہر کچے پکے گھر میں داخل ہو جائے گا۔ پھر کچھ عرصہ بعد دنیا ختم ہوگی اور قیامت کا بگل بج جائے گا۔

اسے ڈھکو مولف کی بدقسمتی سمجھئے کہ اس کے عقیدہ کی رو سے اس زمین پر صدیوں غاصبین کا قبضہ رہا اور جونہی امام مہدی کا دور آئے پھر یہ دنیا ہی ختم ہو جائے اور صرف اس مختصر دور میں ہی دنیا میں عدل وانصاف قائم ہو سکے گا اور نہ خدا کی مشیت تو یہی رہی کہ زمین کا بیشتر حصہ کافروں اور ملحدوں کے قبضہ میں ہی رہے۔

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

تم الباب الثانی وللہ الحمد ویتلوہ الباب الثالث و بہ نستعین.

اب ہم شیعہ لٹریچر میں مدح صحابہ کی روایات پائے جانے کا کچھ مختصر جائزہ لیتے ہیں کہ صداقت کبھی تاریک گوشوں میں بھی اپنی چمک دکھا دیتی ہے۔ ولنعم ماقیل والفضل ماشھدت بہ الاعداء۔

باب سوم

شیعہ لٹریچر میں روایات مدحِ صحابہؓ

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اثنا عشری شیعہ اکابر صحابہؓ کے بارے میں ہمیشہ سے بدگمان رہے ہیں۔ ان کی کتب' عقائد اور کتب حدیث وتاریخ اکابر صحابہؓ کے خلاف بہت وضعی روایات اور تنقید وتبرا سے بھری ہیں۔ خلفاء ثلٰثہ اور ان کے اعوان وانصار جمہور صحابہؓ کے خلاف ان کی فرقہ وارانہ سرگرمیاں یہی ہیں اور اسی عنوان سے وہ اہل سنت کے خلاف ایک مستقل تحریک بنے رہتے ہیں۔ اس صورتِ عمل میں ان کی کتابوں میں صحابہ کرامؓ' خصوصاً خلفاء ثلٰثہ کی کسی فضیلت اور منقبت کو تلاش کرنا ایک بہت دور کی بات ہے۔ لیکن تفتیش کرنے والے آفیسر کبھی خارجی سوالات سے بھی کئی اندر کی باتیں پا لیتے ہیں اور مجرمین سے بہت سی باتیں اگلوا لیتے ہیں جنہیں وہ نمایاں نہیں کرنا چاہتے۔ سو شیعہ لوگوں کی کتابوں سے فضائلِ صحابہؓ کی روایات خلاف موضوع صحابہؓ کے ابواب میں نہیں' دوسرے ابواب میں ملیں گی۔ ان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرح فضائل صحابہؓ کے ابواب بندھے نہ ملیں گے۔ یہاں ان کا فضائل صحابہؓ کا کوئی بیان اگر کسی چور دروازے سے معلوم ہو جائے تو ہو جائے عمداً وہ کسی صحابیؓ کی کوئی فضیلت نقل نہ ہونے دیں گے۔ سو اس کا ان کی کتابوں میں اشارۃً ذکر بھی اہل سنت کے لیے ایک بڑی شہادت بن جاتا ہے۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تری

تاہم شیعہ کتابوں میں مدحِ صحابہؓ کی خوشبو کہیں کہیں دوسرے ابواب میں ضمناً یا استدلالاً مل ہی جاتی ہے اور اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ بلی اچانک تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ یہ مظلوموں کی آہیں ہیں جو کبھی اس طرح بھی سنی گئی ہیں۔

ان روایات کو آپ ان کتابوں میں واقعاتی شہادت Circumstancial Evidence یا بالواسطہ ثبوت Indirect Approach کہہ سکتے ہیں۔ جب انہیں ان کتابوں سے پیش کیا جائے تو شیعہ مبلغین ان کے سیاق وسباق میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ کوئی اصل بات کی طرف دھیان ہی نہ کر پائے کہ اس ضمن میں یہ بات کیسے کھل رہی ہے اور آپ نے اس بات کا کیسے بلا ارادہ اقرار کر لیا ہے۔

ان روایات سے شیعہ حضرات کی اصلاح کے لیے صرف اسی پہلو سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھو ان کے تسلیم کردہ ان واقعات کی تہ سے کس طرح مقامِ صحابہؓ نے اپنی روشنی دے دی ہے اور مخالفین کے اجڑے دیار میں بھی سچائی کے سورج نے کچھ اپنی کرنیں آخر بکھیر ہی دی ہیں۔ حق کی شان یہ ہے کہ مخالفین کے ہاں بھی کبھی غیر ارادی طور پر مدحِ صحابہؓ کی سوئی نکال دیتا ہے۔ یہ شیعہ مصنفین کا کمال نہیں ہے کہ انہوں نے حق کی بات کہہ دی۔ یہ ابدی سچائی کا چراغ ہے جو چمکے بغیر نہیں رہا۔ جگنو کو اس سے غرض نہیں کہ اس کی چمک کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں۔

والفضل ما شهدت به الاعداء

نارِ انتقام میں بھسم ہونے والوں پر کیا گزری

ان روایات کی آگ میں بھسم ہونے والے ڈھ گو (کچی بات کرنے والے)' ان کے جواب میں ہمیشہ سے یہی کہتے آئے ہیں کہ یہ روایات ہمارے مصنفین نے الزاماً درج کی ہیں اور وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کے ان مصنفین نے انہیں اپنے ہاں تردیداً ذکر کیا ہے یا وہ یہ روایات کبھی تسلیماً اپنے ہاں لاتے ہیں۔

سو اب جب وہ یہ روایات تسلیماً اپنے ہاں لائے ہیں تو اب انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کے راویوں پر بحث کریں اور روایت کو مسترد کریں۔ کتب حدیث میں روایات دو طرح سے لائی جاتی ہیں۔ (۱) کبھی صرف روایات کو جمع کرنا مقصود ہوتا ہے' ان سے استدلال نہیں کیا جاتا اور (۲) کبھی وہ روایات معرض استدلال میں لا کر پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی صورت میں تو بے شک دوسرے فریق کو حدیث کی صحت پر بحث کرنے کا حق پہنچتا ہے لیکن دوسری صورت میں کہنا پڑے گا کہ یہ مصنفین اپنے ہاں ان روایات کو تسلیماً نقل کر رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر قارئین کو وہ پوری روایات اہل سنت کتب حدیث میں بھی دیکھ لینی چاہئیں۔ شیعہ محققین خود اہل سنت محدثین کو اہل انصاف تسلیم کر چکے ہیں۔ (دیکھیں گوہر مراد از ملا عبدالرزاق لاہجی)

شیعہ لٹریچر میں منقبت حضرت ابوبکرؓ کی ایک روایت

ملا محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) فروع کافی میں حضرت امام جعفر صادقؒ کی زندگی کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ان کے ہاں کچھ صوفی لوگ آ نکلے اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت امامؒ نے ایک قیمتی جبہ زیب تن کر رکھا ہے۔ ان صوفیوں نے آپ کو اپنے زہد و تقویٰ کی دعوت دی۔ آپؒ نے انکے سامنے حضرت ابوبکرؓ ' حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمانؓ کے زہد سے استدلال فرمایا اور اپنے عمل پر ان کی شہادتیں پیش کیں اور اس پر حضرت ابوبکرؓ کا اول نمبر پر ازھد الناس ہونا واضح طور پر بیان فرمایا اور انہیں اور حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمانؓ کو ایک فہرست میں ذکر کیا۔

یہاں دوسرے نمبر پر حضرت ابوذرؓ کو لانا بتلاتا ہے کہ حضرت امام اس وقت کوئی الزامی بات نہ کر رہے تھے کیونکہ حضرت ابوذرؓ کا موقف جمع مال کے بارے میں حضرت عثمانؓ کے موقف سے کھلے طور پر مختلف تھا گو جمہور صحابہؓ حضرت عثمانؓ کے ساتھ تھے۔ شیعہ لوگ جن صحابہؓ کو عام لہرِ ارتداد سے مستثنیٰ رکھتے ہیں وہ تین صحابیؓ ہیں۔ (۱) حضرت ابوذرؓ (۲) حضرت سلمانؓ اور (۳) حضرت مقدادؓ۔ سو واضح ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ اسلامی زہد کی اس وضاحت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمانؓ کو الزاماً پیش نہیں کر رہے اور نہ حضرت امام کے ہاں ان صوفی حضرات کی یہ حاضری کسی مجلس مناظرہ کے طور پر تھی۔ صوفیوں کو مناظرہ سے کیا مطلب؟

پھر ان دنوں شیعہ مذہب بھی ابھی مدون نہ ہوا تھا۔ امام جعفر صادقؒ کی وفات (۱۴۸ھ) میں ہوئی اور شیعہ مذہب کی سب سے پہلی حدیث کی کتاب الکافی چوتھی صدی ہجری کے شروع میں مرتب ہوئی اور اس سے اثنا عشری مذہب آگے چلا۔ امام جعفر صادقؒ کی مجلسوں میں سنی شیعہ عقائد کے یہ فاصلے نہ تھے جو آج ان دو حلقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اثنا عشری عقائد کا خاتم المحدثین ملا محمد باقر مجلسی (۱۱۱۰ھ) اس وقت کے حالات کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔

> ''جمعے از راویاں کہ در اعصار ائمہ بودہ انداز شیعاں اعتقاد بعصمت ایشاں نداشتہ اند بلکہ ایشاں را از علماء نیکو کارے دانستہ اند چنانچہ از رجال کشی ظاہر می شود و مع ذلک ائمہ حکم بایمان بلکہ بعدالت ایشاں مے کردہ اند۔'' (حق الیقین ۵۴۴ طبع ایران)
>
> ترجمہ : ''راویوں کا ایک طبقہ جو ائمہ اہل بیت کے دور میں بطور شیعہ معروف رہا ہے وہ ان ائمہ اہل بیت کو معصوم نہ جانتے تھے۔ انہیں وہ علماء' نیکوکار کے طور پر جانتے تھے جیسا کہ رجال کشی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس عقیدہ عدم عصمت کے باوجود ائمہ اہل بیت انہیں مومن قرار دیتے تھے بلکہ انہیں عادل راوی جانتے تھے۔
>
> معلوم ہوا کہ ان دنوں عقیدہ عصمت ائمہ ابھی پورے طور پر قائم نہ ہوا تھا' نہ ان ائمہ کو عمومی پیرایہ میں کہیں معصوم سمجھا جاتا تھا ورنہ صوفی حضرات کو کبھی جرأت نہ ہوتی کہ امامؒ کو نصیحت کرنے کے درپے ہوتے۔''

پس جب ان دنوں سنی شیعہ فاصلے اس طرح قائم نہ تھے جیسا کہ اب ہیں تو ظاہر ہے کہ ان دنوں ان ائمہ کی مجالس میں مناظرے نہ ہوتے تھے۔ نہ اصول مناظرہ کے حوالے سے ائمہ کرامؒ کسی سوال کرنے والے کو الزامی جواب دیتے تھے۔ ائمہ کی ان مجالس میں ان کی اپنی تشریف فرمائی بھی انہیں ایک مقتدر سنی عالم سمجھنے کے طور پر تھی اور شیعوں کے اپنے علیحدہ عقائد ابھی مرتب نہ ہو پائے تھے ورنہ یہ ائمہ کرام اپنی مجالس کے ان سنی راویوں کو حدیث کے عادل راوی ہونے کا کبھی درجہ نہ دیتے۔ عبداللہ بن سبا جو اس سے بہت پہلے ہوا وہ یہودیوں کے ایجنٹ کے سوا کچھ نہ تھا اور حضرت علیؓ

مرتضیٰؓ نے اسے سزائے موت دی تھی۔

شیعہ کے بعض اصول حدیث

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں شیعہ نقطہ نظر سے روایت حدیث کا ایک مختصر خاکہ ہدیہ قارئین کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ ان کی کتابوں میں کسی روایت کے کسی راوی کا سنی ہونا اس روایت کو ہرگز مسترد نہیں کرتا۔ ان کے ہاں ثقہ کے نیچے ممدوح کا ایک درجہ ہے۔ جس میں راوی پھر بھی لائق مدح ہی رہتا ہے۔ شیعہ روایات حدیث کے راویوں کا یہ خاکہ ملاحظہ فرمائیں۔

راوی ثقہ ہوں مگر عقیدہ امامت نہ رکھتے ہوں تو ان کی حدیث قوی شمار ہوگی۔ بعض راوی امامی ہوں اور بعض غیر امامی، مگر ہوں ثقہ، تو بھی حدیث قوی سمجھی جائے گی۔ کسی حدیث کے بعض راوی ممدوح ہوں اور امامی ہوں اور بعض دوسرے راوی ثقہ ہوں مگر غیر امامی ہوں، تو یہ حدیث بھی قوی ٹھہرے گی۔" (دیکھیے جامع الرواۃ ج ۲ ص ۴۷۰)

صوفی لوگ علماء کی مجالس میں مناظرہ کرنے نہیں آتے تھے

صوفی حضرات کا ایک اپنا خاص مشرب ہے وہ مطلق جمع مال کے حق میں نہیں ہوتے، گو وہ اسے حرام بھی نہیں کہتے، وہ صرف اسے پسندیدہ نہیں سمجھتے۔ ہاں ان کی اس بات کو شریعت نہیں کہا جاتا، اگر اسے قانون کی شکل دی جائے تو پھر زکوۃ آخر کن لوگوں پر فرض ہوگی؟ یہ تو انہی لوگوں پر فرض ہوتی ہے جن کے پاس مال ہو۔ صوفی حضرات کے ہاں نہ جمع مال ہے نہ حولان حول اور نہ فرضیت زکوۃ۔ ظاہر ہے کہ فقہاء ان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے خود کہا:

فما وجبت علي زكوة مال

وهل تجب الزكوة على الجواد

ترجمہ: مجھ پر کبھی مال کی زکوۃ فرض نہیں ہوئی کیا کبھی سخی پر بھی زکوۃ دینے کی نوبت آتی ہے۔

یہ کسی صحیح روایت میں نہیں کہ حضرت علیؓ مرتضیٰ ہر سال محتاجوں اور مسکینوں کو مسجد میں بیٹھنے کے لیے کہتے اور پھر نماز میں رکوع کی حالت میں ان کی طرف زکوۃ کی ادائیگی میں انگوٹھی پھینکتے تھے۔

ایک حدیث بھی روایت کی جاتی ہے کہ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے رکوع کی حالت میں ایک محتاج کی طرف اپنی انگوٹھی پھینکی۔ حافظ ابن کثیر سورہ مائدہ کی تفسیر میں زیر آیت ۵۶ لکھتے ہیں:

بعض دیگر مفسرین نے بھی یہ تفسیر کی ہے لیکن سند ایک کی بھی صحیح نہیں رجال ایک کے بھی ثقہ اور ثابت نہیں پس یہ واقعہ بالکل غیر ثابت ہے اور صحیح نہیں ٹھیک وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ سب آیتیں حضرت عبادہ بن صامت کے بارے میں نازل ہوئیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۱۳)

ہاں یہ صحیح ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں اپنی رعایا میں زکوۃ کا نظام اسی تسلسل میں قائم رکھا جو پہلے تین راشدین نے قائم کیا ہوا تھا اور آپ اپنے نظام خلافت میں بالکل پہلے تین خلفاء کے نقش قدم پر ہی چلے۔

تاریخ گواہ ہے کہ خلفائے راشدین نے زکوۃ کو اپنے ادوار میں کبھی اسلام کے معاشی نظام سے خارج نہیں کیا تھا۔ غریب کی تمام ضرورتیں پوری ہوں تو بھی کوئی شخص مستحق زکوۃ مل ہی جاتا ہے۔ یہ صرف دور آخر میں ہوگا کہ مال اس قدر بڑھ جائے گا کہ اب اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔ لا يقبله احد۔

اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں۔ ہم یہاں صرف صوفیوں کے زہد و تقویٰ پر بات کر رہے ہیں جو مطلقاً جمع مال کے حق میں نہیں ہوتے اور وہی لوگ حضرت امام جعفرؒ کی مجلس میں آئے تھے۔

یہ لوگ جب درویشوں کی ادا میں بات کرتے ہیں تو ایک پیرائے میں زہد و تقویٰ کی تلقین ہوتی ہے۔ اسے شریعت کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ علماء جب حدیث و فقہ کا درس دیتے ہیں تو اسے شریعت اور فتویٰ کی زبان ملتی ہے۔ اہل طریقت کے اپنے احوال اور ظروف ہیں۔ صوفی لوگ ہر ایک سے ملتے ہیں۔ ان میں انسانی محبت جاگتی ہے۔ ان میں تعصب نہیں ہوتا۔ یہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتے۔ البتہ دنیا کے فانی ہونے کا نقشہ ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے کھچا رہتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی تصویر کا یہی رخ دکھاتے ہیں۔

صوفی حضرات کا ایک گروہ کہیں چلتے چلتے حضرت امام جعفر صادقؒ کے پاس آ نکلا اور ان سے آپ کے لباسِ فاخرہ پر سوال کیا۔ اس وقت سنی شیعہ کے فاصلے کہیں قائم نہ تھے اور نہ سنی شیعہ تفریق کہیں قائم تھی۔ یہ لوگ حضرت امامؒ کے ہاں انہیں ایک بزرگ سمجھ کر حاضر ہوئے اور وہ سمجھنا چاہتے تھے کہ مسلمان کس حد تک مال سے دور رہ سکتا ہے۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر کوئی دلائل پیش نہ کیے تھے اور نہ وہ آپ کے پاس کسی مناظرہ کے لیے آئے تھے، نہ صوفیوں اور درویشوں کا یہ انداز ہوتا ہے، نہ یہ حضرت امامؒ کی شان کے لائق تھا کہ ہر آنے والے وفد سے مناظرے کے لیے تیار ہو جائیں۔ وہ تو اس وقت سب کے بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جو اس وقت ان کو اپنا مقابل سمجھتا ہو اور یہ ائمہ حضرات ان پر اصول مناظرہ کی مشقیں کرتے ہوں۔ آپؒ نے انہیں اس وقت جو کچھ کہا سمجھانے کے لیے کہا، مناظرہ کرنے کے لیے نہ کہا تھا۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے لیے وہ مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں یہ ان کے (حضرت امامؒ) مرتبہ علمی اور بزرگی کے خلاف تھا۔ کسی ڈھ گو کی یہ بات قبول کرنے کے لائق نہیں کہ اتنا بڑا علم کا پہاڑ ان درویشوں سے مناظرے پر اترا ہوا تھا، عقل کو بالکل فارغ کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

عام پند ونصائح میں کیا موقف اختیار کیا جاتا ہے؟

ایسے مواقع پر اخبار احاد سے کام نہیں لیا جاتا۔ اخبار متواترہ اور عام مشاہدات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اخبار احاد مفید ظن ہوتی ہیں ان سے علم قائم نہیں ہوتا۔ اخبار متواترہ مفید علم ہوتی ہیں' علم کی دنیا میں کسی کو اس سے انکار نہیں۔ حضرت امامؒ نے حضرت ابو بکرؓ کے عمل سے استدلال کیا۔ اس میں ایک وجہ حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں وہ شہرت عام تھی کہ آپ اپنے پرائے سب کے ہاں ایک بڑے زاہد مانے ہوئے تھے۔ ایک جزو اس روایت کا یہ ہے کہ آپ نے اپنی وفات سے پہلے اپنے مال سے پانچویں حصے کی وصیت عام صدقات کی کی تھی۔ اس سے حضرت امام جعفرؒ کا استدلال یہ تھا کہ آپ کے پاس اس وقت بھی کچھ نہ کچھ اپنا مال ضرور تھا۔ سو اپنے پاس مال کا ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ کے اس استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت حضرت ابو بکرؓ کے زہد وتقویٰ کی عام شہرت تھی جو ان درویشوں کو بھی معلوم تھی اور یہ اس طرح عام تھی جس طرح حضرت ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی کے زہد وتقویٰ کے عام چرچے تھے۔

شیعہ کتب حدیث میں فضائل صحابہؓ کے موضوع پر کسی حدیث کا اس درجے میں بھی ثابت ہو جانا بلکہ پوری روایت میں ایک پہلو اس تیز روشنی کا نکل آنا یہ بھی دراصل انہی بزرگوں کی کرامت ہے جس کا مقابلہ کوئی سخت حیلہ جو بھی نہیں کر سکتا۔ جو لوگ مخالفانہ لٹریچر سے اس قسم کی حدیثوں کے طالب ہوتے ہیں۔ جو اہل سنت کے ہاں فضائل صحابہؓ میں باب در باب پائی جاتی ہیں۔ وہ علمی دنیا کی اس چمک سے پورے اندھیرے میں ہیں۔ ہم شیعہ لٹریچر سے بس اتنی روایت بھی سامنے لے آئیں تو اس کے بوجھ سے ان کا بڑا سے بڑا مجتہد بھی نہ نکل سکے گا۔

شیعہ کی اس روایت میں ایک اور چمک

اس روایت میں حضرت ابو بکرؓ کا ازھد النّاس ہونا ہی مذکور نہیں' آپ کا اپنے آخری وقت میں اپنے مال میں وصیت کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کی خلافت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغاوت ہوتی اور آپ معاذ اللہ اندر سے مومن نہ ہوتے تو آپؓ کا آخری عمل شریعت کی تابعداری میں وصیت کرنے کا کبھی نہ ہوتا۔ افسوس کہ ملا کلینی اس واقعہ کو روایت کرتے بھی اپنے تعصب کا لاوا آپ پر گرانے سے نہیں چوکا۔ اس کے ان الفاظ پر غور کریں:

''وہ جانتا ہوتا کہ تیسرے حصے کی وصیت میں زیادہ ثواب ہے وہ تو ایسا ہی کرتا۔''

نفلی ثواب کے زیادہ لینے اور کم لینے سے کسی پر جرح نہیں کی جا سکتی۔ تیسرے حصے کی وصیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مال سے زیادہ سے زیادہ تیسرے حصے کی ہی وصیت کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ وصیت کرنا وارثوں کے حقوق میں دخل اندازی ہوگی۔ ہاں اس سے کم وہ جو وصیت بھی کرے شریعت اسے مسترد نہیں کرتی۔ سو پانچویں حصے کی وصیت میں شرعاً کوئی جرح راہ نہیں پاتی۔ مگر ملا کلینی کا تعصب دیکھئے' کس طرح وہ اسے بھی نشانہ بنا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کی اس منقبت پر کہ حضرت امام جعفر صادقؒ آپ کو ازھد النّاس سمجھتے تھے' بہت جلا ہوا ہے اور وہ اسے صرف بادل نخواستہ روایت کر رہا ہے۔

پھر حضرت امام کا یہ کہنا کہ وہ جانتا ہوتا کہ تیسرے حصے کی وصیت میں ثواب زیادہ ہے تو وہ ایسا ہی کرنا بتلاتا کہ آپ کے ہاں حضرت ابو بکرؓ کس طرح دل سے شریعت کے پاسدار تھے' اگر انہوں نے تیسرے حصے کی وصیت نہ کی تو یہ بات اس وقت ان کے ذہن میں نہ آئی۔ ورنہ وہ کبھی شریعت سے ایک انچ بھی نہ ہٹتے۔

ملا محمد بن یعقوب الکلینی نے یہاں حضرت جعفر صادقؒ سے حضرت ابو بکرؓ کے زہد کا اقرار محض اس کی شہرت عام سے کیا ہے' یہ نہیں کہ ملا کلینیؒ ان کے لیے کوئی قصیدہ منقبت پڑھ رہا ہے۔ سچی بات کبھی دشمنوں کی زبان پر بھی بے اختیار آ جاتی ہے اور وہ اسے چھپائے بھی چھپا نہیں سکتے۔ اس خلاف ارادہ کہی بات کا وزن بہت زیادہ ہونا چاہیے نہ کہ اس کی سندوں پر بحث شروع کر دیں۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

دیکھئے کلینی دل سے جو حضرت ابو بکرؓ کو مومن بھی نہیں جانتا کس بے خبری میں اس نے حضرت ابو بکرؓ کے زہد و تقویٰ کی شہرت عام کے آگے سر جھکا دیا ہے اور کس طرح اس نے اپنے عقیدہ میں حضرت ابو بکرؓ کو دل سے شریعت کا شیدا بنا دیا اور وہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی زبان سے حضرت ابو بکرؓ کی اس روحانی فضیلت کا مدعی بن گیا ہے۔

شیعہ حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمانؓ کو اپنے حلقے کے لوگوں میں سمجھتے ہیں اور انہیں ان صحابہؓ میں جگہ نہیں دیتے جو خلفائے ثلثہ کے ساتھ رہے۔ حضرت امامؒ نے اپنے اس ارشاد میں ان دونوں کا نام بھی لیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؒ ان تینوں کو ایک مسلک کے افراد سمجھتے تھے۔ سو آپ کے اس ارشاد کو الزامی صورت جواب کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فروع کافی کی یہ پوری روایت حضرت ابو بکرؓ کی منقبت میں ہے۔ یہ ساری روایت ایک شیعہ عقیدے کی ہے لیکن اسے اسلام کا اعجاز کہیے یا خلفاء راشدین کا صدق وخلوص کہ صحابہؓ کی منقبت کا کوئی نہ کوئی جزئیہ پھر بھی ان کی زبان پر کبھی آ ہی جاتا ہے۔

ملا محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) کی فروع کافی کی اس روایت کو دیکھئے:

''کچھ صوفی حضرات امام جعفر صادقؒ کے پاس گئے۔ حضرت امام کو اچھے لباس میں دیکھا۔ حضرت سفیان الثوریؒ نے آپ کو کہا کہ یہ لباس آپ کا معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت امامؒ نے فرمایا کہ ابو بکرؓ نے اپنی وفات سے پہلے اپنے مال کے پانچویں حصے کی وصیت کی تھی اس سے ظاہر ہے کہ وہ سارا مال خرچ کر دینے کے حق میں نہ تھے۔ اور ان کے بعد تم جانتے ہو کہ حضرت ابوذرؓ اور حضرت

سلمان فارسیؓ بھی مال پورا خرچ کردینے کے حق میں نہ تھے۔ اس پر حضرت امام نے یہ جملہ فرمایا:

ثم من قد علمتم بعده فی فضله و زهده سلمان و ابو ذر

(فروع کافی کتاب المعیشہ ج ۵ ص ۶۸ ج ۲ ص ۴ لکھنو)

ترجمہ : ''پھر آپ کے فضل وزہد میں آپ کے بعد تم جانتے ہی ہو حضرت سلمانؓ اور حضرت ابو ذرؓ ہیں۔''

ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب اثنا عشری مذہب ابھی قائم نہ ہوا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمانؓ سب ایک ہی عقیدے کے لوگ سمجھے جاتے تھے۔ ائمہ اہل بیت کے حلقوں کے سنی رواۃ بھی ان ائمہ کے ہاں مومن شمار ہوتے تھے۔ عصمت ائمہ کا مسئلہ ابھی وضع نہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپس میں کوئی مناظرہ کی فضا نہ تھی۔ صرف اس لیے کہ روایت کا انکار ہو سکے اسے خواہ مخواہ مناظرہ قرار دینا اور جواب کو الزامی بتانا کسی صاحب علم کو زیبا نہیں دیتا۔ پھر حضرت امامؒ کا یہ کہنا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کو معلوم ہوتا کہ تیسرے حصے کی وصیت میں ثواب زیادہ ہے تو وہ ویسا ہی کرتے' بتلا رہا ہے کہ حضرت امامؒ حضرت ابوبکرؓ کو دل سے پورا مومن سمجھتے تھے ورنہ جو دل سے مسلمان نہ ہو اس کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسے اس نیکی کا علم ہوتا تو وہ ضرور اس پر عمل کرتا۔ آپؒ نے ان کے علم پر تو جرح کی لیکن ایمان پر نہیں۔ رہی یہ بات کہ وصیت کرنے والا اگر اس سے پہلے کچھ وصیت کر چکا تھا تو ضروری نہیں کہ اب وہ اس کا بھی اعلان کرے۔ اس روایت میں سب سے پہلے ازهد کا لفظ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں ہے اور پھر حضرت سلمان فارسیؓ اور پھر حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں ہے۔ اس ترتیب کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوذرؓ اپنے زہد وفضل میں حضرت ابوبکرؓ کے طریقہ پر تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اول تھے اور یہ دونوں ان کے بعد اس وصف میں معروف ہوئے۔ اب ان تینوں کو زاہدین ومتقین میں شمار کرنا اور من ازهد من هؤلاء میں ان تینوں کو لانا' ان میں کوئی بات خلاف سیاق نہیں ہے۔ ہاں حالات تینوں کے اپنے اپنے رہے۔

۱۔ حضرت ابوبکرؓ سے یہ وقوع میں آیا کہ آپؓ نے اپنے مال سے پانچواں حصہ کی راہِ خدا میں وصیت کی' سو پانچویں حصے کی وصیت پر اصولاً کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ یہ تیسرے حصے سے کم ہے۔ تیسرے حصے سے زیادہ کرنا منع ہے۔ اس سے کم کسی مقدار میں بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔

یہ آپ کا اس وقت وصیت کرنا بتلاتا ہے کہ آپ اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ اس ایمان و یقین سے اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو رہے تھے جو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا اور آپ حضورؐ کی اس تعلیم پر عمل کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ وقت وفات تہائی مال کے اندر اندر کسی مقدار مال کی وصیت کی جا سکتی ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے اور آپ اس

وقت ہرگز ایمان سے تہی دامن نہ تھے جیسا کہ اثنا عشری لوگ خیال کرتے ہیں۔ آپؓ کا پورا دور خلافت حضورؐ کی پیروی میں گزرا اور آپ آخر دم تک ایمان و عمل پر قائم رہے۔

اگر خدانخواستہ آپؓ کی خلافت حضورؐ سے بغاوت ہوتی اور معاذ اللہ آپ اندر سے مومن نہ ہوتے تو آپ کا آخری عمل شریعت کی تابعداری میں وصیت کرنے کا نہ ہوتا۔

۲۔ حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوذرؓ سے جو وقوع میں آیا وہ یہ رہا کہ یہ دونوں حضرات پوری عمر میں کبھی اس مقام پر نہ آئے کہ ان کے پاس کچھ نہ رہا ہو۔ حضرت امامؒ نے فرمایا:

ولم یبلغا من امرهما بان صارا لا یملکان شیاء البتة کما تأمرون النّاس بالقاء امتعتهم و شیئهم ویوثرون به علٰی انفسهم و عیالاتهم.

ترجمہ : ''اور یہ دونوں اپنی عمر میں کبھی اس مقام پر نہ پہنچے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہ رہے ہوں جیسا کہ تم (صوفی لوگ) لوگوں کو اپنے پورے مال دے ڈالنے کا حکم دے رہے ہو۔''

یہ تثنیہ کے صیغے ان دو کے اپنے حالات کے لیے ہیں۔ رہا زہد و تقویٰ تو اس میں یہ تینوں اپنے اپنے درجہ میں پورے ممتاز رہے۔

من ازهد من هؤلاء میں یہ تینوں حضرات مذکور ہیں۔ اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس دور میں ان کے زہد و تقویٰ کی یہ شان درجہ شہرت میں عام تھی۔ امام جعفر صادقؒ یہاں اس خبر متواتر اور استفاضہ عام سے استدلال کر رہے ہیں کوئی الزامی جواب نہیں دے رہے۔ الزامی جواب کی باری تحقیقی جواب کے بعد آتی ہے؟ کیا یہاں حضرت امام جعفر صادقؒ کا کوئی تحقیقی جواب موجود ہے کہ کہا جا سکے اب حضرت امامؒ سے ایک الزامی جواب بھی سن لو۔ یہاں جمع حقیقت میں تین ہی کے لیے ہے۔ دو کے لیے تثنیہ کا جدا صیغہ ہے۔ جمع فوق الواحد عموم مجاز کے طور پر آتی ہے۔ اگر حقیقی جمع مراد لی جا سکے تو جمع فوق الواحد کا سہارا کا کوئی جواز پیدا نہیں کرتا۔ اگر اس تاویل کو جگہ بھی دی جائے تو بھی اس روایت میں حضرت ابوبکرؓ کے اول درجے کے فضل وزهد کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فروع کافی کی اس روایت کا درجہ اسناد

محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) نے الکافی (اصول بھی اور فروع دونوں) حضرت امام منتظر کی غیبت صغریٰ میں مرتب کی تھی اور حضرت امامؒ نے اپنے پہلے ظہور میں اس پوری کتاب کو دیکھا اور اسکی تصدیق فرما دی تھی۔

هذا کاف لشیعتنا۔ ''یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔''

آپ کا یہ تاریخی جملہ فروع کافی طبع لکھنو کے سرورق پر جلی الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب اثنا عشریوں کے

اصول اربعہ میں سب سے پہلی کتاب شمار ہوتی ہے۔ سو امام کی اس تصدیق کے بعد اس کے راویوں کی تعدیل کی کوئی مزید ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اگر کوئی ضد کا مارا پھر بھی سند کے پیچھے لگا رہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

کہتے ہیں اس کا ایک راوی سعدہ بن برقہ سنی تھا۔ سو جاننا چاہیے کہ حسب اصول شیعہ کسی راوی کے سنی ہونے سے اس کی روایت مسترد نہیں ہو سکتی۔ مشہور شیعی محدث عبدالرزاق لاہجی نے شیعہ اصول حدیث پر ایک رسالہ گوہر مراد لکھا ہے۔ اس میں اہل سنت کے تمام علماء میں محدثین کو اہل انصاف تسلیم کیا ہے۔ سو اگر ان کی روایت قبول نہ ہوگی تو اور کس کی ہوگی۔ علامہ حیدر علی نے منتھی الکلام میں اسے نقل کیا ہے:

بہار (بھارت) کے مقتدر عالم جناب ولایت حسین نے گوہر مراد کی یہ عبارت اس طرح نقل کی ہے:

''اہل انصاف درفرقہ سنیاں محدثین ایشانند کہ ہرچہ از جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بآنہا رسیدہ بے کم وکاست روایت مے کنند۔ مختصراً کذا فی منتھی الکلام۔''

(کشف التلبیس حصہ اول ص ۲۴ سید ولایت حسین بہاری)

یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؒ نے ان زاہدوں میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر محض اپنے جذبہ پسری کی وجہ سے کیا ہے' آپ ان کی اولاد میں سے تھے' اکثر فرماتے: ولدنی ابوبکرؓ مرتین اور آپ کی والدہ حضرت ام فروہ حضرت ابوبکرؓ کی حقیقی پوتی تھیں۔ حضرات اہل بیت نے ایمان کے مقابل کبھی اپنے آبا سے خیر خواہی روا نہیں رکھی۔ حضرت علیؓ مرتضی اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

ولقد کنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نقتل ابائنا وابناء نا واخواننا و اعمامنا مایزید ذلک الا ایمانًا و تسلیمًا و مضیاء علٰی اللقم و صبراً علی مضف الالم. (نہج البلاغہ جلد ۱ ص ۴۰۳ خط نمبر ۵۵)

ترجمہ: اور ہم بیشک حضور ﷺ کے ساتھ اپنے باپ دادوں، اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے اعمام کو قتل کرتے رہے اس سے ہمارا ایمان اور بڑھتا اور سر تسلیم کرنے کی اور ہمت ہوئی اور تکالیف ہر صبر کا جذبہ اور ابھرتا۔

علامہ طبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان ایک مقتدر شیعہ عالم ہیں مگر دیکھئے وہ کس طرح اپنی کتاب میں مجاہد قتادہ اور سعدی سے روایات لائے ہیں اور انہیں رد نہیں کرتے کہ یہ سنیوں کی روایات ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ شیعہ علماء نے سنی روایات سے اصولاً کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ سنی رواۃ حدیث کو ہمیشہ اہل انصاف تسلیم کرتے آئے ہیں۔

شیعہ لٹریچر میں منقبت ابی بکرؓ کی دوسری روایت

شیعہ مفسر علامہ طبرسی مجمع البیان میں لکھتا ہے کہ آیت **وسیجنبها الاتقی الذی یؤتی ماله یتزکی ابوبکرؓ** کی شان میں نازل ہوئی۔

عن ابن الزبیر قال ان الآیة نزلت فی ابی بکر. (تفسیر مجمع البیان ج)

ترجمہ: ''ابن الزبیر سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے حق میں اتری۔''

یہاں پھر وہی سوال ابھرتا ہے کہ یہ ابن الزبیر کا بیان ہے جو شیعہ مفسر علامہ طبرسی نے نقل کیا ہے اور وہ سنی ہے اور ہم سنی کی بات نہیں مانتے۔ ہم یہاں بھی وہی بات کہیں گے جو ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ غور کرو طبرسی ابن الزبیر سے یہ بات تردیداً نقل کر رہا ہے یا تسلیماً؟ وہ اسے اس کی تردید کرنے کے لیے لایا ہے یا وہ اسے تسلیم کر رہا ہے؟ اگر وہ اسے یہاں تسلیم کر رہا ہے تو کیوں نہ کہا جائے کہ شیعہ لٹریچر میں حضرت ابوبکرؓ کے لیے اتقیٰ کا لفظ موجود ہے اور اس کی آگے کہیں تردید نہیں۔ مولف آفتاب ہدایت نے اس روایت کو اپنی تائید میں نقل کیا ہے۔ اب اس کا جواب اس شیعہ کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''اس بات کو امین الاسلام علامہ طبرسی علیہ الرحمہ کی امانت' وسعت قلب اور عالی ظرفی پر محمول کرنا چاہیے کہ وہ باوجود ایک مقتدر شیعہ عالم ہونے کے اپنی تفسیر میں جہاں پہلے اپنے ائمہ طاہرین کے ارشادات پیش کرتے ہیں وہاں مخالفین کا نظریہ بھی بلا رد و قدح پوری دیانت داری سے پیش کر رہے ہیں۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۵۲)

یہاں موصوف کے ان الفاظ پر غور کریں' سو دیانت داری یہ ہے کہ اس روایت پر رد و قدح نہ کی جائے۔

''بلا رد و قدح پوری دیانت داری سے پیش کر رہے ہیں۔''

تعجب ہے کہ جب علامہ طبرسی اس کی تردید نہیں کر رہے تو اس شیعہ ڈھ گو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس کی تردید کے درپے ہوا۔ اور اس نے علامہ طبرسی کی اتنی تردید بھی نہ کی کہ اس نے اپنی اس کتاب کو سنی مفسرین کے اقوال سے کیوں بھر دیا ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص اس آیت کے تحت شیعہ ائمہ طاہرین کا قول تلاش کرے تو کیا وہ یہ بات معلوم کر پائے گا کہ ان کے یہاں اتقیٰ سے کون شخص مراد ہے جو حضورؐ پر اس وقت مال خرچ کرتا رہا۔ جب کوئی اور اس خدمت کے لیے آپ کے ساتھ نہ تھا' قرآن نے یہاں اس اتقیٰ کی یہ تفصیل خود نقل کی ہے کہ اس سے مراد اس وقت کا کوئی صاحب مال شخص ہے جو آپ پر مال خرچ کر رہا ہے۔

اتقی الذی یؤتی ماله یتزکی. (پ ۳۰ اللیل)

ترجمہ: ''اتقیٰ وہ شخص ہے جو اپنا مال دیتا ہے' دل کی پاکیزگی پانے کو۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا ہے کہ مال خرچ کرنے اور میرے ساتھ رہنے میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان ابوبکرؓ کا ہے۔ قرآن کریم نے اتقٰی کی یہ جو تفصیل کر دی ہے آپ اس کا مصداق بتلانے میں حضرت علیؓ حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کا نام نہیں لے سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا صاحب مال نہ تھا کہ اس وقت حضورؐ کی ضرورتوں میں وہ آپ کا اس طرح ساتھ دے سکے۔

تاریخ کی یہ بے لاگ شہادت بتلاتی ہے کہ حضورؐ پر ان دنوں مال خرچ کرنے کی جو سعادت حضرت ابوبکرؓ کے نام لکھی جا چکی تھی اس میں کوئی اور صحابیؓ آپ سے آگے نہ جا سکا اور قرآن کا یہ لفظ اتقٰی سب سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ پر ہی منطبق ہوتا ہے۔ کسی مجمل کا جب مصداق واضح ہو جائے تو پھر وہ مجمل نہیں رہتی، شخصیت متعین ہو جاتی ہے اور یہ اس کی صریح منقبت سمجھی جاتی ہے۔

شیعہ لٹریچر میں اس روایت کا ملنا گو وہ کسی درجے میں ہو صحابہ کرامؓ کی یقیناً ایک بڑی کرامت ہے۔ ہم پہلی روایت (ازھد النّاس والی) میں بھی یہ بات کہہ آئے ہیں کہ شیعہ لٹریچر میں بھی مدحِ صحابہؓ کی روایات اسی طرح ملتی ہیں کہ شیعہ کو ان کے بیان سے چارہ نہیں رہتا۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

شیعہ لٹریچر میں حضرت ابوبکرؓ کی منقبت پر تیسری شہادت

شیعہ کی معتبر کتاب، کتاب الاحتجاج طبرسی میں امام محمد تقی اور قاضی یحییٰ بن اکثم کا ایک مکالمہ درج ہے۔ اس میں قاضی یحییٰ نے حضرت عمرؓ کی فضیلت میں یہ حدیث پیش کی کہ حضرت عمرؓ کی زبان پر سکینہ اترتا تھا۔

فقال یحیی وقد روی ان السکینة تنطق علٰی لسان عمر فقال لست بمنکر فضل عمر و لکن ابابکر افضل من عمر. (کتاب الاحتجاج ص ۲۴۸)

ترجمہ: ”اس پر حضرت امام محمد تقی (۲۲۰ھ) نے فرمایا میں عمرؓ کی فضیلت کا منکر نہیں ہوں اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے افضل ہیں۔

یہاں یہ کہنا حسب سیاق تسلیم کرنے کے معنٰی میں ہے کہ میں حضرت ابوبکرؓ کی اس فضیلت کو تسلیم کرتا ہوں، اس کا منکر نہیں ہوں۔

آگے حضرت امام حضرت ابوبکرؓ کے تقویٰ اور خدا خوفی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آپؓ نے فرمایا کہ میں معصوم نہیں کہ مجھ سے غلطی ہو نہ پائے۔ میرا بھی ایک شیطان ہے جو مجھ پر چڑھائی کرتا ہے، جب ایسی کوئی صورت ہو تو فوراً مجھے اس پر ٹوک دیا کرو۔ (میں غلطی پر نہیں رہنا چاہتا وہ چڑھائی میں کامیاب نہ ہونے پائے۔) یہ بات آپؓ نے اپنے

خطبہ خلافت میں ان الفاظ میں کہی تھی۔ یہ الفاظ خود بتاتے ہیں کہ آپؓ نے اسے غالب نہ ہونے دیا۔ آپؓ کے ان الفاظ پر غور کریں۔

”جب تک میں کتاب و سنت کے مطابق چلوں میرا ساتھ دو اور اگر میں کہیں ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے اس پر ٹوک دو۔“

اس کی روشنی میں امام محمد تقی کا حاصل استدلال یہ نکلا کہ جب حضرت ابوبکرؓ معصوم نہ تھے تو حضرت عمرؓ بھی معصوم نہ ہوئے۔ سو اس حدیث کا مطلب کہ حضرت عمرؓ کی زبان حق بولتی ہے، یہ ہے کہ عام طور پر اس زبان سے حق ہی نکلتا ہے اگر کبھی کوئی اور بات نکلے تو دوسرے صحابہؓ سے استدعا کی جا رہی ہے کہ فوراً مجھے سجدہ سہو پر لے آؤ۔ مجھے اس پر فوراً ٹوک دو۔ حضرت عمرؓ کا حضورؐ کی وفات پر یہ کہنا کہ حضورؐ کی وفات نہیں ہوئی، یہ بات درست نہ تھی تاہم حضرت ابوبکرؓ نے اس کی اصلاح کر دی۔ سو آپ کی زبان پر حق جاری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ خلاف حق بات کبھی آپ کی زبان پر آ ہی نہ پائے۔ ہاں اگر کبھی بلا قصد کوئی غلطی راہ پائے تو میں اس پر بھی قائم نہیں رہنا چاہتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے حدیث میں ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ ہے۔ بایں ہمہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

فلا تکفوا عن مقالة بحق او مشورة بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطیٔ ولا امن ذلک من فعلی الا ان یکفی اللّٰہ من نفسی ما ھوا ملک به منی فانما انا وانتم عبید مملوکون لرب لا رب غیرہ یملک منا مالا نملک لانفسنا.

(نہج البلاغہ ج ۲ ص ۲۲۷)

ترجمہ: ”عدل کا مشورہ دینے سے اپنے آپ کو نہ روکنا۔ میں اپنی ذات میں خطا سے بالا نہیں ہوں اور نہ اپنے عمل میں اس سے بے خوف ہوں۔ مگر اللہ مجھے اپنے نفس کے دخل سے کافی ہو جائے، وہ مجھ سے زیادہ اس پر حق رکھتا ہے کہ میں اور تم سب اس کے غلام ہیں۔ اپنے رب کی ملکیت ہیں جس کے سوا اور کوئی رب نہیں ہم اپنے جی پر اتنا قبضہ نہیں رکھتے جتنا اس کا قبضہ ہم پر ہے۔“

آمدم برسر مطلب

قاضی یحییٰ کا حضرت علیؓ کی اس حدیث ان السکینة تنطق علٰی لسان عمر (رواہ البیہقی) سے مطلب یہ نہ تھا کہ آپؓ کی زبان پر ہر وقت حق جاری رہتا ہے۔ آپؓ حضرت عمرؓ کے عمومی تقویٰ و طہارت کی بات کہہ رہے ہیں یا یہ کہہ رہے ہیں کبھی مرادات الٰہیہ پیش از ورود حکم حضرت عمرؓ کی زبان پر جاری ہو جاتی تھیں۔ آپؓ کا آپ کے لیے ہر وقت اس کیفیت کا دعویٰ نہ تھا۔ قاضی یحییٰ نے یہ بات نہ کہی تھی جو ایک ڈھگو نے اپنی طرف سے گھڑ لی اور اس روایت میں ہر ہر وقت

کے الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیے۔

''اس کی زبان پر ہر ہر وقت حق کس طرح جاری ہو سکتا ہے۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۵۳)

حضرت ابوبکرؓ نے برسر منبر یہ کہا تھا فان زغت فقومونی لیکن طبرسی نے ان کی طرف سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں:

قال علی رأس المنبر ان لی شیطاناً یعترینی فاذا ملت فسددونی.

(احتجاج طبرسی ص ۱۴۸)

ترجمہ : ''آپؓ نے برسر منبر کہا' میرے لیے بھی ایک شیطان ہے جو میرے سامنے آتا ہے سو میں راہ صواب سے ذرا بھی کجی کی طرف جاؤں تو مجھے فوراً روک دیا کرو۔''

یہ الفاظ صحت سند سے حضرت ابوبکرؓ سے ہمیں نہیں ملے اور نہ ڈھکو نے ان پر کوئی سند پیش کی ہے۔ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان کا ہونا ایک الٰہی حکمت ہے تاکہ متقین اسے ناکام کرنے کا ثواب حاصل کر سکیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

ما منکم من احد الا وقد وکل اللّٰہ بہ قرینہ من الجن وقرینہ من الملئکۃ (قالوا وایاک یا رسول اللّٰہ) قال وایای ولکن اللّٰہ اعاننی علیہ فاسلم فلا یامرنی الا بخیر. (صحیح مسلم)

ترجمہ : ''تم میں سے ہر شخص پر اللہ تعالیٰ نے دو دو موکل لگا دیے ہیں جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک جن دوسرا فرشتہ۔ صحابہؓ نے پوچھا کیا یہ دو تو تیں آپ کے ساتھ بھی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا 'ہاں میرے ساتھ بھی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اس جن کے خلاف مدد فرمائی سو وہ مسلمان ہو گیا اور وہ مجھے سوائے بھلائی کے اور کوئی بات نہیں کہتے۔''

یہ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا' وہ مسلمان ہو چکا ہے سو وہ سوائے خیر کے مجھے کسی طرف نہیں لے جاتا۔ اس طرح اللہ کے اور مقبولین بھی اللہ کی فرمانبرداری کر کے شیطان کو لاغر کر دیتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

ان المؤمن لیضنی شیاطینہ کما یضنی احدکم بعیرہ فی السفر. (رواہ احمد)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے شیطان کو ناکام کرنے کی اگر یہ تجویز کی تو بھی اس میں شیطان کی ہی ناکامی ہے۔

تاہم ڈھکو اس سے انکار نہیں کر سکا کہ حضرت امام محمد تقیؒ نے واقعی یہ الفاظ کہے کہ میں حضرت عمرؓ کی فضیلت کا منکر نہیں ہوں۔ ہم یہاں علامہ سیوطی کو اس روایت کے تسلیم کرنے پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے' کاش وہ اسے بلا تاویل قبول کرتا۔ اگر وہ اپنے عقیدہ کی مجبوری میں اس کی شرح کسی اور طرح کر دے تو ہم اسے کیا کہہ سکتے ہیں لیکن ہم جب یہ الفاظ

شیعہ لٹریچر میں ائمہ کی زبان سے ادا ہوتے پڑھتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حق کی آواز کسی نہ کسی راہ سے تو ہم نے یہاں بھی سن لی ہے۔

شیعہ لٹریچر میں حضرت ابوبکرؓ کی منقبت پر چوتھی روایت

قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) نے مجالس المومنین میں مجلس سوم طائفہ دوم میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما سبقکم ابوبکرؓ بصوم ولا صلوٰۃ ولکن بشئی وقرفی صدرہ.

(مجالس المومنین ج ا ص ۲۰۶)

ترجمہ : ''تم پر ابوبکرؓ نے روزے اور نماز میں سبقت نہیں پائی لیکن وہ اس چیز میں تم پر سبقت لے گئے جو ان کے سینے میں قرار پکڑے ہے۔''

اس حدیث میں حضرت ابوبکرؓ کی قوت ایمانی کا بیان ہے۔ ایمان کا محل دل ہے اور دل کا محل سینہ ہے۔ حدیث میں ہے الایمان فعل القلب اور قرآن میں ہے:

لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور. (پ ۱۷ الحج ۴۶)

ترجمہ : ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن وہ دل جو سینوں میں ہوں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔''

یہاں اس چیز کا بیان ہے جو سینہ میں قرار پکڑے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ دل میں قرار ایمان کو ہی ملتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس چیز کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو اور صحابہ میں بمع حضرت علیؓ کے پائی جائے اور ظاہر ہے کہ وہ ایمان ہی ہو سکتا ہے۔ پھر اس میں حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور دوسروں کی نمازوں اور روزوں کو نوعاً ایک سی نمازیں کہا ہے۔ اگر وہ نوعاً بھی مختلف ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں صرف سبقت کا موضوع نہ بناتے۔ سبقت ایک سی چیزوں میں ہوتی ہے نہ کہ وہاں جہاں ایمان اور نفاق کا مقابلہ ہو رہا ہو وہاں نفی یا اثبات کی بات چلتی ہے سبقت کی نہیں۔

وہ کونسی چیز ہے جو سینہ ابی بکرؓ میں قرار پکڑے رہی

یہاں حضور اکرمؐ کا خطاب صحابہؓ سے ہے موضوع کلام حضرت ابوبکرؓ کی سبقت ہے۔ آپ کی یہ سبقت نماز روزہ سے نہیں' آپ کو اس دل میں قرار پکڑی چیز میں سبقت ملی ہے۔ معلوم ہوا یہ چیز وہی ہو گی جس میں عام صحابہ بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ صرف سبقت ابوبکرؓ کی رہے اور ظاہر ہے کہ وہ ایمان ہی ہو سکتا ہے جس میں تمام صحابہ کرام مشترک ہیں اور اس میں سبقت تاریخ اور قوت میں حضرت ابوبکرؓ لے گئے۔

اس روایت کو پہلے دور میں کس طرح سمجھا گیا۔ پہلے دور کے محدثین میں اسے ابوبکرؓ بن عیاش (۱۹۳ھ) سے بھی سنا گیا۔ آپ اسے کس سیاق میں نقل کرتے ہیں۔ اسے حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) اس طرح نقل کرتے ہیں:

هذا مما يعرف به ان ابابكر من يكون احد مثله فان اليقين والايمان الذى كان فى قلبه لا يساويه فيه احد. قال ابوبكرؓ بن عياش ما سبقهم ابوبكرؓ بكثرة صلوٰة ولا صوم ولكن بشئى و قرفى قلبه. (منهاج السنة ج ۳ ص ۱۸۳)

ترجمہ: ''اس سے یہ بات پہچانی جاتی ہے کہ ابوبکرؓ کے مثل کوئی کبھی نہ ہو سکے گا کیونکہ جو ایمان و یقین اس کے دل میں تھا کوئی اس کے برابر نہیں اترتا۔ ابوبکرؓ بن عیاش (۱۹۳ھ) نے کہا کہ ابوبکرؓ دوسرے صحابہؓ سے نماز روزہ میں نہیں بڑھے وہ اس چیز میں ان سے بڑے جو ان کے دل میں گڑ گئی تھی۔''

پہلے دور میں اس روایت کو جس طرح سمجھا گیا ہم اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ جو چیز ان کے دل میں اتری' وہ ایمان و یقین ہی تھا۔ شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے سینہ میں حب ریاست قرار پکڑے تھی اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس میں تو دوسرے صحابہؓ آپ کے ساتھ شریک نہیں رہے۔ پھر آپ ان پر یہ سبقت کیسے لے جا سکتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جس طرح تمام صحابہ نماز روزے میں ایک دوسرے کے شریک تھے' ایمان میں بھی سب شریک تھے۔ ان میں سبقت حضرت ابوبکرؓ لے گئے اور آپ کی اس ایمانی قوت کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب حضورؐ کی وفات ہوئی اور انکار ختم نبوت اور انکار زکوٰۃ کے فتنے اٹھے۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت ان سب فتنوں کے مقابلے میں اسی قوت ایمانی سے اٹھے جو انبیاء کی شان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ صحابیٔ رسولؐ حضرت حذیفہؓ نے کہا قام مقام الانبیاء۔ آپؓ کو پیغمبر نہیں لیکن آپؓ نے اس دن وہ استقامت دکھائی جو پیغمبروںؑ کی ہی میراث ہے۔

اس روایت میں لفظ سبقت بتاتا ہے کہ موضوع کلام وہ چیز ہے جس میں سب صحابہؓ شریک ہوں اور سبقت حضرت ابوبکرؓ کا نصیب ٹھہرے۔ رہی نماز تو وہ سب کی ایک ہی ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے ہوتی ہے۔ اس کی ولا الضالین پر سب آمین کہتے ہیں۔ سو نمازوں میں سبقت کسی کی نہیں ہوتی۔ رہے روزے تو یہ ایک ایسی عبادت ہے جو خالصۃً اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی ہر ایک کے اخلاص کو جانتا ہے۔ یہ صرف ایمان ہے جس کے مظاہرے عملاً ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ جس طرح اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے' یہ آپؓ کے اندر کی ایک آواز تھی جو خارج میں بھی عام سنی جاتی رہی۔

شیعہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں حضورؐ کا منشاء صحابہؓ کو یہ بتانا تھا کہ ابوبکرؓ حب ریاست میں ہر جگہ سبقت لے جاتا رہا ہے اور اسی ریاست کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہر موقع پر خرچ کرتا آیا ہے۔

مقام غور ہے کہ اگر آپ صحابہ کو ہی سمجھانا چاہتے تھے تو آپ خود بھی تو اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ سے نفرت کرتے اور اگر خود بحالات ایسا نہ کر سکتے تھے تو پھر آپ دوسرے صحابہؓ کو ان سے اس طرح نفرت کیوں دلاتے رہے۔ شیعہ کی یہ بات کتنی غیر معقول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ڈھائی سال خلافت کرنے کے لیے اپنے آپ کو حضورؐ کے ساتھ پورے تیس سال طرح طرح کی تکلیفوں اور مشکلات میں ڈالے رکھا۔ کیا کوئی ہوشمند اپنی دو سالہ راحت کے لیے تیس سالہ مشقت اختیار کرتا ہے؟ چہ جائیکہ پورے تیس سال آپ حضورؐ کے ساتھ ہر مشقت میں شریک رہے۔ کس لیے کہ دو سال حکومت کر لیں۔ غبی سے غبی انسان بھی شیعہ کی اس تاویل کی تائید نہ کرے گا۔

پھر جب تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آپؓ نے اپنے دور خلافت میں کوئی مال و دولت اکٹھے نہیں کیے' نہ اپنی اولاد کے لیے کوئی جاگیریں بنائیں۔ ایک عام اور سادہ زندگی بسر کی تو پھر یہ بات ہرگز لائق قبولیت نہیں رہتی کہ اس حدیث **ولکن بشئى وقرفى صدره** میں مراد (العیاذ باللہ) حب ریاست تھی جو ان کے سینہ میں جاگزیں تھی اور آپؓ اسی کے لیے زندگی بھر مشقتیں اٹھاتے رہے اور دنیا نے آپؓ کو آپؓ کے دور خلافت میں بھی اسی سادگی میں دیکھا جو آپؓ کی پہلی زندگی کی عمومی ادا تھی۔ جہاں تک اس حدیث کی صحت کا تعلق ہے' اسے رافضی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) لکھتا ہے:

اس مطلب کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں جسے ناسمجھ لوگ فضائل ابوبکرؓ میں پیش کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

ما سبقکم ابوبکرؓ بصوم ولا صلوٰة الا بشئى وقرفى قلبه. (مجالس المومنین ج ا ص ۲۰۶)

رافضی اس بیان میں دعویٰ کرتا ہے کہ یہ حدیث فضائل ابوبکرؓ میں نہیں ہے۔ یہ اس کی اپنی سمجھ ہوگی اور جو اسے فضائل ابی بکرؓ میں شمار کرتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ علماء ہیں۔ یہ اپنی اپنی سمجھ ہے لیکن اس بات میں دونوں میں کوئی اختلاف نہیں کہ واقعی یہ فرمودہ رسولؐ ہے۔ سو یہ ایسی حدیث ہے جسے رافضی بھی اپنے ہاں قبول کر چکے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ واقعی حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہؓ پر سبقت لے گئے تھے۔ اختلاف صرف اس میں رہا کہ کس چیز میں سبقت لے گئے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ آپؓ ایمان میں سبقت لے گئے اور رافضی کہتے ہیں' نہیں آپ حب سلطنت میں سب سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ تاہم اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم میں سبقت کا لفظ کہیں بھی کسی ناجائز بات میں آگے بڑھنے میں استعمال نہیں ہوا۔ اچھی بات میں آگے بڑھنا ہی سبقت کہلاتا ہے۔ آیت کریمہ **فاستبقوا الخيرات** میں نیکیوں میں ہی سبقت کی راہ بتلائی گئی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی نماز میں سبقت بایں طور رہی کہ حضرت کو جو نمازیں سفر ہجرت میں پیش آئیں ان میں پوری امت میں صرف آپ ہی حضورؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ سبقت اور کوئی نہ لے جاسکا۔

جہاں تک اس حدیث کی صحت کا تعلق ہے اسے رافضی تسلیم کرتے ہیں۔ قاضی نوراللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) نے اسے مجالس المومنین میں تسلیم کیا ہے۔

حضورؐ نے جب صیغہ ماضی میں ما سبقکم ابوبکرؓ بصوم و لا صلوٰۃ کہا تو اس وقت کیا آپ سب صحابہ سے نمازوں اور روزوں میں سبقت نہ لے گئے ہوئے تھے۔ اس وقت اگر آپ واقعی نماز میں دوسرے صحابہؓ پر سبقت نہ پائے ہوئے تھے تو کیا بعد میں بھی آپؓ نے حضورؐ کے تمام صحابہؓ کی امامت نہ فرمائی۔ اور کیا آپ اب نماز میں ان سے آگے نہ بڑھے تھے اور کیا نماز میں آپؓ ان پر سبقت نہ لے گئے تھے۔

قاضی نوراللہ شوستریؒ نے اس حدیث کے سیاق میں اپنی طرف سے جو باتیں کہی ہیں ہمیں ان سے بحث نہیں نہ وہ حدیث کا جزو ہیں۔ ہمارا استدلال صرف کلام پیغمبرؐ سے ہے ناقل کی اپنی رائے سے نہیں۔ آفتاب ہدایت میں اس حدیث کی کوئی بات چھپائی نہیں گئی تھی۔ اب اس پر ایک ڈھکو کا یہ کہنا کہ اس روایت کے نقل کرنے میں ماقبل اور مابعد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے' یہ ایک کھلی ڈھٹائی اور ایک کھلا جھوٹ ہے۔ نظر انداز صرف اس چیز کو کیا گیا ہے جو قاضی نوراللہ کی اپنی تھی۔ پیغمبرؐ کی بات صرف اتنی تھی جسے پورے کا پورا آفتاب ہدایت میں دے دیا گیا ہے۔ اب اس پر پوری بات نقل نہ کرنے کا الزام کسی طرح وارد نہیں ہوتا۔ اور پھر یہی نہیں اس ڈھکو نے اس بات کی نسبت خود حضورؐ کی طرف بھی کر دی۔ استغفراللہ العظیم۔ وہ لکھتا ہے:

''آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ کو مال وجاہ کا طمع دلایا۔ یہاں تک کہ وہ اسی لالچ میں آ کر مسلمان ہو گیا۔''

(تجلیات صداقت ۱۵۴)

افسوس صد افسوس! سوچئے' کیا یہ حضورؐ نے خود ہی حضرت ابوبکرؓ کو بتلا دیا تھا کہ میری خلافت تجھے ملے گی اور فتوحات کے خزانے سب تیرے ہاتھوں سے تقسیم ہوں گے اور یہ کہہ کر انہیں خوش کر دیا کہ علیؓ بھی تیرے پیچھے نماز پڑھیں گے اور وہ نیت اقتدا کی نہ کریں گے۔ شیعہ کے اس علم و فہم کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

اور پھر حضرت ابوبکرؓ بھی تو ایک بڑے آدمی تھے' اتنے ناداں نہ تھے کہ دو سال کی حکومت کے لیے وہ اپنی پوری زندگی تکلیفوں اور جوکھوں میں ڈالے رہیں۔ اس مقام تعلق کو وہی سمجھ سکتا ہے جو کبھی اس مصرعہ کی گہرائی میں اترا ہو:

کسی کی یاد میں میں نے مزے ستم کے لیے

شیعہ لٹریچر میں منقبت ابوبکرؓ کی پانچویں روایت

مقتدر شیعہ عالم ابوالفتح اربلی (۶۷۶ھ) نے اپنی کتاب کشف الغمہ میں ابوالفرج ابن الجوزی (۵۹۷ھ) کی کتاب صفوۃ الصفوہ سے یہ روایت لی ہے۔

حضرت امام محمد باقر سے پوچھا گیا کہ تلوار کو مرصع کرنا کیسا ہے' آپ نے فرمایا جائز ہے کیونکہ ابوبکرؓ نے اپنی تلوار کو چاندی سے مزین کیا تھا۔ راوی نے کہا آپ بھی ان کو صدیق کہتے ہیں۔ آپ اپنے مقام سے اچھلے اور فرمایا ہاں وہ صدیق ہے صدیق ہے صدیق ہے۔ جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ تعالیٰ اس کی کوئی بات دنیا اور آخرت میں سچی نہ کرے۔

حضرت امام محمد باقر نے یہاں آپ کو صدیق نہ ماننے والے جملہ رافضیوں کو بددعا دی ہے جس کا یہ نتیجہ رہا کہ رافضیوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے تقیہ اختیار کیا اور اسے ایک بڑی دولت سمجھا۔

یہ روایت خالص سنی عقیدے کی ترجمان ہے' اہل سنت اعتقاد رکھتے ہیں کہ ائمہ اہل بیت سب سنی عقیدے کے تھے اور امام محمد باقر (۱۱۴ھ) بھی سنی العقیدہ تھے۔ آپ کی شادی حضرت ابوبکرؓ کی پوتی ام فروہ سے ہوئی۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے عمل سے سند لے رہے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے عمل سے سند پکڑی کہ تلوار کو سجانا جائز ہے۔ امام جعفر صادقؒ آپ کو اپنے آباء میں سے سمجھتے تھے' جن سے آپ کا اس نشأ عنصری میں ظہور ہوا۔

شیعہ پر اہل سنت کا یہ الزام چلا آتا ہے کہ یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گستاخ اور بے ادب ہیں۔ ابوالفتح اربلی نے ان کے جواب میں یہ روایتیں پیش کی ہیں کہ دیکھو حضرت امام باقرؒ کس طرح حضرت ابوبکرؓ کی عزت کرتے تھے اور ان کے عمل سے سند لیتے تھے۔

ڈھکو یہاں کہتا ہے کہ ابوالفتح اربلی نے یہ روایت اہل سنت کی کتابوں سے اتمام حجت کے طور پر نقل کی ہیں۔ اتمام حجت کسے کہا جاتا ہے؟ اپنی بات کو دوسروں کی روایت سے بھی مدلل کرنا۔ سو یہاں یہ یقین کرنے سے چارہ نہیں کہ ابوالفتح اربلی ابن جوزی کی یہ روایت تردیداً نقل نہیں کر رہا' اسے اتمام حجت کے پیرائے میں روایت کر رہا ہے۔ اور یہ رضاء وتسلیم کا ایک عجیب منظر ہے۔

شیعہ لٹریچر میں منقبت صحابہؓ کی بات اس طرح بھی ملے تو اسے صحابہ کرام کی عنداللہ مقبولیت سمجھیں کہ شیعہ کے آنگن میں بھی صحابہؓ کی صداقت کی روشنی آ چکی ہے اور شیعہ مصنف نے اس کی تردید کی بجائے اسے اپنے اتمام حجت کے طور پر نقل کیا ہے۔

نکل جاتی ہے سچی بات جو اک بار مستی میں
تقیہ مصلحت بین سے وہ رند بادہ خوار اچھا

شیعہ لٹریچر میں منقبت ابوبکرؓ کی چھٹی شہادت

دنیا میں کسی شخص کے اپنی سوسائٹی میں معزز و موقر اور معین و موثر ہونے کی چار صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ اس وقت کے اعیان و اشراف اس کی بات کو لائق توجہ سمجھتے ہوں۔

۲۔ اس وقت دنیا کے رائج علم و فن میں اسے مہارت ہو۔

۳۔ روزی کمانی اسے آتی ہو وہ محض کسی کے رحم و کرم پر پڑا نہ ہو۔

۴۔ دوسرے ضرورت مندوں پر خرچ کرنا اسے آتا ہو۔

حضرت ابوبکرؓ حضورؐ کے دعویٰ نبوت سے پہلے بھی مکہ کے اشراف میں صائب الرای سمجھے جاتے تھے۔ ان اشراف میں یہ حضرات بھی ایک اپنا مقام رکھتے تھے۔

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفانؓ ۲۔ حضرت زبیر بن عوامؓ

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۴۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

یہ حضرات کس پائے کی شخصیتیں تھے یہ کسی تاریخ دان سے مخفی نہیں۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کے دوستوں میں سے تھے اور ان کی ترغیب سے داخل صف اسلام ہوئے۔ آپؓ اس درجہ میں موثر شخصیت تھے کہ یہ سب حضرات آپؓ کو صائب الرائی سمجھتے تھے۔ آپؓ کا انہیں خفیہ دعوت اسلام دینا ایک بہت مناسب طریق دعوت تھا۔

(۲) اس وقت عرب میں علم انساب تاریخ کا ایک بہت اہم شعبہ سمجھا جاتا تھا اور حضرت ابوبکرؓ اس میں ماہر مانے جاتے تھے۔

(۳) آپؓ اپنی روزی خود کماتے تھے، کسی کے دروازے پر نہ پڑے تھے۔

کان ابوبکرؓ قبل ان یشتغل بامر المسلمین تاجراً یغدو کل یوم فی السوق یبتاع الثیاب. (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۲۱)

ان دنوں مکہ میں کپڑوں کی کوئی دکانیں نہ تھیں۔ اہل مکہ کے ہاں تاجروں کی مارکیٹیں لگتی تھیں جنہیں سوق کہا جاتا تھا۔ سوق عکاظ ان کا سب سے بڑا میلہ تھا۔ وہاں بھی حضرت ابوبکرؓ کی مارکیٹ لگتی تھی۔ وہاں پھیری پر کپڑا بیچنے کا کوئی رواج نہ تھا۔

(۴) آپؓ دوسروں پر مال خرچ کرنا بھی جانتے تھے اور اسلام لانے پر ان کا بہت سا مال اسلام کی راہ میں لگا اور حضورؐ سے بھی اس کی تصدیق مروی ہے۔

شیعہ مورخین کے ہاں آپ کی اس پر وجاہت شخصیت کا بیان کس طرح ملتا ہے اسے ناسخ التواریخ ج ۲ ص ۵۶۳ میں دیکھیے۔

واز پس اول ابوبکر مسلمان شد نخستین عثمان بن عفان ...... و دیگر زبیر بن العوام ...... و دیگر عبدالرحمٰن بن عوف و دیگر سعد بن ابی وقاص و دیگر طلحہ بن عبیداللہ جملہ از دوستان ابوبکرؓ بودند و بدعوت او اسلام یافتند واز پس ادعبیدۃ در اسلام آمد۔

عشرہ مبشرہ میں سے چھ وہ حضرات ہیں جو صرف حضرت ابوبکرؓ کی ترغیب و تبلیغ سے اسلام لائے۔ حضرت ابوبکرؓ کو بھی ساتھ لے لیں تو یہ کل دس میں سے سات حضرات عشرہ مبشرہ کے ہیں، یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کہنے پر ایمان لائے۔ پھر ساری عمر یہ حضرت کے ساتھ رہے۔ یہ حضرات حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ عشرہ مبشرہ میں سے باقی تین حضرات حضرت علیؓ حضرت عمرؓ اور حضرت سعید بن خالد رضی اللہ عنھم اجمعین ہیں۔

یہاں حضرت ابوبکرؓ کی شخصی وجاہت اور ان کے دنیوی علم و تجربہ کا بھی بیان ہے مگر رافضی کا بغض ملاحظہ ہو۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کی اس دنیوی تعلیم و فنی مہارت کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ڈھگو لکھتا ہے:

"جہاں تک ان کی نسب دانی کا تعلق ہے یہ ایک ایسا علم ہے کہ **لا ینفع من علمه ولا یضر من جهله**." (تجلیات ج ۱ ص ۱۵۷)

لا یضر من جهله کا مطلب یہ ہے کہ اس علم کا نہ ہونا آخرت میں کسی ضرر کا سبب نہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیوی علوم و تجربات کا نفع دنیا میں بھی کسی کو نہیں پہنچتا۔ اگر نہیں پہنچتا تو کیا پھر کالج اور یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر صاحبان اپنے ان علوم و فنون پر دنیوی عنایات سے نوازے نہیں جاتے؟ افسوس کہ شیعہ صاحبان اپنے جوش تعصب میں اتنی بات تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

یہ ڈھگو اس روایت کے معارضہ میں وہ وجوہ لاتا ہے جو بذات خود اختلافی ہیں۔ وہ اس پر کوئی متفق علیہ وجہ معارضہ نہیں لا سکا۔ کسی بات کو کاٹنے کے لیے مخالف کی کوئی متفق علیہ دلیل پیش کرنی چاہیے۔ کوئی متنازعہ فیہ بات کسی دوسری متنازعہ فیہ بات کو کاٹ نہیں سکتی مگر رافضی یہ غلطی ڈھٹائی سے کرتا ہے۔ لکھتا ہے اس سلسلہ میں جن اکابر کے نام گنوائے گئے ہیں وہ سب کے سب دشمنان اہل بیت رسول ہیں۔ (ص ۱۵۸ ایضاً) معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

شیعہ لٹریچر میں منقبت حضرت ابوبکرؓ کی ساتویں شہادت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

الذی جاء بالصدق ...... (پ ۲۴ الزمر ۳۳)

"یہ وہ شخصیت ہے جو اپنی ہر بات میں صدق لے کر آیا۔"

اس کے ساتھ ہی ہے **وصدّق به** اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہ سب متقی لوگ ہیں۔

اس آیت میں حضورؐ کے اس صدق کی تصدیق کرنے والا کس کو کہا گیا ہے؟ حضرت علیؓ اس وقت نابالغ تھے اور حضرت ابوبکرؓ بالغ تھے۔ گواہی بالغ کی ہوتی ہے۔ شیعہ مفسر طبرسی اس پر پریشان تھا کہ شیعہ جو اس سے حضرت علیؓ کو مراد لیتے ہیں اس پر دنیا کیا کہے گی۔ اس نے اس پر ابوالعالیہ کی روایت لے لی کہ اس سے مراد ابوبکرؓ ہیں۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ شیعہ خلفائے ثلثہؓ کے حق میں کہی گئی روایات کو خوشی سے قبول نہیں کرتے۔ انہیں وہ مجبوراً قبول کرنی پڑتی ہیں۔ یہی حال اس روایت میں ہے۔ اس کا شیعہ کتابوں میں پایا جانا ہی ہمارے لیے کافی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے ہم اس روایت کو اس کا قرار واقعی وزن دے رہے ہیں۔

مخالف کی زبان سے سچی بات کب نکلتی ہے؟ جب وہ اس پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ بات کہے بغیر آگے نہیں چل سکتا۔

نکل جاتی ہے سچی بات جو ایک بار مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

بالغ کی گواہی اور نابالغ کی گواہی میں فرق

بالغ اپنی گواہی اپنی ذمہ داری پر دیتا ہے اور نابالغ اپنے والد کے مشورہ اور اس کی ہدایت سے چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گواہی اصل وہی ہے جو اپنی ذمہ داری پر ہو۔ آج تک کسی عدالت میں نابالغ کی گواہی کو اول درجے کی گواہی نہیں سمجھا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح عالی گو نبوت سے اس وقت بھی سرفراز تھی جب حضرت آدمؑ بھی ابھی پیدا نہ ہوئے تھے لیکن آپؐ نے دعویٰ رسالت چالیس سال کی عمر میں فرمایا۔ یہ اپنے ذمہ دارانہ منصب کا ایک فطری تقاضا تھا۔ گواہ کوئی بھی ہو وہ اصل مدعی سے تو نہیں بڑھ جاتا کہ اسے تیس سال کی عمر میں ہی اس بڑے منصب تصدیق نبوت کے لیے پیش کیا جاسکے۔ اس وجہ سے علامہ طبرسی کو لکھنا پڑا اور سنی موقف کے آگے جھکنا پڑا۔

قیل الذی جاء بالصدق رسول اللّٰہ وصدق بہ ابوبکر. (تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۳۷۹)

ترجمہ: ''یہ کہا گیا ہے کہ جو صدق لے کر آیا وہ حضور اکرمؐ ہیں اور جس نے آپ کی تصدیق کی وہ ابوبکرؓ ہیں۔''

دنیا گواہ ہے کہ آج تک یہی کہا گیا اور یہی سنا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ صدیق اسلام کہلائے۔ گویا یہ آپ کے نام کا جزو ہو گیا اور یہ لقب اس پیرائے میں آپ کا کوئی اور مصدق نہ پا سکا۔

شیعہ لٹریچر میں منقبت ابوبکرؓ کی آٹھویں روایت

بریدہ اسلمی کہتے ہیں میں نے حضور اکرمؐ کو کہتے سنا آپؐ نے فرمایا:

الجنة تشتاق الی ثلثة اتنے میں ابوبکرؓ آ گئے۔ اب روایت ملاحظہ ہو

فجاء ابوبکرؓ فقیل لہ انت الصدیق انت ثانی اثنین اذھما فی الغار فلو سألت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ھؤلاء الثلثة؟

جنت تین شخصوں کے شوق میں ہے۔ اتنے میں ابوبکرؓ آ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ سے کہا گیا آپ صدیق ہیں۔ قرآن میں ثانی اثنین اذھما فی الغار آپ کے حق میں ہے۔ کاش میں حضورؐ سے پوچھتا کہ یہ تین کون ہیں؟ یہ بھی ہمیں معلوم ہو جاتا۔

اس مقام پر یہ تین باتیں ملحوظ نظر رہیں۔

۱۔ حضورؐ کی موجودگی میں کسی کا حضرت ابوبکرؓ سے کہنا کہ آپ حضورؐ سے پوچھیں، یہ تین کون ہیں، عام سمجھ سے بالا ہے۔ آپؐ کی مجلس میں کسی کو اس طرح بات کرنے کی مجال نہ تھی۔ پھر جب اس نے حضرت ابوبکرؓ کی منقبت بیان کی، آپ کو صدیق کہا۔ آپ کو ثانی اثنین کہا اور یہ سب حضورؐ کے سامنے کہا اور حضورؐ نے اس پر نکیر نہ فرمائی تو اب یہ صرف اس راوی کی بات نہ رہی۔ حضورؐ کی طرف سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔ شیعہ لٹریچر میں حضرت ابوبکرؓ کی یہ عظیم منقبت اس طرح مسلم ہو تو یہ کیا کوئی کم فضیلت ہے؟ شیعہ لٹریچر میں اتنی منقبت بھی ملے تو یہ حق کی وہ چمک ہے جو ان تاریک گوشوں میں بھی کبھی چمک اٹھتی ہے پوری روایت کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ شیعہ اپنی کتابوں میں کس طرح کوئی حق کی بات کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ اس وقت اس مجلس رسول میں بنو تیم میں سے کون کون تھا جس کے طعن سے حضرت ابوبکرؓ ڈر رہے تھے یا بنو عدی میں سے کون تھا جس کے ڈر سے حضرت عمرؓ ڈر رہے تھے۔ رافضی ڈھ گو نے ان میں سے کس کا پتہ نہیں دیا۔ معلوم ہوا روایت کا یہ حصہ اسے کسی طرح لائق تسلیم نہیں صرف اتنا حصہ لائق تسلیم ہے کہ حضورؐ کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کی عظیم منقبت بیان کی گئی اور حضورؐ نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

۳۔ اس روایت کا ایک حصہ رافضی ڈھ گو نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

''اگر ان میں میرا نام شامل ہوا تو خدا کی حمد کروں گا اور اگر نہ ہوا تو بھی حمد باری کروں گا۔''

(تجلیات ص ۱۶۰)

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک حضرت علیؓ کو پتہ نہ تھا کہ آپ ان تین میں سے ہیں یا نہیں۔ جب حضورؐ دس صحابہ کو جنہیں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے یہ بشارت دے چکے تھے حضرت ابوبکرؓ کو یہاں تک کہہ دیا گیا تھا کہ جنت اپنے آٹھوں

دروازوں سے آپ کی مشتاق ہے تو کیا اب حضرت ابوبکرؓ کو اس میں کوئی تردد ہو سکتا تھا ہرگز نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روایت کا اگلا حصہ کسی طرح لائق تسلیم نہیں۔ جس میں جنت کی یہ خبر حضرت علیؓ حضرت سلمانؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کو دی گئی اور ان تین میں نہ حضرت بلالؓ شامل ہیں نہ حضرت امام حسنؓ، نہ حضرت امام حسینؓ۔ سو اس روایت کا آخری حصہ کسی طرح لائق قبول نہیں ہم رجال کشی کی اس روایت کے صرف پہلے حصے سے استدلال کر رہے ہیں کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ کی منقبت ایک کھلے پیرایہ میں حضورﷺ کے سامنے بیان ہوئی اور آپ نے اس پر کوئی نکیر نہ فرمائی۔

شیعہ لٹریچر میں منقبت ابوبکرؓ کی نویں روایت

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی ایک یہودی سے ایک طویل علمی گفتگو ہوئی۔ یہودی نے انبیاء بنی اسرائیل کے فضائل پیش کیے۔ حضرت علیؓ اس کے جواب دیتے رہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرتے رہے۔ یہودی نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کا چلنا پیش کیا۔ حضرت علیؓ نے جواباً یہ روایت پیش کی:

کنا معه علی جبل حراء اذ تحرک الجبل فقال له قرّ فانه لیس علیک الا نبی و صدیق و شہید فقر الجبل مطیعاً لامره. (کتاب الاحتجاج للطبرسی ص ۱۱۴)

ترجمہ: ''ہم حضورؐ کے ساتھ کوہ حراء پر تھے جب پہاڑ نے جنبش کی۔ سو آپ نے اس پہاڑ کو کہا قرار پکڑ سکون میں آ تجھ پر اس وقت ایک نبی ایک صدیق اور ایک شہید کے سوا کوئی نہیں۔ سو پہاڑ اسی وقت آپ کے اس حکم کے آگے جھک گیا۔''

یہاں لفظ کنا معه پر غور کریں۔ حضورؐ کے ساتھ اس وقت کتنے افراد تھے؟ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ سو یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پہاڑ پر حضورؐ کے سوا اوروں کا ہونا بصورت جمع تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس وقت حضورؐ کے ساتھ صرف حضرت علیؓ ہوں۔ کنا معه کے الفاظ اس کی تردید کر رہے ہیں۔

پھر حضورؐ نے آگے تین اسماء ذکر کیے۔ ۱۔ نبی ۲۔ صدیق ۳۔ شہید۔ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ اس وقت پہاڑ پر دو افراد نہ تھے مگر تعصب میں گھرا رافضی کہتا ہے کہ اس وقت پہاڑ پر دو افراد ہی تھے۔ ڈھ کو لکھتا ہے:

''اصل عبارت یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قم جبل فانه لیس علیک الا نبی او صدیق و شہید اے پہاڑ ٹھہر جا تجھ پر سوائے نبی یا صدیق شہید کے اور کوئی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ صدیق و شہید ایک ہی شخص کے دو عنوان ہیں۔''

بناء بریں نبی جناب رسول خدا اور صدیق و شہید جناب امیر علیہ السلام قرار پاتے ہیں۔

(تجلیات ص ۱۶۱ ج ۱)

یہ جواب نہ صرف حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کے الفاظ اذ کنا معه سے ایک کھلا مذاق ہے بلکہ قرآن پاک کے بھی کھلا خلاف ہے۔ قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کے ہاں انعام پانے والے چار طبقے ذکر کیے ہیں:۔

نبی، صدیق، شہید اور صالحین۔

فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النّبیین والصدیقین والشہداء والصالحین. (النساء)

پھر رافضی نے حدیث کی اصل عبارت کچھ اور بتائی ہے اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ اس میں واؤ عاطفہ کی بجائے او حرف تردید ذکر کیا ہے۔

یہ صورت حال بتا رہی ہے کہ رافضی کو حضورؐ کے فرمائے ان تین الفاظ نبی صدیق اور شہید کے تین مصداق نہیں مل رہے اور وہ مجبوراً صدیق اور شہید کا مصداق ایک شخص کو بتا رہا ہے۔ حضرت علیؓ کے لیے اس وقت تک کے اسلامی لٹریچر میں صدیق کا لقب کہیں نہیں ملتا اور یہاں لفظ صدیق اس طرح موجود ہے جیسے اس عنوان سے بتلائی جانے والی کوئی جانی پہچانی شخصیت مراد ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک صدیق کے عنوان سے شہرت صرف حضرت ابوبکرؓ کی تھی۔ حضرت علیؓ کے لیے اس وقت تک صدیق کا لقب کہیں نہیں بولا جاتا تھا۔ تو سنی لٹریچر میں یہ حدیث ان الفاظ میں پڑھ لیجیے۔ شیعہ لٹریچر میں یہ غلطی بھی پائی جاتی ہے کہ یہ جبل حراء کا واقعہ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں یہ جبل احد کا واقعہ ہے۔ جبل حرا مکہ کے قریب ہے اور جبل احد مدینہ کے قریب۔ اور ظاہر ہے کہ حضور اکرمؐ اب مدینہ میں رہتے تھے۔ مدینہ سے آپ جبل حراء پر گئے تھے تاریخ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ صحیح بخاری میں یہ روایت اس طرح ہے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صعد احداً و ابوبکرؓ و عمر و عثمان فرجف بهم فضربه برجله فقال اثبت احد فانما علیک نبی و صدیق و شہیدان.

ترجمہ: ''آنحضرت کوہ احد پر چڑھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ آپ کے ساتھ تھے کہ پہاڑ نے جنبش کی۔ آپ نے زمین پر پاؤں مارا اور فرمایا اے احد اپنی جگہ رہ تجھ پر اس وقت ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا اور کوئی نہیں۔''

سنی لٹریچر کی اس روایت سے شیعہ لٹریچر کی اس حدیث کے جملہ ابہامات اٹھ جاتے ہیں۔ کہیں لفظوں کا مذاق نہیں بنتا۔ بصورت دیگر شیعہ لٹریچر کی یہ روایت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہاں عمداً لفظ صدیق کا مصداق چھپا رکھا گیا ہے۔ شیعہ علماء کو چاہیے اپنی مبہم روایتوں کی توضیح میں تو سنی روایات کو قبول کر لیا کریں۔ خصوصاً جبکہ ان کے لٹریچر میں سنی رواۃ حدیث کو بھی عادل اور قابل اعتماد راوی مانا گیا ہے۔ اس پر ہم پہلے حوالہ پیش کر چکے ہیں۔

مشہور شیعہ محدث عبدالرزاق لاہجی ''گوہر مراد'' میں لکھتا ہے:

اہل انصاف در فرقہ سنیاں محدثین ایشانند کہ ہر چہ از جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بانہا رسیدہ بے کم و کاست روایت کنند۔

ترجمہ: ''اہل السنۃ میں (سنن طبقے میں) اہل انصاف ان کے محدثین ہیں وہ حضورؐ کی حدیثیں بے کم و کاست روایت کرتے ہیں۔''

یعنی وہ ان میں کانٹ چھانٹ نہیں کرتے۔

سو روایات اگر شیعہ لٹریچر میں کہیں مبہم بھی ملیں تو سنی رواۃ حدیث سے اس کی وضاحت لینے میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیے۔

ڈھکو رافضی نے بھی ایک بحث میں تسلیم کیا ہے کہ اہل سنت اپنی کتب حدیث سے صحابہؓ کے حق میں کسی بات کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ اب یہاں رافضی کو جبل احد کی پوری روایت قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ ڈھکو رافضی لکھتا ہے:

''ہم با انصاف ناظرین سے خدائے ذوالمنن کا واسطہ دے کر التماس کرتے ہیں کہ وہ شیعہ کی نہیں بلکہ سنیوں کی کتب سے ہی سہی مگر ان صفات جلیلہ کا اصحاب ثلٰثہ میں پایا جانا ثابت کریں۔''

(تجلیات ج ۱ ص ۲۱۶ سطر ۱۶)

دیکھیے ہم نے کتاب الاحتجاج کی اس مختصر روایت کی تفصیل صحیح بخاری کی روایت سے کر دی ہے اب ڈھکو کو اسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ دسویں روایت اور رافضی کا جواب

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

للّٰہ بلاد فلان فقد قوّم الاود وداوی العمد و خلّف الفتنۃ و اقام السنۃ ذھب نقی الثوب قلیل العیب اصاب خیرھا و سبق شرھا ادّی الی اللّٰہ طاعتہ واتقاہ بحقہ رحل و ترکھم فی طرق متشعبۃ لا یھتدی فیھا الضال ولا یستیقن المھتدی.

(نہج البلاغہ ج ۲ ص ۲۴۹)

ترجمہ: ''اللہ ہی کے لیے اس کی حکومت تھی' اس نے کجی کو سیدھا کیا' جہالت کا علاج کیا' فتنوں سے آگے نکل گیا' اس نے سنت قائم کی' دنیا سے پاکدامن گیا' بہت کم عیب والا تھا' حالات کی

اچھائی پالی اور شر و فساد سے بچ نکلا' اللہ کے حضور اس کی بندگی کی اور اس کے سامنے تقویٰ کا حق ادا کیا' وہ چل بسا اور لوگ پیچ در پیچ رستوں میں رہ گئے اس طرح کہ گمراہ اس میں رستہ نہ پا سکے اور راہ پانے والا یقین نہ کر پائے۔''

یہاں کوئی نام مذکور نہیں لیکن مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی حاکم اور صاحب بلاد کی بات ہو رہی ہے۔ کجیاں ٹھیک کرنے کی ذمہ داری کن لوگوں پر آتی ہے؟ حاکموں پر۔ سنتیں قائم کرنا انہی کا کام ہوتا ہے اور انہی کی پاک دامنی دیکھی جاتی ہے۔ یہ پیرایہ یہاں بتا رہا ہے کہ حضرت علیؓ یہاں اپنے سے پہلے کسی حکمران کا ذکر کر رہے ہیں جو ان سے پہلے ہوا اور اپنے سفر آخرت پر چلا گیا۔

اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ اس کا نام نہیں لے رہے۔ فقط فلاں سے اسے بیان کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ ایک ایسے ماحول سے دوچار تھے کہ کھل کر اس کا نام لینا مناسب نہ تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔ یہی لوگ جو حضرت عثمانؓ کے خلاف نکلے اور حضرت علیؓ نے خلیفہ بنتے ہی ان کے بارے میں کہا یملکوننا ولا نملکھم (نہج البلاغہ ج ۲ ص ۹۸)

مسلمانوں کی صف کب تک ایک رہی؟ حضرت علیؓ کے ایک دوسرے ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ جن فتنوں کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں وہ حضرت عثمانؓ کے بعد پھوٹے۔ آپؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

وانی انشدک اللّٰہ ان لا تکون امام ھٰذہ الامۃ المقتول فانہ کان یقال یقتل فی ھٰذہ الامۃ امام یفتح علیھا القتل والقتال الٰی یوم القیٰمۃ ویلبس امورھا علیھا ویثبت الفتن فیھا فلا یبصرون الحق من الباطل یموجون فیھا موجاً و یمرجون فیھا مرجاً. (نہج البلاغہ ص ۸۶)

ترجمہ: ''میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اس امت کے وہ امام نہ ہوں جو قتل کیے جائیں۔ یہ بات پہلے سے کہی جا رہی ہے کہ اس امت میں ایک امام قتل ہوگا کہ اس پر قتل و قتال کی راہ چل پڑے گی اور امت پر معاملات مشتبہ ہو کر رہ جائیں گے اور فتنے واقع ہوں گے۔ وہ حق اور باطل میں فرق نہ پا سکیں گے۔ انہی میں وہ اچھلیں گے اور انہی میں وہ گھسیں گے۔

مولانا دبیر اس پہلے خطبہ پر کہ 'ایک سربراہ ہوا جس نے ہر کجی درست کر دی' لکھتے ہیں:

''شارحین نہج البلاغہ نے لفظ فلاں سے ابوبکرؓ یا عمرؓ مراد لیا ہے۔ دیکھیے اس خطبہ میں حضرت علیؓ' حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کیسی تعریف فرماتے ہیں۔ (ص ۱۰۵)''

جواب رافضی

شارحین نہج البلاغہ میں شدید اختلاف ہے کہ اس فلاں سے مراد کون ہے۔ کسی نے ابوبکرؓ، کسی نے عمرؓ، کسی نے محمد بن ابی بکر مراد لیا ہے۔ الغرض

ہر کس بقدر فہمش فہمیدہ مدعا را

یہاں محمد بن ابی بکر اسی لیے مراد نہیں ہو سکتے کہ آپ کبھی بھی سربراہ امت نہ بنے تھے اور سیاق وسباق بتلاتا ہے کہ یہ بات کسی حکمران کی ہو رہی ہے۔ آپ امت میں اختلاف پھوٹنے سے پہلے سفرِ آخرت پر گئے۔ آپ حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کے ربیب (پروردہ) تھے اور یہاں حضرت علیؓ اس فلاں کی ایسے مدح فرما رہے ہیں گویا وہ فلاں آپ کے بڑے تھے۔ ایک دوسرے موقعہ پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا:

مضت اصول نحن فروعها. (ایضاً ص ۳۸۳)

"بڑے تو جا چکے اب ہم ان کے چھوٹے رہ گئے ہیں۔"

ان قرائن سے جب دوسرے سب احتمالات کٹ گئے تو اس میں فلاں سے مراد نہ محمد بن ابی بکر ٹھہرے نہ حضرت سلمان فارسیؓ جو بھی ہے وہ انتشار فتنہ سے پہلے کا کوئی فرد جلیل ہے۔ تو اب یہاں رافضی کا پیش کردہ قاعدہ **اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال** پورا کٹ گیا۔ جن اور افراد کا اس نے نام لیا' ان کی نفی سامنے آ گئی اب ان کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سوا کس کا نام رہا؟

رافضی ان احتمالات میں اترنے کی بجائے اگر سیدھا یہ کہہ دیتا کہ یہ بات حضرت علیؓ نے تقیۃً کہی تھی تو اس سے رافضی کی شاید اتنی بے آبروئی نہ ہوتی۔ پھر اس رافضی نے ایک یہ موقف بھی اختیار کیا ہے:

"امام کا یہ کلام ذوالوجہین ہے۔" (تجلیات صداقت ص ۱۶۳ سطر اول)

ذوالوجہین کلام کس کا ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

تجدون شر الناس یوم القیٰمة ذوالوجهین الذی یاتی هولاء بوجه و هولاء بوجه.

(متفق علیه کما فی المشکوٰة ص ۴۱۱)

اور یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

ان من شر الناس عند الله یوم القیٰمة ذوالوجهین ... وفی الباب عن عمار و انس ... هذا حدیث حسن صحیح .... جامع ترمذی ج۲ص۲۲)

ترجمہ: "اللہ کے ہاں قیامت کے دن تم سب سے برا آدمی ذوالوجہین پاؤ گے جو ادھر بات اور

طرح سے کرے اور ادھر اور طرح سے۔"

اہل سنت تو کبھی حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کو چکر باز کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ وہ کلام ہی کیا جس کا معنیٰ کوئی نہ سمجھے۔ دو رخی باتیں اپنے ماحول میں کون کرتے ہیں؟ یاد رکھیے حضرت علیؓ کا پیرایہ کلام ہرگز ذوالوجہین نہیں تھا۔ رافضی غلط کہہ رہا ہے۔ آپ اس سے پاک تھے کہ کسی کو اس طرح چکر دیں۔

پھر جب رافضی کے لیے ساری راہیں بند ہو گئیں تو اس نے آخری موقف یہ اختیار کیا کہ یہ اس فلاں کی مدائح سب حضرت عثمانؓ کے مقابل بیان ہو رہی ہیں۔ اس کے ان فقروں پر غور فرمائیں۔

(۱) کجی کو سیدھا کیا یعنی بہ نسبت ثالث شورش پسندوں کی سرکوبی کی۔

(۲) صاف لباس سے گیا یعنی بہ نسبت خلیفہ سوم اس کا ظاہر اچھا تھا جب ہی تو لوگوں نے زیادہ شور نہیں مچایا۔

(۳) بہ نسبت خلیفہ ثالث کے کم عیب تھا۔

(۴) بہ نسبت خلیفہ ثالث ظاہری نقائص سے بچتا رہا۔

رافضی نے یہ جو چار پہلو بیان کیے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ضمیر کے اس پہلو کو بھی تسلیم کر رہا ہے جو حضرت علیؓ کے اس خطبہ کا صحیح مورد ہے ورنہ حضرت علیؓ شیر خدا کو اس طرح ڈر ڈر کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر ڈر کی بات بھی اس طرح تکرار در تکرار اور اقرار بار بار کے ساتھ بھی بیان ہوئی ہے؟

مولانا دبیر کی پیش کردہ گیارہویں روایت اور رافضی کا جواب

روایت:۔ تزویج فاطمہ کی تحریک ابوبکرؓ نے کی (جلاء العیون از دواج اول ص ۱۷۸)

رافضی کا اقرار اور ایک بات پر اعتراض

"جب ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت امیر علیہ السلام نے تنگ دستی کی وجہ سے تا حال خواستگاری نہیں کی اور ان سے انہوں نے مالی امداد کا وعدہ کیا تھا۔ تب جناب امیر نے خواستگاری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرف قبولیت بخشا تو پھر اپنی پیشکش کے مطابق مالی امداد کیوں نہ کی۔" (تجلیات صداقت ص ۱۶۴)

اس میں رافضی کا صریح اقرار ہے کہ مولانا دبیر نے جو کہا ہے کہ تزویج فاطمہ کی تحریک حضرت ابوبکرؓ نے کی بالکل صحیح ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ پھر ان حضرات نے آپ کی مالی امداد کیوں نہ کی؟ ہمیں اس پر کوئی دلیل نہیں ملی کہ صحابہؓ نے آپ کی کوئی مالی امداد نہ کی تھی۔ یہ کہنا کہ انہوں نے آپ کی مالی امداد نہ کی تھی ایک نسبت خبریہ ہے اور ہر خبر کا کوئی مبدا ضرور

ہوتا ہے۔ اسے یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ امر منفی کے لیے دلیل نہیں ہوتی۔ پھر (۲) حضرات صحابہؓ اس پیغمبر کے تربیت یافتہ تھے جس کی تعلیم تھی کہ اس طرح دوسرے کی مدد کرو کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کسی کو کیا دیا ہے۔ پھر (۳) حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی عزت نفس کا تقاضا تھا کہ کوئی انہیں دوسرے کے سامنے کچھ نہ دے جب کہ آپؓ نے ان صحابہؓ سے یہ کہا تھا کہ بہ سبب تنگ دستی اظہار سے شرم آتی ہے۔ (تجلیات ص۱۶۴)۔ ہاں حضرت علیؓ نے اگر کہیں کہا ہو کہ ان حضرات نے حسب وعدہ میری کوئی مالی امداد نہیں کی تو رافضی کا فرض تھا کہ اس پر صحیح حوالہ پیش کرتا اور پھر یہ اعتراض جماتا کہ:

"اپنی پیش کش کے مطابق مالی امداد کیوں نہیں کی۔" (ایضاً ص۱۶۴)

لیجیے اب کھلی مالی امداد کا بھی ثبوت حاضر ہے۔

جب حضرت علیؓ نے اپنی زرہ حضرت عثمانؓ کے پاس چار سو درہم میں فروخت کی تو حضرت عثمانؓ نے پھر وہ زرہ حضرت علیؓ کو ہدیہ کر دی تھی۔

کیا اس طرح بالواسطہ حضرت علیؓ کی مدد نہ ہوگئی۔ حضرت فاطمہؓ کی عزت وعظمت کا تقاضا تھا کہ ان کی تزویج پر کوئی کھلے طور پر مالی امداد نہ کرے۔ یہ بالواسطہ مدد حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی عزت نفس کے خلاف نہ تھی۔

(ایک ضروری نوٹ) حضرت علیؓ سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ نے یہ کہا تھا:

"اے ابوالحسن کوئی فضیلت ہائے نیک سے نہیں ہے مگر یہ کہ تم اور لوگوں پر اس فضیلت میں سابق ہو۔" (ص۱۶۵)

اس میں ان حضرات نے حضرت علیؓ کو یہ کہا تھا کہ انہیں اور لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ مگر یہ نہیں کہا تھا کہ اے علیؓ تم ہم پر بھی سبقت لے گئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہجرت میں جو سبقت حضرت ابوبکرؓ کو حاصل ہوئی اور کوئی اس میں شامل نہ تھا۔ یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ تم حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پر بھی سبقت رکھتے ہو۔ پھر بھی رافضی اگر یہی سمجھتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے انہیں اپنے سے بھی اسبق بتایا تھا تو کیا اسے تواضع اور انکساری نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر رافضی کی چالاکی دیکھیے کہ کس طرح بغیر کسی دلیل کے اسبقت سے افضلیت پر استدلال کر لیا۔ مالکم کیف تحکمون۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ بارہویں روایت اور رافضی کا جواب

بس ان دراہم سے دو مٹھیاں لے کر ابوبکرؓ کو دیں اور فرمایا بازار میں جا کر کپڑا وغیرہ جو کچھ اثاث البیت درکار ہے لے آ۔ (آفتاب ہدایت ص۱۰۸ بحوالہ جلاء العیون ص۱۶۳)

رافضی کا جواب

"ضرورت تھی کہ کپڑا وہ شخص خریدے جو اچھے برے نیز اس کے بھاؤ وغیرہ سے واقف ہو۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے یہ کام ان کے سپرد فرمایا۔" (تجلیات صداقت ص۱۶۵)

جواب الجواب

معلوم ہوا کہ حضورؐ کو اس کام کے لیے حضرت ابوبکرؓ کی ضرورت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے تجربے پر پورا اعتماد تھا۔ آپؐ نے جب رقم حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کی تھی تو اس میں بھی آپؐ کو ان پر اعتماد تھا۔ حضرت عمارؓ کو جو پیچھے بھیجا تو یہ بطور خدمت گار کے بھیجا کہ جو سامان حضرت ابوبکرؓ خریدیں اٹھانے کے لیے کچھ خادم بھی ساتھ ہوں۔

مگر رافضی کہتا ہے کہ خدام کو پیچھے بھیجنا عدم اعتماد کیلیے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ انہیں یوں کہتے ابوبکرؓ سے رقم لے کر اپنے پاس رکھنا۔ قارئین اچھی طرح جان لیں کہ پورے شیعہ مذہب کی بناء بس اسی قسم کی بدگمانیوں پر ہے۔ حضورؐ کے بارے میں بار بار ایسے خیالات کہ پہلے آپ کی سوچ غلط ہوتی تھی اور وہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پر بہت اعتماد کر لیتے تھے اور پھر آپ اپنی رائے بدلتے اور شیعوں کے موافق ہو جاتے۔ اس قسم کے سب خیالات حضورؐ کی بلند پایہ فکر ونظر کے ساتھ کہیں لگاؤ نہیں کھاتے۔

کتاب نہج البلاغۃ علامہ شریف رضی شیعی (۴۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ اس کے خطبات حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں۔ اور آپ بے شک شیعہ نہ تھے۔ لیکن کتابیں مولفین کے مسلک سے پہچانی جاتی ہیں۔ منسوب الیہ کے مسلک سے نہیں۔ اثناعشریوں کے اصول اربعہ شیعہ مولفین کے ناموں سے شیعہ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں نہ کہ ائمہ اہل بیت امام باقرؒ اور امام جعفر وغیرہما (معاذ اللہ) شیعہ تھے۔ سوڈھ گو رافضی کا یہ لکھنا علم ودیانت سے خاصا دور ہے کہ کتابیں منسوب الیہ کے نام سے پہچانی جاتی ہیں، وہ لکھتا ہے:

"اسے شیعوں کی کتاب قرار دینا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام صرف شیعوں کے امام ہیں۔" (تجلیات ج۱ ص۱۰۲)

سو نہج البلاغۃ میں حضرت علیؓ کے نام سے حضرت ابوبکرؓ کی یہ منقبت ایک ایسی حقیقت ہے کہ ڈھ گو رافضی سے اس کا کوئی جواب نہ بن سکا۔ وہ یہ کہہ کر اس سے عہدہ برآ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ مدح سب حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں ہے۔ ہم کہتے ہیں صورت حال کچھ بھی ہو، ہے یہ مدح ہی تو ہے جو حضرت علیؓ کی زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ حضرت مولانا دبیرؒ نے اگر اسے حضرت علیؓ کی زبان سے حضرت ابوبکرؓ کی منقبت کہا ہے تو آپؒ نے کوئی زیادتی کی بات نہیں کی اور آپ اپنے دعوے میں صادق ہیں۔

مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ تیرہویں روایت اور رافضی کا جواب

''جس وقت مرض رسول کریم ﷺ پر سنگین ہوا اس وقت ابوبکر آئے اور کہا یا حضرت آپ کس وقت انتقال کریں گے۔ حضرتؐ نے فرمایا میری اجل حاضر ہے۔ ابوبکرؓ نے کہا آپ کو غسل کون دے گا؟ حضرتؐ نے فرمایا جو میرے اہل بیت سے مجھ سے زیادہ قریب ہو......سو حضورؐ نے بوقت نزع بھی آپ کو ہی شرف ہم کلامی بخشا۔'' (آفتاب ہدایت ص ۱۰۸ بحوالہ جلاء العیون ص ۷۷)

جوابِ رافضی

''یہ روایت ثعلبی سنی عالم سے منقول ہے جو شیعوں پر حجت نہیں۔'' (تجلیات ص ۱۶۶)

جواب

باقر مجلسی نے جلاء العیون میں اسے قبول کیا ہے یا اسے نقل کر کے اس کا رد کیا ہے؟ آگے پوری کتاب میں کہیں اس کا رد نہیں ملتا۔ سو اس نے اسے تسلیم کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے احکام کے قبیل سے نہیں کہ اس سے کوئی حکم ثابت ہو اور کسی راوی کا سنی ہونا اس کے اعتبار سے نہیں روکتا تبھی تو باقر مجلسی اسے قبول کر رہا ہے۔

سوالِ رافضی

''تیماردار کبھی یہ بھی پوچھا کرتے ہیں' آپ کس وقت انتقال کریں گے؟''

جواب

یہ کسی عام مریض کی بات نہیں ہو رہی۔ عام اموات سے تو یہ نہیں پوچھتے لیکن پیغمبر سے فرشتے بھی پوچھتے ہیں کہ آپ ابھی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں یا رفیق اعلیٰ کے لیے تیار ہیں۔ جب تک آپ ہاں نہ کریں انتقال دارین نہیں ہوگا۔ جب یہ بات فرشتہ پوچھ سکتا ہے تو کیا حضرت ابوبکرؓ یہ نہ پوچھ سکتے تھے؟ حضورؐ نے جب الرفیق الاعلیٰ کہا تو حضرت ام المؤمنین کو پتہ چلا کہ آپ یہاں رہنے کو پسند نہیں کر رہے تو کیا یہ حضورؐ کا اپنا بتلانا نہیں۔

پھر رافضی کہتا ہے کہ حجرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا (ص ۱۶۷ سطر ۳) اب دیکھئے کہ اتنے ہجوم میں حضورؐ سے ہمکلامی کا شرف حضرت ابوبکرؓ کو حاصل تھا یا نہیں؟ آخری وقت میں ہم کلامی کی یہ شان کیا مقربین کے سوا اور بھی کسی کو نصیب ہوتی ہے؟ نہیں۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ پوچھا کہ آپ کا بازگشت کہاں ہیں تو یہ اس لیے ہوا کہ آپ حضورؐ کے مقام کا پتہ کرنا

چاہتے تھے کہ مقام محمود اعلیٰ علیین ہے یا رفیق اعلیٰ یا اور کوئی منزل رفیع یا یہ کہ کیا آپ کا زیادہ ربط مدینہ منورہ کے اسی روضہ اطہر سے ہوگا؟ حضرت ابوبکرؓ نے اگر یہ سوال کیا تو رافضی نے اس پر اعتراض کر دیا کہ ابوبکرؓ صاحب کو تا حال یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پیغمبر اسلام کا انجام کیا ہے۔ (ص ۱۶۶)

دیکھئے تعصب نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ مقام کی بات کو انجام سے بدل دیا۔ رافضی اگر سوال نہ سمجھ پاسکا تھا تو اسے یہ بھی نہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ سوالات اس قدر احمقانہ ہیں کہ صاحب خلق عظیم کا ہی یہ کام تھا کہ انہوں نے ان کے جوابات دیے۔

پھر یہ بھی دیکھیں کہ حضور اکرمؐ کی منزل کا پتہ کیا ایک راز کی بات نہ تھی۔ اس پر رافضی کے یہ الفاظ کیا اس کی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں یا ان سے محض اس کی حماقت ہی ظاہر ہوتی ہے۔

''اس میں نہ کوئی راز کی بات ہے یہ چند عامیانہ سوالات ہیں۔''

دیکھئے رافضی خود اپنی تنگ دامنی محسوس کر رہا ہے تبھی تو آخر میں گنگنا رہا تھا

؎ بس اک عناد پر ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

بات کچھ بھی ہو آخری ایام میں حضرت ابوبکرؓ کا آپ کے مقربین میں ہونا آپ کے مقام رفاقت کا کھلے طور پر پتہ دے رہا ہے اور مولانا دبیر کی بھی یہی مراد اس حوالے سے تھی۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ چودھویں روایت اور رافضی کا جواب

امام جعفرؒ سے یہ حدیث مروی ہے:

هما اما مان عادلان قاسطان كانا على الحق و ماتا عليه فعليهما رحمة الله يوم القيٰمة. (آفتاب ھدایت ص ۱۰۹ ؟؟)

ترجمہ : ''ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں امام عادل تھے' انصاف پسند' دونوں حق پر تھے اور حق پر ہی فوت ہوئے۔ ان دونوں پر قیامت کے دن خدا کی رحمت ہو۔''

جوابِ رافضی

امام نے بطور توریہ یہ ذومعنی کلام ارشاد فرمایا جس کے معنی قریب سے مدح ظاہر ہوتی ہے اور معنی بعید سے مذمت۔

جواب الجواب:

۱۔ یہاں رافضی نے گواسے توریہ پر محمول کیا ہے لیکن اس نے ان الفاظ کا حضرت امام سے ثابت ہونا تو تسلیم کر ہی لیا ہے۔ اور یہاں پر قاری جو عقائد میں توریہ اور تقیہ کا قائل نہیں اس سے مدح کے معنی ہی مراد لے گا سو مولانا دبیر نے اسے پیش کر کے کوئی غلط بات نہیں کی۔

۲۔ اس رافضی نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اہل قرابت کے ہاں اس میں واقعی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی مدح ہے اور دور کے لوگوں کے لیے اس میں ان کی مذمت ہے۔

اس روایت کا دوسرا حصہ جو قاضی نور اللہ شوستری نے احقاق الحق میں نقل کیا ہے وہ ان وجوہ سے قابل قبول نہیں:۔

(۱) حضرت امام کی یہ حدیث ایک جم غفیر کے سامنے بیان ہوئی اور اس کے ظاہری معنی لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی مدح ہی سمجھے۔ جب لوگ چلے گئے تو ایک شخص نے حضرت امام سے اس کے معنی پوچھے تو امام نے ان تمام الفاظ کو ایک تاویل بعید میں بدل دیا۔ اب آپ ہی غور کریں کہ ایک جم غفیر کی روایت اور اس کے ظاہر معنی کی قبولیت کو ایک شخص کی روایت سے کیسے رد کیا جا سکتا ہے۔ وہ جم غفیر بھول میں تھا یا ایک شخص در پے افتراء ہے۔

حضرت امام نے فرمایا تھا: **ماتا علی الحق** ان دونوں کی وفات حق پر ہوئی۔

اب یہ ایک شخص حضرت امامؒ سے اس کا یہ معنی روایت کرتا ہے:

والمراد من موتهما علی الحق انهما ماتا علی عداوته من غير ندامة۔

شیعوں نے اس کا یہ معنی نہایت بے دردی سے کیا ہے۔ اور حدیث کا مطلب بری طرح بگاڑا ہے اس سے شیعہ مذہب کی پوری حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ حضرت امام نے یہ بات بطور توریہ کہی تھی۔ ایک اور سوال سامنے لاتی ہے۔

توریہ کن سے کیا جاتا ہے؟ جن سے اپنے آپ کو چھپانا مقصود ہو۔ آپ نے جب ایک شخص کے سامنے ہی اپنا راز کھولا تو معلوم ہوا کہ وہاں حضرت امام عام لوگوں کے سامنے بطور ایک سنی عالم کے ہی رہ رہے تھے تبھی تو آپؒ نے ان کے سامنے اپنا وہی عقیدہ ظاہر کیا جو سنی کہتے ہیں اور اپنی بات اپنے ایک شخص کے کان میں کہی۔ کچھ سوچیے کیا عقیدے اسی طرح ثابت ہوتے ہیں؟

رافضی کو یہاں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ حضرت امام جعفر عام لوگوں کے سامنے بطور ایک سنی عالم کے ہی رہتے تھے اور اس وقت تک شیعہ مذہب باقاعدہ وجود میں نہ آیا تھا۔ ورنہ امام کو توریہ کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور اپنے

آدمی ان کے ہاں پردے میں نہ رکھے جاتے جنہیں ظاہر سے ہٹ کر کوئی علیحدہ دین پڑھایا جاتا۔ حدیث میں ذوالوجہین کو شر الناس کہا گیا ہے۔ یہ مومنین کی شان نہیں کہ زندگی بھر دو چادریں اوڑھے رکھیں' ایک چادر میں اِدھر کی بات ہو اور دوسری میں اُدھر کی۔ کیا ایسے لوگوں کو کسی درجے میں بھی منبع ہدایت مانا جا سکتا ہے۔

پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیعہ علماء اب تک اس شخص کا کوئی نام اور پتہ نہیں بتلا سکے جس نے اس جم غفیر کی روایت کے خلاف حضرت امام کے نام سے یہ خلاف ظاہر روایت گھڑی۔ اگر حضرت امام جعفرؒ بھی شیعہ رواۃ کی طرح تقیہ کی چادر زیب تن رکھتے تھے تو پھر صادق کا لفظ ان کے نام کا جز و لازم کیوں بنا ہوا تھا۔ آپ کا نام جعفر صادقؒ اسی لیے تو تھا کہ آپ تقیہ کی چادر ہرگز اوڑھے نہ رہتے تھے۔ اور یہ کوئی محض ایک چھپا واقعہ نہیں' اپنے عقیدے کا ایک عوامی اظہار تھا۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ پندرھویں روایت اور رافضی کا جواب

شیعہ کی معروف کتاب نہج البلاغہ کی ایک بڑی شرح بحرین کے علامہ کمال الدین بن میثم نے ساتویں صدی (۶۷۷ھ) میں لکھی۔ اس میں اس نے حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کا ایک خط جو آپؓ نے حضرت معاویہؓ کے جواب میں لکھا تھا اس کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

وذكرت ان الله اجتبیٰ له من المسلمين اعواناً ايده بهم فكانوا فی مناز لهم عنده علیٰ قدر فضائلهم و كان افضلهم فی الاسلام كما زعمت وانصحهم لله ولرسوله الخليفة الصديق اوخليفة الخليفة الفاروق. ذكرت امراً ان تم لم يعنک كلمة وان نقص لم يلحقک ثلمة وما انت والصديق فالصديق من صدق بحقنا وابطل باطل عدونا وما انت والفاروق فالفاروق من فرق بيننا و بين اعدائنا. وذكرت ابطائی عن الخلفاء وحسدی اياهم والبغی عليهم فاما البغی فمعاذ الله ان يكون و اما الكراهة لهم فوالله ما اعتذر للناس من ذلک.

ترجمہ: اے معاویہؓ تو نے (اپنے خط میں) ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی نصرت کے لیے کچھ مسلمان مددگار چنے اور ان کے ذریعہ اپنے رسولؐ کی مدد کی وہ اپنے اپنے فضائل اسلامی کے مطابق حضور اکرمؐ کے ہاں اپنا مقام رکھتے تھے اور ان میں سب سے افضل جیسا کہ تو نے گمان کیا ہے اور خدا اور رسول کے سب سے بڑے خیر خواہ خلیفہ (ابوبکرؓ) صدیق اور پھر ان کے جانشین (عمرؓ) فاروق تھے۔ یہ تو نے ایک ایسی بات ذکر کی ہے جو پوری بھی ہو تو تجھے کوئی فائدہ نہیں دیتی

اور کچھ کم بھی ہو تو تجھے اس سے کوئی نقصان نہیں۔ تو کہاں اور صدیق کہاں' صدیق تو وہ تھا جس نے ہمارا حق جانا اور ہمارے دشمنوں کے موقف باطل کو غلط کہا۔ اور تو کہاں اور فاروق کہاں' فاروق تو وہ تھے جنہوں نے ہمارے اور ہمارے دشمنوں میں فرق کیا۔

پھر تو نے یہ ذکر کیا ہے کہ میں نے ان خلفاء کے تسلیم کرنے میں (چھ ماہ کی) دیر کی اور میں (ان کے مرتبہ عالی پر) حسد کرتا رہا اور ان کی خلافت کے خلاف میں بغاوت کے خیالات پھیلاتا رہا۔ سب جہاں تک ان کی خلافت کے خلاف بغاوت کا تعلق ہے سو اللہ بچائے کہ میں نے کبھی ایسا کیا ہو اور یہ جو میں نے ان کے (سقیفہ بنی ساعدہ کے) عمل کو (چھ ماہ تک) ناپسند کیا تو (میں نے اس کی وجہ بیان کر دی تھی) سو اب میں لوگوں کے سامنے اس سے عذر خواہی نہیں کرتا۔ (سب جانتے ہیں کہ میں نے سقیفہ بنی ساعدہ کے عمل سے (کہ اس موقع پر بنی ہاشم میں سے کسی کو نہ بلایا گیا تھا) ناپسندیدگی دل میں نہ رکھی تھی اور ان سے بیعت خلافت) کر کے اس ناراضگی کو ختم کر دیا تھا۔''

پیش نظر رہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف حضرت علیؓ کی خلافت کے تسلیم کیے جانے میں تھا۔ حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے سوابق اسلامی سے ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کرائیں' وہ ایسا کیوں نہیں کراتے اس پر انہیں یہ بدگمانی ہوئی کہ پھر خون عثمانؓ میں حضرت علیؓ کا کچھ اپنا دخل ہو گا لیکن حضرت علیؓ قسمیں کھا کھا کر خون عثمانؓ سے اپنی برأت کا اظہار کرتے رہے تھے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت میں کوئی اختلاف نہ تھا اور نہ آپ حضرت معاویہؓ سے ان کے خلاف کوئی ایسی بات کہہ سکتے تھے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے اس خط میں عربوں کے عام اسلوب کے مطابق پہلے ایک تمہید باندھی ہے اور تمہید متفقہ امور سے ہوتی ہے۔ اختلافی امور سے نہیں سو اس میں آپ نے حضور اکرمؐ ' حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کا ذکر کیا ہے اور اس میں رسالت محمدی اور خلافت شیخین کو اسلام کے متفقہ امور میں ذکر کیا ہے۔

آپ کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فضیلت کو تمہید میں ذکر کرنا بتلاتا ہے کہ اس وقت ان کی افضلیت مسلمات اسلام میں سے تھی۔ یہ حضرت معاویہؓ کی اپنی اختراع نہ تھی ورنہ وہ اسے اپنے اس خط میں بطور تمہید ذکر نہ کرتے۔ اس وقت تک پوری قلمرو اسلامی میں یہ بات کہیں نہ کہی گئی نہ سنی گئی تھی کہ قرآن کریم میں ثانی اثنین میں حضرت ابوبکرؓ کی شان مذکور نہیں ہے۔

آگے جو حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت تسلیم کرنے سے دیری کا طعنہ دیا ہے سو اس

میں ہم حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہیں ہیں۔ جب حضرت علیؓ خود اس تاخیر بیعت پر اپنی معذرت کر چکے ہیں تو اب ان پر کسی کو طعن کرنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ نے کوئی ایسی بات کی تو وہ خود صحابی ہیں۔ ہمیں کسی صحابی پر انگلی اٹھانے کا حق نہیں ہے' وہ مجتہد تھے اور ہم ان کا حق اجتہاد سلب نہیں کرتے۔

رہا آپ کا خلافت میں ان کے خلاف چلنا تو آپ اس سے بھی معاذ اللہ کہہ کر اپنی برأت کر چکے ہیں۔ تاہم ان الزامات میں جو حضرت معاویہؓ نے اپنے خط میں آپ پر لگائے ہیں ہم حضرت معاویہؓ کی حمایت نہیں کرتے۔ ہم خلیفۂ رابع حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کو ہی مانتے ہیں اور وہ بے شک خلیفہ راشد تھے۔

مولانا کرم الدین دبیر کا اس خط سے استدلال یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے اس خط میں حضرت معاویہؓ کی اس تمہید کو بایں طور حق قرار دیا ہے کہ آپ نے اس کی تردید نہیں فرمائی۔ اور اسے ان کے زعم کے مطابق درست تسلیم کیا ہے۔ پھر ان کے صدیق اور فاروق کے ذکر سے ان شخصیات کریمہ سے ذرا بھی اختلاف نہیں کیا اور یہ درست ہے کہ تمہید میں امور مسلمہ ہی لائے جاتے ہیں' امور مختلف فیہ نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سوابق اسلامی پر پورا اتفاق تھا۔

رافضی کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو یہ کہا تھا کہ یہ بات کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی افضل ترین امت اور حضورؐ کے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں تو یہ تیرا زعم باطل ہے۔

(دیکھئے تجلیات صداقت ص ۱۷۰ سطر ۲۳)

ہم کہتے ہیں کہ یہ زعم باطل کے الفاظ رافضی نے اپنی طرف سے اس روایت میں داخل کیے ہیں۔ زعم ہمیشہ بدگمانی کو نہیں کہتے۔ یہ لفظ اعتراف حقیقت کے لیے بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا:

ان نشأ نخسف بهم الارض او نسقط عليهم كسفاً من السماء . (پ۲۱ السباء ۹)

ترجمہ: ''اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں۔ یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں۔''

پھر جب کفار نے حضورؐ کو کہا کہ آپ اب آسمان کو ہم پر ٹکڑے کر کے گرا دیں جیسا کہ آپؐ نے یقین کر رکھا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے تو ایسا کر دکھائیں۔

کچھ سوچئے کہ یہاں زعمت کا لفظ اعتراف حقیقت کے معنی میں ہے یا کسی اور معنی میں؟

او تسقط السماء كما زعمت علينا كسفاً . (پ ۱۵ بنی اسرائیل ۹۲)

ترجمہ: ''یا تو گرا دے آسمان ہم پر جیسا کہ تو نے سمجھ رکھا ہے۔'' (ٹکڑے ٹکڑے کر کے)

رافضی نے جس طرح یہاں زعم باطل کے الفاظ اپنی طرف سے ڈال دیے ہیں اندلس کے ابن عبدربہ نے عقد

الفریدج ۳ ص ۷۰۴ و ۴۰۸ اور ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۷۰۴ سے صدیق اور فاروق کے الفاظ ہی ساقط کردیے ہیں نہ الفاظ رہیں نہ معنیٰ بدلنے کی ضرورت لاحق ہو۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے خط میں جو امور بطور تمہید ذکر کیے ہیں وہ حضرت علیؓ مرتضیٰ کے مسلمہ عقائد تھے اور یہی مولانا دبیر کہنا چاہتے ہیں۔

رافضی مولانا دبیر کے اس استدلال سے اتنا بے خود اور اتنا بے ہوش ہوا ہے کہ وہ اس دباؤ سے نکلنے کے لیے یزید کی قسم دینے پر آ گیا ہے۔ حالانکہ اس روایت میں یزید کا کوئی ذکر تک نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کی فضیلت پر مولانا کرم الدین دبیر نے یہ پندرہ روایات پیش کی تھیں۔ رافضی نے ان کے جو جوابات دیے ہم ان کا ایک ایک کا جواب ہدیہ قارئین کر چکے ہیں۔

اگلے مبحث میں مولانا کرم الدین نے شیعہ کتب سے کچھ روایات حضرت عمرؓ کی فضیلت پر ذکر کی ہیں۔ رافضی اب ان کے جوابات پر اترتا ہے۔ قارئین کرام ان ابواب میں بھی رافضی کی بے بسی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر مولانا دبیرؒ کی پیش کردہ پہلی روایت اور اس پر رافضی کا جواب

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے متعلق ملا باقر مجلسی شیعی نے بحار الانوار ج ۱۴ میں مسعود عیاشی سے یوں روایت کی ہے۔

روی العیاشی عن الباقر علیه السلام ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اللهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بابی جهل بن هشام.

(آفتاب ہدایت ص ۱۱۲)

"اے اللہ! اسلام کو عمر بن الخطاب کے ذریعہ قوت دے یا ابوجہل بن ہشام کے ذریعہ سے۔"

رافضی کا جواب

یہ روایت مرسل و مقطوع ہے اور مقام اعتقاد میں ایسی روایات حجت نہیں۔ (تجلیات ص ۱۷۳)

جواب الجواب

۱۔ روایت مرسل کسے کہتے ہیں؟ یہ وہ روایت ہے جس میں کوئی تابعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث روایت کرے اور اس میں صحابی کا نام مذکور نہ ہو جس سے اس نے وہ بات سنی۔ اس روایت میں امام باقرؒ اسے حضورؐ

سے روایت کرتے ہیں اور آپؒ نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا۔ آپؒ صحابی نہیں ہیں۔ تاہم حدیث مرسل امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک حجت ہے اور کوئی جلیل القدر تابعی کسی حدیث کو حضورؐ سے روایت کریں تو وہ کیوں قابل قبول نہ ہوگی؟ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ امام باقرؒ یہاں جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں۔ شیعہ اسے مرسل کہہ کر مشکوک کردیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ مگر ہم تو حضرت امام باقرؒ پر جھوٹ بولنے کا گمان نہیں کرسکتے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ کوئی صحابی ایسے وقت کی بات کرے جس میں وہ شریک واقعہ نہ تھا تو صحابہؓ کی یہ مرسلات حجت ہیں۔ امام باقرؒ کی مرسل روایت کیوں ٹھکرا دی جائے۔

۲۔ صحابہؓ میں یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی مروی ہے۔ جب اسے روایت کرنے والے صحابہؓ ہیں تو اب وہ حدیث کیسے مرسل رہ سکتی ہے۔

۳۔ اس روایت کے تمام راوی معتبر ہیں اور آپس میں متصل ہیں۔ درمیان میں کہیں انقطاع نہیں سو یہ حدیث منقطع نہیں ہے اور رافضی کا یہ کہنا کہ یہ روایت مرسل و مقطوع ہے قطعاً درست نہیں۔

اب اس حدیث کا متصل سلسلہ روایت بھی دیکھ لیجئے:

حدثنا محمد بن بشار و محمد بن رافع قالا اخبرنا ابو عامر العقدی اخبرنا خارجة بن عبد الله الانصاری عن نافع عن عن ابن عمر ان رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم قال اللهم اعز الاسلام باحب هٰذین الرجلین الیک بابی جهل او ابن الخطاب قال کان احبهما الیه عمر هٰذا حدیث حسن صحیح غریب.

(جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۰۹)

اس حدیث کی ایک دوسری سند میں النضر ابی عمر ایک متکلم فیہ راوی ہے اور وہ عن عکرمہؒ عن ابن عباسؓ سے اسے روایت کرتا ہے۔ سو یہ بالکل ایک دوسری سند ہے۔ اس کے حوالے سے اس حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اس حدیث میں دین کی کسی خاص مدد کا موضوع نہیں۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے دین کی ایک عالمی عزت کا سوال کیا ہے جس سے قومیں بنتی ہیں اور اسلام کی عزت صرف مومنین سے ہوسکتی ہے گو منافق اسے سمجھ نہ پائیں۔ قرآن کریم میں ہے:

وللّٰه العزة ولرسوله وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون. (پ ۲۸ المنافقون ۸)

ترجمہ: "اور عزت تو اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے لیکن منافق جانتے نہیں۔"

سو مذکورہ حدیث کا موضوع اسلام کی کسی خاص کام میں تائید نہیں۔ یہ اسلام کی عالمگیر عزت کا سوال ہے اور

تاریخ نے اس پر قوی شہادت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی یہ دعا منظور فرمائی اور حضرت عمرؓ داخل صف اسلام ہوئے اور حضرت عمرؓ کے توسط سے اسلام کو جو پوری دنیا میں عزت ملی اس کی مثال شاید پوری تاریخ اسلام میں نہ ملے۔

تو رافضی کے خیال میں حضور اللہ تعالیٰ سے کسی ایسے شخص کو مانگ رہے تھے جو کسی وقت اسلام کے لیے عزت کا سبب بنے۔ بھلا یہ بھی کوئی ایسی طلب ہے کہ قریش کے دو بڑے آدمیوں کا نام لے کر حضور اللہ سے استدعا کر رہے ہیں۔ اس عالمی عزت اسلام کا یہ ڈھ گو رافضی بھی ذکر کرتا ہے لیکن ذرا زبان مروڑ کر۔

''بعض اوقات خداوند دین اسلام کی نصرت و تائید ایسے لوگوں سے بھی کر دیتا ہے جو فاسق و فاجر ہوتے ہیں۔'' (تجلیات صداقت ۳۷۱)

جہاں تک کسی فاسق و فاجر کے دین کے کسی کام میں تائید کرنے کا تعلق ہے وہ خدا کی تکوینی حکمت کے تحت ہے لیکن جہاں تک اس کے تشریعی پہلو کا تعلق ہے حضورؐ نے صاف فرما دیا:

لا نستعین بمشرک ''ہم کسی مشرک سے مدد نہیں مانگتے''۔

اگر حضرت عمرؓ اندر سے ایمان نہ لائے تھے تو حضورؐ اپنے دین کے لیے کیا کسی کافر سے مدد مانگ رہے تھے؟ کیا یہ **لا نستعین بمشرک** کے صریحاً خلاف نہیں۔

اللھم اعز الاسلام میں حضورؐ اللہ تعالیٰ سے دین اسلام کی عزت مانگ رہے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے غیر مسلموں کے ذریعہ عزت اسلام کی دعا کریں۔ عزت اسلام ہے تو ہے ہی مومنین کے لیے۔ یہ منافقین کے لیے کیسے ہو سکتی ہے۔ **ان العزة للّٰہ ولرسولہ وللمؤمنین**۔

حضورؐ نے یہ تو بے شک فرمایا کہ اللہ تعالیٰ (اپنی تکوینی حکمت میں) بعض اوقات فاجروں سے بھی دین کی مدد فرما دیتے ہیں لیکن حضورؐ نے اس کام کے لیے کبھی اس طرح دعا نہ کی کہ اے اللہ فلاں فلاں کافروں سے میرے دین کی مدد فرما۔

جس طرح حضورؐ نے اللہ تعالیٰ نے دعا کی کہ اے اللہ عمر کے ذریعہ اسلام کو عزت و غلبہ عطا فرما۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کی کہ حضرت عمرؓ کی رائے جو ابوبکرؓ کے بارے میں ہو اس سے تو اسلام کی مدد فرما۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے اور انہیں دل و دماغ سے مومن سمجھتے تھے ورنہ حضورؐ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور دعا نہ کرتے:

اللھم اید الاسلام بعمر و برایہ فی ابی بکر (وکان اول الناس بایعہ)

(مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۷۷)

ترجمہ: ''اے اللہ عمر کے ذریعہ اور اس کی جو رائے ابوبکرؓ کے بارے میں ہو اس سے اسلام کی مدد فرما۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کھتے ھیں: فضل الناس عمر بن الخطاب باربع.

ترجمہ: ''حضرت عمرؓ چار باتوں میں سب پر فضیلت پا گئے۔''

ان چار میں چوتھی بات یہ تھی کہ عمر کی جو رائے ابوبکرؓ کے بارے میں ہو اس میں اس کی مدد فرما۔

اس میں حضرت عمرؓ کی اس رائے کی طرف اشارہ ہے جو آپؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں دی کہ خلافت بلا فصل کے لائق وہی ہیں۔ لوگوں میں آپ پہلے ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی تھی۔

سو حضورؐ کا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا کہ عمرؓ کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما اسے اس تائید دین پر محمول نہیں کیا جا سکتا جو اللہ تعالیٰ تکوینی طور پر کبھی کسی فاسق و فاجر سے لے لیتا ہے۔ ایسے جزوی مواقع پر خلفائے راشدین کے ذریعہ حاصل ہوئی اسلام کی عالمی عزت و شوکت کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اللھم اعز الاسلام باحب ھٰذین الرجلین الیک۔ حضورؐ حضرت عمرؓ کو دعا میں کس کے مقابل لائے ہیں؟ ابوجہل کے مقابلہ میں ابوجہل قریش کا ایک بڑا آدمی تھا اور اہل مکہ اپنے قومی امور میں اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس پائے کا مکہ میں اور بڑا آدمی کون تھا۔ وہ حضرت عمرؓ تھے۔ تو ان کا اسلام میں آنا اس شوکت کو توڑنے کے لیے تھا جو ابوجہل کو حاصل تھی۔ سو حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ صف اسلام میں آتے ہی صف اسلام کے ایک بڑے سردار سمجھے جاتے تھے اور حضور اکرمؐ بھی ان کو یہی مقام دیتے تھے۔

حضرت امام بخاریؒ باب اسلام عمر بن الخطاب میں پہلی حدیث یہ لائے ہیں' آپ کے اسلام لانے پر مسلمانوں نے کعبہ میں کھلے بندوں نماز پڑھی اور مسلمانوں کو یہ عزت اور شوکت حضرت عمرؓ کے ذریعہ نصیب ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

ما زلنا اعزة منذ اسلم عمر . (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۵)

ترجمہ: ''جب سے حضرت عمرؓ اسلام لائے ہم اسی وقت سے برابر کی عزت پا گئے۔''

حضورؐ کی دعا اسی وقت سے باغیچہ اسلام کو بہار پر لے آئی۔ آپ امت مسلمہ میں چالیسویں مسلمان تھے جس طرح قرآن کی چالیسویں سورة المؤمن ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی موقع کی یہ شہادت آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ کی ایک تفصیلی شہادت بھی سن لیجئے۔ شارح صحیح بخاری علامہ کرمانی آپ سے روایت کرتے ہیں:

ما كان الصحابة يستطيعون ان يصلوا في المسجد الحرام فلما اسلم عمر قاتلهم حتى تركونا فصلينا فيه ظاهراً.

ترجمہ: "صحابہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو آپؓ نے ان سے پورا مقابلہ کیا یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا اور ہم کھلے طور پر مسجد میں نماز پڑھنے لگے۔"

ہم اپنی کتابوں سے یہ شہادت اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ رافضی نے یہاں اپنے موقف کو اس راہ میں ایک متفقہ موقف بتلایا ہے۔ حالانکہ ہم اس کی اس تاویل سے اتفاق نہیں کرتے' یہ متفقہ موقف کیسے ہو گیا۔

"یہ ایسے کھلے ہوئے حقائق ہیں کہ ان میں ہرگز مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ پھر اسلام عمر سے اسلامی احکام کی اعلانیہ اشاعت میں کیا مدد ملی؟" (تجلیات صداقت ص ۱۷۳)

اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔

پھر رافضی نے ہمیں اپنی کتابوں سے حوالے کا حق خود دیا ہے' وہ لکھتا ہے:

"خامساً کتب اہل سنت سے ثابت ہے کہ جناب عمر ایسے ڈرپوک اور کمزور تھے کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

اہل سنت کتب سے اگر اس کے خلاف ثابت ہو تو یہ ڈھکو کیا اسے تسلیم کرے گا؟

الجواب

اگر واقعی ایسا ہی تھا تو اسلام لاتے ہی آپ مشرکین مکہ سے کیسے لڑے اور مسلمانوں کو کعبہ میں کھلے طور پر نماز پڑھنے کا حق انہوں نے کیسے دلوایا؟

رافضی کو مندرجہ ذیل روایت میں لفظ خائف نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس نے اس پر یہ کلیہ تمام کیا ہے کہ آپ بڑے ڈرپوک تھے۔

قال بينما هو في الدار خائف اذ جاءه العاص بن وائل السهمي.

ترجمہ: "آپ اپنے گھر میں خوفزدہ بیٹھے تھے کہ آپ کے پاس عاص بن وائل سہمی آیا۔"

کاش کہ رافضی نے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی لفظ خائف پڑھا ہوتا اور وہ اسے ایک وقتی حالت کہہ کر گزر جاتا۔

فخرج منها خائفاً يترقب قال رب نجني من القوم الظالمين۔ (پ۲۰ ۔ القصص ۲۱)

ترجمہ: "پس حضرت موسیٰ وہاں سے ڈرتے ہوئے نکلے۔ آپ نے کہا اے میرے رب مجھے ان ظالموں سے نجات عطا فرما۔"

پھر آگے ان کے لیے حضرت شعیب کی یہ بشارت بھی پڑھ لی ہوتی:

لا تخف نجوت من القوم الظالمين. (آیت ۲۵)

ترجمہ: "آپ خوف نہ کریں آپ ظالموں کی قوم سے بچ نکلے ہیں۔"

سو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیبؑ کے کہنے سے اطمینان ہوا اور خوف جاتا رہا اگر حضرت عمرؓ کو بنی سہم کے سردار عاص کے اطمینان دلانے پر سکون ہو گیا تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔

قرآن کریم میں خلافت انہی کا نصیب بتلائی گئی ہے جو پہلے خائفین میں رہے ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے خوف کو امن سے بدلا۔ وليبدلنهم من بعد خوفهم امناً۔ معلوم ہوا جو پہلے ڈر میں رہے خلافت پر وہ بھی آ سکتے ہیں۔ عاص نے بھی حضرت عمرؓ سے کہا تھا' "وہ تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے۔" آپ نے کہا اب مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔

قال لا سبيل اليك بعد ان قال امنت . (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۵)

ترجمہ: "عاص نے کہا وہ تیری طرف راہ نہ پا سکیں گے۔ آپ فوراً بولے اب میں بے خوف ہوں۔"

حدیث اللهم اعز الاسلام کی کچھ تفصیل ہم پیچھے کر آئے ہیں۔ افسوس کہ رافضی کو یہ لکھتے ہوئے کوئی علمی حجاب مانع نہ آیا' نہ اس نے اس پر کوئی شرم محسوس کی کہ روایت کا ہی انکار کر دیا وہ لکھتا ہے۔

یہ روایت صرف مقطوع السند ہی نہیں بلکہ موضوع بھی ہے۔ (تجلیات صداقت ص ۱۷۵)

اس پر ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔

اذا لم تستحي فاصنع ما شئت ۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت میں مولانا دبیر کی پیش کردہ دوسری روایت اور اس پر رافضی کا جواب

حضرت عمرؓ نے غزوہ روم کے موقع پر حضرت علیؓ سے مشورہ کیا کہ آپ خود اس جنگ میں نکلیں یا نہ؟ حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ آپ خود اس معرکہ میں نہ جائیں۔ آپ کے بعد مسلمانوں کے لیے مدینہ منورہ میں کوئی مرجع نہ ہوگا جس کی طرف وہ بصورت پریشانی رجوع کر سکیں۔ اس سے مولانا دبیرؒ نے یہ استدلال کیا تھا:

۱۔ مشورہ محل اعتماد میں ہی کیا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں بزرگ باہمی اعتماد قائم نہ رکھے ہوتے تو یہ صورت مشورہ

کبھی سامنے نہ آتی۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے مدینہ سے نکلنے کی صورت میں حضرت علیؓ کی نظر میں کوئی ایسا مرجع المسلمین نہ تھا جو مسلمانوں کو سنبھال پائے۔

۳۔ حضرت علیؓ کی نظر میں اس معرکہ میں حضرت عمرؓ کی کامیابی مسلمانوں کی کامیابی تھی۔

رافضی نے مولانا دبیر کے جواب میں یہ چار باتیں کہی ہیں۔

۱۔ اس مشورہ لینے کو اتحاد کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (تجلیات صداقت ص ۱۷۶ سطر ۲۳)۔

جواب الجواب

مولانا دبیر نے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی اعتماد پر استدلال کیا ہے۔ رافضی اسے توڑ نہ سکا اور اتحاد کی بحث پر آ گیا کہ اس مشورہ کو باہمی اتحاد کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

۲۔ دوسری بات کے جواب میں رافضی لکھتا ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔ غلط مشورہ دینا خیانت ہے۔ (ص ۱۷۷)

جواب الجواب

اس میں رافضی نے خود مولانا دبیر کی تصدیق کردی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس جنگ میں خود نکلنے سے واقعی مدینہ میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہ تھا جو ان نازک حالات میں مسلمانوں کا مرجع و ماوی ہو سکے گا۔ رافضی نے یہاں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اگر حضرت علیؓ یہ مشورہ نہ دیتے تو یہ ایک خیانت ہوتی۔ سو آپ کا یہ مشورہ دینا ایک کھلی حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کی نگاہ میں مسلمانوں کے پاس حضرت عمرؓ کے پائے کا اور کوئی دوسرا نہ تھا۔

۳۔ مولانا دبیر کا تیسرا استدلال یہ تھا کہ حضرت علیؓ کی نظر میں یہ معرکہ حضرت عمرؓ کی کامیابی واقعی مسلمانوں کی کامیابی تھی۔

رافضی نے یہاں بھی مولانا دبیر کی بات کو پورے طور پر قبول کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''حضرت علیؓ کے اس مشورہ میں اسلام کی بقاء و فلاح پوشیدہ تھی۔'' (ص ۱۷۷ سطر ۲۴)

رافضی نے جس طرح یہاں مولانا دبیر کے استدلال کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں ہم اس پر اس کے سوا کچھ نہیں کہتے:

ع لگی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

کسی جنگ میں مشیر کے فرائض سرانجام دینا کیا اس جنگ میں حصہ لینا نہیں سمجھا جاتا مگر رافضی کی کند ذہنی

ملاحظہ کیجئے۔ وہ اتنی بات بھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ لکھتا ہے۔

حضرت امیر ان لوگوں کے ان جنگی کارناموں کو صحیح سمجھتے تو انہوں نے ان میں عملی حصہ کیوں نہ لیا۔

(ص ۱۷۸ سطر ۶)

رافضی کے ہاں کسی معرکہ میں شریک تدبیر ہونا گویا عملاً حصہ لینا نہیں ہے۔ اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ حضرت حسینؓ نے کس طرح اپنی فوجی خدمات حضرت عثمانؓ کے سپرد کر رکھی تھیں اور وہ آخر وقت تک ان کا پہرہ دیتے رہے۔

۴۔ رافضی کی ایک یہ بات بھی ملاحظہ ہو۔

''رابعاً حضرت یوسف سے کافر عزیز مصر کا مشورہ طلب کرنا......قرآن مجید میں مذکور ہے۔''

جواب الجواب

حضرت یوسف اور عزیز مصر میں اقتدار اور حکومت کا کوئی نزاع نہ تھا۔ کفر و اسلام کے وسیع فاصلے کے باوجود وہ دونوں ایک نظام میں شریک تھے اور حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر نے ہی اس مالی عہدے پر مامور کیا تھا۔ حضرت یوسف نے خود اس سے کہہ کر یہ ذمہ داری لی تھی۔

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم . (پ ۱۳ یوسف ۵۵)

ترجمہ: ''حضرت یوسفؑ نے کہا' مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردے میں بہت حفاظت کرنے والا اور حالات کو خوب جاننے والا ہوں۔''

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں اثنا عشری عقیدے کی رو سے مابہ النزاع خلافت اور سیاسی اقتدار تھا اور یہاں معرکہ روم ایک سیاسی جنگ تھی۔ اب ان حضرات کا ایسے سیاسی اور ملکی مسائل میں باہمی مشورہ کرنا اسے حضرت یوسفؑ اور عزیز مصر کے کسی باہمی مشورے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت یوسفؑ عزیز مصر کی طرف سے ایک منصب پر مامور تھے۔ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے کسی عہدے پر مامور نہ تھے۔ سو رافضی کا یہاں عزیز مصر کی بحث لانا ایک بے تکی اور قیاس مع الفارق ہے۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ تیسری روایت اور اس پر رافضی کا جواب

حضرت عمرؓ نے غزوہ فارس کے موقع پر بھی حضرت علیؓ سے مشورہ لیا اور ایک بار پھر یہ بات کھلی کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پورے حلقہ اعتماد میں تھے۔ مشورہ محل اعتماد ہی میں کیا جاتا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی اس مہم کو اسلام کی پہلی جنگوں (معرکہ بدر اور معرکہ احزاب وغیرہ) سے جوڑا اور اپنے آپ کو حضرت عمرؓ کی افواج میں جمع متکلم کے صیغوں سے داخل کیا۔ اس پر مولانا دبیر نے یہ استدلال کیا تھا:

حضرت علیؓ مرتضیٰ حضرت عمرؓ کو برحق خلیفہ سمجھتے تھے...... آپ نے حضرت عمرؓ کو اسلام کی چکی کا قطب اور محور قرار دیا جس کے گرد پوری دنیائے اسلام گھومتی تھی۔

اس سے زیادہ واضح دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کو ہی خلیفہ رسول اور پیشوائے اسلام سمجھتے تھے۔

(آفتاب ہدایت ص ۱۱۶)

اس کے جواب میں بھی رافضی نے اسی طرح ہتھیار ڈالے ہیں جس طرح دوسری روایت کے جواب میں وہ چاروں شانے چت گرا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

حضرت امیر نے المستشار موتمن کے پیش نظر شخصی جذبات و مفادات سے بالاتر ہو کر وہ صائب مشورہ دیا ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت و بقا پوشیدہ تھی۔ (ص ۱۷۹)

ہم پھر یہاں وہ مصرعہ دہراتے ہیں جو ہم پہلے کئی بار لکھ آئے ہیں

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

رافضی کی ایک شرمناک توجیہ

رافضی یہ کہتا ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کو میدان جنگ میں نہ جانے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ کہیں آپ جنگ سے بھاگ نہ کھڑے ہوں اور اس صورت میں مسلمانوں کا بنا بنایا وقار ختم ہو جاتا۔ (ص ۱۸۰)

وقار کیوں ختم ہو جاتا۔ پیچھے مدینہ میں کیا غدیر خم کے مقرر کردہ خلیفہ بلافصل موجود نہ تھے جو مسلمانوں کو اپنی امامت پر پھر سے جمع کر لیتے۔ اس صورت میں حضرت علیؓ نقض بیعت کے بھی مجرم نہ ہوتے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے جو خلافت کی بیعت کی تھی وہ انہوں نے توڑ دی ہے۔ اور سارے مسلمان اس پر ان کے پیچھے لگ جاتے کیونکہ اب کوئی بڑا سیاست دان ایسا نہ تھا جو ان سے خلافت چھین سکے۔ رہے حضرت عثمانؓ تو وہ آپ کے ہم زلف تھے ان سے گھر میں ہی مصالحت ہو جاتی۔ خلافت کو صحیح سمت پر ڈالنے کا اس سے بہتر موقع کونسا ہو سکتا تھا۔ سو جس چیز کو رافضی صحیح امانت دارانہ مشورہ کہہ رہا ہے اسی نے حضرت علیؓ کو (معاذ اللہ) ہمیشہ کے لیے خلافت پر آنے سے روک رکھا تھا اور رافضی کے خیال میں تو چوتھے نمبر پر بھی آپ بلاشرکت غیرے برسر اقتدار نہ آئے تھے۔ استغفر اللہ العظیم۔ آپ کے مشورہ کی یہ توجیہ اپنی سوچ میں اس سے کمزور تر ہے جس طرف مولانا دبیر شیعوں کو متوجہ کر رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کے مشورہ کے یہ پہلو لائق غور ہیں۔ ممکن ہے ان پر غور کر کے کچھ مریض ذہنی شفا پا سکیں۔

۱۔ حضرت علیؓ نے اس معرکہ کو پہلی اسلامی جنگوں سے جوڑا ہے۔ آپ کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

ان هذا الامر لم يكن نصره ولا خذلانه بكثرة ولا قلة وهو دين الله الذى اظهره

وجنده الذى اعده وامده حتى بلغ ما بلغ وطلع حيث ما طلع ونحن على موعود من الله والله منجز وعده و ناصر جنده. (نهج البلاغه ۲ ص ۳۹)

ترجمہ: ''اس دین میں کامیابی اور ناکامی کا مدار کبھی فوج کی کمی بیشی پر نہیں رہا۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جسے اس نے سب دینوں پر غالب کیا ہے اور یہ اس کا لشکر ہے جو اس نے تیار کیا اور اسے دور دور تک پھیلایا ہے۔''

یہاں هذا الامر سے کیا مراد ہے؟ وہی دین جس کے موسس حضور اکرمؐ تھے۔ اس وقت کے حضرت عمرؓ کے معرکہ دین کو آپ نے وہی دین قرار دیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے ذریعہ سارے دینوں پر غالب کرنے کا وعدہ دیا ہوا تھا۔

هوالذى انزل رسوله بالهدىٰ و دين الحق ليظهره علىٰ الدين كلّه وكفىٰ بالله شهيدا. (پ ۲۶ الفتح ۲۸)

ترجمہ: ''وہ ہے جس نے بھیجا ہے رسول کو سیدھی راہ دے کر اور دین حق دے کر تا کہ وہ اس دین کو دوسرے سب دینوں پر غالب کر دے اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا۔''

۲۔ حضرت علیؓ نے خود کو اس لشکر کا شریک حال جانا ہے۔ ان جملوں میں صیغہ متکلم پر غور فرمائیں۔

(۱) ونحن على موعود من الله والله منجز وعده و ناصر جنده. (ایضاً)

(۲) واما ما ذكرت من عددهم فانا لم نقاتل فيما مضىٰ بالكثرة وانما كنا نقاتل بالنصر والمعونة. (نهج البلاغه ج ۲ ص ۴۰)

ترجمہ: (۱) ''اور ہم اللہ کے وعدے پر کھڑے ہیں اور وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی مدد کرے گا۔''

(۲) ''اور آپ نے ان کی تعداد جو بتلائی ہے تو ہم سابق میں بھی تو کثرت کے بل بوتے پر نہیں لڑتے رہے، ہم پہلے بھی اللہ کی تائید و نصرت پر ہی لڑا کرتے تھے۔''

موعود من اللہ سے کونسا وعدہ مراد ہے جسے حضرت علیؓ الٰہی وعدہ فرما رہے ہیں۔ یہ وہی وعدہ خلافت ہے جو قرآن کریم میں سورہ نور میں اس طرح دیا گیا ہے:

وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنّهم فى الارض.

(پ ۱۸ النور ۵۵)

ترجمہ: ''اللہ نے وعدہ کیا ہے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کیے کہ اللہ انہیں زمین میں خلافت دے گا۔''

حضرت علیؓ مرتضیٰ نے اس وعدہ کی تکمیل یہاں حضرت عمرؓ پر منطبق کی ہے۔ قرآن کریم میں یہ وعدہ کن سے کیا گیا (۱) ایمان والوں سے اور (۲) اعمال صالحہ بجالانے والوں سے۔ معلوم ہوا حضرت علیؓ مرتضیٰ کے نزدیک حضرت عمرؓ ایمان والے بھی تھے اور اعمال صالحہ والے بھی۔ اس سے بڑھ کر حضرت عمرؓ کے ایمان اور اعمال صالحہ پر اور کونسی شہادت ہو سکتی ہے۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اس آیت استخلاف سے جو سمجھا ہے وہ وہی ہے جس پر امت مسلمہ اہل سنت و جماعت آج تک برابر متفق چلے آرہے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر حضرت مولانا دبیر کی پیش کردہ چوتھی روایت اور اس پر رافضی کا جواب

محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) اصول کافی جلد صفحہ ۲۹۶ میں حضرت امام باقرؒ (۱۱۴ھ) سے روایت کرتا ہے:

لما قدمت بنت يزد جرد على عمر اشرف لها عذارى المدينة واشرق المسجد بضوئها لما دخلته فلما نظر اليها عمر غطت وجهها وقالت...... فقال عمراً تشتمني هذه وهم بها فقال امير المومنين عليه السلام ليس ذلک خيرّها رجلاً من المسلمين واحسبها بفيئه فخيرها فجاءت حتى وضعت يدها على راس الحسين فقال امير المومنين عليه السلام ما اسمک فقالت جهان شاه فقال لها امير المؤمنين بل شهربانو...... الخ

ترجمہ:

جب یزدگرد (شاہ ایران) کی بیٹی مال غنیمت میں مدینہ آئی تو مدینہ کی لڑکیاں اسے دیکھنے آئیں۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوئی تو مسجد اس کی روشنی سے چمکنے لگی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا...... آپ نے کہا یہ مجھے گالی دے رہی ہے۔ اور آپ نے اس پر اس کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے آپ کو کہا کہ آپ کو اس پر گرفت نہ کرنی چاہیے۔ (یہ بادشاہ کی بیٹی ہے اس سے مروت کا برتاؤ چاہیے) آپ اس کو اختیار دیجئے کہ جس مسلمان کو چاہے پسند کرلے اور اس کو اس کے حصہ میں سمجھ لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے (حضرت علیؓ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے) اس کو اختیار دیا

اور اس نے پیش قدمی کر کے حضرت حسینؓ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت علیؓ نے اس سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا جہانشاہ۔ حضرت علیؓ نے کہا نہیں بلکہ شہر بانو (اور حضرت حسینؓ سے کہا اے ابوعبداللہ اس سے تمہارا ایک بیٹا ہوگا جو روئے زمین کے لوگوں سے بہتر ہوگا چنانچہ اس سے آپ کے ہاں امام زین العابدین پیدا ہوئے۔)

مولانا دبیر کہتے ہیں اس روایت سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے ہیں۔ ہم انہیں اپنے الفاظ میں لکھے دیتے ہیں:

۱۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں حضرت علیؓ جنگوں سے الگ تھلگ نہ رہے تھے۔ وہ گوشہ نشین نہ رہتے تھے (دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کھڑے موجود پائے جاتے تھے) اور حضرت حسنؓ اور حسین بھی حضرت عمرؓ کی سیاسی مہمات سے کنارہ کش نہ رہتے تھے' عام مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے۔ جس وقت یزدگرد کی بیٹی مسجد میں آئی تو یہ حضرات وہیں موجود تھے۔ کسی کونے میں یا گھر میں چھپے نہ بیٹھے تھے۔ حضرت علیؓ بھی حضرت عمرؓ کے مشیر کے طور پر وہاں موجود تھے۔ اپنے آپ کو اور حضرات حسنین کریمین کو فتوحات عمر میں برابر حصہ دار سمجھتے تھے۔ اگر حضرت عمرؓ کی فارس سے یہ معرکہ آرائی اسلامی جنگ نہ ہوتی تو حضرت علیؓ بھی اس کے غنائم میں حضرت حسینؓ کو حصہ دار نہ فرماتے۔

رافضی کا جواب

رافضی مولانا دبیر کے اس استدلال سے ایسا دم بخود ہے کہ اس نے تقریباً یہ ساری باتیں تسلیم کر لی ہیں۔ مولف نے پہلا جواب یہ دیا ہے:

اولاً ''یہ جنگ صحیح تھی اور اس سے حاصل شدہ مال غنیمت بھی جائز تھا۔ وھو المطلوب (یعنی اس کی ان اکابر اہل بیت کو طلب لگی رہتی تھی)'' (استغفر اللہ)

ثانیاً ''عہد عمر کی جنگوں میں یہ دوسری صحیح جنگ تھی جس میں اقلیم امامت کے پہلے تاجدار...... سے مشورہ طلب کر لیا گیا تھا...... اس لیے اس غزوہ میں جو کچھ مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا جائز تھا۔ وھو المقصود. (ایضاً سطر ۱۹)

ثالثاً ''جب جنگ صحیح ہوگی تو اس سے حاصل شدہ مال غنیمت بھی جائز ہوگا۔'' (ایضاً سطر ۲۳)

رابعاً ''اس مال کے حلال و جائز ہونے پر کوئی زد نہیں پڑتی کیونکہ قرآن میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ کلب معلم (تربیت دیے ہوئے کتے) کا کیا ہوا شکار متقی و متورع مسلمان کے لیے جائز ہے تو بلا تشبیہ ایک مسلمان کی جنگ سے حاصل شدہ مال غنیمت کیوں حضرت امیر یا حضرت امام حسین کے

لیے جائز نہ ہوگا۔" (عبارت رافضی از تجلیات ص ۱۸۲ آخری سطر اور ص ۱۸۳ کی پہلی دو سطریں)

حضرت عمرؓ کے جس فوجی نے یزدگرد کو شکست دی، رافضی اسے کلب معلم کے درجے میں لا کر بہت خوش ہو رہا ہے۔ کلب معلم وہ کتا ہے جو اپنے سکھانے والے اور چھوڑنے والے کے حکم سے سر مو تجاوز نہ کرے اور اس شکار کا ذرا گوشت اس کے منہ میں نہ جا لگے یہ تشبیہ اس فوجی کے لیے بڑی عظمت ہے کہ وہ سراسر اسلام کی شرطیں پوری کرتا اس شکار کو پکڑے لاتا ہے۔ تاہم اس رافضی کی گستاخانہ زبان ملاحظہ کریں کہ وہ کس دیدہ دلیری سے حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے بارے میں یہ بات سمجھا رہا ہے کہ وہ کتے کا مارا جانور کھاتے تھے اگر وہ کتا سدھایا ہوا ہو۔ افسوس صد افسوس۔ اس رافضی کی اس جرات پر صد افسوس۔ اس نے حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی کس قدر بے ادبی کی ہے۔ تاہم اس میں بھی اس نے مولانا دبیر کے استدلال کی تصدیق ہی کی ہے اور وہ اسے جھٹلا نہیں سکا۔

خامساً جناب شہر بانو عاقلہ و بالغہ اور مختارہ (اختیار دی ہوئی باندی) تھیں۔ اب انہوں نے اپنے ارادہ و اختیار سے حضرت حسینؓ کو اپنا سرتاج بنانے کے لیے منتخب کر لیا تو اب اس سوال کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ یہ جنگ جائز تھی یا ناجائز۔ (تجلیات ص ۱۸۳ سطر ۳۔۵)

جواب الجواب

رافضی نے شہر بانو کے لیے مختارہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیا یہاں یہ سوال نہیں ابھرتا کہ جناب شہر بانو کو مالک چننے کا یہ اختیار کس نے دیا تھا؟

(جواب) حضرت عمرؓ نے۔ جب آپ نے اسے یہ اختیار دیا تھا تو اب اگر اس نے اپنا یہ اختیار حضرت حسینؓ کے انتخاب میں استعمال کیا تو شہر بانو کے حضرت حسینؓ کے حق میں عطیہ عمر ہونے سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ یہاں یہ بات بھی سامنے رہے کہ اس روایت میں حضرت علیؓ مرتضیٰ نے شہر بانو کو مال غنیمت سے حضرت حسینؓ کے حصہ میں آنے والی خاتون کہا ہے۔ اگر اس کا حضرت حسینؓ سے باقاعدہ نکاح ہونا ہوتا تو حضرت علیؓ اسے حضرت حسینؓ کا حصہ از مال غنیمت ہرگز قرار نہ دیتے اور جناب شہر بانو کی اس پسند کے نتیجہ میں علی الاعلان امام زین العابدین کی پیدائش کی بشارت نہ دیتے۔

رافضی نے یہاں جب یہ دعویٰ کیا کہ تمام اسلامی مکاتب فکر کے نزدیک یہ عقد ازدواج بہر حال جائز ہے۔

(ص ۱۸۳ سطر ۵)

تو اس کے ساتھ اس نے اس نکاح کا کوئی حوالہ کیوں پیش نہیں کیا۔ ایسا کہیں کہا ہوتا تو اس کے ساتھ یہ سوال بھی ابھرتے: (۱) خطبۂ نکاح کس نے پڑھا اور کیا پڑھا؟ (۲) اس نکاح کے گواہ کون کون تھے؟ (۳) مہر کیا مقرر کیا گیا' وہ مجلس تھا یا غیر مجلس (۴) یہ نکاح کس تاریخ کو پڑھا گیا تھا (۵) دعوت ولیمہ کس دن ہوئی وغیر ھا من الواقعات۔

قارئین کرام اس سے رافضی کی بے خودی کا اندازہ کریں کہ حضرت حسینؓ اور جناب شہر بانو کے نکاح پر وہ ایک حوالہ بھی نہیں لا سکا۔ اصول کافی کی روایت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ جناب شہر بانو باندی کے طور پر مدینہ لائی گئی اور بطور مال غنیمت حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت حسینؓ کے حصہ میں آئی اور حضرت علیؓ نے اس وقت اس سے علی بن الحسین پیدا ہونے کی بشارت دی یہ نہ کہا کہ اس سے پہلے اس کا حضرت حسینؓ سے نکاح ہوگا۔ نکاح سے پہلے یہ بیٹے کی بشارت کیسی؟

سادساً رافضی کا شہر بانو کے بعہد عمر مدینہ آنے سے انکار

رافضی لکھتا ہے:

"شبلی نعمانی جیسے کئی مورخین کے نزدیک یہ واقعہ اصول روایت اور درایت کے مطابق بالکل بے بنیاد ہے اور ان لوگوں میں پھر اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ عثمانؓ کے دور حکومت میں اس حلقہ خلافت میں آئیں۔" (ص ۱۸۳)

مولانا دبیر نے شہر بانو کے حضرت حسینؓ کے حصہ میں آنے کی روایت اصول کافی سے حضرت امام محمد باقر کی روایت سے پیش کی ہے۔ اس رافضی کا امام باقر کے مقابلہ میں علامہ شبلی نعمانی کو ترجیح دینا ہمیں سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات ایک مذبوح کی پھڑ پھڑاہٹ کے سوا کوئی وزن نہیں رکھتی۔

پھر دیکھئے وہ اسے ایک واقعہ بھی مانتا ہے اور پھر مورخین کے نام سے اسے بے بنیاد بھی کہہ رہا ہے۔ علامہ کلینی آج زندہ ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے' تم نے یہ بے بنیاد بات گھڑی ہے یا امام باقرؒ سے تمہیں یہ بات واقعی اس طرح پہنچی تھی؟ رافضی کا اگر یہ خیال ہے کہ ایران سے یہ جنگ حضرت عثمانؓ کے دور میں ہوئی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ وہ اس پر کوئی حوالہ ضرور لکھتا۔ رہی یہ بات کہ جنگ قادسیہ حضرت علیؓ کے دور میں ہوئی تھی اور یہ معظمہ (بی بی شہر بانو) حضرت علیؓ کے ظاہری دور خلافت میں مدینہ میں قید ہو کر آئی تھیں تو یہ بات محدث قمی کہے یا کوئی اور افسانہ نویس باور نہیں کی جا سکتی۔ حضرت علیؓ کا دار الحکومت تو کوفہ تھا مدینہ نہ تھا۔ وہ حضرت علیؓ کے عہد میں مدینہ کیسے چلی آئی؟ ڈھکو رافضی کی اس عامی کمزوری پر جتنا تعجب کیا جائے کم ہے۔

سابعاً رافضی کا یہ دعویٰ کہ اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ عام امور سلطنت میں حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ رافضی لکھتا ہے:

"عین ممکن ہے کہ جب سارے مدینہ میں غلغلہ مچا تھا کہ اسیران عجم آئے ہیں اور شاہزادیوں کو

دیکھنے کے لیے سارا مدینہ مسجد نبوی میں امڈ آیا تھا تو (اہل بیت کے) یہ ذوات قدسیہ بھی اپنے علم لدنی کی بنا پر کہ یہ معظمہ (شہر بانو) حضرت امام حسینؓ کے حبالہ عقد میں آنے والی ہیں' تشریف لائے ہوں۔ (ایضاً ص ۱۸۳ سطر ۱۵)

جواب الجواب

اگر حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ اپنے علم لدنی کی بنا پر صرف اس مرتبہ حضرت عمرؓ کے دربار میں حاضر ہوئے تھے کہ آج کچھ ملے گا تو اس غیر معمولی واقعہ پر کسی نے ان حضرات سے کیوں نہ پوچھا کہ آپ یہاں حضرت عمرؓ کے دربار میں کیسے چلے آئے؟ موقعہ سوال پر سوال نہ کرنا اسے لازم ہے کہ یہاں اس سوال کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ تبھی ہے کہ حضرت علیؓ عام امور سلطنت میں حضرت عمرؓ کے حضور موجود رہتے ہوں اور کسی کو آپ کے یہاں مسجد مدینہ میں ہونے میں ذرا تعجب نہ ہوا ہو۔ مولانا دبیر کا یہاں استدلال استصحاب سے ہے استقراء سے نہیں۔ کیا اس کے بعد بھی حضرات حسنین کریمین حضرت عثمانؓ کے آخری دور خلافت میں آپ کے حضور حاضر خدمت نہ ہوتے تھے۔ اب اسے استقراء ناقص کیسے کہا جا سکتا ہے۔

کیا حضرت علیؓ اس سے پہلے معرکہ روم میں بھی امیر المومنین کے پاس مشورہ دینے کے لیے حاضر دربار نہ تھے۔

ثامناً مولانا دبیر نے یہ کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کو حضرت علیؓ اور امام حسینؓ سے بڑی محبت تھی۔ اسی لیے آپ نے شاہی خاندان کی خاتون حضرت حسینؓ کو بخش دی۔ اس پر رافضی کہتا ہے پہلے "بخشی وہ چیز جاتی ہے جو پہلے ذاتی ملکیت میں داخل ہو۔" یہ معظمہ شہر بانو کب حضرت عمرؓ کی ذاتی ملکیت تھیں۔ وہ تو مال غنیمت میں آئی تھیں۔ ص ۱۸۳۔

جواب الجواب

اس جہاد میں امیر المومنین کون تھا جس کے مال غنیمت میں جناب شہر بانو مدینہ منورہ آئی تھیں؟ وہ حضرت عمرؓ ہی تو تھے۔ اب ان کے بغیر نہ مال غنیمت کی تقسیم ہو سکے گی نہ کسی کو باندیوں کی تملیک ہو سکے گی۔ تو اس تملیک سے پہلے اس پر قبضہ کس کا تھا؟ سلطنت کا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ شہر بانو کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ کسی مسلمان کو اپنے لیے چن لے۔ یہ اختیار دینے والے کون تھے؟ حضرت عمرؓ۔ حضرت شہر بانو نے کس کے دیے اختیار پر اپنے لیے حضرت حسینؓ کو چنا؟ حضرت عمرؓ کے دیے اختیار سے۔ رافضی کی یہ عجیب منطق ہے کہ فارس کی مہم تو حضرت عمرؓ روانہ کریں' وقت کے امیر المومنین بھی آپ ہی ہوں اور غنیمت تقسیم کریں حضرت علیؓ۔ حضرت حسینؓ خود ہی بے عطائے حضرت عمرؓ شہر

بانو کو اپنے ساتھ لے جائیں؟ یہ عجیب منطق ہے جو ائمہ کے علم کے نام سے ان لوگوں نے اپنے ہاں قائم کر رکھی ہے۔ فقہ جعفری کی یہ ساری تاسیس ائمہ کے اس علم لدنی پر قائم ہے نہ کہ قرآن کریم اور سنت نبی کریم پر۔

ڈھکور رافضی کا یہاں ان کے علم لدنی کی بنا پر مسجد میں آنے کا دعویٰ مولانا دبیر کی بات کاٹنے میں رافضی کی بے بسی پر حق کی ایک کھلی آواز ہے۔ جب اس سے کوئی بات بن نہ پائی تو وہ اسے ایک باطنی آواز کہنے پر آ گیا۔ وہ باطنی آواز کیا تھی؟ اپنے علم لدنی کا نعرہ۔ کیا قم کی درس گاہ میں یہی علم پڑھایا جاتا ہے اور یہی نعرہ لگایا جاتا ہے جو یہاں امام بارگاہوں میں سنایا جاتا ہے۔

تاسعاً رافضی لکھتا ہے' مولف (مولانا دبیر) نے "یہ بے پر کی بھی اڑائی ہے کہ حضرت عمرؓ کا سادات پر احسان ہے۔" (ص ۱۸۳ آخری سطر)

جواب الجواب

رافضی نے اسے بے پر کی بات کیسے کہہ دیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ امام زین العابدین باپ کی طرف سے حضرت فاطمۃ الزہراء کی اولاد تھے اور ماں کی طرف سے ساسانی شاہی خاندان کی خاتون جناب شہر بانو کے بیٹے تھے۔ کیا یہ دو بڑے خاندانوں کا نقطہ اجتماع نہیں۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ چاہتے تو شہر بانو اپنے یا حضرت عثمانؓ کے کسی عزیز کو دے دیتے لیکن آپ کو خاندان رسالت سے اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ حسینی سادات کے لیے آپ اس قران السعدین کا سبب بنے اور اس جوش محبت میں آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ ایرانی کہیں اس بنیاد سے آئندہ کبھی اپنے ساسانی عقیدہ "بادشاہوں کے ربانی حقوق" کو خاندان رسالت کے استحقاق خلافت کی دلیل نہ بنا دیں۔ انگریز مورخ ایڈورڈ براؤن نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (دیکھئے تاریخ ادبیات ایران ج ۱ ص ۲۱۵ ج ۴ ص ۱۹۲)

تاہم حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے جوش محبت میں حضرت علیؓ کی یہ بات مان لی کہ جناب شہر بانو کو اختیار دیں کہ وہ کسی مسلمان کو اپنا رفیق حیات چن لیں۔ یہ سادات پر حضرت عمرؓ کا ایک واقعی احسان ہے' یہ ہرگز بے پر کی اڑان نہیں۔

رافضی کا دوسرا موقف

سادات کرام کا (حضرت عمر) پر احسان ہے کہ ان کے جد امجد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اونٹ چرانے والا بظاہر حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ ص ۱۸۴ سطر ۲۔

اس میں رافضی نے دبی زبان میں اقرار کر لیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا حلقہ اسلام میں آنا حضورؐ کے طفیل (آپ کی دعا اللهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب) ہوا۔ رافضی یہاں اونٹ چرانے کو بظاہر حقارت کی نظر سے دیکھ رہا ہے اور وہ

یہ نہیں جانتا کہ حضور اکرمؐ نے بھی بکریاں چرائیں اور یہ عمل عربوں میں کبھی کسی کے لیے نشان حقارت نہیں سمجھا گیا۔ افسوس کہ اس ڈھگو کو یہ معمولی باتیں بھی سمجھ نہیں آتیں۔

رافضی کی تاریخ دانی ملاحظہ ہو

اس پر سب مورخین متفق ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں ہوا اور حضرت ابو بکرؓ کی بیبیوں میں حضرت اسماءؓ حضرت سیدہ کے آخری دنوں میں ان کی عیادت میں رہیں۔ لیکن رافضی کہتا ہے کہ اس وقت حضرت عمرؓ برسر اقتدار تھے جب آپؓ نے حضرت فاطمہؓ کا گھر جلانے کے لیے ان کے دروازہ پر لکڑیاں جمع کیں۔ وہ لکھتا ہے:

"عمر اس قدر محسن کش اور احسان فراموش واقع ہوا تھا کہ جس محسن اعظم کے طفیل اسے یہ سب کچھ عزو وقار اور جبروت واقتدار حاصل ہوا تھا اس کی لاڈلی بیٹی کا گھر جلانے کے لیے دروازے پر اس نے آگ ولکڑیاں جمع کیں۔" (تجلیات صداقت ص ۱۸۴)

اب تک یہ بات کسی شیعہ نے بھی نہ کی تھی کہ حضرت فاطمہؓ کے ساتھ یہ بے ادبی کا معاملہ حضرت عمرؓ کے دور اقتدار میں پیش آیا تھا۔ سچ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ صرف سچ ہے جو اپنے پاؤں پر چلتا ہے۔

رافضی پہلے اس عزو وقار اور سلطنت واقتدار کے بارے میں کہہ آیا ہے کہ وہ آپ کو مسند خلافت پر آنے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"گمنام شخص بظاہر حلقہ بگوش اسلام ہوا اور پھر مسند خلافت وحکومت پر بیٹھا اور پورے عالم اسلام پر حکمرانی کی۔ اگر سادات کے جد نامدار کا یہ احسان نہ ہوتا تو عمر کو یہ ملک و مال اور یہ سطوت واقتدار اور یہ ظاہری وقار کس طرح نصیب ہوتا...... جس محسن اعظم کے طفیل اسے یہ سب کچھ عزو وقار اور جبروت واقتدار حاصل ہوا تھا اسی کی لاڈلی بیٹی کا گھر جلانے کے لیے دروازے پر لکڑیاں جمع کیں ...... پہلوئے فاطمہ پر دروازہ گرایا۔" (ص ۱۸۴)

رافضی اس تحقیق انیق اور اپنی تاریخ دانی میں اپنے سے پہلے کے سب اثنا عشری مجتہدین کو مات دے گیا ہے۔ جو اس فرضی واقعہ کو پہلی خلافت کا واقعہ کہتے رہے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس سے پہلے شیعہ یہی کہتے آ رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کو خلافت بہ جبر وغصب ملی۔ اس رافضی نے یہاں کھل کر کہا ہے کہ آپ کو خلافت حضورؐ کے طفیل ملی۔ اس رافضی کا یہ موقف شیعہ مذہب کی پوری عمارت کو یکسر گرا دیتا ہے۔ (مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری)

اس سے پہلے بھی یہ رافضی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کافر کہنے سے کھلے طور پر توبہ کر چکا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"شیعان حیدر کرار پر یہ سراسر بہتان ہے کہ وہ جناب عمر یا اس کے دوسرے دو ساتھیوں (حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمان) کو کافر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔" (تجلیات ص ۱۸۲ سطر ۲۰)

عاشراً مولانا دبیر نے شیعہ کی ایک یہ بات آفتاب ہدایت میں اس طرح پیش کی تھی:

"شیعہ کہتے ہیں کہ شیخین نے باوجود مشکل کشا اور خاتون جنت کی منت وخوشامد کے باغ فدک ان کو نہ دیا تو شہر بانو کا گراں قدر عطیہ انھیں کیسے مل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں شہزادی تو وہ بیش قیمت شاہانہ پوشاک اور گراں بہا زیورات پہنے ہوئے تھی جن کی قیمت سے باغ فدک جیسے کئی باغ خریدے جا سکتے تھے۔" (آفتاب ہدایت ص ۱۱۹)

شیعہ اس اساس پر کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کو شہر بانو کا یہ گراں قدر عطیہ کیسے مل سکتا ہے؟ شیعوں نے یہ بات جناب شہر بانو کے عطیہ میں دیے جانے کے انکار کے لیے کہی ہے۔ مولانا دبیر نے اسے بر سبیل الزام تسلیم کر کے پھر حضرت عمرؓ کے اس احسان کو اصول کافی کی روایت سے پیش کیا تھا اور کہا تھا:

"اگر حضرت عمرؓ کو بزعم شیعہ اہل بیت سے عداوت ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔"

(آفتاب ہدایت بحوالہ اصول کافی ص ۲۹۶)

رافضی نے اپنے دسویں جواب میں اس بات کی تردید کی ہے کہ جناب شہر بانو اپنے ساتھ اس قدر لباس فاخرہ اور زیورات وجواہرات لائیں جس سے کئی باغ خریدے جا سکتے تھے۔" اور کہا ہے کہ یہ خیال بچند وجوہ محال ہے۔

(تجلیات ص ۱۸۵ سطر اول)

جواب الجواب

مولانا دبیر نے یہ بات شیعوں کی نقل کی ہے، اسے ڈھگو رافضی نے مولانا دبیر کی بات سمجھ لیا ہے۔ پھر اس بات پر بھی تو رافضی کوئی حوالہ پیش نہیں کر سکا کہ شہر بانو کو کہاں اور کب لوٹا گیا تھا اور کس نے ان کے بدن سے زیورات اور جواہرات اتارے تھے؟ رافضی اسی بے بسی میں حضرت عمرؓ پر اس طرح برس رہا ہے:

"آپ نے اس قدر زر کثیر صرف ایک بزرگ امام حسین کے حوالے کیوں کر دی جبکہ سب مسلمان اس میں شریک تھے اور امام حسین نے اپنے استحقاق سے زائد حصہ کیوں قبول کیا؟"

(تجلیات ص ۱۸۵ سطر ۷۔۹)

امام پر غنائم کی تقسیم میں برابری واجب نہیں۔ وہ حسب ضرورت وحیثیت کمی بیشی کر سکتا ہے۔ ہاں اپنے کو زیادہ

نہیں دے سکتا۔ یہ خارجی عقیدہ ہے کہ امام کو اس تقسیم میں کمی بیشی کا حق نہیں۔ خارجیوں کے مورث اعلیٰ نے ایک ایسے موقع پر حضورؐ سے کہا تھا۔ اعدل یا رسول اللہ اور حضورؐ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ رافضی کو نہ چاہیے تھا کہ وہ یہاں صرف مولانا دبیر کی ضد میں یہ خارجی عقیدہ اختیار کرے۔

ہم رافضی کے پیش کردہ ان دس وجوہ پر ترتیب سے تبصرہ کر آئے ہیں۔ رافضی جناب شہر بانو کے اس واقعہ پر مولانا دبیر کے خلاف یہ کہہ کر بڑے طمطراق سے نکلا تھا۔

نالہ بلبل شیدا تو ہنس ہنس کے سنا
اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

ہم نے یہ دسوں وجوہ مختصر تبصرے سے ہدیہ قارئین کر دی ہیں۔ رافضی قارئین کے سامنے اس توپچی سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوا جس کے سب کارتوس ٹھنڈے ہو چکے ہوں۔

جو خود کو کہتے تھے توپچی وہ چلے ہوئے کارتوس نکلے

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر مولانا دبیر کی پیش کردہ پانچویں روایت اور رافضی کا جواب

روایت: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے پہلی روشنی میں یمن کے محلات دیکھے کہ خدا نے وہ ملک مجھے دے دیا' دوسری میں شام کے محلات نظر آئے وہ ملک بھی خدا نے مجھے عطا فرمایا' تیسری (چمک میں) مجھے مدائن کے چوبارے دکھائی دیے اور خدا نے مجھے بادشاہ عجم کی سلطنت بخش دی۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا اس دین کو غالب کرے گا۔" (بحوالہ حیاۃ القلوب ج ۲ ص ۲۰۳)

مولانا دبیر کا استدلال یہ ہے کہ حضور سے کیے گئے وعدے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں پورے ہوئے۔ اس پر مولانا دبیر لکھتے ہیں:

"ہم شیعہ حضرات سے دریافت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی یہ پیش گوئی کب اور کس کے عہد میں پوری ہوئی۔"

رافضی کو کھلا اقرار ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور اسلام کو طاقت ملی' وہ لکھتا ہے:

"اس استدلال کا لب لباب یہ ہے کہ جناب عمر نے بہت سے دیار و امصار بلکہ بہت سے ممالک فتح کیے اور ان کی وجہ سے اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی' یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔"

(تجلیات صداقت ج ۱ ص ۱۸۷)

"بس یہ ٹھیک ہی نہیں بلکہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ آپ بہادر تھے اور جنگیں کرنا جانتے تھے۔" (افسوس صد افسوس)

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

اے رافضی! ہم تیرے اس کہنے پر کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے تجھے داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاش کہ تمہارے سب پیرو بھی اس عقیدے پر آ جائیں۔ اس کے بعد رافضی لکھتا ہے:

"مگر اس سے نہ جناب عمر کا ایمان ثابت ہوتا ہے نہ خلافت اور نہ ہی نجات۔" (تجلیات ص ۱۸۷)

ایمان اور عقیدہ تو باطنی امور میں سے ہیں۔ کسی کے ایمان اور عقیدہ کو سامنے لا کر محسوسات کی صورت میں دکھایا نہیں جا سکتا۔ نجات بھی امور آخرت میں سے ہے جو یہاں محسوسات میں سے نہیں ہے۔ لیکن خلافت حکومت کی ایک محسوس صورت ہے اور اس کی فتوحات یمن کی ہوں یا شام کی یا مدائن کی محسوسات میں سے ہیں جو دنیا نے دیکھی ہیں۔ عالم ظاہر میں یہ فتوحات حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں واقع ہوئیں اور حضورؐ سے کیے گئے یہ وعدے محسوسات میں حضرت عمرؓ کے ہاتھوں پورے ہوئے۔

رافضی کا اس کھلے اقرار کے بعد یہ کہنا کہ اس سے حضرت عمرؓ کی خلافت ثابت نہیں ہوتی صرف ایک منہ زوری ہے۔ رافضی نے جب یہ تسلیم کیا کہ حضرت عمرؓ کے ذریعہ اسلام کو بڑی تقویت ملی تو دیکھا جائے گا کہ اس سے کس اسلام کو تقویت ملی؟ اسی اسلام کو جو حضورؐ لائے تھے۔ رافضی نے اپنے جواب میں یہ تین حدیثیں پیش کی ہیں۔ ان سب سے واضح ہے کہ ان فتوحات سے اس دین کی تقویت کا اقرار ہے جو حضورؐ لے کر آئے تھے۔

۱۔ ان اللہ یوید الدین بالرجل الفاجر ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۴-۹۷۷)

۲۔ ان اللہ تبارک و تعالیٰ لیویّد الاسلام برجال ماھم باھلہ۔ (کنز العمال ج ۲ ص ۲۱۲)

۳۔ ان اللہ لیوید الدین باقوام لاخلاق لھم فی الآخرہ۔ (رواہ النسائی)

حضور کی مراد یوید الدین کے الفاظ میں اس دین کی تائید ہے جو حضور لے کر آئے تھے۔ اگر یہ اس دین کی مدد نہ ہوئی تو آپ نے جس طرح ان مدد کرنے والوں کی مذمت فرمائی اس دین کی بھی مذمت فرماتے جس کی یہ لوگ تائید کر رہے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھوں جس دین کو تقویت ملی وہ وہی دین ہے جو حضورؐ لے کر آئے تھے اور اللہ نے آپ سے اسے تمام دینوں پر غالب کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

پھر یہاں جن لوگوں کی مذمت کی اس سے مسلمان فوجوں کے کمزور دل اور بے عمل لوگ مراد ہوں گے نہ کہ سربراہ اور رہنما حضرات۔ جب بعض روایات میں برجال اور باقوام کے الفاظ ملتے ہیں تو اس پیرایہ میں بعض فوجی ہی

مراد لیے جائیں گے نہ کہ سربراہ۔ سوان روایات کی روشنی میں بالرجل الفاجر میں بھی فاجر احاد امت ہو سکیں گے نہ کہ سربراہ سلطنت۔ صورت عمل کچھ بھی ہو اتنی بات ضرور ہے کہ ان سے دین اسلام کو قوت ملی اور اسی دین کو ملی جو حضور لے کر آئے تھے۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ تائید دین فاجر کے ہاتھوں تو کبھی ہو سکتی ہے لیکن کافر کے ہاتھوں یہ ہو جائے یہ کسی روایت میں وارد نہیں ہے۔

قرآن کریم میں تمکین دین کے موارد ایمان اور عمل صالح سے وابستہ بتلائے گئے

قرآن کریم کی آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے تمکین دین کا ثمرہ ایمان اور عمل صالح پر مرتب فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ محسوسات میں جب تم دین کی تائید اور تمکین دیکھو تو معاً جان لو کہ جن کے ہاتھوں حضورؐ سے کیے گئے یہ وعدے پورے ہو رہے ہیں وہ لوگ یقیناً ایمان کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ ایمان سامنے نظر آنے والی چیز نہیں کہ اسے کوئی محسوسات میں دیکھے۔ اس کا تعلق باطن سے ہے لیکن جب تم محسوسات میں کسی کے ہاتھوں تمکین دین ہوتی دیکھو تو اس ظاہر سے ان کے اندر کے ایمان کی بھی تصدیق کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تمکین دین کی خوش خبری ایمان اور عمل صالح پر مرتب کی ہے۔

صحابہؓ نے جب حضور کی اس بشارت پر تعجب کا اظہار فرمایا تو رافضی نے اپنی طرف سے اسے یہ صورت دی ہے:

"(بطور تمسخر ایک دوسرے سے کہا) کہ ہم تو قضائے حاجت کے لیے باہر نکل نہیں سکتے اور یہ رسول ہم سے روم و عجم کی بادشاہتیں ملنے کے وعدے کر رہے ہیں۔" (ص ۱۸۷)

یہاں یہ تمسخر کے الفاظ اس مسخرے نے اپنی طرف سے ڈالے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب ان کے نتائج سامنے آگئے تو ان سے ان کی امامت اور خلافت کیوں درست نہیں سمجھی جا سکتی۔

پھر مولف کے اس استدلال پر بھی اس کی بیچارگی کا اندازہ کیجیے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا فرعون نے حضرت موسیٰ کی پرورش کر کے بالواسطہ دین کو تقویت نہیں پہنچائی۔"

(ص ۱۸۷)

مولف پہلے بھی کو تسلیم کر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کی فتوحات میں واقعی اسلام کی تقویت تھی لیکن اب اسے فرعون کے دربار میں بالواسطہ دین کی تقویت کی راہ ملی ہے۔ حالانکہ فرعون کے گھر میں کبھی دو دینوں کا ذکر نہ ہوا تھا اور حضرت عمرؓ جن جن ملکوں اور میدانوں میں گئے وہاں ان کا پہلا اور براہ راست تعارف اسلام کے نام سے ہی ہوتا تھا۔ کس قدر کمزور بات ہے جو اس رافضی نے اپنی ضد پورا کرنے کے لیے کہی ہے۔ ولعم ما قیل۔

الغریق یتشبث بالحشیش "ڈوبنے والا تنکے کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔"

یہاں رافضی نے اپنی شرمندگی کو بالواسطہ کے لفظ میں لپیٹا ہے۔ پھر اس کی بیچارگی کی انتہا ملاحظہ کریں۔ اس سے زیادہ طویل و عریض فہرستیں سکندر اعظم ہلاکو خان اور نپولین وغیرہ فاتحین عالم کے حالات میں مل جائیں گی' سوال گندم جواب چنا۔ پھر معلوم نہیں ڈھکو رافضی انہیں لیؤید الدین بالرجل الفاجر کی بحث میں کیوں لا رہا ہے' یہ بدترین مثال ہے۔ ان فاتحین عالم کی فتوحات ہرگز کسی دین کی تقویت کے لیے نہ تھیں۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر مولانا دبیر کی پیش کردہ چھٹی روایت اور رافضی کا جواب

ابن شہر آشوب نے روایت کی کہ ایک روز آنحضرتؐ نے سراقہ بن مالک کے بازوؤں کو دیکھا اور فرمایا:

"سراقہ تمہاری اس وقت کیا حالت ہوگی جب شاہ عجم کے کنگن تمہارے ہاتھ میں ہوں گے۔"

(بحوالہ حیاۃ القلوب ۲ ص ۲۴۸)

استدلال مولانا دبیر

اگر حضرت عمرؓ...... کا جہاد نا جائز ہوتا اور مال غنیمت مال مغصوب (ایک غصب شدہ مال) ہوتا تو کیا رسول خدا سراقہ کو مال حرام کے حاصل ہونے کی بشارت دیتے۔

رافضی کا جواب

اس سے صرف پیشگوئی کرنے والے کی صداقت اور حقانیت ظاہر ہوتی ہے کہ جس طرح آپ نے باعلام الٰہی خبر دی تھی' اسی طرح یہ وقوع پذیر ہوئی۔ یہ صداقت نبی کی دلیل ہے اس سے کیا غرض کہ وہ کس کے عہد میں پوری ہوئی۔ نہ ہی اس میں اس غزوہ کے جواز یا عدم جواز کا کوئی تذکرہ ہے۔

سابقاً واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ غزوہ فارس بوجہ حضرت علیؓ سے مشورہ طلب کرنے کے جائز تھا اور اس سے حاصل شدہ مال حلال تھا۔ (تجلیات صداقت ص ۱۸۹)

جواب الجواب

شاہ عجم کے کنگن ایک مسلمان کے ہاتھ میں آئیں اور وہ مال مغصوب ہو' حضورؐ کے لیے اس وقت اس پر نکیر کرنے کا بہت اچھا موقعہ تھا۔ نکیر کس وقت ضروری ہوتی ہے؟ جب کوئی غلط بات سامنے آئے۔ جب حضورؐ نے اس وقت اس پر نکیر نہ فرمائی تو بایں وجہ کہ موقع ذکر میں کسی بات کا ذکر نہ کرنا اس کی نفی کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا وہ غزوہ بھی درست تھا اور اس سے آیا مال بھی مال مغصوب نہ تھا۔ وہ خلیفہ کی عطاء سے مال حلال تھا۔

پھر اگر وہ مال حضرت علیؓ کے صوابدید اور مشورہ کے باعث مال حلال ہو سکتا ہے تو حضرت علیؓ کے نماز میں ان حضرات کے پیچھے کھڑے ہونے اور آپ کی صوابدید سے ان کی امامت اور خلافت کو کیوں درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ نماز کیسے مشتبہ ہو سکتی ہے جس کے پیچھے فاتح خیبر بصورت مقتدی کھڑے ہوں۔

یہاں رافضی کے دماغ نے اتنا کام بھی نہ کیا کہ یہ واقعہ جنگ احزاب کا ہے۔ جب یہ روشنیاں نظر آئیں اس وقت حضورؐ خندق کی کھدائی کر رہے تھے۔ آپ نے یہ کام صحابہؓ میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ دس دس فوجی چالیس چالیس گز کی کھدائی کریں۔ کیا اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت ہو سکتی ہے کہ وہ قضائے حاجت کے لیے باہر نہ نکل سکتے ہوں۔ مسلمان اس وقت ایک پوری سلطنت رکھتے تھے۔ ملا باقر مجلسی نے اور پھر اس ڈھگو رافضی نے یہ کیسی بے تکی ہانکی ہے۔

پھر تمسخر کے الفاظ سے رافضی یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ صحابہ اس روم و عجم کی بادشاہت ملنے کو محالات میں سے سمجھتے تھے حالانکہ یہی رافضی پہلے یہ کہہ آیا ہے:

"ایک راہب نے ابوبکرؓ صاحب کو خبر دی تھی کہ عن قریب ایک دعوے دار نبوت ظاہر ہوگا اور تمہیں اس کی وجہ سے بڑی دنیوی فوائد حاصل ہوں گے حتی کہ ان کی وجہ سے تمہیں حکومت ہاتھ آئے گی ......اس دنیوی لالچ میں آ کر آپ نے حسب ظاہر اسلامی کلمہ پڑھا تھا......راہب نے جس کی پیش گوئی پر آپ کو پورا یقین تھا ملکی فتوحات اور غنائم کی خبر دی تھی۔" (تجلیات صداقت ص ۴۲)

جب صحابہ کو شروع سے یہ سلطنتیں ملنے کا یقین تھا تو کیا جنگ خندق کے وقت وہ روم اور عجم کی بادشاہت ملنے پر تمسخر کا اظہار کر سکتے تھے؟ رافضی جو بات ص ۴۲ پر مان آیا تھا اس نے ص ۱۸۷ پر اسے کیسے تمسخر کہہ دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" جھوٹ بولنے والے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اسے کئی دفعہ یاد نہیں رہتا کہ پہلے کیا کہہ آیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر مولانا دبیر کی پیش کردہ ساتویں روایت اور رافضی کا جواب

یہ امر مسلم ہے کہ حضرت عمرؓ کی دختر نیک اختر حضرت حفصہؓ کو حضورؐ کی زوجہ ہونے کا شرف حاصل ہوا اور آپ رسول پاک کے خسر بھی تھے۔ آپ کی صاحبزادی اگر معاذ اللہ منافق اور کافر ہوتی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان سے نکاح نہ کرتے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:

ولا تنکحوا المشرکات حتٰی یؤمن. (پ ۲ البقرہ ۲۲۱)

ترجمہ: "تم کافر عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مومنہ نہ ہو جائیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ سب امہات المؤمنین حضورؐ کی زوجات کریمات مومنات تھیں۔ اور حضرت حفصہؓ بھی مومن عورت تھیں اور جس طرح جناب ام حبیبہ کے نکاح کے وقت ام حبیبہ اور ان کے والد ابوسفیان کے علیحدہ علیحدہ دین پر ہونے کی عام شہرت تھی، حضرت حفصہ اور ان کے والد حضرت عمرؓ کے ایک دین پر ہونے کی بھی شہرت عام تھی۔ سو حضرت حفصہؓ کے مومنہ ہونے سے حضرت عمرؓ کے مومن ہونے کی بھی خبر مل جاتی ہے، اس استفاضہ عام کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا دبیر کا استدلال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں حضرت حفصہؓ کے مومنہ ہوئے بغیر کیسے ان سے نکاح کر سکتے تھے؟ کبھی نہیں۔

جواب رافضی

"آپ نے از راہ خلق و مروت (حضرت حفصہؓ کی) اس پیش کش کو قبول کیا۔ لیکن اس نیک دختر سے آنحضرت کا نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچ گئی...... بالآخر انہی (حضرت عمر) کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرتؐ نے رجوع فرمایا۔ (روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۲۱۲ طبع لکھنو۔)"

(تجلیات صداقت ص ۱۱۲)

جواب الجواب

افسوس رافضی نے یہ نہ سوچا کہ نکاح کا مدار ایمان پر ہے۔ یہ عقد صرف خلق و مروت سے نہیں بندھتا۔ کافرہ سے مومن کا نکاح کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ جب حضورؐ نے ارادہ طلاق سے رجوع فرما لیا تو اسلام میں اعتبار آخری بات کا ہوگا۔ کسی پہلی بات سے چمٹنا تو کوئی علمی بات نہیں۔ جب حضورؐ نے یہاں بھی حضرت عمرؓ کی بات رد نہ کی تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کے دل میں حضرت عمرؓ کی کس درجہ قدر محبت تھی۔

پھر رافضی کا یہ سوال بھی ملاحظہ ہو:

"یہ کس شریعت کا مسئلہ ہے کہ کافر و مشرک کی بظاہر مسلمان بیٹی سے نکاح نہ کیا جائے؟

(ص ۱۹۲)

رافضی جس پیرائے میں بیٹی پر بظاہر مسلمان کا لفظ لایا ہے اسی پیرایہ میں وہ یہ لفظ باپ پر کیوں نہیں لایا۔ اسے صریح پیرائے میں کافر کہا بلکہ کافر و مشرک بتایا ہے۔ حالانکہ رافضی کے عقیدے میں اس وقت حضرت حفصہؓ کے والد بظاہر کافر و مشرک نہ تھے، مسلمان تھے۔ ڈھگو کے اس بے ڈھب سوال پر تعجب ہوتا ہے۔ از روئے شریعت محمدیہ نکاح کا مدار ظاہر مسلمان ہونے پر نہیں مومن ہونے پر ہے اور اس پر ہم قرآن کریم کی آیت پیش کر چکے ہیں۔ **فافھم و تفکر۔** رہی اثنا عشری شریعت تو ہم اس وقت اس کی بات نہیں کر رہے۔

تاہم اس سے واضح ہے کہ یہ رافضی حضرت حفصہ کو کھلے طور پر مسلمان سمجھتا ہے اور انہیں کافر نہیں کہتا اور یہ بھی کہتا ہے:

''یہ شیعوں پر سراسر اتہام ہے کہ وہ حضرت ثانی کو کافر سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً سطر)

معلوم ہوتا ہے کہ رافضی حضرت عمرؓ کو مسلمان ماننے پر مجبور ہے۔ ان کے قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) کا بھی یہی موقف تھا۔ وہ اس بات کے جواب میں کہ جب حسب قرآن بدوں ایمان لائے کسی کو بیٹی نکاح میں نہیں دے سکتے تو حضرت علیؓ نے ام کلثوم کیوں حضرت عمرؓ کے نکاح میں دی۔ اس کے جواب میں قاضی نور اللہ کہتا ہے:

''چرا آنحضرت دختر خود رابعمر بن الخطاب داد۔ گفت بواسطہ آنکہ اظہار شھادتین مے نمود۔''

(مجالس المومنین ص ۵۱ ۲ طبع ایران' کتاب الشافی للشریف مرتضیٰ ص ۲۱۶ ایران)

ترجمہ: ''حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی حضرت عمرؓ کو کیوں نکاح میں دی؟ یہ اس لیے کہ حضرت عمرؓ اللہ کی وحدانیت اور حضورؐ کی رسالت کی شہادت دیتے تھے۔''

یہاں اسلام مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں ایمان کے معنی میں ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں بھی مدار نکاح ایمان پر ہی رکھا گیا ہے نہ کہ صرف اقرار اسلام پر۔ قرآن کریم میں دیے گئے ایمان کے لفظ کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

فان علمتموھن مومنات فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن. (پ ۲۸ الممتحنہ ۱۰)

ترجمہ: ''پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن عورتیں ہیں تو انہیں کفار کی طرف نہ جانے دو۔ مومنات ہرگز ان کے لیے حلال نہیں' نہ وہ مومن عورتوں کے لائق ہیں۔''

مولانا دبیر کی پیش کردہ آٹھویں روایت اور رافضی کا جواب

کسریٰ شاہ ایران نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشت خاک بھیجی۔ حضورؐ نے فرمایا عن قریب میری امت اس زمین کی مالک ہوگی۔ (بحوالہ حیاۃ القلوب ج ۲ ص ۴۱۹)

استدلال مولانا دبیر

''یہ مسلم ہے کہ یہ پیشگوئی بھی حضرت عمرؓ کے عہد فرخ میں پوری ہوئی۔''

جواب رافضی

''یہاں امت اجابت (جو حضورؐ پر ایمان لائے) مراد نہیں' امت دعوت مراد ہے۔ (جنہیں حضورؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاسکے۔ کافر امت اجابت میں شمار نہیں ہوتے۔ اگرچہ امت دعوت میں شامل ہوتے ہیں۔'' (تجلیات ص ۱۹۴)

جواب الجواب

امت دعوت میں تو کسریٰ اور جملہ اہل ایران بھی تھے۔ اب اگر یہ پیش گوئی ملک ایران کے ان کے ہاتھوں سے نکلنے اور حضور کی امت کے پاس پہنچنے کی تھی تو اس سے مراد امت دعوت کیسے ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں تو یہ سلطنت پھر بھی امت دعوت کے پاس رہنے کی ہی ہوئی تو اس کے بیان کا فائدہ کیا ہوا۔ کیا حضورؐ کی یہ عظیم پیشگوئی ایسی مہمل بات کے لیے تھی کہ ایران امت دعوت کے ہاتھوں سے نکل کر امت دعوت کے پاس ہی رہے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی اس معنی میں تھی کہ اب ایران شاہ ایران کسریٰ سے نکل کر حضورؐ کی قائم کردہ جماعت امت مسلمہ (امت اجابت) کے زیر حکومت آئے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ایران حضرت عمرؓ کے عہد میں اس امت اجابت کے قبضے میں آیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ اور ان کے کل پیرو اس امت اجابت کے افراد تھے جنہوں نے حضورؐ کی دعوت پر لبیک کہی اور داخل حوزہ اسلام ہوئے۔

کسریٰ شاہ ایران نے اپنے ملک کی مٹھی بھر خاک بطور تحقیر حضورؐ کے پاس بھیجی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت جلد اس زمین کی وارث ہوگی جیسا کہ اس نے (کسریٰ نے) اپنے ملک کی یہ مٹی مجھے بھیجی ہے۔

رافضی کا ایک دوسرا جواب

رافضی نے پہلے امت سے امت دعوت مراد لی۔ اب وہ ایک دوسرے جواب پر آرہا ہے۔ سنئے:

''جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو...... ان پر بظاہر امت رسول ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ امتی ہونے کے لیے مومن عادل ہونے کی کوئی شرط نہیں جس پر مشہور حدیث ستفترق امتی علی ثلثۃ و سبعین فرقۃ دلالت کرتی ہے۔'' (تجلیات صداقت ص ۱۹۴)

جواب الجواب

جس دور کی یہ پیش گوئی ہے اس وقت بے شک منافقین وجود رکھتے تھے لیکن جب یہ پیشگوئی پوری ہوئی اس وقت (حضورؐ کی وفات کے بعد) منافقین بطور جماعت کہیں تسلیم نہیں کیے گئے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:

انما کان النفاق علیٰ عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاما الیوم فانما ھو الکفر بعد الایمان ...... (رواہ البخاری ج ۲ ص ۱۰۵۴)

ترجمہ: نفاق کے احکام صرف حضور ﷺ کے عہد تک ہی تھے آپ کے بعد اگر منافق کا کفر کھلا نہیں تو وہ مومن سمجھا جائے گا اور اگر کھل گیا تو وہ ایمان لانے کے بعد کفر میں جانے والا شمار ہوگا (اور اس پر مرتد کے احکام عائد ہوں گے) نفاق بطور ایک مشق یا درجے کے ختم ہو چکا۔

جب حضورؐ کے بعد منافقین بطور گروہ کہیں وجود ہی نہ رکھتے تھے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ کی یہ پیشگوئی کہیں منافقین کے ہاتھوں پوری ہو۔ جب یہ دور منافقین ہی نہ تھا تو فاتحین ایران کو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بظاہر مسلمان تھے۔ اس لیے ایران ان کے قبضے میں آیا۔

منافقین پر جزو امت ہونے کا اطلاق بے شک ہوتا آ رہا ہے لیکن ان پر علی الاطلاق امت رسول ہونے کا لفظ اب کہیں وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی پوری کی پوری امت منافق ٹھہرے۔ حضورؐ نے فرمایا میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ معلوم ہوا کہ پوری کی پوری امت گمراہی پر کبھی جمع نہ ہوگی۔ صحابہ کے ماننے والے ہمیشہ رہیں گے۔ منافق جس دور میں مسلمانوں میں شامل سمجھے گئے اس وقت بھی وہ بظاہر جزو امت ہی تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پوری کی پوری امت منافقین کی ہو جائے۔

حضورؐ نے جب کسریٰ ایران کے ملک پر اپنی امت کے قابض ہونے کی خبر دی تو یہ پوری امت مسلمہ کے ایران پر قبضہ کرنے کی خبر تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کچھ لوگوں کے قبضہ کی خبر نہ تھی کہ ان پر بظاہر امت ہونے کا اطلاق ہو۔ سو اب یہ کہنا کہ یہ صرف منافقوں کے ایران پر قبضہ کرنے کی خبر تھی' کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ کچھ وقت تک تو بے شک منافق مسلمانوں میں شمار رہے ہیں۔ لیکن پوری امت مسلمہ پر منافقین کا اطلاق تاریخ اسلام کے کسی دور میں نہیں ملتا۔ سو رافضی کا یہ جواب کسی طرح درست نہیں ہے۔

امت کا لفظ جب مطلق استعمال ہو تو اس میں بے شک امت اجابت کے گمراہ فرقے بھی آ سکتے ہیں لیکن جب یہ لفظ کفار کے مقابل وارد ہو تو پھر اس میں گمراہ فرقے یا منافقین نہیں آ سکتے۔ ایسے مواقع پر حق اور باطل کا تقابل سامنے ہوتا ہے۔

حضور اکرمؐ نے کسریٰ ایران کی ایک گستاخی کے جواب میں فرمایا کہ میری امت اس زمین کی وارث ہوگی تو یہاں امت سے مراد اہل حق ہیں جو کسریٰ کی زمین پر قبضہ پائیں گے۔

یہ بات کسی طرح باور کرنے کے لائق نہیں کہ آپ کی پیشگوئی یہ تھی کہ (معاذ اللہ) میری امت کے منافق کافروں کی اس زمین کے مالک ہوں گے۔ کوئی ملک کافروں کے ہاتھ سے نکلے اور منافقوں کے قبضہ میں جائے اس میں خوشی کی کونسی بات ہے۔ منافق تو کافروں سے بھی برے ہیں اور وہ جہنم کے بہت نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النّار ولن تجدلھم نصیراً (النساء ۱۴۵)

ترجمہ: "بے شک منافق سب سے نچلے درجہ میں ہیں دوزخ کے اور تو نہ پائے گا ان کا کوئی مددگار۔"

اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ایک قطعہ زمین کافروں کے قبضہ سے نکلے اور منافقوں کے قبضہ میں چلا جائے۔ یہ انقلابات تاریخ کے حقائق ہیں۔ کچھ بچوں کی دھینگا مشتی نہیں۔ معلوم نہیں اس ڈھگو رافضی کی عقل کو کیا ہو گیا ہے؟

حضرت عمرؓ کی فضیلت پر مولانا دبیر کی پیش کردہ نویں روایت اور رافضی کا جواب

جناب امیر علیہ السلام نے اپنی دختر بلند اختر حضرت ام کلثوم کا رشتہ حضرت عمرؓ کو دیا:

اس پر مولانا دبیر نے اثنا عشریوں کے اصول اربعہ میں سے علامہ کلینی (۳۲۹ھ) کی اصول کافی اور فروع کافی سے اور محمد بن حسن طوسی (۴۶۰ھ) کی کتاب تہذیب الاحکام سے روایات پیش کی ہیں۔ یہ شیعہ کے قدیم ترین حدیثی لٹریچر کی بے لاگ شہادتیں ہیں۔

رافضی از روئے نقل ان دلائل کو توڑ نہیں سکا' اس نے اس نقل صریح کے یہ جوابات دیے ہیں:

۱۔ کیا عقل سلیم باور کر سکتی ہے کہ وہ صغیرۃ السن بچی...... چار پانچ سال کی دلہن اور ساٹھ سال کا دولہا چشم بد دور' کیسا نادر روزگار جوڑا ہے۔ ایسا کہنے والوں کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ شرم۔ شرم۔ شرم۔ (۱۹۷) شرم ان کو آ جائے جو اپنی لڑکی کو اصول کافی میں اس جوڑے میں پیش کرتے ہیں۔

رافضی یہ جلی کٹی کن کو سنا رہا ہے۔ اپنے چوٹی کے محدثین علامہ کلینی اور علامہ طوسی کو جن کے ہاتھوں ان کے اصول مرتب ہوئے۔ اس علمی شرافت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس گھر کو اپنے ہی ڈھگو کے ہاتھوں آگ لگ رہی ہے۔

۲۔ حکم شریعت یہ ہے کہ رشتہ اسے دو جس کا دین و اخلاق پسندیدہ ہو...... آیا یہ ممکن تھا کہ حضرت امیر علیہ السلام...... ایسے شخص کو اپنے لخت جگر کا رشتہ دیتے جس کا ایمان ہی سرے سے قائم نہ ہو۔ (ایضاً)

۳۔ حضرت عمرؓ کی زوجہ ام کلثومؓ اور اس کے بطن سے ایک لڑکا زید دونوں ماں بیٹے کی بعہد معاویہؓ ایک ہی دن وفات ہوئی۔ حالانکہ ام کلثوم دختر امیر المومنین باتفاق تمام مورخین کربلا میں موجود تھیں...... بعد کچھ مدت کے انہوں نے

انتقال فرمایا۔

۴۔ مسلمانوں کے خلیفہ کی عزت وناموس کی سلامتی اسی میں ہے کہ اس قصہ عقد وازدواج کو ایک افسانہ سمجھا جائے اور بس۔

۵۔ اس سلسلہ میں سنی شیعہ کتب سے جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ اس قدر مضطرب اور باہم متعارض ہیں کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔

۶۔ یہ روایات یا تو بلاسند بعض کتب تاریخ وحدیث میں مذکور ہیں ...... اور جو مستند ہیں وہ بوجہ ضعف رجال نا قابل اعتماد ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر راوی کذاب وضاع اور دشمن اہل بیت ہیں۔

۷۔ جہاں تک اصول کافی، فروع کافی اور تہذیب الاحکام کی روایات کا تعلق ہے تو شیعہ محققین نے انہیں نقد و تبصرہ سے بالا نہیں سمجھا اور یہ روایات صحیح السند نہیں ہیں اور پھر ان روایات میں بنت علی کے الفاظ موجود ہیں۔ مگر کسی روایت میں اس ام کلثوم کے بنت فاطمہ ہونے کی صراحت موجود نہیں۔

۸۔ ابن اذینہ بیان کرتے ہیں، امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں (لفظ قیل سے) کہا گیا کہ لوگ ہمارے خلاف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت امیر نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا عقد عمر سے کیا۔ امام ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کیا لوگ یہ بات کہتے ہیں؟ وہ کبھی سیدھے رستے پر نہیں آئیں گے۔ سبحان اللہ کیا امیر المومنین اس پر قادر نہ تھے کہ عمر میں اور ام کلثوم میں وہ حائل ہو جاتے اور اسے بچا لیتے، وہ جھوٹ کہتے ہیں ایسا نہیں ہوا جو وہ کہتے ہیں۔

أما كان يقدر امير المومنين ان يحول بينه و بينها و فينقلها كذبوا لم يكن ما قالوا. (تجليات ص ۲۰۰ بحواله مرأة العقول ج ۳ ص ۴۴۸ ج ۴ ص ۱۹)

۹۔ بناء بر تسلیم صحت عقد وہ ام کلثوم بنت ابی بکر تھیں اور ان کی والدہ اسماء بنت عمیس تھیں جنہوں نے بعد وفات ابی بکر حضرت علیؓ سے عقد کر لیا تھا اور وہ دونوں صغیر سن بچے محمد بن ابی بکر اور ام کلثوم بنت ابی بکر اپنے ہمراہ لائیں...... اس بچی کی تربیت حضرت علیؓ کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ اس لیے مجازاً اسے بنت علیؑ کہہ دیا گیا اور جناب امیر نے بھی حق سرپرستی ادا کرتے ہوئے مقدور بھر اس بچی کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۰۔ اور بفرض محال اگر یہ عقد واقع ہوا ہے تو انتہائی جبر واکراہ کی حالت میں ہوا ہے اور شریعت اسلامیہ نے ہر حرام چیز کو حتی کہ لحم خنزیر کو بھی عند الضرورۃ حلال قرار دیا ہے۔ ارشاد معصوم ہے۔

ما من شئی حرّمه الله الا وقد احلّه عند الضرورة . (تجليات ص ۲۰۲)

جواب الجواب

رافضی اپنے پہلے چار جوابات میں مولانا دبیر کے اصول کافی اور تہذیب الاحکام سے پیش کردہ حوالوں کی کسی نقل صحیح سے تردید اور تضعیف پیش نہیں کر سکا۔ کسی روایت کی تضعیف کے لیے وہ نقل چاہیے جو اس روایت کا حوالہ دے کر اس کی تردید کرے۔ رافضی ان حوالوں کو کسی حوالے سے نا قابل اعتبار ثابت کرنے میں بالکل ناکام ہے۔ پھر جواب نمبر ۲ میں وہ اپنے اس دعوے پر کہ ام کلثوم بنت فاطمہ سانحہ کربلا میں موجود تھیں۔ اس پر بھی یہ رافضی امام زین العابدینؒ سے لے کر امام حسن عسکری تک کسی امام کی شہادت نہیں لا سکا۔ "باتفاق تمام مورخین" کے الفاظ یونہی اس نے ترتیب دے لیے ہیں۔ اس خود ساختہ مفروضہ سے اتفاق محدثین توڑا نہیں جا سکتا۔ رافضی ضرورت کے اس موقع پر کوئی حوالہ پیش نہیں کر پایا۔ پانچویں نمبر پر اس نے اس سلسلہ میں سنی اور شیعہ دونوں کی روایات کو مضطرب اور متعارض کہا ہے۔ سو اس سلسلہ میں ہم کچھ سنی روایات بھی پیش کیے دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی روایت محدثین کی اصطلاح کے مطابق مضطرب اور متعارض قرار نہیں پاتی۔ باقی رہا جھوٹ سو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس کے بعد ہم شیعہ روایات سے بھی ثابت کریں گے کہ شیعہ مذہب یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کی حضرت ام کلثوم بنت علیؓ سے تزویج ایک واقعہ ہے گو اس پر ایک جبری نکاح کا نام انہوں نے تجویز کر رکھا ہے یا وہ اسے ایک غصب قرار دیتے ہیں۔ اہل سنت اسے غصب تسلیم نہیں کرتے۔ یہ بات حضرت علیؓ کی عزت کے خلاف ہے کہ ان کی بیٹی گویا ان کی ربیبہ بیٹی کو کوئی غصب کر کے لے جائے۔

حضرت ام کلثوم کے بنت فاطمہ ہونے پر سنی روایات

۱۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب حمل النساء القرب ...... میں ہے:

حدثنا عبدان اخبرنا عبد الله اخبرنا يونس عن ابن شهاب قال ثعلبة بن ابى مالک ان عمر بن الخطاب قسم مروطاً بين نساء من نساء المدينة فبقى مرط جيّد فقال له بعض من عنده يا امير المومنين اعط هذا بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم التى عندک يريدون ام كلثوم بنت على فقال عمر ام سليط احق ...... فانها كانت تزفر لنا القرب يوم احد. (صحيح البخارى ج ۱ ص ۴۰۳)

ترجمہ: "حضرت عمرؓ مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کر رہے تھے کہ ایک اچھی چادر باقی رہی، حاضرین میں سے کسی نے کہا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ام کلثوم بنت علیؓ کو جو آپ کے نکاح میں ہے دے دیں۔ آپؓ نے کہا، ام سلیط اس کی زیادہ حق دار ہے، وہ احد کے دن ہمارے لیے پانی کی مشکیں بھر کر لاتی رہی ہے۔"

(۱) اس روایت میں حضرت ام کلثوم کے لیے صریح طور پر بنت رسولؐ کے الفاظ موجود ہیں۔ سو یہاں کوئی اور ام کلثوم مراد نہیں۔ یہ ام کلثوم بنت فاطمہ ہی ہو سکتی ہے جو یہاں بنت رسول کے طور پر مذکور ہے۔

(۲) اس حدیث کے راویوں میں کوئی ضعیف نہیں۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔

(۳) یہ تیسری صدی کی تاریخی دستاویز ہے کہ حضرت عمرؓ کی بیوی ام کلثوم حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں اور وہ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھیں۔ اس تاریخی حوالے پر دوسری صدی کی بھی ایک دستاویز ملاحظہ کیجیے۔

۲۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد محدث عبدالرزاق (۲۱۰ھ) حضرت سفیان الثوری ۱۶۱ھ سے روایت کرتے ہیں:

عن ابی حصین و اسمعیل عن الشعبی ان ابن عمر صلّٰی علٰی ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب و زید بن عمر فجعل زیداً یلیه والمرأة امام ذلک. (المصنف ج ۲ ص ۴۶۵)

ترجمہ: ''علامہ شعبی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ام کلثوم بنت علی اور اس کے بیٹے زید کی نماز جنازہ پڑھائی۔ امام کے سامنے زید کی میت تھی اور اس کے آگے اس مرحومہ کی۔''

حضرت علیؓ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم اگر آپ کی ربیبہ ہوتیں اور حضرت اسماء بنت عمیس کی صاحبزادی ہوتیں تو بنو ہاشم کو اس موقع پر اس خصوصیت سے حاضر ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں بنو تمیم خصوصیت سے حاضر ہوتے لیکن وہاں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اپنی بہن کے جنازہ پر آئے۔ ان دنوں مدینہ پر سعید بن العاص گورنر تھے۔ نماز جنازہ حضرت ام کلثوم کے سوتیلے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر نے پڑھائی۔ روایت ذیل ملاحظہ فرمائیں:

عبد الرزاق عن الثوری عن رزین عن الشعبی قال ...... ان ابن عمر فعل ذلک بام کلثوم و زید و ثم رجال من بنی هاشم قال اراه ذکر حسنا و حسیناً. (المصنف ج ۲ ص ۴۶۶)

ترجمہ: ''علامہ شعبی کہتے ہیں' وہاں بنو ہاشم کے بہت سے لوگ موجود تھے' آپ نے ان میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی ذکر کیا۔''

جنازہ میں حضرت امام حسن اور امام حسین اور کئی دوسرے ہاشمیوں کی حاضری بتلاتی ہے کہ یہ کسی ہاشمیہ کا جنازہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی اس جنازہ میں موجود تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو امامت کے لیے حضرت امام حسنؓ نے ہی تجویز کیا تھا۔ (الاستیعاب لابن عبدالبرؒ)

۳۔ سنن ابی داؤد باب کتاب الجنائز اذا حضر جنائز رجال و نساء من یقدم ...... میں ہے:

حدثنا یزید بن خالد بن وهب الرملی حدثنا ابن وهب عن ابن جریج عن یحیٰی بن صبیح قال حدثنی عمار مولیٰ الحارث بن نوفل انه شهد جنازة ام کلثوم و ابنها فجعل الغلام مما یلی الامام فانکرت ذالک وفی القوم ابن عباس و ابو سعید الخدری و ابو قتادة و ابو هریرةؓ فقال هذه السنة.

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۹۹)

ترجمہ: ''حارث بن نوفل کے آزاد کردہ غلام عمار کہتے ہیں کہ وہ ام کلثوم اور اس کے بیٹے کے جنازہ میں موجود تھے۔ میں نے اس ترتیب کو اوپرا جانا اور حاضرین میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابوسعید الخدریؓ، حضرت ابو قتادہ اور حضرت ابو ہریرہ بھی موجود تھے۔ (آپ نے کہا (ترتیب جنازہ) میں سنت یہی چلی آرہی ہے۔''

۴۔ ابن جریج حضرت نافع سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر نے سات جنازے پڑھائے' ان میں حضرت علیؓ کی بیٹی ام کلثوم جو حضرت عمرؓ کی بیوی تھیں ان کا اور ان کے بیٹے زید کا بھی جنازہ تھا۔ وہ بھی (ماں بیٹا) اکٹھے رکھے گئے۔ ان دنوں مدینہ پر حکمران سعید بن العاص تھے اور لوگوں میں حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید الخدریؓ، حضرت ابو قتادہؓ بھی تھے۔ امام نسائی (۳۰۳ھ) روایت کرتے ہیں:

وضعت جنازة ام کلثوم بنت علی امرأة عمر بن الخطاب و ابن لها یقال له زید وضعاً واحداً. (ص ۲۱۷ طبع دهلی)

ترجمہ: ''اس میں ام کلثوم کے بنت علی ہونے کی تصریح بھی ہے۔ امام نسائی کی یہ روایت بھی ملاحظہ کریں۔''

فوضع الغلام مما یلی الامام فقال رجل فانکرت ذلک فنظرت الٰی ابن عباس و ابی هریرة و ابی سعید و ابی قتادة فقلت ما هذا قالوا هی السنة. (سنن کبری ج ۱ ص ۶۴۱' المجتبیٰ ج ۱ ص ۲۸۰)

ترجمہ: ''ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابوسعید الخدری اور حضرت ابو قتادہ کی طرف دیکھا' ان سب حضرات نے کہا' اجتماعی جنازہ میں یہی سنت چلی آرہی ہے۔''

یہ تیسری صدی کے اواخر کی تاریخی دستاویز ہے۔ اس وقت شیعہ عقائد ابھی مرتب ہو رہے تھے۔ چوتھی صدی میں شیعہ حدیث کی کتابوں میں پہلی کتاب الکافی مرتب ہوئی۔ یہ محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۹ھ) نے لکھی۔ انہوں نے

پہلی تین صدیوں کی اس مسلمہ حقیقت کا کہیں انکار نہیں کیا بلکہ اس کا کھلا اقرار کیا۔اور فروع کافی میں تزویج ام کلثوم باب باندھا ہے۔آپ اس میں حضرت امام جعفر صادقؒ سے یہ روایت لائے ہیں:

ان ذلک فرج غصبناہ ۔ (فروع کافی ج۲ص۱۴۱)

ترجمہ: ''یہ وہ فرج ہے جو ہم سے چھینی گئی۔''

حضرت ام کلثوم کے بنت فاطمہ ہونے پر شیعہ روایات

۱۔ محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۹ھ) نے فروع کافی میں ایک مستقل باب باندھا ہے۔باب تزویج ام کلثوم (فروع کافی ج ۱ص) اور اس میں حضرت امام کی یہ روایت پیش کی ہے۔اول فرج غصبناہ . یہ پہلی لڑکی ہے جو ہم (اہل بیت) سے جبراً (نکاح میں) لی گئی ہے۔سو یہ اہل بیت میں سے تبھی ہو سکتی ہے کہ بنت فاطمہ ہو۔اسماء بنت عمیس کی بیٹی اہل بیت میں کیسے شمار کی جاسکتی ہے؟

رہا یہ غصب کا الزام تو یہ اسی طرح ہے جیسے شیعہ اکابر صحابہ پر غصب خلافت کا الزام لگاتے ہیں اور وہ غلط ہے۔ اسی طرح وہ ان پر غصب ام کلثوم کا الزام بھی لگاتے ہیں اور وہ بھی غلط ہے۔علامہ کلینی نے اس باب میں یہ دوسری روایت پیش کر کے لفظ غصب کی پوری تردید کر دی ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ انہوں نے اس رشتہ (ام کلثوم بنت فاطمہ در نکاح عمر) کو تزویج کا نام دیا ہے نہ کہ اغوا کا اور ظاہر ہے کہ تزویج باقاعدہ نکاح سے ہوتی ہے' غصب سے نہیں۔وہ دوسری روایت جو علامہ کلینی اس باب میں لائے ہیں' یہ ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا جاء کم من ترضون خلقه و دينه فزوجوه الا تفعلوا تكن فتنة فى الارض و فساد كبير. (فروع كافى ج ٢ ص ١٤١ لكهنو)

ترجمہ: ''جب تمہارے پاس کوئی شخص رشتہ لینے آئے اور اس کے اخلاق اور دینداری پر تمہیں اطمینان ہو تو اسے رشتہ دے دو' ایسا نہ کرو گے تو اس سے زمین پر فتنے ہوں گے اور بڑا فساد ہوگا۔''

اب پہلی روایت کی سند ملاحظہ ہو۔

علامہ کلینی کی دوسری روایت

علامہ کلینی اصول کافی میں ایک آسمانی وصیت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔اس میں حضرت علیؓ کو بہت سی تکلیفات پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ان میں ایک تکلیف ہتک حرمت بھی بتلائی گئی ہے۔اس میں آپ کی بیٹی کے اس نکاح کا اشارہ ملتا ہے۔حضرت امام موسیٰ کاظم سے اصول کافی میں مروی ہے' حضور اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے یہ عہد لیا تھا:

قبلت و رضيت وان انتهكت الحرمة و عطلت السنن و مزق الكتاب و هدمت الكعبة . (اصول كافى ص ١٧٣ لكهنو)

ترجمہ: ''میں نے عہد کیا اور اس پر راضی ہوا اگرچہ عزت لٹ جائے اور حضورؐ کی سنت معطل ٹھہریں اور قرآن پھاڑ دیا جائے اور کعبہ گرا دیا جائے۔''

اب شیعہ مجتہدین سے اس اشارے کی وضاحت بھی سنئے۔ان کے قزوین کے مشہور مجتہد ملا خلیل شرح اصول کافی میں لکھتے ہیں:

"اشارت است به غصب عمر ام كلثوم بنت فاطمه عليها السلام را. " (الصافى شرح الكافى ج ٣ ص ٢٨٢)

ترجمہ: ''یہ جو عزت لٹنا ہے اس میں حضرت فاطمہؓ کی بیٹی ام کلثوم کے غصب کی طرف اشارہ ہے جو ہم اہل بیت سے چھینی جائے گی۔''

یہ شیعہ مذہب کی چوتھی صدی کی آواز ہے۔کسی شیعہ عالم نے چوتھی صدی میں علامہ کلینی کے اس مذہب کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔پانچویں صدی تک شیعہ مذہب کی یہی بات چلتی رہی کہ یہ ام کلثوم حضرت علیؓ کی ہی بیٹی تھیں۔

علامہ کلینی یہ بھی روایت کرتے ہیں:

سلیمان بن خالد حضرت امام جعفر صادقؒ کے اصحاب میں سے تھے۔آپ نے حضرت امام سے پوچھا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ اپنی عدت کہاں گزارے۔ آپ نے کہا جہاں وہ چاہے (فروع کافی ج۲ص۳۱۰)

عن ابى عبد الله عليه السلام قال سألته عن المرأة المتوفى عنها زوجها تعتد فى بيتها او حيث شاءت قال بل حيث شاءت ان علياً صلوٰت الله عليه السلام لما توفى عمر اتٰى ام كلثوم فانطلق بها الٰى بيته. (فروع كافى جلد ٢ ص ٣١١ طبع لكهنو)

ترجمہ: ''حضرت امام جعفر صادقؒ سے مروی ہے آپ سے بیوہ کے بارے میں پوچھا گیا وہ اپنی عدت کہاں گزارے اپنے ہی گھر یا جہاں چاہے آپ نے کہا جب حضرت عمرؓ فوت ہوئے، حضرت علیؓ (اپنی بیٹی) ام کلثوم کے پاس آئے اور اسے اپنے گھر لے گئے (اس نے عدت وہاں گزاری)

آیئے اب ہم آپ کو پانچویں صدی میں لے چلیں۔یہ امام محمد باقر (۱۱۴ھ) کی روایت ہے:

اثنا عشریوں کے تیسرے محدث علامہ محمد بن حسن الطوسی (۴۶۰ھ) تہذیب الاحکام میں امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں:

ما تت ام كلثوم بنت علی و ابنها زيد بن عمر بن الخطاب فی ساعة واحدة لا يدری ايهما هلک قبل فلم يرث احدهما من الآخر و صلی عليها جميعاً.

(تهذيب الاحكام ج ۲ كتاب الميراث ص ۳۸۰)

ترجمہ: ''ام کلثوم بنت علی اور اس کے بیٹے زید بن عمر کی وفات ایک ہی ساعت میں ہوئی۔ یہ نہ جانا جا سکا کہ پہلے کون فوت ہوا' ان میں سے کوئی دوسرے کا وارث نہ کیا گیا اور دونوں کی نماز جنازہ اکٹھی پڑھی گئی۔

ام کلثوم بنت علی اور اس کا بیٹا زید بن عمر بن الخطاب ایک ہی وقت میں فوت ہوئے۔

اس روایت کی یہ سند ملاحظہ ہو۔ اس میں ایک راوی بھی ایسا نہیں جو وضاع ہو اور جس پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔

پوری پانچویں اور چھٹی صدی میں ہم شیعہ مذہب میں اس ام کلثوم کے بنت علی ہونے میں اور بنت حضرت فاطمہؓ ہونے کے خلاف ایک آواز بھی نہیں سنتے اور ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ شیعہ مذہب بالاتفاق یہی ہے کہ ام کلثوم واقعی حضرت عمرؓ کی تزویج میں دی گئی تھیں اور یہ حضرت فاطمہؓ کی ہی بیٹی تھی۔

شیعہ کتابوں میں اس کثرت اور قوت سے ام کلثوم بنت علی کا یہ نکاح مذکور ہے کہ ان کے خاتم المحدثین ملا باقر مجلسی ان علماء شیعہ پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں جو اس نکاح کا انکار کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کا انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ سو بہتر یہی ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ نکاح حضرت علیؓ نے تقیہ کے پیرائے میں کر دیا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

فبعد ورود تلک الاخبار و ما سياتی باسانيد ان علياً لما توفی عمر اتیٰ ام كلثوم ذنطلق بها الیٰ بيته و غير ذلک مما اوردته فی كتاب بحار الانوار انكار ذلک عجيب والاصل فی الجواب هو ان ذلک وقع علیٰ سبيل التقيه والاضطرار ولا استبعاد فی ذلک. (مرأة العقول فی شرح الفروع و اصول ج ۳ ص ۴۴۹)

ترجمہ: ''سوان احادیث کے ملنے پر اور جو آگے آئیں گی کہ حضرت عمرؓ کی وفات پر حضرت علیؓ ام کلثوم کے پاس آئے اور اسے اپنے گھر لے گئے اور کئی دوسری احادیث جو میں نے کتاب بحار الانوار میں لکھی ہیں اس نکاح کا انکار بہت حیران کن ہے ہم شیعہ کا اصل جواب وہی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا بطور تقیہ کے ہوا اور مجبوری میں ہوا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو دین میں نہ ہو سکے۔

حضرت عمرؓ کی اس نکاح سے غرض صرف یہ تھی کہ وہ کسی طرح اہل بیت کی رشتہ داری میں آ جائیں۔ بقول شیعہ انہوں نے حضورؐ کی یہ حدیث سن رکھی تھی کہ قیامت کے دن ہر حسب ونسب جاتا رہے گا۔ سوائے میرے حسب اور نسب

کے۔ آپ نے چاہا کہ اس دن آپ اہل بیت کے رشتہ داروں میں اٹھائے جائیں۔

علی بن عیسی اردبیلی (۶۴۶ھ) اس روایت کو نقل کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قال عمر حين طلب مصاهرة علی انی سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول كل سبب و نسب منقطع يوم القيٰمة الا سببی و نسبی.

(کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ ص ۱۰)

ترجمہ: ''حضرت عمرؓ نے جب حضرت علیؓ سے یہ رشتہ مانگا تو کہا' میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا تھا' آپ نے فرمایا: 'ہر رشتہ اور نسب قیامت کے دن جاتا رہے گا مگر میرا رشتہ اور نسب ہمیشہ قائم رہے گا'۔''

امام بیہقی نے سنن کبری میں آگے یہ الفاظ بھی روایت کیے ہیں:

انه كان لی صحبة فاحببت ان يكون لی معها سبب.

(سنن کبری ج ۷ ص ۶۴ و ۱۱۴)

ترجمہ: ''مجھے حضورؐ سے صحبت کا شرف تو ہے ہی' میں نے چاہا کہ اس کے ساتھ مجھے حضورؐ سے یہ رشتہ بھی مل جائے۔''

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تزویج بر طریق غصب یا ہتک حرمت نہ تھی بہ طریق محبت وعقیدت تھی اور مسلمانوں کی اہل بیت سے ایک والہانہ محبت کا اظہار تھا اور اس میں رشتہ رسالت سے انسلاک تھا۔

ہم یہاں پانچویں اور چھٹی صدی کی یہ دو اور شیعی روایتیں پیش کیے دیتے ہیں۔ اثنا عشریوں میں ایک بڑے مجتہد شیخ مرتضیٰ علم الھدی (۴۳۶ھ) ہوئے ہیں وہ بھی لکھتے ہیں:

اما انكاحه بنته عمر لم يكن الا بعد توعد و تهدد و مراجعة و منازعة و كلام طويل معروف اشفق معه من شروق الحال و ظهر مالا يزال يخفيه ...... علی انّه لا يمتنع ان يبيح الشرع ان يناكح بالاكراه من لا يجوز مناكحة مع الاختيار.

(كتاب الشافی ص ۳۵۴)

ترجمہ: ''آپ کا اپنی بیٹی کو حضرت عمرؓ کے نکاح میں دینا دھمکیوں اور ڈرانے' بار بار کہنے اور تنازع کرنے اور لمبی چوڑی باتوں کے بعد ہی وقوع میں آیا۔ آپ ان حالات میں ڈر گئے ...... پھر یہ کوئی ممنوع نہیں کہ شریعت مجبوراً اس نکاح کو جائز قرار دے جو اختیاراً جائز نہ ہو۔''

چھٹی صدی کے علامہ ابن شہر آشوب مازندرانی (۵۸۸ھ) بھی لکھتے ہیں:

فولد من فاطمة عليها السلام الحسن والحسين والمحسن و زينب الكبرىٰ و ام كلثوم الكبرىٰ تزوجها عمر.

(مناقب لآل ابی طالب ابن شهر آشوب ج ۳ ص ۱۶۲)

اس میں اس ام کلثوم کے بنت فاطمہ ہونے کی بھی پوری صراحت ہے سو یہ وہ ام کلثوم نہیں جو حضرت اسماء بنت عمیس کی بیٹی تھی۔

۶۔ رافضی کے پانچویں جواب کے جواب الجواب میں اس کے چھٹے جواب کی بھی دھجیاں اڑ گئی ہیں کہ ام کلثوم بنت علی کے حضرت عمرؓ کے زوجہ ہونے کی روایات یا تو بلاسند ہیں اور جو سند سے ہیں ان کے راوی کذاب اور وضاع درجے کے ہیں۔

شیعہ کے اصول اربعہ اہل سنت کی صحاح ستہ کی طرح نہیں

۷۔ رافضی اپنے ساتویں جواب میں کہتا ہے:

"شیعہ علماء محققین نے اہل سنت کی صحاح ستہ کی طرح اپنی کتب کو کبھی صحاح اربعہ نہیں کہا اور ان کو نقد و جرح سے بالا نہیں جانا۔" (دیکھئے تجلیات صداقت)

جواب الجواب

شیعہ علماء اگر اپنی ان کتابوں کو صحاح اربعہ نہیں کہتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انہیں صحاح سے ایک اوپر کے درجے میں رکھتے ہیں اور انہیں اپنے مذہب کے اصول کا نام دیتے ہیں۔ انہیں وہ اپنے اصول اربعہ کہتے ہیں۔

(۱) اہل سنت کے ہاں صحاح ستہ کے مؤلفین سب کے سب مقلدین تھے اور شیعہ اصول اربعہ کے مؤلفین سب مجتہدین تھے۔ راویوں کی جرح و تعدیل مقلدین کی تالیف میں چلتی ہے مجتہدین کی تالیف میں نہیں۔ صحاح ستہ میں صحیحین کے علاوہ دوسری چار کتابوں میں بعض راویوں پر جرح کی جاتی ہے اور خود ان محدثین نے بھی اپنی ان کتابوں میں بعض راویوں پر جرح کی ہے۔ سو رافضی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اہل سنت انہیں نقد و جرح سے بالا سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس شیعہ اصول اربعہ کے مؤلفین مجتہد تھے۔ ان کتابوں میں جرح و تعدیل نہیں چلتی۔ سو یہ ساری روایتیں ان کے مجتہدین پر حجت ہوں گی اور ان میں سے کسی روایت کا انکار نہ کیا جاسکے گا۔

(۲) مجتہد جب کوئی روایت لاتا ہے تو وہ اپنے ہاں اس کی تصحیح کرتا ہے گو کسی دوسرے محدث کے ہاں وہ روایت ضعیف ہو۔ سو شیعہ اصول اربعہ میں اگر کوئی جھوٹا راوی ملے تو اسے اس قاعدہ کے مطابق لائق قبول سمجھا جاتا ہے کہ

جھوٹا بھی تو آخر کبھی سچ بولتا ہے جب اس کی روایت کسی اصول شیعہ کے مطابق ہو اور اس میں کوئی استبعاد نہ ہو تو شیعہ کے ہاں اسے مسترد کرنے کی کوئی راہ نہیں نکلتی اور اس کی بات کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مجتہد کی کسی روایت کی قبولیت اس کے ہاں اس کی تصحیح ہے

المجتهد اذا استدل بحديث كان تصحيحا له كما في التحرير لابن الهمام

(القواعد في علوم الحديث ص ۵۷)

ترجمہ: مجتہد جب کسی حدیث سے استدلال کرے تو یہ اس کے ہاں اس حدیث کی تصحیح سمجھی جائے گی۔

علامہ ابن ہمام نے التحریر میں ایسا ہی لکھا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی ایک حدیث کے متعلق جس کے ایک راوی پر امام بیہقی نے کلام کیا ہے لکھتے ہیں۔

وقد احتج بهذا الحديث احمد و ابن المنذر وغيرهما وفي ذلك دليل على صحته عندهما. (التلخيص الحبير جلد ۱ ص ۱۷۰)

یہ بات نہایت معقول ہے وہ حدیث اگر اس استدلال کرنے والے کے ہاں لائق قبول نہ ہوتی تو وہ اس سے کبھی استدلال نہ کرتا ایسا کرنا اس کی دیانت اور امانت کے خلاف تھا۔

۸۔ ابن اذینہ نے روایت انکار تزویج امام جعفر سے نہیں سنی

رافضی لکھتا ہے:

ابن اذینہ بیان کرتے ہیں:

قيل لابي عبد الله ان الناس يحتجون علينا ويقولون ان امير المؤمنين زوّج فلاناً ابنته ام كلثوم (وكان متكئاً نجلس وقال) ويقولون ذلك ان قوماً يزعمون ذلك لا يهتدون الى سواء السبيل سبحان الله اما كان لا يقدر امير المؤمنين ان يحول بينه و بينها فينقذها. (تجلیات صداقت ص ۲۰۰ بحوالہ مرآۃ العقول)

ترجمہ: "امام جعفر صادقؒ سے کہا گیا کہ لوگ ہم پر استدلال لاتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی ام کلثوم فلاں کو نکاح میں دے دیں تو حضرت امام جو لیٹے ہونے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا جو لوگ یہ کہتے ہیں کبھی سیدھی راہ نہ پاسکیں گے سبحان اللہ کیا حضرت علیؓ اس پر قادر نہ تھے کہ اس شخص میں اور اپنی بیٹی میں حائل ہو جائے اور اسے ان سے چھڑا لیتے۔"

جواب الجواب

یہ روایت قیل (یہ کہا گیا ہے) سے شروع ہوتی ہے یعنی یہ کہا گیا ہے۔ وہ کہنے والے کون ہیں؟

سو یہ اس پر اس کے ضعیف ہونے کا گمان ہے۔ رافضی نے ان کے نام نہیں بتلائے۔ ان میں سے کس نے حضرت امام سے اس کا جواب سنا' اس کا بھی کوئی پتہ نہیں۔ نہ ابن اذینہ کہتا ہے کہ میں نے امام کو کروٹ بدل کر بیٹھتے دیکھا' نہ وہ کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام کو یہ جواب دیتے سنا۔ اب ایسی بے سروپا روایت سے صدیوں کا مسلم شیعہ مذہب کہ حضرت عمرؓ کی وہ زوجہ حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں' کیسے رد کیا جاسکتا ہے۔ پھر قارئین کرام روایت کے ان الفاظ پر بھی غور کریں۔ یہ تزویج ام کلثوم کے صرف جبراً ہونے کی نفی ہے مطلق تزویج کی نفی نہیں۔ حضرت علیؓ اگر نہ چاہتے تو یہ نکاح کبھی نہ ہو پاتا۔

سبحان الله أما كان يقدر امير المؤمنين ان يحول بينه بينها فينقذها.

ترجمہ: کلمہ تعجب ہے' "کیا امیر المؤمنین اتنی طاقت بھی نہ رکھتے تھے کہ وہ غاصب اور ام کلثوم کے مابین رکاوٹ بن جاتے اور اسے بچالیتے۔"

ہم پیچھے مرآۃ العقول کی یہ پوری عبارت ہدیہ قارئین کر چکے' اثنا عشری اپنے ائمہ سے آج تک کسی سند صحیح سے اس نکاح کی نفی ثابت نہیں کر سکے۔

گیارہویں صدی تک شیعہ مذہب اس تزویج کا اقرار ہی رہا ہے

گیارہویں صدی کا شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) لکھتا ہے:

اگر نبی دختر بہ عثمان دار ولی دختر بہ عمر فرستاد۔ (مجالس المؤمنین ج ۱ ص ۲۰۴)

ترجمہ: "اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی عثمان کو دی' علی نے بیٹی حضرت عمرؓ کے ہاں بھیجی۔"

یہ بھیجنے کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اسے غصبانہ لے گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے اسے نکاح سے آپ کے ساتھ روانہ کیا تھا۔

چرا آنحضرت دختر را بہ عمر بن خطاب داد گفت بواسطہ آنکہ اظہار شہادتین مے نمود بزبان۔

(مجالس المؤمنین ج ۱ ص ۲۵۱)

ترجمہ: "حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی کیوں حضرت عمرؓ کے نکاح میں دی؟ امام نے جواب دیا یہ اس لیے کہ حضرت عمرؓ مسلمان تھے اللہ کے ایک ہونے اور حضور ﷺ کی رسالت کا برابر اقرار کرتے تھے۔"

اسلام کے پہلے ہزار سال میں اثنا عشریوں کے ہاں کہیں اس نکاح کا انکار نہیں ملتا۔

رہا شیعہ کا یہ اصول کہ اگر کسی مسئلے میں ان کے ہاں دو روایتیں ہوں ایک عامہ کے مطابق اور ایک عامہ کے خلاف تو اسے قبول کیا جائے جو عامہ کے خلاف ہو۔ تو اسے اس واقعہ تزویج ام کلثوم پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اصول وہیں لاگو ہو سکتا ہے جہاں شیعہ مذہب میں واقعی شروع سے دو روایتیں چلی آرہی ہوں۔ یہاں یہ صورت حال نہیں ہے۔ شیعہ کے ہاں اس واقعہ میں شروع سے ایک ہی روایت رہی ہے کہ حضرت علیؓ کی بیٹی ام کلثوم بے شک حضرت عمرؓ کی تزویج میں آئیں۔ آگے اس بات میں وہ بے شک مختلف الآراء رہے کہ یہ تزویج غصب خلافت کی طرح غصباً اور جبراً وقوع میں آئی یا اس اصول پر کہ تزویج بنات کے لیے فریق ثانی کا مسلمان ہونا کافی ہے اس کے لیے مومن ہونے کی شرط نہیں یا اس لیے کہ اس میں خاندان رسالت سے عقیدت کا ایک اور قدم تھا۔

یہ نکاح واقع ہوا صورت عمل کوئی بھی ہو شیعہ مذہب میں یہ بات پہلے ہزار سال میں کہیں نہیں ملتی کہ کسی نے ان کے ہاں اس نکاح کے وقوع سے انکار کیا ہو۔ اگر کسی نے انکار کیا تو رائے سے کیا' روایت سے نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نقل واقعات میں روایت کی ضرورت ہوتی ہے' رائے کی نہیں۔ یہ کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں کہ اس پر قم کے مجتہدین اجتہاد کرنے بیٹھ جائیں۔

سو رافضی کا یہ آٹھواں نمبر کا جواب بھی باقی سات جوابات کی طرح کلیتہً ھباءً منثورا ہو چکا۔

۹۔ رافضی کا نویں نمبر پر یہ جواب ہے کہ بناء بر تسلیم صحت عقدہ ام کلثوم حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں جو محمد بن ابی بکر کی بہن تھیں' اہل بیت میں سے نہ تھیں۔

جواب الجواب

ہم صحیح بخاری' سنن نسائی' اصول کافی اور فروع کافی سے ثابت کر آئے ہیں کہ یہ ام کلثوم حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء کی ہی بیٹی تھیں' ان کی پیدائش حضور کی زندگی میں ہوئی اور وہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت کم از کم تیرہ چودہ سال کی تھیں۔ چار پانچ سال کی نہ تھیں۔ تاہم ڈھگو رافضی کو یہ موقف اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ حضرت علیؓ پر یہ بات برابر لوٹتی ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی ام کلثوم (گو وہ اصلاً آپ کی بیٹی ہو یا آپ کی ربیبہ ہونے کی وجہ سے آپ کی بیٹی ہو) حضرت عمرؓ کے نکاح میں کیوں دی؟ اگر وہ مومن نہ تھے تو یہ نکاح کیسے عمل میں آیا؟

قرآن کریم کا حکم عام ہے' اس کی اپنی بیٹیوں سے تخصیص نہیں' وہ یہ کہتا ہے کہ جن لڑکیوں کے تم وکیل یا کفیل ہو یا ان کا کسی کے نکاح میں دینا تمہارے ہاتھ میں ہے تو تم یہ لڑکیاں مشرکین کے نکاح میں نہ دو اس میں یہ قید نہیں کہ تم اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں نہ دو لیکن تم دوسروں کی بیٹیاں ان کے نکاح میں دے سکتے ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے تو اگر حضرت علیؓ نے ام کلثوم حضرت عمرؓ کے نکاح میں دی تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کو مومن سمجھتے تھے۔ کافر اور مشرک نہ سمجھتے

تھے۔ قرآن کہتا ہے:

لا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا. (پ ۲ البقرہ ۲۲۱)

ترجمہ: ”[] کافروں کو کوئی لڑکی نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔“

اسی طرح حضور اکرمؐ کے رقیہ اور ام کلثوم کو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دینے سے ان کا مومن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس حکم قرآنی میں یہ نہیں کہ اپنی بیٹیاں تو تم غیر مومنین کے نکاح میں نہ دو اور دوسروں کی بیٹیاں جن کا نکاح تمہارے اختیار میں ہو تم غیر مومنین کو دے سکتے ہو۔ ایسا ہرگز نہیں۔

فان علمتموھن مومنات فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن. (پ ۲۸ الممتحنہ ۱۰)

ترجمہ: ”اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ لڑکیاں مومنہ تھیں تو تم انہیں کافروں کو نہ لوٹاؤ وہ ان کافروں کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ کافران مومنات کے لیے حلال ہیں۔“

اس آیت میں سورۃ البقرہ کے لفظ مشرکین کی تفسیر مطلق کافرین سے کی گئی ہے۔

محمد بن حسن طوسی (۴۶۰ھ) لکھتا ہے:

نکاح الکافرۃ بسبب کفرھا سواء کانت عابدۃ وثن او مجوسیۃ او یھودیۃ او نصرانیۃ یدل علی ذلک قولہ تعالیٰ ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن فنھیٰ عن تزویج المشرکات قبل ایمانھن ونھیہ تعالیٰ علی الحظر. (تھذیب الاحکام کلاں ص ۱۹۸)

ترجمہ: ”کافر عورت سے نکاح کرنا وہ بت پرست ہو یا آتش پرست یہودیہ ہو یا نصرانیہ ایک جیسا ہے (یعنی جائز نہیں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر رہنمائی کرتا وہ یہ کہ تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں سو اللہ تعالیٰ نے کافر عورتوں سے ان کے ایمان لانے سے پہلے نکاح کرنے سے منع کیا ہے اور اللہ کا روکنا اس سے بچنے کے لیے ہے۔“

۱۰۔ رافضی کا دسواں جواب یہ ہے کہ اگر یہ نکاح واقعتاً ہوا تو نہایت مجبوری میں واقع ہوا اور نظریہ ضرورت کے تحت یہ جائز ہے۔ ارشاد معصوم ہے:

مامن شئی حرّمہ اللہ الا وقد احلّہ عند الضرورۃ. (تجلیات صداقت ص ۲۰۲)

ترجمہ: ”کوئی ایسی چیز نہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہو مگر یہ کہ اس نے اسے ضرورت کے وقت حلال کیا ہے۔“

جواب الجواب

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھوک کے اضطرار میں خنزیر کھانے کو لائق مغفرت ٹھہرایا ہے لیکن ایسے کسی اضطرار میں اللہ تعالیٰ نے زنا کو حلال کر دیا ہو اس پر قرآن وحدیث اور اقوال ائمہ میں ہمیں کوئی روایت نہیں ملی۔ قد احلہ جملہ خبریہ ہے سو یہاں حوالہ درکار ہے کہ کہیں زنا کو یا کافروں سے نکاح کو جائز کیا گیا ہو۔

پھر نظریہ ضرورت کے تحت رافضی کے خنزیر کھانے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن اسے ایک عادت بنانا پھر بھی جائز نہیں۔ اسلام کسی کو مستضعفین کی زندگی اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

یاد رکھئے کہ مجبوری میں حرام کھانے کی اجازت ہے لیکن اسے حلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس پر اس مجبور کو مواخذہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس کا مجبوری میں گناہ معاف کر دیں گے۔ یہ جو اسے معاف کرنے کی بشارت دی اس میں اشارہ ہے کہ یہ ہے گناہ ہی تاہم اس پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیں گے۔ وہ بہت ہی معاف کرنے والے ہیں۔

فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ. ان اللہ غفور رحیم.

(پ۲ البقرہ ۱۷۳)

ترجمہ: ”سو جو حالت اضطرار میں ہو نافرمانی کے لیے نہیں، نہ زیادتی کے طور پر تو اس پر کوئی گناہ نہ آئے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔“

فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانفٍ لاثم. فان اللہ غفور رحیم.

(پ۶ المائدہ ۳)

ترجمہ: ”پھر جو کوئی لاچاری میں آ گیا بھوک کی، لیکن وہ گناہ کی طرف نہ جھکا تھا تو اللہ بے شک بڑا بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔“

حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں:

جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں (یہ اشیاء) کھا لینے کی اجازت ہے بشرطیکہ نافرمانی اور زیادتی نہ کرے۔ نافرمانی یہ کہ مثلاً نوبت اضطرار کی نہ پہنچے اور کھانے لگے اور زیادتی یہ کہ قدر ضرورت سے زائد خوب پیٹ بھر کر کھا لے بس اتنا ہی کھائے جس سے مرے نہیں۔

حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

”حلال وحرام کا قانون مکمل ہو چکا اس میں اب کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک و پیاس کی

شدت سے بے تاب اور لاچار ہو وہ اگر حرام چیز کھا پی کر جان بچا لے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذت مقصود نہ ہو' غیر باغ ولا عاد تو حق تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرمادے گا۔ گویا وہ چیز تو حرام ہی ہے مگر اسے کھا پی کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی اتمام نعمت (اتممت علیکم نعمتی) کا ایک شعبہ ہے۔

رافضی نہ معلوم کس ارشاد معصوم سے حرام کو حلال قرار دے رہا ہے؟ اس نے اس پر قرآن وسنت سے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ما من شئی حرمه الله الا وقد احلّه عند الضرورة. (تجلیات صداقت ص ۲۰۲)

اکل حرام مجبوری میں لائق مغفرت ہے۔ آخرت میں گناہ کا بوجھ اس پر نہ آئے گا۔ لا اثم علیه ۔ لیکن حرام کو حلال کہنا درست نہیں ہے۔ اکل حرام کی اس وقتی اجازت سے اسے پورے تسلسل سے ایک حرام میں زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سوڈھ گو رافضی کا یہ استدلال یہاں کسی طرح درست نہیں بیٹھتا۔

رافضی نے نکاح ام کلثوم پر جو وجوہ پیش کیے ہیں ان میں اس کا آخری موقف یہی ہے کہ یہ نکاح بہ طریق غصب عمل میں آیا اس کے اسلاف اسے یوں ترتیب دیتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی اس بیٹی کا ولی نکاح حضرت عباس کو بنا دیا تھا۔ اس لیے جو غلطی ہوئی حضرت عباس سے ہوئی۔ حضرت علیؓ پر اگر کوئی سوال اٹھتا ہے تو وہ یہی کہ انہوں نے زندگی بھر کے لیے یہ مستضعفین کی صورت کیوں اختیار کی رکھی۔ ظاہر ہے کہ اس پر اہل سنت اور شیعہ ایک اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تزویج ام کلثوم کی بحث میں ہم اس دوسری بحث پر اتریں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ رافضی نے اپنے ان دس وجوہ میں آخری بات اسی کو ٹھہرایا ہے کہ حضرت علیؓ مرتضٰی نے مجبوراً اپنی بیٹی حضرت عمرؓ کے نکاح میں دی تھی۔ قرآن کریم میں مستضعفین کی زندگی گزارنے پر یہ وعید وارد ہے۔

ان الذین توفاهم الملٰئکة ظالمی انفسهم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا ألم تکن ارض الله واسعة فتهاجروا فیها فاولٰئک مأواهم جهنم وسآء ت مصیرا ٥ الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلاً. (پ ۵ النساء ۹۸)

ترجمہ: "جن کی فرشتے اس حالت میں جان نکالتے ہیں کہ وہ برا کر رہے تھے اپنا' وہ انہیں کہتے ہیں تم کس حال میں رہے۔ وہ کہتے ہیں ہم تھے اس ملک میں بے بس مجبور۔ فرشتے انہیں کہتے ہیں کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ جو چلے جاتے تم وطن چھوڑ کر وہاں۔ سوایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ ہے بہت بری جگہ۔ اس سے وہی بے بس مرد' عورتیں اور بچے مستثنیٰ ہیں جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر' اور نہ جانتے ہیں کہیں کا راستہ۔"

فضائل حضرت عثمانؓ پر مولانا دبیر کی کتب شیعہ سے پہلی شہادت اور اس پر رافضی کا جواب

۱۔ مولانا دبیر نے فروع کافی سے حضرت امام جعفر صادقؒ کی یہ روایت پیش کی ہے' حضرت امام جعفر (۱۴۸ھ) نے فرمایا:

قال سمعت ابا عبد الله علیه السلام یقول اختلاف بنی العباس من المحتوم.

(فروع کافی ج ۲ص ۹۹ کتاب الروضه)

ترجمہ: "بنو عباس میں اختلاف ہو کر رہے گا۔"

یہ حدیث اپنے مضمون میں بہت واضح ہے۔ اس سے منقبت عثمان میں کسی تاویل کو راہ نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ اس کے اثر کو توڑنے کے لیے شیعہ نے ایک حدیث گھڑی جسے ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار ج ۱۳ص ۲۶۳ سے ص ۲۷۰ میں درج کیا ہے۔ اس گھڑی روایت نے دونوں نداؤں میں اس طرح فرق کر دیا ہے جو منادی صبح کے وقت حضرت علیؓ کے شیعوں کی فوز وفلاح کی ندا کرے گا وہ ندائے ربانی ہوگی اور جو ندا دن کے آخری حصہ میں ہوگی وہ ندائے شیطانی ہوگی۔

(تجلیات صداقت ص ۹۵)

کیا امام جعفر صادقؒ نے اس شیطانی آواز کے بارے میں کہا کہ یہ بات غلط ہے؟ ایسا نہیں ہوگا۔ ائمہ کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ وہ شیطان کی بات بھی نقل کریں اور اس کی تردید نہ کریں۔ تو اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ تقریری حدیث ہوگئی اور اس میں وزن آ گیا۔ پھر شیعہ نے حدیث **لان الحق مع علی و علی مع الحق** پر قیاس کرتے ہوئے حدیث مندرجہ بالا میں شیطانی ندا کے یہ الفاظ داخل کیے ہیں اور اس کے لیے یہ قاعدہ استعمال کیا ہے **الاحادیث تفسر بعضها بعضاً** اس سے رافضی مولانا دبیر کے مقابلہ میں پورا دم توڑتا نظر آتا ہے۔ تاہم وہ اس حدیث کا انکار نہیں کر سکا۔ اب خارج سے دلیل لا کر اس حدیث کے اثر کو توڑنا خود اس ڈھ گو رافضی کی بے بسی کا ایک نشان ہے۔ استدلال بالمعارضہ تبھی ہوتا ہے کہ جب اندر سے کوئی جواب نہ بن پڑے۔

لیجیے ہم اس حدیث کی شرح کچھ اپنے الفاظ میں بھی کیے دیتے ہیں:

۱۔ حدیث کے یہ الفاظ **ان عثمان و شیعته هم الفائزون** قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ شیعان حضرت عثمانؓ کے مقابل وہ دوسرا گروہ کونسا ہوگا جس کو فوز وفلاح نصیب نہ ہوگی۔ وہ طبقہ کونسا ہو سکتا ہے جس کے مقابل

حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کو فائزون کی بشارت دی گئی ہے؟

پیش نظر رہے کہ حضرت عثمانؓ کے دور تک سب مسلمان ایک تھے۔ ان میں کوئی گروہ بندی نہ تھی۔ عبداللہ بن سبا یہودی بے شک ایک بغاوت کی فضا بنا رہا تھا مگر ان باغیوں کی کوئی گروہ بندی نہ تھی۔ نہ ابھی تک شیعہ کسی مذہبی فرقہ کی صورت میں قائم ہو پائے تھے۔ نہ حضرت علیؓ مرتضیٰ حضرت عثمانؓ سے ہٹ کر کسی اور مذہبی فرقہ میں گئے تھے۔ آپ نے عبد اللہ بن سبا کو زندہ جلا دیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان باغیوں کے بالمقابل شیعان عثمان جمہور مسلمان ہی تھے جو اس وقت کی پوری امت مسلمہ تھے اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ بھی انہی میں سے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں کوئی مذہبی گروہ بندی نہ تھی۔ اب آپ ہی سوچیں کہ کیا الا ان عثمان و شیعته هم الفائزون کبھی شیطانی ندا ہو سکتی ہے؟ پھر جب کہ دونوں ندا زن کے الفاظ بالکل ایک سے ہیں۔

الا ان عثمان و شیعته کے مقابل دوسرا گروہ ان علیاً و شیعته نہیں ہو سکتا کیونکہ انہیں (شیعان عثمان اور شیعان علی کو) اس وقت تک دو مستقل جماعتیں کہیں نہیں کہا گیا تھا ہاں ان کے مقابل دونوں کے اپنے اپنے مخالفین تھے جو اپنی جگہ سبائی اور خوارج بتلائے گئے ہیں۔ شیعان عثمان کے خلاف اس وقت سبائی تھے اور شیعان علی کے خلاف خوارج اٹھے جو اعتقادی طور پر حضرت علیؓ کے خلاف تھے۔ پیش نظر رہے، حضرت امیر معاویہؓ اعتقادی طور پر حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں ایک عقیدے پر تھے اور یہ دونوں حضرات زندگی میں ایک دوسرے سے ۴۰ھ میں صلح بھی کر چکے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں کوئی فرقہ بندی نہ ہوئی تھی مذہبی گروہ بندی میں خوارج پہلا فرقہ ہیں جو اہل سلب سے کٹے۔ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کے اختلاف میں خود فرما گئے الامر واحد (عقیدے میں ہم ایک ہی ہیں)۔

ولا نستزیدهم فی الایمان باللّٰه والتصدیق و برسوله ولا یستزیدوننا الامر واحد الا ما اختلفنا فیه من دم عثمانؓ و نحن منه براء. (نهج البلاغة ج ۳ ص ۱۲۶)

ترجمہ: ''ہم اہل شام سے ایمان باللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق رسالت میں کچھ اور نہیں چاہتے اور نہ وہ ہم سے ایمان میں کسی زیادتی کے طالب ہیں۔ ہم دونوں عقیدۃً ایک ہیں۔ ہاں ہم میں خون عثمان کے بارے میں اختلاف چلا اور ہم اس میں ہرگز شریک نہ تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ حضرت علیؓ بھی نفس ایمان میں کمی بیشی ہونے کا عقیدہ نہ رکھتے تھے۔

۲۔ رافضی نے اس حدیث کے بارے میں ایک یہ بات بھی کہی ہے:

اس حدیث میں امام زمانہ کے ظہور کی حتمی علامات کا تذکرہ ہے جو ظہور سے کچھ وقت پہلے ظاہر ہوں گی۔ من جملہ ان کے یہ ایک ندائے آسمانی ہے۔ (ص ۲۰۴)

جواب الجواب

اگر وہ واقعی ظہور مہدی کے قریب کا دور ہوگا تو وہ وقت غلبہ حق کا وقت ہوگا۔ اس وقت امام ظاہر ہو جائیں گے اور ہر طرف حق غالب آئے گا سو وہ دور تقیہ کا نہ ہوگا کہ اس وقت کوئی شیطانی نداء چلے۔ شیطان کو اس کی اس وقت کیا ضرورت ہوگی؟ سو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ آخری دور میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے محبین ضرور فائزین کی عزت پائیں گے اور سب ایک ہوں گے جس طرح آج اہل سنت کی مساجد میں خطبہ جمعہ میں دونوں کا نام آتا ہے۔ دور مہدی میں بھی دونوں کے ایک ہونے کی نداء دی جائے گی اور دونوں فوز وفلاح کی سعادت سے سرفراز ہوں گے۔ یہ فوز وفلاح پانے کی خبر ان کے آخرت میں کامیاب ہونے کی خبر ہے۔ اس وقت دونوں کی اذان ایک ہوگی۔

فوز وفلاح کا وقوع کب ہوگا؟

فمن زحزح عن النار و ادخل الجنة فقد فاز. (پ ۴ آل عمران ۱۸۵)

ترجمہ: ''جو آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ فائز ہو گیا۔'' (اس کا کام بن گیا)

رافضی کی اس روایت میں ایک کھلی تحریف

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے فرمایا جب دجال خروج کرے گا تو اس کے پیچھے وہ ہوں گے جو عثمان کے حب دار ہوں گے۔ (ایضاً ص ۹۵ ج ۱)

یہ حب دار کی ترکیب اس رافضی کے نوادرات میں سے ہے۔

رافضی اسے آٹھویں صدی کے علامہ ذہبی (۷۴۸ھ) کے حوالے سے زید بن وھب تابعی سے روایت کرتا ہے۔ ان دو کے درمیان چھ سو سال کا فاصلہ ہے۔ (میزان الاعتدال) اس چھ سو سال کے راویوں کی اس رافضی نے کوئی نشان دہی نہیں کی۔

علامہ ذھبی نے یعقوب الفسوی سے اس روایت کی بنا پر زید بن وھب کے لائق احتجاج ہونے میں کلام کیا ہے۔ اگر رافضی میزان الاعتدال کی یہ پوری عبارت لکھ دیتا تو اس روایت کا ناقابل قبول ہونا خود اسی عبارت سے مل جاتا۔ علامہ ذہبی کی یہ عبارت ہم پیچھے دے آئے ہیں۔ اس رافضی نے اسے نامکمل نقل کی ہے۔

قال و مما یستدل به علی ضعف حدیثه روایته عن حذیفة ان خرج الدجال یتبعه من کان یحب عثمان. (ج ۳ ص ۱۵۸)

ترجمہ: ''زید کی روایت کے ضعیف ہونے پر جن روایات سے اس کے ضعیف ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے ان میں حضرت حذیفہؓ کے نام سے یہ روایت ہے کہ اگر دجال نکلے تو حضرت عثمانؓ کے چاہنے والے اس کی پیروی کریں گے۔''

لیکن رافضی اس حوالے سے روایت صرف اتنی لکھتا ہے:

''جب دجال ظہور کرے گا تو اس کے وہی پیروکار ہوں گے جو عثمان کے حبدار ہوں گے۔''

(تجلیات صداقت ۹۵)

اس روایت کا پہلا حصہ جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں اس نے یکسر چھوڑ دیا ہے تا کہ وہ قارئین کو مغالطہ دے سکے۔ افسوس کہ رافضی کو یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس روایت میں لفظ قتل کسی راوی سے رہ گیا اور یہ کمزور روایت اسی طرح چل نکلی۔ پوری روایت تاریخ الخلفاء سے ہم پہلے پیش کر آئے ہیں۔

اول الفتن قتل عثمان و آخر الفتن خروج الدجال والذی نفسی بیده لا یموت رجل و فی قلبه مثقال خردل من حب قتل عثمان الا تبع الدجال.

ترجمہ: ''مسلمانوں میں سب سے پہلا فتنہ شہادت عثمان سے چلا تھا اور آخری فتنہ خروج دجال ہوگا۔''

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کوئی شخص جو دل سے ذرا بھی قتل عثمان سے خوش ہوگا وہ دجال کے ساتھ چلے گا۔

حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے شاگرد مولانا ولایت حسین بہاریؒ نے بھی یہ حدیث کشف التلبیس جلد ۲ ص ۱۴۱ پر نقل کی ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے نام سے حضرت حذیفہؓ کو یہ روایت کرتے دکھایا گیا ہے:

یا حذیفة باللّٰه انا من المنافقین .

اس پر علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

ثم انه ساق من روایته قول عمر یا حذیفة باللّٰه انا من المنافقین قال وهذا محال و اخاف ان یکون کذباً .

ترجمہ: ''پھر یعقوب الفسوی نے زید بن وہب کی روایت سے حضرت عمرؓ کا یہ قول ''اے حذیفہ میں منافقین میں سے ہوں۔'' نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کہا ہو مجھے

گمان ہے کہ یہ جھوٹ ہوگا۔

ہم یہ کہہ کر کہ رافضی نے یہاں نامکمل عبارت نقل کر کے قارئین کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ حضرت عثمانؓ کے چاہنے والے دجال کی پیروی کریں گے بلکہ یہ کہا ہے کہ قتل عثمان سے خوش ہونے والے اس وقت دجال کی حمایت میں نکلیں گے۔ حقیقت حال آپ کے سامنے آچکی۔

حضرت عثمانؓ کی فضیلت پر مولانا دبیر کی پیش کردہ دوسری حدیث

اور اس پر رافضی کا جواب

محمد بن یعقوب الکلینی امام جعفر صادقؒ سے روایت کرتا ہے:

فجلس سهیل بن عمرو عند رسول اللّٰه و حبس عثمان ......

رافضی کی طرف سے اس کا جواب

''اس میں ہرگز کوئی فضیلت نہیں کیونکہ آنحضرتؐ باعلام الٰہی جانتے تھے کہ عثمان اس بیعت پر قائم نہ رہ سکیں گے اور آئندہ ہونے والی جنگوں میں راہ فرار اختیار کریں گے۔ اس لیے اگر ان کی طرف سے بیعت نہ ہوتی تو اہل سنت کو یہ عذر پیش کرنے کا موقع مل جاتا کہ انہوں نے تو فرار نہ کرنے کا عہد کیا ہی نہ تھا۔'' (تجلیات صداقت ص ۹۴)

جواب الجواب

حضورؐ کو اس وقت تک یہ نہ بتایا گیا تھا کہ حضرت عثمانؓ مکہ میں زندہ ہیں اور وہ شہید نہیں کیے گئے۔ یہ بیعت تو اسی لیے لی جارہی تھی کہ آپ خون عثمان کا بدلہ لیں۔ اب اسی وقت یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت جانتے تھے کہ عثمان واقعۃً زندہ ہیں اور وہ آئندہ ہونے والی جنگوں میں ثابت قدم نہ رہ سکیں گے اور آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اس وقت باعلام الٰہی جانتے تھے کہ عثمان اس حدیبیہ کی بیعت پر قائم نہ رہیں گے۔ اس کا حاصل تو یہ نکلتا ہے کہ حضورؐ کو ان کے زندہ رہنے کا پورا علم تھا اور مقام حدیبیہ پر آپ یہ بیعت معاذ اللّٰہ صرف دکھاوے کے لیے ہی لے رہے تھے اور وہ بیعت جو قرآن کریم میں بڑی عزت سے ذکر کی گئی ہے اور یہ کہ ان سے بیعت کرنے والوں کے ہاتھ پر اللّٰہ کا ہاتھ ہے۔ معاذ اللّٰہ۔ یہ سب ڈرامہ تھا۔

افسوس کہ اثناعشریوں نے اپنے پورے دین کو مختلف ڈراموں کی صورت ہی دے رکھی ہے۔

ثانیاً یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ کوئی امتی اپنے ہاتھ سے کی بیعت کے خلاف چلا جائے لیکن اس کی طرف سے پیغمبر کا ہاتھ بیعت کرے تو اس میں نقض بیعت کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا کیونکہ اس نقض سے پیغمبر کے ہاتھ پر نقض لازم آتا

ہے۔اور یہ ممکن نہیں کہ پیغمبر کے ہاتھ سے ہوئی بیعت ٹوٹ جائے۔

ثالثاً رافضی کی تاریخ دانی دیکھئے کہ جنگ بدر اور جنگ احد کو اس بیعت رضوان کے بعد کے واقعات بتلایا حالانکہ یہ جنگیں بیعت رضوان سے بہت پہلے ہو چکی تھیں لیکن اس نے چونکہ حضرت عثمانؓ پر احد سے فرار کا الزام لگانا تھا۔ اس نے جنگ احد کو بیعت حدیبیہ سے موخر بتلایا۔ رافضی کی یہ حرکت خود ایک ڈرامے سے کم نہیں ہے۔

مولانا دبیر کی پیش کردہ تیسری شہادت اور اس پر رافضی کا جواب

حضرت علیؓ امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے پیچھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا' ان لوگوں نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کے سامنے ان امور کا اقرار کیا:

۱۔ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جسے آپ نہ جانتے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم میں حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے زیادہ نہ تھے۔

۲۔ حضورؐ کو جیسا ہم نے دیکھا ہے آپ نے بھی دیکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا آپ نے حضورؐ کو جس طرح بنظر ایمان دیکھا تھا اسی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی حضورؐ کو بنظر ایمان دیکھا۔ نہ اس نظر میں کوئی شائبہ نفاق تھا۔ دونوں مرتبہ صحابیت میں ایک سطح پر تھے۔

۳۔ آپ نے کہا جیسے ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مصاحبت حاصل کی آپ نے بھی کی ہے۔

اس سے معلوم ہوا جس طرح حضرت علیؓ کا حضورؐ کی صحبت میں آنا محض اخلاص تھا اسی طرح حضرت عثمانؓ کا حضورؐ کی مصاحبت میں آنا بھی پورے اخلاص سے تھا' اس میں دکھاوے کی کوئی بات نہ تھی۔

مولانا دبیر کا استدلال

"یہ وہ شہادت ہے جس کے مقابلہ میں روافض کی بدگمانیوں کی ذرہ برابر وقعت نہیں رہ جاتی۔"

(آفتاب ہدایت ص ۱۴۴)

رافضی کا جواب

"حضرت علیؓ اس گفتگو میں لوگوں کے وکیل تھے۔ یہ لوگوں کے خیال کی ترجمانی ہے۔ آپ کا اپنا اعتقاد و نظریہ یہ نہ تھا۔" (تجلیات ج ۱ ص ۲۰۶)

جواب الجواب

ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو اپنا وکیل بنانے سے پہلے کہاں حضرت عثمانؓ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس مجلس کی نشاندہی کریں اور وہاں کی بات چیت کا ثبوت پیش کرنا اب اس ڈھ گو رافضی کے ذمہ رہے گا۔

حضرت علیؓ نے اپنے اس خطاب میں واحد متکلم اور جمع متکلم کے دو مختلف صیغے استعمال کیے ہیں۔ اپنے بارے میں حضرت عثمانؓ سے زیادہ عالم نہ ہونے کا آپ نے بصیغہ واحد متکلم اقرار کیا ہے۔ یہ آپ کی اپنی بات ہے اور آپ کا اپنا اعتقاد ہے۔ اس طرح دوسروں کی ترجمانی قارئین نے کہیں دنیائے علم میں نہ سنی ہوگی۔ کسی صاحب علم سے ایسی کمزور بات کی امید نہیں کی جاسکتی۔ پھر آپ نے جمع متکلم کے صیغے میں بات کی ہے۔ ان امور میں آپ نے پوری قوم کو شریک کیا ہے اور اس میں اپنا کوئی استثنا نہیں کیا۔ آپ نے قوم کی وکالت کوئی فیس لے کر نہیں کی تھی کہ آپ کا نظریہ کچھ اور ہو اور آپ کے موکلین کا نظریہ کچھ اور ہو جیسا کہ اس دور کے اکثر وکیلوں کا حال ہوتا ہے۔ یہ واقعہ اس دور کا ہے جب وکیل جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ مولانا دبیر کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ بھی پیشہ وارانہ جھوٹ نہ بولتے تھے اور یہ کہ آپ پر تقیہ کی تہمت بے جا ہے:

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون اور عنقریب یہ ظالم جان لیں گے کہ وہ کس کس کرٹ مڑ رہے ہیں۔

ثانیاً یہاں علم کی مساوات صرف ان امور کے ماننے میں ہے جن پر لوگوں کو اعتراض تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ لوگوں کو آپ پر یہ کوئی اعتراض نہ تھا کہ آپ خلافت پر غصباً قائم ہیں' نہ یہ اعتراض تھا کہ آپ کا انتخاب خلافت درست نہیں ہوا تھا۔ خلافت ہم نہیں مانتے' نہ ان میں سے کسی کا عقیدہ تھا کہ ختم نبوت کے بعد اب عقیدہ امامت تسلیم کرنا چاہیے۔ کیونکہ بقول شیعہ ان تینوں باتوں کا علم حضرت علیؓ رکھتے تھے۔ عوام کو ان تینوں باتوں کا علم نہ تھا۔ ورنہ رافضی یہ نہ کہتا کہ "یہاں صرف ان امور کے جاننے میں مساوات مراد ہے جن پر لوگوں کو اعتراض تھا"۔ ابن ابی الحدید معتزلی بھی یہی کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کو ان کے صرف ان چند نئے امور پر اعتراض تھا۔ پھر معتزلی کی بات سے اہل سنت پر الزام لانا بھی تو درست نہیں۔

ما اعرف شیئاً تجھلہ ولا ادلک علی امر لا تعرفہ میں شیئاً نکرہ اور امر دونوں جو اپنے عموم میں سب جزئیات کو شامل ہیں۔ ابن ابی الحدید نے بھی حضرت علیؓ کے عموم الفاظ کا انکار نہیں کیا۔ ہاں نئے پیش آمدہ حالات کو اس میں خاص طور پر مراد بتلایا ہے۔ خاص کے اقرار سے عام کی نفی نہیں ہوتی۔

لانّہ لا یعرف امراً یجھلہ ای من ہذہ الاحداث خاصۃ. (شرح نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۳۸۲)

ترجمہ: ''کیونکہ آپ کوئی ایسی چیز نہیں جانتے جسے آپ نہ جانتے ہوں ان خاص نئے پیدا ہونے والے حالات میں سے۔''

رافضی اس بحث میں اتنا دم بخود ہے کہ اب وہ خارجی دلائل سے سہارا لینے پر آ گیا ہے۔ اس نے یہاں یہ دو حدیثیں پیش کی ہیں۔

۱. انا مدينة العلم وعلى بابها. (متفق عليه)

یہ جھوٹ ہے' صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ حدیث ہمیں کہیں نہیں ملی۔ یہ اس پر متفق علیہ کا فیصلہ کتنا کھلا جھوٹ ہے۔

رافضی نے یہ بات یہاں یونہی چلا دی ہے۔

۲. اعلم امتى على بن ابى طالب . (مناقب خوارزمى و فرائد السمطين)

رافضی نے اس روایت پر کوئی سند پیش نہیں کی۔ نہ کسی محدث سے اس کی تصحیح یا توثیق پیش کی ہے۔

اس کے یہ دو تیر بھی خالی گئے۔

سو اس یقین سے چارہ نہیں کہ آپ کا فرمانا **لا اعرف شياءً تجهله ولا ادلك علىٰ امر لا تعرفه** اپنے عموم سے صرف ان حوادث تک محدود نہیں۔ حوادث پیش آمدہ اس میں خاص طور پر مراد ہیں۔ ابن ابی الحدید نے انہیں خاصۃً کہہ کر شیاء کے عام ہونے کی پوری تصدیق کر دی ہے۔ حضرت علیؓ مرتضیٰؓ اپنے آپ کو ان سے علم میں بڑا سمجھتے تو کبھی یہ نہ فرماتے **لا اعرف شياءً تجهله** میں ایسی کوئی بات نہیں جانتا جو آپ نہ جانتے ہوں۔

ڈھکو اپنی بات حضرت علیؓ کے منہ میں ڈالتے ہوئے اسے اس طرح لکھتا ہے:

''جناب امیر اپنے اس کلام معجز نظام میں ہی فرمانا چاہتے ہیں کہ تم صحبت رسولؐ میں بیٹھنے ان کا کلام سننے اور ان کی سیرت و کردار کا مشاہدہ کرنے کے بعد احکام شریعت کی یہ جو خلاف ورزی کر کے احداث و بدعات پھیلا رہے ہو تو تمہارا یہ فعل درگزر کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ نا قابل معافی اور سنگین جرم ہے۔'' (تجلیات صداقت ج ۱ ص ۲۰۷)

جب رافضی حضرت علیؓ کے کلام سے کوئی اپنے مطلب کی بات نہیں کہہ سکتا تو وہ اس بات پر آ گیا ہے کہ حضرت علیؓ چاہتے کیا تھے اور آپ کی یہ بات صرف ڈھکو پر ہی کھلی ہے یہ حضرت علیؓ کے لفظوں میں نہیں اتری۔

حضرت علیؓ اگر حضرت عثمانؓ کو وہی بات کہہ رہے ہیں جو آپ کے باغی آپ کے خلاف کہہ رہے تھے تو کیا آپ (معاذ اللہ) ان باغیوں کے ساتھ شریک جرم نہ ہوئے تھے؟

باغیوں کی اس یلغار کے دوران حضرت عثمانؓ پر یہ چارج شیٹ لگانا اور باغیوں کو اس بات پر پختہ کرنا کہ حضرت عثمانؓ واقعی ایک سنگین جرم کے مجرم ہیں اور ہرگز لائق معافی نہیں ہیں۔ کیا یہ خود خونِ عثمانؓ سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں؟ اگر صورت واقعہ یہی ہے جو ڈھکو حضرت علیؓ کی طرف سے کہہ رہا ہے تو پھر حضرت علیؓ کا یہ کہنا کہ میرے اور حضرت معاویہؓ کے مابین جو اختلاف ہے وہ صرف حضرت عثمانؓ کے بارے میں ہے' خدا جانتا ہے کہ ہم اس سے بالکل بری اور بیزار ہیں' کیا یہ کھلا جھوٹ نہ ہوگا۔ ہم اہل سنت تو حضرت علیؓ کے خلاف اس تہمت کی جرأت نہیں کر سکتے۔ علامہ رضی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

الامر واحد الا ما اختلفنا فيه من دم عثمان و نحن منه براءُ (نهج البلاغة ج ٣ ص ١٢٦)

ترجمہ: ''ہم اور شام والے (حضرت معاویہؓ اور ان کے انصار) بالکل ایک ہیں۔ ہم میں بالکل اتحاد تھا ماسوائے اس اختلاف کے جو خون عثمان کے بارے میں ہو گیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اس سے بالکل بری الذمہ ہیں۔

قارئین کرام غور فرمائیں کیا یہ الفاظ اس شخص کے ہو سکتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کے بارے میں یہ ڈگری دے چکا ہو کہ آپ کا یہ جرم ہرگز قابل معافی نہیں ہے (تم قتل کے ہی لائق ہو)۔ پھر اس بات سے جو ڈھکو نے حضرت علیؓ کی طرف سے بتائی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کو اس شک کا فائدہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھے جو آپ حضرت معاویہؓ کو دیتے تھے۔ آپؓ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں صاف کہا کہ ہم میں اور ان میں کچھ شکوک و شبہات آ واقع ہوئے ہیں ورنہ ہم تو بالکل ایک ہی تھے۔

انما اصبحنا نقاتل اخواننا فى الاسلام علىٰ ما دخل فيه من الزيغ والاعوجاج والشبهة والتاويل . (نهج البلاغة ج ٢ ص ٣)

ترجمہ: ''ہم اپنے اسلامی بھائیوں سے لڑنے لگے' ہم میں اس موضوع میں کج روی' ٹیڑھا پن اور کچھ شبہ و تاویل کی راہیں پیدا ہو گئیں۔''

جب حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کو یہ شبہ اور تاویل کا حق دے رہے ہیں اور انہیں اپنا اسلامی بھائی کہہ رہے ہیں تو کیا آپ یہ حق حضرت عثمانؓ کو دینے کے لیے تیار نہ تھے اور آپ ان کے خلاف اس بات پر آ گئے تھے جو آپ کے باغی آپ کے خلاف کہہ رہے تھے۔ نہیں یہ بات ہرگز باور کرنے کے لائق نہیں جو اس ڈھکو نے حضرت علیؓ کے منہ میں ڈالی ہے اور ان کی طرف سے کہی ہے۔ یہ حضرت علیؓ پر یقیناً ایک جھوٹ اور افتراء ہے۔

جب حضرت علیؓ خونِ عثمان سے بالکل بری الذمہ ہیں تو یہ تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ جب آپ نے حضرت عثمانؓ سے یہ ملاقات کی تھی تو آپ نے اس میں حضرت عثمانؓ پر ان الزامات کا ہرگز کوئی چارج شیٹ نہ لگایا تھا جو اس ڈھگو نے حضرت علیؓ کے ذمہ لگایا ہے کہ آپ نے انہیں کہا تھا کہ تمہارا یہ عمل ایک ناقابل معافی اور سنگین جرم ہے۔(دیکھو تجلیات صداقت ص ۲۰۷)۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔نہج البلاغہ میں یہ الفاظ کہیں موجود نہیں۔

بلکہ آپ نے ان کی تطییب خاطر کے لیے ان کے سامنے برملا کہا کہ آپ علم و فضل اور صحبت رسول سے استفادہ کرنے میں ہم سے کسی درجہ میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔

منقبت حضرت عثمانؓ پر شیعہ لٹریچر کی چوتھی روایت

حضورؐ نے دو صاحبزادیوں کا نکاح حضرت عثمانؓ سے یکے بعد دیگرے کیا۔ یہاں بھی شیعہ یہ بحث چھیڑتے ہیں کہ یہ دو صاحبزادیاں آپ کی حقیقی بیٹیاں نہ تھیں' آپ کی ربیبہ تھیں اور بات پھر اسی پر آجاتی ہے کہ اسلام نے یہ کہاں کہا ہے کہ اپنی بیٹیاں تم غیر مومن کے نکاح میں نہ دو۔ اور دوسری بیٹیاں جن کا نکاح تمہارے ہاتھ میں ہو وہ بے شک تم غیر مومنوں کو دے دو۔قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنی بیٹیاں غیر مومنوں کو نہ دو۔

قرآن کریم کا حکم عام ہے ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یومنوا ۔ایسے ہی آپ خود غور کریں کہ شیعوں کا یہ موقف کہ حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثوم آپ کی اپنی بیٹیاں نہ تھیں' انہیں کہاں تک فائدہ دے سکتا ہے؟ حضورؐ کا انہیں یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دینا حضرت عثمانؓ کے ایمان پر ایک ایسی مہر ہے جو شیعہ علماء سے وہ ان کے اکابر ہوں یا اصاغر تیرہ سو سال میں کہیں نہیں ٹوٹ سکی۔

شیعہ کی اس غلط بیانی کو کچھ بھی وزن دیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت عثمانؓ کے حقیقی سسر نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ رشتے حضرت عثمانؓ کے لیے کسی اعزاز کا باعث نہیں ہو سکتے۔اعزاز اس میں ہے کہ ان رشتوں سے حضرت عثمانؓ کی حضورؐ کے ساتھ کوئی نسبت قائم ہوتی ہو۔

اس کے خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے حضورؐ سے حضرت عثمانؓ کے ان رشتوں کو محل مدح میں ذکر کیا ہے۔آپ جب حضرت عثمانؓ کے پاس ان کے آخری دنوں میں گئے تو آپ نے انہیں مخاطب کر کے کہا تھا۔

وقد نلت من صهره ما لم ينالا (نهج البلاغه ج ۲ ص ۸۵)

ترجمہ: ''اور آپ نے حضورؐ سے ان کی دامادی کا وہ شرف پایا جو پہلے دو حضرات نہ پا سکے۔''

ڈھکو کہتا ہے کہ حضرت علیؓ اس وقت ان لوگوں کے وکیل تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ یہ ان عوام کا عقیدہ تھا کہ آپ حضورؐ کے حقیقی داماد ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ اپنا نظریہ نہ تھا۔ہم کہتے ہیں حضرت علیؓ ان باغیوں کے

مطالبات میں تو ان کے وکیل ہو سکتے ہیں' ان کی غلط بیانی میں آپ ان کے وکیل کیسے ہو گئے۔ یہ بات حضرت علیؓ کے مقام عزت کے خلاف ہے کہ وہ غلط لوگوں کی کسی غلط بیانی میں ان کے وکیل ہوں۔

پھر اگر واقعی حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے ہم زلف نہ تھے تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی اس بات کو ناپسند کیا تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خلاف جنگ احد کے سانحہ پر کچھ لب کشائی کریں تو حضرت علیؓ نے وہاں حضرت عثمانؓ کے ہم زلف ہونے کا انکار کیوں نہ کیا تھا۔ کیا حضورؐ ان دونوں کو ہم زلف کہنے میں (معاذ اللہ) کسی غلطی کا شکار تھے۔ (استغفر اللہ) ایسا ہرگز نہیں۔

ڈھکو کی یہ بات کسی طرح لائق تسلیم نہیں کہ کوئی شخص اپنی ربیبہ کا جس سے رشتہ کرے پھر اسے اپنا داماد بھی کہے۔ ربیبہ کے خاوند کو داماد کہنے کی اس وقت کے عرب معاشرہ میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ مگر دیکھئے ڈھکو نے یہ کیسی بے تکی ہانکی ہے:

''جس حیثیت سے وہ رسول اللہ کی بیٹیاں ہوں گی' اسی لحاظ سے جس سے وہ بیاہی جائیں گی وہ داماد رسول بھی کہلائے گا۔'' (تجلیات ص ۲۱۰)

لیکن حضورؐ نے مندرجہ بالا روایت میں حضرت عثمانؓ کو اس طرح کا داماد نہیں کہا حضرت علیؓ کے برابر کا داماد کہہ کر دونوں کو ہم زلف قرار دیا ہے۔فافهم ولا تكن من القاصرين۔

قرآن کریم نے پرورش کردہ بیٹیوں کو جدا ذکر کیا ہے

قرآن کریم میں جن عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہیں (۱) مائیں (۲) بیٹیاں (۳) بہنیں (۴) پھوپھیاں (۵) خالائیں (۶) بھتیجیاں (۷) بھانجیاں (۸) رضاعی مائیں (۹) رضاعی بہنیں (۱۰) ساس (۱۰) وہ ربیبہ لڑکیاں جو تمہاری بیویوں کے ساتھ تمہارے ہاں آئیں۔ (پ ۴ النساء آیت ۲۳)

اس میں بیٹیوں اور ربیبہ لڑکیوں کو ۲ اور ۹ میں ذکر کیا گیا۔قرآن نے جب بیٹیوں کو اور ربیبہ لڑکیوں کو جدا جدا ذکر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن کی عملی تصویر تھے اور حضرت علیؓ مرتضیٰ جو علم کا دروازہ تھے وہ کس طرح ربائب کو بیٹیوں میں ذکر کر سکتے تھے۔قرآن کریم نے جب لے پالک بیٹوں کو بیٹا کہنے سے روکا اور کہا کہ انہیں ان کے باپوں کی طرف نسبت کرو مجازی نسبتیں چھوڑ دو تو ربیبہ لڑکیوں کو پالنے والوں کی طرف نسبت کرنے کا جواز کیسے باقی رہ سکتا تھا۔ قرآن کریم نے یہ نسبتیں توڑ کر رکھ دیں۔

ادعوهم لآبائهم هو اقسط عند الله فان لم تعلموا آباء هم فاخوانكم فى الدين ومواليكم (پ ۲۲ الاحزاب ۵)

ترجمہ: ''تم ان لے پالک بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے بلاؤ۔ یہی بات اللہ کے ہاں

انصاف کے قریب ہے۔ تم اگر ان کے باپوں کو نہ جانو تو وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔"

مولیٰ کا معنی رفیق کا ہے، جانشینِ سلطنت کا نہیں، دیکھئے ترجمہ قرآن حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ۔

قرآن میں جب مولیٰ کا معنی دوست اور رفیق کا ہے تو حدیث من کنت مولاہ میں بھی مولیٰ کا معنی دوست اور رفیق کا ہی لیا جائے گا اگر یہ حدیث کہیں صحت سند سے ثابت ہو پائے۔

جب قرآن کریم میں ازواج کا لفظ بھی حقیقی معنی میں آیا ہے اور نساء المومنین بھی اپنے حقیقی معنی دے رہا ہے تو درمیانی لفظ بنٰتک کیسے مجازی معنی میں لیا جا سکتا ہے؟ سو قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بیٹیاں حضورؐ کی ہی تھیں اور یہاں امت کی عورتوں کو حضورؐ کی بیٹیاں نہیں کہا جا رہا ہے۔ ان کے لیے علیحدہ الفاظ نساء المومنین آئے ہیں۔ یہاں نساء المومنین کی اسی لیے صراحت کر دی گئی ہے کہ کوئی وبنٰتک کے لفظ کو اس کے کسی مجازی معنی پر لانے کی جرأت نہ کرے۔

قرآن کریم کے ان الفاظ پر غور کریں:

یا ایھا النبی قل لازواجک وبنٰتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن. (پ ۲۲ الاحزاب ۵۹)

شریعت محمدیؐ میں ربائب کو اب اپنی بیٹیاں بتلانے کی اجازت نہ رہی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے دور میں اگر اس کی اجازت تھی تو اب یہ اجازت نہ رہی۔ حضرت زید بن حارثہؓ کو اگر زید بن محمدؐ کہنے کی اجازت نہیں تو حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ اگر حضورؐ کی بیٹیاں نہ تھیں تو انہیں حضورؐ یا حضرت علیؓ کس طرح مجازاً بنات نبیؐ کہنے کا حق رکھتے تھے اور حضرت علیؓ کس طرح پیرایہ مجاز میں حضرت عثمانؓ کو داماد رسول کہہ سکتے تھے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کو جو کہا نلت من صھرہ ما لم ینالاہ تو یہ بطور حقیقت کہا۔ کیونکہ اب مجاز کے پیرایہ میں حضرت عثمانؓ کو داماد رسول کہنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

اگر کوئی شخص کسی کی بیٹی کو طلاق دے دے تو اسے اس کا داماد نہیں کہا جاتا۔ وہ اس رشتہ سے نکل گیا۔ لیکن جس کی بیٹی زندگی بھر اس کے نکاح میں رہے اس پر داماد کے اطلاق کو کسی جہت سے نہیں روکا جا سکتا۔

اگر حضورؐ نے شریعت کا یہ حکم کہ اب غیر مومن کو بیٹی نکاح میں نہیں دی جا سکتی، آنے سے پہلے اپنی یہ دو بیٹیاں عتبہ اور عتیبہ کے نکاح میں دی تھیں اور انہیں رخصتی سے پہلے گھر بیٹھے ہی طلاق ہو گئی مگر اس سے عتبہ و عتیبہ کو داماد رسول کہنے کی ہرگز کوئی راہ نہیں نکلتی اور اس سے حضرت عثمانؓ کا داماد رسول ہونے کا شرف ان سے چھینا نہیں جا سکتا اور نہ یہ رشتہ دامادی ان سے کسی جہت سے مجروح ہوتا ہے۔ ڈھکو کو خدا نے حقائق کی دنیا میں ایک قدم رکھنے کی بھی سعادت نہیں بخشی۔ اب سوائے اس کے نہیں کہ ڈھکو کا عتبہ و عتیبہ کو حضرت عثمانؓ کے برابر لانا صرف اس کی رافضیت کا ایک نشان ہو اور اس میں

صداقت کی کوئی راہ نہیں پھر رافضی کا اسے تجلیات صداقت کا نام دینا کیا ستم بالائے ستم نہیں؟ اور کیا یہ اس کا اپنے آپ سے ہی تمسخر نہیں۔

مولف کی ایک اور غلط بیانی ملاحظہ ہو

ڈھکو لکھتا ہے:

"ہم نے کتب فریقین کی ورق گردانی کی ہے۔ ہمیں تو ان کی فضیلت میں کوئی ایک روایت بھی نہیں ملی۔ کاش کہ ڈھکو نہج البلاغہ کی اس روایت کو ہی دیکھ لیتا جس میں حضرت علیؓ مرتضیٰ نے حضورؐ کی ان دو بیٹیوں کے حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آنے کو حضرت عثمانؓ کا ایک شرف قرار دیا ہے۔

کیا یہ ان پاک بیبیوں کی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے اپنی سب سے بڑی بیٹی حضرت سیدہ زینبؓ کو خیر بناتی اصیبت فی (کہ میری بیٹیوں میں سب سے زیادہ اچھی یہ بیٹی ہے جس نے میری وجہ سے بہت سے دکھ اٹھائے) کہنے کی روایت ہی مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۱۳ سے دیکھ لی ہوتی۔

خدا کا شکر ہے کہ ڈھکو نے آخر کار یہ تسلیم کر لیا ہے:

"اس نکاح کو عثمانؓ کے ظاہری اسلام کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔" (تجلیات ص ۳۱۱)

وہ کہنا چاہتا ہے کہ شریعت محمدیؐ میں نکاح کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ہے اور حضرت عثمانؓ مسلمان تھے۔ اس لیے ان نکاحوں کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کا ظاہری اسلام واقعی ثابت ہے۔

یہاں ڈھکو کا دل خود بھی اسے ملامت کرتا ہوگا کہ اس نے اس بحث میں عتبہ و عتیبہ کا ذکر کر کے اپنے آپ کو علمی دنیا میں اور گرا دیا ہے۔ جب اس نے حضرت عثمانؓ کے ظاہری اسلام کی بات کہنی تھی تو وہ پہلے ہی کہہ دیتا کہ شریعت کی رو سے ان کا نکاح عتبہ اور عتیبہ سے نہ ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اسلام نہ لائے تھے۔ اسے اس بحث میں عتبہ و عتیبہ کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔

ڈھکو کا خود اپنے آپ سے ٹکراؤ

دیکھئے وہ کس طرح خلفاء ثلثہ سے کفر کی نفی کرتا ہے۔

"شیعاں حیدر کرار پر سراسر یہ بہتان ہے کہ وہ جناب عمرؓ یا اس کے دو ساتھیوں کو کافر سمجھتے ہیں ایسا ہرگز نہیں۔" (تجلیات ص ۱۸۲)

اگر ایسا ہرگز نہیں تو تم حضرت عثمانؓ کی دامادی کی بحث میں عتبہ و عتیبہ کو کیوں لے آئے؟ کیا یہ دونوں کافر

ڈھکو حضرت عثمانؓ کی دامادی کی بحث میں لکھتا ہے:

''وہ داماد عتبہ وعتیبہ کافر تھے تو کیا ان کو اس نسبتی قرابت رسول سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہاں جواب نفی میں ہے تو پھر وہاں بھی ایسا ہی سمجھیں۔'' (ایضاً ص ۲۱۲)

عتبہ وعتیبہ کو ان کے طلاق دینے کے باوجود حضورؐ کا داماد کہنا مولف کی کتنی بڑی بداخلاقی اور علمی بے حیائی ہے اور پھر داماد رسول حضرت عثمانؓ کے بارے میں یہ کہنا کہ پھر وہاں بھی ایسا ہی سمجھیں' کیا یہ خود اپنے آپ سے ٹکراؤ نہیں؟ ڈھکو کا حضرت عثمانؓ کو مسلمان مان کر پھر انہیں کافروں کے ساتھ ملانا اس کا خود اپنے آپ سے ٹکراؤ ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

''ہم ان کو کافر نہیں سمجھتے۔'' (ایضاً ۱۹۴)

قرب الاسناد کی معتبر سند سے ائمہ معصومین کی شہادت

ان کے پہلے دور کے مجتہدین تو اسے سند معتبر قرار دیں اور چودھویں صدی کے یہ لوگ اسے ناقابل استدلال کہیں تو یہ بھی شیعہ علماء کا اپنے آپ سے ٹکراؤ ہے۔ تیرہ سو سال سے وہ ائمہ اہل بیت میں سے کسی ایک امام کا قول بھی نہیں دکھا سکے کہ حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ حضور اکرمؐ کی حقیقی بیٹیاں نہ تھیں۔

ڈھکو ملا باقر مجلسی سے حضرت رقیہؓ کے بارے میں ایک یہ قول نقل کرتا ہے کہ وہ ہجرت حبشہ سے پہلے حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آ چکی تھیں۔ اور ایک قول یہ نقل کرتا ہے کہ وہ جنگ بدر کے وقت اس رشتہ عقد میں آئیں۔ ڈھکو اسے ان کے بنت رسول ہونے میں متعارض بیانات قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہاں تعارض ان کے بنت رسول ہونے میں نہیں۔ یہ دو مختلف روایات ان کے اس رشتہ عقد میں آنے کے وقت کے بارے میں ہے۔ وقت عقد کے اس اختلاف کو دوسری روایات کی روشنی میں جانچا جا سکتا ہے اور تاریخی طور پر ان کی صحت معلوم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ یہ حضرت رقیہؓ کے بنت رسول ہونے میں دو متعارض روایات میں ہیں۔ آیئے اب ہم آپ کو اس کی راہ بتاتے ہیں کہ یہ تاریخی غلطی کیسے دور کی جا سکتی ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اگر یہ تینوں واقعی حضورؐ کی ہی بیٹیاں تھیں تو روایات میں کہیں تو ان کی کوئی منقبت ملتی۔ حضرت زینبؓ' حضرت رقیہؓ' اور حضرت ام کلثومؓ کے بارے میں کوئی فضیلت تو کہیں ملنی چاہیے۔

جواب

حضرت رقیہؓ بنت رسول کو یہ ذاتی شرف حاصل ہے کہ ان کی تیمارداری جنگ بدر میں شرکت کے برابر قرار دی

گئی۔ یہ شرف اور کسی بیٹی کے لیے نہیں ملتا۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو حضرت رقیہؓ کی تیمارداری میں رہنے کے باعث شرکاء بدر میں شریک کیا اور انہیں بدر کے مال غنیمت سے برابر کا حصہ دیا۔ پھر آپؐ کی تیسری بیٹی حضرت ام کلثوم کی یہ ذاتی شان رہی کہ ان کا نکاح آسمانوں میں پڑھا گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں' حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

یا عثمان هذا جبریل اخبرنی ان اللّٰه عز و جل قد زوجک ام کلثوم بمثل صداق رقیة. (سنن ابن ماجه ص ۱۱)

ترجمہ: ''اے عثمانؓ' یہ جبریل میرے پاس آئے ہیں اور انہوں نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا نکاح ام کلثوم سے اسی مہر پر کر دیا ہے جو رقیہ کا تھا۔''

خدا کا ام کلثوم کو کسی کے نکاح میں دینا کیا یہ خود ام کلثوم کی کوئی منقبت نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ام المومنین حضرت زینبؓ کا نکاح بھی خود حضور اکرمؐ سے کیا تھا اور یہ خبر قرآن پاک میں اس طرح دی گئی ہے:

فلما قضٰی زید منها وطراً زوجنکها. (پ ۲۲ الاحزاب ۳۷)

ترجمہ: ''جب زید اس سے اپنی غرض پوری کر چکا ہم نے اسے آپ کے نکاح میں دے دیا۔''

اسی طرح حضرت زینب بنت رسول کو یہ فضیلت حاصل ہوئی تھی کہ آپ کو حضور اکرمؐ نے خیر البنات کہا۔

خیر بناتی اصیبت فی. (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۱۳)

ترجمہ: ''یہ میری سب سے اچھی بیٹی ہے جس نے میری وجہ سے بہت سے مصائب دیکھے۔''

اسی طرح حضرت فاطمہؓ سیدة نساء اهل الجنة کے شرف سے مالا مال ہوئیں۔

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں بیٹیوں کی فضیلتیں علیحدہ علیحدہ ہم نے یہاں ہدیہ قارئین کر دی ہیں۔ ان میں اللہ سے نسبت پانے کی فضیلت حضرت ام کلثوم کو ملی۔ ان کا نکاح آسمانوں پر ہوا۔ وہ حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ پھر حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کی یہ فضیلت بھی کوئی کم نہیں ہے کہ پوری امت مسلمہ میں انہیں نور مانا گیا ہے اور اسی انتساب سے حضرت عثمانؓ' ذوالنورین کہلائے۔ جس طرح حضرت علیؓ سے اس امت پر علم برسا حضرت عثمانؓ سے اس امت پر نور برسا اور حضور ﷺ کے یہ دونوں داماد آپ سے ہی علم و نور لے کر چلے۔

اس کے بعد ڈھکو رافضی کی بس ہو گئی اور اب وہ کسی روایت سے حضرت عثمانؓ پر اعتراض کناں نہیں ہے۔

اپنے ابا سے کون لایا   جس نے پایا یہیں سے پایا!

اصحاب ثلثہ کی مشترکہ تعریف

شیعہ لٹریچر سے صحابہؓ کی مجموعی منقبت کی پہلی روایت

اصحاب ثلثہ کی مشترکہ تعریف

شیعہ لٹریچر سے صحابہؓ کی مجموعی منقبت کی پہلی روایت

حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں۔

لقد رایت اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم فما اری احداً منکم یشبههم لقد کانوا یصبحون شعثاً غبراً وقد باتوا سجداً و قیاماً یراوحون بین جباههم وخدودهم ویقفون مثل الجمر من ذکر معادهم کان بین اعینهم رکب المعزیٰ من طول سجودهم اذا ذکر اللّٰہ هملت اعینهم حتی تبلّ جیوبهم ومادرا کما یجید الشجر یوم الریح العاصف فوقاً من العقاب ورجاءً للثواب. (نهج البلاغه ج ۱ ص ۱۸۸)

ترجمہ: ”بیشک میں نے حضورِ اکرم ﷺ کے صحابہ کو دیکھا ہے میں تم میں سے کسی کو ان سے ملتا جلتا نہیں دیکھتا دنوں کو ان کے سر جہاد کے گھوڑوں کی دوڑ میں مٹی سے اٹے ہوتے تھے اور ان کی راتیں سجدوں اور نمازوں میں گزرتیں تھیں وہ اپنی پیشانیاں اور چہرے جھکائے رکھتے وہ آخرت کی فکر میں ایسے بے چین رہتے جیسے وہ انگاروں پر کھڑے ہوں ان کی آنکھوں کے مابین مجھے سجدوں سے بکری کے گھٹنوں جیسے گٹے پڑ گئے تھے اللہ کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں برس پڑتی تھیں اور ان کے دامن بھیگ جاتے تھے اور کانپتے تھے جیسے کہ درخت آندھی کے پھڑ پھڑاتے ہیں اللہ کے ہاں پکڑ کے ڈر سے اور ثواب کی امید میں۔“

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا:

مرة العیون من البکاء خمص البطون من الصیام ذبل الشفاه من الدعاء صفر الالوان من السهر علی وجوههم غبرة الخاشعین اولئک اخوانی الذاهبون فحق لنا ان نظمأ الیهم ونعض الایدی عن فراقهم ان الشیطان یستی لکم طرقه و یرید ان یحل دینکم عقدة عقدة ویعطیکم بالجماعة الفرقة. (نهج البلاغة ج ۱ خطبه ۱۱۷)

ترجمہ: ''کثرت گریہ سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں' روزوں سے ان کے پیٹ سکڑے ہوئے تھے' بیداری کے سبب ان کے چہرے زرد تھے' وہ لوگ میرے بھائی تھے جو گزر گئے' ہمارا حق ہے کہ ہم انہیں دیکھنے کے پیاسے ہوں اور اپنے ہاتھوں کو ان کی جدائی میں منہ سے کاٹ لیں۔ شیطان۔ نے تمہارے لیے اپنے رستے کھول دیے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ وہ دین کی رسی کو پارہ پارہ کردے۔'' (نہج البلاغہ ج اص ۳۳۷)

ڈھکو کے جواب کا حاصل

یہاں ان اصحاب کی تعریف ہے جو مومن تھے' فاسق نہ تھے۔ **افمن کان مومناً کمن کان فاسقا**. (تجلیات ص ۲۱۵)

جواب الجواب: دین کی رسی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے چلی؟ جس کو شیطان اب پارہ پارہ کردینا چاہتا ہے۔ حضورؐ کے متصل بعد حضرت ابوبکرؓ نے خلافت بلافصل سے اس رسی کو مضبوطی سے پکڑا' حضرت عمرؓ آئے اور پھر حضرت عثمانؓ اس تسلسل میں چوتھے نمبر پر آئے۔ ۱۔ پہلے حضورؐ ۲۔ پھر حضرت ابوبکرؓ ۳۔ پھر حضرت عمرؓ ۴۔ پھر حضرت عثمانؓ ۵۔ حضرت علیؓ کے آنے تک یہ رسی مسلسل رہی۔ آپؓ نے اندیشہ ظاہر فرمایا: ''شیطان چاہتا ہے کہ وہ دین کی اس رسی کو پارہ پارہ کردے۔'' اس سے پتہ چلا کہ اس وقت تک وہ رسی ایک تھی اور اسی تسلسل میں حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ تھے اور ان کی خلافت پہلی تین خلافتوں کا ہی تسلسل تھا۔ حضرت علیؓ کی بیان کردہ یہ فضیلت صحابہ اگر صرف رونے والوں کی ہی فضیلت تھی تو حضرت علیؓ نے اس سلسلہ کو رسی سے کیسے تعبیر کردیا۔

حضرت علیؓ کے اس بیان سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تعریف انہی حضرات کی تعریف ہے جو دین کی اس رسی کو سنبھالنے والے تھے۔ **واعتصموا بحبل اللہ جمیعا** میں ایک تسلسل سے اس رسی کو سنبھالنے کا حکم ہے۔

ڈھکو نے صحابہ کی تقسیم کرتے ہوئے یہ آیت پیش کی ہے:

منھم المومنون واکثرھم الفاسقون. (پ ۴ آل عمران ۱۱۰)

کہ ان میں کچھ مومن تھے اور کچھ منافق۔ کچھ عادل تھے اور کچھ فاسق۔ ص ۲۱۵

یہ آیت صحابہؓ کے بارے میں نہیں ہے' اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ ڈھکو نے ازراہ تحریف اسے صحابہ پر لگا دیا ہے۔ ہم یہاں پوری آیت لکھے دیتے ہیں:

ولو اٰمن اھل الکتاب لکان خیراً لھم ط منھم المومنون واکثرھم الفاسقون.

دوسری آیت بھی صحابہ کے بارے میں نہیں ہے نہ قرآن کریم صحابہ میں کہیں مومن اور فاسق کے فاصلے قائم کرتا

ہے۔ قرآن کریم کی رو سے سب صحابہ جنتی تھے۔ گو درجات ہر ایک کے اپنے اپنے ہیں۔ یہ آیت عام مومنوں اور کافروں کے بارے میں تھی لیکن ڈھکو نے یہ بھی صحابہ پر لگا دی اور ان میں تقسیم کردی ہے۔ اب یہ آیت بھی پوری پڑھ لیجئے:

افمن کان مومناً کمن کان فاسقا لا یستون ٥ اما الذین اٰمنوا وعملوا الصالحٰت فلھم جنّٰت الماویٰ نزلاً بما کانوا یعملون ٥ واما الذین فسقوا فماواھم النّار (پ ۲۱ السجدہ ۱۸)

ڈھکو ان دونوں آیتوں کو خلاف محل پیش کرنے اور ان میں تحریف کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''یہی ہمارے ہادیان دین کی ہمیں تعلیم وتلقین ہے۔'' (ص ۲۱۵)

یہ ائمہ اہل بیت پر افتراء اور بہتان ہے۔ انہوں نے قرآن میں تحریف کرنے کی ہرگز کسی کو تلقین نہیں کی۔

حضرت علیؓ نے جس پیرایہ بیان میں یہاں صحابہؓ کا ذکر کیا ہے یہ جلی طور پر جمہور صحابہ کی مدح ہے۔ اس سے بعض چند صحابہؓ مراد لینا اور حضرت علیؓ کے ان خطبوں کو صرف ان کی مدح کہنا صرف انہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جن کی بصیرت کی آنکھیں بند ہوں اور وہ آخرت کی پکڑ سے بالکل بے خوف ہو چکے ہیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ میں صحابہؓ کا عمومی تذکرہ ہے۔ اس میں اپنی طرف سے خاص خاص کے الفاظ داخل کرنا کسی صاحب دیانت اور صاحب شرافت کو زیبا نہیں دیتا۔ ان کے نہج البلاغہ کے مترجم مفتی جعفر حسین کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ وہ حضرت علیؓ کے عربی الفاظ کا یہ ترجمہ کرتا ہے۔

حضرت علیؓ کے الفاظ:

لقد رایت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فما اری احداً منکم یشبھھم.

(نہج البلاغہ خطبہ ۹۵ ج اول)

ترجمہ مفتی جعفر حسین: ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص اصحاب دیکھے ہیں' مجھے تم میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا۔''

جواب ڈھکو رافضی: ''اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افراد مراد ہیں جنہوں نے پوری طرح پیغمبر کا ساتھ دیا۔'' (تجلیات ص ۲۱۵)

جواب الجواب

مفتی جعفر حسین نے ترجمہ میں خیانت کی ہے اور ڈھکو نے بھی اپنی طرف سے اس کی تخصیص کی ہے۔ حضرت علیؓ کے اپنے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔ آپ نے کھلے دل سے اس خطبہ میں جمہور صحابہؓ کی مدح کی ہے۔ اس میں اصحاب ثلثہ اور ان کی بیعت کرنے والے بھی صحابہؓ آجاتے ہیں اور یہ سب انہی کی مدح ہے۔

ڈھ گو رافضی نے اپنے دعوے تخصیص میں اس خطبہ کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے:

بعض هلک و بعض نجی. (خطبہ ۱۱۹ جلد اول)

اور ترجمہ نہیں دیا تا کہ بعض قارئین اس سے دھوکہ میں آجائیں کہ یہ سب صحابہؓ کی منقبت نہیں ہے۔ بعض ان میں ہلاک ہونے والے تھے اور بعض نجات پانے والے۔ یہ ان الفاظ کا مفہوم نہیں ہے۔ خطبہ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ بعض ھلک و بعض نجی اور ان کا ترجمہ یہ ہے کہ بعض فوت ہو گئے اور بعض ابھی زندہ بچے رہے۔ یہاں ھلاک ہونا برباد ہونے کے معنی میں نہیں۔ عربی میں یہ لفظ مطلق وفات کے لیے آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے یہ لفظ اس طرح وارد ہے:

لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللّٰہ شیاءً ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعاً . (پ ۶ المائدہ ۱۷)

ترجمہ: ''وہ لوگ کافر ٹھہرے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا' آپ کہہ دیں کہ پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے۔ اگر وہ مسیح بن مریم کو ہلاک کر دے۔ (اسے وفات دے دے) اور اس کی ماں کو (تو وہ پہلے وفات دے چکا) اور جو بھی ہیں زمین پر سب کو۔''

وفی الحدیث کلما ھلک نبی خلفہ نبی.

مفتی جعفر حسین نے بعض ھلک اور بعض نجی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

''(صحابہ نے) تلواروں کو نیام سے نکال لیا اور دستہ دستہ اور صف بصف بڑھتے ہوئے زمین کے اطراف تک (جا پہنچے) (ترجمہ نہج البلاغہ ص ۳۳۶)

اس خطبہ میں صحابہؓ کی اچھے برے کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ صرف بعض کے فوت ہو جانے اور بعض کے زندہ رہنے کا بیان ہے۔ ڈھ گو رافضی کا یہاں تخصیص کا استدلال بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی نے کہا تھا

''تیلی رے تیلی تیرے سر پر کوہلو''

غدیر خم کے اعلان سے منحرف ہونے والے اس فضیلت میں شامل

ڈھ گو کو غدیر خم کے عہد سے منحرف ہونے والوں کو اس مدح صحابہ میں شامل کرنے سے انکار نہیں لیکن اس کا بغض ان اصحاب ثلثہ کو برداشت نہیں کرتا اور جو ان کی اس روش سے برسر اقتدار آئے انہیں سراسر دائرہ ایمان سے باہر ٹھہرانا یہ بغض باطن کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ڈھ گو رافضی لکھتا ہے:

''جن بعض اخبار میں یہ وارد ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سوائے چار افراد (حضرت سلمانؓ، ابوذرؓ، عمار بن یاسرؓ اور مقدادؓ) کے باقی لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ اس ارتداد سے یہاں اس کے وہ فقہی معنی مراد ہیں جو کفر کے مترادف ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ غدیر خم کے مقام پر حضرت امیر کی خلافت و امامت کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو عہد و پیمان لیا تھا اس سے منحرف ہو گئے اور اس پر ثابت قدم نہ رہے۔ یہ بات ان کے نقص ایمان کی علامت ہے (کہ ان کا ایمان کم ہو گیا) نہ کہ کفر و شرک کی دلیل۔'' (تجلیات ص ۲۱۴)

اور یہ بھی لکھا ہے:

شیعان حیدر کرار جناب سلمانؓ ' ابوذرؓ ' عمار بن یاسرؓ ' اور مقداد بن الاسودؓ کو تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ورنہ ان کے علاوہ جس قدر اصحاب باصفا و ارباب زہد و اتقا ہیں شیعہ ان سب کے (باوجود ان کے غدیر خم کا عہد بھلانے کے) بدل و جان معتقد ہیں اور ان کی تعظیم و تکریم کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۱۵)

سو اب اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضرت علیؓ کے مذکور بالا ارشاد میں صحابہ کی جو منقبت بیان کی گئی ہے وہ سب جمہور صحابہؓ کو شامل ہے اور مفتی جعفر حسینؒ نے ترجمہ میں اسے جو چند خاص صحابہؓ کی منقبت بتلایا ہے یہ سراسر جھوٹ اور کلام خلیفہ راشد میں ایک کھلی تحریف ہے۔

پھر ڈھ گو جب خود بھی قاضی نور اللہ شوستری کی طرح خلفاء ثلثہ کے اسلام کا قائل ہے اور حضرت علیؓ کے مذکور بالا ارشاد میں صحابی کی جو منقبت منقول ہے' آپ نے اسے لفظ اسلام سے بیان فرمایا ہے جس میں یہ حضرات شامل ہیں تو پھر معلوم نہیں اس ڈھ گو کو یہاں تخصیص لانے سے کیا فائدہ ہوا۔ یہاں منقبت صحابہ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

این القوم الذی دعوا الی الاسلام فقبلوہ و قراٴوا القرآن فاحکموہ وھیجوا الی القتال فولھوا. (خطبہ ص ۱۱۹)

صحیفہ سجادیہ میں بھی صحابہ کرامؓ پر درود و سلام بھیجتے ہوئے خاص صحابہؓ کا ذکر ایک مزید عقیدت کے طور پر ہے۔ اس میں دوسرے صحابہؓ پر درود و سلام کی نفی کہیں نہیں کی گئی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ڈھگو رافضی مولانا دبیر کے اس استدلال کو کہیں توڑ نہیں سکا۔ حضرت علیؓ نے جس طرح پہلی تین خلافتوں کو عملاً تسلیم کیا اسی طرح آپ نے انہیں اپنے لیے درجہ اصول میں تسلیم کیا ہے اور خود آپ اپنے آپ کو ان کے فروع میں رکھ رہے ہیں۔

۲۔ حضرت علیؓ اپنے آپ کو ان پہلے بزرگوں کا ہی ایک تسلسل کہتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

ولقد مضت اصول نحن فروعها فما بقاء فرع بعد ذهاب اصله.

(نہج البلاغۃ ج ۲ خطبہ ۱۳۸)

ترجمہ: ”پہلے بنیادی لوگ (دین کی جڑیں) تو جاتے رہے اب ہم تو صرف ان کی شاخیں ہیں۔
جب جڑیں جاتی رہیں تو شاخیں کہاں رہ سکتی ہیں۔“

یہ بھی خلفاء ثلثہ کی ایک مشترکہ مدح ہے اور حضرت علیؓ اپنے آپ کو ان کا ہی ایک تسلسل بتا رہے ہیں۔ کئی شیعہ مجتہد کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ یہاں اپنے آباء و اجداد ابو طالب اور عبدالمطلب کو اپنی جڑیں کہہ رہے ہیں اور اپنے آپ کو ان کی فروع سمجھتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں اسلام کا یہ درخت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چلا ہے ابو طالب سے نہیں۔ جب یہ سلسلہ حضورؐ سے چلا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر اصول (جڑیں) کا لفظ خلفاء ثلثہ کے لیے ہی ہو سکتا ہے نہ کہ نسبی آباء و اجداد کے لیے اور یہ واقعہ ہے کہ آپ اپنے دور خلافت میں انہی خلفاء کی سیرت پر چلے ہیں۔

بعض اوقات روافض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس روایت میں کہیں خلافت یا رعیت کا ذکر نہیں کہ مضت اصول سے پہلے حکمران مراد لیتے جائیں۔ جواباً ہم نہج البلاغہ سے حضرت علیؓ کا عہد نامہ ۵۳ بھی پیش کیے دیتے ہیں۔ یہ اصحاب ثلثہ کی منقبت پر تیسری شہادت ہے۔

۳. **ولا تنقض سنة صالحة عمل بها صدور هذه الامة واجتمعت بها الالفة و صلحت عليه الرعيّة. (نهج البلاغه جلد ۳ ص ۹۹)**

ترجمہ: ”اس سنت صالحہ کا خلاف نہ کرنا جس پر اس امت کے پہلے بڑے چلے اور ان پر اتحاد اور یک جہتی رہی اور رعیت کی اس میں بہتری رہی۔“

رعیت کن کی ہوتی ہے؟ حکمرانوں کی۔ اتحاد اور یک جہتی کہاں مطلوب ہوتی ہے؟ سلطنت کے انتظامی امور میں۔ سو حضرت علیؓ یہاں صدور هذه الامة کن کو کہہ رہے ہیں؟ پہلے خلفاء کرام کو اگر دنیا سے انصاف ختم نہیں ہو گیا تو یہاں لفظ رعیت کے قرینے سے ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ اس میں اپنے سے پہلے حکمرانوں کی مدح کر رہے ہیں۔

اصحاب ثلثہ کی منقبت پر حضرت علیؓ کی چوتھی شہادت

۴. **انه با یعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه.**
(نهج البلاغة مكتوب ۶ جلد ۳ ص ۸)

ترجمہ: ”میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے پہلے تین خلفاء کی بیعت کی تھی اور انہی شرطوں پر کی ہے جن شرطوں سے ان سے کی تھی۔“

اس میں ان حضرات کی مدح اس جہت سے ہے کہ ان کی تسلیم کردہ شرائط کو آپ نے اپنے لیے بھی لائق تسلیم سمجھا۔ سو اس میں اس خط کی صرف الزامی حیثیت نہ رہی۔ آپ نے اس میں پہلے تین خلفاء کی شرائط خلافت کو لائق تسلیم جانا۔ حضرت معاویہؓ آپ کی اس بات سے متفق نہ تھے کہ آپ واقعی ان شروط کو اپنے لیے معیار سمجھ رہے ہیں۔ سو آپ کے اس خط کو محض الزامی نہیں سمجھا جا سکتا۔

۵۔ حضرت امام حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کو خلافت سپرد کرتے وقت ان پر جو شرطیں لگائیں ان میں تیسرے نمبر پر یہ تھی کہ معاویہؓ پہلے خلفاء صالحین کی سیرت کی پیروی کریں۔

هذا ما صالح عليه الحسن بن علی بن ابی طالب و معاوية بن ابی سفيان صالحه علی ان یسلم الیه ولایة امر المسلمين علی ان یعمل فیهم بکتاب اللّٰه وسنة رسوله و سيرة الخلفاء الصالحين. (تاریخ حبیب السیر ج ۲ ص ۱۴ و کشف الغمه للدردبیلی)

ترجمہ: ”اس میں حضرت حسنؓ کی زبان سے پہلے تین خلفاء کرام کی کھلی منقبت ہے۔ یہ شرط حضرت حسنؓ نے لگائی اور حضرت معاویہؓ نے تسلیم کی تھی۔ معاہدات میں الزامیات کو کبھی راہ نہیں دی جاتی۔“

اب آیئے ڈھکو کی ایک دوسری سرخی ملاحظہ ہو:

”اصل محل نزاع اصحاب ثلثہ کی شخصیت ہے۔“

یہ بھی ڈھکو کی ایک غلط بیانی ہے۔ اصل محل نزاع ان حضرات کی شخصیت نہیں ان کی خلافت ہے۔ شخصیتیں یہ صرف تین ہیں لیکن ان کی خلافت میں یہ ساری امت رہی ہے۔ ان تین کو فاسقوں میں شمار کرنا یا کافر کہنا حضور اکرم کی پوری امت کو فاسق اور کافر کہنا ہے۔ حضرت علیؓ بھی جب ان کی پیروی میں چلے تو انہیں بھی ان الزامات اور اتہامات سے نکالنا ایک خاصا اہم کام ہوگا جو شاید ان اثنا عشریوں سے بھی نہ ہو سکے۔

ہم ڈھکو کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اصل نزاع ان تینوں کی شخصیت ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ سنی شیعہ کا اصل نزاع ان کی خلافت میں چلا آ رہا ہے نہ کہ ان کی شخصیات زیر بحث رہی ہیں۔ حضورؐ کی وفات سے پہلے ان حضرات ثلثہ کا کب کبھی حضرت علیؓ سے اختلاف ہوا؟ حضورؐ کے ایام علالت میں بھی صحابہ کے کسی حلقہ میں حضرت ابو بکرؓ کی امامت کے بارے میں کبھی کہیں کسی اختلاف کی آواز سنی گئی؟ کبھی نہیں۔ فافہم وتدبر۔

ڈھ گو جواب بالمعارضہ کی پناہ میں

مولانا دبیرؒ نے خلفاء ثلثہ کی منقبت میں انفراداً اور اجتماعاً شیعہ لٹریچر سے بھی کثیر تعداد اشارے ہدیہ قارئین کیے تھے۔ ڈھ گو جب انہیں کسی طرح توڑ نہیں سکا تو اب وہ جواب بالمعارضہ کے پلیٹ فارم پر آ کھڑا ہوا ہے اور اس نے تجلیات کے ص ۲۱۶ پر بڑے طمطراق سے یہ سرخی باندھی ہے: "اصل اعتقاد جناب امیر علیہ السلام متعلق باصحاب ثلثہ"۔ اس میں اس نے دس حوالے بیان کیے ہیں جن میں پہلے سات صرف نہج البلاغہ سے پیش کیے ہیں۔ ان حوالوں کی گندی زبان خود بتلا رہی ہے کہ یہ ہرگز حضرت علیؓ کے ارشادات نہیں ہیں۔ آپ کی زبان بڑی پاکیزہ تھی۔ مرتب نہج البلاغہ شریف رضی شیعہ نے انہیں خود یہ صورت دی ہے۔ حضرت علیؓ کی عظیم عبقری شخصیت سے کچھ بھی تعارف رکھنے والا حضرت علیؓ کو کبھی اتنا بے بس تسلیم نہیں کر سکتا جس میں اس ڈھ گو نے انہیں پیش کیا ہے۔ مثلاً

لیس لی معین غیر اهل بیتی. (نهج البلاغة ص ۲۲ بحواله تجلیات ص ۲۱۷)

جو شخص تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے وقت برابر کا امیدوار خلافت رہا ہو اسے کس طرح اتنا بے بس تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کی پوری امت میں اس کا کوئی مددگار نہ ہو۔ آخر آپ نے کیا قصور کیا تھا کہ پوری امت ہی آپ کو چھوڑ گئی؟ پھر مددگاروں کی ضرورت کن کو ہوتی ہے؟ جو کسی مقابل پلیٹ فارم پر کھڑے ہوں اور کسی کو اپنی مدد کے لیے آواز دیں۔ حضرت علیؓ خلفاء ثلثہ کے دوران خلافت کبھی کسی پلیٹ فارم پر کھڑے نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ ہم شیعہ لٹریچر کی حضرت علیؓ کی بے بسی کی اس قسم کی روایات کو بالکل جعلی سمجھتے ہیں۔ باقر مجلسی لکھتا ہے:

سلمان گفت چوں شب شد علی فاطمہ را بر دراز گوشے سوار کرد دراز گوشے کرد و دست حسن و حسین را گرفت و بخانہ ہر یک از اہل بدر از مہاجرین و انصار رفت و حق امامت و خلافت خود بہ یادشاں آورد و طلب یاری از ایشاں کرد اجابت او نہ کردند مگر چہل و چہار کس (حق الیقین ج ص)

ترجمہ: "جب رات ہوئی حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو ساتھ سوار کیا اور حضرت حسنؓ اور حسین کو ساتھ لیا اور تمام اصحاب بدر مہاجرین اور انصار کے دروازہ پر گئے اور انہیں اپنا حق امامت اور خلافت یاد کرایا اور ان سے مدد مانگی۔ چوالیس آدمیوں کے سوا کسی نے ہاں نہ کی۔"

نہج البلاغہ کی اس روایت کو اگر درست تسلیم کیا جائے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ اہل بیت کے سوا کوئی نہ تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ۴۴ مخلص کہاں سے آ گئے اور اگر باقر مجلسی کی یہ روایت صحیح ہے تو پھر یہ بات اور کھل کر سامنے آ گئی کہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں کئی باتیں اپنی طرف سے بھی داخل کر رکھی ہیں۔

ڈھ گو نے اپنے اس موقف پر جو دس روایتیں پیش کی ہیں اور مولانا دبیر کے مناقب ثلثہ کا معارضہ کیا ہے ان میں سات شریف رضی کی اس صفت تحریف کا شاہکار ہیں۔ سو اس نے ان حضرات کے بارے میں حضرت علیؓ کا جو اعتقاد اپنی موضوع حدیثوں سے پیش کیا ہے وہ ہمارے ہاں پرکاہ کا وزن نہیں رکھتا۔ ہاں اس کے آخری تین حوالے جو اس نے ص ۲۱۸ پر صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹، تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۳۳ اور صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۰ سے دیے ہیں ہم ان کا ترتیب وار نوٹس لیتے ہیں۔

۱۔ پہلے دونوں حوالے امر خلافت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں حضرت علیؓ حضورؐ سے صرف قرابت پر اپنا حق مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہیں غدیر خم کی وصایت کا ذکر کرتے نظر نہیں آئے۔ یہ بات اہل سنت عقیدے کی ہے کہ حضرت کی خلافت بلافصل ہرگز منصوص نہ تھی۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے تاخیر سے بیعت کرنے کی جو وجہ بیان کی وہ ان حوالوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

ولکنک استبدت علینا بالامر ولکنا نریٰ لنا حقاً لقرابتنا من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.

ترجمہ: "ہم بناء بر قرابت رسول کہ ہم بنو ہاشم ہیں اپنا حق سمجھتے تھے کہ ہمیں بھی سقیفہ میں انصار کی منعقد کی گئی میٹنگ میں بلا لیا جاتا۔"

اب آپ خود ہی غور فرمائیں کہ زیر بحث ان حضرات کی شخصیت ہے یا ان کی خلافت۔ اور اس میں جب حضرت علیؓ بھی بطور بنو ہاشم اپنا حق جتلا رہے ہیں تو پھر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصل موضوع نزاع خلفاء ثلثہ کی شخصیت رہی ہے نہ کہ خلافت ایسا ہرگز نہیں۔ پھر آپ کے اس ارشاد سے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آپ غدیر خم کی کسی بات کے حوالے سے خلافت پر اپنا کوئی حق نہ سمجھتے تھے، صرف قرابت رسول کی بناء پر آپ اس میں اپنا یہ حق جتلا رہے تھے۔ پھر آپ نے اپنا یہ حق جتلا کر بھی جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کر لی تو اب اس مسئلے میں کونسا باب نزاع رہا۔ یہ آٹھویں اور نویں روایت کا جواب ہو چکا۔ اب اس کی پیش کردہ دسویں روایت پر آیئے۔

۲۔ ڈھ گو کی ترتیب میں یہ دسویں روایت ہے۔ ہم اس پر کچھ تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ واللّٰہ ہو الموفق۔

ڈھگو حضرت حسنؓ کے خلاف ایک نئے موقف پر

ڈھ گو نے حضرت علیؓ کے مدح خلفائے صالحین کے موقف کے خلاف ایک یہ سرخی باندھی ہے:

''اصل اعتقاد جناب امیر متعلق اصحابِ ثلثہ''

ڈھکو۔نے اس میں شریف رضی کے جمع کردہ خطبات حضرت علیؓ مرتضٰی کے تحریف شدہ کلمات سے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں سے کوئی کلمہ ہم پر حجت نہیں۔ ہاں اس نے آٹھویں اورنویں نمبر پر حضرت علیؓ کے لفظ استبدت علینا سے استدلال کیا ہے۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے فضل وکمال کے اعتراف سے خود اپنے اس موقف سے رجوع کرلیا اور حضرت ابوبکرؓ کے بھی اس پر آنسو جاری ہوگئے تو اب ان الفاظ میں کیا اثر باقی رہا۔ ہاں اگلی روایت پر ہم کچھ تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

ڈھکو کی دسویں نمبر پر پیش کردہ روایت

ڈھکو نے یہاں دسویں نمبر پر مالک بن اوس کی روایت صحیح مسلم کے حوالے سے صرف اس کے آخری حصے سے نقل کی ہے اور اس نے پوری روایت شروع سے نہیں لکھی۔ ایسا کیوں؟ یہ اس لیے کہ اس کے شروع میں تقریباً یہی الفاظ حضرت علیؓ پر اتر رہے ہیں جنہیں ان کے ظاہر میں کوئی مسلمان مراد نہیں لے سکتا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ پہلے سے حضرت عمرؓ کی مجلس میں حضرت عثمانؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ موجود تھے۔ حضرت عباسؓ نے آتے ہی حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کہا اور حضرت علیؓ کے بارے میں یہ سخت الفاظ کہے اور پہلے بیٹھے لوگوں نے بھی فی الجملہ حضرت عمرؓ سے ان میں فیصلہ کرنے کے لیے کہا۔

فقال عباس یا امیر المومنین اقض بینی و بین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن فقال القوم اجل یا امیر المومنین فاقض بینھم و ارحھم. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۰)

ترجمہ: ''حضرت عباسؓ نے کہا' امیر المومنین مجھ میں اور اس کاذب وآثم اور غادر وخائن میں فیصلہ کرا دیجئے۔ پاس بیٹھے لوگوں نے بھی امیر المومنین سے ان میں فیصلہ کرنے کی درخواست کی اور کہا' ان کو ایک دوسرے کے بارے میں آرام بہم پہنچائیں۔''

حضرت عباسؓ کا حضرت علیؓ کو کاذب' آثم' غادر اور خائن کہنا صرف بطور الزام تھا' یہ نہیں کہ معاذ اللہ آپؓ حضرت علیؓ کو واقعی جھوٹا اور خائن سمجھتے تھے۔ اس لیے بعض علماء اہل سنت نے اس کی شرط محذوف بتلائی ہے اور کہا ہے:

معناہ الکاذب ان لم ینصف (نووی شرح صحیح مسلم)

ترجمہ: ''یہ کاذب ہوں گے اگر یہ انصاف سے کام نہ لیں۔''

اب پوری حدیث میں یہ الفاظ جس پر بھی آئیں اس شرط سے مشروط سمجھیں جائیں گے۔ سو اہل سنت لٹریچر میں جہاں بھی کسی پر یہ الفاظ بولے جائیں گے وہ تصدیقاً نہیں کہ معاذ اللہ حضرت علیؓ واقعی جھوٹے گناہگار اور خائن تھے بلکہ تادیباً کہ اگر وہ انصاف سے کام نہ لیں تو ایسے ہی سمجھے جائیں گے۔

اسی طرح حضرت عباسؓ کی نظر میں اگر حضرت عمرؓ (معاذ اللہ) جھوٹے' آثم اور غادر ہوتے تو عم رسول حضرت عباسؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؓ کو یا امیر المومنینؓ سے خطاب نہ کرتے۔ حضرت علیؓ کا وہاں اپنے چچا کی بات نہ کاٹنا بتلاتا ہے کہ آپ بھی حضرت عمرؓ کو امیر المومنین سمجھتے اور مانتے تھے۔ سو ڈھکو کا اس روایت کو حضرت علیؓ کا عقیدہ ثابت کرنے کے لیے پیش کرنا علم ودیانت اور صدق وشرافت کا خون کرنے سے کوئی کم جرم نہیں ہے۔ پھر ڈھکو نے حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ الفاظ رایتمانی کاذباً آثماً غادراً خائناً نقل کرتے ہوئے اگلے تردیدی الفاظ یکسر چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں جو ڈھکو نے خیانتاً چھوڑے' انہیں ہم ذیل میں پیش کیے دیتے ہیں۔

فرایتمانی کاذباً آثماً غادراً خائناً واللہ یعلم انی لصادق بارّ راشد تابع للحق فولیتھا ثم جئتنی انت و ھذا و انتما جمیع و امرکم واحد فقلتم ادفعھا الینا فقلت ان شئتم دفعتھا الیکم علی ان علیکما عھد اللہ ان تعملا فیھا بالذی کان یعمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخذتماھا بذلک قال أکذلک قالا نعم. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۱)

ترجمہ: تم نے مجھے کاذب' آثم' غادر اور خائن سمجھا اور اللہ جانتا ہے کہ میں سچا' راست باز' راشد اور تابع للحق تھا پھر میں نے اس کی تولیت رکھی پھر تم اور یہ (حضرت علیؓ) میرے پاس آئے اور تم دونوں اس مطالبے پر ایک تھے کہ یہ زمین ہمیں ہی دے دیں۔ میں نے کہا' تم یہ چاہو تو میں اس پر بھی عمل کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تم اللہ سے عہد باندھو کہ تم اس زمین میں وہی کاروائی کروگے جو حضور کرتے رہے سو تم نے یہ زمین (اس عہد کے ساتھ) لے لی۔ آپؓ نے کہا' کیا بات اسی طرح نہیں؟ دونوں نے کہا' ہاں بات اسی طرح ہوئی تھی۔''

جب حضرت عمرؓ نے یہ پوری صورت حال بیان کرنے کے بعد ان سے سوال کیا کہ کیا صورت حال اسی طرح نہیں ہے تو دونوں نے اس کا اقرار کیا اور حضرت عمرؓ کو کاذب کی بجائے صادق' آثم کی بجائے بارّ غادر کی بجائے راشد اور خائن کی بجائے تابع للحق تسلیم کیا۔ تو کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کی نظر میں (معاذ اللہ) خلیفہ راشد نہ تھے' جب حضرت عمرؓ نے خدا کو گواہ بنا کر اپنے آپ کو خلیفہ راشد کہا اور حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے اس کا انکار نہ کیا تو حضرت عمرؓ نے جو پہلے بات کہی تھی کہ تم نے (الزاماً اور تحکماً) مجھے کاذب سمجھا تو کیا یہ روایت کے اگلے الفاظ ان پہلے

الفاظ کی کھلی تردید نہ ہوں گے۔ مولف میں ذرا بھی علمی شرافت ہوتی تو وہ اس روایت کو نامکمل نقل نہ کرتا۔ یہ الفاظ اگر حضرت عمرؓ پر اس طرح اتر رہے تھے تو یہ حضرت علیؓ پر بھی اسی روایت میں برابر آ رہے تھے۔

حضرت عباسؓ کے حضرت علیؓ کو جھوٹا اور خائن کہنے پر اہل سنت کا موقف

قاضی عیاض (۵۴۴ھ) علامہ مازری سے نقل کرتے ہیں:

هذا اللفظ الذی وقع لا یلیق ظاهره بالعباس و حاشا لعلی ان یکون فیه بعض هذه الاوصاف فضلاً عن کلها ولسنا نقطع بالعصمة الا للنبی صلی الله علیه وسلم ولمن شهد له بها لکنّا مامورون بحسن الظن بالصحابة رضی الله عنهم اجمعین و نفی کل رذیلة عنهم واذا انسدت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها ..... فاجود ما حمل علیه انه صدر من العباس علیٰ جهة الادلال علیٰ ابن اخیه لانه بمنزلة ابنه وقال مالا یعتقده .... ولا بد من هذا التاویل لان هذه القضیّة جرت فی مجلس فیه عمر وهو الخلیفة و عثمان و سعد و زبیر و عبد الرحمٰن ولم ینکر احد منهم هذا الکلام مع تشددهم فی انکار المنکر وما ذلک الا لانهم فهموا بقرینة الحال انه تکلم بمالا یعتقد ظاهره مبالغة فی الزجر قال المازری و کذلک قول عمر انکما جئتما ابابکر فرایتمانی کاذباً آثماً غادراً خائناً وکذلک ذکر عن نفسه انهما رایاه کذلک و تاویل هذا علی نحو ما سبق وهو ان المراد انکما تعتقدان ان الواجب ان نفعل فی هذه القضیة خلاف ما فعلته انا و ابوبکرؓ فنحن علی مقتضی رایکما لو اتینا ما اتینا و نحن معتقدان ما تعتقدانه لکنا بهٰذه الاوصاف.

ترجمہ: یہ الفاظ جو یہاں روایت ہوئے ظاہری پیرایہ میں حضرت عباسؓ کی شخصیت کے ہرگز لائق نہیں اور یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ حضرت علیؓ میں ان اوصاف میں سے کچھ بھی ہوں چہ جائیکہ یہ پورے اوصاف ان میں پائے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ مقام عصمت قطعی درجے میں صرف نبوت کا ہے اور اس کے لیے جس کے بے گناہ ہونے کی حضورؐ شہادت دے دیں۔ لیکن ہم اہل سنت اس کے پابند ہیں کہ سب صحابہ سے نیک گمان رہیں اور ان سے ہر قسم کی رذیلت کی نفی کریں اور جب تاویل کی تمام راہیں بند ہوں تو ہم اس کے راویوں سے خلاف واقعہ بات کہنے کا گمان کریں.... سو بہترین

بات جس پر اس روایت کو محمول کیا جاسکتا ہے' یہ ہے کہ حضرت عباسؓ سے حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بات بھتیجے پر بطور ادلال کہی گئی کیونکہ بھتیجا بیٹے کے درجے میں ہوتا ہے اور آپؓ نے حضرت علیؓ کے بارے میں وہ بات کہی جو ان کا اپنا اعتقاد نہ تھا۔ اور اس تاویل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ یہ مقدمہ جو حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا اور حضرت عثمانؓ حضرت سعدؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت عبد الرحمٰنؓ وہیں موجود تھے اور کسی نے بھی ان میں سے حضرت عباسؓ پر ان کے یہ الفاظ کہنے پر نکیر نہیں کی حالانکہ یہ حضرات ہر منکر کی تردید میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ سو یہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے قرینہ حال سے یہی سمجھا کہ حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے بارے میں جو الفاظ کہہ رہے ہیں آپ اپنے اعتقاد میں حضرت علیؓ کو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بات بطور مبالغہ فی الزجر کے تھی۔ علامہ مازری کہتے ہیں' اسی طرح حضرت عمرؓ کا انہیں یہ کہنا کہ تم حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے تھے اور تم نے انہیں ایسا ایسا سمجھا اور آپ نے انہیں اپنے بارے میں بھی کہا (کہ پھر تم میرے پاس بھی آئے تھے) اور تم دونوں نے مجھے بھی ایسا ایسا سمجھا سو اس کی تاویل بھی اسی کے مطابق کی جائے گی۔ جیسے ہم نے ان الفاظ کے حضرت علیؓ کے بارے میں کہے جانے پر کی تھی۔ سو اس میں معنی مراد یہ ہوں گے کہ تم دونوں یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم اس میں اس کے خلاف فیصلہ کریں جو میں اور حضرت ابوبکرؓ اس میں پہلے کر چکے تھے۔ سو اس بات سے یہ بات لازم آتی ہے کہ تم دونوں ہمارے فیصلے پر جو ہم نے کیا ہمیں ان اوصاف پر ہی سمجھتے ہو۔ یعنی آپ نے یہ بات بطور تحکم کہی تھی کہ تمہاری بات کا (بایں صورت کہ تم اپنے آپ کو سچا سمجھو) یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اس پیرایہ بیان میں ضروری ہے کہ ان کلمات کو بطور تحکم اور الزام لیا جائے نہ کہ یہ سمجھا جائے کہ اس مجلس میں یہ الفاظ بطور اعتقاد کہے گئے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ پورے سیاق وسباق کو سامنے رکھ کر یہی بات ہے جو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ان الفاظ کو ان کے ظاہر استعمال پر محمول نہ کیا جائے۔

ایک اور مثال سامنے رکھیئے

ایک شخص اپنے بیٹے کو ایک بات سمجھا رہا تھا اور وہ اسے سمجھ نہ رہا تھا۔ وہ اس پر غور بھی نہ کر رہا تھا۔ باپ نے جب اس کی بے پرواہی دیکھی تو اس نے غصہ میں کہا "کیا میں بکواس کر رہا ہوں؟" یعنی اگر تم میری بات پر کچھ بھی غور نہیں کر رہے تو اس کا نتیجہ لازم تو یہ نکلتا ہے کہ تم میری اس بات کو محض کلام لاطائل سمجھ رہے ہو۔ اس پر اس نے بطور الزام اور تحکم کہا

"کیا میں بکواس کر رہا ہوں؟" اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بیٹے کا واقعی اعتقاد یہ تھا کہ میرا باپ بکواس کر رہا ہے۔ ایسی باتیں عام پیرایہ بیان میں صرف بطور تحکم والزام کہی جاتی ہیں نہ کہ ان سے اعتقاد کشید کیے جاتے ہیں۔

اگر ہم علامہ مازری کی اس تاویل کو قبول نہ کریں تو پھر یہ الفاظ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ پر ہی نہیں اترتے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ پر بھی برابر اترتے ہیں۔ اہل سنت جس طرح ان الفاظ کو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر اترنے نہیں دیتے وہ انہیں اس ظاہری پیرائے میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ پر بھی اترنے نہیں دیتے۔ ڈھکو کا اس روایت کے پچھلے حصے کو نقل کرنا اور پہلے حصے کو دبا جانا صرف اس لیے تھا کہ اس کی زد حضرت علیؓ پر بھی برابر آتی تھی۔ یہ بات ڈھکو کی اندرونی سیاہی کا پتہ دیتی ہے۔ لینے اور دینے کا ترازو ایک ہونا چاہیے۔ **فویل للمطففین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون.**

پھر اس سے یہ بات بھی تو واضح ہوتی ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ دونوں حضرت عمرؓ کو امیر المومنین اور دوسرا جانشین رسول مانتے تھے تبھی وہ آپ کے پاس اپنے ایک مقدمہ میں دوسری دفعہ پیش ہوئے۔ اگر وہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ کی خلافت کو ایک طاغوتی حکومت سمجھتے تو کبھی آپ ان کے پاس ایک فیصلے کے لیے حاضری نہ دیتے۔

قرآن کریم میں ہے:

الم تر الی الذین یزعمون انهم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به و یرید الشیطان ان یضلهم ضلالاً بعیداً. (پ ۵ . النساء ٦٠)

ترجمہ: "کیا تم نے ان کو نہ دیکھا جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو اتارا گیا تجھ سے پہلے۔ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمے طاغوت (شیطان) کے پاس لے جائیں اور حکم ہو چکا تھا انہیں کہ وہ طاغوت کے پاس جانے سے انکار کردیں اور چاہتا ہے شیطان کہ ان کو بہکا کر دور لے جائے۔"

سو اس میں شک نہیں کہ آپ اپنے دور خلافت میں اپنے آپ کو پہلی تین خلافتوں سے جوڑتے تھے۔ انتخاب خلیفہ کو نص پر مبنی نہیں، مہاجرین اور انصار کے فیصلے پر مبنی سمجھتے تھے۔ آپ امیر معاویہؓ کو اسی خط میں لکھتے ہیں:

انه بایعنی القوم الذی بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه فلم یکن للشاهد ان یختار و لا للغائب ان یردّ وانما الشوریٰ للمهاجرین والانصار فان اجتمعوا علیٰ رجل و سموه اماماً کان ذلک لله رضیٰ.

(نہج البلاغہ ج ۳ مکتوب ۶ جلد ۳ ص ۸)

ترجمہ: "بے شک میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی اور انہی شرائط پر کی ہے جن پر وہ ان کی بیعت کر چکے تھے۔ پس (میری بیعت کے وقت) جو حاضر تھا اسے اب کسی دوسرے فیصلے کا حق نہیں اور نہ کسی غائب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے رد کرے۔ شوریٰ کا حق صرف مہاجرین اور انصار کو ہے اگر وہ کسی پر جمع ہو جائیں اور اسے امام کا نام دیں تو اسی میں اللہ کی رضا سمجھی جائے گی۔"

اس خط کے دو حصے ہیں (۱) نقل واقعات اور (۲) اس صورت عمل کے صحیح ہونے پر دلائل۔

ڈھکو لکھتا ہے:

"ہم علی وجہ البصیرۃ کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہم السلام کا یہ کلام بطور الزام ہے نہ بطور بیان مقصد و مرام۔ (ص ۲۱۹)

الزامی جواب میں صرف نقل واقعات ہوتا ہے جس پر مقابل پر کوئی بات لازم کی جائے، اس میں دلائل مہیا نہیں کیے جاتے۔ اس پر دلائل تبھی لائے جاتے ہیں جب وہ بات صرف الزامی نہ ہو اپنا موقف اور عقیدہ بھی وہی ہو۔ یہ موقف حضرت علیؓ کا تھا کہ حاضرین کی بیعت کا فیصلہ (دور رہنے والے) غائبین پر بھی لازم آتا ہے۔ تاکہ حضرت معاویہؓ اس میں دور رہنے کو اپنے لیے دلیل نہ بنا سکیں اس پر حضرت علیؓ ایک دوسرے موقعہ پر اپنا موقف اپنے خطبہ ۱۷۱ میں پیش کر چکے ہیں۔ آپ نے قسم کھا کر کہا:

ولعمری لئن کانت الخلافة لا تنعقد حتی یحضرها عامة الناس فما الی ذلک من سبیل ولکن اهلها یحکمون علی من غاب عنها ثم لیس للشاهد ان یرجع ولا للغائب ان یختار. (نهج البلاغة ج ۲ خطبه ۱۷۱)

ترجمہ: "اور اپنی جان کی قسم اگر خلافت کا انعقاد تمام افراد امت کے ایک جگہ بٹھانے سے ہی ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح عمل میں نہیں آ سکتا لیکن بات یوں بنے گی کہ اس کے موجودین کا فیصلہ ان پر بھی لازم آتا ہے جو وہاں موجود نہ ہوں پھر موجود کو اختیار نہ ہوگا کہ وہ کبھی پیچھے ہٹ سکے اور نہ غیر موجود کو حق ہوگا کہ وہ کسی اور کو خلیفہ چنے۔"

یہ آپ کا کوئی خط نہیں کہ اس میں آپ کسی کو کوئی الزامی بات کہہ رہے ہوں۔ آپ کا یہ خطاب عامۃ الناس کو تھا اور یہ وہی باتیں ہیں جو آپؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھی تھیں۔ سو معلوم ہوا کہ آپ کا وہ خط جو آپ نے حضرت معاویہؓ کے نام لکھا یہ کوئی الزامی تحریر نہ تھی۔ انتخاب امام میں آپ کا اپنا موقف اور عقیدہ بھی یہی تھا۔

پھراس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہر سوال کا پہلے تحقیقی جواب دیا جاتا ہے پھر کہیں الزامی جواب کی باری آتی ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ بحالت تقیہ صرف الزامی جواب دیا جاسکتا ہے۔ تحقیقی جواب دینے سے تقیہ قائم نہیں رہتا اور جو تقیہ نہ کرے اس کا ایمان جاتا رہتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پھر کم از کم اتنا تو تسلیم کرلو کہ مذکورہ خط لکھتے وقت حضرت علیؓ نہ چاہتے تھے کہ معاویہؓ سے ایک الزامی خط سمجھیں، وہ امید رکھتے تھے کہ معاویہؓ سے حقیقت سمجھیں گے اسے محض ایک الزام کا درجہ نہ دیں گے۔

الزامی جواب کی باری کب آتی ہے

اہل علم سے مخفی نہیں کہ کسی اعتراض کا پہلا جواب تحقیقی ہوتا ہے اور پھر کہیں الزامی جواب کی باری آتی ہے۔ پھر الزامی کہیں اپنے ہاں بھی قابل قبول ہوتا ہے اور کہیں اپنے اوپر اسے لازم نہیں کرتے۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو خط لکھا کہ میری بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی سو تمہیں چاہیے کہ مجھے بھی اس تسلسل میں تم چوتھا خلیفہ تسلیم کرو۔ مولانا دبیر نہج البلاغہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کے اس خط سے استدلال کرتے ہیں

"آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ میری اور خلفائے سابقین کی خلافت ایک ہی طریق سے ایک ہی جماعت (مہاجرین وانصار) کے انتخاب سے عمل میں آئی ہے۔"

ڈھکو مولانا دبیر کے جواب میں لکھتا ہے

"جناب امیر علیہ السلام کا یہ کلام بطور الزام ہے۔" (تجلیات ص ۲۱۹)

اگر آپ کا یہ کلام محض الزامی ہے تو آپ کا پہلا تحقیقی جواب بھی تو کہیں ہونا چاہیے۔ ڈھکو اور اس کے اعوان و انصار اسلام کی تیرہ صدیوں میں اہل سنت لٹریچر سے کہیں حضرت علیؓ کا اس میں کوئی امر تحقیقی جواب پیش نہیں کرسکے۔ یہ الزامی جواب کیسا ہے جس کے لیے اس کا کوئی تحقیقی جواب سرے سے نہ ملے۔ پھر لزوم اور الزام میں بھی فرق ہے۔ لزوم ایک حقیقت کا پہلو ہے لیکن الزام کبھی واقعہ اور دیانت کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ ڈھکو کی علمی۔ بے چارگی دیکھئے کہ لزوم سے اس کو ایک کارروائی کہہ رہا ہے۔

"لیجئے اس مکتوب میں لزوم کا لفظ بھی موجود ہے جس سے اس کا الزامی دلیل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۲۰)

حضرت علیؓ کا اگر یہ جواب محض الزامی ہوتا تو کیا وہ محض ایک الزامی خلافت پر ساڑھے چار سال مسلمانوں کے

حکمران بنے رہے۔ آپ کا اپنے پورے دوران خلافت اپنے آپ کو حضرت خلفاء ثلثہ کی پیروی میں چلانا پتہ دیتا ہے کہ آپ کا یہ جواب الزامی نہ تھا۔ تحقیق حال بھی یہی تھی کہ آپ کی خلافت پہلی تین خلافتوں کا ہی تسلسل تھا اور آپ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) کی یہ عبارت آپ کے مطالعہ میں پہلے آچکی ہے۔

اکثر اہل آں زماں را اعتقاد آں بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است و فساد امامت ایشاں را دلیل فساد امامت او مے دانستند۔ (مجالس المومنین جلد ا ص ۵۴)

ترجمہ: اس دور کے اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ کی امامت حضرت ابوبکرؓ و عمر و عثمان کی امامت کا ہی تسلسل ہے اور اگر ان خلفاء ثلثہ کی امامت غلط سمجھی جائے تو اس سے حضرت علیؓ کی امامت بھی اپنی جگہ قائم نہ رہ پائے گی۔

ابھی شیعوں میں عقیدہ عصمت ائمہ پیدا نہ ہوا تھا اس وقت کے اہل علم ان ائمہ اہل بیت کو اسی طرح صلحائے امت سمجھتے تھے۔ جس طرح وہ دیگر ائمہ کو (جیسے امام مالک امام سفیان ثوری اور امام ابویوسف وغیرہم) کو صلحائے امت سمجھتے تھے۔

ملا باقر مجلسی بھی لکھتا ہے:

جمع از راویاں کہ در اعصار ائمہ بودہ اند از شیعاں اعتقاد بعصمت ایشاں نداشتہ اند بلکہ ایشاں را علماء نیکوکار مے دانستہ اند و مع ذلک ائمہ حکم بایمان ایشاں بلکہ بعدالت ایشاں مے کردہ اند۔ (حق الیقین ص ۶۲۹ ایران)

ترجمہ: ان شیعہ راویان حدیث میں جو ائمہ اہل بیت کے گرد و پیش ہوتے تھے اکثر ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ نہ رکھتے تھے وہ انھیں (ان ائمہ کو) بس علماء صالحین کے درجہ میں ہی سمجھتے تھے اس کے باوجود ائمہ اظہار انھیں مومن بھی قرار دیتے اور انھیں عادل راویوں میں سے سمجھتے تھے (جن کے ذریعہ ان کا دین آگے دوسرے لوگوں تک پہنچتا تھا)

ہم پیچھے اس پر پوری بحث کر آئے ہیں کہ آپ کا مذکورہ خط ہرگز ایک الزامی درجہ کی بات نہ تھی اور حضرت علیؓ مرتضٰی کا اپنا قول و فعل بھی اس خط کے مندرجات کے مطابق رہا ہے۔ ڈھکو اگر ڈھ فیم بھی ہو اور وہ اس خط کو نہ سمجھ پائے تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

وكم من عائب قولاً صحيحاً...... وآفته من الفهم السقيم.

خلافت اور امامت کا معرکۃ الآراء مسئلہ

باب چہارم

خلافت اور امامت کا معرکۃ الآراء مسئلہ

اسلام دین فطرت ہے اور انسانی تمدن کا یہ فطری تقاضا ہے کہ پبلک کے لیے ایک امیر یا حاکم ہو۔ اس کے بغیر ملک کا نظم و نسق قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی نظم امور کے بغیر کوئی سیاست وجود میں آ سکتی ہے۔ اسلام میں بھی حکومت کا یہی تصور پیش کیا گیا ہے کہ حاکم وہ چاہیے جو رعیت کے لیے ڈھال ہو اور اس کے پیچھے عوام مفسدوں اور امن کے دشمنوں سے بچ سکیں؛ جو حاکم عوام کو دہشت گردی سے نہ بچا سکے وہ امام یا امیر بننے کے لائق نہیں۔

سربراہ کی پہلی صفت یہ ہے کہ صاحب قوت ہو اور دوسری یہ کہ حکومت چلانے اور عوام کو عدل انصاف دینے اور ان کے حقوق ادا کرنے کا اسے علم ہو۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ فرماتے ہیں:

ایھا الناس ان احق الناس بھٰذا الامر اقواھم علیه واعلمھم بامر اللّٰه فیه فان شغب شاغب استعتب فان ابیٰ قوتل. (نھج البلاغه ج ۲ خطبه ۱۶۴ ص ۱۰۴)

ترجمہ: ''تمام لوگوں میں خلافت کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہے جو اس کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔ اگر کوئی فتنہ پرداز گڑبڑ کرے تو اسے توبہ کی طرف بلایا جائے۔ اگر وہ اس طرف نہ آئے تو اس سے لڑا جائے۔ وہ کسی مرحلے پر یہ نہ کہہ سکے کہ اس فتنہ پرداز کے مقابلہ کی مجھ میں طاقت نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حاکم کے لیے امام اور حضرت علیؓ نے اس کے لیے امیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ نے اسے امام بھی کہا اور فرمایا اللہ کو ایسا حاکم ہی پسند ہے۔ ہم اس کا ترجمہ سربراہ سلطنت بھی کر سکتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

انما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به فان امر بتقویٰ اللّٰه و عدل کان له بذلک اجر وان یامر بغیره لکان علیه منه.

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۶ . صحیح بخاری ج ۲ ص)

ترجمہ : ''امام سوائے اس کے نہیں کہ ایک ڈھال ہے اس کی قیادت میں جنگ لڑی جاسکتی ہے اور اس کے ذریعہ انسان حفاظت میں رہتا ہے۔ اگر وہ اللہ کے ڈر میں رہ کر حکومت کرے اور رعیت میں عدل قائم کرے تو اسے اس کا اجر ملے گا اور وہ اس کے بغیر حکومت چلائے تو یہ حکومت اس پر (قیامت کے دن) بار ہوگی۔''

حضرت علیؓ مرتضیٰ فرماتے ہیں:

وانہ لابد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرتہ المومن ویستمتع فیھا الکافر. (نھج البلاغہ ج ۱ خطبہ ۳۹ ص ۸۷)

ترجمہ : ''اس سے چارہ نہیں کہ لوگوں کا ایک امیر (امام) ہو نیک ہو یا فاجر مومن بھی اس کی حکومت میں چلے اور کافر بھی اس کی حکومت سے فائدہ پائے۔''

حضرت علیؓ ایک دوسرے موقعہ پر شوریٰ سے چنے امیر پر امام کا لفظ بھی استعمال فرماتے ہیں اور پھر اس پر اللہ کی پسندیدگی ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے وہی امام ہے۔

انما الشوریٰ للمھاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل و سموہ اماماً کان ذلک للہ رضی. (نھج البلاغۃ ج ۳ مکتوب ۶ ص ۸)

ترجمہ : ''شوریٰ کا حق صرف عوام کو ہے۔ وہ اگر کسی پر ایکا کرلیں اور اسے امام کہیں تو اللہ کے ہاں بھی اس میں رضا ہے۔''

اس سے پتہ چلا کہ امام کے لیے عصمت ضروری نہیں۔ بقول حضرت علیؓ ہر نیک اور گناہ گار اس ذمہ داری پر آسکتا ہے۔ امام میں یہ دیکھا جائے کہ وہ رعایا کی اس ذمہ داری کو نبھا سکے گا یا نہیں۔ اس کا تقرر صرف نیکی پر عمل میں نہ آئے اس میں حکومت کرنے کی اہلیت بھی ہونی چاہیے۔ ڈھکو خود تسلیم کرتا ہے:

''قطع نظر نبی وامام کے، پبلک کے لیے ایک امیر اور حاکم کا وجود بہر حال ناگزیر ہے۔ جس کے بغیر ملک کا نظم ونسق بحال نہیں رہ سکتا اور نہ ہی سیاست مدن قائم رہ سکتی ہے۔ اس کلام میں لفظ امیر وارد ہوا ہے نہ امام۔ اس کا ترجمہ مولف (مولانا دبیر) نے امام کر کے اپنے علم کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں کیا۔'' (تجلیات ص ۲۳۶)

ہم کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون میں لفظ امام استعمال فرمایا ہے۔ مولانا دبیر نے یہاں امیر کا ترجمہ امام اپنی طرف سے نہیں کیا۔ لسان رسالت سے اس بحث میں یہ لفظ امام صادر ہوا ہے۔

ان عبارات میں اہل سنت اور اہل تشیع میں یہ موقف متفقہ طور پر نظر آتا ہے۔

۱۔ اسلام میں امام، امیر، والی یا خلیفہ کوئی اصطلاحات نہیں ہیں۔ رعایا کو ہر حال میں ایک والی امور کی ضرورت ہے جو ان میں نظم امور قائم کرسکے اور انہیں دہشت گردوں سے بچا سکے۔ اس حاکم کو لفظ امام، امیر، والی، سربراہ اور خلیفہ کسی بھی لفظ سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ سربراہ مملکت کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ نظم امور کے لیے فاجر بھی آسکتا ہے اور وہ لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنے پر گناہ گار ٹھہرے گا۔ اور اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام کبھی فاجر حکمران سے بھی لے لیتے ہیں۔ حکومت کے لیے عصمت شرط نہیں۔ نظم امور میں علم اور نفاذ حکم میں اس میں طاقت ہونی چاہیے۔ **زادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ (پ ۳ البقرہ)**

۳۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ رعایا کے نظم امور کے بغیر اور ان سے دشمنوں کے شر کو دور کیے بغیر کوئی شخص اپنے گھر میں بیٹھا خلیفہ وقت نہیں ہوسکتا نہ کوئی گوشہ نشین امام وقت سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس سے کوئی اس ذمہ داری کو چھین لے تو یہ اپنے اس چھنے عہدے میں خلیفہ نہ کہلا سکے گا۔ پھر وہ اپنے آپ کو خلیفہ کہے یا لوگ اس گوشہ نشین کو خلیفہ کہیں تو یہ ایک نہایت مضحکہ خیز بات ہوگی۔

اسلام میں خلیفہ کا لفظ کسی اصطلاح میں بند نہیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا البتہ خلفاء ہوں گے اور وہ بہت ہوں گے۔
اس سے پتہ چلا کہ خلفاء کے لیے کوئی عدد معین نہیں، وہ کئی ہوں گے اور بہت ہوں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انہ لا نبی بعدی و ستکون خلفاء (فتکثر قالوا فما تامرنا قال) فوابیعۃ الاول فالاول واعطوھم حقھم. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۶)

ترجمہ : ''بے شک میرے بعد کسی کو نبوت نہ ملے گی اور خلفاء ہوں گے اور وہ کئی ہوں گے صحابہ نے عرض کیا۔ پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ حضورؐ نے فرمایا۔ پہلے جس کی بیعت ہو جائے تم اسے نبھانا پھر اس کے بعد جس کی پہلے بیعت ہو جائے اس سے نبھانا اور ان خلفاء کو ان کا حق دینا۔ (ان کی اطاعت میں رہنا)''

ہونے والے خلفاء کی مختلف جہات کے لحاظ سے آپؐ نے تقسیم فرمائی (۱) تیس سالہ خلافت کی بھی خبر دی (۲) بارہ حکمرانوں کا بھی پتہ دیا (۳) اور اپنے آخری دور میں ہونے والے خلیفہ کی بھی خبر دی اور (۴) یہ بھی فرمایا کہ خلفاء بہت ہوں گے۔

۱۔ تیس سالہ خلافت کی خبر دیتے ہوئے آپؐ نے اسے خلافت نبوت کا بھی نام دیا' اسے خلافت علی منہاج النبوۃ کہتے ہیں۔ اس میں صرف چار خلیفہ ہوئے جن کی وفات بحالت خلیفہ ہوئی۔ حضرت حسنؓ کا عہد سعادت مہد تو خلافتِ راشدہ میں داخل ہے لیکن خلافت چھوڑنے پر آپؓ خلفائے راشدین میں شمار نہ پا سکے۔ آپ کی وفات یا شہادت بقائی خلافت نہ ہوئی تھی تاہم آپ کا دور حکومت بھی ان تیس سالوں میں شمار پا گیا۔

حضرت سفینہؓ کہتے ہیں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

الخلافة فی امتی ثلثون سنة ثم ملک بعد ذلک (جامع ترمذی ج ۲ ص ۴۵)

ترجمہ : ''میری امت میں خلافت تیس سال تک رہے گی پھر ملوکیت آ جائے گی۔''

حضرت سفینہؓ نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا دور حکومت' حضرت عمرؓ کا دور حکومت' حضرت عثمانؓ کا دور حکومت اور حضرت علیؓ کا دور حکومت شمار کرنے کا کہا اور فرمایا ہم نے یہ تیس سال پورے کر لیے ہیں۔

امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

ان المراد فی الحدیث الخلافة ثلثون سنة خلافة النبوة و قد جاء مفسراً فی بعض الروایات ان خلافة النبوة بعدی ثلثون سنة ثم تکون ملکاً ولم یشترط هذا فی الاثنٰی عشر (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۹)

ترجمہ : ''اس حدیث سے مراد کہ خلافت تیس سال تک رہے گی' خلافت نبوۃ ہے اور یہ بات دوسری روایت میں اس تفصیل سے مذکور ہے کہ خلافت نبوۃ میرے بعد تیس سال رہے گی۔ پھر یہ بادشاہت ہو جائے گی اور یہ خلافت النبوۃ والی شرط بارہ خلفاء والی روایت میں نہیں ہے۔''

ثم عربی میں تراخی کے لیے آتا ہے جو حکومت تیس سال کے بعد ہو گی وہ ملوکیت ہو گی۔ خلافت علی منہاج النبوۃ نہ ہو گی۔ امیر معاویہ کی حکومت مذکورہ تیس سال کے اندر شروع ہو گئی تھی' تیس سال کے بعد نہیں۔ سو یہ ملک عضوض میں شمار نہ پائے گی۔ یہ ایک عبوری دور سمجھا جائے گا۔ ملک عضوض حضرت معاویہؓ کے بعد ہو سکے گا۔

۲۔ بارہ خلفاء والی روایت

حضرت جابر بن سمرۃؓ کہتے ہیں' میں نے حضور اکرمؐ کو کہتے سنا:

لا یزال الاسلام عزیزاً الٰی اثنی عشر خلیفة ... لا یزال هذا الدین عزیزاً منیعاً الٰی اثنی عشر خلیفة (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۹)

ترجمہ : ''اسلام بارہ حکمرانوں تک بے شک غالب رہے گا۔ بایں طور کہ اس پر کوئی باہر کی طاقت

غالب نہ آ سکے گی۔ قلعہ اسلام منیع رہے گا اور یہ بارہ حکمران سب کے سب قریش سے ہوں گے۔''

اس حدیث میں خلافت علیٰ منہاج النبوہ کی نہیں خلافت علیٰ وجہ القوۃ کی خبر دی گئی ہے کہ باہر کی کوئی طاقت ان پر نہ چھا سکے گی۔ سو اس حدیث کا تیس سالہ خلافت کی حدیث سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

ڈھکو امام نوویؒ کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ تیس سالہ خلافت والی روایت بارہ خلفاء والی روایت کے خلاف ہے۔

لیکن افسوس کہ ڈھکو نے امام نوویؒ کا آگے دیا جواب یہاں نقل نہیں کیا۔ امام نوویؒ ڈھکو کی اس پیش کردہ عبارت کے آگے لکھتے ہیں

والجواب عن هذا ان المراد فی حدیث الخلافة ثلثون سنة خلافة النبوة.

افسوس کہ ڈھکو نے امام نووی کی پوری عبارت نقل نہ کرنے میں ایک صریح خیانت کی ہے۔

(نوٹ) حضورؐ نے ان بارہ خلفاء کے بارے میں فرمایا **کلهم من قریش** اس سے پتہ چلا کہ یہ بارہ قریش کی کسی ایک شاخ سے نہ ہوں گے ورنہ اس کا نام لیا جاتا۔ انہیں اس مقسم عالی میں نہ رکھا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ قریش کی دو شاخوں بنو عدی اور بنو تیم میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ قریش کی دو شاخوں بنو امیہ اور بنو ہاشم میں سے تھے۔ یہ بارہ خلفاء اگر سب بنو ہاشم میں ہونے ہوتے تو حضورؐ مقسم قریب چھوڑ کر ان کے مقسم بعید **کلهم من قریش** سے ان کا پتہ نہ دیتے' **کلهم من بنی هاشم** کہتے۔ بایں صورت **کلهم من قریش** سے کلام مقتضائے حال کے مطابق نہیں رہتا۔ شیعہ علماء اس ضرورت سے غافل نہ تھے۔ انہوں نے اسے پورا کرنے کے لیے حدیث میں ایک اضافہ کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ حدیث **کلهم من قریش** کی ان بارہ ہاشمی اماموں پر دلالت بہت ضعیف تھی ورنہ وہ اس صحیح حدیث میں یہ اپنے موضوع الفاظ داخل نہ کرتے۔

ان الائمة من قریش غرسوا فی هذا البطن من بنی هاشم (نهج البلاغة خطبه)

ترجمہ : ''بے شک امام قریش میں سے ہوں گے لیکن سب بنو ہاشم میں سے ہوں گے۔''

بے شک یہ بارہ امام سب قریش میں سے ہوئے لیکن بقول شیعہ یہ پودا بنی ہاشم میں لگایا گیا ہے۔ قریش کی دوسری شاخوں میں کسی میں امامت نہ آئے گی۔ پھر اس پر **کلهم من قریش** کی خبر بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔

حدیث کی واضح دلالت اس پر ہے کہ یہاں بارہ حکمرانوں کی خبر دی گئی ہے۔ بارہ درویشوں یا عالموں کی نہیں اور اس پر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں متفق ہیں کہ شیعہ کے تجویز کردہ بارہ اماموں میں سے نو ایسے اشخاص ہیں جن کو زندگی بھر حکومت کرنے کا ایک لمحہ نصیب نہیں ہوا اور وہ پھر بھی اپنے حلقوں میں خلفاء اور حکمران سمجھے جاتے رہے۔ شیعہ علماء کا یہ جواب کہ ان خلفاء سے خلافت غصب کر لی گئی مگر وہ خلیفہ پھر بھی رہے۔ اس پر پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جس خلیفہ سے خلافت

غصب کر لی گی ہو اسے سیاسی اور تمدنی زبان میں کیسے حکمران کہا جا سکتا ہے۔ حضرت حسنؓ تو خلافت چھوڑنے کے بعد کبھی خلیفہ نہ کہلاتے تھے۔ نہ حضرت حسینؓ نے اپنے مدینہ سے کوفہ کے سفر میں کہیں اپنے آپ کو خلیفہ کہا تھا۔

مولانا دبیر نے خلافت اور امامت کے عنوان سے تقریباً ستر صفحات پر بہت عمدہ اور مدلل بحث کی ہے۔ ڈھ گو نے اس پر بہت سے مقامات پر مولانا دبیر کی باتوں کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً ڈھ گو لکھتا ہے:

۱۔ ''یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام کی خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے سلسلہ میں ہماری حیثیت مدعی کی ہے۔ اس لیے بار ثبوت ہم پر عائد ہوتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ظاہری مسند خلافت پر قبضہ و تصرف اہل جماعت کا رہا ہے۔'' (تجلیات ص ۲۳۰)

۲۔ مولف نے جو یہ کہا ہے کہ شیعہ امام کو معصوم مانتے ہیں' یہ بالکل درست ہے۔ (ج ۲۳۳)

اس کے بعد مولف نے ص ۲۳۲ پر یہ سرخی باندھی ہے ''تیس سالہ خلافت والے نظریہ کا ابطال'' اس میں اس نے حدیث کو بارہ خلفاء والی حدیث سے ٹکرانے کی بحث کی ہے' ہم پیچھے اس کی پوری وضاحت کر آئے ہیں۔ اب مولف کی ان دو غلط باتوں پر کچھ اور غور کریں۔

حدیث اثنا عشر خلیفہ سے واضح ہے کہ خلافت نبویہ کا سلسلہ قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔' (ص ۲۳۲)

حدیث اثنا عشر خلیفہ میں یہ کہیں نہیں کہ خلافت نبویہ قیامت تک جاری و ساری رہے گی۔ یہ مولف کا جھوٹ ہے۔ حدیث میں صرف اتنا ہے کہ بارہ حکمران ایسے ہوں گے جن کے عہد حکومت میں اسلام عزیز و منیع رہے گا' بیرونی طور پر اس پر کوئی حملہ نہ ہو سکے گا۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہ قیامت تک خلافت نبویہ باقی رہے گی۔ یہ ڈھ گو کا صریح جھوٹ ہے۔

پھر مولف کا یہ کہنا بھی جھوٹ ہے کہ خلفاء کا بلا کم و کاست بارہ ہونا ضروری ہے' اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ خلفاء بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس بھی شمار کیے جائیں تو ان کی تعداد چالیس سے بھی زائد بنتی ہے' معلوم نہیں بارہ سے زیادہ کی نفی ڈھ گو نے حدیث کے کن الفاظ سے اخذ کی ہے یا یہ بھی حسب عادت اس نے جھوٹ ہی کہا ہے۔

اگر حضورؐ اور قیامت کے مابین صرف بارہ خلفاء کا ہی دور ہوتا تو قیامت کبھی کی آ چکی ہوتی۔ شیعہ نے اس مشکل پر قابو پانے کے لیے بارھویں امام حضرت مہدی کی عمر بہت طویل کر رکھی ہے اور انہیں غار سر من رای میں صدیوں سے آرام کرتے بٹھا رکھا ہے۔ وہ وہاں بالکل تندرست بیٹھے ہیں اور کبھی بیمار نہیں ہوئے' ان کے سفراء ان کے لیے باہر سے کھانا لاتے ہیں۔

بارہ خلفاء کی بحث میں مولف نے اتنی بے سروپا باتیں کی ہیں کہ اب ہمیں ان کے رد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مولف کا اپنا بیان ہی ان کا رد ہے۔

مولف نے آگے عصمت ائمہ کی سرخی باندھی ہے

عصمت ائمہ سے پہلے مولف کو مقام ائمہ کی سرخی باندھنی چاہیے تھی کہ قرآن و سنت کی روشنی میں امامت کسی آسمانی عہدے کا نام ہے جس طرح کہ نبوت و رسالت ایک آسمانی منصب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کسی کو اس آسمانی عہدے پر کھڑا کرتا ہے۔ اسے ایک زمینی ذمہ داری قرار دینا درست نہیں۔

اللّٰہ یصطفی من الملئکۃ رسلاً ومن النّاس (پ ۱۷ . الحج ۷۵)

ترجمہ: ''اللہ چنتا ہے فرشتوں سے پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی۔''

زمین پر صرف انبیاء و رسل ہی یہ آسمانی ذمہ داری پاتے ہیں۔ انسانوں کے لیے نبوت و رسالت کے سوا کوئی اور آسمانی عہدہ نہیں۔ ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اطلاع دے دی تھی کہ میری طرف سے تمہارے پاس رسول آئیں گے جو تمہیں میری باتیں بتائیں گے اور ان سے اصلاح بنی آدم کے سبق جاری ہوں گے۔''

یا بنی آدم امّا یأتینّکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی فمن اتقٰی واصلح فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون (پ ۸ الاعراف ۳۵)

ترجمہ: ''اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور تم پر وہ میری آیات پڑھیں تو (ان کی پیروی میں) جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا' نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے۔''

اصلاح بنی آدم کے لیے اگر کوئی اور بھی آسمانی منصب ہوتا تو وہ یہاں ذکر کر دیا جاتا۔ حضرت آدم کے جنت سے نکلنے پر ان کی پوری اولاد کو تسلی دی گئی کہ جب تمہارے پاس خدا کے بھیجے آئیں گے اور تمہیں وہ راہ بتائیں گے جس پر چل کر تم اپنے مسکن اصلی اور آبائی ترکہ کو واپس لینے کی تدبیر کر سکو' خدا سے ڈر کر جو اس راہ پر چلے تو پھر تمہارا مستقبل بالکل بے خوف و خطر ہے' پھر تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن و اطمینان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔''

نبوت و سالت کے اس آسمانی منصب کے آگے کئی درجات ہیں۔ سکول میں کئی ماسٹر ہوتے ہیں' انہی میں ایک ہیڈ ماسٹر کے مقام پر ہوتا ہے۔ لفظ ماسٹر سے جدا کر کے ہیڈ کے کوئی معنی نہیں رہتے' نہ ہیڈ اپنی ذات میں کسی عہدے کا نام ہے۔ یہ لفظ جب ماسٹر کے لفظ کے ساتھ لگے گا تو اس کا کوئی مطلب ظاہر ہوگا۔ اسے ماسٹر سے علیحدہ رکھ کر دیکھو تو یہ ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے الفاظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور ان سے ماسٹر کا ایک وصف سامنے آتا ہے۔ سو ہیڈ ماسٹر اپنی ذات میں کوئی منصب نہیں۔ یہ ایک وصف ہے جو ہیڈ کے لفظ سے اس کا ایک لغوی معنی دے رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ رب العزت کے ایک اولوالعزم پیغمبر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تربیت دی اور

بڑے بڑے امتحانوں سے گزارا اور ان سب میں انہوں نے علم میں مقام یقین اور عمل میں مقام صبر کا بہت اونچا کردار پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ کو اپنے وقت اور اپنے بعد کے رسولوں کی پیشوائی بخشی۔ اس پیشوائی کو عربی میں امامت کہتے ہیں۔ آئندہ آنے والے رسول سب آپ کی ملت پر رکھے گئے۔ آپ بطور ملت سب انبیاء و رسل کی امامت پا گئے۔

واذا ابتلٰی ابراھیم ربّہ بکلمات فاتمھن . قال انّی جاعلک للنّاس اماما. قال ومن ذریّتی قال لا ینال عھدی الظالمین . (البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: ''اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا' پھر اس نے ان سب باتوں کو پورا کر دکھایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا' میں تجھے تمام لوگوں کا (کل اولاد آدم کا) امام بناؤں گا۔ آپ نے کہا اور میری اولاد کو بھی؟ اللہ تعالیٰ نے کہا ان میں جو زیادتی کرنے والے ہوں گے ان سے یہ میرا عہد نہیں ہے۔''

نبی اپنے حلقے کے تمام انسانوں کا پیشوا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اولاد کو بھی یہ پیشوائی دی کہ آئندہ جتنے بھی پیغمبر ہونے تھے سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہوئے اور وہ بھی اپنے اپنے حلقے میں اپنے وقت کے امام بنے۔ یہاں بھی امام پیشوائی کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت خانوادہ ابراھیم میں حصر کر دی۔ سو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو بھی لوگوں کی یہ امامت مل گئی۔ انہیں عصمت نبوت و رسالت کی راہ سے اور امامت اپنے عمل و کردار اور علم و یقین کی راہ سے ملی۔

ووھبنا لہ اسحٰق ویعقوب وجعلنا فی ذرّیتہ النّبوّۃ والکتاب (پ ۲۰ العنکبوت ۲۷)

ترجمہ: ''اور دیے ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور رکھ دی بس اس کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب۔''

حضرت ابراہیم کو یہ مقام امامت وہبی طور پر نہیں' انہیں کئی امتحانات پاس کرنے پر ملا۔ جس طرح نبوۃ و رسالت ایک وہبی چیز ہے' کسبی نہیں۔ حضرت ابراہیم کو یہ مقام اس پر ملا کہ انہوں نے اپنے کردار سے یہ امتحانات پاس کر لیے۔ یہ امامت کوئی آسمانی منصب نہ تھا جو کسی کو وہبی طور پر ملے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب امتحانات پاس کیے تو اس مرتبۂ امامت پر آئے۔ سو امامت ایک اکتسابی چیز ہے۔

مقامِ امامت پر آنے والے کچھ صالحین بھی ہوئے

حضرت ابراہیم کی اولاد میں مقام امامت پر آنے والے سب پیغمبر ہی نہیں کچھ دوسرے صالحین بھی رہے۔ پیغمبر تو بوجہ نبوت معصوم تھے لیکن صالحین بوجہ صلاح ظالمین کی صف میں نہ رہے اور آئندہ آنے والے مومنین کو حکم دیا گیا کہ وہ جس طرح پیغمبروں کی راہ پر چلیں اسی طرح صدیقوں کی راہ بھی شہیدوں کی راہ بھی اور صالحین کی راہ بھی خدا سے طلب کریں اور اس پر چلیں۔ قرآن پاک کی رو سے یہ صالحین بھی مقام امامت پر مانے گئے ہیں اور مقامِ امامت واقعی کوئی آسمانی منصب نہیں ہے۔ یہ منصب علم صحیح اور صبر کامل پر پورا اترنے سے ہی ملتا ہے۔

وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بایاتنا یوقنون.

(پ ۲۱ السجدہ ۲۴)

ترجمہ: ''اور کیے ہم نے ان میں پیشوا جو راہ دکھاتے رہے ہمارے حکم سے اور رہے وہ ہماری باتوں پر پورے یقین سے۔''

یہ نہ سمجھا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو امام بنایا تو امامت ایک آسمانی مرتبہ ٹھہری۔ ایسا نہیں یہ جعل تکوینی ہے اور اللہ تعالیٰ اس طرح بادشاہ بھی بناتا رہا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وجعلکم ملوکاً واٰتاکم مالم یؤت احداً من العالمین. (پ ۶ المائدہ ۲۰)

سو جعلنا سے یہ دلیل پکڑنا کہ امام بھی خدا کا ہی انتخاب ہوتے ہیں جیسے انبیاء و رسل' یہ درست نہیں ہے۔ یہ اسی طرح ایک کلمہ جہالت ہے جیسے کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خود امام کے مقام پر کھڑا کیا تھا اس میں ابراہیمؑ کا اپنا کوئی کردار نہ تھا۔ امامت واقعی ایک آسمانی ذمہ داری تھی جو حضرت ابراہیم کو دی گئی۔ آپ کی امامت آپ کا بطور نبی اور رسول تمام جہان کی پیشوائی پانا تھا۔ آپ نبی بھی ہوئے اور امام بھی۔ جیسے آپ کی اولاد میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ الاسراء میں تمام انبیاء کی امامت کرتے دکھلائے گئے۔

قران کریم میں امامت کا لفظ کہیں کسی آسمانی عہدے کے طور پر نہیں آیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا آسمانی عہدہ صرف نبوۃ و رسالت کا تھا' وصف امامت آپ کا ایک زمینی کردار تھا۔ جب آپ تمام امتحانوں میں پورے اترے تو آپ کو تمام انسانوں کی پیشوائی دی گئی کہ آئندہ جو بھی نبی آئے وہ آپ کی ہی اولاد میں سے ہو۔ حضرت خاتم النبین پر جب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوا تو نبوت و رسالت پر مرتب ہونے والی کسی امامت کا بھی کوئی موقعہ نہ رہا۔ اب نہ کسی کو کوئی آسمانی منصب ملے گا نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی پر کوئی وحی یا آسمانی حکمنامہ اترے گا۔ اس امت میں امامت کا لفظ صرف اپنے لغوی معنی میں رہا ہے اور ہر مسلمان کو امید دلائی گئی کہ وہ قرآنی احکام پر عمل کر کے اس مرتبہ امامت پر آ سکتا ہے۔ بندوں کو یہ دعا تعلیم دی گئی وہ یہ دعا کریں اور قوت عمل سے وہ یہ مقام امامت پا لیں۔

ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریّتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما.

(پ ۱۹۔ الفرقان ۷۴)

ترجمہ: "اے ہمارے رب تو دے ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں تقویٰ رکھنے والوں کا امام۔"

سو یہاں امام پیشوا کے معنیٰ میں ہے اور ہر مومن شرائط پورا کرنے سے اس شان امامت پر آسکتا ہے۔ یہ کوئی آسمانی منصب نہیں ہے، جس کے لیے عصمت شرط ہو اور اس پر وحی بھی آتی ہو اور تمام انسانوں کے لیے اس کا ماننا ضروری ہو۔ یہ صرف نبوت ورسالت ہے، جس کا ماننا تمام انسانوں کے لیے ضروری ٹھہرے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے جب یہ مرتبہ امامت پایا تو آپ نے اس پر اللہ تعالیٰ کی اس طرح ثنا کی۔

الحمدللّٰہ الذی جعل الدین قواماً وجعل ابا ھریرۃ اماما. (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد اوّل ص ۳۶۵)

شیعہ علماء اس آیت سے گلوخلاصی نہ کرا سکے

شیعہ علماء اہل سنت کے اس استدلال سے اتنے دم بخود ہوئے کہ انہوں نے اس آیت کو ہی غلط کہہ دیا اور کہا آیت اس طرح نہ اتری تھی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی امتی اس طرح مقام امامت پانے کی دعا کرے۔

علی بن ابراہیم القمی (۳۰۴ھ) اپنی تفسیر میں لکھتا ہے، یہ آیت اس طرح نازل نہ ہوئی تھی، قرآن جمع کرنے والوں نے اسے اس طرح کر دیا ہے آیت اس طرح تھی:

ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریّتنا قرۃ اعین واجعل لنا من المتقین اماماً. (تفسیر قمی)

ترجمہ: "اے اللہ ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمارے لیے پرہیزگاروں میں سے امام بنا۔"

ڈھکو حضرت ابراہیم کی امامت کو نبوت ورسالت سے الگ ایک آسمانی عہدہ قرار دیتا ہے اور ختم نبوت کے بعد اس امامت کو نبوت کے بغیر جاری بتلاتا ہے۔ اس نوع امامت کی اس کے پاس بلکہ کسی بھی شیعہ عالم کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اب آپ ڈھکو کے عصمت ائمہ کے چند دلائل بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس نے تجلیات میں ص ۲۳۳ پر یہ سرخی بھی باندھی ہے۔

شیعہ کے عصمت ائمہ کے (پانچ) چند دلائل

شیعہ کے اس معرکۃ الآراء مسئلے پر اپنے صرف پانچ دلائل ہیں۔ ان میں پہلی دلیل صرف ایک طفیلی دلیل ہے کہ ان کے جو دلائل عصمت نبوت ورسالت پر ہیں وہی یہاں ہیں۔ دیکھئے مولف کس طرح اس میدان میں طفیلی بنا کھڑا ہے۔ یہ اس کی ان پانچ دلیلوں میں سے پہلی دلیل ہے۔ پانچویں دلیل اس نے اپنی ایک قلمی کتاب فرائد السمطین حموینی سے دی ہے۔ اس سے اس کی اس اہم ترین موضوع پر عجیب بے چارگی ظاہر ہو رہی ہے۔ دیکھئے قرآن کریم اور احادیث صحیحہ متواترہ سے وہ کس طرح تہی دامن کھڑا ہے، دوسری تیسری اور چوتھی دلیل میں اس نے جو تین آیتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک بھی اپنے موضوع پر صریح الدلالت نہیں ہے، جس سے امامت کے ایک آسمانی سلسلہ ہونے کی خبر ملے۔ تاہم اس کی یہ پانچ دلیلیں ہم یہاں پیش کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے

۱۔ عصمت ائمہ کی پہلی اجمالی دلیل تو یہ ہے کہ چونکہ تقرر ونصب امام کی غرض وغایت بالکل وہی ہے جو بعثت نبی ورسول کی ہوتی ہے.... لہذا جن دلائل وبراہین کی رو سے نبی اور رسول کے لیے عصمت ضروری ہے انہی دلائل سے امام کے لیے بھی عصمت لازمی ہے۔

جواب الجواب: ہم ختم نبوت کا عقیدہ رکھنے والوں کے لیے یہ دلیل پر کاہ کا وزن نہیں رکھتی۔ ختم نبوت کے بعد اگر پھر اسی سطح کے آسمانی پیشوا کی ضرورت تھی تو پھر ختم نبوت کا عقیدہ بالکل ڈرامہ سا بن کر رہ جاتا ہے کہ وہ سب ضرورتیں باقی ہیں جن کی وجہ سے نبوت اور رسالت کا سلسلہ باقی تھا لیکن اب وہ ضرورت نبی کے نام سے نہیں امام کے نام سے قائم ہوگی اور عصمت امام کے سایہ میں آگے بڑھتی دکھائی جائے گی۔ یہ عقیدہ تو اسلام کے عقیدہ ختم نبوت کو بالکل مٹا کے رکھ دیتا ہے۔

۲۔ آیت مبارکہ **لا ینال عھدی الظالمین ....** امامت رہے گی تو تیری اولاد میں۔ امامت کے درجہ رفیعہ پر صرف وہی فائز ہو سکے گا جس کا دامن ہر قسم کے گناہ کی آلودگی سے پاک ہو۔ (اس میں ڈھکو نے یہ نہیں بتایا کہ امامت ہے کیا جسے معصوم ہونا لازم ٹھہرے۔ ثبوت امام پر وہ کوئی بات کہہ نہیں سکا اور جس امامت کا وجود ہی نہیں وہ اس کے لیے عصمت ثابت کرنے کے درپے ہے۔)

جواب الجواب: یہ اس امامت سے متعلق ہے جو نبوت کے ساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم کی اولاد میں یہ مرتبہ بیشک انبیاء کو ملتا رہا۔ عصمت نبوت کی وجہ سے سب پیغمبر حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے آئے اور وہ یقیناً معصوم تھے۔ اور بے شک ان میں عصمت پائی گئی۔ لیکن ایسا کوئی امام نہیں پایا گیا جو نبی نہ ہو۔

شیعہ حضرات کو چاہیے کہ پہلے بدوں نبوت امامت کی کوئی نشاندہی کریں۔ اس فرضی امامت کے تصور پر عصمت امامت کا دعوے بناء فاسد علی الفاسد سے زیادہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے پاس تھے کہ وہ نبوت دیے گئے اور انہوں نے اپنے والد کو برملا کہا

یا ابت انی قد جاء نی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اھدک صراطا سویّا (پ ۱۶. مریم ۴۳)

ترجمہ: ''اے میرے باپ بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں سو تو میری پیروی میں چل؛ میں تجھے درست راہ پر لے چلوں گا۔''

تاہم ابھی تک بات کھلی نہ تھی کہ آپ کا دائرہ رسالت کہاں تک وسیع ہے اور آپ بھی نہ جانتے تھے کہ آپ مستقل شریعت دیے جائیں گے یا پہلے کے کسی رسول کی پیروی کریں گے۔ آپ ابھی توحید کی منادی کر رہے تھے کہ آپ کو گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپ کئی امتحانات سے گزرے اور آپ بفضلہٖ تعالیٰ ان میں پورے اترے۔ اب آپ کو نبوت میں مقام امامت دیا گیا۔ آپ اگر پہلے کے کسی رسول کی شریعت پر رکھے جاتے تو اس صورت میں آپ اس کے موتم ہوتے' عالمی سطح کے امام نہ ہوتے۔ آپ کی امامت اس خاص درجہ نبوت کا نام ہے۔ یہ نبوت سے علیحدہ کوئی اور آسمانی منصب نہیں۔ آپ نبوت کے مقام امامت پر بے شک کچھ امتحانوں کے بعد آئے مگر اصل نبوت کوئی کسبی چیز نہیں کہ اسے امتحانوں سے پاس کیا جا سکے۔ جن حضرات متقدمین نے یہاں امامت سے نبوت مراد لی ہے۔ ان کی امامت سے مراد نبوت کا وہ درجہ ہے کہ اس میں کسی پہلے پیغمبر کی پیروی لازم نہ ہو وہ تمام لوگوں کا امام ٹھہرے۔ حضرت ابراہیم اس طرح مقام امامت پر آئے۔ وہ نہ صرف اپنے بعد کے امام ہوئے بلکہ اپنی ذریت کے واسطہ سے آئندہ کے تمام بنی نوع انسان کے بھی امام ہوئے۔ حتیٰ کہ حضرت خاتم النبیین بھی جو تمام اولاد آدم کے سردار تھے وہ بھی انہی (حضرت ابراہیمؑ) کی ملت پر رہے۔

انّہ تعالیٰ لما امرہ ببعض التکالیف فلماً و فی بہا و خرج عن عہدتہا لا جرم نال النبوۃ والامامۃ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۱)

اس طرح حضرت ابراہیمؑ اس مقام امامت پر آئے جو نبوت کا ہی ایک درجہ ہے نہ یہ کہ نبوت کے بغیر بھی امامت کوئی آسمانی عہدہ ہے' نہ یہ درست ہے کہ حضرت علیؓ پر کسی نئے آسمانی عہدہ (امامت) کا دروازہ کھلا تھا۔ قرآن کریم سے اس عہدہ امامت کا جو نبوت کے بغیر ہو کہیں پتہ نہیں ملتا۔ یہ عہدہ امامت شیعہ کی صرف ایک اپنی اختراع ہے۔

چھٹی صدی کے جلیل القدر مفسر امام فخر الرازی (۶۰۶ھ) لکھتے ہیں

اما الامامۃ فلان المراد منہا ھھنا ھو النبوۃ . (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۴)

اور یہ بھی لکھتے ہیں:

قال اہل التحقیق المراد من الامام ھھنا النبی و یدل علیہ بوجوہ

(تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۶)

ترجمہ: ''اہل تحقیق یہی کہتے ہیں کہ امام سے یہاں مراد صاحب نبوۃ ہے اور اس پر کئی وجوہ سے

استدلال کیا گیا ہے۔''

اب اگلی صدی میں چلیں۔ علامہ ابن حیان الاندلسی الغرناطی (۶۵۴ھ) بھی اسی بات کو دہرا رہے ہیں

قال اہل التحقیق المراد بالامام ھھنا النبی ای صاحب شرع متبع لانہ لو کان تبعاً لرسول لکان ماموماً لذلک الرسول لا اماماً. (تفسیر البحر المحیط ج ۱ ص ۳۷۶)

ترجمہ: ''اہل تحقیق کہتے ہیں امام سے یہاں مراد نبی ہی ہے جس کی اپنی شریعت ہو اگر وہ کسی دوسرے رسول کا تابع ہوگا تو وہ نبی امام نہیں ماموم ٹھہرے گا اور حضرت ابراہیمؑ تو امام بتلائے گئے ہیں۔''

معلوم ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام مختلف امتحانات سے گزرنے کے بعد نبوت کے مقام امامت پر آئے تھے۔ اس سے اس امامت کا تصور دینا جو نبوت کے بغیر ہو ہرگز روا نہیں۔ ایسی امامت کوئی انتظامی عہدہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی آسمانی عہدہ نہیں ہے۔

پچھلے دور کے اہل تحقیق بھی اپنے انہی متقدمین کے پیچھے چلے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی (۱۲۲۵ھ) اپنی عربی تفسیر میں لکھتے ہیں (اردو ترجمہ ملاحظہ کیجئے)

امامت سے مراد اس مقام پر نبوت ہے یا عام معنی مراد لیے جائیں یعنی امام وہ ہے جس کی اقتداء کی جائے۔ سلطنت اور امامت بمعنی خاص مراد نہیں جیسے امامیہ مذہب والوں نے گھڑ رکھا ہے اور امامت کا اس معنی میں شرع اور لغت میں کہیں استعمال نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو امامت عامہ عطا فرمائی تھی حتیٰ کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ناطق ملا:

اتبع ملّۃ ابراھیم حنیفا . (النحل ۱۲۳)

''یعنی اتباع کرو ملت ابراھیم کا جو ایک کا ہو رہا تھا۔'' (تفسیر مظہری ص ۲۱۳ ج اوّل)

اسی صدی کے ایک دوسرے عالم علامہ آلوسی (۱۲۷۰ھ) بھی یہی لکھتے ہیں:

والامام اسم للقدوۃ الذی یوتم بہ و منہ قیل لخیط البناء امام .... وھو بحسب المفہوم و ان کان شاملاً للنبی والخلیفۃ وامام الصلوٰۃ بل کل من یقتدی بہ فی شئی ولو کان باطلاً ... ان المراد بہ ھھنا النبی المقتدی بہ فان من عداہ لکونہ ماموم النبی لیس امامتہ کامامتہ . (روح المعانی ج ص ۳۷۴)

ترجمہ: ''امام اس قائد کا نام ہے جس کی پیروی کی جائے اور یہ لفظ اگرچہ حسب مفہوم نبی خلیفہ اور امام نماز کو شامل ہے بلکہ ہر اس شخص کو جس کی کسی بات میں وہ غلط ہی کیوں نہ ہو پیروی کی جائے۔

یہاں امام سے مراد وہ نبی ہے جس کی اقتداء کی جائے۔ اب جو اس کے سوا ہوگا وہ نبی کا ماموم ہونے کی وجہ سے اس مقام پر نہ آسکے گا کہ اس کی امامت نبی کی امامت کی طرح ہو۔''

سو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام کا لفظ قرآن کریم میں کہیں بھی کسی آسمانی عہدہ کے لیے نہیں آیا۔ حضرت ابراہیم کے مقام امامت میں نبی ہی کی ایک شان امامت کا بیان ہے۔ پھر آپ کی امامت آپ کی اولاد میں بھی اس طرح رہی کہ آپ کے بعد جتنے پیغمبر بھی آئے وہ آپ کی ذریت سے ہی آئے۔ کہیں بھی کوئی نبی آیا تو یہ ضرور رہا کہ وہ آپ کی اولاد میں سے ہو۔ قرآن میں ہے:

وجعلنا فی ذریته النبوة والکتاب . (پ ۲۰ العنکبوت ۲۷)

ترجمہ: ''ہم نے اب ابراہیمؑ کی ہی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔''

شیعہ کا دین میں امامت بدوں نبوت کا تصور اصول دین میں ایک نئی چیز ہے اور یہ یقیناً دین میں ایک اضافہ ہے۔ قرآن کریم کہیں ایسی امامت کا پتہ نہیں دیتا۔ یہ شیعہ کا اس مجرد امامت کو امامت مع النبوۃ سے ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ امامت اصول دین میں سے کوئی چیز ہوتی تو قرآن کریم اہل باطل کے اماموں کا کہیں اس طرح ذکر نہ کرتا' شیعوں کی اصطلاح امامت کا تحفظ کرتا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وجعلنا هم ائمة يدعون الى النّار . (پ ۲۰ القصص ۴۱)

ترجمہ: ''اور ہم نے انہیں امام بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔''

کیا یہاں امام کا لفظ کوئی اصطلاح ہے یا یہ یہاں ایک لغوی معنی دے رہا ہے۔ کسی آسمانی عہدے کے الفاظ کیا کبھی اپنے لغوی معنی میں اس طرح جاری وساری رہ سکتے ہیں۔ وہ کونسا مرتبہ امامت ہے جس کے امام لوگوں کو جہنم کی دعوت دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا' امامت اسلام کی کوئی مقدس اصطلاح نہیں ہے۔ اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگوں پر آتی ہے۔

امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) کا ایمان افروز بیان

وثانیاً ....ان اللفظ یدل علی انه امام فی کل شئی والذی یکون کذلک لا بدو ان یکون نبیاً ثالثها ان الانبیاء علیهم السلام ائمة من حیث یجب علی الخلق اتباعهم قال الله تعالیٰ وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا (الانبیاء ۷۳) والخلفاء ایضا ائمة لانهم رتبوا فی المحل الذی یجب علی الناس اتباعهم وقبول قولهم واحکامهم والقضاة والفقهاء ایضا ائمة لهذا المعنی والذی یصلی بالناس یسمیٰ ایضاً اماما. لان من دخل فی صلوته لزمه الأیتمام به .... فثبت بهذا ان اسم الامام لمن استحق الاقتداء به فی الدین وقد یسمی بذلک ایضاً من یوتم به فی الباطل قال الله تعالیٰ وجعلنا هم ائمة یدعون الی النار الا ان اسم الامام لا یتناوله علی الاطلاق . (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۶)

اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے لیے لفظ امام دلالت کرتا ہے کہ آپ ہر بات میں امام ٹھہریں اور جو اس طرح امام ہو ضروری ہے کہ وہ نبی بھی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ انبیاء کرام اس لیے بھی امام ہیں کہ لوگوں پر ان کی اتباع واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا' ہم نے ان کو امام بنایا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ بتاتے تھے۔ خلفاء کرامؓ بھی ائمہ ہیں کیوں کہ وہ اس مقام پر رکھے گئے کہ لوگوں پر ان کی پیروی' ان کی بات ماننا اور ان کے فیصلے ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اور فقہاء کرام بھی اس معنی میں امام ہیں جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے اسے بھی امام کہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ جو بھی اس کی نماز میں شامل ہوگا۔ اس پر اس کی پیروی ضروری ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ امام اس شخص کا نام ہے جس کی پیروی دین میں لازم ٹھہرے بلکہ یہ نام کبھی اسے بھی مل جاتا ہے جس کی پیروی غلط کاموں میں کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے انہیں (باطل کے) امام بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔ ہاں باطل کی طرف دعوت دینے والوں کے لیے لفظ امام علی الاطلاق استعمال نہیں کیا جاتا۔ (اس کے لیے قرینہ حال ساتھ ہونا چاہیے)

معلوم ہوا یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص نبی ہو اور وہ امام نہ ہو۔ ہاں وہ انبیاء جو خود اپنی شریعت نہ لائے کسی دوسرے پیغمبر کے تابع رہے یا اس کی کتاب کے مطابق فیصلے دیتے رہے ان پر امام کا لفظ شاید نہ آسکے۔

صاحب شریعت انبیاء سب اعلیٰ مرتبہ امامت پر رہے

جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ یہ انبیاء اپنے اعلیٰ مراتب امامت پر رہے تو حضرت ابراہیمؑ کے لیے لفظ امام نبوت پر ہی محمول کیا جائے گا' نبوت کے بغیر ان کا یہ عہدہ امامت قائم نہیں ہو پاتا۔

امام فخر الدین رازی آگے یہ بھی لکھتے ہیں

فوجب حمل هذه الامامة علی النبوة (ایضاً ص ۳۷)

ترجمہ: ''یہاں امامت کو نبوت پر محمول ٹھہرانا واجب ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہا: **وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا** ۔ (پ۱۷۔ الانبیاء ۷۳)

تو معلوم ہوا کہ امامت کے لیے نص وارد ہونا ضروری نہیں۔ حضرت ابراہیم کے لیے نص وارد ہونا اسے ضابطہ نہیں بناتا۔ امام رازی لکھتے ہیں:

انما النزاع في انه هل تثبت الامامة بغير النص وليس في هذه الآية تعرض لهذه المسئلة لا بالنفي ولا بالاثبات.

آیت **وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا** میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ ان انبیاء کی امامت پر کہیں نص وارد ہوئی تھی۔

ائمہ سلطنت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ معصوم ہوں

صرف ان ائمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ شانِ عصمت رکھتے ہوں جو نبوت کے ساتھ امامت پر آئیں لیکن جو ائمہ حکومت بغیر نبوت ہوں ان کا معصوم ہونا ضروری نہیں' ہاں یہ ضروری ہے کہ کھلے طور پر وہ کسی گناہ میں ملوث نہ ہوں' پہلے وہ کفر میں بھی رہے ہوں مگر اب وہ توبہ کر چکے ہوں تو وہ مسلمانوں کے ائمہ ولایت ہو سکتے ہیں۔ نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس پر دعوے نبوت سے پہلے بھی کفر کا کوئی لمحہ نہ گزرا ہو لیکن ائمہ حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں' کسی کا کفر سے نکل کر اب اسلام قبول کرنا اس سے پہلے کی سب آلودگیاں دھو دیتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا:

الاسلام يهدم ما كان قبله والهجرة تهدم ما كان قبلها.

ترجمہ: ''اسلام لانا اس سے پہلے کے تمام گناہ گرا دیتا ہے۔ اور ہجرت بھی اپنے سے پہلے کے تمام گناہ گرا دیتی ہے۔''

حضرت علی المرتضیٰؓ نے شراب حرام ہونے سے پہلے اگر کبھی شراب پی ہو تو اس سے یہ مسئلہ کشید نہ کیا جا سکے گا کہ اب آپ معاذ اللہ امام سلطنت بننے اور خلافت کے لائق نہیں رہے۔ عصمت تامہ کاملہ صرف نبوت کے لیے شرط ہے۔ امام سلطنت کے لیے نہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا:

فاني لست في نفسي بفوق ان اخطئ ولا امن ذلك من فعلي الا ان يكفي الله من نفسي ما هو املك به منه. (نهج البلاغه ج ۲ خطبه ۲۱۱ ص ۲۲۷)

ترجمہ: ''میں تو اپنے آپ کو اس سے بالا نہیں سمجھتا کہ خطا کروں اور نہ اپنے کسی کام کو لغزش سے محفوظ سمجھتا ہوں مگر یہ کہ خدا میرے نفس کو اس سے بچائے جس پر وہ مجھ سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔''

نظم سلطنت کے لیے تو کوئی امیر چاہیے جو اچھا ہو یا برا اس کے لیے معصوم ہونے کی طلب کیوں کریں۔ آپ نے فرمایا **لا بد للناس من امير بر او فاجر** (ایضاً ص ۸۷)

ہاں ائمہ ولایت کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھلے طور پر کسی بڑے گناہ میں آلودہ نہ ہوں عقد حکومت کے بعد وہ فسق پر آ جائیں تو امام فسق سے معزول نہیں ہوتا اسے نصیحت کی جائے لیکن اسے ایک دفعہ ماننے کے بعد پھر اس سے اس کے فسق کے بعد بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ اور پہلا اس کا کوئی بڑا گناہ سامنے ہو تو ضروری ہے کہ وہ اب اس سے ہٹ چکا ہو۔ شروع سے ہر قسم کے گناہ سے دور رہنا یہ صرف نبوت کی شان ہے۔ ائمہ حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ معصوم ہوں جب کہیں کہ ظالمین کو یہ حق حکومت نہیں پہنچتا تو یہاں لفظ ظالمین کافروں کے لیے ہوگا۔ **والكافرون هم الظالمون** (پ۳ البقرہ، ۲۵۴) یہ معصومین کے لیے نہ ہوگا۔

اس تفصیل سے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں' شیعہ کا امامت کا موقف کسی طرح قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ سو اب ان کا اپنے عقیدہ عصمتِ ائمہ سے بحث کرنا ایک فضول محنت ہے۔ کسی چیز کی جب بنیاد ہی نہ ہو تو اس کی فروع سے بحث کہیں کار دانشمندی نہیں۔ جب بانس ہی نہ ہو تو بانسری کیا بجے گی۔ البتہ ان ملنگوں کے چیلے اس پر بدستور بجتے رہیں تو ہم شاید انہیں نہ روک سکیں۔

ڈھکو کی حوالہ دینے میں ایک اور خیانت

ڈھکو نے اس آیت کی بحث میں لکھا ہے:

''امام رازی جیسے بزرگ نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ آیت مبارکہ امام کی ظاہری اور باطنی عصمت پر دلالت کرتی ہے۔ **ومقتضى الآية ذلك اي وجوب العصمة ظاهراً و باطناً الا انا تركنا اعتبار الباطن**'' (ص ۲۳۴)

تفسیر کبیر میں امام رازی کی اصل عبارت یہ تھی:

اما الشيعة فيستدلون بهذه الآية على صحة قولهم في وجوب العصمة ظاهراً و باطناً واما نحن فنقول مقتضى الآية ذلك الا ان تركنا اعتبار الباطن فتبقى العدالة الظاهرة معتبرة. (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۹)

ترجمہ: ''شیعہ اس آیت سے اپنی بات کی صحت پر دلیل لاتے ہیں کہ امام کی عصمت ظاہراً اور باطناً ضروری ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں' آیت اس کی مقتضی ہے کہ امام وہی ہو جو ظالمین میں سے نہ ہو) مگر ہم امام میں یہ شرط صرف ظاہر کے اعتبار سے لگاتے ہیں' باطنی عدالت کی شرط ہمارے ہاں نہیں

ہے۔(ہم اسے معصوم کے درجے میں نہیں رکھتے۔) سو امام کے لیے صرف ظاہری عدالت کافی ہے۔(یہ کوئی آسمانی عہدہ نہیں کہ اس میں عدالت باطنی بھی شرط ٹھہرے۔)

امام رازیؒ کی بات ہم نے آپ کے سامنے ان کی مرادات سے واضح کر کے رکھ دی ہے۔اب آپ ڈھ گو کے نقل کردہ حوالے کو اس کے الفاظ میں دیکھیں اور اس کی اس جرأت وخیانت کی داد دیں۔

چہ دلاوراست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ **ولیست باول قارورة کسرت فی الاسلام۔**

مسئلہ یہی ہے کہ تم ان لوگوں کی طرف رجوع نہ کرو جو ظلم کے مرتکب ہوں۔اپنے امام اور پیشوا انہی کو بناؤ جن کی ظاہری عدالت مجروح نہ ہو۔وہ کسی کھلے گناہ میں نہ گھرے ہوں۔ان کے باطن سے بحث کرنے کا تمھیں کوئی حق نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النّار ومالکم من دون اللّٰہ من اولیاء.

(پ ۱۲ ھود ۱۱۳)

ترجمہ: ”اور نہ جھکو ان لوگوں کی طرف جو ظالم ہیں، پھر تم کو بھی وہ آگ اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور نہیں کوئی تمہارا اللہ کے سوا مددگار۔“

سو جن میں یہ کلمہ توحید (کہ نہیں تمہارا اللہ کے سوا کوئی معبود) پایا جائے اپنے امام انہی میں سے بناؤ۔یہی وہ کلمہ اسلام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت میں چھوڑا۔

وجعلھا کلمة باقیة فی عقبه لعلھم یرجعون . (پ ۲۵ الزخرف ۲۷)

ترجمہ: ”اور یہی بات ابراہیم اپنی اولاد میں باقی چھوڑ گئے تا کہ وہ رجوع کریں۔“ (ایک دوسرے سے توحید کا بیان اور دلائل سن کر اس طرف رجوع ہوتا رہے)

دنیا سے اگر انصاف رخصت نہیں ہو گیا تو خدارا ڈھ گو کی اس کھلی خیانت پر نہ صرف افسوس کریں بلکہ اس کی علمی بے چارگی پر بھی اس سے تعزیت کریں۔وہ کس طرح ایک فرضی آسمانی امامت کے غلط دعوے میں اس علمی خیانت پر اترا ہوا ہے کہ جو بات امام رازی نے **اما الشیعة فیستدلون بھٰذہ الایه** کے الفاظ سے شروع کی تھی وہ اسے امام رازی کے نام سے ان لفظوں میں پیش کر رہا ہے۔

امام رازی جیسے بزرگ نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ آیت مبارکہ امام کی ظاہری و باطنی عصمت پر دلالت کرتی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ ڈھ گو کو تسلیم اور تردید کا فرق معلوم نہیں ورنہ جس بات کی یہاں امام رازی نے تردید کی ہے اسے وہ تسلیم کرنے سے تعبیر کر رہا ہے۔پھر اس کی بوکھلاہٹ دیکھئے کہ علامہ فخر الدین رازی کو اس تسلیم کرنے پر وہ بھی امام تسلیم کر رہا ہے۔حالانکہ اس کے عقیدے میں امام رازی معصوم نہ تھے۔

صورت عمل کچھ بھی ہو شیعی عقیدۂ امامت ثابت کرنے میں یہاں ڈھ گو کی بے چارگی اظہر من الشمس اور ابین من الامس ہے۔

ان کنت لا تدری فتلک مصیبة

وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

ڈھ گو نے عصمت ائمہ پر پانچ دلیلیں کھڑی کی تھیں۔پہلی دلیل اس کی محض طفلی درجے کی تھی جس میں صرف ضرورت نبوت کا سہارا لیا گیا ہے۔اور اس نے اس پر امامت کی نیو رکھی ہے۔عصمت ائمہ پر دوسری دلیل ڈھ گو نے اس امامت سے لے لی جو نبوت کے ساتھ ہو اور وہ حضرت ابراہیمؑ کی امامت تھی۔ہم اس کی متقدمین اور متاخرین سے پوری تفصیل ذکر کر آئے ہیں۔مولف نے تیسرے اور چوتھے نمبر پر دو اور آیتیں پیش کی ہیں۔ہم ان پر بھی کچھ ضروری بحث کیے دیتے ہیں۔واللہ ولی امرہ۔

۳۔ **اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم . ... کونوا مع الصادقین** میں اہل ایمان کو اولی الامر اور صادقین کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا گیا ہے جو کسی زمان ومکان اور کسی حالت سے مقید نہیں اور جس کی اطاعت مطلقہ کا اس طرح حکم کیا جائے وہ معصوم ہی ہو سکتا ہے۔

جواب الجواب : ان دونوں آیات میں نہ کہیں امام کا ذکر ہے نہ اس کی اطاعت مطلقہ کا کہیں حکم ہے۔یہ شیعہ اپنے آپ کو بڑے فخر سے امامی کہتے ہیں۔اور جب وہ امامت ثابت کرنے پر آتے ہیں تو انہیں قرآن کریم میں کہیں ایک مقام پر بھی ایسے امام یا اس قسم کی امامت کا نشان نہیں ملتا جو نبوت کے بغیر ہو۔عقائد ثابت کرنے کے لیے صریح دلیل درکار ہوتی ہے۔اور وہ شیعہ کے پاس نہیں ہے۔

آیت میں اولی الامر کے لیے لفظ اطیعوا وارد نہیں۔اسے اسی اطیعوا کے تحت رکھا گیا ہے جو الرسول کے لیے وارد ہے۔سو معلوم ہوا اس کی اطاعت مطلق نہیں مشروط ہے۔بایں شرط کہ اس کا کوئی حکم خدا اور اس کے رسول کے خلاف نہ ہو اور یہ شرط اسی صورت میں لگ سکتی ہے کہ اولی الامر اصولاً معصوم نہ ہوں۔

آیت ھٰذا میں تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے

(۱) اللہ کی اطاعت (۲) اس خاص رسول کی اطاعت (۳) اور اولی الامر کی اطاعت۔

اللہ اور رسول کے لیے تو مستقل طور پر اطیعوا کا لفظ آیا ہے۔اولی الامر کو اس اطیعوا کے تحت رکھا گیا جو الرسول کے لیے وارد تھا۔یہ اس لیے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت تو مطلق رہے اسے کسی شرط سے مشروط نہ سمجھا جائے۔لیکن اولی

الامر کی صرف وہی بات لائق قبول ہو جو اس رسول کی تعلیم کے موافق ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ اولی الامر کی اطاعت مطلق نہیں اللہ اور رسول کے مطابق ہونے سے مقید ہے۔ ان کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے اور ان سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بصورت تنازع اسے قرآن وسنت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اگر خدا اور اس کے رسول پر صحیح معنوں میں ایمان قائم ہو تو بات یونہی کرنی پڑے گی۔ آخری فیصلہ صرف خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا ہوگا۔ اولی الامر اگر معصوم ہوتے تو ان سے اختلاف کی اس طرح اجازت نہ دی جاتی۔ معلوم ہوا اولوالامر اپنی ذات میں مقام عصمت پر نہیں۔ معصوم سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا اور یہاں قرآن پاک ان سے اختلاف کا حق دے رہا ہے۔

شیعہ کا اس پر ایک غلط موقف

یہاں تنازعہ سے وہ تنازع مراد ہے جو عام مسلمانوں کا آپس میں ہو۔ وہ تنازع مراد نہیں جو عوام کا اپنے اولی الامر سے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ ان کی اطاعت کا حکم دیں اور ساتھ ہی ان سے اختلاف کی بھی اجازت دیں۔

الجواب: ایسا ہوتا تو پھر اس امر مختلف فیہ کو بھی تینوں کی طرف لوٹایا جاتا اور آیت یوں ہوتی

فان تنازعتم فی شئی فردّوہ الیٰ اللّٰہ والیٰ الرسول والیٰ اولی الامر منکم.

جب اس اختلاف میں آخری بات صرف اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹنے کی رکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں اولی الامر منکم کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہاں تنازع سے وہی تنازع مراد ہو جو کسی مسلمان کا خود ان اولی الامر سے ہو ورنہ اپنے باہمی اختلافات میں تو اولی الامر سے فیصلہ لینا اور ضروری ہو جاتا ہے اور وہ اس میں کتاب وسنت کے پوری طرح پابند ہوں گے۔ اس آیت میں اللہ سے مراد اس کی کتاب اور رسول سے مراد اس کی سنت لی جائے گی۔

ایک اور سوال اور اس کا جواب

اس دور کے خام علم شیعہ علماء تو بے شک یہ کہتے ہیں کہ یہاں وہ تنازع مراد نہیں جو کسی مسلمانوں کا اپنے اولی الامر سے ہو لیکن ان کے پچھلے علماء بھی تو اہل سنت کے اس استدلال کا کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیتے ہوں گے۔ اگر ان کی کسی معتبر کتاب میں اس کا کوئی اور جواب دیا گیا ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔

الجواب: ان کے تیسری صدی کے مرکزی مفسر علی بن ابراہیم القمی (۳۰۴ھ) جو محمد بن یعقوب کلینی (۳۲۸ھ) کے بھی استاد ہیں وہ اس آیت کو غلط قرار دیتے ہیں کیونکہ اس سے عوام کو اولی الامر سے تنازع کا حق مل رہا ہے اور اس سے عصمت ائمہ باقی نہیں رہتی۔ وہ بتلاتے ہیں کہ آیت اصل میں یوں تھی۔ علامہ قمی حضرت امام جعفر صادقؒ کے نام سے اسے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ آیت اس طرح اتری تھی۔

عن ابی عبداللّٰہ علیہ السلام قال نزلت: وان تنازعتم فی شئی فارجعوہ الی اللّٰہ والی الرسول و الیٰ اولی الامر منکم. (تفسیر قمی ص ۴۶)

ترجمہ: اور اگر تمہارا کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ کی طرف، اس کے رسول کی طرف اور اولی الامر کی طرف لوٹاؤ۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے شیعہ علماء کو کم از کم یہ تو مان لینا چاہیے کہ آیت اگر اسی طرح ہے جیسا کہ وہ اس قرآن میں اب تک لکھی آرہی ہے اور پڑھی جارہی ہے تو اس کی روشنی میں شیعہ کا عقیدہ عصمت ائمہ کسی درجے میں باقی نہیں رہتا اور جب قرآن کریم کی محفوظیت ہی مجروح ہوگئی اور آیت کسی اور طرح نازل ہوئی بتلائی گئی تو شیعہ کی پیش کردہ آیت کے آخری حصہ فردّوہ الی اللّٰہ والرسول پر عمل کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اس دور میں ردّ الی اللّٰہ سے مراد یقیناً اس تنازعہ کا اس موجودہ قرآن کی طرف لوٹانا ہے اور ردّ الی الرّسول سے مراد اس کا سنت کی طرف لوٹانا ہے۔ سو اگر قرآن ہی مجروح ہو پایا تو اب فردّوہ الی اللہ کی تو کوئی عملی صورت باقی نہ رہی اور فردّوہ بھی اصل آیت میں فارجعوہ نکلا۔ (استغفر اللہ)

امام رازیؒ پر اولی الامر کو معصوم ماننے کی تہمت

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں قرآن کریم کی آیت اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم میں مومنین پر تین اطاعتیں فرض ہیں۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ مومنین کی حکم خداوندی، حکم رسالت اور وقت کے اولی الامر تک رسائی ہو۔ اللہ اور اس کے رسول برحق کے احکام تو قرآن وسنت میں مل سکتے ہیں۔ لیکن امت کی وقت کے اولی الامر تک رسائی ممکن نہ ہو تو اس آیت پر عمل کبھی نہ ہو سکے گا۔ امام غائب پر عقیدہ رکھنے والے اس کی کس طرح پیروی کر سکیں گے، اگر کہو کہ سفراء اربعہ کے ذریعہ تو ہم کہیں گے کہ اس سے تو ان سفراء کی عصمت کا بھی اقرار کرنا پڑے گا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں یہاں اولی الامر سے مراد کوئی امام غائب نہیں، اولی الامر وقت کے وہ اہل حل وعقد ہیں جو کتاب وسنت کے مطابق احکام صادر کریں۔ اور اس لیے بھی کہ شیعہ کے ہاں بھی امام وقت ایک ہوتا ہے اور اسی کی پیروی اس کے دور امامت میں فرض ہے اور یہاں ولی الامر کی پیروی نہیں اولی الامر (جمع) کی پیروی کا حکم ہے اور وہ وقت کے حل وعقد ہی ہو سکتے ہیں صرف اسی میں ان تین اطاعتوں کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

انا بیّنا انّ اللّٰہ تعالیٰ اوجب طاعۃ اولی الامر فی ھٰذہ الآیۃ قطعاً و ایجاب طاعتھم قطعاً مشروط بکوننا عارفین بھم قادرین علی الوصول الیھم

والاستفادة منهم ونحن نعلم بالضرورة انا فى زماننا هذا عاجزون عن معرفة الامام المعصوم عاجزون عن الوصول اليهم عاجزون عن استفادة الدين والعلم منهم واذا كان الامر كذلک علمنا ان المعصوم الذى امر الله المومنين بطاعته ليس بعضاً من ابعاض الامة ولا طائفة من طوائفهم ولما بطل هذا وجب ان يكون ذلک المعصوم الذى هوالمراد بقوله و اولى الامر منكم اهل الحل والعقد من الامة وذلک يوجب القطع بان اجماع الامة حجة. (تفسیر کبیر ج ۱۰ ص ۱۱۶)

ترجمہ: ”ہم نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اولی الامر کی اطاعت قطعی پیرایہ میں واجب کی ہے اور ان کی پیروی قطعی درجے میں لازم کرنا اس سے مشروط ہے کہ ہم انہیں پہچانتے ہوں۔ ان تک پہنچنے پر قادر ہوں اور ان سے استفادہ کر سکیں اور یہ بات بھی ہم سے چھپی نہیں کہ ہم ایک ایسے دور میں ہیں کہ کسی امام معصوم کو پہچانتے نہیں اور ان تک پہنچنے سے قطعاً عاجز ہیں۔ ان سے دین اور علم کا کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ جب صورت حال یہ ہے تو ہم نے جانا کہ وہ معصوم کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اس امت کا کوئی حصہ نہیں اور نہ وہ اس امت کے گروہوں میں سے کسی گروہ کا نام ہے جب یہ صورت حال باطل ٹھہری تو لازم آیا کہ اس معصوم سے مراد وہ اولی الامر ہوں جو اس امت کے ہی اہل حل وعقد ہوں اور اس سے یہ بات قطعی طور پر لازم آتی ہے کہ اس امت کے اہل حل وعقد کا اجماع حجت شرعی ہو۔“

امام رازی یہاں چھٹی صدی کا حال بیان کر رہے ہیں کہ کوئی امام معصوم ہمیں مل نہیں رہا (اور شیعہ نے اس وقت کا جو امام معصوم تجویز کر رکھا ہے وہ ایک غار میں چھپے بیٹھا ہے) سو ان کے موقف کے مطابق ہم اس آیت کی تیسری اطاعت پر کسی طرح عمل پیرا نہیں ہو پاتے۔ سو یہاں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اولی الامر سے اہل حل وعقد مراد لیے جائیں اور ان کی بات بھی صرف اسی صورت میں لائق قبول ٹھہرے کہ کتاب وسنت سے نہ ٹکرائے۔ ان کی اطاعت بے شک علی سبیل القطع ہے لیکن علی سبیل الاطلاق نہیں۔ فردوہ الی اللہ والرسول سے مقید ہے۔ اس سے بات بالکل واضح ہوگئی کہ امت کے اہل حل وعقد کا اجماع کسی غلط بات پر ہو ہی نہیں سکتا۔ قدرت کے تکوینی ہاتھ اسے وہیں رد کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کی پیروی فرض کی تو یہ تبھی ہو سکے گا کہ ان کا اجماع معصوم ہو۔ وہ فرداً فرداً تو معصوم نہیں لیکن ان کا اجماع معصوم ہو۔

ومن امر الله بطاعته على سبيل الجزم والقطع لابد ان يكون معصوماً عن

الخطاء. (ایضاً)

ترجمہ: ”اور وہ جن کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ علی سبیل الجزم والقطع دیں ضروری ہے کہ وہ خطاء سے معصوم ہوں۔“

جب اجماع اہل حل وعقد معصوم ہے اور وہ سب کے سامنے عمل میں آ سکتا ہے اور شیعہ جو امام معصوم تجویز کرتے ہیں وہ کسی غار میں چھپا ہے اور اس کی قوم بھی اسے امام غائب سے یاد کرتی ہے تو اسی صورت میں امام رازی کے ہاں اس آیت پر عمل کرنے کی اور کوئی صورت نہیں رہی مگر یہ کہ اجماع اہل حل وعقد کو معصوم مانا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ وہ ان پر خدا کی حفاظت کا ہاتھ ہے۔ ایسا نہ مانا جائے تو قرآن کریم کی یہ آیت عملاً بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔

امام رازی نے اپنے اس بیان میں صریح طور پر شیعہ امام معصوم کے عقیدے کی تردید کی ہے۔ آپ آگے بھی ایک جگہ لکھتے ہیں:

وان حمل الآية على الائمة المعصومين على ما تقوله الروافض ففى غاية البعد لوجوه احدها ما ذكرنا. ان طاعتهم مشروطة بمعرفتهم وقدرة الوصول اليهم فلو اوجب علينا طاعتهم قبل معرفتهم كان هذا تكليف مالا يطاق. (ایضاً ص ۱۱۷)

ترجمہ: ”اور اس آیت کو ائمہ معصومین پر محمول کرنا جیسا کہ رافضی لوگوں کا خیال ہے کئی وجہ سے بہت ہی دور کی بات ہے۔ ایک یہ کہ ان کی اطاعت ان کی معرفت سے اور ان تک رسائی پانے سے مشروط ہے۔ اگر ہم پر ان کی اطاعت ان کے جاننے سے پہلے واجب ٹھہرائی جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور یہ ایک ایسا کام ہے جو انسان کی قدرت سے باہر ہے۔“

یہ عجیب مذہب ہے جس پر عمل کسی صورت میں راہ نہ پا سکا اور سوائے اس کے کہ ہم انتظار امام میں بیٹھے رہیں اور کسی طرف چل نہ سکیں۔

اب ان تصریحات کے ہوتے امام رازی پر بعض افراد امت کو امام معصوم ماننے کی تہمت اور ڈھ گو کی ان سے عقیدہ عصمت ائمہ کی تصدیق لینے کی حرکت کیا علم سے ایک کھلا مذاق نہیں انہیں اپنی تائید میں پیش کرنا ڈھ گو کا ایک صریح جھوٹ ہے۔ اب ڈھ گو کی پیش کردہ چوتھی آیت پر بھی غور کر لیجیے۔

عصمت ائمہ پر ڈھ گو کی پیش کردہ چوتھی دلیل

انّما يريد الله ليذهب عنكم الرّجس اهل البيت ويطهر كم تطهيراً.

(پ ۲۲ الاحزاب ۳۳)

ترجمہ: ''اللہ ہی چاہتا ہے اے اہل بیت کہ تم سے دور کرے گندی باتیں اور پاک کردے تمہیں پاکیزگی سے۔''

اس میں سرے سے خلافت کی بحث نہیں۔ حضورؐ نے چار افراد کو ساتھ لے کر ان پر یہ آیت پڑھی اور ان چار کو بھی اہل بیت میں داخل فرمایا۔ ان چار میں سیدہ فاطمہؓ بھی تھیں اور ظاہر ہے کہ وہ اہل خلافت میں سے نہ تھیں۔ ورنہ تاریخ میں کہیں تو انہیں خلیفہ بنانے کی تجویز کی گئی ہوتی۔ شیعہ بھی امام اول حضرت علیؓ کو مانتے ہیں' حضرت فاطمہؓ کو نہیں تو جب یہ آیت خلافت کا موضوع نہیں تو معلوم نہیں ڈھ گو کس علمی بیچارگی میں اس آیت کو پیش کر رہا ہے۔

وہ کونسا رجس تھا جسے اہل بیت سے دور کیا گیا؟

ہم اہل بیت کو کسی گناہ یا ناپاکی میں گھرا نہیں پاتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ شروع سے ہر رجس سے پاک ہیں۔ ایسا ہوتا تو اس طرح نہ کہا جاتا **انما یرید اللّٰه لیذھب عنکم الرّجس** بلکہ یوں کہا جاتا **اراد اللّٰه ان یذھب عنکم الرّجس**۔ شروع سے ہر گناہ سے دور رہنا صرف انبیاء کی شان ہے اور انہیں ہی معصوم کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اہل بیت کو اب سے ہر رجس سے پاک رکھنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے' آیت کے سیاق و سباق میں حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کا ذکر ہے۔ یہ قرآنی اہل بیت ہیں ان کی پہلے سے جو شان اور فضیلت ہے پہلے وہ ذکر کی گئی ہے۔ **یا نساء النبی لستن کاحد من النساء**۔ یہاں اب بتایا گیا ہے کہ مستقبل کے لیے بھی خدا کا ارادہ ہے کہ انہیں ہر طرح کے علمی اور عملی رجس سے پاک رکھے۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ اس آیت میں نہ خلافت کا ذکر ہے نہ کسی آسمانی عہدہ امامت کا نہ بطور اولی الامر اس میں کسی ہونے والے حکمران کی خبر ہے اور مولف کا بھی اس سے استدلال کسی عہد امامت کے لیے نہیں صرف عصمت ائمہ ثابت کرنے کے لیے ہے۔

الجواب: اس میں عصمت کا کوئی لفظ نہیں۔ **یطھرکم تطھیراً** کے الفاظ سے انہیں آئندہ پاک رکھنے کی خبر دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ بدریوں کے لیے بھی ملتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے جب ان پر میدان بدر میں سکینہ اتارا تو انہیں خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان سے شیطان کی ہر نجاست دھو دے گا:

اذ یغشیکم النعاس امنة منه وینزل علیکم من السماء ماءً لیطھرکم به ویذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط علٰی قلوبکم ویثبت به الاقدام. (پ ۹ الانفال ۱۱)

ترجمہ: ''اور جب ڈال دی اس نے تم پر اونگھ اپنی طرف سے بہ پیرایہ تسکین۔ اور اتارا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تم کو پاک کردے اور دور کرے تم سے نجاست شیطان کی اور مضبوطی دے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدم۔''

لیذھب عنکم الرجس اھل البیت اور **یذھب عنکم رجز الشیطان** ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ سوان سے ہم اہل بیت یا بدری صحابہ کے لیے عقیدہ عصمت کشید نہیں کرسکتے۔ ہر مسلمان وضو کرتے ہی **لیطھرکم** سے نوازا جاتا ہے۔

ما یرید اللّٰه لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتمّ نعمته علیکم.

(پ ٦ المائدہ ٦)

ترجمہ: ''اور اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاکیزگی بخشے اور پوری کرے اپنی نعمت تم پر۔''

اب یہ بات آپ کے سامنے کھل گئی کہ شیعہ حضرات اس آیت سے اپنا عقیدہ عصمت ائمہ کشید کرنے میں کلی طرح ناکام ہیں۔ عصمت صرف شانِ نبوت ہے۔ حضرت علیؓ کے اپنے پیروان کے بارے میں عقیدہ عصمت نہ رکھتے تھے ورنہ تحکیم کے موقع پر وہ ان پر گناہ کبیرہ کے ارتکاب کا الزام نہ لگاتے اور ان کی جماعت کا ایک حصہ ان سے نکل کر اپنا خارجی کیمپ علیحدہ نہ لگاتا۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے کسی حلقہ میں عقیدہ عصمت اولی الامر نے کوئی راہ نہ پائی تھی۔ امام جعفر صادقؒ (۱۴۸ھ) کے دور تک ائمہ اہل بیت کے حلقوں میں اس عقیدہ کی کوئی شہرت نہ تھی نہ ان کے حلقوں میں بیٹھنے والے اکثر لوگ ان کے بارے میں اس عقیدہ کے قائل تھے۔

خود اثنا عشریوں کی اپنی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی تک ان کے اپنے حلقوں میں عقیدہ میں بھی عصمت ائمہ کو کوئی علمی شہرت حاصل نہ تھی اور نہ ان میں اسے کوئی تواتر حاصل تھا۔

عقیدہ عصمت کے متواتر نہ ہونے پر باقر مجلسی کی شہادت

ملا محمد باقر مجلسی لکھتا ہے:

جمعے از راویاں کہ در اعصار ائمہ بودہ اند اعتقاد بہ عصمت ایشاں نداشتند

مولف اپنے عقیدہ امامت کو جب کسی آیت یا حدیثِ متواتر سے ثابت نہیں کرسکا' تو اب اس کا عصمت ائمہ کا اعلان بناء فاسد علی الفاسد سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ اس نے اپنے اس فرضی عقیدے پر جن پانچ وجوہ سے استدلال کیا ہے ہم اس پر پہلے کچھ بحث کر آئے ہیں۔ پہلی وجہ اس کی محض ایک طفیلی دلیل تھی کہ جیسے انبیاء معصوم ہیں اسی طرح ائمہ بھی خدا کے چنے ہوتے ہیں۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے نمبر پر جو اس نے تین آیتیں پیش کیں ان میں سے کسی میں بدوں نبوت کسی منصب امامت کا بیان نہیں ملتا۔ **اولی الامر** کی مشروط اطاعت بھی کسی آسمانی امامت کا پتہ نہیں دیتی اور حدیث

کساء کے چار حضرات کو بھی آئندہ ہر قسم کے رجس سے دور رکھا جانے سے ان کی عصمت ثابت نہیں ہوتی' معصوم وہ ہیں جو پہلے سے ہی ہر معصیت سے محفوظ رکھے گئے ہوں نہ کہ پھر کسی وقت ارادہ خداوندی ہو کہ ان سے ہر طرح کا رجس دور کر دیا جائے جو خود کہیں لست فی لفسی بفوق ان اخطئ انہیں کون معصوم قرار دینے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ایسا ہوتا تو حضرت علیؓ اپنے کو گمراہ کہنے والوں کو کسی طرح اپنے سے مصالحت کی دعوت نہ دیتے۔ آپؓ نے واقعہ تحکیم کے بعد ایک نہایت ایمان افروز پیرائے میں اپنے سے معصوم امامت کے تصور کو دور کیا ہے۔ آپ نے خوارج کو کہا کہ میرے گناہوں سے تم حضورؐ کی امت (گناہ کبیرہ کے مرتکبین) کو کیوں کافر کہہ رہے ہو۔ آپؓ نے کہا:

فان ابیتم الا ان تزعموا انی اخطاء ت وضللت فلم تضللون عامة امة محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم بضلالی و تاخذ و نهم بخطاء ی وتکفرونهم بذنوبی.

(نهج البلاغة خطبه ۱۲۳ جلد ۲ ص ۱۱)

ترجمہ: ''اگر تم اس کے سوا کہ میں نے غلطی کی اور راہ راست کو چھوڑ دیا اور کسی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو تم بتاؤ کہ تم حضورؐ کی پوری امت کو میرے گمراہ ہونے سے کیوں گمراہ قرار دے رہے ہو اور میری خطا پر انہیں کیوں پکڑ رہے ہو اور میرے گناہ گار ہونے سے ان کی تکفیر کیوں کر رہے ہو؟''۔

حضرت علیؓ المرتضیٰؓ کی عظمت پر قربان جائیں' وہ کس جذبہ خیر خواہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری امت کو فتویٰ کفر سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو گمراہ کہنے کے لیے تیار کھڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حضورؐ کی امت کو کافر سمجھنے کے عقیدۂ فاسدہ سے کسی نہ کسی طرح ضرور بچایا جائے۔

تاہم یہ تجویز کسی ایسے شخص کی نہیں ہو سکتی جو اپنے لیے کسی آسمانی عہدہ امامت کا دعوے دار ہو۔ شیعہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ چونکہ اس وقت حضرت علیؓ اپنی خلافت کو پہلے تین خلفاء کی خلافت کا ہی ایک تسلسل سمجھ رہے تھے اور سیرت شیخین اور خلفاء ثلثہ کی پیروی کا دم بھرتے تھے۔ اس لیے آپؓ نے اپنے امام معصوم ہونے کی حیثیت کو ہمیشہ چھپائے رکھا۔ ہم کہتے ہیں کہ وجہ جو کچھ بھی ہو' آپ کے ایسے خطبات کے ہوتے ہوئے ختم نبوت کے بعد پورے دائرہ اسلام میں کسی آسمانی عہد امامت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اپنے اس عقیدہ کی یہاں تک صراحت فرما دی۔

فلا تکفوا عن مقالة بحق او مشورة بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطئ ولا امن من ذلک من فعلی الا ان یکفی اللّٰہ من نفسی ما هوا ملک به منی فانما انا وانتم عبید مملوکون لرب لا رب غیره یملک منا مالا نملک من

انفسنا و اخرجنا مما کنا فیه الی ما صلحنا علیه فا بدلنا بعد الضلالة بالهدیٰ واعطانا البصیرة بعد العمی. (نهج البلاغة خطبه ۲۴۷ ج ۲)

ترجمہ: ''تم اپنے آپ کو مجھے حق بات کہنے سے نہ روکو نہ مجھے عدل کا مشورہ دینے کو گراں سمجھو کیونکہ میں اپنے آپ کو خطاؤں سے بالا نہیں سمجھتا (اپنے آپ کو معصوم نہیں جانتا) اور نہ میں اپنے کسی کام کو لغزش سے محفوظ سمجھتا ہوں۔ مگر یہ کہ خدا میرے نفس کو اس سے بچائے جس پر وہ مجھ سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔ میں اور تم اس خدا کے بے اختیار بندے ہیں (میں مشکل کشا ہونے کا مدعی نہیں) جس کے علاوہ دوسرا کوئی رب نہیں' وہ ہم پر اپنا اختیار رکھتا ہے کہ ہم اپنے نفس پر اتنا اختیار نہیں رکھتے۔ اس نے ہمیں ہماری پہلی حالت سے نکالا جس میں ہم تھے (ہم سے ہر رجس کو دور کیا) اس نے ہماری گمراہی کو ہدایت سے بدلا' ہم بے بصیرت تھے اس نے ہمیں بصیرت دی۔''

یہ حدیث کساء کی برکت تھی جس نے ان حضرات سے ہر طرح کے رجس کو دور کیا۔ سو یہ سمجھنا کہ حضرت علیؓ المرتضیٰؓ پہلے سے معصوم تھے یا آپ کسی آسمانی عہدہ امامت پر فائز کیے گئے تھے کسی آیت اور کسی حدیث متواتر سے ثابت نہیں ہوتا۔ ختم نبوت پر ایمان رکھنے کے بعد کسی آسمانی امامت کا عقیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔

قارئین پر اب یہ بات مخفی نہ رہی ہوگی کہ ڈھکو نے عصمت ائمہ پر جو چار وجوہ پیش کیں ان میں کسی میں کوئی علمی وزن نہیں۔ اور نہ ان کا اس کے اثبات مدعا میں کوئی دخل ہے۔ ہاں پانچویں نمبر پر اس نے ایک خبر واحد (اور وہ بھی اپنی کتابوں سے اور وہ بھی اس کی کسی قلمی دستاویز سے) پیش کی ہے کہ (معاذ اللہ) حضورؐ نے فرمایا:

انا وعلی و الحسن والحسین و تسعة من ولد الحسین ...... مطهرون معصومون. (فرائد السمطین حموینی شریف (ج ۲ ص ۳۱ قلمی)

ظاہر ہے کہ ایسی بے سروپا موضوع روایتوں سے بلکہ کسی خبر واحد سے اساسی عقیدے ثابت نہیں ہوتے۔ حموینی شریف کو اس بحث میں لانا کسی غلط حمایتی کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ کسی صاحب علم کا نہیں۔

اپنی اس علمی کمزوری پر مولف جب اس قسم کی روایات سے اپنا عقیدہ امامت ثابت کرتا ہے تو یہ خود اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ان کا عقیدہ آسمانی امامت کا ایک بالکل بے بنیاد عقیدہ ہے۔ بہر حال اس کی وجوہ خمسہ کے بعد اس کی یہ تین روایات بھی سن لیں۔

القرآن مع علی وعلی مع القرآن .... الحق مع علی وعلی مع الحق .... انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وعترتی سے روز روشن کی طرح ائمہ اہل بیت کی عصمت اور

طہارت واضح ہوتی ہے۔ (تجلیات صداقت ص ۲۲۵)

ان میں سے اس نے ایک پر بھی کوئی صحیح سند پیش نہیں کی پھر ان روایات کو اگر صحیح بھی مان لیں تو ان میں سے کسی میں آسمانی عہدہ امامت کا کہیں ذکر تک نہیں' نہ ان میں سے کسی میں ان نو ائمہ اہل بیت میں کسی کی عصمت پر کوئی لفظ موجود ہے۔

اب ان تین روایات کو کچھ معنوی طور پر سمجھیں۔

۱۔ قرآن کریم اگر صرف حضرت علیؓ کے پاس ہی ہوتا جیسا کہ القرآن مع علی کے حوالہ سے کہا جاتا ہے تو جب امیر معاویہؓ نے جنگ صفین میں بانسوں پر مصاحف بلند کیے تھے تو کیا اس سے یہ پتہ نہ چلا تھا کہ قرآن حضرت معاویہؓ کے پاس بھی ہے۔ بلکہ یہ ہر مسلمان کے پاس ہے۔ اور بے شمار حافظوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور وہ ایک ہی کتاب ہے جو سب کے پاس ہے۔ بے شک حضرت علیؓ بھی اس شرف سے مشرف ہیں لیکن اس میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں کہ قرآن صرف حضرت علیؓ کے پاس ہی تھا حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے پاس نہ تھا۔ اسلام کے مجتہدین ہمیشہ حق اور خطاء میں دو حصوں میں رہے ہیں۔ سو جو مجتہدین صواب پر رہے تو کیا یہ ان کے حق پر ہونے کا نشان تسلیم نہ کیا جائے گا۔ یہ کیسے کہا جا سکے گا کہ حق صرف علی کے ساتھ ہے۔ پھر اس میں حق اگر ہمیشہ اہل بیت میں رہنے کی خبر تھی تو اسے صرف حضرت حسینؓ کی اولاد میں نو اماموں میں کیوں منحصر رکھا گیا۔ اہل بیت تو قیامت تک رہیں گے اور حضورؐ کی اولاد قیامت تک مستحق تکریم رہے گی۔ حضرت حسینؓ کی اولاد میں اسے نو پر کیوں ختم کر دیا گیا۔

پھر یہ حدیث ثقلین جس میں کتاب اللہ کے بعد دوسرا وزنی ماخذ سنت مذکور نہیں وہ کیسے صحیح حدیث مانی جا سکتی ہے۔ شیعی عقیدہ میں بھی اہل بیت تیسرے نمبر پر ہیں۔ وہ جب اپنے ائمہ اہل بیت کو اولی الامر منکم میں داخل کرتے ہیں تو وہ اس آیت کے بیان سے کہ اطاعتیں تین ہیں **اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم** خود اس حدیث کی تردید کر دیتے ہیں۔ اگر یہ کوئی صحیح حدیث ہوتی تو حضرت علیؓ مرتضیٰ اسلام کا دوسرا علمی ماخذ اس طرح بیان نہ کرتے:

ومحمد صلی اللہ علیه وسلم فلا تضیعوا سنته اقیموا هذین العمودین اوقدوا هذین المصباحین (نهج البلاغه وصیت ۲۳ باب تعزیرات)

ترجمہ: ''اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سو آپ کی سنت کو کبھی ضائع نہ ہونے دینا۔ ان دونوں ستونوں کو کھڑے رکھنا اور یہ دو چراغ جلائے رکھنا۔''

سو جو روایت سنت رسول کو درمیان سے نکال دے وہ اہل بیت کے ہاں کسی درجہ میں لائق قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ثقلین کے بیان میں سنت کو سرے سے نکال دیا جائے۔ اعاذنا اللہ منه۔

صحیح مسلم کی روایت سے یہ مغالطہ پیدا نہ ہو کہ ثقلین (دو وزنی چیزوں) سے مراد صرف کتاب اللہ اور عترت یا اہل بیت ہیں کیونکہ راوی حدیث اذکر کم اللہ فی اهل بیتی۔ حضرت زید بن ارقم پہلے یہ کہہ آئے ہیں۔

حضرت حصین بن سبرہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا:

یا ابن اخی واللہ لقد کبرت سنی و قدم عهدی و نسیت بعض الذی کنت اعی من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فما حدثتکم فاقبلوه ومالا فلا تکلفونیه.

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۹)

ترجمہ: ''اے میرے بھتیجے بخدا میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میرا وقت قریب آ گیا ہے اور میں بہت سی چیزیں جو میں حضورؐ سے یاد رکھتا تھا بھول چکا ہوں سو جو میں خود تمہارے سامنے بیان کروں اسے لے لیا کرو اور جو بیان نہ کروں تو مجھے اس کی تکلیف نہ دینا۔''

پھر آپ نے حضور اکرمؐ کی یہ حدیث روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی تارک فیکم ثقلین اولهما کتاب اللہ فیه الهدی والنور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا به.

ترجمہ: ''حضرت زید بن ارقم کہتے ہیں کہ آپ نے پھر کتاب اللہ کی بہت ترغیب دلائی اور اس کی پیروی پر بہت زور دیا۔''

فحث علی کتاب اللہ ورغب فیه.

آپ نے کن لفظوں میں تمسک بالقرآن پر زور دیا اور کن لفظوں میں اس کی مزید ترغیب دی وہ الفاظ حدیث میں نہیں ملتے۔ ان کی حکایت تو ہے لیکن محکی عنه مذکور نہیں۔ پھر حضرت زیدؓ نے حضور اکرمؐ کی پہلی بات اولهما کتاب اللہ کے الفاظ سے کہی۔ آگے ثانیهما کے لفظ سے کوئی دوسری بات نہیں ملتی۔ پھر جو تیسری بات فرمائی اذکر کم اللہ فی اهل بیتی یہ اپنی جگہ ایک امر مبہم ہے۔ اس سے اہل بیت کے کچھ حقوق بھی امت کے ذمہ آتے ہیں اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

رہی دوسری بات (کتاب اللہ کے بعد حضور اکرمؐ کی سنت) وہ اس روایت میں بیان سے رہ گئی ہے۔ حضرت حصینؓ نے پھر پلٹ کر حضرت زیدؓ سے اس کا سوال نہیں کیا کہ دوسری بات سے ان ثقلین میں کیا تھی۔ اس لیے کہ حضرت زیدؓ خود اپنی کبرسنی اور اپنے بھولنے کا عذر پہلے پیش کر چکے تھے۔ سو صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح اطیعوا اللہ کے بعد یقینی طور پر اطیعوا الرسول ہے' اولی الامر منکم تیسرے نمبر پر آئے ہیں۔ اسی طرح ثقلین یا امرین اور

عمودین میں دوسری چیز حضور کی سنت ہے۔ سنت کو عترت سے بدلنا کسی طرح درست نہیں۔ وہ تمام روایات جن میں ثقل ثانی میں عترت کا ذکر کیا گیا ہے محل کلام ہیں۔ گو اہل بیت کے اس امت پر اپنے حقوق ہیں اور اہل سنت میں سے کوئی شخص ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے اطاعت خداوندی کے ساتھ متصلاً اطاعت رسول کو جوڑا ہے اور ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات پر ہم اسے اسی ترتیب کو پاتے ہیں۔ اب جو روایات سنت کو نکال کر ماخذ علم کتاب اللہ اور عترت رسول بیان کریں وہ ظاہر ترتیب میں کیوں نہ خلاف قرآن سمجھی جائیں گی۔

حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کے ہاں کتاب اللہ کے بعد دوسرا عمود اسلام آنحضرت کی سنت ہی رہی ہے۔ آپ یقین کے ذکر میں کہتے ہیں:

۱. عمار الليل و منار النهار متمسكون بحبل القرآن يحيون سنن الله وسنن رسوله. (خطبہ ۱۸۷ خطبہ قاصعہ جلد ۲ ص ۱۸۴)

۲. كتاب ربكم منكم مبيناً حلاله وحرامه و فرائضه و فضائله وناسخه و منسوخه ورخصه وعزائمه وخاصه وعامه و عبره و امثاله...... و معلوم فى السنة نسخه و واجب فى السنة اخذه. (نهج البلاغه جلد ۱ ص ۲۰)

۳. انى نظرت فى كتاب الله ...... فاتبعته و ما استن النبى صلى الله عليه وسلم فاقتديته. (خطبہ ۲۰۳)

۴. ووضع على حده فريضة فى كتابه او سنت بنبيّه صلى الله عليه وسلم. (مکتوب ۵۳)

۵. اما وصيتى فالله لا تشركوا به شياءً ومحمدﷺ فلا تضيعوا سنته اقيموا هذين العمودين و اوقد و اهذين المصباحين. (خطبہ ۱۴۵ جلد ۲ ص ۴۵)

۶. افيضوا فى ذكر الله فانه احسن الذكر ...... واقتدوا بهدى نبيّكم فانه افضل الهدى واستنوا بسنته فانها اهدى السنن. (خطبہ ۱۰۸)

ثقلین کو قرآن و عترت سے روایت کرنے والے حضرت علیؓ سے ایک خطبہ بھی نقل نہیں کر سکتے جس میں آپ نے اسلام کا دوسرا ماخذ علم سنت درمیان سے نکال دیا ہو۔ اسلام کا دوسرا ماخذ علم سنت ہے اور قرآن کریم کے موافق وہی حدیث ہے جس میں دوسرے نمبر پر سنت ہے نہ کہ عترت۔ گو عترت کی اپنے محل پر ایک اپنی شان ہے۔ ہاں سنت کے بعد عترت کا کہا جائے تو بات بیشک بنتی ہے۔

بارہ اماموں کی امامت پر ڈھکو رافضی کے پاس حموینی شریف کی اس روایت کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

حموینی شریف کی وہ بے سند روایت یہ ہے۔

انا وعلى والحسن والحسين و تسعة من ولد الحسين ...... مطهرون معصومون. (ج ۲ ص ۳۱ قلمی)

مطبوع کتابوں میں جب ڈھکو کو کوئی دلیل نہیں ملی تو وہ اب قلمی کتابوں پر آ گیا ہے۔ حموینی شریف کی اس روایت کی بجائے اگر وہ کلینی شریف سے دلیل پیش کرتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ جس وصیت کی مہریں تاریخ کے مختلف موقعوں پر کھلتی رہی ہوں اور وہ کبھی یکجا نہ پڑھی گئی ہوں علمی دنیا میں اس کا کیا پایہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات خود واضح ہے کہ کلینی شریف کی روایت میں کچھ وزن ہوتا تو یہ ڈھکو حموینی شریف پر نہ آتا۔

عقیدہ امامت میں تو مولف بالکل چل نہیں سکا اب آیئے مسئلہ خلافت میں کچھ باہمی اختلاف کو سمجھنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ اس میں کتاب و سنت کی رہنمائی کیا ہے۔ مولانا کرم الدین دبیر اپنے موقف پر قرآن کریم کی اٹھائیس آیات پہلے پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اپنے قارئین کو اس مسئلہ میں زیادہ تر اصول و واقعات کی طرف متوجہ کریں گے۔

واللہ ولی امرہ وبہ تتم الصالحات۔

مسئلہ خلافت پر ایک تحقیقی نظر

الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد.

جب قرآن کریم سے بدون نبوت کسی آسمانی امامت کا پتہ نہیں ملتا اور نہ امامیہ اب تک اپنے اس عقیدہ امامت پر کوئی صریح الدلالۃ ایک آیت قرآنی یا کوئی ایک صریح الدلالۃ حدیث متواتر پیش کر سکے ہیں تو ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم قرآن کریم کی روشنی میں مسئلہ خلافت کا بھی کچھ جائزہ لیں کہ اسلام میں یہ کیسے قائم ہوتی ہے۔ یہ ایک ضرورت کی چیز ہے' معلوم رہے کہ اسے کس طرح قائم ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے خلافت منصوص نہیں رکھی کہ خود کسی کو خلیفہ نامزد کر دیں۔ اسے امت کے ہاتھوں میں دیا گیا کہ اہل حل وعقد خود یہ امانت اپنے صوابدید سے کسی اہل کے سپرد کر دیں جو اسے نبھا سکے اور جملہ امور خلافت پوری بصیرت سے سر انجام دے سکے اب سوال یہ ہے کہ کیا اولی الامر کے لیے ہمیں کوئی آسمانی حکمنامہ ملا ہے کہ وہ کیسے اپنے منصب پر آئیں؟ ہاں آیت اولی الامر سے پہلے ان کے لیے یہ راہ بتلائی گئی ہے۔

۱۔ **ان اللّٰہ یامرکم ان تودوا الامانات الٰی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللّٰہ نعمّا یعظکم بہ. (پ ۵ النساء ۵۸)**

ترجمہ: ''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو اور جب لوگوں میں محاکمہ کرو تو عدل سے کام لو۔ یہ ایک اچھی نصیحت ہے اور بے شک اللہ ہے سننے والا' دیکھنے والا۔''

اس سے اگلی آیت میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے سو یہاں امانت سے مراد ولایت ہے جو خدا کی نیابت میں عمل میں آئے اور انسان انی جاعل فی الارض خلیفہ کی رو سے ایک نظام میں منسلک ہوں۔ ناظرین کرام! اس آسمانی روشنی سے آنکھیں بند نہ کرو۔ اسلام میں نظام حکومت شورائی ہے اور مومنین کو حکم ہے کہ وہ نظام خلافت میں اہلیت' قابلیت اور کارکردگی کو دیکھیں ان اصولوں پر کسی کو چنیں اور یہ امانت خلافت اس کے سپرد کر دیں۔ یہی لوگ ہیں جو مسلمانوں میں مرتبہ ولایت پائیں اور داخلی نظام حکومت کے ساتھ ساتھ وہ امت کے گرد حفاظت کا پہرہ دیں۔ اس میں

صرف بزرگی نہ دیکھیں' اہلیت بھی دیکھیں اور یہ امانت انہی کے سپرد کریں جو اس کے اہل ہیں۔ ان کے پاس حکم نافذ کرنے کی طاقت بھی ہو اور نظام چلانے کا علم بھی ہو۔

وہ حکام جو شوریٰ سے چنے جائیں گے وہ اپنے کاموں میں قوم کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ آسمانی فرستادہ، قوم کے سامنے کبھی جوابدہ نہ ہو سکے گا۔ البتہ پیغمبر جو لوگوں کا انتخاب نہیں ہوتے اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ وہ سربراہ سلطنت بھی ہوں تو ان کی قوم کے سامنے جوابدہی نہ ہوگی۔

اگلی آیت میں یہ پوری ہدایت دی گئی کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ تیسری اطاعت اولی الامر کی بتلائی لیکن ان کی اطاعت مطلق نہیں وہ اطاعت اس قید کے ساتھ ہے کہ وہ کہیں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں سے نہ ٹکرائے۔

۲۔ اولی الامر میں لفظ امر پر ہمیشہ نظر رہے۔ صاحب امر کو ہی امیر یا امیر المومنین بھی کہا گیا ہے۔ لوگوں پر دروازہ بند کیے گھر بیٹھے رہنے والے کو کبھی امیر نہیں کہا جاتا۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کے نظام حکومت کو شورائی کہا گیا ہے۔

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلٰوۃ وامرھم شورٰی بینھم ومما رزقنٰھم ینفقون (پ ۲۵ الشورٰی ۳۸)

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جنہوں نے حکم مانا اپنے رب کا (صفِ اسلام میں داخل ہوئے) اور انہوں نے نماز قائم کی۔ مل کر دائرہ نماز میں آئے اور ان کی حکومت شوریٰ سے طے ہوئی اور جو (مجموعی طور پر) ہم نے ان کو مال دیے وہ (اسے دوسروں پر) خرچ کرتے ہیں۔''

مسلمانوں کا دائرہ نماز مسلمانوں کی اسمبلی بنا اور انہوں نے بھی اپنے باہمی مشورہ سے اپنے امیر کا انتخاب کیا اور ان کی ضرورت کے لیے زمین نے جو دولت اگلی اس سے انہوں نے رعیت میں مالی نظام قائم کیا' زمینی دولت اور اپنی محنت سے بنائے سرمایے سے انہوں نے سب کی ضرورتیں پوری کیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لیے اپنے دائرہ نماز کا امام تو مقرر کیا لیکن قوم کی امامت کبریٰ پر کسی کو نامزد نہ کیا تاکہ وہ قوم کے انتخاب سے اقتدار پر آئے اور پھر اپنے پورے دور حکومت میں قوم کے سامنے جوابدہ رہے۔ حضورؐ کا نامزد کردہ شاید پوری قوم کے سامنے جوابدہ نہ ہوتا۔ تاہم امام نماز مقرر کرنے سے پیغمبر کی نگاہ ناز قوم کو ایک اشارہ دے گئی۔ حضرت علیؓ اس اشارہ کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ آپ نے فرمایا ہم حضورؐ کے حضرت ابوبکرؓ کو امام نماز مقرر کرنے سے آپ کا اشارہ پا گئے کہ اب مسلمانوں کی امامت کبریٰ پر کسے لانا چاہیے۔ ہم نے اپنی دنیا کے لیے اسے پسند کیا جسے حضورؐ نے ہمارے دین کے لیے آگے کیا ہے۔

حضرت علیؓ حضورؐ کی وفات کے بعد ایک نماز میں بھی حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء سے نہیں نکلے۔ خلافت کی بیعت اتنی ضروری نہ سمجھی جتنا اس دائرہ نماز میں شامل رہنا ضروری سمجھا اور ایک دن کے لیے بھی آپ مسلمانوں کے اس نظام نماز سے دور نہ رہے۔ اب نماز کی امامت پر امامت کبریٰ مرتب ہو گئی۔ خلافت گو منصوص نہ رہی لیکن دائرہ نماز میں پوری طرح محسوس کی گئی۔

شیخ الاسلام اس آیت پر لکھتے ہیں:

''خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر تھی۔ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت ان کاموں میں سے ہے جو مہتم بالشان نہ ہوں اور جو قرآن وسنت میں منصوص نہ ہوں' جو چیز منصوص ہے اس میں رائے اور مشورہ کے کوئی معنی نہیں۔'' (ص ۶۴۸)

۳۔ حضورؐ کے بعد اس امت میں خلافت منصوص نہیں موعود رکھی گئی۔ موعود وہی چیز ہوتی ہے جو عملاً قائم نہ ہو وعدہ پائی ہو۔ قرآن کریم نے موعود خلافت کی علامات یہ بتلائیں کہ

(۱) انہیں زمین پر پورا قبضہ ملے گا جیسا کہ یہ نظام پہلے بھی چلا آیا ہے۔ یہ کوئی روحانی کھیل نہیں ہوگا۔

(۲) خدا کے پسندیدہ دین پر انہیں پورا جماؤ ملے گا' دین پر ان کے اکھڑے اکھڑے قدم نہ ہوں گے۔

(۳) وہ اپنے دور خلافت میں کسی ڈر میں دبے نہ ہوں گے کہ اپنے فیصلے اپنی رائے سے نہ کر سکیں۔

(۴) وہ صحیح عقیدہ توحید پر رہنے والے ہوں گے' اور کفر کی آلائش سے پوری طرح محفوظ ہوں گے۔

یہ علامات کیوں بیان فرمائیں؟ یہ اس لیے کہ خلافت موعود تھی' منصوص نہ تھی۔ منصوص میں شخصیت پیش کی جاتی ہے' موعود میں علامات بتائی جاتی ہیں۔ اب جو ان علامات سے اور ان خلفاء کے فضل وشرف سے منکر ہوا قرآن کے ضمن کفر بعد ذلک کے الفاظ سے اس کا حال سمجھ لیا گیا۔ اب یہی ان کا حکم ٹھہرا۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امنا. یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذلک فاؤلئک ھم الفاسقون. (پ ۱۸ النور ۵۵)

ترجمہ : ''وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور کیے انہوں نے صلاحیت والے عمل کہ (۱) اللہ انہیں خلافت دے گا زمین کی جیسا کہ وہ پہلے حاکم کرتا رہا اور (۲) جما دے گا ان کے لیے دین ان کا جو اس نے پسند کیا ہے ان کے لیے اور (۳) دے گا انہیں امن

بدلے خوف کے۔ وہ میری بندگی کرتے ہوں گے' شریک نہ کریں گے کسی کو اس کے ساتھ سو اب جو بھی کفر کرے اس کے بعد سو وہ نافرمان لوگ ہوں گے۔''

شیخ الاسلام اس آیت پر لکھتے ہیں :

الحمدللہ کہ یہ وعدہ بھی چاروں خلفاء رضی اللہ عنھم کے ہاتھوں پر پورا ہوا اور دنیا نے اس عظیم الشان پیشگوئی کے ایک ایک حرف کا مصداق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

۴۔ حضور اکرمؐ نے پہلے لوگوں کی طبعی طلب کے پیش نظر چاہا تھا کہ اپنا جانشین نامزد فرما دیں مگر جب آپ ارادہ الٰہی پر مطلع ہوئے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا کسی پر یہ تکوینی فیصلہ نہ اترے گا تو آپ نے آخری وقت میں وصیت لکھنے کا ارادہ بدل لیا۔ قرآن کریم میں ہے کہ آپ کو اس سے روک دیا گیا۔ جنگ بدر کے بعد آپ کو کہہ دیا گیا تھا:

لیس لک من الامر شئی (پ ۴ آل عمران ۱۲۸)

ترجمہ: ''اس امر میں آپ کو اختیار نہیں دیا گیا ہے۔''

بظاہر اس آیت کا موضوع یہ رہا کہ آپ ان کافروں پر بددعا نہ کریں لیکن الفاظ اپنے عموم میں ایسے ہر امرِ حکومت میں حضورؐ کو اپنی رائے سے فیصلہ کرنے سے روک رہے تھے۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''بعض روایات سے ان آیات کی شان نزول کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ فتح الباری میں کئی جگہ اس پر شافی کلام کیا ہے۔ فلیراجع'' (اس کی مراجعت کر لی جائے)

حضورؐ کا اپنا ارادہ کرنا اور پھر ارادۂ الٰہی پر اطلاع پانا

امام ترمذیؒ حضرت عروہ سے' وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنے آخری وقت میں انہیں کہا:

ادعی لی اباک و اخاک حتی اکتب کتاباً فانی اخاف ان یتمنیٰ متمنّ ویقول قائل انا اولی ویابی اللہ والمومنون الا ابابکر. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳)

ترجمہ : ''اے عائشہؓ! تو اپنے باپ اور بھائی کو بلا۔ یہاں تک کہ میں (وصیتِ خلافت) لکھ دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کہے میں اس کے زیادہ لائق ہوں۔ اور اللہ اور مومنین ابوبکرؓ کے سوا سب کا انکار کر دیں گے۔''

خلافت کے لیے وصیت کرنے کا آپ کا ارادہ اسی حد تک تھا۔ یہاں آپ نے پہلے ارادہ تحریر ظاہر کیا۔ پھر آپ

نے اس ارادہ سے رجوع فرمایا۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کو کاغذ قلم لانے کے لیے کہا۔ آپ حضورؐ کے اس حکم پر عمل اس لیے نہ کر سکے کہ آپ کو اندیشہ ہوا کہ آپ کہیں حضورؐ سے ان آخری لمحات میں غائب نہ رہ جائیں۔ حضرت علی مرتضیٰؓ خود ارشاد فرماتے ہیں:

جب حضرت علیؓ آپ کے اس آخری وقت میں کاغذ اور قلم نہ لا پائے تو حضرت عمرؓ کو خدشہ گزرا کہ لوگ کہیں حضرت علیؓ کے خلاف نہ ہو جائیں کہ کاغذ قلم کیوں نہیں لا رہے۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کی طرف سے حسبنا کتاب اللہ کہا کہ کتاب اللہ میں پہلے سے یہ ضمانت موجود تھی کہ تم قرآن کے موجود ہونے سے کبھی گمراہ نہ ہو پاؤ گے۔ وہ ضمانت قرآن میں کہاں ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔

یبیّن اللّٰہ لکم ان تضلوا واللّٰہ بکل شئی علیم . (پ ۶ النساء ۱۷۶)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے یہ آیتیں بھیج رہے ہیں تاکہ تم کہیں گمراہ نہ ہو پاؤ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

اس میں عیاں ہے کہ قرآن تمہارے لیے گمراہ ہونے سے بچنے کی بڑی ضمانت ہے۔ اب گمراہ ہونے سے بچنے کے لیے اور کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ سنت بھی تو قرآن کا ہی ایک عملی پھیلاؤ ہے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کا خدا کے اس فیصلہ پر اتفاق

اس پر دونوں فریق متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو کسی وصیت خلافت سے روک دیا۔ اہل سنت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو خبر دے دی کہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی فیصلہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں ہو چکا ہے۔ آپ مطمئن رہیں کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ شیعہ کہتے ہیں کہ حضور حضرت علیؓ کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک دیا اور فرمایا لیس لک من الامر شئی آپ کو اگلے وقت کی حکومت کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے۔

علامہ فرات کوفی جو دو واسطہ سے مشہور شیعی مفسر علی بن ابراہیم القمی کے استاذ ہیں اور آپ نے سورہ ق کی تفسیر میں ایک سند میں ان کا نام اس طرح لیا ہے۔

حدثنا ابوالقاسم الحسنین قال حدثنا فرات بن ابراھیم قال حدثنا محمد بن احمد بن حسان قال حدثنا محمد بن مروان عن عبید بن یحییٰ عن محمد بن الحسین بن علی بن الحسین عن ابیه عن جدہ. (تفسیر قمی ص ۳۳۹)

آپ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم حرص ان یکون الامر لامیر المومنین علیه السلام (لعلی علیه السلام) من بعدہ فابی اللّٰہ (وقال لیس لک من الامر شئی)

(تفسیر فرات ص ۱۹ طبع مکتبه حیدریه نجف اشرف)

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حکومت آپ کے بعد حضرت علیؓ کو ملے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار کر دیا اور فرمایا اے میرے پیغمبرؐ آپ کو جانشین حکومت مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔''

سو قرآن کریم نے ان چار وجوہ سے حضرت علیؓ کے حضور کے خلیفہ بلافصل ہونے کا انکار کیا اور اس سلسلہ میں کیے گئے ہر استدلال کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ شیعہ حضرات سے جس طرح حضرت علیؓ کے آسمانی عہد امامت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو پائی' شیعہ قرآن کی رو سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر بھی کوئی دلیل سامنے نہیں لا سکے۔

حضرت علیؓ کی آسمانی امامت اور زمینی خلافت پر ڈھکو کی بے بسی

ڈھکو نے حضرت علیؓ کے آسمانی عہد امامت اور آپ کی زمین کی بلافصل خلافت پر جو دلائل پیش کیے' ان میں اس کی کوئی بات قائم نہ رہ پائی۔ اب وہ اپنی بوکھلاہٹ میں ان باتوں پر آ گیا جن کو علمی دنیا میں کوئی وزن نہیں دیا جاتا۔ غلط روایات اور غلط باتیں عام کتابوں میں عام ہوتی ہیں اور ان سے کوئی مذہب اپنے عقیدے استوار نہیں کرتا۔ اثبات عقائد کے لیے دلائل قطعیہ ویقینیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاریب فیه صرف ایک کتاب کی شان ہے۔ اپنے مسلک کی حفاظت میں ہم ہر غلط بات کو غلط کہیں گے۔ ڈھکو اپنی بوکھلاہٹ میں اب کن باتوں پر آ اترا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ اس پیرایہ میں ڈھکو کی یہ عبارات ملاحظہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے وہ امامت اور خلافت کے موضوعات پر آخری حد تک اپنا دم توڑ چکا ہے۔ تبھی تو وہ ان شرمناک باتوں پر آ گیا ہے۔

مولف کے بوکھلاہٹ میں لکھے گئے شرمناک جھوٹے واقعات

ڈھکو رافضی لکھتا ہے:

''کن کے مذہب کی کتابوں میں انبیاء تو درکنار خود سرور انبیاء کے لیے اعلان نبوت سے قبل کفر و شرک کے ارتکاب کے واقعات درج ہیں؟ ..... یہ کس فرقہ کی کتب میں مذکور ہے ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات ..... یہ کن لوگوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے زلیخا کے ساتھ زنا کا ارادہ کر لیا تھا' بند شلوار کو کھول دیا تھا۔ اس اثناء میں خدا نے ان کے سامنے حضرت یعقوبؑ کو حاضر کر دیا اور انہوں نے کہا' بیٹا تمہارا نام تو فہرست انبیاء میں درج ہے اور تم زنا کرتے

ہو۔تب وہ بازآئے قصص الانبیاء للثعالبی۔" (تجلیات ص۲۳۶)

پھر یہاں تک وہ جھوٹ لکھتا ہے:

اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ بات کس گستاخ فرقہ نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے:

"کان محمد علیٰ دین قومه الی اربعین سنة ." (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۸۰۲)

اور یہ وہی بات ہے جو ڈھ گو پہلے ص ۱۲ پر بھی کہہ آیا تھا۔وہاں اس کا غبار نہ اترا تھا۔اب وہ دوبارہ ان باتوں پر آ اترا ہے؟ اسی بوکھلاہٹ میں کہ اس سے اپنے آسمانی امامت کے عقیدے پر اور حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل پر کوئی بات نہیں کہی جاسکی وہ اچانک اپنے موضوع سے نکلا ہے۔یہ واقعی نیرنگی روزگار کا ایک شاہکار ہے کہ کس احساس شکست میں وہ اپنے موضوع سے نکلا ہے۔

بعض دفعہ کتابوں میں اس قسم کی باتیں ضعیف اقوال تفردات یا شطحیات کی صورت میں آجاتی ہیں لیکن ان سے جماعتوں کے عقائد نہیں پہچانے جاتے۔یہ اقوال رجال ہوتے ہیں کبھی کسی فرقے نے اس قسم کی باتوں کو اپنا مختار نہیں بنایا۔ فقہ میں ایک مسئلے پر کتنے کتنے اقوال ملتے ہیں مگر مفتی بہ کوئی ایک قول ہوتا ہے۔افرادی باتوں کو پورے فرقہ کی بات سمجھنا اسی کا کام ہوسکتا ہے جسے کتاب پڑھنے کا کوئی سلیقہ نہ ہو۔آپ ڈھ گو کے اس فقرے پر پھر غور کریں۔

"یہ بات کس گستاخ فرقہ نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے۔"

اسے اتنا بھی علم نہیں کہ کتابیں افراد لکھتے ہیں فرقے نہیں۔اگر ڈھ گو اتنی بات کہتا کہ کس گستاخ مصنف نے اپنی کتاب میں یہ بات کہی ہے تو اس میں کچھ بات بھی تھی۔لیکن یہ ہر کسی کو معلوم ہے کہ پورا فرقہ کوئی بات نہیں لکھتا۔اس کی جو بھی ذمہ داری ہے وہ پہلے مصنف پر آتی ہے نہ کہ فرقہ پر۔پھر لکھنا تو اس کی اپنی بات ہوسکتی ہے۔درج کرنے میں یہ احتمال ہے کہ بات کسی اور کی ہو اور اس نے محض معلومات کے طور پر اسے یہاں درج کردیا ہو۔اس پس منظر میں آپ عام کتابوں میں بڑے بڑے اقوال پائیں گے اور ان کے آگے کئی اور اقوال ہوتے ہیں ان میں بسا اوقات پہلی کسی بات کی تردید ہوتی ہے۔تاہم کوئی صاحب علم جس میں کچھ بھی علم کی شرافت ہوا سے اس پیرایہ میں ذکر نہ کرے گا کہ (معاذاللہ) امام رازی یہاں اپنا عقیدہ لکھ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں پھر بات بعد میں لکھنا اور اسے گستاخ پہلے کہہ دینا یہ بھی ایسے ہی لوگوں کا طریق ہے جنہیں علم اور شرافت سے کچھ حصہ نہ ملا ہو۔

اب ہم مصنف کی اس علمی خیانت سے پردہ اٹھاتے ہیں' امام رازی کی مذکورہ بالا عبارت اصل میں یہ تھی: اور پھر آگے اس کی کھلے لفظوں میں تردید تھی:

وقال السدی کان علی دین قومه اربعین سنة . (تفسیر کبیر ج ۳۱ ص ۱۹۵)

ڈھ گو نے اس میں مزید بے ادبی یہ کی کہ کان کے بعد لفظ محمد ملا کر اپنی گستاخانہ حیثیت کو اور نمایاں کردیا کہ دیکھو حضورؐ کی کس طرح بے ادبی کی ہے۔پھر اربعین سے پہلے لفظ الیٰ بڑھا کر پورے چالیس سالوں کو ایک تسلسل میں لے آیا ہے کہ آپ پر معاذاللہ ان چالیس سالوں میں ایک لمحہ بھی کسی دوسری سوچ کا نہیں آیا۔

آگے امام رازی اپنا اہل سنت (جمہور اہل اسلام) کا عقیدہ ان الفاظ میں لکھ رہے ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

واما الجمهور من العلماء فقد اتفقوا علیٰ انه علیه السلام ما کفر بالله لحظة واحدة.

ترجمہ: "اور جمہور علماء اسلام اس پر متفق ہیں۔ان میں کسی قسم کا اس میں اختلاف نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی آنکھ کی جھپک تک بھی کفر کا صدور نہیں ہوا۔"

پھر آگے جاکر لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ عقلاً ممکن ہے مگر نقلاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آپ نے کفار و مشرکین کے عقیدے کی کبھی کوئی بات کہی ہو بلکہ قرآن پاک میں کھلا اعلان ہے ماضل صاحبکم و ما غویٰ کہ آپ نہ کبھی گمراہ ہوئے اور نہ کبھی بہکے۔اللہ نے آپ کو ہر گمراہی سے پاک رکھا۔

ان الدلیل السمعی قام علیٰ ان هٰذا الجائز لم یقع وهو قوله تعالیٰ ماضل صاحبکم و ما غویٰ وما ینطق عن الهویٰ ان هو الا وحی یوحی.(النجم پ۲۷)

ترجمہ: "دلیل سمعی اس پر قائم ہوچکی کہ یہ عقلاً ممکن بات عملاً کبھی واقع نہیں ہوتی اور وہ دلیل سمعی یہ ہے' ما ضل صاحبکم وما غویٰ (النجم)

اعتقاد کفر تو اپنی جگہ رہا۔آپ نے زندگی بھر کبھی کوئی جاہلی کام نہیں کیا اس پر امام رازی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بھی نقل کی ہے۔حضور اکرمؐ نے فرمایا:

ما هممت بشئی مما کان اهل الجاهلیة یعملون به غیر مرتین کل ذلک یحول الله بینی و بین ما ارید من ذلک ثم ما هممت بعدهما بسوء حتی اکرمنی الله برسالته.

ترجمہ: "اہل جاہلیت جو کام کرتے تھے ان میں سے دو مرتبہ کے سوا میں نے کبھی اس کام کا ارادہ نہیں کیا۔دونوں دفعہ اللہ تعالیٰ میرے اور میرے ارادہ میں حائل رہے (مجھ سے وہ عمل صادر نہ ہوا) ان کے بعد میں نے کبھی کسی برے کام کا ارادہ نہیں کیا۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے عزت بخشی۔"

مذاہب اہل سنت میں سب سے بڑی قطار حضرت امام ابوحنیفہ (۱۵۹ھ) کے پیروؤں کی ہے۔ آپ فقہ اکبر میں اپنا عقیدہ عصمت انبیاء ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

والانبیاء علیهم السلام کلهم منزهون عن الصغائر والکبائر والکفر والقبائح والفواحش (فقه اکبر (مع الشرح) ص ۶۷)

ترجمہ: اور انبیاء کرام سب کے سب پاک اور منزہ ہیں تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے کفر و شرک سے تمام قبیح امور سے اور بے حیائی کی باتوں سے۔

ہمیں ڈھکو کی بات پر تعجب ہوتا ہے۔ کس ڈھٹائی سے وہ سدی اور ثعالبی کو اہل سنت کا ترجمان سمجھ رہا ہے۔

اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی (۱۲۷ھ) کے بارے میں کتب تراجم میں لکھا ہے:

کان بالکوفة کذابان فمات احدهما السد والکلبی. (تهذیب التهذیب ج ۱ ص ۳۱۴)

ترجمہ: "کوفہ میں دو کذاب رہتے تھے۔ ایک ان میں سے السری وہ فوت ہوگیا ہے اور کلبی۔"

انہی لوگوں نے تیسری صدی میں جا کر شیعہ مذہب ترتیب دیا' یہاں تک کہ قاضی نور اللہ شوستری کو کہنا پڑا:

شیعی بودن اہل کوفہ حاجت با قامت دلیل ندارد۔ (مجالس المومنین ج ۱ ص)

ترجمہ: "کوفی ہونا شیعہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس پر مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی کوفی شیعی نہ ہو تو اس پر دلیل درکار ہوگی۔"

رہی سدی کی بات کہ **کان علی دین قومه اربعین سنة** (اگر واقعی یہ صحت نقل سے امام رازی کو پہنچی ہو) تو اسے اس طرح بھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اہل مکہ اپنی تاریخ میں اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کے مذہب پر سمجھتے تھے۔ ان میں جو شرک آیا وہ دین ابراہیم میں تحریف کی جہت سے آیا۔ اصل میں ملت ابراہیم ہر شائبہ شرک سے پاک تھی۔ حضورؐ اپنی قوم کے دین پر ملت ابراہیمی کے طور پر رہے۔ ہاں آپ نے اہل مشرکین مکہ کے طریق پر ایک لحہ کے لیے بھی کبھی کوئی عملی شرک نہ کیا' نہ ان کی تہذیب وثقافت میں کبھی شرکت کی۔ ان کی بڑی محفلوں میں شراب عام پی جاتی تھی لیکن مجال ہے کہ ان چالیس سالوں میں حضورؐ کے حلق میں اس کا ایک قطرہ بھی کبھی اترا ہو۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ آپ نے ان چالیس سالوں میں اپنی قوم کو اپنے کسی علیحدہ دین کی بات نہیں کہی اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ان کے تحریف شدہ دین میں بھی کبھی شرکت نہیں کی۔ جب حراء میں آفتاب رسالت چمکا تو آپ نے انہیں اپنے علیحدہ دین کی اس طرح خبر دی **لکم دینکم ولی دین** اس میں آپ نے انہیں اپنے اسی

علیحدہ دین کی خبر دی ہے۔

ان چالیس سالوں میں اگر آپ انہیں کسی دوسرے دین کی بات کہتے تو پھر آپ کے دعویٰ نبوت کی بنیاد وہیں سے سمجھی جاتی اور واقعہ حراء اس کی دوسری منزل سمجھا جاتا۔ آپ نے ان چالیس سالوں میں کہیں کسی اور دین پر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے مشرکین مکہ کے شرکیہ عقائد میں اور ان کے ناشائستہ اعمال میں کبھی شرکت نہیں کی ہے۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ سدی کوئی اس جہت سے کہہ رہا ہو کہ حضورؐ چالیس سال (اصولاً نہ کہ عملاً) اپنی قوم کے دین یعنی ملت ابراہیمی پر رہے۔ اس بیان میں ان خرافات کا بیان نہیں جو مشرکین دین ابراہیم میں تحریف کر کے اس میں لے آئے تھے۔

کیا حضورؐ نے مدینہ آ کر یہود و نصاریٰ کے متوازی اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر نہیں کہا؟ اور کیا شریعت محمدی ملت ابراہیمی کی ہی ایک کامل تشکیل نہیں ہے؟ یہودی اصل میں حضرت موسیٰ کی قوم تھے اور دین موسیٰ اپنی جگہ حق تھا۔ مسیحی قومیں اصل میں حضرت مسیحؑ کی قوم تھیں اور ظاہر ہے کہ دین عیسیٰ بن مریم بھی اپنی جگہ حق تھا مگر حضورؐ جب وہاں تشریف لائے تو آپؐ نے اپنے آپ کو دین موسیٰ یا دین عیسیٰ پر نہیں کہا۔ اپنے ملت ابراہیم پر ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ مکہ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مشرکین مکہ نے اگر اس دین ابراہیمی میں تحریف کر دی تھی تو اس کا یہ معنی نہیں کہ دین ابراہیمی یکسر بے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ اہل مکہ کے جو لوگ شرک میں آلودہ نہ ہوئے وہ دین ابراہیم پر ہی سمجھے جائیں گے۔

وقالوا کونوا هوداً او نصاریٰ تهتدوا ط قل بل ملة ابراهیم حنیفا وماکان من المشرکین (پ ۱ البقره ۱۳۵)

ترجمہ: "اور وہ کہتے ہیں تم ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم ہدایت پا جاؤ گے۔ آپ کہہ دیں ایسا نہیں بلکہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے اور وہ مشرک نہ تھے۔"

اس میں یہ اشارہ ہے کہ مکہ والوں نے جو شرک اختیار کر رکھا ہے۔ یہ انہوں نے دین ابراہیمی میں تحریف کی ہے۔ حضرت ابراہیم تو شرک کرنے والے نہ تھے۔ اب بھی اگر کوئی دین ابراہیمی پر ہو تو ہم اسے مشرک نہ کہیں گے۔ جب سدی کے بیان کو (اگر وہ واقعی ہو) اس معنی پر لایا جا سکے تو کھینچا تانی سے اسے شرک و کفر کے معنی میں لے جانا اچھے لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ اچھے لوگ جہاں تک ممکن ہو کسی بات کو اچھے پیرایہ میں ہی لیتے ہیں۔

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه. اولئک الذین هداهم الله.

(پ ۲۳ . الزمر ۱۸)

ترجمہ: ''میرے ان بندوں کو بشارت دیں جو سنتے ہیں کوئی بات تو وہ اس کے اچھے معنی مراد لیتے ہیں، وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی۔''

مولف سدی کی بات کو اگر اس ترجمہ میں نہ اتار سکتا تھا تو کم از کم اس کی نظر اس پر ضرور رہنی چاہیے تھی کہ امام رازیؒ نے آگے اس عقیدہ کی تردید میں اہل سنت کا عقیدہ بڑی وضاحت سے لکھ دیا ہے۔ اہل سنت کا عقیدہ نہ سمجھنا اور سدی کو اہل سنت کا پیشوا بنا کر ظاہر کرنا مولف کی بد باطنی کا پتہ دیتا ہے۔

آپ ثعالبی سے بھی ایک مختصر تعارف کرتے چلیں جس کے نام سے اس ڈھ گو نے حضرت یوسفؑ کا بند شلوار کھولا ہے اور اسے ایک نبی کا اس طرح ذکر کرتے کچھ شرم محسوس نہ ہوئی۔ آپ قصص الانبیاء میں اس روایت کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جائیں گے مگر ڈھ گو کا یہ کھلا نالہ آپ کو کہیں نہ ملے گا۔

حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ خلاف واقعہ بات کہی اور یہ قرآن کریم سے ثابت ہے اسے صرف سنیوں کی بات اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ شیعوں کا اس قرآن پر ایمان نہ ہو، پھر آپ نے جس دور میں اس پیرائے میں یہ باتیں کہیں ان پر جھوٹ کا لفظ جس معنی میں ہم اسے اردو میں استعمال کرتے ہیں، اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عربی میں اسے کذب کہہ سکتے ہیں مگر اردو میں اسے جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ اردو میں جھوٹ اسے کہتے ہیں جب نیۃً غلط بیانی کی جائے۔ مگر عربی میں یہ صرف خلاف واقع بات پر بولا جاتا ہے نیت ہو یا نہ ہو۔

قرآن میں یہ تین باتیں اس طرح دی گئی ہیں:

۱۔ بتوں کو توڑ کر آپ نے یہ ذو معنی بات کہی۔ **بل فعله كبيرهم هذا فسئلوهم ان كانوا ينطقون** (پ ۱۷ الانبیاء ۶۳) آپ کا یہ کہنا بطور الزام اور تبکیت تھا۔ خلاف واقعہ خبر دینے کے لیے نہ تھا۔

۲. **فنظر نظرةً فى النجوم ٥ فقال انى سقيم ٥** (پ ۲۳ الصافات ۲۳)

آپ نے ستاروں کو دیکھا اور کہا میں بیمار ہونے والا ہوں، لوگ یہ سمجھے کہ آپ نے بذریعہ نجوم معلوم کر لیا ہے کہ آپ بیمار ہونے والے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا **انى سقيم** کہنا مطلب واقعی کے اعتبار سے جھوٹ نہ تھا۔ البتہ مخاطبین نے جو سمجھا اس اعتبار سے یہ بات خلاف واقعہ تھی۔

ایسی آیات کو ان کے ظاہر پر رکھ کر کذب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا حمل بطور توریہ دور کے معنی پر ہوگا۔ ظاہر معنی کے پہلو سے اگر اسے کبھی جھوٹ کہہ دیا گیا تو پھر ان متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسلام کا محکم عقیدہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء سب گناہوں سے معصوم مانے جائیں اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ ان سے کبھی کوئی گناہ صادر نہیں ہوا۔ اہل سنت کے کسی گروہ کا ان روایات کے ظاہر معنٰی کا اعتقاد نہیں جس نے بھی حدیث **ما كذب ابراهيم الا ثلثه كذبات** کو مانا اس نے اسے اس کے ظاہر معنی سے دور رکھا تا کہ ان کا عقیدہ عصمت انبیاء کسی پہلو سے مجروح نہ ہو پائے۔ سو ڈھ گو کا یہ اعتراض صرف صحیح بخاری پر نہیں خود قرآن کریم پر وارد ہوتا ہے اور خود قرآن کریم میں ہے کہ اس میں کئی آیات متشابہات ہیں جن سے دلیل نہیں پکڑی جاتی۔

عربی میں کذب صرف خلاف واقعہ بات کہنے کا نام ہے

خلاف واقعہ بات کبھی نیۃً کی جاتی ہے، اور یہ جھوٹ ہے۔ اور کبھی توریۃً کہ یہ جھوٹ نہ رہے، نیت خلاف واقعہ بات کہنے کی نہ ہو۔ توریہ کی نیت ہو یہ جھوٹ نہیں۔

علامہ خطابی (۳۸۸ھ) لکھتے ہیں:

سو حضرت ابراہیم نے کوئی نیۃً خلاف واقعہ بات نہ کی تھی دور کے معنی میں توریۃً یہ کلام کیا تھا۔

اہل سنت کے عقیدہ عصمت انبیاء پر خلاف سلیقہ یہ اعتراضات وارد کرنے کے بعد ڈھ گو پھر حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کی طرف لوٹتا ہے۔ ہم بھی اس کے اس موضوع کی طرف مڑنے پر پھر خلافت کے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

کیا حضرت علیؓ حضورؐ کے خلیفہ بلافصل تھے؟

ڈھ گو نے ص ۲۳۹ پر بڑے طمطراق سے باب باندھا' کیا حضرت علی حضورؐ کے خلیفہ بلافصل تھے۔ پھر اس نے آفتاب ہدایت کی ص ۱۵۰ کی پوری عبارت نقل کی اور اپنی کتاب کے وزن کو وہ اسی طرح بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس نے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر اس قسم کے کمزور دلائل پیش کیے ہیں کہ کوئی صاحب علم ان سے خلافت کے اس مرکزی فیصلے پر نہ آ سکے گا۔ آپ ڈھ گو کے ان دلائل کو ملاحظہ کریں اور شیعہ مجتہدین کے علم کی داد دیں اور غور کریں کہ کیا ان سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل قطعیت سے ثابت ہو رہی ہے؟ اس کے ان بیانات کو پڑھیں۔

۱۔ دلیل بذمہ مدعی ہوتی ہے (مولانا دہیر نے) خود دلائل پیش کرنا شروع کر دیے ہیں جسے آداب مناظرہ میں غصب کہتے ہیں۔

۲۔ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے فضائل بہت ہیں تو پھر کم فضائل والوں کو رہنما بنانا عقل ونقل کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ آیت استخلاف کا خلافت ثلثہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ وعدہ حضورؐ کے نیک عمل صحابہ سے تھا اور اس کے مطابق مکہ فتح ہو گیا۔ (مکہ میں خلافت کی کیا ضرورت تھی وہاں تو حضور خود ساتھ تھے)

۵۔ ابوبکرؓ کی خلافت عمر کی بے نظیر تدبیر اور دھینگا مشتی سے عمل میں آئی گو خدا نے امت کو اس کے شر سے بچا لیا۔

۶۔ پھر یزید پلید مردان طرید اور ولید عنید (تین خلفاء) کو بھی خلفاء راشدین تسلیم کرنا پڑے گا۔

ان دلائل سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آفتاب ہدایت کے دلائل کو توڑنے کے لیے ڈھ گو کے ترکش میں کس قسم کے تیر رکھے ہیں۔ کیا منصف مزاج قارئین ان میں حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کا کوئی ثبوت اور کچھ وزن بھی محسوس کر سکتے ہیں؟ یہاں ڈھ گو کی بے نقط گالیاں اس کے اندرونی غصے اور بے چارگی کا پتہ دیتی ہیں۔ ذرا الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وسوسہ ابلیس کو دلیل کا نام دینا' یہ وہی عامیانہ اور سوقیانہ استدلال ہے۔ (حدیث میں منافق کی علامات بتلائی گئی ہیں کہ جب جھگڑے پر آئے تو گالیوں پر اتر آتا ہے۔) ڈھ گو کی زبان اس کے علم اور اس کی شرافت کا پورا پتہ دیتی ہے۔ پھر ڈھ گو نے آگے ایک بڑی سرخی قائم کی ہے۔ (دیکھیے ص ۲۴۴)

حضرت امیر کے خلفاء ثلثہ سے جنگ نہ کرنے کے اسباب

اسباب جنگ کرنے کے ہوتے ہیں' نہ کرنے کے نہیں۔ جنگ نہ کرنے کی وجوہات ہوتی ہیں۔ یہ عجیب ڈھ گو ہے جو اردو کے عام لفظوں تک کی پہچان نہیں رکھتا۔ اس کے پیش کردہ اسباب میں حضرت علیؓ کا یہ اندیشہ ایک بڑا سبب تھا۔

۱۔ (آپ کہتے ہیں) مجھے یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ اگر ان حالات میں صبر و سکوت کر کے اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کروں تو مجھے اسلام میں ایسا رخنہ اور شگاف دیکھنا پڑے گا جس کا صدمہ چند روزہ خلافت چھن جانے سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ (بحوالہ نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۳۰)

عالم اسلام ہر چار طرف سے کفار و مشرکین کے نرغے میں گھرا ہوا تھا بنا بریں اگر اسلامی دار الحکومت مدینہ میں باہمی تلوار چل جاتی تو داخلی اور خارجی دشمنان دین کو سر اٹھانے اور ان کو اسلام کی بیخ کنی کرنے کا موقع مل جاتا اور اسلام ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاتا۔

ناظرین خود فیصلہ کریں کہ یہ بات جو ڈھ گو نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے کہی ہے وہ ایک وجہ ہو سکتی ہے یا جنگ نہ کرنے کا ایک سبب (رسی) ہے۔

پھر ڈھ گو کا ایک اور سبب ملاحظہ ہو جس نے حضرت علیؑ کو خلفاء ثلثہ سے جنگ نہ کرنے دی۔

۲۔ آنحضرت ﷺ نے باعلام ایزدی ان آنے والے حالات و کوائف سے جناب امیر کو آگاہ کر کے حوزہ اسلام کی حفاظت کی خاطر ان کو صبر و شکیبائی اختیار کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

(کنز العمال جلد ۶ ص ۵۷ روضۃ الاحباب جلد ۵ ص ۳۲۳)

۳۔ یہ کہنا کہ اگر قتل و قتال تک نوبت پہنچتی تو جمہور مسلمین آپ کا ساتھ دیتے۔ یہ مولف کا محض حسن ظن ہے جس کی تاریخی حقائق تائید نہیں کرتے۔ اس پر ڈھ گو نے ایک شعر بطور دلیل پیش کیا ہے۔

ہر دور میں ہوتی رہی باطل کی پرستش
ہر دور یزیدوں کا طرفدار رہا ہے

ڈھ گو کے اس بیان سے یہ راز کھل گیا کہ شیعہ مقررین جب جنگ بدر کی کامیابی اور فتح مکہ کو بیان کرتے ہیں تو آخر میں یہ شعر کیوں پڑھتے ہیں۔

ہر دور یزیدوں کا طرفدار رہا ہے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ بدر میں بھی یہ لوگ مخالفین کے ہی طرفدار رہے ہیں۔ مشرکین کے ساتھ تھے حضور ﷺ کے ساتھ نہ تھے۔

پھر مولف نے ۲۴۷ سے ص ۲۵۱ تک آفتاب ہدایت کی عبارت (ص ۱۵۲ سے ۱۵۹) تک کی نقل کی ہے اور پھر اس کے جوابات کا آغاز کیا ہے۔

ناظرین کرام سے التماس ہے کہ وہ یہاں شیعہ علماء کے ان کھوکھلے دعووں کا ایک فکری جائزہ لیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام ابتداء اعلان نبوت سے لے کر اعلان غدیر خم تک برابر لوگوں کو بتلاتے رہے تھے کہ بحکم خدا میرے بعد میری مسند کا وارث حضرت علیؓ مرتضیٰؓ ہوں گے۔ (تجلیات صداقت ص ۲۵۲)

گویا حضورؐ نے مکہ میں ہی ایک تقریباً ۱۸ سالہ لڑکے کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔

۲۔ حجۃ الوداع میں لوگوں کو بتا دیا گیا تھا کہ غدیر خم پر ایک بڑا اعلان ہونے والا ہے اور کسی نے حضور ﷺ سے یہ درخواست نہ کی کہ میدان عرفات میں ہی وہ اعلان فرما دیں اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی نیا اعلان نہ تھا۔ حضور ﷺ شروع سے ہی جب یہ بات کہتے آ رہے ہیں تو یہ کوئی چھوٹا یا بڑا اعلان نہ تھا۔ (معاذ اللہ)

پھر یہ بھی جھوٹ ہے کہ سارا مجمع آپ کے ساتھ مدینہ آ رہا تھا۔ کیا یہ سب لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے؟ مختلف جہات کے لوگ حج سے فراغت کے بعد اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ آپ کے ساتھ آنے والے صرف وہ تھے جن کے گھر سمت مدینہ کی طرف تھے اور انہیں ادھر ہی آنا تھا۔

ڈھ گو نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ سارا مجمع ادھر آ رہا تھا کیونکہ اس نے رستے میں غدیر خم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ولایت علیؑ کا اعلان کرانا تھا۔ حالانکہ اس قسم کی کوئی بات وہاں نہ تھی۔ نہ پہلے سے کسی اعلان کا انتظار تھا۔ اگر کوئی اعلان ضروری ہوتا وہ عرفات اور مکہ میں ہی ہو جاتا جہاں سارا مجمع تھا۔ یہ واپسی کے سفر میں ایک چھپڑ کے کنارے ایک اتنے بڑے اعلان کی کیا مناسبت تھی۔

پھر کبھی یہ لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ اعلان آیت تبلیغ دین کے نازل ہونے پر شروع کیا تھا اور

اس آیت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ کھل کر یہ اعلان کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جب بات اصولی طور پر ہی بے بنیاد ہو تو جھوٹی روایات گھڑنے والے بار بار اپنے پینترے بدلتے ہیں۔

آیت تبلیغ دین کہاں اور کن کے مقابلے میں اتری

یا ایھا الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالته واللّٰه یعصمک من النّاس . ان اللّٰه لا یھدی القوم الکافرین . (پ ٦ المائدہ ٦٧)

ترجمہ: ''اے رسول پہنچادے جو اتارا گیا تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تو نے اللہ کی پیغام رسانی آگے نہ جانے دی اور اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں سے بچائیں گے۔ (وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے) اور اللہ تعالیٰ راہ نہیں دیتا قوم کفار کو۔''

یہ آیت شریفہ آیت تبلیغ کہلاتی ہے۔ الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی ایک بات کی تبلیغ نہیں۔ (۱) یہاں پوری رسالت (پہنچانے) کا عنوان ہے۔ (۲) اس میں یہ بشارت ہے کہ قوم تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ (۳) اس میں کافروں کی مذمت ہے کہ وہ کبھی صحیح راہ نہ پائیں گے، مسلمانوں کی اس میں کوئی مذمت نہیں۔

اب ہم ان تین عنوانوں کی روشنی میں اس وقت کی تلاش کرتے ہیں جب حضورؐ نے اپنی پوری تیئس سالہ رسالت پہنچانے کا بیان دیا ہو اور اس پر امت کے گواہ کھڑے کیے ہوں۔

آپ نے حجۃ الوداع کے وقت میدان عرفات میں اس آیت شریفہ پر عمل کر کے اپنی پوری رسالت پہنچانے کا بیان دیا تھا اور صحابہ نے اس منزل کے پورا ہونے کی بر سر میدان عام گواہی دی تھی۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور آئین آسمانی کے موافق امت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی نوع انسانی کے عوام و خواص میں سے جو بات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی۔ آپ نے بلا کم و کاست اور بے خوف و خطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کر دی اور وفات سے دو ڈھائی سال پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں چالیس ہزار سے زائد خادمان اسلام اور عاشقان تبلیغ کا اجتماع تھا۔ آپ نے علی رؤس الاشھاد اعلان فرما دیا کہ اے خدا تو گواہ رہ کہ میں تیری امانت پہنچا چکا۔''

قال ان دماء کم واموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا. الا کل شئی من امر الجاھلیة تحت قدمی موضوع و دماء

الجاھلیة موضوعة ..... فاتقوا اللّٰه فی النساء فانکم اخذتموھن بامان اللّٰه واستحللتم فروجھن بکلمة اللّٰه ..... وقد ترکت فیکم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب اللّٰه وانتم تسئلون عنی فما انتم قائلون قالوا نشھد انک قد بلغت و ادیت و نصحت فقال باصبعه السبّابة یرفعھا الی السماء وینکتھا الیٰ النّاس اللّٰھم اشھد اللّٰھم اشھد ثلٰث مرات . (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۹۷)

ترجمہ: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر اسی طرح لائق احترام ہیں جس طرح تمہارا آج کا دن تمہارے سامنے احترام کا دن ہے تمہارے اس شہر حرم میں...... اس بلد اللہ الحرام میں خبردار رہو۔ عہد جاہلیت کی ہر چیز میرے دو قدموں سے روند دی گئی ہے اور جاہلیت کے تمام خون جو تم نے کیے معاف کیے جا چکے...... عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امان سے اپنے حق میں لے لیا ہے اور اللہ کے حکم سے انہیں اپنے نکاح میں لائے ہو ...... اور میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس سے تمسک کرو تو تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو سکو گے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے اور تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے تو تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا دین ہم تک پہنچایا' اپنی یہ امانت ادا فرمائی اور امت کی خیر خواہی میں کوئی کمی روا نہ رکھی۔ پھر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا' اے اللہ تو گواہ رہ' اے اللہ تو گواہ رہ' اے اللہ تو گواہ رہ۔''

اور پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہاں جو موجود ہیں وہ ان کو بھی یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔

فان دمائکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا الیٰ یوم تلقون ربکم الاھل بلّغت قالوا نعم قال اللّٰھم اشھد فلیبلغ الشاھد الغائب فربّ مبلغ اوعٰی من سامع ولا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۳۵)

ترجمہ: ''بے شک تمہارے خون تمہارے مال تم پر اسی طرح لائق حرمت ہیں جس طرح تمہارا یہ دن حرمت والا ہے۔ تمہارے اس حرمت والے مہینہ میں' اس حرمت والے شہر میں' اس دن تک جب تم اپنے رب سے ملو گے' کیا میں نے اللہ کی امانت تم تک پہنچا دی؟ سب نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ سو چاہیے کہ ہر حاضر یہ بات ہر غائب تک پہنچا دے۔ کئی ایسے ہوتے

ہیں جن تک بات پہنچائی جائے وہ پہنچانے والے سے اس کے زیادہ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔
میرے بعد تم پھر سے کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

آیت الیوم اکملت لکم دینکم اسی دن عرفات میں اتری۔

طارق بن شہاب البجلی حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں' آپ نے بتایا:

ان رجلاً من الیہود قال له یا امیر المؤمنین ایة فی کتابکم تقرؤنها لو علینا معشر الیہود نزلت لا تخذنا ذلک الیوم عیداً قال ای ایة قال الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا.

ترجمہ: "ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین سے کہا تم اپنی کتاب (قرآن) میں ایک آیت پڑھتے ہو۔ اگر یہ ہم (یہود) پر اترتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ آپ نے پوچھا' کونسی آیت۔ اس نے کہا آیت الیوم اکملت لکم دینکم۔"

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

قد عرفنا ذلک الیوم والمکان الذی نزلت فیه علی النبی صلی الله علیه وسلم وهو قائم بعرفة یوم الجمعة. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۱)

ترجمہ: "ہم وہ دن پہچانتے ہیں اور وہ جگہ بھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی۔ آپ اس وقت مقام عرفہ میں تھے اور وہ جمعہ کا دن بھی تھا۔"

انی لا علم حیث انزلت و این انزلت واین رسول الله صلی الله علیه وسلم حین انزلت یوم عرفة وانا والله بعرفة. (ج ۲ ص ۲۶۲)

حضرت امام محمد باقر بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیت تکمیل دین عرفہ کے دن (۹ ذوالحج ۱۰ھ) اتری تھی۔ محمد بن یعقوب الکلینی روایت کرتا ہے:

عن ابی الجارود وعن ابی جعفر علیه السلام قال سمعت ابا جعفر علیه السلام یقول فرض الله عزوجل علی العباد خمساً اخذوا اربعاً و ترکوا واحدة.....ثم نزلت الولایة وانما اتاه ذلک یوم الجمعة بعرفة انزل الله عزوجل الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی. (اصول کافی کتاب الحجة جزو سوم ص ۲۹۹ مع شرح الصافی)

حضرت امام محمد باقر فرماتے ہیں لوگوں نے چار چیزیں نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کو لے لیا پھر آیت ولایت اتری اور یہ جمعہ کے دن عرفہ کے دن اتری۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی.

سو جب یہ ۹ ذوالحج کو اتری تو اب ۱۷ ذوالحج کو غدیر خم کے مقام پر حضرت علیؓ کی ولایت کا اعلان کس طرح اصول دین میں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دین تو ۹ ذوالحج کو مکمل ہو چکا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت مومنین پر تمام کر دی تھی یہ ۱۷ تاریخ کا اعلان کسی طرح اصول دین میں جگہ نہیں پا سکتا۔

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت تکمیل دین واقعی عرفات میں اتری اور اس آیت کے شایان شان وہی تاریخی موقع اور عظیم اجتماع تھا دین کامل ہو چکا اور ابھی غدیر خم پر ٹھہرنا اور وہاں ولایت علیؓ کا اعلان کرنا' یہ موقع نہ آیا تھا۔ یہ سترہ ذوالحج کا واقعہ ہے اور دین نو ذوالحج کو مکمل ہو چکا تھا۔ اب اسے سترہ ذوالحج کو مکمل کرنا ہماری سمجھ سے بالا ہے۔

آیت تبلیغ دین یا ایها الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربک کا غدیر خم پر ٹھہرنے سے کوئی تعلق نہیں۔
یہ آیت تبلیغ دین کافروں کے بالمقابل تبلیغ رسالت کی تاکید تھی اور کافروں سے کوئی خوف و اندیشہ نہ رکھنے کا ایک حکم تھا۔ آیت کے سیاق وسباق کو دیکھیں اور جان لیں کہ یہ آیت حضور کے پورے دین کے آگے پہنچنے اور کافروں کو کوئی راہ نہ ملنے کا ایک بیان ہے۔ اس کا حضرت علیؓ کے ولی عہد مقرر کیے جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ کے ہاں ولایت علیؓ اصول دین سے ہے اور دین اس سے پہلے نو ذوالحج کو مکمل ہو چکا تھا۔

آیت تبلیغ دین پارہ ۶ میں سورہ المائدہ کی آیت ۶۷ ہے:

آیت ۵۹ قل یا اهل الکتاب سے شروع ہوتی ہے۔
آیت ۶۴ وقالت الیهود ید الله مغلولة سے شروع ہوتی ہے۔
آیت ۶۵ ولو ان اهل الکتاب امنوا واتقوا سے چلتی ہے۔
آیت ۶۶ ولو انهم اقاموا التوراة والانجیل سے شروع ہوتی ہے۔
آیت ۶۷ یا ایها الرّسول بلغ ما انزل الیک میں اس پورے دین کو بلا خوف وخطر آگے پہنچانے اور کافروں کے کوئی راہ نہ پا سکنے کا عنوان ہے۔ اس آیت میں کہیں حضورؐ کو حضرت علیؓ کے ولی عہد مقرر کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔
آیت ۶۸ قل یا اهل الکتاب لستم علی شئی سے چلتی ہے۔
آیت ۶۹ میں مسلمانوں' یہودیوں' ستارہ پرستوں اور عیسائیوں کا ایک بین الاقوامی تذکرہ ہے۔

آیت ۷۰ لقد اخذ اللّٰہ میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیھم رسلاً ہے۔

آیت ۷۱ لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم ہے۔

قارئین کرام! آیت ۶۷ کے اس سیاق وسباق کو بھی دیکھیں اور ڈھ گو کے اس بے ڈھب دعوے پر بھی غور کریں کہ یہ آیت حضرت علیؓ کو ولی عہد بنانے کے لیے اتری تھی۔

اندھے کو اندھیرے میں بڑے دور کی سوجھی

شیعہ اسے کس طرح ولایت علی کی دلیل بتاتے ہیں

ڈھ گو نے المائدہ کی اس آیت ۶۷ کو اس طرح ولایت علی کی دلیل بنایا ہے کہ اس آیت میں حضرت علیؓ کا نام تھا جو قرآن جمع کرنے والوں نے نکال دیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ شیعہ موجودہ قرآن کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ اس میں تحریف کے قائل ہیں اور اس قرآن پر یہ (جھوٹا) الزام لگاتے ہیں کہ اس میں صحابہؓ نے آیتیں آگے پیچھے کر دی ہیں۔ ڈھ گو اس آیت ۶۷ سے اس طرح ولایت علی ثابت کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے:

یہ آیت اصل میں اس طرح تھی:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیاً مولی المؤمنین.

پھر اس پر ڈھ گو نے یہ سرخی باندھی ہے

قرآن میں حضرت امیر کے اسم گرامی کی تصریح

قرآن میں نئی قرأت لانے سے تو بے شک اس آیت کو ولایت علیؓ سے جوڑا جا سکے گا لیکن یہ بات اپنی جگہ پختہ ہے کہ قرآن پاک میں یہ الفاظ ڈالے بغیر اس آیت سے ولایت علی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ ناقابل رد ہے کہ ولایت علی کے اعلان سے حضرت علیؓ کو مولیٰ مومنین کہنے سے انہیں سلطنت کی ولی عہدی کی پھر بھی سند نہیں ملتی۔ ان مبہم اور مجمل الفاظ کو حضرت علیؓ کی خلافت کی نص نہیں کہا جا سکتا۔ شیعہ ڈھ گو کی مبہم بیان کو صریح کہنے کی ان کوششوں پر جتنے آنسو بہائیں کم ہیں۔ اس کی ان دو سطروں کی غلط بیانی کا اندازہ کریں۔

۱۔ اتمام حجت کی خاطر غیر مبہم الفاظ میں مجمع عام میں حضرت علیؓ کی خلافت اور وصایت کا اعلان کیا۔

(تجلیات صداقت ص ۲۵۲ سطر ۶)

۲۔ جب ولی عہدی کا اعلان واجب الاذعان ہو چکا تو آنحضرتؐ نے جناب امیر کو دستار بندھائی۔

(ص ۲۵۳)

اس حوالے سے ڈھ گو نے تسلیم کیا ہے کہ اس دستار بندی سے پہلے یہ ولایت علی کی تقریب من کل الوجوہ مکمل نہ

تھی اور یہ اب مکمل ہوئی ہے۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ڈھ گو نے فرشتوں کی بھی دستار بندی کر دی

فرشتے نحن نسبح بحمدک ونقدس لک کہتے رہے مگر اللہ تعالیٰ نے دستار خلافت حضرت آدمؑ کے سر پر رکھی۔ مگر ڈھ گو نے جوش خلافت میں بدر میں اترے فرشتوں کی بھی دستار بندی کر دی۔ وہ لکھتا ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا:

"خدا نے بدر وحنین کے دن جن فرشتوں کے ذریعہ میری مدد کی تھی انہوں نے اسی طرح عمامے باندھے ہوئے تھے۔" (کنز العمال ج ۸ ص ۶۰)

ڈھ گو نے ۲۵۴ پر بدر میں اترے فرشتوں کی دستار بندی کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکا کہ فرشتوں کو کن سلطنتوں کی ولی عہدی دی جا رہی تھی اور اگر ان کی یہ دستار بندی صرف بطور اعزاز تھی تو کیا غدیر خم میں حضرت علیؓ کی دستار بندی (اگر کہیں واقعی ہوئی ہو) کو بھی یہ مقام اعزاز نہیں دیا جا سکتا؟ دوستو کچھ تو سوچو اور دونوں فرقوں کی دستار بندی کو ایک اعزاز پر لاؤ۔ حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ کو کوئی صحیح سند میسر بھی آ جائے تو اس سے ولایت سلطنت کہیں ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے آخر میں حضور اکرمؐ نے (بصورت ثبوت حدیث) لفظ ولایت بہ مقابلہ عداوت لا کر بتلا دیا کہ آپ کا یہاں مولیٰ ہونا محبت اور دوستی کی جہت سے ہے، سلطنت اور خلافت کی جہت سے نہیں ہے۔

قرأت میں تفسیری کلمات کہنے کا رواج

صحابہ میں اساتذہ آیات پڑھتے تو کبھی تفسیری جملے بھی درمیان میں کہہ دیتے تھے۔ عمرو بن رافع کہتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے مصحف لکھ رہا تھا، آپؓ نے مجھے کہا جب تو اس آیت پر حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للّٰہ قانتین پر پہنچے تو مجھے بتانا۔ وہ کہتے ہیں جب میں اس آیت پر پہنچا تو آپ نے مجھے اس طرح املاء کرائی۔

فاملت علی حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر وقوموا للّٰہ قانتین . (موطا امام مالک ص ۵۲ دھلی)

ام المومنینؓ نے پہلے آیت اسی طرح پڑھی جس طرح کہ وہ قرآن میں ہے۔ پھر لکھاتے وقت آپؓ نے یہ تفسیری جملہ ساتھ لکھایا۔ صحابہؓ اپنے مصاحف میں کہیں کہیں تفسیری جملے بھی ساتھ لکھ لیتے تھے اور اسے قرآن میں اضافہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن وہ اسی کو مانتے تھے جو اب تک مسلمانوں میں متفقہ طور پر چلا آ رہا ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ہم حضورؐ کے زمانے میں یہ آیت تبلیغ اس طرح (مع تفسیر) پڑھا کرتے تھے:

یایھا الرّسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المومنین۔ (در منثور ج۲ ص۲۹۸)

اس کا ترجمہ ڈھ کو نے اس طرح کیا ہے:

''اے رسول جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے کہ علی اہل ایمان کے مولا و آقا ہیں لوگوں تک پہنچادو۔''

ابن مردویہ نے اس روایت کی کوئی سند نہیں دی نہ امام سیوطی بھی اس کی سند کسی دوسری کتاب سے پیش کر سکے ہیں اور نہ انہوں نے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اس میں یہ کہیں نہیں کہ حضرت علیؓ آپ کے جانشین سلطنت ہوں گے۔

اگر اس کی کوئی لائق اعتبار سند مل جائے تو یہ جملہ صرف ایک قرأت یا ایک تفسیری جملے سے زیادہ کوئی فائدہ نہ دے سکے گا۔ اہل سنت ایسی روایات کو اختلاف قرأت میں یا تفسیری جملوں میں جگہ دے دیتے ہیں لیکن شیعہ اختلاف قرأت کے قائل نہیں۔ ان کی کتابوں میں جہاں ایسے جملے ہوں گے وہ ان کے عقیدہ تحریف قرآن کی ہی نشان دہی کریں گے۔ ڈھ کو نے یہاں اہل سنت پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے قرآن میں تحریف کر کے علیؓ کا نام قرآن سے نکال دیا ہے۔

اس پر ڈھ کو نے یہ سرخی باندھی ہے ''اہل جماعت کی تحریف'' اور اس کے ذیل میں لکھا ہے:

''علماء جماعت نے اس آیت مبارکہ میں دو قسم کی تحریف کی ہے۔ ایک لفظی اور دوسری معنوی۔ لفظی اس طرح کہ آیت سے یہ نام ان علیاً مولیٰ المومنین غائب کر دیا ہے اور معنوی اس طرح کہ جو آیت پہلے اتری تھی (یا ایھا الرسول بلغ) اس کو (سورہ المائدہ میں ۶۷ نمبر پر رکھا) اور جو ترتیب میں بعد میں اتری تھی الیوم اکملت لکم دینکم اسے (نمبر ۳ پر) پہلے جگہ دے دی۔'' (تجلیات صداقت ۲۵۳)

ڈھ کو نے یہاں اپنا عقیدہ تحریف قرآن کھلے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ کہ قرآن میں اختلاف قرأت کہیں نہیں، علامہ کلینی کی اس روایت میں دیکھ لیجئے۔ امام باقرؒ (۱۱۴ھ) کہتے ہیں:

ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الاختلاف یجیء من قبل الرواۃ (اصول کافی جلد ۲ ص)

ترجمہ: قرآن ایک ہی ہے ایک (ذات باری) کی طرف سے ہی آیا ہے آگے اختلاف راویوں کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔

اس میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ قرآن کو آگے روایت کرنے والے اس کی روایت میں مختلف ہو گئے ہیں سو اب ان کے ہاں یہ ایک کتاب جس پر سب کا اتفاق ہو نہ رہی۔

کلینی امام جعفر صادقؒ سے بھی روایت کرتا ہے۔

ان الناس یقولون ان القرآن نزل علی سبعة احرف (فقال) کذبوا اعداء اللہ ولکنه نزل علی حرف واحد من عند واحد. (ایضاً)

ترجمہ: لوگ (اہل سنت) کہتے ہیں قرآن کریم سات قرأت میں اترا ہے یہ جھوٹ کہتے ہیں قرآن پاک ایک ہی قرأت میں اترا۔ یعنی اس کی کوئی اور قرأت نہیں ہے سو اہل سنت کہیں گے اختلاف قرأت کی بات کریں تو اس سے اصل کا انکار لازم نہیں آتا لیکن شیعہ جب کہیں کہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی تو وہ اس میں اختلاف قرأت کا سہارا نہیں لے سکتے۔

آیت تبلیغ دین حضرت علیؓ کی خلافت کے تصور سے یکسر خلاف ہے

ڈھ کو کا یہ ڈھکوسلا ملاحظہ ہو:

''بتائیے کہ یہ آیت اور روایت (نامزدگی غدیر خم) جناب امیر علیہ السلام کی خلافت بلافصل کی نص صریح ہے یا نہیں؟ (تجلیات صداقت ص ۲۵۵)

ڈھ کو اس آیت کو حضرت علیؓ کی خلافت کی نص صریح بتا رہا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نص ہونا تو درکنار اس میں آپ کی یا کسی اور کی خلافت کا اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں حضورؐ کی پورے دین کی تبلیغ کا ذکر ہے اور اس آیت کا پورا سیاق و سباق کہ اس کے اول و آخر میں اہل کتاب موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں، معلوم ہوتا ہے مولف کو پتہ نہیں کہ نص کسے کہتے ہیں۔

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

لیجئے ہم یہاں کچھ اور وضاحت کیے دیتے ہیں۔

۱۔ اس آیت کے آخر میں ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین کے الفاظ ہیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اس میں تقابل کافروں سے ہے اور اس میں ان کی ناکامی ذکر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اگر اس آیت میں موضوع حضرت علیؓ کی خلافت ہوتا تو حسب عقیدہ شیعہ آپ کی بلافصل خلافت کے خلاف تو مسلمان تھے کافر نہ تھے۔ سو آیت کا یہ حصہ شیعہ تصور خلافت سے یکسر جدا ہے۔ ڈھ کو صحابہ کرامؓ کو جنہوں نے اس کے عقیدہ میں حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل ہونے نہ دیا، مسلمان سمجھتا ہے کافر نہیں کہتا۔ پھر یہ اس کی پیش کردہ آیت ان پر کیسے منطبق ہو گی۔ مولف لکھتا

ہے:

''شیعان حیدر کرار پر یہ سراسر بہتان ہے کہ وہ جناب عمرؓ یا اس کے دوساتھیوں کو کافر سمجھتے ہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' (تجلیات ۱۸۲)

پھر آگے جا کر بھی لکھتا ہے:

''ہم ان کو کافر نہیں سمجھتے۔'' (ص ۱۹۴)

۲۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بمقابلہ اہل الکتاب تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مخالفین کے شر سے بچائے گا اور شیعہ کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ صحابہ آخری وقت میں حضورؐ پر چھائے رہے۔ انہوں نے حضورؐ کی کوئی بات نہ چلنے دی۔ وصیت لکھنے کے لیے قلم دکاغذ پیش کیا نہ غدیر خم کی بات چلنے دی۔ نہ سقیفہ میں حضرت علیؓ کو بلایا گیا۔ نہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں بنو ہاشم کو میٹنگ کرنے دی۔ نہ حضرت عباسؓ کو حضورؐ کی مسجد میں نماز کی امامت کرنے دی۔ نہ یہ لوگ حضورؐ کے جنازہ میں شامل ہوئے۔ نہ انہوں نے حضورؐ کے دفن کی جگہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں بننے دی۔ نعوذ باللہ من تلک الخرافات.

اب آپ خود ہی سوچیں اگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اعلان رسالت میں یہ تسلی دی تھی واللہ یعصمک من النّاس۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اعلان خلافت کو کیوں چلنے نہ دیا اور مخالفین کے شر سے حضورؐ کو اور اہل بیت اطہار کو کیوں نہ بچایا۔

۳۔ غدیر خم پر ٹھہرنا ۱۷ ذوالحجہ کو ہوا۔ اگر غدیر خم میں حضورؐ نے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا اعلان فرمایا تو مسئلہ خلافت اصول دین میں سے نہ رہا کیونکہ دین تو ۹ ذوالحج بروز عرفات مکمل ہو چکا تھا اور بقول امام محمد باقر آیت الیوم اکملت لکم دینکم وہیں عرفات میں اتری تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شیعہ کبھی مسئلہ خلافت کو اپنے اصول دین سے خارج سمجھنے کی ہمت نہ کریں گے۔ اور نہ یہ کہہ سکیں گے کہ ہمارا دین ۹ ذوالحج کو مکمل نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان ۱۷ ذوالحج کو ہوا یہ اپنے ہاتھوں اپنے مذہب کو دفن کرنا ہوگا۔

۴۔ بعض اوقات شیعہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت بذات خود تو بے شک حضرت علیؓ کی خلافت پر نص نہیں لیکن حدیث غدیر خم ساتھ ملانے سے یہ خلافت پر نص بن جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہارا حدیث غدیر خم کو ساتھ ملانا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا عقیدہ خلافت اس آیت سے کسی طرح ثابت نہیں ہو رہا اور تم نے اپنا مذہب بچانے کے لیے یہ روایت وضع کی کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم بمقام غدیر خم اتری تھی' عرفات میں نہ اتری تھی۔ اور یہ حضرت عمرؓ اور حضرت امام محمد باقر دونوں کی متفق علیہ روایت کے خلاف ہے۔

۵۔ پھر اس روایت میں لفظ مولیٰ خلافت کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے اور یہ لفظ حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے پر نص صریح نہیں ہے۔ خلافت حضورؐ کے بعد کی ایک انتظامی ذمہ داری ہے اور اس حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ میں بعد کا لفظ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اس کے برعکس اس روایت میں دو مولیٰ کا پتہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ خلافت تو حد (ایک شخص کی حکومت) چاہتی ہے مولیٰ بمعنی دوست ہو۔ تو بے شک ایک وقت میں دو مولیٰ ہو سکتے ہیں لیکن یہ لفظ اگر خلیفہ کے معنی میں ہو تو ایک وقت میں دو مولیٰ نہیں ہو سکتے اور روایت میں یہ الفاظ دو دفعہ ہیں پھر دوستی تو افراد سے ہو سکتی ہے لیکن خلافت افراد پر نہیں پوری قوم پر ہوتی ہے۔ اگر حضورؐ ان الفاظ میں خلافت کا اعلان کر رہے تھے تو اس بات کو اس طرح کہنا من کنت مولاھم فعلی مولاھم مقتضائے حال کے مطابق تھا۔ سو جو کلام مقتضائے حال کے مطابق نہ ہو وہ کلام نبوت نہیں سمجھا جا سکتا۔ نبی کا کلام مقام بلاغت سے کہیں نہیں گرتا۔

۶۔ پھر یہ روایت ایک بھی صحیح سند سے ثابت نہیں چہ جائیکہ اسے متواتر کہہ کر اس سے کوئی عقیدہ کشید کیا جا سکے۔ یہ حدیث ان ضعیف حدیثوں میں سے ہے جن کے طرق روایت اور جتنے بڑھتے جائیں ان کا ضعف اور نمایاں ہوتا جائے گا۔ محدث جلیل حافظ جمال الدین الزیلعی (۸۶۲ھ) لکھتے ہیں:

وکم من حدیث کثرت رواته و تعددت طرقه وهو حدیث ضعیف کحدیث الطیر وحدیث افطر الحاجم والمحجوم وکحدیث من کنت مولاه فعلی مولاه بل قد لا یزید کثرة الطرق الا ضعفا. (نصب الرایه ج ۱ ص ۳۶۰)

ترجمہ: کتنی حدیثیں ہیں جن کے کئی کئی راوی ہیں اور ان کے کئی کئی سلسلے ہیں مگر وہ ہیں پھر بھی ضعیف۔ جیسے کہ حدیث الطیر اور حدیث پچھنے لگانے سے روزہ جاتا رہتا ہے اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ بلکہ جتنے ان حدیثوں طرق برتتے جاتے ہیں ان کا ضعف اور بڑھتا جاتا ہے۔

لفظ مولیٰ کبھی جانشینی پر نص نہیں سمجھا گیا

پہلے عربی کے دو لفظ سمجھ لیں۔ لغت میں ان دو کے علیحدہ علیحدہ معنٰی دیے گئے ہیں۔

(۱) اولیٰ زیادہ حقدار اور لائق۔ ولایت (دوستی) اس کا مادہ ہے۔

(۲) مولیٰ' مالک' آقا' سردار' غلام' محبت کرنے والا' ساتھی' حلیف پڑوسی وغیرہ۔

حدیث میں حضرت علیؓ کے لیے ولی اور مولیٰ دونوں الفاظ ملتے ہیں۔ یہ ایک ہی روایت کے مختلف طریق ہیں۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ مولیٰ یہاں ولی (دوست) کے معنی میں ہے۔

شیعہ لفظ مولیٰ سے حضرت علیؓ کی بطور ولی عہد تقرری ثابت کرتے ہیں اس کے لیے وہ اسے اولیٰ کے معنی میں

لاتے ہیں حالانکہ مولیٰ کے ان معنوں میں اولیٰ کہیں نہیں ملتا۔ مولانا دبیر مرحوم نے دعویٰ کیا تھا کہ لفظ مولیٰ دس معنی میں مشترک لفظ ہے اور ان میں اولیٰ کہیں نہیں ملتا۔ ڈھ گو خود تسلیم کرتا ہے کہ یہ لفظ جانشین سلطنت کے لیے کہیں بطور نص وارد نہیں ہوا۔ وہ اسے صرف اس کے ضمنی پیرائے میں خلیفہ پر منطبق ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

لفظ مولیٰ کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں اولی بکم ..... **المولی بمعنی اولی بالشئی۔**

یہ الفاظ کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے خود بتا رہے ہیں کہ یہ کوئی متفقہ بات نہیں ہے۔ جب یہ صورت حال ہوئی تو ظاہر ہے کہ جہاں بھی اس سے استدلال کیا جائے گا وہیں اس کا کوئی دوسرا مورد بھی سامنے آ جائے گا اور ظاہر ہے کہ دوسرا احتمال آنے سے پہلا استدلال یکسر جاتا رہتا ہے۔ اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ عہدے اوصاف سے نہیں منصب کے نام سے قائم کیے جاتے ہیں۔

سو لفظ مولیٰ اگر کہیں اولیٰ کے حق میں بولا جائے تو یہ ہرگز کسی منصب کا نام نہ ہوگا۔ کسی مناسبت سے اسے اس کے اس معنی میں لے آئیں گے لیکن یہ نہ ہوگا کہ یوں کہا جائے کہ لفظ مولیٰ کا لغت میں ایک معنی اولیٰ بھی ہے۔ اگر اسے کسی مناسبت سے اولیٰ کے معنی میں لایا بھی جائے تو یہ صرف بر سبیل احتمال ہوگا۔ اس لفظ (مولیٰ) کے اپنے معنی اولیٰ کے کبھی نہ مانے جائیں گے۔ شریف مرتضٰی (۴۳۶ھ) نے حضرت علیؓ کی ولی عہدی ثابت کرنے کے لیے مندرجہ ذیل آیت کے لفظ مولیٰ سے یہ معنی کشید کیا ہے۔

ماواکم النار هی مولاکم و بئس المصیر (پ ۲۷ الحدید ۱۵)

ترجمہ: ''تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہی تمہارے لیے زیادہ موزوں ہے اور جہنم بہت بری جگہ ہے لوٹنے کی۔''

دوسرے مترجمین نے یہاں مولیٰ کا ترجمہ رفیق کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ مصیر (ٹھکانہ) کیا ہے اور یہی معنی اس کا قرآن کریم میں عطف تفسیر سے بتلایا گیا ہے۔ هی مولاکم و بئس المصیر۔ کلبی نے اس کا معنی اولیٰ بکم کیا ہے اور اسے زجاج فراء اور ابوعبیدہ سے نقل کیا ہے۔ یہ ان حضرات نے یہاں اس لفظ کی مراد اولی بکم سے واضح کی ہے۔ یہی اس آیت کے معنی ہیں اور ساتھ ہی ماوٰی اور مصیر کے الفاظ دیے گئے ہیں۔ سو یہ اس آیت کے معنی ہیں نہ کہ یہ لفظ مولیٰ کی تفسیر ہے۔ مولیٰ کا لفظ لغت میں کہیں اولیٰ کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ آیت کے معنی میں احتمال ہے کہ اسے کسی مناسبت سے اولی بکم کے معنی میں لیا گیا ہو۔ سو یہ لفظ مولیٰ کی تفسیر ہرگز نہیں ہے۔

امام فخرالدین رازی نے یہاں لفظ مولیٰ میں کئی اقوال لکھے ہیں۔ یہ کئی اقوال خود اس بات پر نص ہیں کہ لفظ مولیٰ کی تفسیر اولیٰ سے کسی مناسبت سے صرف ایک احتمال کے درجے میں ہے۔ اولیٰ لفظ مولیٰ کی تفسیر نہیں ہے نہ یہ اس کا معنی ہے۔ آیت کے معنی اور اس لفظ کی لغوی دلالت دونوں میں فرق ہے۔ شریف مرتضٰی اس آیت کو لفظ مولیٰ کے معنی کہنے میں غلطی کر رہا ہے۔

ڈھ گو نے یہاں امام رازی اور قاضی بیضاوی اور علامہ زمخشری کو اپنے گواہوں میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ ان تینوں میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ رہا کہ لفظ مولیٰ کے ایک معنی اولیٰ کے بھی ہیں۔ امام رازی کے ان الفاظ پر غور کریں اور ڈھ گو کے جھوٹ کی داد دیں۔ امام رازی نے کہیں بھی نہیں کہا کہ لفظ مولیٰ کے ایک معنی اولیٰ کے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں تحقیق یہی ہے کہ مولیٰ کے معنی یہاں ولی (دوست) کے ہیں۔

وفی لفظ المولیٰ ههنا اقوال احدها قال ابن عباسؓ (مولاکم) ای مصیرکم و تحقیقه ان الولی موضع المولی ..... والثانی قول الکلبی یعنی اولیٰ بکم وهو قول الزجاج و الفراء و ابی عبیده. (تفسیر کبیر ج ۲۹ ص ۱۹۹)

امام رازی نے آگے جا کر شریف مرتضٰی کی نہایت کھل کر تردید کی ہے۔ اس پر بھی شیعہ علماء امام رازی کو اپنے حامیوں میں کھڑا کریں تو ان کے علم و فہم اور ان کی امانت و دیانت کی داد دینی چاہیے۔ ہم آگے ان شاء اللہ امام رازی کی پوری عبارت نقل کریں گے۔

قاضی بیضاویؒ (۶۸۵ھ) نے مولاکم کی تفسیر اولیٰ بکم سے لبید کے اس شعر کی روشنی میں کی ہے۔ اس شعر میں لفظ مولیٰ المخافة پر غور کیجئے جہاں ڈرہی ڈر سوار ہو اور کوئی چیز راہ نہ پا سکے وہاں سمجھ لیجئے کہ اس پر ڈر ہر طرف سے چھایا ہوا ہے۔ اس کا آگا ہو یا پیچھا۔ ڈر اس پر پوری طرح اترا ہوا ہے۔ وہ ڈر ہی کے لائق ہے۔ ڈر اس کا رفیق ہو چکا۔ لبید کہتا ہے:

فعدت کِلا الفرجین تحسب انّه	**مولیٰ المخافة خلفُها و امامُها**
حتی اذا یئس الرماة وارسلوا	**غضفاً دواجن قافلاً اعصامها**

ترجمہ: سو وہ جنگلی گائے بایں طور چلی کہ اس کی آگے اور پیچھے کی دونوں سمتیں ڈر ہی کی ہو رہیں۔ ڈر اس پر ہر طرف سے چھا چکا۔''

اس کو خوف آگے اور پیچھے سے لاحق تھا۔ وہ دوڑی جا رہی تھی۔ اس کے بچے کو درندے نے کھا لیا تھا اور وہ اب ڈر کے ہی لائق ہو کر رہ گئی تھی۔ **مولیٰ المخافة** کا معنی ہوگا **اولیٰ موضع لان یکون فیه الخوف۔**

یہاں مولیٰ، اولیٰ کے معنی میں بہ طریق مجاز ہے۔ لغت میں مولیٰ کا لفظ دس معنی میں مشترک ہے ان میں اس کا

معنی اولیٰ کہیں نہیں ہے اور اگر یہ ہو بھی تو کئی دوسرے معنی ہوتے ہوئے اسے اس ایک معنی پر نص کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ترجمہ: ۲۔ حتی کہ جب تیر پھینکنے والے سب مایوس ہو کر رہ گئے (اور وہ زد سے نکل گئی تھی) تو انہوں نے اس پر دراز کان شکاری کتے چھوڑے جن کے پٹھے خشک ہو چکے تھے۔ اب وہ وحشی گائے خوف ہی کے لائق ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے ڈھ گو اسے خوف کے لیے اولیٰ سمجھ رہا ہے۔ یہاں یہ لفظ مولیٰ حقیقت نہیں واقعہ کی مناسبت سے قریب کے معنی میں ہے۔ یہاں اولیٰ مولیٰ کا حقیقی معنی نہیں' ایک مناسبت سے معنی لازم ہے جیسے کسی سخی کو کہیں هو مئنة الكرم وہ کرم کی علامت ہے۔ یہ اس کے قائم مقام ہے کہ کہیں انه لكريم تو مولیٰ کہنے سے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اس کے قریب کا ہے۔

او مكانكم عما قريب من المولىٰ وهو القريب او ناصركم علىٰ طريقة قوله تحيته بينهم ضرب وجيع۔ ان کا آپس میں تحفہ ایک دردناک ضرب لگانا ہے۔

یہاں یہ ناصرکم کا معنی دے گا یا یہ اس کے ناصر ہونے کی نفی سمجھی جائے گی۔

المراد نفى الناصر علىٰ طريقة قولهم تحية بينهم ضرب وجيع والمراد نفى التحيّة فيما بينهم قطعاً ضرورة ان الضرب الوجيع ليس بتحية فيلزم ان لا تحية بينهم البتة. (شيخ زاده على البيضاوى ج ٨ ص ١١٣)

امام رازی بھی یہ معنی پہلے کر آئے ہیں اور یہ آیت کے معنی ہیں لفظ مولیٰ کے دس معانی ہیں اور یہ حقیقی معانی ہیں ان میں اولیٰ کا معنی کہیں نہیں۔

وفى الآية وجه آخر وهو ان معنى قوله هى مولاكم اى لا مولىٰ لكم و ذلك لان من كانت النار مولاه فلا مولىٰ له كما يقال من كان ناصره الخذلان و معينه البكاء اى لا ناصر له ولا معين. (تفسير كبير ج ٢٩ ص ١٩٩)

اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ اب وہ ڈر ہی کی ہو رہی یا ڈر اس کا متولی و مولیٰ ہو کر اس پر چھا یا رہا۔ بیضاوی میں آگے یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

او متوليكم يتولاكم كما توليتم موجباتها فى الدنيا (وبئس المصير) النار.

اب ہم شریف مرتضٰی کے رد میں امام فخر الدین رازی کی ایک مفصل عبارت بھی نقل کیے دیتے ہیں جس سے ہمارے قارئین جان لیں گے کہ ڈھ گو کا ان کو اپنے حامیوں میں پیش کرنا کس قدر امانت اور دیانت کے خلاف ہے۔

امام فخر الدین رازی کے نام سے اس نے یہ نہایت کریہہ جھوٹ بولا ہے۔ امام رازی مولیٰ کی تفسیر اولیٰ سے کرنے کی پرزور تردید کرتے ہیں اور یہ الٹا انہیں اپنے گواہوں میں پیش کر رہا ہے۔

امام رازی لکھتے ہیں:

ليس بتفسير اللفظ لانه لو كان مولىٰ و اولىٰ بمعنى واحد فى اللغة يصح استعمال كل واحد منهما فى مكان الآخر فكان يجب ان يصح ان يقال هٰذا مولى من فلان كما يقال هٰذا اولىٰ من فلان ويصح ان يقال هٰذا اولىٰ فلان كما يقال هٰذا مولىٰ فلان ولما بطل ذلك علمنا ان الذى قالوه معنى و ليس بتفسير ولما نبهنا علىٰ هٰذه الدقيقة لان الشريف المرتضٰى لما تمسك بامامة علىٰ لقوله عليه السلام من كنت مولاه فعلى مولاه قال احد معانى مولىٰ انه اولىٰ واحتج فى ذلك باقوال ائمة اللغة فى تفسير هٰذه الآية بان مولىٰ معناه اولىٰ واذا ثبت ان اللفظ محتمل له وجب حمله عليه لان ما عداه اما بيّن الثبوت ككونه ابن العم والناصر او بيّن الانتفاء كالمعتِق والمعتَق فيكون علىٰ تقدير الاول عبثا وعلىٰ التقدير الثانى كذباً . واما نحن فقد بيّنا بالدليل ان قول هٰؤلاء فى هٰذا الموضع معنى لا تفسير و حينئذ يسقط الاستدلال به.

پھر امام رازی ایک دوسری توجیہ بھی لکھتے ہیں:

وفى الآية وجه آخر وهو ان معنى قوله هى مولاكم اى لا مولىٰ لكم وذلك لان من كانت النّار مولاه فلا مولىٰ له كما يقال من كان ناصره الخذلان و معينه البكاء اى لا ناصر له و لا معين. (تفسير كبير ج ٢٩ ص ١٩٩)

ترجمہ: '' اولیٰ لفظ مولیٰ کی تفسیر نہیں ہے۔ مولیٰ اور اولیٰ اگر ایک معنی میں ہوتے تو ان میں سے ہر ایک کا استعمال دوسرے کی جگہ درست ہوتا۔ یہ کہنا کہ هٰذا اولىٰ من فلان (یہ اس سے بہتر ہے) اس طرح بھی کہا جا سکتا۔ هٰذا مولىٰ من فلان او هٰذا مولىٰ فلان کی جگہ هٰذا اولىٰ فلان کہنا بھی درست ہوتا۔ جب یہ باطل ٹھہرا کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں تو ہم نے یہ جان لیا کہ یہ بات صرف آیت کا معنی کہی جا سکتی ہے۔ اولیٰ مولیٰ کی تفسیر نہیں ہے اور ہم نے اس باریک بات پر اس لیے متنبہ کیا ہے کہ شریف مرتضٰی نے حضرت علیؓ کی امامت ثابت کرنے کے لیے حدیث من كنت مولاه سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ مولیٰ کے ایک معنٰی اولیٰ کے بھی ہیں اور اس نے اس آیت (پ ۲۷ الحدید ۱۵) کی تفسیر میں بعض ائمہ لغت سے استناد پکڑا ہے کہ مولیٰ کبھی اولیٰ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لفظ اس معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے تو اسے اسی معنی پر لانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے جو دوسرے معنٰی ہیں جیسے

چچا کا بیٹا یا الناصر وہ بیّن الثبوت ہیں یا معتِق اور معتَق کی طرح بیّن الانتفاء ہیں پہلی صورت میں یہ بات عبث ٹھہرے گی اور دوسری صورت میں جھوٹ۔ اور ہم دلیل سے واضح کرتے ہیں کہ ان ائمہ لغت کا کہنا بطور معنیٰ آیت کے ہے بطور تفسیر لفظ مولیٰ کے نہیں ہے۔ اس صورت میں شریف مرتضیٰ کا استدلال بالکل جاتا رہتا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ امام رازی جنہوں نے شریف مرتضیٰ کا استدلال پورا باطل ٹھہرایا ہے انہیں ڈھ گو کا اپنے گواہوں میں کھڑا کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

پھر ڈھ گو نے اس آیت سے استدلال لینے میں قاضی بیضاوی کو بھی اپنا ہمنوا ٹھہرایا ہے۔ ہم قاضی بیضاوی کی بات بھی اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس میں بھی ڈھ گو دیانت و امانت سے یکسر خالی نظر آ رہا ہے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کے الفاظ ماواکم النّار ھی مولاکم کو اس معنی میں لکھ رہے ہیں ھی اولیٰ بکم یہی آگ تمہاری رفیق ہے۔ یہ لفظ مولیٰ کے یہاں معنی ہوئے کہ تم اسی کے لائق ہو تمہارا اور کوئی رفیق نہ ہوگا۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ اولیٰ بہ لفظ مولیٰ کی یہاں تفسیر ہے۔"

اب ڈھ گو کی دوسری سرخی ملاحظہ ہو کہ مولیٰ کا لفظ ایک حدیث میں بھی اولیٰ کے معنی میں آیا ہے۔

مولیٰ بمعنی اولیٰ در حدیث

اس میں ڈھ گو لکھتا ہے:

کتب حدیث میں ایک مشہور حدیث مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایما امرأة نکحت بغیر اذن مولاھا فنکاحھا باطل.

ترجمہ: "ہر وہ عورت جو اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے۔"

حدیث کے اصل الفاظ یہ تھے اور انہی سے یہ حدیث درجہ شہرت کو پہنچتی ہے۔

عن عائشة رضی اللہ عنھا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای امرأة نکحت بغیر اذن موالیھا فنکاحھا باطل باطل باطل. (رواہ ابوداؤد ج ۱ ص ۲۸۴)

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ سے مروی ہے آپ کہتی ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس عورت نے بھی اپنے ولی کے بغیر نکاح کیا اس کا یہ نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔"

موالی جمع ہے مولیٰ کی۔ مولیٰ کا معنی اولیٰ ہو تو موالی کے معنی ہوں گے قریب کے رشتہ دار۔ ان کی اجازت کے بغیر جو عورت اپنی مرضی سے کہیں نکاح کرے تو اس کا نکاح درست نہیں۔ لفظ موالی میں تعدد ہے اور خلیفہ میں توحد چاہیے۔

سو لفظ موالی سے ایک خلیفہ پر استدلال کسی طرح درست نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بھی حضورؐ سے روایت کرتے ہیں:

اذا نکح العبد بغیر اذن موالیہ فنکاحہ باطل. (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: "جب کسی غلام نے اپنے مالکوں کی اجازت کے بغیر کہیں نکاح کر لیا تو اس کا یہ نکاح باطل شمار ہوگا۔"

اس میں بھی لفظ موالی جمع ہے۔ ڈھ گو اس سے من کنت مولاہ فعلی مولاہ سے ایک حضرت علیؓ کی خلافت ثابت کر رہا ہے۔

حضرت جابرؓ بھی کہتے ہیں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

ایما عبد تزوج بغیر اذن موالیہ فھو عاھر۔ (اخرجہ ابوداؤد۔)

جامع ترمذی میں آپ کو یہ حدیث ان الفاظ میں ملے گی۔

ایما امرأة نکحت بغیر اذن ولیّھا فنکاحھا باطل (ص ۱۳۰) ج ۱)

عن ابی بردة عن النبیؐ لا نکاح الا بولی۔ (رواہ الترمذی)

لا نکاح الا بولی۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۳۵)

یہ سب طرق اس بات کی قوی شہادت ہیں کہ لفظ موالی یہاں اولیاء نکاح کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے نہ کہ خلافت کے معنی میں۔ مگر ڈھ گو یہاں اس روایت کے لفظ مولیٰ سے حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل ثابت کر رہا ہے۔

بریں عقل و دانش باید گریست

ڈھ گو کو اگر ذخیرہ حدیث سے لفظ مولیٰ (بمعنی رفیق اور دوست) کی ضرورت تھی تو اسے چاہیے تھا کہ وہ اس حدیث کو دیکھ لیتا جب حضور اکرمؐ نے زید بن حارثہؓ کو (جسے پہلے زید بن محمد کہا جاتا تھا) کو کہا تھا:

انت اخونا و مولانا ۔ "تو ہمارا دینی بھائی اور ہمارا رفیق ہے۔"

جب لسان شریعت سے حضرت زیدؓ کے لیے لفظ مولیٰ رفیق کے معنی دے رہا ہے تو حضرت علیؓ کے لیے لفظ مولیٰ کو اس معنی سے نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضورؐ کا حضرت زیدؓ کو اپنا مولیٰ کہنا قرآن کی اس آیت کی مناسبت سے تھا۔

فان لم تعلموا آباءھم فاخوانکم فی الدین وموالیکم.

یہ لفظ موالی مولیٰ کی ہی جمع ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کیا اس قسم کے الفاظ سے کسی قوم یا ملک کے فیصلے کیے جا سکتے ہیں؟

قبیلہ کی سرداری کے لیے لفظ سردار کافی نہیں

ایک قوم میں سردار کئی بھی ہو سکتے ہیں لیکن سربراہ کئی نہیں ہوتے۔ سربراہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ قریش پورے اہل مکہ کے سردار سمجھے جاتے تھے لیکن ان میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ کوئی سربراہ سلطنت۔ سو لفظ سردار سے کسی قبیلہ کی سرداری اور سربراہی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

بنوطی تمام لوگوں کے سربراہ تھے مگر سب لوگوں کا سربراہ ان کا بھی سربراہ تھا۔ معلوم ہوا سردار ہونا سربراہ ہونے کے معنی میں نہیں آتا۔ افسوس ڈھ گو متنبی کے اس شعر پر بھی غور نہ کر سکا۔

حتی یشار الیک ذا مولاهم

وهم الموالی والخلیقة عُبیدهم

ترجمہ: ”یہاں تک کہ پھر تیری طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ ان کا مولیٰ ہے حالانکہ بنوطی سب مولیٰ ہیں اور سارے لوگ ان کے غلام ہیں۔“

معلوم ہوا مولیٰ ہونے کے بعد بھی ایک مقام ولایت آتا ہے پھر اس سیاق سے مولیٰ سے سربراہ کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں۔ تاہم اسے کسی قانونی فیصلے پر نص پھر بھی نہ کہا جا سکے گا۔

غدیر خم میں حضور اکرمؐ خود بھی مولیٰ تھے اور آپ نے (بشرط صحت حدیث) حضرت علیؓ کو بھی مولیٰ فرمایا۔ حضور سب کے سربراہ تھے اور باقی سب آپس میں ایک دوسرے کے مولیٰ تھے، رفیق تھے اور دوست تھے۔

یہاں مولیٰ سے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے کوئی شہادت نہیں ملتی۔

ولی یلی ولایة جب کسی جگہ کے لیے آئے تو اس سے مراد اس پر قبضہ پانا ہوتا ہے۔ جہنم کو کہا گیا ھی مولاکم وہ تمہیں لے لے گی یہی تمہارا ٹھکانہ ہے۔ لیکن جب یہ لفظ کسی شخص کے لیے آئے تو لغت عرب میں اسے خلافت پر آنا اسی صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ خلافت ساتھ بطور مفعول مذکور ہو۔ جیسے یہ لفظ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں آیا ہے۔

یلی الخلافة بعدی ابوبکر.

ترجمہ: ”میرے بعد ابوبکرؓ والیٔ خلافت ہوں گے۔“

ولایت (یلی کا لفظ) جس طرح یہاں خلافت کو ساتھ لیے ہوئے ہے، حدیث غدیر خم میں مولیٰ کے ساتھ خلافت کسی طریق میں بھی مذکور نہیں۔ سو صرف مولیٰ کے معنی اولیٰ بالخلافت کسی طرح نہیں کیے جا سکتے۔

ڈھ گو نے حضرت علیؓ کے مولیٰ ہونے پر جہنم کے مولیٰ ہونے سے استدلال کیا ہے۔ ہم اس بے ادبی کی جرأت نہیں کر سکتے۔

پھر ڈھ گو نے اپنے گواہوں میں امام رازی، قاضی بیضاوی اور علامہ زمخشری کا نام بھی لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

ان میں سے کوئی بھی حضرت علیؓ کے لیے لفظ مولیٰ آنے سے ان کے اولیٰ بالخلافۃ ہونے کا قائل نہیں ہے۔ ڈھ گو نے اس پر یہ جلی سرخی باندھی ہے۔

قرآن کریم نے خدا، حضرت جبریل اور صالح المومنین سب کو ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مولیٰ بتایا ہے۔

افسوس کہ ڈھ گو کو یہاں یہ بات یاد نہ رہی۔ صرف اس لیے کہ اس سے حضورؐ کے متعدد مولیٰ ثابت ہوتے ہیں اور خلافت میں تو حد چاہیے تعدد موالی سے خلافت ثابت نہیں ہوتی تھی۔

فان اللہ ہو مولاہ وجبریل وصالح المومنین. (پ ۲۸ التحریم ۴)

ترجمہ: ”بے شک اللہ حضورؐ کا مولیٰ ہے اور جبریل بھی اور نیک مومنین بھی اس کے مولیٰ ہیں۔“

شیخ الاسلام نے اس آیت میں لکھا ہے، بعض سلف نے صالح المومنین کی تفسیر میں ابوبکرؓ و عمر کا نام بھی لیا ہے۔

اس میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو بطور قضیہ فرضیہ کہا گیا ہے کہ اگر تم اس پیغمبر پر چڑھائی کرو گی، اپنی بات زور سے منواؤ گی تو تمہیں پتہ رہے کہ اس میں تمہارے باپ بھی تمہارے ساتھ نہ ہوں گے۔ حضورؐ کے ساتھ ہوں گے۔ اسی صورت میں حضرت ابوبکرؓ بھی حضورؐ کے مولیٰ رہیں گے اور حضرت عمرؓ بھی حضورؐ کے ساتھ ہوں گے اپنی بیٹی کے ساتھ نہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ تو سب مومنین کا مولیٰ ہے۔

ان اللہ مولی الذین امنوا وانّ الکافرین لا مولیٰ لھم. (سورہ محمد)

قرآن کریم نے یہاں لفظ مولیٰ کا معنی ساتھ دینے والے بتایا ہے۔ خلافت میں تعدد نہیں ہوتا اور حضورؐ کے مولیٰ تو لاتعداد تھے۔ یہاں صاف سمجھ میں آ رہا ہے کہ لفظ مولیٰ سے خلافت کا ثبوت قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے لیے ڈھ گو کو جہنم کے مولیٰ ہونے کے سوا کوئی آیت نہیں ملی۔

لفظ مولیٰ پر قرآن کی ایک اور شہادت

مولیٰ کے معنی مطلق مالک کے بھی ہوں تو بھی اس سے سربراہ مملکت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

ضرب اللہ مثلاً رجلین احدھما ابکم لا یقدر علیٰ شیٔ وھو کلّ علیٰ مولاہ اینما یوجھہ لا یأت بخیر. (پ ۱۴ . النحل ۷۶)

ترجمہ: ”اور بتائی اللہ نے ایک دوسری مثال، دو مرد ہیں ان میں ایک گونگا ہے وہ کسی کام کے لائق نہیں اور وہ بوجھ ہے اپنے مالک پر کہیں بھی اسے بھیجے نہ کر پائے کوئی بھلائی۔ کیا وہ اور جو شخص حکم کرے انصاف سے برابر ہو سکتے ہیں۔“

یہاں لفظ مولیٰ مالک کا معنٰی دے رہا ہے اور یہ معنٰی ان دس معانی میں سے ہے جو اہل لغت نے اس لفظ مشترک

کے بتائے ہیں۔

لفظ مولیٰ کے معنی کتب لغت میں

لفظ مولیٰ کے لغت میں کئی معنی ملتے ہیں۔ محدث کبیر ملا علی قاری نہایہ سے نقل کرتے ہیں:

فی النهایه المولیٰ یقع علیٰ جماعة کثیرة کا الرب والمالک والسید والمنعم والمعتق والناصر والمحب والتابع والجار وابن العم والحلیف والعقید والصهر والعبد والمنعم علیه واکثرها قد جاء ت فی الاحادیث و من کنت مولاه فعلی مولاه یحمل علیٰ اکثر هذه الاسماء المذکورة.

ترجمہ:۔ نہایہ میں ہے کہ مولی کا لفظ کئی لوگوں پر صادق بیٹھتا ہے جیسے لفظ رب، مالک سید منعم آزاد کرنے والا مدد کرنے والا چاہنے والا ہمسایہ چچازاد ساتھی عقد میں آیا ہوا سسر غلام نعمت پانے والا ان میں سے اکثر الفاظ احادیث میں ملتے ہیں من کنت مولاہ میں لفظ مولی بھی ان میں سے اکثر پر محمول ہوتا ہے

اب مصباح اللغات میں دیکھئے:

مالک وسردار۔ غلام آزاد کرنے والا۔ آزاد شدہ انعام دینے والا۔ جس کو انعام دیا جائے۔ محبت کرنے والا۔ ساتھی۔ حلیف۔ پڑوسی مہمان۔ شریک بیٹا۔ چچا کا بیٹا۔ بھانجا۔ چچا۔ داماد۔ رشتہ دار۔ ولی۔ تابع ۔ اور کہا جاتا ہے **هو یتمول علینا** وہ ہمارا سردار بننا چاہتا ہے: (مصباح اللغات ص ۹۶۸)

مولیٰ کے معنی اولیٰ بالتصرف کرنے سے اگر یہ سوال سامنے آئے کہ اگر کسی عورت کا نکاح اس کے قبیلے کا سردار کہیں کر دے اور اس عورت کا باپ اس سے رضامند نہ ہو تو وہ نکاح درست ٹھہرے گا یا باطل اس صورت حال میں وہ عورت کیا کرے اپنے نکاح کے لیے اپنے مولیٰ (سردار قبیلہ) کی اجازت حاصل کرے۔ اپنے دوسرے مولیٰ (باپ یا بھائی) کی وہ اپنے دو مولاؤں میں سے کس کی اجازت حاصل کرے اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کیا یہ کافی نہیں کہ وہ مولیٰ کے معنی سربراہ مملکت تسلیم ہی نہ کرے اور اس حدیث میں لفظ مولیٰ سے ولی نکاح مراد لے نہ کہ خلیفہ وقت یا سربراہ مملکت۔

اس پر ڈھکو لکھتا ہے:

عین ممکن ہے کہ لفظ مولیٰ صرف اولیٰ میں حقیقت ہو اور دوسرے (دس) معانی میں مجاز ہو۔ **واذا جاء**

الاحتمال بطل به الاستدلال۔ (تجلیات ص ۲۵۶)

یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے کبھی لغت کی کوئی کتاب نہ دیکھی ہو۔ ایک مجازی معنی سے دس حقیقی معنوں کو مجاز بتلانا ایسے ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ یہ احتمال لا کر خود ایسے ہی کسی استدلال کو تو باطل نہیں کر رہا۔

نا مناسب نہ ہوگا کہ ہم روایت **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** کے بارے میں کچھ اور بھی امور ہدیۂ قارئین کر دیں۔

اس روایت میں لفظ بعدی شیعہ رواۃ کا وضع کردہ ہے

شیعہ علماء نے اس روایت سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کے لیے اس میں لفظ بعدی کا بڑی فراخدلی سے اضافہ کیا ہے۔ اس میں ان کے پیش نظر یہی بات تھی کہ ایک وقت میں دو مولیٰ نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ اپنے وقت میں مولیٰ تھے اور حضرت علیؓ حضورؐ کے بعد مولیٰ ہوں گے۔ ان کے حدیث میں لفظ بعدی اضافہ کرنے سے ان کی یہ بات بھی یکسر مٹ گئی کہ غدیر خم میں حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو کہا تھا **انت مولائی و مولی کل مومن**۔

امام احمد نے اپنی مسند میں یہ حدیث ولایت علیؓ متعدد طرق سے روایت کی ہے اور اس میں ایک طریق میں بھی بعدی کا لفظ نہیں ہے۔ رہی حضرت علیؓ کی ولایت ومحبت تو وہ ہر مومن کے سینہ میں ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف حضورؐ کی وفات کے بعد ہی قائم ہو۔ سو حدیث اگر ہے تو اتنی ہی ہے **وهو ولی کل مومن** اس میں بعدی کے الفاظ حضور اکرمؐ پر ایک افتراء ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> **وکذلک قوله هو ولی کل مومن بعدی کذب علی رسول الله صلی الله علیه وسلم بل هو فی حیاته و بعد مماته ولی کل مومن و کل مومن ولیه فی المحیاء والممات فالولایة التی هی ضد العداوة لا تختص بزمان.**

(منہاج السنۃ ج ص)

ترجمہ: ''اسی طرح یہ الفاظ کہ حضرت علیؓ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہوں گے حضور اکرم ﷺ پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ آپ حضور ﷺ کی حیات میں بھی اور آپ کے بعد بھی ہر مومن کے دوست ہیں اور ہر مومن آپ کا زندگی میں بھی اور بعد وفات بھی دوست ہے سو جو ولایت عداوت کی ضد سے ہے وہ کسی ایک زمانے سے خاص نہیں کی جا سکتی۔''

جامع ترمذی کی روایت وھوولی کل مومن بعدی

حدثنا قتيبة بن سعيد اخبرنا جعفر بن سليمان الضبعي عن يزيد الرشک عن مطرف عن عبد الله عن عمران بن حصين ...... وهو ولي كل مومن من بعدى .
هذا حديث غريب لا نعرفه الا من حديث جعفر بن سليمان.

(جامع ترمذی ۲ص ۲۱۳)

حافظ ذھبی جعفر بن سلیمان کے بارے میں لکھتے ہیں' وہ شیعہ ہے۔(میزان الاعتدال ج ۲ص ۱۳۶) حافظ ابن حجر بھی یہی کہتے ہیں۔(تہذیب التہذیب ج ۱ص ۱۷۹)۔ یہ نہ کہا جائے کہ جعفر اس روایت میں متفرد نہیں اس کی متابعت اجلح کندی کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ اجلح بھی تو شیعہ ہے کمافی التہذیب۔

شیعہ جب ہماری کتب حدیث سے کوئی حوالہ دیں تو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنی کتابوں سے اس کا جواب دیں۔ کوئی شخص اس ورطۂ جہالت میں نہ ڈوبے کہ کتابیں تو ہماری ہوں اور ان روایات کی صفائی یا ان پر جرح شیعہ کتابوں سے ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مقدمہ میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ کوئی بدعتی راوی جب اپنی بدعت کی حمایت میں کوئی روایت لائے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ آپ لکھتے ہیں:

والمختار انه ان كان داعياً الى بدعته و مروجاً له رد و ان لم يكن كذلك قبل الا ان يروى شيأ يقوى به بدعته فهو مردود قطعاً .

اکثر روایات میں لفظ ولی مروی ہے مولیٰ نہیں۔

حضرت علیؓ کے اپنے ہاں لفظ مولیٰ کا وزن

حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہم بنو ہاشم قرابت رسول کی بنا پر اس میں اپنا حق سمجھتے تھے۔ آپ نے اس موقع پر لفظ مولیٰ سے کوئی استدلال نہیں کیا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ حضرت علیؓ خلافت پر اپنا حق از روئے اعلان غدیر خم نہیں سمجھتے تھے' نہ وہ اپنے آپ کو حضور کا وصی کہتے تھے۔ صرف از راہ قرابت رسول وہ سمجھتے تھے کہ سقیفہ میں انہیں بھی بلایا جانا چاہیے تھا۔ اور اس میں بھی آپ حضرت ابوبکرؓ کے فضل ومقام کے پوری طرح قائل رہے۔ آپ ان کے ان الفاظ پر غور فرمائیں جو آپؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ان کے پاس آنے پر کہے۔ یہ سونے کے حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔

فدخل عليهم ابوبكرؓ فتشهد على فقال انا قد عرفنا فضلك و ما اعطاك الله ولم ننفس عليك خيراً ساقه الله اليك ولكنك استبدت علينا بالامر وكنا نرىٰ لقرابتنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم نصيباً حتّٰى فاضت عينا ابى بكر (صحيح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹ . صحيح مسلم ج ۲ ص ۹۱)

ترجمہ: ''حضرت علیؓ نے تشہد پڑھ کر کہا' اے ابوبکرؓ! ہم آپ کی فضیلت کو جانتے ہیں اور جو درجہ اللہ نے آپ کو دیا اسے پہچانتے ہیں بلکہ اللہ نے آپ کو جو خیر عطا کی اس میں ہم آپ سے مقابلہ نہیں کرتے لیکن آپ نے اس کام میں ہم پر زیادتی کی' ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا بھی بناء بر قرابت رسول اس میں ایک حصہ ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ کے آنسو جاری ہو گئے۔''

کنّا جمع کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد آپ کی صرف ذات نہ تھی' یہاں بنو ہاشم مراد ہیں۔ یہ پیرایۂ بیان بتلا رہا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر ہرگز کوئی نص نہیں تھی۔ تیسرے نمبر پر بھی آپ نے خلافت خود ٹھکرادی تھی' کسی نے آپ سے چھینی نہ تھی۔ ڈھکو خود تسلیم کرتا ہے:

''جناب نے خلافت ٹھکرادی تھی لیکن سیرت شیخین پر چلنا گوارا نہ کیا تھا۔''

(تجلیات ص ۲۱۸ سطر ۲۲)

یہ حقیقت ہے کہ سیرت شیخین پر نہ چلنے کا موقف آپ کو چوتھے نمبر پر بدلنا پڑا تھا اور آپ اپنے دور خلافت میں پورے طور پر سیرت شیخین پر چلے تھے۔ آپؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا تھا کہ لوگوں نے میری بیعت انہی شرطوں سے کی ہے جن شرطوں سے انہوں نے پہلے تین خلفاء کی بیعت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ آپ نے اب بیعت لیتے ہوئے پہلے تینوں خلفاء کی پیروی کا پورا اقرار کیا تھا۔

حضرت علیؓ کے سیرت شیخین پر چلنے کے شواہد

۱۔ قاضی نوراللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) لکھتا ہے:

اکثر اہل آں زمان را اعتقاد آں بود کہ امامت حضرت علیؑ مبنی بر امامت ایشاں است و فساد امامت ایشاں را دلیل فساد امامت او مے دانند۔ (مجالس المومنین ج ۱ص ۵۴)

ترجمہ: ''حضرت علیؓ کے دور خلافت میں اکثر لوگوں کا اعتقاد یہی تھا کہ آپ کی امامت پہلے تین خلفاء کی امامت پر ہی بنی ہے اور اگر ان کی امامت فاسد ٹھہرے تو یہ آپ کی امامت کے فاسد ہونے کی دلیل ٹھہرے گی۔''

۲۔ حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو سلطنت دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی طرح ان پر یہ شرط عائد کی کہ وہ سیرت شیخین بلکہ پہلے تینوں خلفاء کے طریقے پر چلیں۔ اگر حضرت علیؓ نے چوتھے نمبر پر اپنا مذکورہ موقف نہ بدلا ہوتا تو

حضرت حسنؓ خلافت کے اس زریں اصول پر اس طرح اصرار نہ کرتے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے معاہدہ کے ان الفاظ کو دیکھئے:

هذا ما صالح عليه الحسن بن عليؓ بن ابی طالب و معاويةؓ بن ابی سفيان صالحه علىٰ ان يسلّم اليه ولاية امر المسلمين على ان يعمل فيهم بكتاب الله وسنة رسوله وسيرة الخلفاء الصالحين.

(تاریخ حبیب السیر ج۲ ص۱۴)

ترجمہ: "یہ وہ مصالحت ہے جو حسنؓ بن علیؓ اور معاویہؓ بن ابوسفیانؓ کے مابین قائم ہوئی بایں شرط کہ حسنؓ ولایت امور مسلمین بایں شرط معاویہؓ کے سپرد کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سیرت خلفاء صالحین کے مطابق عمل کرے۔"

شیعہ کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ اپنے عہد خلافت میں مجبوراً سیرت شیخین پر چلے۔ ہم جواباً کہتے ہیں کہ پھر آپ نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے وقت اس شرط کو مجبوراً کیوں نہ مان لیا۔ اگر امور سلطنت میں سیرت شیخین پر چلنا ایسا ہی لابدی امر تھا تو آپ تیسری خلافت کے وقت ہی اسے مجبوری کے تحت مان سکتے تھے۔ قولاً انکار کرنا اور عملاً ان کی سیرت پر چار سال تک چلتے رہنا ایک عجیب فلسفۂ زندگی ہے، کوئی مسلمان قول و فعل کا یہ تضاد حضرت علیؓ کی طرف منسوب نہ کر سکے گا۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ وہ کون سے خلفائے صالحین تھے جنہیں معاہدہ کے دونوں فریق خلفائے صالحین مانتے تھے وہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ تین ہیں جن کا نام لے کر حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کو خط لکھا اور یہی وہ تین ہیں جن کی سیرت پر چلنے کی حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ پر ذمہ داری ڈالی تھی اور ان سے عہد لیا تھا۔

باب پنجم

خلفاء ثلثہ کی جہاد سے کنارہ کشی کی وضعی داستانیں

روافض کی پیش کردہ روایات کا ایک مختصر تحقیقی جائزہ

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفىٰ اما بعد.

خلفائے راشدین اہل سنت کے پیشوا ہیں اور اہل سنت کے ہاں ان کا ایمان دلائل قطعیہ و یقینیہ سے ثابت ہے۔ جب ان سے کوئی مخالف کہے کہ ان حضرات کا مومن ہونا ثابت کرو تو ظاہر ہے کہ اہل سنت اسے اپنی کتابوں سے ہی ثابت کریں گے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ عقیدہ تو اہل سنت کا ہو اور اسے ثابت کرنا لازم ٹھہرے روافض یا خوارج کی کتابوں سے۔ جن کا مذہب ہو وہ انہی کی کتابوں میں سے ملتا ہے اور اس پر جو اعتراضات ہوں ان کی وضاحت بھی انہی کی کتابوں سے کی جاسکتی ہے۔ اہل سنت کی حدیث کی کتابوں میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے مناقب و فضائل اسی ترتیب سے مذکور ہیں قرآن پاک میں نہ حضرات خلفاء ثلثہ اور نہ چوتھے خلیفہ (حضرت علی) کہیں نام بنام مذکور ہیں۔ قرآن پاک میں ان سابقین اولین کے بے شک تذکرے ہیں اور ان کا برسر اقتدار آنا بھی عمومی طور پر مذکور ہے اور یہ صحیح ہے کہ اہل سنت کی کتب تفاسیر میں ان صفات کا مصداق یہی حضرات بتلائے گئے ہیں اور قرآن کریم میں نازل شدہ پیشگوئیاں بے شک انہی پر پوری اترتی ہیں۔ جہاں تک ناموں کا تعلق ہے قرآن پاک میں صحابہؓ میں سے صرف حضرت زید کا نام ملتا ہے اور کسی کا نہیں۔ اور وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی جماعت کے فرد تھے۔

سوان حضرات خلفائے راشدین پر جب کوئی شخص جرح کرے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب یا کسی واقعہ کی وضاحت اہل سنت کتب سے ہی کی جائے گی یہ حضرات اہل سنت کے پیشوا ہیں لہٰذا ان کا مومن ہونا، مہاجر ہونا، حضورؐ کے غزوات میں شامل ہونا، خلیفہ برحق ہونا اور جنتی ہونا بطور تحقیق اہل سنت کی دور اول کی کتب سے ہی لیا جائے گا محققین کبھی غلط فہمی میں یہ نہیں کہتے کہ پیشوا تو یہ اہل سنت کے ہیں لیکن ان کے ایمان اور ان کی عظمت کا ثبوت کتب شیعہ سے ہونا چاہیے۔ یہ بے تکی کوئی نہ ہانکے گا۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ جب ہم ان حضرات کا ایمان یا ان کی صحابیت اپنی کتابوں اور اپنے

راویوں سے بیان کرتے ہیں تو بسا اوقات شیعہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اہل سنت کی کتابیں ہیں یا یہ سنی راویوں کی روایت ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے جب بزرگ ان کے ہیں تو ان کی بزرگی کا ثبوت بھی تو انہی کی کتابوں سے ملے گا نہ کہ ان کے مخالفین کی کتابوں سے۔ آغا تیغ درمیان کن۔ حضور اکرم ﷺ نے جب یہود سے ان کے موقف پر دلیل طلب کی تھی تو ان کی کتاب سے ہی اس کی تصدیق چاہی تھی نہ یہ کہ عقیدہ تو ان کا ہو اور ثبوت اس کا وہ قرآن سے دیں۔ قرآن پاک میں ہے کہ آپ نے انہیں کہا تھا:۔

قل فاتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صادقین۔ (پ ۴ آل عمران ۹۳)

اس سے پتہ چلا کہ جس مذہب والوں سے کوئی بات پوچھی جائے وہ اس کا جواب اپنی کتابوں سے ہی لائیں گے نہ کہ اپنے مخالفوں کی کتابوں سے اور اسی طرح اگر کسی بات کی کہیں وضاحت مطلوب ہو تو وہ بھی انہی کتابوں میں دیکھی جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی اپنے حق میں مخالفین کی کتابوں سے بھی استدلال کیا جاتا ہے لیکن اس کی حیثیت محض ایک الزامی جواب کی ہوتی ہے اسے پیرایہ تحقیق نہیں کہا جاتا۔

وہ قواعد کلیہ جن سے بحث نتیجہ خیز بنائی جاسکتی ہے

۱۔ بنیادی عقائد دلائل قطعیہ سے ثابت کئے جاتے ہیں یہ قطعیت ثبوت اور دلالت دونوں میں مطلوب ہوتی ہے جو چیز تواتر سے منقول ہو وہ قطعی ہوتی ہے گو یہ تواتر قدر مشترک ہی کیوں نہ ہو اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی دلالت بھی اپنے مدعا پر قطعی ہو اور ایسی واضح ہو کہ اس کا محمل کچھ اور نہ ہو سکے۔

۲۔ کسی مذہب کی مشہور اور متواتر روایات کے خلاف انہی کی کتابوں میں کوئی خبر واحد پائی جائے تو اسے شاذ سمجھا جائے گا اسے ان کا مذہب نہ قرار دیا جائے، قوی کے مقابلے میں کمزور روایت کو ضعیف کہہ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اگر اس ضعیف کا مقابلہ کسی سے نہ ہو تو اس کا بھی کسی درجے میں اعتبار کیا جائے گا۔

۳۔ اگر کسی بات میں دو پہلو نکلتے ہوں تو اس میں اس بات کو اختیار کیا جائے جو دونوں میں سے بہتر ہو۔ قرآن پاک نے اچھے لوگوں کے اس عمل کی تعریف کی ہے۔

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه. (پ پ۲۳، الزمر ۱۸)

عدالتوں میں بھی احتمال کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دیا جاتا ہے اپنی مرضی کی توجیہہ سے کسی ملزم کو لائق سزا قرار نہیں دیتے۔

۴۔ اعتبار آخری بات کا ہوتا ہے پہلی بات گناہ ہی کیوں نہ ہو اسے (۱) توبہ یا (۲) نیکیوں کی کثرت بہا کر لے جاتی ہے اہل سنت اور شیعہ دونوں اس اصول کو صحیح مانتے ہیں۔

والما یوخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی الله علیه وسلم. (صحیح بخاری ج ص ۹۶ ج ۲ ص ۶۱۳)

کان صحابة رسول الله صلی الله علیه وسلم یتبعون الاحدث فالاحدث من امره صلی الله علیه وسلم. (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۵۵)

انما یوخذ بالاخر من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم. (الخطابی جلد ۱ ص ۱۲۳)

انما یوخذ بآخر امر رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۱۹۷)

انّما یوخذ بآخر امر رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (فروع کافی جلد ۴ ص ۱۲۷)

اور حضورؐ نے خود بھی فرمایا، العبرة بالخواتیم اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ نے بھی کہا:

اذا حدثتم بالحدیث عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فظنوابه الذی هو اهیاء والذی هو اهدی والذی هو اتقی. (رواه الدّارمی)

۵۔ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ گناہوں سے انسان ایمان سے نہیں نکلتا قرآن کریم میں ایمان اور اعمال صالحہ میں عطف تغائر ہے۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات۔ (پ ۳۰، العصر) مگر شیعہ اس مسئلے میں خارجیوں کے مذہب پر ہیں کہ گناہ کبیرہ سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے یہ اعمال کو ایمان کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ اور ملزم کے اقرار ایمان کی پرواہ نہیں کرتے۔

اب اس صحرائے بے کنار میں رافضیوں کی صحابہؓ کے خلاف پیش کردہ چند کہانیاں سنیں اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں جو ہم اوپر پیش کر آئے ہیں خود ہی ان باتوں کی تصدیق یا تکذیب فرمائیں۔

صحابہؓ کے جہاد سے فرار ہونے کی وضعی داستانیں

۱۔ حضرت ابوبکرؓ جنگ بدر میں حضورؐ کے ساتھ عریش بدر پر بیٹھے جنگ کا نظارہ کرتے رہے جنگ میں شریک نہ ہوئے (دیکھئے تجلیات صداقت ص ۴۸)

الجواب

اعلیٰ فوجی افسر پوری جنگ کا جائزہ لیتے ہیں اور ہدایات دیتے ہیں، سپاہی بن کر نہیں لڑتے جنگ میں موجود ہونا ہی جنگ میں شرکت سمجھا جاتا ہے تاریخ کی کتابوں میں کسی کی جنگ میں شرکت اس کے وہاں حاضر ہونے کو ہی کہتے ہیں کسی کی شرکت اس پیمانے میں نہیں ناپتے کہ اس نے کتنے مارے ظاہر ہے کہ نوجوان جنگ میں زیادہ پھرتیلے اور زور

والے ہوتے ہیں، اگر بزرگ اس درجے میں زور نہ دکھا سکیں تو چھوٹوں اور بڑوں یا جوانوں اور بوڑھوں کا مقابلہ نہیں کیا جاتا۔ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں عریش بدر میں بیٹھے پوری جنگ پر نظر رکھے ہوئے تھے حضور ﷺ کو اور حضرت ابوبکر کو قاعدین میں شمار کرنا اور اس پر یہ آیت لکھنا فضل اللّٰہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجه اسی رافضی کا کام ہو سکتا ہے جو صحابہؓ کے بغض میں حضورؐ کی شان میں بھی گستاخی کرنے سے بھی نہ ٹلے۔ اس وقت آپ کا حضورؐ کے ساتھ بیٹھنا اگر کسی درجے میں بھی قابل اعتراض ہوتا تو حضورؐ اسی وقت فرما دیتے، یہاں نہ بیٹھو اب آپ ہی سوچیں یہ کون لوگ ہیں جو حضورؐ سے اپنی آواز اونچی کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے تو انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے سے نہ روکا اور یہ لوگ ہیں جو اسے (معاذاللہ) ان کی بزدلی پر محمول کر رہے ہیں۔ جنگ میں ساتھ شامل ہونا اس جنگ میں حصہ لینا سمجھتا ہے۔

خطیب تبریزی قتادہؓ بن نعمان کے ترجمہ میں لکھتا ہے بدری شھد بعدھا المشاھد کلھا۔ قوامہ بن نطعون کے ترجمہ میں لکھتا ہے شھد بدراً او سائر المشاھد۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے ترجمہ میں لکھتا ہے، شھد مع النبیؐ المشاھد کلھا لم یفارقه فی الجاھلیة ولا فی الاسلام۔ حضرت براء بن عازبؓ کے ترجمہ میں لکھتا ہے شھد مع علی بن ابی طالب الجمل والصفین والنھروان۔ حضرت طلحہؓ کے ترجمہ میں لکھتا ہے شھد المشاھد کلھا غیر بدر اور حضرت علیؓ کے ترجمہ میں لکھتا ہے شھد مع النبیؐ المشاھد کلھا غیر تبوک۔ اس پیرایہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ وتراجم میں جنگ میں موجود ہونا ہی جنگ میں شرکت سمجھا جاتا ہے اور مختلف خدمات سرانجام دینے میں کوئی کسی پر انگلی نہیں اٹھاتا کہ کسی نے کتنے مارے اور نہ نوجوانوں کو زیادہ لڑنے پر بزرگوں پر کوئی ترجیح دی جاتی ہے۔ وہاں حاضری ہی اس معرکہ میں شرکت شمار ہوتی ہے۔

۲۔ ڈھگو رافضی کہتا ہے جنگ احد سے اصحاب ثلثہ کے فرار کا اہل سنت کے علماء کبار نے اقرار کیا ہے۔ تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۴۳۱ طبع مصر پر مرقوم ہے۔

قال ابوبکرؓ لما صرف الناس یوم احد من رسول اللّٰہ فکنت اول من جاء النبی.

(تجلیات صداقت ص ۴۸)

ترجمہ: ”ابوبکرؓ بیان کرتے تھے کہ جب احد کے دن تمام لوگ رسول خدا کو چھوڑ گئے تو میں سب سے پہلے رسولؐ کے پاس واپس آ گیا۔“ (یعنی صرف تین دن کے بعد) ص ۴۸

الجواب

جنگ احد میں خالد بن ولید کے عقبی حملے سے مسلمانوں میں جو افراتفری پیدا ہوئی اس میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ سوائے حضرت طلحہ اور حضرت سعد کے حضورؐ سے سب لوگ دور ہو گئے حضرت علیؓ مرتضٰی بھی آپ سے دور تھے آپ کو پتہ

نہ تھا کہ حضورؐ کہاں ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

”جانبازوں کا زور بھی نہیں چلتا تھا جو جہاں تھا گھر کر رہ گیا تھا آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے لیکن مقصود (آنحضرت ﷺ) کا پتہ نہ تھا۔“ (سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۳۷۸)

اب اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت علیؓ حضورؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ افراتفری میں کسی کو کسی کا پتہ نہ رہے یہ ایک جدا بات ہے۔ حضرت علیؓ خود بیان کرتے ہیں۔

”جب کفار نے مسلمانوں پر غلبہ کیا اور حضورؐ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے مقتولوں اور شہیدوں میں جا کر تلاش کیا (گویا آپ کو بھی گمان ہو رہا تھا کہ شاید آپ شہید ہو گئے ہوں) تو میں نے اپنے آپ سے کہا ممکن ہے حق تعالیٰ نے ہمارے فعل کی بناء پر ہم پر غضب فرمایا ہو اور اپنے نبیؐ کو آسمان پر اٹھا لیا ہو میں نے خود سے کہا اس سے بہتر یہی ہے کہ میں خوب جنگ کروں یہاں تک میں شہید ہو جاؤں۔“ (مدارج النبوۃ جلد ۳ ص ۲۱۰)

اس سے پتہ چلا کہ حضرت علیؓ اس دن اس جوانمردی سے اس لئے لڑے کہ حضورؐ کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے کہ جب حضورؐ ہی نہ رہے تو ہمیں زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں اب ایسے فداکاروں کے بارے میں یہ بدگمانی کہ وہ حضورؐ کو چھوڑ گئے تھے کسی طرح صحیح نہیں اگر وہ حضور کو چھوڑ گئے ہوتے تو پھر تلاش کیوں کرتے اگر وہ افراتفری میں حضورؐ کے ساتھ نہ رہے تو اس پر کوئی بدگمانی نہ کرنی چاہئے۔ اس دن صحابہؓ سے درہ چھوڑنے کی جو غلطی ہوئی حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو اس سے بری نہیں کیا بلکہ فرمایا۔ ممکن ہے حق تعالیٰ نے ہمارے فعل کی بناء پر ہم پر غضب فرمایا ہو۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں یہ گمان کہ وہ بھی اس افراتفری میں حضورؐ سے چلے گئے تھے کسی طرح صحیح نہیں۔ ہاں حضرت ابوبکرؓ کا یہ کہنا کہ سب سے پہلے میں رسول اکرم ﷺ کے پاس واپس لوٹا جیسا کہ رافضی نے اسے نقل کیا ہے درست ہو سکتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ ہی حضور ﷺ کے ثانی بنے اور آپ ہی سب سے پہلے حضور ﷺ کے پاس آئے۔ لیکن رافضی نے اس کے ساتھ یہ لکھ کر کہ آپ تین دن کے بعد آئے محض جھوٹ بولا ہے کیا باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور تین دن اس پریشانی میں اکیلے ہی رہے ہوں یا یہ کہ آپ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعد کے ساتھ اپنے سے دور جانے والے ساتھیوں کو واپس آنے کے لئے پکارتے رہے ہوں۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو اس کی کوئی خبر نہ ہو بھلا یہ وضعی داستان قبول کرنے کے لائق ہے؟ کسی طرح نہیں۔

الحاصل رافضی کے اس حوالے سے کہ اس دن سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ آپ کے پاس واپس لوٹے، حضرت

ابوبکرؓ پر کوئی جرح وارد نہیں ہوتی۔ آپ کے تین دن بعد لوٹنے کی من گھڑت روایت پر رافضی نے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ جھوٹ، جھوٹ ہے اور وہ کھل کر رہتا ہے۔ یہ تین دن بعد کی بات اس کے اندر کا بغض ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔

۳۔ رافضی کا ایک یہ الزام بھی ملاحظہ فرمائیں، جنگ خندق پر حضور اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو قریش مکہ کی خبریں لانے کے لئے بھیجنا چاہا آپ نے استغفر اللہ ورسولہ کہہ کر معذرت کر دی۔ رافضی لکھتا ہے:۔

''تیسری مرتبہ فرمایا یا ابا بکرؓ تم جا کر خبر لاؤ۔ ابوبکرؓ نے کہا استغفر اللہ ورسولہ، میں خدا اور رسول سے معافی چاہتا ہوں پھر فرمایا ان شئت ذھبت یا عمر، اگر چاہو تو تم چلے جاؤ، عمر نے بھی کہا استغفر اللہ ورسولہ۔ پھر حذیفہؓ سے فرمایا اور وہ لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور تعمیل حکم کی۔''

(تجلیات صداقت ص ۵۲)

اس سے رافضی نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

''اس واقعہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات میں فدا کاری اور حکم رسولؐ کی پاسداری کا کس قدر جذبہ موجود تھا۔''

یہ روایت اگر اس طرح ہو بھی تو اس سے حضورؐ کے حکم کا انکار ثابت نہیں ہوتا حضورؐ نے جب حضرت ابوبکرؓ کو کہا اور آپ نے استغفر اللہ ورسولہ کہہ کر حضورؐ سے اس کام کے بجالانے میں معذرت کی اور معافی کی درخواست کی اور حضورؐ نے بھی آپ کو معاف کر کے حضرت عمرؓ کو ان شئت ذھبت (تم چاہو تو تم جا سکتے ہو) کہہ کر قریش مکہ کے کیمپ میں جانے کا کہا اور آپ نے بھی معذرت چاہی اور اس خدمت سے معافی کی درخواست کی اور حضورؐ نے اسے بھی قبول کر لیا اور حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا تو اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کے حکم کی نافرمانی نہیں کی تھی بلکہ حضورؐ نے ان حضرات کی درخواست پر اپنا حکم ہی ان سے اٹھا لیا سو اب اسے ان حضرات کی جرح میں لانا کسی دانشور کا کام نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے انہیں محض اس لئے کہا تھا کہ یہ حضرات یہ نہ کہیں کہ ہمیں یہ کام کیوں نہ سونپا گیا ورنہ حضور بھی جانتے تھے کہ دشمن کی خبر لانے کے لئے بڑے لوگوں کو نہیں نوجوانوں کو بھیجا جاتا ہے جن کے ان میں جانے اور گھسنے کا آسانی سے پتہ نہ چلے۔ حضرت ابوبکرؓ جیسے بزرگ کو ایسے خفیہ کام کے لئے کیسے بھیجا جا سکتا تھا۔ ان حضرات نے بھی حضورؐ کی اس بات کو ایک مشورے کے درجہ میں لیا اور حضورؐ سے اس کی معذرت کر لی اور حضورؐ نے بھی اسے قبول فرما لیا، حضرت حذیفہؓ کمزور بدن کے تھے اور ان کا دشمن کے کیمپ میں جانا آسان تھا، اس کا آسانی سے پتہ نہ چل سکتا تھا ایسے مواقع پر مختلف تدبیروں کا سامنے آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ حضور اکرمؐ نے اس شخص کو جو قریش مکہ کی خبر لائے قیامت کے دن

اپنی معیت کی بشارت دی تھی اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان حضرات میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے تکوینی فیصلے میں دنیا میں ہی حضور اکرم ﷺ کی معیت میں جگہ دے چکے تھے اور انہیں حضورؐ کے روضہ انور میں جگہ دینا ایک الٰہی فیصلہ ہو چکا تھا۔ حضرت حذیفہؓ جو مقام قیامت کے دن پائیں گے اللہ تعالیٰ نے معیت مصطفےٰؐ کی یہ فضیلت ان حضرات کو خود اسی دنیا میں ہی دے دی جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ دنیا میں غار ثور میں حضورؐ کی زبان سے انّ اللہ معنا کی فضیلت پا گئے اور قرآن کریم نے حضورؐ کی اس شہادت کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔

آئیے اب ہم آپ کو اصل روایت کا پتہ دیں اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے یہود صحابہ کے خلاف کس حد تک آگے گئے ہیں۔

اصل روایت میں اس واقعہ میں ابوبکر و عمرؓ کا نام نہیں ہے

ہم نے گزشتہ تفصیل یہ کہہ کر کی ہے کہ یہ روایت اگر اس طرح بھی ہو تو اس سے حضورؐ کی نافرمانی لازم نہیں آتی۔ یہ ایک شورائی گفتگو تھی جو ہوئی۔ اب آئیے اس روایت کو پہلے دور کی کتابوں سے لیں امام مسلم نے یہ روایت صحیح مسلم میں جو تیسری صدی کی کتاب ہے اس طرح روایت کی ہے کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام تک نہیں اور اس کی سند بالکل صحیح ہے اور رافضی نے اسے درمنثور سے نقل کیا ہے جو دسویں صدی کی کتاب ہے۔ امام مسلم (۲۶۱ھ) اس حدیث کو اپنی سند سے لائے ہیں اور امام سیوطی (۹۱۱ھ) اسے ائمہ تخریج سے لائے ہیں اسے اپنی سند سے حدیث روایت کرنے والے نہیں، امام سیوطی نے یہ روایت کن کتابوں سے لی ہے ان کی کوئی اور ہی سند ہے۔ صحیح مسلم کے سب راوی ثقہ ہیں اور فریابی اور ابن عساکر کے رواۃ کون ہیں ان کا درمنثور جلد ۵ ص ۳۵۴ میں یا جلد ۱۸۵ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ صحیح مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے۔ (دیکھئے جلد ۲ ص ۱۰۷)

قال زهير اخبرنا جرير عن الاعمش عن ابراهيم التيمي عن ابيه قال كنا عند حذيفه.... فقال حذيفةؓ لقدرايتنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة الاحزاب واخذ تناريح شديدة وقرّ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا رجل ياتيني بخبر القوم.. جعله الله عزوجل معي يوم القيٰمة فسكتنا فلم يجبه منا احد ثم قال .... فسكتنا فلم يجبه منا احد ثم قال ..... فسكتنا فلم يجبه منا احد فقال قم يا حذيفةؓ فاتنا بخبر القوم فلم اجد بداً اذ دعاني باسمي ان اقوم قال اذهب فاتني بخبر القوم ولا تذعرهم علي فلما وليت من عنده جعلت كانما امشي في حمام حتى اتيتهم فرايت اباسفيان يصلي ظهره بالنار... الحديث.

ترجمہ: ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ہے کوئی شخص جو مجھے قریش کے کیمپ کی خبر لادے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن میری معیت دیں گے؟ ہم سب خاموش رہے اور کسی نے حضورؐ کے سامنے ہاں نہ کی (حضرت علیؓ نے اس وقت کیوں ہاں نہ کی) یہ اس لئے کہ بنو امیہ اگر اس ہاشمی کو دیکھ پائیں تو ان کی عداوت اور بھڑ کے گی اس لئے نہیں کہ آپ وہاں جانے سے ڈرتے تھے، ایسا تین دفعہ ہوا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے حذیفہ! تو ہی اٹھ اور ہمیں ان لوگوں کی خبر لادے۔ اب آپ نے جب میرا نام لے کر مجھے آواز دی تو میرے لئے اٹھنے سے چارہ نہ رہا، آپ نے کہا تو جا اور ان لوگوں کی خبر لا اور انہیں مجھ پر اور چڑھائی کرنے کا موقعہ نہ دینا۔ جب میں آپ کے پاس سے چلا تو میں اس حال میں تھا کہ گویا میں ایک حمام میں (گرم ہوا میں) چل رہا ہوں یہاں تک کہ میں ان کے پاس پہنچ گیا وہاں میں نے ابوسفیان کو دیکھا کہ اپنی پشت سے آگ تاپ رہے ہیں۔''

اصل روایت یہ ہے جو سنداً صحیح ہے رافضی نے صحیح مسلم سے یہ روایت کیوں پیش نہیں کی، یہ اس لئے کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام نہ آتا تھا اور اس کا بغض باطنی اسے مجبور کر رہا تھا کہ گو اس روایت کی کوئی سند متصل نہ ہو اسے وہاں سے روایت کرو جہاں اس میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام آئے۔ صحیح مسلم میں روایت مل جانے سے بعد کی کتابوں کی کوئی روایت اس کے مقابل تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

رافضی نے اپنی اس روایت پر مسند امام احمد کا بھی حوالہ دیا ہے اس میں بھی ہمیں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کا نام نہیں ملا۔ وہاں حضرت حذیفہؓ کی بجائے حضرت زبیر یہ خدمت سرانجام دیتے بتلائے گئے ہیں اور یہ تو بات ہی بدل گئی اس سے اور کسی جہت سے حضرت ابوبکرؓ پر جرح نہیں ہوسکتی یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت زبیر جو والدہ کی طرف سے ہاشمی تھے یہ خدمت بجالا سکتے تھے تو حضرت علیؓ حضور کے اس حکم پر خود کیوں نہ اٹھے؟ کیوں بیٹھے رہے؟ یہ خیال کیوں کیا کہ اموی ہاشمیوں کے زیادہ دشمن ہیں۔ اسی لئے خود جانے کی پیش کش نہ کی۔

اس صورت حال میں بھی کسی کو حضرت زبیر کی اس ہمت پر حضرت علیؓ کے خلاف یہ آیت پڑھنے کا حق نہیں ہے

فضل اللہ المجاهدين باموالهم وانفسهم على القاعدين درجة۔ (پ۵، النساء، ۹۵)

حضرت زبیرؓ نے تین دفعہ ہاں کی

عن جابر بن عبداللہؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من یاتینی بخبر القوم یوم الاحزاب فقال الزبیر انا ثم قال من یاتینی بخبر القوم؟ قال الزبیر

انا. قال من یأتینی بخبر القوم؟ فقال الزبیر انا قال لکل نبی حواری وان حواری الزبیر. (مسند امام احمد جلد۵، ص ۱۵۲)

ترجمہ: ''حضرت جابر سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے احزاب کے دن فرمایا کون مجھے دشمنوں کی خبر لا کر دے گا؟ حضرت زبیر نے کہا میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ آپ نے پھر یہی سوال کیا حضرت زبیرؓ نے پھر کہا میں یہ کام انجام دوں گا۔ آپ نے فرمایا، ہر نبی کا ایک حواری ہوا ہے میرا حواری میرا پھوپھی زاد بھائی زبیر ہے۔''

یہاں یہ سوال نہ اٹھایا جائے کی حضور کی اس تین دفعہ کی آواز پر حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ کیوں نہ اٹھے تاہم حضرت زبیرؓ نے یہاں جو تین دفعہ ہاں کی اسے تاریخ نے محفوظ کرلیا ہے۔

۴۔ غزوہ احزاب کے بعد جنگ خیبر کا ایک واقعہ

حضرت ابوبکرؓ کے خلاف اس رافضی کی ایک اور وضعی داستان ملاحظہ ہو۔

سب سے زیادہ مضبوط قلعہ قموص تھا...... آنحضرت نے ایک بار حضرت ابوبکرؓ کو اور دو بار حضرت عمرؓ کو اسلامی لشکر کی قیادت سونپی مگر ہر بار جونہی حارث برادر مرحب سے مڈبھیڑ ہوئی سوائے راہ فرار اختیار کرنے کے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا جب بھاگتے تو آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ (تجلیات صداقت ص ۵۴)

اگر تسلیم کیا جائے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی پوری جدوجہد کے باوجود قلعہ قموص کو فتح نہ کر سکے اور اگلے دن حضرت عمرؓ بھی اپنی پوری جدوجہد سے قتال کرتے اسے فتح نہ کر سکے اور حضور کی خدمت میں لوٹتے رہے لیکن اس میں فرار کی داستان قطعاً وضعی ہے۔ حضور کی خدمت میں آنے کو کسی طرح فرار نہیں کہا جاسکتا۔ کسی صحیح روایت میں ان کا میدان سے بھاگنا ثابت نہیں۔ بھاگنے والا اپنے گھر کا رخ کرتا ہے نہ کہ آقا کے حضور حاضری دیتا ہے۔ رافضی خود یہاں لکھتا ہے: جب بھاگتے تو آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اب آپ ہی سوچیں کیا اسے بھاگنا کہہ سکتے ہیں۔ اتنی کمزور بات کہتے کچھ تو ڈھکو کو علمی حجاب آنا چاہئے تھا۔

مولف سیرت مصطفےٰ لکھتا ہے:

''جب اس قلعہ کا محاصرہ ہوا تو آنحضرت درد شقیقہ کی وجہ سے میدان میں تشریف نہ لا سکے اس لئے نشان دے کر ابوبکر صدیق کو بھیجا باوجود پوری جدوجہد کے قلعہ فتح نہ ہوسکا واپس آگئے دوسرے روز فاروق اعظم کو نشان دے کر روانہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے پوری جدوجہد سے قتال کیا لیکن بغیر فتح کئے ہوئے واپس آگئے۔'' (ص ا، رواہ احمد والنسائی وابن حبان والحاکم عن بریدۃ (سیرت مصطفےٰ جلد ۳ ص ۶)

کسی صحیح روایت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے یہاں سے بھاگنے کا ذکر نہیں۔ رافضی کی یہ پیش کردہ داستان بالکل وضعی ہے وما تخفی صدورھم اکبر۔

بھاگنا اور فرار کرنا کسے کہتے ہیں

میدان جنگ سے بھاگنا اور فرار کرنا کسے کہتے ہیں؟ فرار یہ ہے کہ کوئی لڑائی سے بچ کر کسی اپنی جگہ پر آ کر پناہ لے لیکن اگر کوئی میدان سر کئے بغیر اپنے مرکز میں لوٹے تو اسے ایک جنگی حیلہ کہتے ہیں اور جنگوں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ خود قرآن کریم میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفاً فلاتولوھم الادبارO ومن یولّھم یومئذٍ دبرہ الا متحرفاً لّقتالٍ اومتحیّزاً الیٰ فئۃٍ فقد باء بغضب من اللہ وماواہ جھنم وبئس المصیر۔ (پ ۹، الانفال ۱۶)

ترجمہ: ”اے ایمان والو جب کافروں کے بڑے لشکر سے تمہارا مقابلہ ہو تو انہیں پیٹھ نہ دو اور جو اس دن اُنہیں پیٹھ دکھائے گا ماسوائے لڑائی کا ہنر دکھانے کے لئے یا اپنی جماعت میں مل جانے کے لئے تو وہ اللہ کے غضب میں پلٹا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی۔“

قلعہ فتح ہوتا نظر نہ آئے تو مزید مشورہ اور ہدایت لینے کے لئے مرکز کی طرف رجوع کرنا اسے کبھی اہل دانش فرار نہیں کہتے۔ یہ حضرات واپس آئے حضورؐ کو صورت حال کی اطلاع دی حضور نے اللہ رب العزت سے مزید نصرت مانگی اور اس معرکے کے لئے بوڑھوں کی بجائے ایک نوجوان کا انتخاب فرمایا تو اس سے بڑوں کی بڑائی اور ثقاہت مجروح نہیں ہوتی۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ اب ہم فتح نہ کر سکیں گے محض شوق شہادت کے لئے لڑتے رہنا اور صورت حال کا جائزہ نہ لینا دین فطرت اس کی اجازت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان بزرگوں کے واپس چلے آنے پر انہیں ادنیٰ سرزنش بھی نہ فرمائی۔ اور پھر اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے پھر سے آرزو کی تھی کہ حضورؐ مجھے پھر اس قلعے کو فتح کرنے کے لئے بھیجیں۔ آپ نے کب یہ خواہش کی؟ جب حضورؐ نے خیبر کی فتح کی برسر میدان پیشگوئی کر دی تھی آپ نے فرما دیا تھا کہ صبح اللہ تعالیٰ فتح دیں گے یہ سعادت حضرت علیؓ مرتضیٰ کے نام لکھی تھی ورنہ حضرت عمرؓ بھی چاہتے تھے کہ حضور آج اس لشکر کی قیادت مجھے سونپیں اور خیبر کا یہ قلعہ میرے ہاتھ پر فتح ہو، آپ خود فرماتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یوم خیبر لاعطین ھٰذا الرأیۃ رجلاً یحب اللہ ورسولہ یفتح اللہ علیٰ یدیہ قال عمر ابن الخطاب ما احببت الامارۃ الا یومئذٍ قال فتساوٍرت لھا رجاء ان ادعی بھا۔

ترجمہ: ”حضور اکرمؐ نے فرمایا میں آج یہ جھنڈا اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اسؐ کے رسول کو محبوب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا میں نے کبھی امارت کی تمنا نہ کی مگر اس دن آپ کہتے ہیں، میں دل میں یہ آرزو رکھے رہا مجھے اس خدمت کے لئے آواز دی جائے۔“

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے اس مورچہ سے کبھی ناکام واپس نہ لوٹے تھے ایسا ہوتا تو آپ کبھی وہاں دوبارہ جانے کی آرزو نہ کرتے صحیح مسلم کی اس روایت کے مقابلہ میں تاریخ کی کسی روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی ہاں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اب اس مہم کے لئے حضورؐ اکرم نے فتح کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اور اب بہت سے صحابہ تمنا کر رہے تھے کہ یہ سعادت ان کے نام ہو۔ حضرت علیؓ بھی حضورؐ کی اس بشارت سے بہت شاداں وفرحاں تھے۔

حضرت عمرؓ کے خیبر سے ناکام لوٹنے کی روایت صحیح نہیں

طبری نے اسے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے اس میں عوف ایک شیعہ راوی ہے اس سے حضرت عمرؓ کے بارے میں کسی انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک راوی عبداللہ بن بریدہ ہے وہ شیعہ تو نہیں لیکن یہاں وہ اسے باپ سے روایت کر رہے ہیں اور یہ ایک دوسری جرح ہے۔

حضرت علیؓ کے ہاتھوں قلعہ قموص فتح ہوا

اس نازک مرحلے پر حضور اکرم ﷺ نے تین علم تیار کرائے ایک حضرت خباب بن منذرؓ کو دیا دوسرا حضرت سعد بن عبادہ کو اور تیسرا حضرت علیؓ کو اس مہم کے لئے عطا فرمایا۔ حضرت علیؓ کا یہ علم حضرت عائشہ کے دوپٹہ سے بنا تھا اور ہزاروں برکات اپنے دامن میں لئے ہوا تھا۔ یہ فتح خیبر اسی دوپٹے کی برکت تھی جو حضرت علیؓ کا نصیب رہی۔

”اور خاص علم نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہ کی چادر سے تیار ہوا تھا جناب امیر کو مرحمت ہوا۔ فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامر بن الاکوع یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے۔“ (سیرت النبی جلد ا ص ۴۸۱)

سو اب اس معرکہ خیبر میں صرف حضرت علیؓ ہی نہیں اس میں حضورؐ کا پرچم حضرت عائشہ کی عزت وحرمت کا واسطہ اور حضرت عامر کی اللہ رب العزت کے حضور یہ عاجزانہ صدا بھی شامل تھی۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا — ولاتصدقنا ولاصلینا

فاغفر فداء لک ما اتقینا — والقین سکینۃ علینا

اب جب حضورؐ کا پرچم ساتھ ہو حضرت عائشہ کے دوپٹے کا پھریرا ہو حضرت عامر کی عاجزانہ پکار ہو اور حضرت علیؓ

مرتضٰی کی تلوار ذوالفقار ہوتو اللہ رب العزت کی طرف سے اس چہارگانہ صدا کی اجابت کیوں نہ ہو۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک پائندہ نقش ہے کہ حیدر کرار کے ہاتھوں یہ قلعہ قموص فتح ہوا بیس روز تک اسی کا محاصرہ رہا اس میں مرحب کے مقابل حضرت علیؓ نکلے اور پھر مرحب کا بھائی یاسر سامنے آیا تو ادھر سے حضرت زبیر نکلے حضرت علیؓ نے مرحب کو واصل جہنم کیا اور حضرت زبیرؓ نے یاسر کو وہاں پہنچایا۔

حضرت علیؓ مرتضٰی کے حیدر کرار ہونے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت خالد بن الولید، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عمرو بن العاص اور ان جیسے کئی اور حضرات کرار نہ تھے، سب معاذ اللہ فرار تھے۔

یہ اسی طرح ہے کہ بارہ ائمہ اہل بیت میں سے صرف امام جعفرؒ کو صادق کہنا اس کا یہ مطلب کسی نے نہیں لیا کہ دوسرے ائمہ کرام (معاذ اللہ) سب کاذب تھے۔ (استغفر اللہ العظیم)

خیبر کے مختلف قلعے مختلف ہاتھوں فتح ہوئے

ا۔ قلعہ ناعم	اس میں قیادت حضرت محمود بن مسلمہ نے فرمائی اور شہادت بھی پائی۔
۲۔ قلعہ قموص	حضرت علیؓ مرتضٰی نے فتح کیا مرحب کے بھائی یاسر کے مقابل حضرت زبیر نکلے
۳۔ قلعہ صعب	اس میں قیادت خود حضورؐ فرماتے رہے۔
۴۔ قلعہ قلہ	غنائم کی تقسیم میں یہ حضرت زبیر کو ملا اسے اس لئے قلعہ زبیر بھی کہتے ہیں۔
۵۔ قلعہ وطیح	اس میں بھی قیادت حضور اکرم کی رہی، قلعہ سلالم بھی اس کے ساتھ فتح ہوا۔

اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے قلعے تھے جو سب فتح ہوئے لیکن ان میں سب سے اہم معرکہ قلعہ قموص کا رہا اس میں دوران قتال حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ڈھال گر پڑی۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ڈھال گرنے کو آپ کی بہادری میں موجب قدح نہ سمجھا جائے۔ آپ نے اس کے دروازے کی ایک پتھر کی شیٹ کو ڈھال بنالیا۔ اس پتھر کی وزنی شیٹ اٹھانے پر آگے کئی داستانیں وضع ہوئیں جن میں سب سے اونچی یہ رہی کہ آپ نے پورے خیبر کو اپنے بائیں ہاتھ سے اٹھالیا تھا۔ اندھی عقیدت میں پتھر کی ایک شیٹ کو پورا خیبر کہہ دیا جائے تو اس پر کسی کو تعجب کرنے کا حق نہیں۔ جھوٹ کا ایک اپنا مزہ بھی تو ہوتا ہے۔

حافظ سخاوی (۹۰۲ھ) ان سب کے بارے میں کہتے ہیں، کلها واهية، ان میں سے ایک داستان بھی صحیح طور پر ثابت نہیں ہو پائی۔ ملا باقر مجلسی نے اس پر کچھ جنوں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں بچے انہیں بہت مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن یاد رہے کہ دین کوئی افسانوں کی دنیا نہیں ہے۔ حضورؐ جب مقام رجیع سے آگے قلعہ نطاۃ کی طرف نکلے تو آپ نے فوج کے ایک حصے کا انچارج حضرت عثمانؓ کو بنایا تھا سو جنگ خیبر میں حضرت عثمانؓ نے بھی حضور کے حکم سے کچھ ذمہ

داریاں ادا کی ہیں۔ آپ اگر احد میں بھاگے ہوتے تو حضور اکرمؐ اس معرکہ خیبر میں یہ ذمہ داری آپ کو نہ سونپتے۔ لیکن ڈھکورافضی کا نصیب نہیں کہ فاتحین خیبر میں حضرت عثمانؓ کا بھی کہیں ذکر کردے۔

پچھلوں کی کامیابی سے پہلے سپاہ سالار مجروح نہیں ہوتے

جنگ موتہ میں آنحضرتؐ نے تین سپہ سالار مقرر فرمائے تھے، (۱) حضرت زید بن حارثہ جنہیں حضورؐ نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا (۲) حضرت جعفر بن ابی طالب، یہ حضرت علیؓ کے بھائی تھے اور ان سے بڑے تھے، اور (۳) حضرت عبداللہ بن رواحہ۔ آنحضرت نے اس معرکہ کے لئے یہ ہدایت دی تھی:۔

ان قتل زيد فجعفر و ان قتل جعفر فعبدالله بن رواحة.

ترجمہ: ''اگر زید مارا جائے تو جعفر قیادت کرے وہ بھی مارا جائے تو عبداللہ بن رواحہ کمان سنبھالے۔''

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں:۔

ان النبیؐ نعیٰ زیداً و جعفراً وابن رواحة للناس قبل ان یاتیهم خبرهم فقال اخذالرایةزید فاصیب ثم اخذجعفر فاصیب ثم اخذ ابن رواحة فاصیب و عیناه تذرفان حتی اخذالرایه سیف من سیوف الله حتی فتح الله علیهم.

(صحیح بخاری جلد۲، ص۶۱۱)

ترجمہ: ''آنحضرت نے پیشتر اس کے کہ میدان موتہ سے خبر آئے صحابہؓ کو ان تینوں کی شہادت کی خبر دی اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے آپ نے فرمایا، اب اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے علم ہاتھ میں لے لیا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالٰی نے اسے ان پر فتح عطا فرمادی ہے۔''

اب یہ کہنا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب جو سابقین اولین میں سے ہیں تاریخ کی رو سے اکتیسویں مسلمان ہیں وہ فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے اور حضرت خالد بن ولید ان پر بازی لے گئے یہ کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا نہ اسے حضرت خالد بن ولید کے حضرت جعفرؓ سے افضل ہونے کی دلیل بنایا جاسکے گا اس طرح یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ خیبر کا قلعہ قموص فتح کرنے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ناکام رہے اور حضرت علیؓ ان پر بازی لے گئے۔ ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ پھر خیبر کے دن یہ تمنا نہ کرتے کہ حضور آج پرچم میرے ہاتھ میں دیں اور خیبر میرے ہاتھوں فتح ہو۔ سو یہ نہ کہا جاسکے گا کہ حضرت علیؓ جن کا چوتھا درجہ ہے اس پہلے نمبر پر آگئے ہیں ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی قلعہ قموص کے فاتح حضرت علیؓ رہے حضرت زبیر مرحب کے بھائی یاسر کے مقابلہ میں نکلے اور اس کا کام تمام کیا۔

الحمدللہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف اس رافضی نے جو چار طرف سے جنگوں سے بھاگنے کی داستانیں پیش کیں ہم نے ایک ایک سے پردے اٹھادیئے ہیں اور حقیقت حال قارئین کے سامنے رکھ دی ہے رہی ضد تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ مخالفین نے تو پیغمبروں پر بھی جرح کی اتنی راہیں نکالی ہیں کہ اب تک مسیحی منادانسان کو پیدائشی طور پر گناہگار کہنے سے نہیں رکتے اور جب تک وہ پیغمبروں کو گناہگار ثابت نہ کرلیں انہیں حضرت عیسیٰ بن مریم کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی کوئی راہ نہیں ملتی۔

حضرت عمرؓ کے خلاف وضع کی گئی باتیں

آیئے اب ہم اس رافضی کے ان الزامات کا بھی ایک مختصر جائزہ لیں جو اس نے حضرت عمرؓ پر جنگوں سے بھاگنے کے لگائے ہیں اور اپنے عوام کو صحابہ کے خلاف اکسانے کے لئے ان لوگوں نے یہ داستانیں وضع کی ہیں اور انہوں نے بیشتر ان وضعی داستانوں کو اپنے بڑوں سے وراثت میں پایا ہے۔

ا۔ جنگ بدر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی شرکت کا رافضی اس طرح اقرار کرتا ہے:۔

جناب ابوبکرؓ و عمرؓ کا آنحضرتؐ کے ہمراہ جانے کا تو تاریخ سے پتہ چلتا ہے مگر تاریخ ان کا کوئی جنگی کارنامہ پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ (تجلیات صداقت ص ۴۸)

کیا جنگ میں ساتھ ہونا ہی اس میں شرکت نہیں ہے؟ آپ ان لوگوں کی بدگمانی کا اندازہ کیجئے۔ یہ رافضی ایک صفحہ پہلے یہ بھی کہہ آیا ہے:۔

ان کی زندگیوں کا ایک خاصا حصہ رسول خدا ﷺ کے ساتھ غزوات نبویہ میں شرکت کرنے میں گزر گیا...... مگر پورے زمانہ میں نہ کبھی کسی کو کوئی ضرب لگائی اور نہ کبھی کسی سے کوئی چوٹ کھائی (ص ۴۷)

اس بات سے کوئی صاحب دانش انکار نہیں کر سکتا کہ جنگ میں شرکت ہی جنگ میں شمولیت سمجھی جاتی ہے کسی نے کتنے مارے اور کتنے نہیں ان کی فہرستیں نہیں بنائی جاتیں اگر کوئی شخص ان حضرات کے شرکاء جنگ میں سے کہے ماضر بوا و ماضر بوا۔ تو اس عینی گواہ کی بات پر غور ہو سکتا ہے کہ الزام کے لئے ایک سند مل گئی اور اگر کوئی شخص جوان حضرات کو دیکھ بھی نہیں پایا نہ ان حضرات کے ساتھ وہ جنگ بدر میں ساتھی رہا وہ اس قسم کا منفی دعویٰ کرے تو اس کے دعویٰ میں کتنا وزن سمجھا جا سکتا ہے یہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

۲۔ جنگ احد میں سب مسلمان شکست کھا گئے پھر شکست فتح میں بدلی

اس پر سب مورخین متفق ہیں کہ جنگ احد میں کچھ لوگوں کے درہ چھوڑنے پر سب مسلمان بطور قوم شکست

کھا گئے خالد بن ولید کے عقبی حملے سے مسلمان دونوں طرف سے آگے اور پیچھے سے کافروں میں گھرے تھے اور اس افراتفری میں مسلمان فوجیوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کس کو مار رہے ہیں کسی مسلمان کو یا کافر کو۔ اس حال میں مسلمانوں نے دوڑ کر ایک پہاڑ پر پناہ لی یہاں تک کہ مسلمان پھر وہاں جمعیت بن گئے وہاں یہ افواہ بھی بڑے زور سے پھیلی تھی کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے ہیں اور بہت سے مسلمان اس غم میں ٹوٹے جا رہے تھے۔ حضرت علیؓ بھی حضور ﷺ کو ڈھونڈ رہے تھے اور حضور ﷺ کے ساتھ نہ رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ بھی پہاڑ پر آ گئے کافروں نے مسلمانوں کو پھر سے جمع ہوتے دیکھا تو وہ مکہ کو بھاگ نکلے اور ان کی فتح پھر شکست میں بدل گئی۔

حضرت عمرؓ کے خطبہ میں احد کی شکست کا ذکر ایک قومی المیہ کے طور پر تھا

رافضی ص ۴۸ پر لکھتا ہے:

ایک مرتبہ بروز جمعہ جناب عمرؓ نے خطبہ میں سورہ آل عمران پڑھی اور کہا احد کے دن ہم شکست کھا گئے تھے

لما كان يوم احد هزمنا ففررت حتى صعدت الجبل.

یہاں یہ چند امور غور طلب ہیں۔

ا۔ حضرت عمرؓ لفظ ھزمنا میں اس دن پورے مسلمانوں کی شکست کا ذکر کر رہے ہیں نہ کہ کسی اپنے ذاتی فعل کو بیان کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے کہ جیسے حضرت علیؓ نے اپنے ایک خطبہ میں بات کہی تھی۔

ولقد كنا مع رسول الله ﷺ نقتل آباء نا و ابناء نا و اخواننا و اعمامنا .

(نہج البلاغہ جلد ا ص ۱۰۰)

ترجمہ: ''اور ہم بے شک حضور کے ساتھ اپنے باپوں، اپنے بیٹوں، اپنے بھائیوں اور اپنے چچاؤں کو قتل کرتے رہے۔''

یہاں کیا کوئی اس کا یہ مطلب لے سکتا ہے کہ یہاں حضرت علیؓ، ابوطالب اور حضرت حمزہ کو قتل کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں یہ قومی سطح کا ایک عمل تھا جو ان دنوں مسلمان کرتے رہے اسی طرح جنگ احد کی ہزیمت بھی مسلمانوں کی ایک قومی درجہ کی ہزیمت تھی جس کی ذمہ داری بمع حضرت علیؓ پوری قوم پر آتی ہے۔ سو اس میں حضرت عمرؓ ھزمنا کا لفظ اسی سطح پر بول رہے ہیں نہ کہ وہ کوئی اپنی بات کہہ رہے ہیں، کوئی عقلمند اپنی ذاتی کمزوری کو کبھی مجمع عام میں بیان نہیں کرتا۔ سو اسے آپ کی ذاتی کمزوری قرار دینا صرف بغض باطن ہی کے باعث ہے نہ کہ یہ کوئی حضرت عمرؓ کا اپنا ذاتی عمل تھا۔

حضرت علیؓ بھی اپنے آپ کو احد کی شکست میں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں

آپ فرماتے ہیں:

ممکن ہے حق تعالیٰ نے ہمارے فعل کی بناء پر ہم پر غضب فرمایا ہو۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۲۱۰)

حضرت عمرؓ کے خطبہ میں ھزمنا سے مراد فرار نہیں اپنی جگہ سے ہل جانا اور مختلف اطراف میں نکلنا ہے یہاں ھزم بھاگنے کے معنی میں نہیں بکھر جانے کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے خطبہ میں آپ نے اسے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے یہ روایت بھی کلیب ہی کر رہے ہیں۔

عن کلیب قال خطبنا عمر فکان یقراء علی المنبر آل عمران ثم قال تفرقنا عن رسول الله یوم احد فصعدت الجبل فسمعت یهودیاً یقول قتل محمد فقلت لا اسمع احداً یقول قتل محمد الا ضربت عنقه. (درمنثور جلد ۲، ص ۱۴۳)

ترجمہ: ''حضرت عمرؓ نے کہا ہم احد کے دن حضور اکرم ﷺ سے (عقبی حملے سے پیدا ہونے والی افراتفری میں) متفرق ہو گئے میں اس حال میں پہاڑ پر چڑھ گیا۔ وہاں میں نے ایک یہودی کو کہتے سنا کہ حضور مارے گئے ہیں میں نے جوابی آواز دی میں جس کو بھی یہ کہتے سنوں گا اسے جان سے مار دوں گا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور بھی وہاں آ گئے اور لوگ آپ کی طرف چلے آ رہے ہیں۔''

سو ھزمنا یہاں متفرق ہونے کے معنی میں ہے سو اس عبارت میں منھزمین کا معنی بھی متفرق ہو جانے والے ہی کیا جائے گا نہ کہ بھاگنے والے۔ رافضی نے امام رازی کے حوالے سے حضرت عمرؓ پر احد کے دن بھاگ نکلنے کا الزام ان لفظوں سے لگایا ہے۔

ومن المنهزمین عمر الا انه لم یکن فی اوائل المنهزمین ولم یتبعد. (تفسیر کبیر جلد ۹، ص ۴۲)

ترجمہ: ''اور احد کے دن (افراتفری میں) متفرق ہو جانے والوں میں عمر بھی تھے لیکن جو لوگ پہلے متفرق ہوئے آپ ان میں نہ تھے اور آپ دور بھی نہ گئے تھے۔ پہاڑ پر چڑھتے ہی آپ نے آواز لگائی تھی کہ جو شخص کہے گا کہ حضور مارے گئے میں اسے قتل کر دوں گا۔''

اس صورت حال کو کوئی بھی جنگ سے فرار کا نام نہ دے سکے گا۔ بالخصوص جب کہ حضور بھی بالآخر اس پہاڑ پر آ گئے تھے اور یہ امت منتشرہ پھر وہاں جمع ہو نے لگی۔ اس صورت حال کو اس بیان میں دیکھیں:

فلو استمروا علیٰ المکث هناک لقتلهم العدو من غیر فائدة اصلاً فلهذا السبب جاز لهم ان یتنحو عن ذٰلک الموضع الیٰ موضع یتحرزون فیه عن العدو الا تری ان النبی ﷺ ذهب الیٰ الجبل فی جماعة من اصحابه ویحصنوا به ولم یکونوا عصاة بذٰلک فلما کان هٰذا الانصراف جائزاً اضافه الیٰ نفسه بمعنی انه کان بامره واذنه. (تفسیر کبیر جلد ۹، ص ۵۱)

ترجمہ: ''اگر صحابہؓ وہیں ٹھہرے رہتے تو دشمن ان سب کو قتل کر دیتے اور اس میں سرے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ سو ان کے لئے اس مقام سے ہٹ کر ایک طرف ہو جانا جہاں وہ دشمن سے بچ سکیں، بالکل درست تھا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضور خود بھی پہاڑ کی طرف اپنے صحابہؓ کے پاس پہنچے جو وہاں اپنے آپ کو بچائے ہوئے تھے اور وہ اس میں ہرگز گناہگار نہ تھے پس جب یہ ایک طرف مڑنا درست تھا تو اسے آپ نے اپنی طرف نسبت دی۔ گویا یہ آپ کا ہی امر اور اذن تھا۔''

جب حضرت عمرؓ میدان احد میں پہلے متفرق ہونے والوں میں نہ تھے اور اس وقت دونوں طرف تلواریں چل رہی تھیں تو خود سوچئے کیا آپ پر اس وقت کافروں کے حملے نہ ہوتے ہوں گے اور کیا آپ انہیں نہ روکتے ہوں گے! ایسی گھمسان کی لڑائی میں کچھ عرصہ جمے رہنا اور ایک زخم تک نہ کھانا، کیا آپ کا محیر العقول جنگی کارنامہ نہیں؟ رہا یہ سوال کہ آپ وہاں کیوں گئے تو اگر یہی سوال حضرت علیؓ پر آئے کہ آپ حضور سے دور کیوں رہے جیسا کہ ہم مدارج النبوۃ کے حوالے سے پہلے کہہ آئے ہیں تو اس صورت میں ہمارا جواب کیا ہوگا؟

حضرت عمرؓ کے خطبہ میں اختلاف الفاظ

رافضی نے تجلیات کے ص ۲۴۷ پر حضرت عمرؓ کا جو خطبہ نقل کیا ہے اس میں ھزمنا اور فررت کے الفاظ ہیں اس پر رافضی نے درمنثور کا حوالہ دیا ہے۔ اور جو خطبہ ابن المنذر نے کلیب سے روایت کیا ہے۔ اس میں ھزمنا کی بجائے تفرقنا کا لفظ ہے اور فررت کا لفظ سرے سے ہے ہی نہیں اور وہ روایت بھی اسی کتاب میں ہے۔ (الدر المنثور، جلد ۲، ص ۱۴۳)

سو فررت کا لفظ یہاں حقیقی فرار کے معنی میں نہیں، جگہ چھوڑ کے جلدی سے پہاڑ پر چلے آنا ہے یہ بھی اس صورت میں کہ اس کی سند متصل ہو۔ جب فررت کا لفظ ایک روایت میں ہے اور ایک میں نہیں اور اتصال روایت ایک روایت میں بھی نہیں تو بنیادی عقائد ایسے دلائل ظنیہ سے نہیں لئے جاتے۔ ہاں یاد رہے کہ جن علماء نے انہیں اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے انہوں نے بھی ان سے اپنے عقائد نہیں لئے۔ خالد بن ولید کے عقبی حملے سے مسلمانوں کی فتح کس طرح شکست میں بدلی اور اس وقت حضرت عمرؓ کہاں تھے؟ اپنی شکست خوردہ افواج کے ساتھ ہی تھے جو کفار کے دوطرفہ حملوں کی وجہ سے

مورچوں سے ہٹ چکے تھے اس پریشان حالی میں حضرت عمرؓ کہاں تھے؟ وہیں اپنے ساتھیوں کو سہارا دے رہے تھے جیسے بڑا اپنے چھوٹوں کو تسلی دیتا ہے۔ آپ اسے خدا تعالیٰ کا ایک تکوینی امر بتا رہے ہیں۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ احد کی شکست میں مسلمان اپنے مورچے چھوڑ کر گھروں کی طرف نہیں بھاگے تھے وہیں پھر سے جمع ہو رہے تھے حضرت عمرؓ نے اس صورت حال کو مشیت ایزدی کہا آنحضرت ﷺ نے بھی اس جگہ کو چھوڑ کر پہاڑ کا رخ اختیار کیا یہ بھاگنا نہیں تھا نئے سرے سے کھوئی طاقت کو جمع کرنا تھا، ارباب سیر لکھتے ہیں:

جب کچھ مسلمان حضور کے پاس جمع ہو گئے تو آپ پہاڑ کی طرف چلے، ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، اور حارث بن صمہ وغیرہ آپ کے ہمراہ تھے۔ (سیرت مصطفیٰ، جلد ۲، ص ۲۰۹)

بھاگنے والوں اور واپس ہونے والوں میں جوہری فرق

اصول شرع میں اعتبار بعد کی بات کا ہوتا ہے بھاگنے والے وہی سمجھے جاتے ہیں جو آخر تک واپس نہ ہوئے ہوں، جو گئے سو گئے۔ اور جو اپنے مرکز پر واپس آ گئے گو کتنی دیر میں آئے اور قافلہ سالار نے بھی انہیں قبولیت بخشی۔ انہیں بھاگنے والے نہیں کہا جا سکتا انہیں ایسا کہنا خود قافلہ سالار کی گستاخی اور بے ادبی شمار ہوگی قرآن کریم نے ان کے پہلے عمل کو اگر تولوا سے تعبیر کیا ہے (ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان) تو ساتھ ہی انہیں معاف کرنے کی بھی خبر دے دی اور یہ بدوں اس کے نہیں ہو سکتا کہ وہ حضورؐ کے پاس واپس ہوئے ہیں اور حضورؐ نے انہیں پذیرائی دی ہو۔

اب قرآن کریم میں ان کی تولّی کا ذکر مقربین کے پہلو سے ہے۔ ورنہ اسے بغیر توبہ معاف نہ کیا جاتا اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ان کی توبہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ مقربین کی ذرا سی کمزوری پر بھی اس کا نوٹس لیا جاتا ہے گو وہ کمزوری نیک آدمیوں کے ہاں خود ایک نیکی نہ ہو۔ حضورؐ کے وفات پانے کی خبر سے کچھ مخلصین کا بالکل ہمت ہار دینا اس غلط خبر کا ایک فطری اثر تھا مورخ اسلام مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کا سب سے بڑا وصف حیا تھا اور حیا خود صفت انفعال ہے اس بناء پر آپ اس طبقہ میں شامل تھے حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ فعل ایک سخت گیر دہشت انگیز خبر کا فوری اثر تھا اس کو میدان جنگ سے فرار نہیں کہا جا سکتا تاہم حسنات الابرار سیأت المقربین کے مطابق قرآن میں اس کو تولّی اور روگردانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کی معافی کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ (عثمان ذوالنورین ص ۶۷)

بات حضرت عمرؓ کی ہو رہی تھی حضرت عثمانؓ کا ذکر یہاں ضمناً آ گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا وارفتگی میں تڑپنا جنگ سے بھاگنا نہیں تھا

بھاگنے والا دور جا کر عافیت پاتا ہے یا گھر چلا جاتا ہے مگر حضرت عمرؓ کے بارے میں رافضی بھی لکھتا ہے ''اور نہ ہی زیادہ دور گئے تھے'' ص ۴۸، سطر ۲۰۔ پوری قوم کو شکست ہونے کے بعد میدان جنگ کے قریب رہنا انہی کا کام ہوتا ہے جو مزید طاقت جمع کر کے پھر سے جنگ میں اترنا چاہتے ہوں حضرت عمرؓ کا پہاڑ پر چڑھ کر یہ کہنا کہ جو حضورؐ کے بارے میں کہے گا کہ آپ وفات پا گئے ہیں میں اسے قتل کر دوں گا اور آپ کا گھر واپس نہ جانا اور پہاڑ پر تڑپنا اور چھلانگیں لگانا اور دشمنوں کو للکارنا بتلاتا ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں بھی آپ نئی جنگی تدبیر میں تھے کہ کب نیا حملہ کریں نہ کہ آپ کا یہ عمل جنگ سے فرار شمار کیا جائے۔

حضرت عمرؓ اپنی اس حالت کو برسر منبر بیان کر رہے ہیں کہ جنگ احد کی اس شکست پر میری کیا حالت تھی۔ اگر اس میں حضرت عمرؓ کی اپنی کمزوری کا کوئی پہلو ہوتا جسے آپ کے معائب میں بیان کیا جا سکے تو کیا آپ خود اپنی برائی بیان کرتے؟ ہرگز نہیں۔ اور پھر اس وقت جب آپ امیر المومنین اور پوری امت کے امام تھے؟ آپ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ آپ اپنی کمزوری برسر منبر بیان کریں۔ فتفکروا ولا تکن من الجاھلین۔ جنگ احد میں خالد بن ولید کے عقبی حملے سے دشمن فوج کے دو طرف آ جانے سے جن لوگوں کے قدم پہلے اکھڑے آپ ان میں نہ تھے۔ آپ پہاڑ کی طرف تب گئے جب یہاں جان ضائع کرنے کے سوا اور کوئی نتیجہ عمل نہ تھا۔ اور ایسے موقع پر پھر سے اپنی جمعیت بنانے اور جنگ سے ہٹ جانے کی خود قرآن تعلیم دیتا ہے۔

حاصل اینکہ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ جنگ احد میں فرار کر گئے تھے، ایک نہایت غلیظ جھوٹ ہے۔

جنگ احد سے جانے والے جو پھر واپس نہ آئے

جنگ احد کے مقاصد میں ایک مقصد یہ تھا کہ منافقین مومنین سے جدا ہو جائیں اور دوسرا یہ تھا کہ مومنین ابتلاء کے مختلف پیرایوں سے گزارے جائیں اور آئندہ وہ پوری قوت سے ابھریں اور دنیا میں اللہ کے نام پر ایک عظیم سلطنت قائم ہو۔

(۱) ولیعلم اللہ الذین امنوا ویتخذ منکم شھداء واللہ لا یحب الظالمین ○ ولیمحص اللہ الذین امنوا و یمحق الکافرین. (پ ۴، آل عمران، ۱۴۱)

ترجمہ: ''اور یہ کہ شہادت لے ان کی جو ایمان لائے اور لے تم سے کچھ شہید اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہ کہ اللہ پاک کرے مومنین کو (کافروں سے) اور مٹا دے کافروں کو۔''

(۲) ولیعلم الذین نافقوا وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعو قالوا لو

نعلم قتالاً لا تبعنا کم هم للکفر یومئذٍ اقرب منهم للایمان.

(پ ۴ ،آل عمران، ۱٦٧)

ترجمہ: ”اور یہ کہ وہ جان لے (بطریق شہادت) ان لوگوں کو جو منافق تھے اور جب کہا گیا ان کو آؤ اور لڑو اللہ کی راہ میں یا پیچھے ہٹاؤ دشمن کو۔ بولے ہم جانتے لڑنا تو ہم تمہارے ساتھ رہتے اس دن وہ لوگ بہ نسبت ایمان کفر کے قریب تھے کہتے تھے منہ سے وہ بات جو ان کے دلوں میں نہ تھی۔“

پہلی آیت میں ظالمین سے مراد اگر مشرکین ہیں جو احد میں فریق مقابل تھے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کی عارضی کامیابی کا سبب یہ نہیں کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے بلکہ دوسرے اسباب ہیں اور منافقین مراد ہوں جو عین موقع پر مسلمانوں سے الگ ہوئے تو یہ بتلا دیا کہ وہ خدا کے نزدیک مبغوض تھے اس لئے ایمان وشہادت کے مقام سے انہیں دور پھینک دیا گیا۔ (ص ۸۷)

جنگ ہونے سے پہلے جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگا اس وقت کہا گیا کہ عین موقع پر کہاں بھاگتے ہو آؤ اگر دعویٰ اسلام میں سچے ہو تو اللہ کی راہ میں لڑو ورنہ کم از کم دشمن کو دفع کرنے میں حصہ لو یعنی مجمع میں شریک رہو، تا کہ کثرت تعداد کا اثر دشمن پر پڑے...... اس روز عین موقع پر پیغمبر علیہ السلام کو چھوڑ کر چلے جانے اور جھوٹے حیلے تراشنے سے اچھی طرح نفاق کی قلعی کھل گئی۔ اب ظاہر میں یہ بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہوگئے (ص ۹۳ تفسیر عثمانی)

جنگ احد سے یہ جانے والے وہ تھے جو پھر نہ واپس آئے نہ وہ مسلمانوں میں پھر سے شامل ہوئے جنگ احد کا یہ جو مقصد تھا کہ منافقین مومنین سے جدا ہو جائیں وہ اس طرح پورا ہو گیا۔

جنگ احد میں مومنین پر بھی بہت سے مراحل آئے کچھ لوگوں نے خلاف حکم رسول درہ کو چھوڑ دیا اور مسلمان آگے سے اور پیچھے سے دونوں طرف سے مشرکین میں گھر گئے جب ان کے گرد مومنین جو منتشر ہوئے تھے پھر سے جمع ہونے لگے حضورؐ جہاں پہلے کھڑے تھے وہاں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ آئے۔ حضرت طلحہ وسعدؓ تو ہر لحہ حضورؐ کے ساتھ رہے حضرت علیؓ بھی حضورؐ سے جدا ہو گئے تھے اب انہوں نے بھی حضورؐ کو تلاش کر لیا (دیکھو مدارج النبوۃ جلد ۲ ص)

سو اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ بالآخر سب حضورؐ کے پاس آگئے اب ان کو بھاگنے والا کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:۔

واعلم ان القوم لما انهزموا من النبیؐ یوم احد ثم عادوا لم یخاطبهم الرسول بالتغلیظ والتشدید وانما خاطبهم بالکلام اللین ثم انه سبحانه وتعالیٰ...... عفا

عنهم وزاد فی الفضل والاحسان بان مدح الرسول علی عفوه عنهم.

(تفسیر کبیر جلد ۹، ص ۵۰)

ترجمہ: ”اور جان لو کہ احد کے دن جو لوگ نبیؐ سے متفرق ہو گئے تھے اور پھر آ گئے تھے (جلدی یا بدیر) حضورؐ نے ان سے غصے اور سختی کا برتاؤ نہ کیا نرمی سے ان سے بات کی پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی انہیں معاف کر دیا اور ان پر فضل واحسان فرمایا اور حضورؐ کی ان سے درگزر کرنے پر مدح فرمائی۔“

قال القفال والذی تدلّ علیه الاخبار فی الجمله ان نفراً منهم تولوا وابعدوا منهم من دخل المدینه ومنهم من ذهب الیٰ سائر الجوانب واما الاکثرون فانهم نزلوا عندالجبل واجتمعوا هناک ومن المنهزمین عمر الا انه لم یکن فی اوائل المنهزمین ولم یبعد بل ثبت علی الجبل الیٰ ان صعد النبیؐ.

(تفسیر کبیر جلد ۹، ص ۴۲)

ترجمہ: ”تاریخ سے جو پتہ چلتا ہے مختصراً یہ ہے کہ مسلمانوں سے کچھ لوگ (مشرکین کے دوطرفہ حملے سے) بھاگ نکلے اور بہت دور چلے گئے ان میں وہ بھی نکلے جو مدینہ میں آ داخل ہوئے اور وہ بھی جو ادھر ادھر چل دیئے لیکن اکثر لوگ پہاڑ کے پاس جا نکلے اور وہاں پھر سے اپنی جمعیت بنائی ان اپنی جگہ سے ہلنے والوں میں عمرؓ بھی تھے۔ مگر وہ پہلے جگہ چھوڑنے والوں میں نہ تھے نہ دور تک گئے بلکہ پہاڑ پر ثابت قدم رہے یہاں تک کہ حضور بھی وہیں پہاڑ پر آ چڑھے۔“

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب مومنین بالآخر حضور ﷺ کے پاس حاضر جمع ہو گئے اور منتشر مومنین پھر ایک جمعیت بن گئے۔ اور اس جمعیت کا مشرکین پر اتنا رعب پڑا کہ انہوں نے اب مکہ کی طرف جانا غنیمت جانا اور ادھر مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ایسی جگہ سے پیچھے ہٹنا جہاں فوج بالکل دشمن کی زد میں ہو فوجی نقطہ نظر سے کوئی عیب نہیں گو رافضی نقطہ نظر یہ ہو کہ اسے وہیں مر جانا چاہئے تاہم قانون فطرت کسی کو اس طرح خودکشی کی اجازت نہیں دیتا جنگ احد میں ساری قوم کو شکست ہو گئی اب اگر وہ پھر پہاڑ پر جمع ہوئے اور حضور ﷺ بھی ان میں آ گئے اور پھر مسلم فوج تازہ دم ہو گئی تو اس میں ہرگز کوئی عیب نہیں جس کی دیکھنے کی آنکھ ہی نکل چکی ہو اسے دوسرے کا ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد

عیب نماید ہنرش درنظر

اگر حضرت عمرؓ پہاڑ پر آ نکلے اور پھر حضورؐ بھی پہاڑ پر آ چڑھے تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی دشمنوں کے نرغے میں جان دینی مناسب نہ سمجھی ہوگی اس دوران اگر آپ بھی حضورؐ کے ساتھ نہ رہے اور آپ حضورؐ کو ڈھونڈتے رہے تو اس سے حضرت علیؓ کو بھگوڑا کہنا کسی بدبخت کا کام ہی ہوسکتا ہے بلکہ ان میں سے کسی کو حضرت عمرؓ کو یا حضورؐ کو کوئی ایمان والا ہرگز بھگوڑے نہ کہے گا۔

حضرت علیؓ مرتضٰی حضورؐ کی تلاش میں

حضرت علیؓ کے ایمان اور اخلاص کو دیکھئے کہ آپ جب حضورؐ سے دور جا نکلے تو کس بے قراری سے حضورؐ کی تلاش میں رہے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کو پالیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

حضرت علیؓ مرتضٰی سے مروی ہے کہ جب کفار نے مسلمانوں پر غلبہ کیا اور حضور میری نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میں نے آپ کو مقتولوں اور شہیدوں میں تلاش کیا مگر آپ نظر نہ آئے تو میں نے اپنے آپ سے کہا ممکن ہے حق تعالیٰ نے ہمارے فعل کی بناء پر ہم پر غضب فرمایا ہو اور اپنے نبی کو آسمان پر اٹھالیا ہو میں نے خود سے کہا اس سے بہتر یہی ہے کہ میں خوب جنگ کروں یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں۔ میں نے تلوار سونت کر مشرکوں پر حملہ کردیا اور ان کے پرے کے پرے الٹ دیئے اچانک میں نے حضور اکرمؐ کو دیکھا کہ صحیح وسلامت ہیں میں نے جان لیا کہ حق تبارک تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ آپ کی حفاظت فرمائی ہے (مدارج النبوۃ ۲، ص ۲۱۰)

جنگ احد میں حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ بات واضح ہوچکی کہ آپ جنگ سے بھاگے نہ تھے فوجی نقطہ نظر سے آپ پہاڑ پر آ گئے تھے اور پھر باقی لوگ بھی یہاں آ کر پھر سے جمع ہوئے تھے اور پھر حضورؐ بھی وہیں آ گئے تھے اور مسلم شیرازہ پھر سے بندھ گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے خلاف وضع کی گئی داستان پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتی اب آگے چلئے۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف وضع کیے گئے الزامات

اب ہم حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھی کچھ گذارش کرتے ہیں۔

یہ حضرت علیؓ کا اپنا اعتراف ہے کہ آپ اس دن ہر لحہ حضورؐ کے ساتھ نہ رہے تھے ورنہ یہ نہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ آپ کی محافظت فرمائی ہے آگے حضرت شیخ عبدالحق لکھتے ہیں:۔

جب مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ حضور اکرم ﷺ کو تنہا چھوڑ گئے۔ (الخ)

اس میں تصریح ہے کہ اس دن آپ پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے کہ آپ تنہا رہ گئے تھے ارباب سیر لکھتے ہیں کہ اس دن سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ آپ کے پاس آئے پھر کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ بھی آپ کے پاس آ پہنچے۔ یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ آپ کو مقتولوں اور شہیدوں میں تلاش کر رہے تھے اس وقت آپ یقیناً حاضر خدمت نہ تھے۔

اس دن حضورؐ کے گرد صرف چودہ محافظین رہے تھے سات مہاجرین میں سے اور سات انصار میں سے ابن سعد لکھتے ہیں:۔

ثبت معه عصابة من اصحابه اربعه عشر رجلاً سبعة من المهاجرين فيهم ابوبكرؓ الصديق رضى الله عنه وسبعة من الانصار. (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲۶)

ترجمہ: ''حضورؐ کے پاس اس دن چودہ صحابی ٹھہرے رہے تھے سات مہاجرین میں سے، ان میں حضرت ابوبکرؓ صدیق بھی تھے اور سات انصار میں سے۔''

سو اگر اس دوران کسی وقت آپ اکیلے بھی رہے اسے کسی طرح حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت طلحہ اور حضرت علیؓ کی بے وفائی نہیں کہا جا سکتا۔ بھیڑ بکری بھاگ جاتی ہے مگر پہاڑی بکری کودتی پھاندتی ہے اور ٹکرانا جانتی ہے، بھاگنا نہیں جانتی، حضرت عمرؓ اس غلط خبر پر کہ حضورؐ مارے گئے ہیں، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے مگر افسوس کہ رافضی انہیں گھر بھاگا کہہ رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ آپ اس دن میدان میں نہ رہے تھے (استغفر اللہ)

اگر وہ گھر بھاگ گئے ہوئے تھے تو حضور اکرمؐ پہاڑ پر آخر کس کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے حضرت علیؓ تو ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اس دن افراتفری کے عالم میں جتنے صحابہؓ آپ سے دور ہو گئے انہوں نے دامن نبوت میں دوبارہ آ پناہ لی۔ کئی دیر میں بھی آئے مگر حضورؐ نے انہیں بھی اپنے دامن محبت میں پذیرائی بخشی کسی پر ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا۔ ہاں جو لوگ واپس نہ آئے اور حضور اکرمؐ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے وہ واقعی خبیث تھے جن سے اللہ تعالیٰ طیب اور پاک لوگوں کو الگ کرنا چاہتا تھا۔ دیکھئے (پ ۴، آل عمران ۱۶۷)

وما اصابكم يوم التقى الجمعان فباذن الله وليعلم المومنينo وليعلم الذين نافقوا.

ترجمہ: ''اور جو کچھ پیش آیا تم کو اس دن کہ ملیں دو فوجیں تو یہ سب اللہ کے علم سے تھا اور یہ کہ اللہ (بطریق شہادت) جان لیوے ان لوگوں کو جو منافق تھے۔''

ما كان الله ليذر المومنين علىٰ ما انتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب. (پ ۴ آل عمران ۱۷۹)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ نہیں کہ چھوڑ دیں تم کو اس حالت پر جس پر کہ تم ہو، یہاں تک کہ جدا کر دے ناپاک کو پاک سے۔''

مومن اور منافق میں اور خبیث اور طیب میں یہ فرق کیسے قائم ہوا؟ یہ اس طرح کہ منافقین نے اپنے نفاق کا اظہار کر دیا اور آنحضرت ﷺ سے کھلے طور پر جدا ہو گئے۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگا اس وقت کہا گیا تھا کہ اب کہاں بھاگتے ہو، آؤ اگر دعوے اسلام میں سچے ہو تو اللہ کی راہ میں لڑو (ص ۹۳)

عن ابن اسحق فى قوله وليعلم المومنين وليعلم الذين نافقوا ...... يعنى عبدالله بن ابى واصحابه. (الدر المنثور جلد ۲ ص ۱۶۶)

اس آیت میں مومنین اور منافقین کے جانے سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے (تین سو ساتھیوں) کا علیحدہ ہونا ہے یہ لوگ پہلے مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے جنگ احد میں انہوں نے اپنے نفاق کو ظاہر کر دیا۔ مومنین اور منافقین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ان منافقین کے نکلنے سے مومن اور منافق میں ہمیشہ کے لئے ایک فاصلہ قائم ہو گیا اب منافق مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے نہ رہتے تھے علامہ بغوی (۵۱۶ھ) لکھتے ہیں:

معنى الآية حتى يميز المنافق من المخلص فميّز اللّٰه المومنين من المنافقين يوم احد حيث اظهر واالنفاق وتخلفواعن رسول اللّٰه. (معالم التنزيل ص ۲۰۰)

ترجمہ: ''یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ منافق کو مخلص سے جدا کر دے اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منافقین سے احد کے دن علیحدہ کر دیا۔ جب انہوں نے اپنا نفاق ظاہر کر دیا اور وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس سے ہٹ گئے۔'' (تو وہ مستقل طور پر حضورؐ سے ہٹ گئے تھے)

امام رازی (۶۰۶ھ) بھی یہی کہتے ہیں:

ان عبداللّٰه بن ابى بن سلول لما خرج بعسكره الىٰ احد قالوا لم نلقى انفسنا فى القتل فرجعوا وكانوا ثلٰث مائة من جمله الالف الذين خرج بهم رسول اللّٰه فقال لهم عبدالله بن عمرو بن حزام ابوجابر بن عبداللّٰه الانصارى اذكركم اللّٰه

ان تخذ لوا نبيكم وقومكم عند حضورا لعدو فهٰذا هوالمراد. (تفسير كبير جلد ۹، ص ۶۹)

ترجمہ: ''عبداللہ بن ابی جب اپنے لشکر کے ساتھ احد کی طرف نکلا تو وہ لوگ کہنے لگے ہم اپنے آپ کو موت کے منہ میں کیوں دیں اس پر وہ واپس لوٹے اور وہ تین سو اسی ہزار میں تھے جنہیں حضور اکرم ﷺ لے کر نکلے تھے انہیں عبداللہ بن عمرو بن حزام نے کہا میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں تم اپنے نبی کو اور اپنی قوم کو دشمن کے سامنے آ کر رسوا نہ کرو۔ یہاں حضور سے منافقین کی دوری مستقل طور پر قائم ہوئی اور حضور کی جمعیت میں پھر سے آ جانے والے وہ حضرت عمرؓ ہوں یا حضرت علی، وہ مستقل طور پر حضور سے جدا نہ ہوئے تھے اور انہیں دامن رسالت کے سوا اور کہیں قرار نہ تھا وہ پھر مرنے کے لئے آپ کے گرد جمع تھے۔''

بہت مدت سے دل کی بے قراری کو قرار آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

حضرت عمر، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جب دنیا سے گئے مقام شہادت پا کر گئے یہ جنگ احد کا واقعہ ان کی شہادت سے پہلے ہو چکا تھا ایک دفعہ جب آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تھے آپ نے احد کو مخاطب کر کے کہا تھا احد سکون کر تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں، احد پر اگر یہ حضرات شہادت پانے سے کچھ کنارہ کش ہو رہے ہوتے تو حضور احد پر ان کے مقام شہادت کا ذکر نہ کرتے۔ بھاگنے والوں کو شہادت کا تمغہ دینا پیغمبر کی شان سے نہایت بعید ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ میدان کارزار میں کبھی مومنین کے دل بھی دہل جاتے ہیں تاہم اس حالت اضطراب اور پریشانی میں ان کے ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

يايها الذين امنوا اذكروا نعمة الله عليكم اذ جاء تكم جنود فارسلنا عليهم ريحاً و جنوداً لم تروها وكان الله بما تعملون بصيراً ٥ اذ جاء وكم من فوقكم ومن اسفل منكم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجروتظنون بالله الظنونا، هنالك ابتلى المومنون وزلزلوا زلزالاً شديداً.

(پ ۲۱، الاحزاب ۱۱،۱۰)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر، جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے بھیج

دی ان پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ہے اللہ دیکھنے والا جو تم کرتے ہو۔ جب وہ چڑھ آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور نیچے سے اور جب بدلنے لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گلوں تک اور اندازے کرنے لگے تم اللہ کی باتوں پر۔ وہاں جانچے گئے ایمان والے اور ہلا کر رکھ دیئے گئے وہ زور سے ہلایا جانا۔"

اس سے پتہ چلا کہ مومنین کا دشمنوں کی بڑی قوت دیکھنے سے حالت اضطراب میں آنا یہاں تک کہ ان کے دل دہل جائیں ہرگز ان کے ایمان کے منافی نہیں اگر دشمن کی کثرت افواج سے متاثر ہونا اور اپنے سالار اعظم سے صورت حال گذارش کرنا خلاف ایمان ہوتا تو قرآن کریم ایک مقام پر یہ نہ کہتا:

الآن خفف الله عنكم وعلم ان فيكم ضعفاً فان يكن منكم مأة صابرة يغلبوا مائتين. (پ ١٠، الانفال ٦٦)

ترجمہ: "اب بوجھ ہلکا کر دیا ہے اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ تم میں کچھ سستی ہے سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب رہیں گے دو سو پر اللہ کے حکم سے۔"

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دشمن کی مقدار اسلحہ اور ان کی افرادی قوت کا جائزہ لینا ہرگز خلاف ایمان نہیں ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کا سفیر مکہ کے طور پر حضرت عمرؓ کو وہاں بھیجنا اور حضرت عمرؓ کا حضور ﷺ کو یہ مشورہ دینا کہ وہاں میری بجائے حضرت عثمانؓ زیادہ بہتر ثابت ہوں گے اور یہ کہ ان کی عزت اہل مکہ کے ہاں زیادہ ہے ہرگز اپنی جان کے خوف سے نہ تھا کون سا فرد کہاں زیادہ مناسب رہے گا یہ امور فوجی کارروائی کا جزو سمجھے جاتے ہیں ایسی کوئی بات ہرگز ایمان کے خلاف نہیں سمجھی جا سکتی۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف بھی بدگمانی نہ کیجئے

شکست کی افراتفری میں حضرت عثمانؓ دو انصاری ساتھیوں کے ساتھ جن کے نام سعد اور عتبہ تھے اپنی جگہ سے ہٹے اور دور تک چلے گئے، مسلمان پھر سے جمع ہوئے تو یہ حضرات بھی حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہو گئے حضور ﷺ نے انہیں اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ تم اس وادی میں بہت دور نکل گئے تھے؟ امام رازی لکھتے ہیں دیکھئے تفسیر کبیر جلد ۹ صفحہ ۵۰:

ولما دخل عليه عثمان مع صاحبيه ماز اد علیٰ ان قال لقد ذهبتم فيها عريضة.

ترجمہ: "جب عثمان اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ حضورؐ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ تم بہت دور نکل گئے تھے۔"

یہ بات کہاں ہو رہی ہے؟ اسی میدان احد میں۔ معلوم ہوا حضرت عثمانؓ بھاگ کر اپنے گھر نہ چلے گئے تھے حضورؐ

کے پاس پھر حاضر ہو گئے تھے۔

حضور بھی سمجھتے تھے کہ ان کا جانا اسی غلط فہمی میں رہا کہ مسلمان شکست کھا گئے ہیں اور اب انہیں دوبارہ مدینہ آ کر تیاری پھر سے کرنی ہوگی۔ انہیں پتہ نہ چلا کہ انہیں پھر لڑنے کی نوبت نہ آئی تھی سو آپ کسی دوسرے سے عملاً پیچھے نہ رہے انہیں اگر پتہ چلتا کہ جنگ پھر سے شروع ہو گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ جلد وہاں آ جاتے ان کی فراست بہت مشہور تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھے ہوں کہ اب پھر سے جنگ نہ ہوگی سو اب قریب رہنے اور دور جانے میں کیا فرق رہا۔ پھر آپ نے مرکز میں آنا مناسب جانا اور پھر سے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے حضور بھی آپ کے جذبات اور احساسات کو جانتے تھے۔ آپ نے انہیں کچھ سرزنش نہ کی بلکہ جس نے بھی آپ پر کوئی انگلی اٹھائی آپ نے اسے اس سے روک دیا۔ حضرت علیؓ نے کچھ کہا تو آپ ان سے ناراض ہوئے اور فرمایا:۔

یا علی اعیانی ازواج الاخوات ان یتحابوا. (تفسیر کبیر جلد ۹ ص ۴۲)

ترجمہ: "اے علی، مجھے اس بات نے تھکا دیا ہے کہ ہم زلف آپس میں کیوں محبت میں نہیں رہتے۔"

جب حضورؐ نے اسے کوئی بڑی غلطی قرار نہیں دیا بس اتنا کہا کہ تم اس وادی میں بہت دور چلے گئے تھے؟ اور حضرت عثمانؓ بھی تین دن دیر سے آنے میں کسی ایسی بڑی نیکی سے محروم نہ رہے تھے کہ اور حضرات وہ سعادت پا گئے ہوں اور آپ اس سے محروم رہے ہوں جب ایسا نہیں تو پھر آپ پر بزدلی کی تہمت لگانا کیا حضورؐ سے اپنی آواز بلند کرنا نہیں ہے؟ کہ حضور تو اسے کوئی بڑی غلطی نہ سمجھیں اور رافضی اس سے آپ کو منصب خلافت پر ہی نہ آنے دیں، معلوم نہیں روافض کو حضورؐ کے فیصلے کے خلاف یہ نفرت کا لاوا اگلنے میں کیا لذت محسوس ہوتی ہے۔

یا ایها الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ...... ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون. (پ ۲۶، الحجرات ۲)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے اونچا نہ کرو، اس سے تمہارے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں خبر تک نہ ہوگی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے اگر حضرت عثمانؓ کی کوئی کمزوری سمجھتے تو جنگ خیبر میں مقام رجیع کے بعد جب آپ قلعہ نطاۃ کی طرف گئے تھے تو حضرت عثمانؓ کو اپنی قیام گاہ کا ذمہ دار نہ بناتے اور نہ فوج کے کسی حصے کا آپ کو انچارج ٹھہراتے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"دوسرے دن حضرت عثمانؓ بن عفان کو منزل کی خلافت سپرد کر کے اور لشکر کے امور کی انجام دہی تفویض فرما کر قلعہ کے نیچے جنگ گاہ میں تشریف لے گئے۔" (مدارج النبوۃ ۲، ص ۲۰۷)

کیا کوئی سمجھدار سربراہ میدان جنگ سے بھاگے ہوئے کسی فوجی کو کسی دوسری جنگ میں فوج کے کسی حصے کا چارج سپرد کرتا ہے؟ کبھی نہیں۔ تو حضورؐ کے اس طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد کے اس واقعہ کو حضرت عثمانؓ کی بزدلی ہرگز نہ سمجھا تھا۔ پھر آپ نے جب حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا تو آپ کو یہ اندیشہ کیوں نہ ہوا کہ مشرکین اسے کہیں قتل نہ کر دیں یا قید نہ کر لیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ وقت کے لئے انہوں نے انہیں قید بھی کیا۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ حضور اکرمؐ کے ذہن پر آپ کے بارے میں بزدلی کا کوئی ادنیٰ اندیشہ بھی نہ تھا۔ پھر آپ نے اپنے انقضائے خلافت پر جس حوصلے اور سکون سے موت کا استقبال کیا اور مسلم افواج میں سے کسی دستے کو اپنی حفاظت کے لئے نہ کہا اور اس عالی ظرفی سے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی کہ آسمان بھی اس وقت یہ شہادت دیتا ہوگا کہ اس جرأت اور صولت کی نظیر شاید آسمان نے کبھی نہ دیکھی ہو۔

؎ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

صحابہؓ کے مقام جنگ چھوڑنے سے قریش مکہ بھی اسے چھوڑ گئے

خالد بن الولید کے عقبی حملے سے جونہی مسلمانوں نے شکست کھائی اور سب مسلمان کچھ وقت کے لئے ادھر ادھر منتشر ہوئے اللہ رب العزت نے ان کے انتشار اور اضطراب پر پردہ ڈال دیا اور قریش مکہ کے دلوں میں رعب اتارا اور وہ اپنی جیتی بازی ہار کر مکہ کو چل دیئے پھر کہیں رستے میں ان کو خیال آیا کہ وہ واپس لوٹ کر پھر سے مسلمانوں پر حملہ کریں مگر پھر بھی ان کو ادھر لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ کس لئے ہوا؟ یہ اس لئے کہ اللہ رب العزت مومنین کی اس ہزیمت کو کچھ نہ ہونے کے درجے میں رکھنا چاہتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے پھر سے اکٹھے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کیا کہ کون ان کا (قریش مکہ کا) تعاقب کرے گا، فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہوگئی اور ان کا ایسا رعب ان پر پڑا کہ وہ پھر مدینہ کا رخ نہ کر سکے۔ ام المومنین حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

لما اصاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما اصاب یوم احد فانصرف عنہ المشرکون خاف ان یرجعوا فقال من یذھب فی اثرھم فانتدب منھم سبعون رجلاً قال فیھم ابوبکرؓ والزبیر. (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۵۸۴)

ترجمہ: ''جب آنحضرتؐ احد کے دن اس مصیبت سے دوچار ہوئے تو مشرکین آپ سے واپس چلے، حضور کو (جو وہیں میدان میں ٹھہرے ہوئے تھے) اندیشہ ہوا کہ وہ پھر سے نہ چلے آئیں، آپ نے کہا کون ان کے پیچھے جاتا ہے؟ (کہ ان کے پروگرام کا پتہ لائے) ستر صحابہؓ تیار ہوئے

ان میں حضرت ابوبکر اور حضرت زبیر بھی تھے۔''

شارح صحیح بخاری علامہ قسطلانی لکھتے ہیں کہ ان دو کے علاوہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عمار، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوحذیفہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبدالرحمن بن عوف بھی ان ستر میں سے تھے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ پھر سے اس جماعت میں آملے تھے جو قریش مکہ کا جہاد کی نیت سے تعاقب کرنے چلی، اب حضرت عثمانؓ بھی وہ فضیلت پاگئے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان مجاہدین کے لئے ذکر کی ہے۔

الذین استجابوا للّٰہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم. (پ ۴، آل عمران ۱۰۲)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے حکم مانا اللہ اور اس کے رسول کا بعد اس کے کہ پہنچ چکے تھے ان کو زخم جو ان میں نیک ہیں اور پرہیزگار، ان کو ثواب ہے بڑا۔''

آپ ﷺ ان مجاہدین کی جمعیت لے کر مقام حمراء الاسد تک پہنچے۔ ابوسفیان کے دل میں یہ سن کر کہ مسلمان اس کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں، سخت رعب طاری ہوا وہ دوبارہ حملے کا ارادہ ختم کر کے مکہ کی طرف بھاگا۔ حضورؐ عملاً اس کے تعاقب میں نہ نکلے کیونکہ مکہ کی طرف رخ کر کے مسلمانوں کو ہتھیار اٹھا کر چلنے کی اجازت نہ تھی۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں مسلمانوں کے دل میں بیت اللہ شریف کا ادب واحترام وہی تھا جو حرم کو حاصل ہے۔

(نوٹ) مسلمانوں کا یہ حمراء الاسد تک آنا جنگ احد کے تتمے کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عثمانؓ بھی موجود تھے اور آپ حضرت علیؓ کے رفیق جہاد تھے۔ اب ہم جنگ احد کی بات ختم کرتے ہیں۔ اب جنگ احزاب میں چلیے۔

جنگ احزاب میں مومنین کے زلزلہ کے سے حالات

قرآن کریم مومنین کے بارے میں بتلاتا ہے کہ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے گویا وہ سخت زلزلے میں ہلا دیئے گئے ہیں۔ معلوم نہیں ابھی کیا ہوتا ہے۔ جنگ کے موقع پر ایسی حالت ہو تو اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ضروری ٹھہرتا ہے۔

قریش مکہ جنگ احزاب میں چوبیس ہزار کے قریب لوگوں کو جمع کر لائے تھے۔ اسے جنگ احزاب اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں بہت سے مخالفین کی اجتماعی یلغار تھی۔ اور ان کا نامی گرامی مبارز عمرو بن عبدود ان کے ساتھ تھا وہ میدان میں نکلا اور اس نے حضورؐ سے مبارز طلب کیا، آپ نے صحابہؓ میں سے کسی کو سامنے آنے کا حکم نہ دیا۔ صرف ان سے پوچھا کہ اس کے مقابل کون نکلتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کو اس طرف توجہ دلائی کہ عمرو بن عبدود بڑا تجربہ کار فوجی ہے اب اس

کے مقابل کس جرنیل کو سامنے لایا جائے؟ یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مشورہ وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی اور ایسا مشورہ بڑے لوگ ہی دے سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ کوئی عمر رسیدہ اس کے مقابل لایا جائے اس موقعہ پر کسی جوان شہسوار کی ضرورت تھی حضرت خالد بن ولید اس وقت تک صف اسلام میں نہ آئے تھے۔ سید الشہداء حضرت حمزہؓ جنگ احد میں شہید ہو چکے تھے اب اس کے مقابل کون آئے اس کا اثر پورے معرکہ پر پڑے گا۔

حضورؐ نے بالآخر حضرت علیؓ کو میدان میں نکلنے کے لئے کہا وہ اس وقت ۲۸ سال کے جوان تھے آپ نے اپنے ہاتھ سے انہیں زرہ پہنائی قرآن کریم مومنین کی اس حالت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ اس وقت بہت گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے گویا وہ سخت زلزلے میں ہیں بایں ہمہ وہ مومنین ہی تھے، نہ کہ منافقین۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

هنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالاً شدیداً. (پ ۲۱، الاحزاب ۱۱)

ترجمہ: ''اس وقت مومنین ایک ابتلاء میں ڈالے گئے اور وہ نہایت سخت طور پر ہلا دیئے گئے۔''

صحابہؓ اس پریشان حالی میں آپس میں مشورہ میں تھے اور زندہ قومیں حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لیتی ہیں۔ پہلے مقابلہ میں وہ فوجی نہ چاہیے تھے جو محض شوق شہادت میں اٹھیں اور عمرو بن عبدود کے سامنے آئیں۔ پہلے مقابلہ میں اس بہادر کی ضرورت تھی جو اس کافر کا کام اسی وقت تمام کرے ورنہ ان مسلمانوں کی ہرگز کوئی کمی نہ تھی جو نہایت شوق سے موت فی سبیل اللہ کا انتظار کر رہے تھے۔

ان زلزلہ کے سے حالات پر ایک نادان کی سوچ

قرآن کریم نے صحابہ کے اس وقت کے تفکر اور تدبر کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ آپ کے سامنے آ چکا۔ اس پریشان حالی میں بھی انہیں مومن ہی کہا گیا ہے۔ منافقین نے جو باتیں کہیں وہ اس سے اگلی آیت میں ہیں۔ اب آیئے صحابہؓ کا وہ نقشہ بھی ملاحظہ کریں جو ایک ڈھگو نے کھینچا ہے۔ آپ کا دل شہادت دے گا کہ ان لوگوں کا ہرگز قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اس نے منافقین کی باتیں بھی صحابہؓ کے کھاتے میں ڈال دی ہیں، وہ لکھتا ہے:۔

ادھر اصحاب پیغمبر نے فوجوں کی یہ کثرت دیکھی تو اکثریت کی یہ حالت تھی کہ مارے خوف و ہراس کے کلیجے منہ کو آ گئے۔ سکرات موت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ خدا اور رسول پر اعتراض کرنے لگے کہ ہم سے فتح و نصرت کے جو وعدے کئے تھے وہ سب فریب اور دھوکہ تھے۔

سب سے زیادہ رعب جناب عمر بن الخطاب پر طاری تھا کیونکہ جب آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے اس خاموشی کا سبب دریافت کیا تو جناب عمرؓ یوں گویا ہوئے، یا رسول اللہ! یہ عمرو بن عبدود ہے، جو عرب

کے بہادروں میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اسے سن کر اصحاب کے اور بھی چھکے چھوٹ گئے۔

(تجلیات صداقت ص ۵۱)

اس عبارت کے ایک ایک لفظ سے صحابہؓ کے خلاف بغض ونفرت کی بو آ رہی ہے۔ مولف پہلے سے اکثریت صحابہ کے خلاف ایک عقیدہ بنائے بیٹھا ہے، اب اسے سمجھ آئے تو کیسے آئے۔ وہ پہلے سے سمجھ رہا ہے کہ اس دن مومنین میں دو گروپ تھے (۱) ایک صحابہ کرامؓ اور (۲) حضرت علیؓ۔ حالانکہ حضرت علیؓ بھی صحابہ کرامؓ کا ہی ایک فرد تھے۔ ان کی کوئی علیحدہ جماعت نہ تھی، صحابہؓ سے وہ کبھی علیحدہ نہ رہے تھے۔ مگر دیکھئے رافضی قرآن کی اس آیت کے مقابل کہ کفار پر سختی کرنے والے بھی بہت سے لوگ تھے، کس طرح اپنی بات کہتا ہے اور اشداء کو جمع نہیں مانتا، اس کے مصداق کے طور پر ایک کو ہی سامنے لاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے (دیکھئے ص ۵۱ نیچے سے دوسری سطر):

''سوائے حیدر کرار کے اور کوئی شخص شمع رسالت کا پروانہ اشداء علی الکفار کا مظہر بن کر آمادہ پیکار نہ ہوا۔''

اس ایک پر جمع کا لفظ اشداء منطبق کرنا ڈھگو کے علمی نوادرات میں سے ہے۔

ایک اور کھلی خیانت ملاحظہ کیجئے

(نوٹ) رافضی کی مذکورہ بالا پہلی عبارات میں خط کشیدہ فقرے قرآن کریم میں اس مقام پر نہیں بلکہ وہ اگلی آیت کے ہیں جو **واذ یقول المنافقون** سے شروع ہوتی ہے یہاں رافضی ان مومنین کو منافقین ثابت کرنے کے لئے اس اگلی آیت کے الفاظ کو مومنین کی آیت میں ڈال رہا ہے۔ قرآن کی تحریف معنوی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی علمی دنیا میں کبھی کسی نے دیکھی ہو۔

حضرت زید بن حارثہؓ کی جنگ خندق میں خدمات

اس جنگ میں قریش مکہ نے ایک بڑی فوج مدینہ منورہ میں بھیج دی تھی انہوں نے تین چار ہفتے تک مدینہ کا محاصرہ کئے رکھا، حضورؐ کے حکم پر وہاں کوئی صحابی گھروں کی حفاظت کے لئے مامور نہ کئے گئے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کو تین سو افراد کے ساتھ مدینہ منورہ کے مکانات، قلعوں اور گھروں کی حفاظت کے لئے روانہ کر دیا اور قریش نے بیس روز یا چوبیس روز یا ستائیس روز تک مسلمانوں کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ اس محاصرے سے تنگ آ گئے۔ اس محاصرے کے دنوں میں روزانہ رات کو حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ ایک جماعت کے ساتھ نبی کریم کے خیمہ

کی پاسبانی کرتے تھے، مشرکین آتے تھے اور حضورؐ کے خیمہ کی طرف رخ کرتے تھے، لیکن اتنی طاقت نہ پاتے تھے کہ خندق کو عبور کر سکیں۔ (مدارج النبوۃ، جلد۲، ص۲۹۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن صرف حضرت علیؓ ہی میدان میں نہ تھے، شمع رسالت کے اور کئی پروانے بھی اپنی اپنی جگہ مصروف کار تھے مگر رافضیوں کو وہ کہیں نظر نہیں آتے۔

حضرت سعد بن معاذؓ میدان جنگ میں

اس غزوۂ عظیمہ کے واقعات میں سے ایک قصہ حضرت سعد بن معاذ کے مجروح ہونے کا ہے، سیدہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ میں ان دنوں حضرت سعد بن معاذ کی والدہ کے ساتھ مدینہ کے ایک قلعہ میں تھی کہ حضرت سعد بن معاذ ایک تنگ زرہ پہنے ہوئے گزرے، ام سعد نے کہا اے میرے بیٹے! جلدی جاؤ اور رسول اللہ کے حضور پہنچو۔ حضور ﷺ کے خیمہ کے برابر کفار نے جنگ شروع کر رکھی تھی۔ حضرت سعد خندق کے کنارے پہنچے تو حیان بن العرق نے ان کو للکارا اور ایک تیر پھینکا، وہ تیر حضرت سعد نے اکحل رگ پر کھایا (دیکھئے مدارج النبوۃ ۲ ص ۲۹۷)

سو رافضی کی یہ بات درست نہیں کہ اشداء علی الکفار کا مصداق صرف حضرت علیؓ تھے، حقیقت یہ ہے کہ اور کئی صحابہؓ نے بھی غزوہ احزاب میں بڑی بڑی خدمات سرانجام دیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بڑے لوگوں میں سے تھے جنہیں حضورؐ مشورے کے لئے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت خباب المنذر نے حضورؐ سے گزارش کی تھی کہ یہود کے کھجوروں کے باغ کاٹ دیئے جائیں تو یہ ان کے لئے اور حسرت کا سامان ہوگا، وہ جلد ہتھیار ڈال دیں گے۔ کچھ صحابہؓ اس کام میں لگ گئے اور چار سو کے قریب درخت کاٹ ڈالے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی وقت حضورؐ سے کہا، حق تعالیٰ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ اب کھجور کے درختوں کو ہم کیوں کاٹیں۔ اب کاٹنے سے لوگوں کو روک دیا جائے۔ حضورؐ نے ابوبکرؓ کی رائے مان لی۔ قرآن کریم نے اس کاٹنے سے رکنے کو بھی اذنِ الٰہی کہا۔

ما قطعتم من لينة او تركتموها قائمة على اصولها فباذن الله وليخزى الفاسقين.

(پ ۲۸، الحشر ۵)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کی آسمانی تصویب تھی۔

اس سے پتہ چلا کہ جنگوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر بیشتر حضورؐ کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے تا کہ اہم امور میں اور ہر وقت کئے جانے والے فیصلوں میں وہ حضورؐ سے بروقت گزارش کر سکیں۔ بڑے لوگوں کا سالار

اس سے پتہ چلا کہ جنگوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر بیشتر حضورؐ کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے تا کہ اہم امور میں اور ہر وقت کئے جانے والے فیصلوں میں وہ حضورؐ سے بروقت گزارش کر سکیں۔ بڑے لوگوں کا سالار
اعظم کے ساتھ رہنا ملکوں کی بڑی فوجی ضرورت سمجھی جاتی ہے مگر افسوس کہ رافضی کی آنکھیں اسی تلاش میں ہیں کہ وہ تمام فوجیوں کی طرح لڑتے کیوں کہیں نظر نہیں آ رہے، اگر وہ (معاذ اللہ) کہیں پیچھے رہنے والوں میں ہوتے تو حضورؐ کے بعد صحابہؓ کی اکثریت ہرگز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ نہ ہوتی، نہ حضرت عثمانؓ کو انتخاب خلافت میں حضرت علیؓ پر ترجیح دی جاتی۔ رافضی اکثر صحابہؓ کو منافقوں میں شمار کرتے رہے، رافضی کی یہ غلط بیانی بھی دیکھئے:۔

> اصحاب پیغمبر نے جن کی تعداد کم و بیش تین ہزار تھی (مشرک) فوجوں کی یہ کثرت دیکھی تو اکثریت کی یہ حالت تھی کہ مارے خوف و ہراس کے کلیجے منہ کو آ گئے ...... سوائے حیدر کرار کے اور کوئی شمع رسالت کا پروانہ آمادہ پیکار نہ ہوا۔ (ص۵۱)

رافضی نے منافقین کے حالات کی آیت مومنین کے ذکر میں اس لئے درج کی ہے کہ کسی طرح ان مومنین پر (خلفاء ثلثہ پر) منافقین کا لیبل لگایا جا سکے۔ مومنین کس طرح حالات کے زلزلہ میں آ گئے تھے۔ یہ آپ مطالعہ کر آئے ہیں اب اس سے اگلی آیت، جس میں منافقوں کی حالت کا بیان ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

آیت مومنین کے مقابل منافقین کے کھل جانے کی آیت

منافقین نے جب کفر کا یہ جملہ کہا کہ ہم سے اللہ اور رسول نے دھوکہ کیا ہے تو وہ اپنے نفاق میں کھل گئے اور اب کھلے کافروں میں آ ملے۔ اب وہ منافق نہ رہے، کھلے کافر ہو گئے اور جو بہانے بنا رہے تھے کہ ہمارے گھر خالی ہیں انہیں بھی اب صرف بہانہ سازی نہ کہا جائے گا اسے بھی منافقوں کا اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقابل آنا قرار دیا جائے گا۔ قرآن کریم نے ان کو واذ قالت طائفة منهم کہہ کر انہی میں شمار کیا ہے۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے انہیں منافقوں میں شمار فرمایا تو ان کا بہانہ صرف ان کی کمزوری نہ سمجھی جائے گی وہ اپنے نفاق میں کھل کر کافروں سے آ ملے تھے۔ قرآن کہتا ہے۔

واذ يقول المنافقون والذين فى قلوبهم مرض ماوعدنا الله ورسوله الا غروراً o
واذ قالت طائفة منهم يا اهل يثرب لا مقام لكم فارجعوا.

(پ۲۱، الاحزاب ۱۲)

ترجمہ: ''اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دل مریض تھے کہنے لگے ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے محض دھوکے سے وعدہ کیا اور انہی میں سے ایک گروہ کہنے لگا اے اہل یثرب تمہارے لئے کوئی ٹھہرنے کا مقام نہیں تم سب واپس ہو جاؤ''۔

اہل سنت جنہیں صحابہ کرامؓ مانتے ہیں، ان سب کے پیشوا حضرات خلفاء ثلثہ ہیں ان میں سے کسی کے منہ سے کوئی کلمہ کفر نکلا ہو یا ان میں سے کسی نے لوگوں کو واپس مدینہ لوٹنے کا کہا ہو تو چاہئے تھا کہ رافضی اس پر کوئی حوالہ پیش کرتا مگر افسوس کہ اپنے بغض باطنی سے اس نے منافقین کے بیان کی آیت دھکا زوری سے مومنین پر منطبق کر دی ہے۔

جنگ حنین میں مومنین کی ایک اور آزمائش

فتح مکہ کے بعد مومنین ایک دفعہ پھر آزمائش میں آئے یہ آزمائش جنگ حنین کی صورت میں آئی۔ قرآن کریم میں یا ایھا الذین امنوا سے اہل ایمان کو خطاب ہوتا ہے۔ اس کے دو آیت بعد پھر انہی اہل ایمان کو کہا گیا:

لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرة ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرینo ثم انزل اللہ سکینته علیٰ رسوله وعلیٰ المومنین وانزل جنوداً لم تروھا وعذب الذین کفروا وذلک جزاء الکافرین ثم یتوب اللہ من بعد ذلک علیٰ من یشاء واللہ غفور رحیم. (پ ۱۰، التوبہ ۲۵.۲۶)

ترجمہ: ”مدد کر چکا اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن جب اچھی لگی تمہیں تمہاری کثرت۔ پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے۔ اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ پھیر کر۔ پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور مومنین پر اور اتاریں فوجیں کہ تم جن کو دیکھ نہ پائے اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے منکروں کی۔ پھر اللہ نصیب کرے گا اس کے بعد توبہ جسے چاہے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔“

یہ کن کو کہا گیا کہ اس دن تمہیں اپنی کثرت اچھی لگی اور وہ تمہارے کسی کام نہ آسکی؟ مومنین کو۔ پہلی دو آیتوں سے روئے سخن انہی کی طرف ہے۔ پھر یہ کن کو کہا گیا کہ زمین تم پر اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی تھی؟ مومنین کو ہی۔ پھر یہ کن کو کہا گیا کہ ہٹ گئے تم پیٹھ پھیر کر؟ انہی مومنین کو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین کن پر اتاری؟ انہی مومنین پر۔ اور اپنی طرف سے فرشتے اتارے کن کو حوصلہ دینے کے لئے؟ ان مومنین کو ہی۔ اور اس دن عذاب پھر کن کا نصیب ٹھہرا؟ ان کافروں کا جو تیراندازی میں سارے عرب میں شہرت رکھتے تھے اور وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پھر ہوازن کو اس کے بعد توبہ نصیب ہوئی اور اکثر مسلمان ہو گئے۔

اس آیت میں ثم ولیتم مدبرین (پھر تم ہٹ گئے پیٹھ پھیر کر) ان ایمان والوں کو ہی کہا گیا ہے۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں سکینہ اتارا اور کافر انہی کو کہا گیا ہے جن پر اس آسمانی مدد سے عذاب اترا اور ظاہر ہے کہ یہ

قبائل ہوازن تھے جو قریش مکہ کے بعد اب نئے ولولہ کفر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔

یہاں ہم قارئین کی توجہ آیت کے ان الفاظ ثم ولیتم مدبرین پر مبذول کرا رہے ہیں۔ رافضی ان الفاظ کا یہ ترجمہ کرنے میں بہت لذت محسوس کر رہا ہے کہ پھر تم بھاگ گئے؟

مومنین کا یہ اپنے مقام سے ہٹنا اور پیٹھ پھیرنا کن ہنگامی حالات میں ہوا اسے تفسیروں میں دیکھئے:

صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی وہ بہت سامال چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے اس وقت ہوازن کے تیراندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا آن واحد میں چاروں طرف سے اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہو گیا اول طلقاء میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے (تفسیر عثمانی)

رافضی اس پس منظر پر اپنی بھاگ گئے بھاگ گئے کی گردان پوری کر رہا ہے اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ قوموں کو کبھی ایسے ہنگامی حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ حنین کے دن ان حالات میں اللہ نے تمہاری مدد کی اور آسمان سے تم پر اپنی نصرت اتاری۔ پھر کیا ہوا کفار کنکریوں کے اثر سے اپنی آنکھیں ملتے رہے۔ جو مسلمان قریب تھے انہوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا آنا فانا مطلع صاف ہو گیا اور بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا لڑائی ختم ہو چکی ہے اور ہزاروں قیدی آپ کے سامنے بندھے کھڑے تھے۔ یہ کافروں کو دنیا میں ہی سزا مل گئی۔

اس سے یہ امور واضح ہوئے کہ ہنگامی حالات میں اپنی جگہ سے اس طرح ہٹنے سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔ مومنین ایسے کمزور حالات میں بھی مومنین ہی رہے اور اللہ رب العزت نے ان پر اپنا سکینہ اتارا۔ یہ اتنی بڑی آزمائش تھی کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغہ میں تھے۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:۔

حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغے میں تھے۔ ابوبکرؓ و عمر، عباس و علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم تقریباً سو یا اسی صحابہ میدان جنگ میں باقی رہ گئے۔ جو پہاڑ سے زیادہ مستقیم نظر آتے تھے۔ یہ خاص موقعہ تھا جب کہ دنیا نے پیغمبرانہ صداقت، توکل اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہر آنکھوں سے دیکھا۔ آپؐ سفید خچر پر سوار ہیں۔ عباسؓ ایک رکاب اور ابوسفیان بن حارث دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ چار ہزار کا مسلح لشکر جوش انتقام میں ٹوٹا پڑتا ہے۔ ہر چہار طرف سے تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ ساتھی منتشر ہو چکے ہیں۔ مگر رفیق اعلیٰ آپؐ کے ساتھ ہے، ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپؐ پر اور آپؐ کے گنے

چنے رفیقوں پر ہو رہی ہے جس کا اثر بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے جدھر سے ہوازن اور ثقیف کا سیلاب بڑھ رہا ہے۔

خوارج کا عقیدہ کہ گناہ کبیرہ سے مومن ایمان سے نکل جاتا ہے

دوسرے یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر ان صحابہ میں جو جنگ حنین میں اس آزمائش کی گھڑی میں حضورؐ کے ساتھ پوری استقامت سے کھڑے رہے، حضرت عثمانؓ کا نام نہیں ملتا کہ وہ حضورؐ کی رکاب تھامے کیوں نہ سامنے آئے۔ تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ آپ کہیں ادھر ادھر ہو گئے تھے غلط ہے۔ ہنگامی حالات میں ہر وفادار اپنی صوابدید سے وفا کے آداب بجالاتا ہے۔ بعض اکابر کا نام اس فہرست میں نہ ملنے سے آپ کی وہاں موجودگی کی نفی نہیں ہوتی۔ حضرت طلحہ و زبیرؓ کے نام بھی اگر یہاں نہیں ملتے تو ان کے بارے میں بھی کوئی بدگمانی نہ کی جائے۔ ان بعض الظن اثم۔ حضرت طلحہ جنگ احد میں اپنی جاں نثاری میں وہ مقام پاگئے کہ خود حضورؐ نے فرمایا کہ وہ لمن قضیٰ نحبه کا مقام پاگئے۔

غزوہ تبوک میں بھی یہی اصول قائم بتلایا گیا

اب سن آٹھ ہجری (جنگ حنین) سے سن نو ہجری (جنگ تبوک) میں چلیں اس جنگ میں تین حضرات کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع باوجود اپنے عزم و ایمان کے محض اپنی غفلت اور لاپرواہی کے باعث غزوہ تبوک میں شرکت سے پیچھے رہ گئے۔ قرآن کریم نے انہیں دائرہ ایمان سے خارج قرار دیا نہ آنحضرتؐ نے انہیں منافقوں میں سے سمجھا اور نہ اس تخلف کو ان کے نفی ایمان کی دلیل بنایا جس طرح جنگ حنین کے مدبرین کے بارے میں کہا تھا کہ زمین ان پر اپنی پوری وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی، تبوک میں پیچھے رہنے والوں کے لئے بھی زمین اسی طرح تنگ بتلائی گئی۔

ضاقت عليكم الارض بما رحبت ثم وليتم مدبرين ثم انزل الله سكينته على رسوله وعلى المؤمنين. (التوبه ۲۵)

ترجمہ: ''اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے پر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور مومنین پر۔''

حنین میں یہ سامنے آ کر پیچھے ہٹے وہاں انہیں صیغہ خطاب سے ذکر کیا اور تبوک میں یہ پیچھے رہے اس لئے انہیں صیغہ غائب سے ذکر کیا۔ ہم یہاں صرف کعب بن مالک کا بیان ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں اس سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی کہ جنگ سے کسی پیچھے رہنے والے پر منافقت کا لیبل لگانا ہرگز کوئی عقل کی بات نہیں، نہ اس سے کسی کے ایمان کی نفی ہوتی ہے جب حضورؐ تبوک سے واپس لوٹے تو کعب بن مالک آپ کے سامنے حاضر ہوئے اور یہ بیان دیا:۔

یارسول اللہ! اگر میں اس وقت دنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح

زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات عالی سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کرلوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا۔ برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لئے آپ کی خفگی برداشت کرنا پڑے گی لیکن امید رکھتا ہوں کہ خدا کی ذات کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا۔ آخرکار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصہ سے نجات دلائے گا۔ یارسول اللہ! واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں جس وقت حضورؐ کی ہم رکابی کے شرف سے محروم ہوا اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوتی تھی۔ میں مجرم ہوں آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں۔

اس کے اس بیان پر آپؐ نے فرمایا: یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی، اچھا جاؤ اور خدائی فیصلے کا انتظار کرو

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع، یہ دو شخص بھی میرے ہی جیسے ہیں۔ ہم تینوں کے متعلق آپؐ نے یہ حکم دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے۔ سب علیحدہ رہیں۔ چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو خانہ نشین ہو گئے شب و روز گھر میں وقف گریہ و بکاء رہے۔ میں سخت اور قوی تھا۔ مسجد میں نماز کے لئے حاضر ہوتا۔ حضورؐ کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ جب میں حضورؐ کی طرف دیکھتا تو آپؐ میری طرف سے منہ پھیر لیتے۔ مخصوص اقارب اور محبوب ترین اعزہ بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے تھے......... غرض پچاس دن اسی حالت میں گزرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکایک جبل سلع سے آواز آئی۔

سمعت صوت صارخ او فى علىٰ جبل سلع يقول باعلى صوته.

یا کعب بن مالک ابشر، اے کعب بن مالک تجھے بشارت ہو۔

فخررت ساجداً وعرفت ان جاء فرج واذن رسول الله للناس بتوبة الله علينا حين صلوٰة الفجر. (البدايه والنهايه جلد۵، ص ۲۵)

میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ اخیر شب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ قبول ہے۔ آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو مطلع فرمایا۔

ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے مگر دوسرا شخص پہاڑ پر سے للکارا۔ اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی اور میں نے اپنے بدن کے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیئے پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا لوگ جوق در جوق آئے اور مجھے مبارکباد دیتے تھے مہاجرین میں سے

حضرت طلحہؓ نے کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔
آپؐ نے فرمایا، خدا نے تیری توبہ قبول کر لی۔ (تفسیر عثمانی ص ۲۷۳)

اس واقعہ سے پتہ چلا کہ (۱) گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی' خوارج کا عقیدہ غلط ہے۔ (۲) گناہ سے توبہ مومنین کے لئے ہے' کافروں کے لیے نہیں۔ (۳) ایمان چھوڑنے والے کو گناہ سے نہیں کفر سے توبہ کرنی پڑتی ہے

غزوہ تبوک یہ آخری غزوہ ہے اس میں بھی یہی اصول کارفرما بتلایا گیا ہے کہ جنگ میں تخلف سے یا میدان جنگ میں پیچھے رہ کر پھر آ ملنے سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔ اپنے ایمان کی نفی کے بغیر کوئی اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

رافضی کی پوری جدوجہد اس پر ہے کہ کسی صحابی کے کسی جنگ میں پیچھے رہ جانے سے اس کے ایمان کی نفی کا اعلان کرتا جائے۔ اس نے اپنے اس موقف کو آنچ دینے کے لئے بہت سے صحابہ کرام کو بہت سی جنگوں سے پیچھے رہنے والے کہا ہے اور اس کے لئے اس نے دل کھول کر جھوٹ بولے ہیں۔ اگر ان فرضی داستانوں کو قبول بھی کیا جائے تو اس سے ان میں سے کسی سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔ اور اس ڈھ گو رافضی کا یہ طلسماتی محل دھڑام سے نیچے آ گرتا ہے۔

رافضی نے اپنے اس غلط موقف پر اکابر صحابہؓ کے میدان جنگ سے بھاگنے کے کئی جھوٹے نقشے کھینچے ہیں اولاً یہ اس کی بغض باطنی سے بھری ہوئی جھوٹی کاروائیاں ہیں۔ ثانیاً اس نے شکست کھانے کو بھی ہمیشہ بھاگنے کا نام دیا ہے اور واپس لوٹنے کے باوجود وہ انہیں بھاگنے والے کہنے میں ہی بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔

از کوزہ ہماں تراود کہ در وست

باب ششم

جنگ احد کی آڑ میں صحابہؓ سے شرمناک بغض

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ.

عربی میں ھزم شکست دینے کو کہتے ہیں" ھزم العدوّ" اس نے دشمن کو شکست دی۔ یہ لفظ باب انفعال میں آئے تو اس کے معنی شکست کھانے کے ہیں، کہتے ہیں انہزم الجیش، لشکر شکست کھا گیا۔ کہتے ہیں، انہزم العصا، لاٹھی ٹوٹ گئی۔ ھزیمت شکست کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ہزائم ہے اس کے معنی بھاگنے کے نہیں ہیں، شکست کے ہیں۔

نہ یہ کسی کمزوری کا اظہار تھا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کی اتفاقی شکست بغاوت کے پیرائے میں نہ تھی' کبھی کسی لشکر کو شکست میدان میں رہتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔ جب کوئی فوج مقابلہ نہ کر پائے اور ہتھیار ڈال دے تو یہ کھڑے کھڑے شکست ہو گئی۔ اس کا معنی بھاگنے کا نہیں ہوتا، نہ شکست کی صورت میں بھاگنا ضروری ہوتا ہے۔

اس ڈھ گو رافضی نے بھی تجلیات صداقت میں کئی مقامات پر اس کا معنی شکست کیا ہے۔ لیکن صحابہ کے لئے وہ اس کا معنی بیشتر بھاگنے کا کرتا ہے۔ اسے بھاگنے میں جو مزہ آتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ کسی صحابیؓ پر جرح کرنی ہو تو اس کا شوق تحریف ابھرتا ہے اور وہ اس کا معنی بھاگنے کا کر کے رافضیت کے عجیب چٹخارے لیتا ہے۔ از کوزہ ہماں تراود کہ در وست۔

جنگ احد میں خالد بن ولید کے عقبی حملے سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی تھی۔ یہ شکست پورے لشکر کی شکست تھی۔ مسلمان آگے اور پیچھے دونوں طرف سے کفار کی زد میں آ گئے تھے۔ اب انہوں نے بھاگ کر پہاڑ کے پاس پناہ لی اور وہاں مسلمانوں نے پھر سے اپنی قوت بحال کر لی اور اپنی جمعیت بنا لی۔ خود حضورؐ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کرتے اور وہیں کفار کے گھیرے میں مرتے تو یہ جہاد نہ رہتا، خودکشی کا ایک منظر بنتا۔ مسلمانوں نے راہ کھو کر بھی راہ پا لی اور پھر سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ اب جو شخص یہ کہے گا کہ حضور اکرمؐ مارے گئے ہیں، میں اسے قتل کر دوں گا۔ شیر ژیاں گرج رہا تھا اور کافر تھرا رہے تھے۔ حضرت علیؓ بھی اس اعلان کی حمایت میں تھے۔ آپ سے اس کا انکار کسی کمزور روایت سے بھی ثابت نہیں۔ حضرت عمرؓ اپنے دوران خلافت کبھی احد کی شکست کا ذکر فرماتے تو بیشتر ہزیمت کے لفظ سے کرتے۔ اس میں اگر آپ کی اپنی کوئی کمزوری ہوتی تو آپ اسے کبھی اس طرح بیان نہ

کرتے۔ کوئی اپنا عیب برسر عام نہیں کھولتا۔ رافضی ایک جگہ آپ کے ایک خطبہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

لما کان یوم احد هزمنا ففررت حتی صعدت الجبل.

(تجلیات صداقت ص ۴۸)

ترجمہ: ''جب بروز احد ہمیں شکست ہوئی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔''

یہاں اس نے ھزمنا کا ترجمہ درست کیا ہے کہ ''جب ہمیں شکست ہوئی'' سو اس کا معنی بھاگنا نہیں ہے ورنہ آگے لفظ ففررت کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا اور یہ بھاگنا میدان جنگ سے بھاگنا نہیں، مجاہدین کو ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جمع کرنے کے لئے ہے اور قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ پہاڑ پر نہ جاتے، جنگل کی طرف رخ کرتے۔ غزوہ حنین میں جب مشرکین پسپا ہوئے تو فروہ بن نعامہ جذامی نے کہا تھا، انهزموا ورب الکعبہ، بخدا وہ شکست کھا گئے۔ کسی نے نہ کہا وہ بھاگ گئے۔ (صحیح مسلم جلد ۲، ص ۱۰۰)

حضرت براء سے پوچھا گیا' یا ابا عمارہ افررتم یوم حنین؟ جواباً فرمایا، لا واللہ، حضرت براء نے قسم کھا کر کہا کہ یہ بھاگنا نہیں تھا (ایضا)

ہم نے ھزیمت کے معنی شکست بتلانے پر رافضی کی اپنی شہادت بھی پیش کر دی ہے۔ اب اس کے شوق تحریف کے بھی چند علمی نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ وہ کس دلیری سے انھزام کا معنی بھاگنا کر رہا ہے اور معنی بدلنے میں اسے کوئی علمی حجاب محسوس نہیں ہو رہا۔

۱. ومن المنهزمین عمر الا انه لم یکن فی اوائل المنهزمین. (ص ۴۸، سطر ۱۹)

ترجمہ از رافضی: ''احد کے دن منجملہ بھاگنے والوں میں ایک عمرؓ بھی تھے۔ مگر وہ پہلے بھاگنے والوں میں سے نہیں تھے۔''

ھزیمت کا معنی شکست کا ہے، بھاگنے کا نہیں۔ یہ ترجمہ رافضی نے کیوں کیا؟ صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے۔ شکست کے موقعہ پر فوجیوں کا ادھر ادھر ہونا نئی پوزیشن کے لئے ہوتا ہے۔ بھاگنے کے لئے نہیں ہوتا۔

۲. ومنهم عثمان انهزم مع رجلین من الانصار. (تجلیات ص ۴۹)

ترجمہ از رافضی: ''منجملہ احد کے بھگوڑوں کے ایک عثمانؓ بھی تھے جو سعد و عقبہ نامی دو انصاری مردوں کے ساتھ بھاگے تھے۔''

رافضی کی گندی زبان کس درجہ بدبودار ہے، یہ آپ دیکھ چکے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ آپ انصار کے دو مردوں کے

ساتھ پیچھے ہٹے تھے پورے لشکر کی شکست پر پیچھے ہٹنا جنگ سے بھاگنا نہیں خصوصاً جب کہ سپہ سالار کے بارے میں یہ بات چل جائے کہ وہ مارے جا چکے ہیں۔

۳. ان الشیخین انهزما یوم احد. (ایضاً ص ۴۹)

ترجمہ از رافضی: ''احد کے دن شیخین بھاگ نکلے اور عمرؓ آنسو پونچھتے ہوئے واپس آئے اور حضرت علیؓ سے معافی مانگنے لگے۔'' (استغفر اللہ)

ھزیمت کا معنی بھاگنے کا کرنے میں رافضی نے پھر اپنا شوق تحریف پورا کیا ہے۔ اور مسند امام احمد کا حوالہ دینے میں بھی اس نے بڑی جرأت سے جھوٹ بولا ہے اور اس میں اس نے کچھ حیا محسوس نہیں کی کہ یہ وہاں نہیں ہے۔ پھر حضرت علیؓ سے معافی مانگنا کس جہت سے تھا۔ وہ اس جھوٹ پر بھی کوئی بات پیش نہیں کر پایا۔

۴۔ ابوقتادہؓ (صحابی) سے مروی ہے، احد کے دن مسلمان بھاگے اور میں بھی بھاگا تو میں نے اس جماعت میں جناب عمرؓ کو بھی چند لوگوں کے ساتھ دیکھا، میں نے ان سے کہا، لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہا خدا کی مرضی۔ (ایضاً ص ۵۵)

نوٹ: ابوقتادہؓ کی یہ بات سرے سے یوم احد کی نہیں۔ یہاں بھی رافضی جھوٹ بول رہا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ اس دن ایک آدھ بھاگنے والا نہ تھا۔ پوری قوم شکست کھا چکی تھی اور حضرت عمرؓ ان کو حوصلہ دے رہے تھے، بھاگ نہیں رہے تھے۔

اس رافضی سے اور سنئے:۔

۵۔ یہ حضرات جنگ خیبر، جنگ خندق اور حنین میں برابر میدان جنگ سے بھاگتے رہے (ایضاً ص ۵۶، سطر ۵)

جنگ خیبر میں یا جنگ خندق میں مسلمان شکست سے دوچار نہیں ہوئے احد اور حنین میں بیشک کچھ وقت کے لئے انہیں شکستیں ہوئیں۔ لیکن بھاگنے کی کوئی صورت ہرگز واقع نہیں ہوئی جو بھی گیا پھر واپس آ گیا۔ ہمیں اس وقت جنگ کی صورت حال سے بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ دیکھو رافضی کس طرح صحابہؓ کے بارے میں بھاگتے رہے کہہ کر اپنے بغض باطنی کا اظہار کر رہا ہے۔ اور جہاں ذرا بھی موقع ملے وہ اپنی اسی گردان پر آ جاتا ہے۔

رافضی کی طرف سے ایک عذر جو لائق قبول نہیں

رافضی کے بعض حامی کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے بھی ان کے بھاگنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر ان کے بھاگنے کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں اس وقت گفتگو بھاگنے میں نہیں ہو رہی، انھزام کے معنی میں ہو رہی ہے، اس لفظ کا معنی بھاگنے کا ہرگز نہیں۔ قرآن پاک میں یہاں لفظ مدبرین ہے، جس کے معنی پیٹھ دے کر ہٹنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ جگہ سے

ہٹنے کو بھاگنا نہیں کہتے، رافضی یونہی بھاگنے کا لفظ دہرا دہرا کر زبان کے چٹخارے لے رہا ہے۔

اگر رافضی کو صحابہ کے جنگ حنین سے بھاگنے پر اصرار ہے تو وہ اس بات سے ہرگز انکار نہ کر سکے گا کہ جنگ حنین میں حضور ﷺ پر بھی ایک ایسا وقت آیا تھا کہ آپؐ اکیلے رہ گئے تھے، ساتھ کوئی نہ تھا۔ اب وہ بھاگنے والے صحابہ میں سے کس کس کو مستثنیٰ کرے گا؟ دیکھئے وہ حضرت علیؓ کو مستثنیٰ کرنے کی کیا راہ نکالتا ہے۔

اس روایت کی روشنی میں وہ تلاش کرے کہ حضرت علیؓ اس وقت کہاں تھے؟ حضرت انسؓ کہتے ہیں:۔

فادبروا عنه حتى بقى وحده. (صحيح بخارى جلد ٢ ص ٦٢١)

ترجمہ: ''سب لوگ حضور کے پاس سے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ اکیلے رہ گئے۔''

یہاں ادبروا کا لفظ وہی ہے جو قرآن کریم میں مدبرین کی صورت میں آیا ہے۔ جنگ احد میں حضورؐ پر بھی ایک ایسا وقت آیا تھا کہ آپ کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔ (دیکھئے صحیح بخاری جلد۲ ص)

رافضی اگر یہ کہے کہ صحیح بخاری کے جنگ احد کے اور جنگ حنین کے یہ دونوں حوالے اسے قبول نہیں تو آپ اس سے کہیں کہ پھر وہ اپنی کتابوں سے ہی کہیں ان کی تردید دکھا دے۔ امام بخاری، علامہ کلینی سے تقریباً پون صدی پہلے کے ہیں اور امام مسلم ابن بابویہ قمی سے سوا صدی پہلے کے ہیں۔ پہلے مولفین وہ بیان کریں اور یہ پچھلے تردید نہ کریں، یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ یہ خود ان دو موقعوں کو اسی طرح تسلیم کئے ہوئے تھے ورنہ وہ اس کی تردید کر دیتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جنگ کے حالات کچھ اس قسم کے ہوئے ہیں کہ وہاں کسی کا قیام کسی ایک جگہ نہیں ہوتا، سوائے ان کے جو خاص مورچوں پر بٹھائے گئے ہوتے ہیں۔ میدان جنگ میں کئی فوجی دستے حسب تقاضا اپنے مقامات بدلتے ہیں۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹنا بھی کہا جا سکتا ہے اور جگہ بدلنا بھی کہا جا سکتا ہے۔ رہا جنگ سے فرار تو اس کی حقیقت اور ہے بھاگنے والا صرف اسے سمجھا جائے گا جو پھر لوٹ کر نہ آئے، جب تک لشکر اسلام میدان جنگ سے واپس نہ ہو، اس وقت تک کوئی بھی لشکر میں واپس آنے والا بھاگا ہوا شمار نہیں ہوتا، اسے فرار نہیں سمجھا جاتا۔ صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اللہ کی رحمت وسیع ہے اور رحمۃ للعالمین کا یہ درجہ رحمت کہ احد کے دن حضرت عثمانؓ کے دور تک نکل جانے کے باوجود واپسی پر آپ نے ان سے کچھ ناراضگی نہ فرمائی اور جس نے بھی اس ضمن میں حضرت عثمانؓ کی کچھ تنقیص کی وہ آپ کا کتنا قریبی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ نے اسے سختی سے روک دیا۔

اب رافضی کا ایک غلط مفروضہ ملاحظہ ہو جس کی قرآن تکذیب کرتا ہے۔

رافضی لکھتا ہے:

''صادق الایمان وہی ہوگا جو میدان جنگ میں جائے تو یا فتحیاب ہو کر واپس آئے یا پھر شہید ہو جائے۔'' (ایضاً ص ۵۴، سطر ۱۷)

قرآن کریم مرکز میں آ کر پھر سے قوت پیدا کرنے کے لئے پیچھے ہٹنے کی اجازت دیتا ہے اور دشمن کو گھیرے میں لینے کے لئے بھی جو پیچھے لوٹے اسے بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔

یاایها الذین امنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفاً فلا تولوهم الادبار ومن یولهم یومئذٍ دبره الا متحرفا لقتال او متحیزاً الیٰ فئة فقد باء بغضب من الله وماواه جهنم وبئس المصیر. (پ ۹، الانفال ۱۶.۱۵)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب بھڑ و تم کافروں سے میدان جنگ میں تو ان سے پیٹھ مت پھیرو، اور جو کوئی ان سے اس دن پیٹھ پھیرے مگر یہ کہ لڑائی کا ایک ہنر پیش نظر ہو یا جا ملتا ہو اپنے دوسرے ساتھیوں سے۔ تو بے شک وہ آیا اللہ کے غضب میں اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔''

رافضی نے اس آیت کو نقل کرتے ہوئے وہ الفاظ جن میں ان دو صورتوں میں واپس لوٹنے کی اجازت دی گئی ہے اس آیت سے انہیں حذف کر دیا ہے۔ یہی اس کا ایمان بالقرآن ہے۔

ہمارے خط کشیدہ الفاظ کو تجلیات صداقت کے ص ۵۴ میں ڈھونڈیئے، یہ آپ کو یہاں نہ ملیں گے۔ اس کے بعد رافضی کا اپنا مذکورہ غلط مفروضہ، بطور تتمہ لکھنا ستم بالائے ستم ہے۔ (دیکھئے تجلیات صداقت ۵۴)

حضورؐ کے اکیلا رہ جانے پر آپ کے پاس سب سے پہلے کون پہنچا

جنگ احد یا جنگ حنین کے ہنگامی حالات میں اگر حضور اکرم ﷺ کہیں اتفاقاً اکیلے رہ گئے تو اس طرف ذہن نہ جائے کہ فوج نے آپؐ سے وفا نہ کی، اس بدگمانی سے بچئے اور موقع پر دیکھئے کہ کون اس وقت حضور ﷺ کے پاس سب سے پہلے پہنچا اور پھر یہ کہ فوج کے اس بکھر جانے کو قائد افواج نے کیا بے وفائی میں شمار کیا یا سمجھا کہ جنگوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ا۔ احد کے موقع پر جب حضورؐ اکیلے رہ گئے اتفاقاً سب لوگ وہاں سے ہٹ گئے تھے تو اس وقت سب سے زیادہ ہوشمند حضرت ابوبکرؓ نکلے کہ سب سے پہلے حضور ﷺ کے پاس آپؓ آئے، آپؓ خود بیان کرتے ہیں:

قال ابوبکرؓ لما صرف الناس یوم احد عن رسول اللہؐ فکنت اول من جاء النبیؐ.

(صحيح بخارى ج ٢ ص ٦٢١)

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرؓ نے کہا جب سب لوگ احد کے دن حضورؐ سے ہٹے تو میں پہلا شخص تھا جو حضورؐ کے پاس واپس حاضر ہو گیا تھا۔''

جب احد کے دن تمام لوگ رسول خدا کو چھوڑ گئے تھے تو کون سب سے پہلے رسول ﷺ کے پاس واپس آیا۔

رافضی سمجھتا ہے کہ حضرت علیؓ آئے تھے مگر تاریخ یہ نہیں بتلاتی۔ سب سے پہلے آپ کے پاس حضرت ابوبکرؓ آئے تھے۔

حضورؐ کے اکیلا رہ جانے سے حضورؐ کو چھوڑنا ہرگز مراد نہیں

جنگ حنین میں حضورؐ کے اکیلا رہ جانے کی روایت (فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ)۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے اب حضرت انسؓ سے ہی اس کی وضاحت سنیں۔ آپ فرماتے ہیں جب حضورؐ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے کن الفاظ میں حضورؐ کو کہا کہ آپؐ اکیلے نہیں ہیں، ان الفاظ کو صحیح بخاری میں دیکھیں:

عن انس بن مالک قال کان یوم حنین اقبلت هوازن وغطفان وغیرهم بنعمهم وذراریهم ومع النبی ﷺ عشرة آلاف من الطلقاء فادبروا عنه حتی بقی وحده فنادی یومئذ ندائین لم یخلط بینهما التفت عن یمینه فقال یا معشر الانصار قالوا لبیک یا رسول الله ابشر نحن معک ثم التفت عن یساره فقال یا معشر الانصار قالوا لبیک یارسول الله ابشر نحن معک.

(صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۲۱)

ترجمہ: ''حنین کے دن ہوازن اور غطفان اور دوسرے لوگ اپنے پورے ساز و سامان اور لشکروں سے نکلے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر تھا اور مکہ کے دن رہائی پائے ہوئے کئی لوگ بھی تھے۔ یہ سب حضورؐ سے پیچھے رہ گئے یہاں تک کہ حضورؐ اکیلے رہ گئے آپؐ نے اس دن دو آوازیں دیں، انہیں آپس میں خلط ملط ہونے نہ دیا، داہنی طرف رخ کر کے کہا، اے معشر انصار؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہم حاضر ہیں۔ بشارت ہو ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ پھر آپؐ نے بائیں طرف رخ کیا اور کہا اے معشر انصار؟ انہوں نے بھی کہا ہم حاضر ہیں۔ ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔''

اس سے پتہ چلا کہ جنگ کی حالت میں جگہ کے فاصلے تھوڑی سی نقل و حرکت سے بھی بدل جاتے ہیں کہیں حضورؐ سے کسی فوجی دستے کا کوئی فاصلہ قائم ہوا تو رافضی پکار اٹھے۔ صحابہؓ بھاگ گئے، بھاگ گئے اور یہ نہ سوچا کہ بھاگنے والا تو پھر واپس نہیں آتا یہ کون لوگ ہیں جن کا رابطہ حضورؐ سے پھر سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ پھر آپؐ کے دامن رحمت میں چلے آئے ہیں اور حضورؐ ان سے کسی سختی اور ناراضگی کا اظہار نہیں فرماتے۔ سراپا رحمت رہتے ہیں۔

حضورؐ نے اکیلا رہنے کے باوجود ہزیمت نہیں اٹھائی

حضور اکرم بھی احد میں بالآخر پہاڑ کی طرف تشریف لے آئے تھے جہاں مجاہدین پھر سے جمع ہو رہے تھے۔ حضرت عمرؓ بھی آپؐ سے پہلے یہیں آ گئے تھے۔ گو آپ ادھر پہلے لوٹنے والوں میں نہ تھے تاہم ملحوظ رہے کہ حضورؐ کی طرف کبھی شکست اور ہزیمت کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔

وقد قالت الصحابةؓ کلهم انه صلی الله علیه وسلم ما انهزم ولم ینقل احد قط انه انهزم صلی الله علیه وسلم فی موطن من المواطن وقد نقلوا اجماع المسلمین علیٰ انه لا یجوز ان یعتقد انهزامه صلی الله علیه وسلم ولا یجوز ذلک علیه. (شرح صحیح مسلم امام نووی جلد ۲ ص ۱۰۱)

ترجمہ: ''اور سب صحابہ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے نہیں ہٹے اور کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی مقام پر شکست کھائی۔ علماء نے اس پر اجماع نقل کیا کہ یہ اعتقاد رکھنا کسی طرح درست نہیں کہ آپ نے شکست کھائی اور نہ یہ آپ کے لئے کسی طرح جائز ہے۔''

صحابہؓ کی طرف بھی بھاگنے کی نسبت کسی طرح درست نہیں ٹھہرتی

اگر سب صحابہ کسی جنگ میں بھاگ جائیں اور حضورؐ اکیلے ہی دو چار ساتھیوں میں کھڑے رہ جائیں تو کیا یہ آپؐ کی بھی (معاذ اللہ) ایک ہزیمت ہو گی؟ مسلمانوں کے لئے اس نتیجہ سے بچنا از بس ضروری ہے سو ہمیں کوئی ایسی پوزیشن اختیار نہ کرنی چاہئے کہ مؤرخ حضورؐ کی طرف بھی اس شکست کی نسبت کر سکے۔ ایک شخص نے حضرت براء بن عازب (۷۲ھ) سے پوچھا کیا تم لوگ غزوہ حنین میں بھاگ گئے تھے، آپ نے فرمایا:

لا والله ماولیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم ولکنه خرج شبان اصحابه واخفاء هم. (صحیح مسلم ۲ ص ۱۰۰)

ترجمہ: ''نہیں ایسا ہرگز نہیں، خدا کی قسم رسول اکرم ﷺ نے کبھی جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی ہاں حضورؐ کے کچھ نوجوان صحابہ اور جلد باز لوگوں سے ایسا ہوتا رہا۔''

سائل نے سوال صرف صحابہ کے بارے میں کیا تھا۔ حضرت براء جواب میں حضور ﷺ کو بھی لے آئے۔ یہ جواب اس پس منظر میں ہے کہ صحابہؓ کے مجموعی فرار سے حضورؐ کے دامن پر بھی دھبے لگتے ہیں۔ تو جب حضور اکرم ﷺ پر یہ الزام کسی جہت میں درست نہیں تو اب جمہور صحابہ کرام کی طرف میدان جنگ سے فرار کی نسبت کیسے کی جاسکتی ہے۔ امام محی الدین النووی (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:

هذا الجواب الذی اجاب به البراء من بدیع الادب لان تقدیر الکلام فررتم

کلکم فیقتضی ان النبی ﷺ والفھم فی ذلک فقال البراء واللہ ما فر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن جماعۃ من الصحابہ جری لھم کذا و کذا.

ترجمہ: ''یہ جواب جو حضرت براء بن عازب نے دیا ہے بدیع ادب کا ایک پیرایہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی کہ جب تم سب بھاگ گئے تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ بھی انہی کے ساتھ رہے۔ جب آپ ﷺ جنگ سے کبھی نہ بھاگے تو یہ بات بھی نہیں ہوسکتی کہ کل صحابہ بھی بھاگے ہوں ہاں صحابہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوئے۔''

اور وہ کون صحابہ تھے جو اس کچھ وقت کے لئے نکلے وہ چند نوجوان تھے اور کچھ دوسرے جلد باز۔ بڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اس دن نہیں بھاگا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اس دن نوجوانوں میں سے نہ تھے۔

ترجمہ: ''یہ جواب جو حضرت براء بن عازب نے دیا ہے بدیع ادب کا ایک پیرایہ تقدیر کلام یہ ہوگی کہ جب تم سب بھاگ گئے تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ بھی انہی کے ساتھ رہے۔ جب آپ ﷺ جنگ سے کبھی نہ بھاگے تو یہ بات بھی نہیں ہوسکتی کہ کل صحابہ بھی بھاگے ہوں ہاں صحابہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوئے۔''

اور وہ کون صحابہ تھے جو اس کچھ وقت کے لئے نکلے وہ چند نوجوان تھے اور کچھ دوسرے جلد باز۔ بڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اس دن نہیں بھاگا۔

حضورؐ کے سامنے کسی نے ہزیمت کی نسبت کی تو آپ نے تردید کردی

ام سلیم نے حضورؐ سے گذارش کی تھی کہ مکہ کے طلقاء کو قتل کردیجئے یہ سچے دل سے ایمان نہیں لائے تھے تبھی تو یہ جنگ حنین میں ھوازن کے ساتھ مل گئے اور انہی سے آپ کو شکست دلوائی۔

اقتل من بعدنا من الطلقاء انھزموا بک. (صحیح مسلم جلد ۲، ص ۱۱۶)

ترجمہ: ''ہمارے بعد جو طلقاء بھی ہیں انہیں قتل کردیجئے یہی آپ کی ہزیمت کا سبب ہوئے ہیں۔''

حضورؐ نے اس کا انکار فرمایا اور کہا:

یا ام سلیم ان اللہ عزوجل قد کفیٰ واحسن.

ترجمہ: ''اے ام سلیم ان سے اللہ عزوجل کا معاملہ کافی ہے اور بہتر رہے گا۔

یعنی یہ وقتی ہنگامہ کوئی ہماری شکست نہیں اللہ تعالیٰ نے بہتر کفایت کی ہے اور انجام صحیح رہا ہے۔

غور کیجئے جب حضورؐ کے نزدیک حنین کی یہ شکست کوئی بڑی بات نہیں اور آپ اس کا الزام طلقاء پر بھی نہیں رکھنا

چاہتے۔ تو وہ لوگ حضورؐ کی نظر میں کس درجہ مردود ہوں گے جو اس کا بوجھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر پر رکھتے ہیں۔

رافضی اپنی عادت یہاں اس طرح پوری کرتا ہے:

جب اصحاب آنحضرتؐ کو نرغہ اعداء میں چھوڑ کر چلے گئے تو صرف چار شخص باقی رہ گئے............ان میں کہیں بھی اصحاب ثلثہ کے نام نظر نہیں آتے۔ لہٰذا وہ بالیقین مفرورین میں شامل تھے۔

(تجلیات صداقت ص ۵۵)

سیرت النبی ﷺ میں علامہ شبلی صاحب مغازی محمد بن اسحٰق (۱۰۵ھ) کی روایت سے لکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حسب ذیل اصحاب موجود تھے۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؓ، حضرت ابوسفیان بن حارثؓ، حضرت جعفر بن ابی سفیانؓ بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ربیعہ بن حارثؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ایمن بن ام ایمنؓ (سیرت النبی، جلد ۱، ص ۵۳۸)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہاں موجودگی کی کھلی شہادت

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

حضرت ابوقتادہؓ انصاری نے اس دوران ایک کافر کو مارا تھا۔ اس مقتول کا سامان کسی دوسرے شخص کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ جب ابوقتادہؓ نے بارگاہ رسالتؐ میں صورت حال بیان کی تو اس شخص نے کہا اس کافر کا سامان میرے پاس موجود ہے۔ مگر یا رسول اللہ! ابوقتادہؓ کو راضی کردیجئے کہ اس مقتول کا سامان مجھے چھوڑ دیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا خدا کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے شیروں میں سے کسی شیر کو جس نے راہ خدا میں جنگ کی محروم نہ رکھیں گے، اور اس سامان کو جو اس کا حق ہے تجھ سے دلوا دیں گے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا، ابوبکر نے ٹھیک کہا ہے، قتیل کا مال اسے (ابوقتادہ) کو لوٹاؤ۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۵۲۳)

اس سے صاف عیاں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ وہاں حضورؐ کے ساتھ موجود تھے اور حضور کے رفیق و مشیر کے طور پر حضورؐ کے ساتھ ساتھ تھے اور جنگ میں شریک فوجیوں کو خدا کے شیر کہہ رہے تھے۔ ایسے کون کہہ سکتا ہے جو خود جنگ میں شریک ہو نہ کہ منہ چھپائے کہیں بھاگا ہوا ہو۔

حافظ ابن کثیر محمد بن اسحٰق کی روایت سے وہاں حضرت عمرؓ کی موجودگی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

فقال عمر واللہ لا یفئھا اللہ علی اسد من اللہ ویعطیکھا فقال رسول اللہ صلی

اللّٰہ علیه وسلم صدق عمر. (البدایه والنهایه جلد ۴ ص ۳۲۷ھ)

حضرت عمرؓ نے یہ بات حضرت ابوبکرؓ کی تائید میں کہی یا حضرت عمرؓ نے پہلے از خود کہی تھی اس میں نافع ابی غالب کہتے ہیں:

ان القائل لذلک عمر بن الخطاب فلعله قاله متابعة لابی بکر الصدیق وساعده ووافقه له او قد اشتبه علی الراوی. (ایضاً ص ۳۲۹)

کوئی صورت حال ہو اس سے اتنا پتہ ضرور چلا کہ آخر تک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وہیں تھے۔ رافضی کا یہ کہنا کہ یہ وہاں کہیں نظر نہیں آئے یہ اس لئے ہے کہ اس کی آنکھیں نہیں جو انہیں دیکھ سکے ورنہ آنکھوں والے شہادت دے چکے کہ حنین میں مہاجرین میں سے جو حضورؐ کے ساتھ موجود رہے ان میں حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ سرفہرست ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ومعه رهط من اهل بيته علی بن ابی طالب وابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب واخوه ربیعه بن الحارث ...... ورهط من المهاجرین منهم ابوبکرؓ و عمر والعباس آخذ بحکمة بغلته البیضا. (البدایه والنهایه، جلد ۴، ص ۳۲۶)

ترجمہ: ”اور آپ کے ساتھ اہل بیت میں سے کچھ تھے جن میں حضرت علیؓ، حضرت ابوسفیانؓ بن حارث اس کا بھائی ربیعہ بن حارث..... اور کچھ مہاجرین میں سے جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ تھے اور حضرت عباسؓ بھی تھے۔ آپ نے اپنی اونٹنی بیضاء کی باگ تھام رکھی تھی۔“

قارئین کرام یہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی ثابت قدمی استقامت اور جرأت وصولت کا ایمان افروز نقشہ آپ کے سامنے ہے آپ اب خود فیصلہ کریں کہ فریقین میں سے کس کی گرفت مضبوط ہے۔ رافضی نے آفتاب ہدایت پر جو گرفت کی ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے اور ہم نے رافضی پر جو گرفت کی ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ قارئین دونوں کے مطالعہ سے بآسانی جان سکیں گے کہ کس کی بات درست ہے اور کس کے دلائل محض اس کے اپنے خیالات و وہمات ہیں۔ خدارا انصاف کیجئے موت کو یاد رکھئے اور آخرت میں حساب دینے پر یقین کیجئے۔

فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون. (پ ۷ الانعام ۸۱)

ترجمہ: ”اب دونوں فریق میں کون امن کا مستحق ہے۔ (بولو) اگر تم کچھ سمجھ بھی رکھتے ہو۔

اس وقت آپؐ کے ہمراہ ابوبکرؓ و عمرؓ، علی و عباسؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور چند آدمی تھے حضرت عباسؓ آپ کے خچر کی لگام تھامے ہوئے تھے اور ابوسفیان بن حارث رکاب پکڑے ہوئے تھے۔

(سیرت المصطفےٰ جلد ۳ ص ۱۰۳)

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

ہوازن کے تیر اندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا۔ آن واحد میں چاروں طرف سے اس قدر تیر برسائے گئے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہوگیا۔ اول طلقاء میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی کہ کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغہ میں تھے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ، عباس و علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم تقریباً سو یا اسی صحابہ میدان جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مستقیم نظر آتے تھے۔ یہ خاص موقع تھا جب کہ دنیا نے پیغمبرانہ صداقت و توکل اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔

(فوائد القرآن ص ۲۵۲، طبع سعودی عرب)

یہ چار شہادتیں ہم نے آپ کے سامنے رکھ دی ہیں جن میں حنین کے اس نازک وقت میں حضورؐ کے پاس حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی موجودگی کا کھلا ثبوت موجود ہے اور جہاں بھی یہ دکھائی دیے یہ حضورؐ کے ساتھ موجود ہیں۔ اب بھی اگر رافضی یہ لکھتا ہے کہ ان میں کہیں اصحاب ثلثہ کے نام نظر نہیں آتے تو ہم یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمہ آفتاب را چہ گناہ

رافضی لکھتا ہے اور کس ڈھٹائی سے لکھتا ہے:

یہ حضرات جنگ خیبر و جنگ خندق و حنین میں برابر اس عہد کی مخالفت کر کے میدان جنگ میں بھاگتے رہے۔ (تجلیات صداقت ص ۵۶)

اور پھر وہ آیات ان صحابہؓ کے بارے میں لکھتا ہے جو شروع یہاں سے ہوتی ہیں، واذ یقول المنافقون حالانکہ اس سے پہلے مومنین کے بارے میں یہ صریحاً موجود ہے کہ جنگ میں جو لوگ ابتلاء میں ڈالے گئے اور زلزلے کے پیرایہ میں ہلا کر رکھ دیئے گئے وہ سب مومن تھے اس زلزلہ خیز کیفیت سے کوئی ایمان سے باہر نہیں آجاتا ان سب حالات کے باوجود وہ لوگ جو اس وقت گھبراہٹ کا شکار ہوئے وہ بھی سب مومن ہی تھے۔ خارجیوں کے سوا انہیں کوئی کافر نہ کہہ سکے گا۔

ھنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالاً شدیدا. (پ ۲۱، الاحزاب ۱۱)

ترجمہ: ”وہاں مومنین ایک ابتلا میں ڈالے گئے اور وہ سخت زلزلے کی صورت پر ہلا دیئے گئے۔“ (مگر وہ تھے پھر بھی مومن ہی)

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ روافض جنگ احد کی آڑ میں صحابہؓ کے خلاف شرمناک بغض کا مظاہرہ کرتے ہیں ورنہ ہر صاحب بصیرت جانتا ہے کہ افراتفری کے ایسے حالات سے کبھی عقائد کشید نہیں کیے جاتے۔ گناہ

بعض الناس لعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخذھا فانزل اللہ وماکان لنبی ان یغل. (سنن ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۹۷)

الجواب:۔ اس روایت میں فقال بعض الناس کے الفاظ کس کے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس کے اور ظاہر ہے کہ یہ کلمہ تحقیر ہے سو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مراد اس سے صحابہ ہرگز نہ تھے اس سے یا تو وہ لوگ مراد ہیں جو ابھی ابھی اسلام لائے تھے اور ابھی ان کی تربیت نہ ہوئی تھی اور اگر کوئی بڑی عمر کے لوگ ہوں گے تو وہ منافقین میں سے ہوں گے حضرت عبداللہ بن عباسؓ خود نو عمر تھے وہ صحابہ کو بعض الناس کے کلمہ تحقیر سے کیسے ذکر کر سکتے تھے؟

اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہنے والوں کی اس طرح اصلاح فرمائی کہ نبی کا کام نہیں کہ وہ کچھ چھپالے یہ آیت پتہ دیتی ہے کہ وہ واقعۃً حضور کو نبی مانتے تھے لیکن ابھی ان کا ذہن یہ شعور نہ پائے ہوئے تھا کہ اللہ کے پیغمبر کو ہرگز لائق نہیں کہ وہ کسی قسم کی خیانت کرے۔ کلمہ ماکان لنبی ان یغل صرف اسی کی تربیت کے لئے کہا جاسکتا ہے جو آپ ﷺ کے نبی ہونے کا قائل ہو اور ظاہر ہے کہ منافقین آپ کو دل سے پیغمبر نہ مانتے تھے۔

سو راجح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ کوئی نو آموز لوگ ہونگے جو ابھی مقام نبوت سے نا آشنا تھے بڑے صحابہ سے کوئی شخص اس بات کی امید نہیں رکھ سکتا اسکی تائید امام فخر الدین رازی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

فقال بعض الجھال لعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخذھا فنزلت ھذہ الایۃ

(تفسیر کبیر جلد ۹ ص ۵۷)

ترجمہ:۔ بعض جاہلوں نے کہا ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے وہ چادر خود اٹھالی ہو اس پر یہ آیت اتری اردو تفسیروں میں سب سے پہلی اردو تفسیر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی ۱۲۳۰ھ) کی ہے اسے بھی اس مقام پر پڑھ لیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

جب بدر کی لڑائی فتح ہوئی اور غنیمت اس لڑائی کی آئی تھی کہ اس مال سے ایک کملی سرخ گم ہوئی تھی بعض کم بختوں نے کہا حضرت پیغمبر ﷺ نے اپنے واسطے رکھ لی ہے تب یہ آیت اتری کہ یہ پیغمبروں کا کام نہیں موضح القرآن ص ۷۰ شائع کردہ ملک دین محمد کشمیری بازار لاہور)

جاہلوں اور کم بختوں کے الفاظ پتہ دے رہے ہیں کہ یہ الفاظ اس وقت کسی عزت سے نہ کہے گئے تھے اور نہ حضور کی نسبت ایسی بات کوئی شریف آدمی کہہ سکتا تھا صحابہ کے بارے میں یہ بدگمانی کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔

ایک ضمنی سوال:۔

کیا کوئی اور آپ واقعہ بھی ملتا ہے کہ کسی نے اس عامی بے خبری میں حضور ﷺ پر خلاف عدل چلنے کا گمان کیا ہو

اگر کوئی اور ایسا واقعہ بھی ملے تو اسکی روشنی میں اسے سمجھنا اور آسان ہو جاتا ہے۔

الجواب:۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ اموال ھوازن کی تقسیم میں بعض انصار نے یہ کہا تھا **یغفر اللہ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعطی قریشا ویدعنا وسیوفنا تقطر من دمائھم**

ترجمہ:۔ اللہ رسول پاک کو معاف فرمائے قریش کو تو کھلے طور پر دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز کر رہے ہیں اور ابھی ہماری تلواروں سے ان کے خون خشک نہیں ہونے پائے

یہ بات حضور کو بتلائی گئی تو حضور نے انصار کو ایک جگہ جمع فرمایا اور ان سے پوچھا یہ کیا باتیں ہیں؟ جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہیں تو انصار میں سے جو فقیہ تھے (دین میں سمجھ رکھنے والے) انہوں نے کہا کہ حضور ہم میں جو سمجھدار اور اہل الرائے ہیں انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی صرف نواحداث نوجوانوں نے کہا تھا

قال لہ فقھاء ھم اماذو ر اینا یا رسول ﷺ فلم یقولو اشیاً واما الناس مناحدیثۃ اسنانھم فقالو یغفر اللہ لرسول ﷺ یعطی قریشا ویترک الانصار وسیوفنا تقطر من دمائھم (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۴۴۵

ترجمہ:۔ حضور کی خدمت میں فقہائے صحابہ نے عرض کی اے اللہ کے پیغمبر ہمارے سمجھدار لوگوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کچھ نوجوانوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ حضور کو معاف فرمائیے قریش کر تو دے رہے ہیں اور انصار کو چھوڑ رہے ہیں اور ہماری تلواریں ابھی تک کفار کے خون سے تر ہیں۔

اس سے پتہ چلا کر وہ چھوٹی عمر کے نوجوان اس بدگمانی کے باوجود حضور کی نبوت و رسالت میں کسی شک اور تردد میں نہ تھے ورنہ وہ اپنی بات یغفر اللہ لرسول ﷺ سے شروع نہ کرتے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان نوجوانوں کی دماغی سوچ اس درجے میں نہ آئی تھی کہ اس قسم کے گمان سے مقام نبوت مجروح ہوتا ہے مہاجرین شروع سے حضور کے زیر تربیت رہے ان سے ایسی بات کسی طرح نہ نکل سکتی تھی یہ انصار تھے اور انکے بھی صرف نوجوان جنکا دینی شعور ابھی پورا پختہ نہ ہوا تھا۔ ایسا ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے:۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور صحابہ میں مال تقسیم کر رہے تھے کہ عبداللہ ذو الخویصرہ التمیمی آگے آیا اور اس نے کہا اعدل یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول عدل کریں۔

آپ نے فرمایا

ویلک ومن یعدل اذالم اعدل۔ یہ تو نے کیا بات کہی ہے

جب میں عدل نہ کر پاؤں تو اور کون ہے جو عدل کر سکے۔ (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۲۷)

اس پر حضرت عمرؓ نے آپ سے اسکے قتل کرنے کی اجازت مانگی آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا اس کے ایسے ساتھی ہونگے کہ تم ان کی نمازوں اور روزوں کو دیکھ کر اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھو گے۔ یعنی یہ ظاہری آداب عبادات

میں بہت آگے دکھائی دیں گے لیکن دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار میں سے نکل جاتا ہے (یہ خوارج کی طرف اشارہ ہے یہ تحریک آئندہ اٹھنے والی تھی)

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضور کے بارے میں تقسیم اموال میں عدل نہ کرنے کا ابہام پیدا کرنے والے لوگوں میں حضرت عمرؓ اور ان جیسے دوسرے مہاجرین اور پختہ کار صحابہ رضی اللہ عنہم ہرگز شامل نہ تھے بلکہ حضور نے اس حدیث میں حضرت عمرؓ اور ان جیسے حضرات کو انکے مقابل ذکر فرمایا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ بدر کے مال غنیمت میں ایک چادر کی گمشدگی پر ہر اس قسم گمان پیدا کرنے والے معروف صحابہ ہرگز نہ تھے یہ صرف ان نو احداث نو جوانوں نے کہا ہوگا جن کا کام دینی شعور ابھی پختہ نہ ہوا تھا اور وہ ابھی تک یہ سمجھ نہ پائے تھے کہ نبی سے اس قسم کا کام نہیں ہوسکتا اور اگر صورت واقعہ یہ نہیں تو پھر ایسی گستاخی کرنے والے یقیناً منافقین تھے۔ کوئی مسلمان اپنے پختہ دینی شعور سے ایسی بات ہرگز نہیں کہہ سکتا حدیث میں ان لوگوں کو بعض الناس سے ذکر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کلمہ تحقیر ہے جو پختہ رجال کار پر نہیں بولا جاتا حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں۔

نزلت هذه الاية وما كان لنبى ان يغل فى قطيفة حمراء فقدت يوم بدر فقال بعض الناس لعل رسول الله صلى الله عليه وسلم اخذها فانزل الله وما كان لنبى ان يغل

ترجمہ:۔ یہ آیت کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ کوئی چیز چھپالے ایک سرخ چادر کے بارے میں بدر کے دن اتری تھی بعض لوگوں نے کہا ہوسکتا ہے کہ وہ رسول پاک نے لے لی ہو اس پر یہ آیت اتری کہ یہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی چیز کو چھپالے

محدثین کے ہاں بعض الناس سے یہاں کون لوگ مراد لئے گئے ہیں اسے بھی دیکھ لیجئے۔

امام تفسیر امام مجاہد (۱۰۰ھ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا یہ بات منافقوں نے کہی تھی **عن مجاهد ابن عباس قال انهم المنافقون۔** تفسیر ابن کثیر جلد ا ص ۴۲۱

دسویں صدی کے مجدد حافظ جلال الدین السیوطی (۹۱۱ھ) بھی یہی لکھتے ہیں۔

ولكن المنافقين اتهموا النبى فى شئى من الغنيمة فانزل وما كان لنبى ان يغل ۱۶۲ھ جلد ۲

اب آگے چلئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں۔

تنزيهم عما اتنيهمة يه بعض المنافقين يوم بدر (روح المعانی جلد ۲ ص ۳۲۱)

ترجمہ:۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کی اس اتہام سے برئیت ہے جو بدر کے دن بعض منافقون نے آپ پر لگایا تھا۔

کسی روایت میں نہیں ملتا کہ (نوٹ) یہ منافق معرکہ بدر میں کہیں دیکھے گئے ہوں یہ اس وقت کی بات ہے جب معرکہ بدر سر ہو چکا تھا اس وقت کچھ اور لوگ بھی لباس اسلام میں وہاں آگئے ہوں گے تو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا سو اس قسم کی روایات سے بدریوں کا تقدس ہرگز مجروح نہیں ہوتا۔

نیز اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت اسلام لانے والے لوگ اسلام قبول کرتے ہی مقام رسالت

اور اسکے آداب تک نہ پہنچے ہوئے تھے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ حضور ﷺ کی تربیت میں ہوتے تھے تب کہیں جا کر ان پر اسلام کے تقاضے کھلتے۔

حضورؐ اپنے فیض صحبت سے انکے دلوں کا تزکیہ کرتے انہیں کتاب وسنت کی تعلیم دیتے پھر کہیں جا کر وہ پختہ فکر مسلمان بنتے تھے لیکن ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ وہ قبول اسلام کے وقت حضور اکرمؐ کے اللہ کا رسول ہونے میں ہرگز کسی شک اور تردد میں نہ ہوتے تھے۔ صرف اتنی بات تھی کہ وہ مقام رسالت کے علمی تقاضوں سے ابتدائی پوری طرح واقف نہ ہوئے ہوں گے سو ان نادانی کے دنوں میں اگر ان میں کسی سے ایسی کوئی بات نکلے تو اسکے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ بات ان سے دوران تربیت نادانی میں صادر ہوئی ہے پھر جب وہ حضورؐ کی تعلیم وتربیت سے اپنے اسلام میں پختہ ذہن اور پختہ کار رجال اسلام بنے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں براہ راست مخاطب کرتے انہیں انکے کمال دین کی اسطرح خبر دی

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى ورضيت لكم الاسلام دينا

نیز اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کی کوئی بات سابقین اولین میں کبھی کسی سے صادر نہیں ہوئی اس طرح کی کمزور روایات سے صحابہ کے بارے میں عقیدے قائم نہیں کئے جاسکتے کہ وہ حضور ﷺ پر اس قسم کا الزام لگانے میں کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے کہ شاید وہ چادر آپ نے اپنے لیے رکھ لی ہو (معاذ اللہ)

کیا ایسا سمجھنا اس نادانی میں نہیں ہوسکتا کہ وہ حضورؐ کو مختار کل سمجھتے ہوں گے کہ آپ عدل نہ بھی کریں تو آپ کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر ایمان کے تقاضے پوری طرح کھول دیے اور وہ مقام رسالت سے پوری طرح آشنا ہوئے تو اب وہ آسمان ہدایت کے ستارے بن کر چکے، اللہ رب العزت نے انہیں سمجھا دیا کہ نبی سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کوئی چیز چھپائے یا کسی قسم کی خیانت کرے کسی بشری تقاضے سے کسی سے کوئی ایسی بات نادانی میں نکلے تو اس پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی اور نہ اس قسم کی باتوں سے کسی کو کسی عقیدے کا ملزم قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس قسم کی روایات سے اکابر صحابہ کے بارے میں یہ ابہام پیدا کرنا کہ وہ حضور ﷺ پر اس طرح کا الزام بھی لگا دیتے تھے ایسا گمان ہے جسے قرآن کریم گناہ ٹھہراتا ہے ان بعض الظن اثم جو لوگ صحابہ کے بارے میں اس قسم کی بدگمانیاں پیدا کرنے ہی میں آخرت کی نجات سمجھتے ہیں انکے بارے میں کیسے مانا جاسکتا ہے کہ ان میں ایمان کسی درجے میں قائم ہوگا **وبئس ماشروا به انفسكم لوكانو ايعلمون**

یہ صرف اس صورت میں ہے کہ وہ منافقین نہ ہوں محدثین میں بیشتر حضرات انہیں کھلے طور پر منافقین لکھتے ہیں ہم ان سے بعض کی عبارت پہلے پیش کر آئے ہیں۔

ایک آخری سوال

یہ جو کہا جاتا ہے کہ شیعہ عقائد کے پیچھے یہودی سازش کارفرما رہی ہے وہ نہ چاہتے تھے کہ مسلمان دنیا میں کسی غالب اور فاتح درجے میں رہیں کیا یہ بات صحیح ہے اور کیا یہ درست ہے کہ شیعیت کا پودا عبداللہ بن سبا نے کاشت کیا تھا۔

جس کے برگ وبار دنیا نے اس کے دوسو برس بعد دیکھے۔

الجواب

ہاں یہ درست ہے کہ یہود کا ایک بڑا عالم صف اسلام میں داخل ہونے کے لیے آیا تھا اور اس نے آتے ہی یہ بات چلادی کہ حضرت علی جیسے بڑے عالم کو خلافت میں کیوں پیچھے رکھا گیا ہے یہ پہلا تیر تھا جو یہودیوں نے اس بات پر چلایا جس کی بنا بالفاظ قرآن اشداء علی الکفار اور رحماء بینھم میں واضح تھی اور حضرت ابوبکر وعمر اور حضرت علی ایک ہی ملت کے افراد تھے مگر اس یہودی نے آتے ہی یہ ایک سوال پیدا کر دیا اور شیعہ صاحبان اب تک اسی سوال کو ہر جگہ اٹھاتے اور دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

اس یہودی نے کہا میرے کچھ سوالات ہیں اگر مجھے ان کے صحیح جوابات ملے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا وہ مسلمانوں کے پاس کب آیا؟ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اور انہی سے اس نے کچھ سوالات پوچھے۔ اس نے حضرت عمرؓ سے کہا۔ یاعمر انی جئتک ارید الاسلام فان اخبرتنی عما اسئلک عنه فانت اعلم اصحاب محمد بالکتاب والسنة و جمیع ما ارید ان اسئل عنه. اس وقت شاہان عالم کا دستور تھا کہ بادشاہ سے اگر کوئی بات پوچھی جائے تو بادشاہ خود جواب نہ دیتے تھے جواب وزیر دیتا تھا اس میں سربراہان ممالک کا رعب ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس یہودی کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ کہ جواب یہ دیں گے

محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) روایت کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسے کہا۔

لست هناک لکنی ارشدک الی من هو اعلم امتنا بالکتاب والسنة و جمیع ماتسأل عنه وهو ذاک فاومأ الی علیؓ. (اصول کافی کتاب الحجة جلد ۳ ص ۱۷۳ طبع کراچی)

ترجمہ: یہ میرا کام نہیں لیکن میں تمھیں اس شخص کا پتہ دیتا ہوں جو ہماری اس امت میں کتاب وسنت کا او جو تو پوچھے اس کا سب سے بڑا عالم ہے اور وہ یہ ہے اور آپ نے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کیا۔

یہودی عالم کا پہلا زہر آلود تیر

یہودی نے طنزاً کہا علم کی بات علی بتائے اور خلافت آپ لیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اسے جھڑک دیا روایت

فقال له الیهودی یا عمر ان کان هذا کما تقول فما لک ولبیعة الناس و انما ذاک اعلمکمؓ...... فزبره عمر.

ترجمہ: اس یہودی نے آپ سے کہا اے عمر اگر بات اس طرح ہے جو آپ نے کہی کہ یہ کتاب وسنت کا سب سے بڑا عالم ہے تو پھر تجھے لوگوں سے خلافت کی بیعت لینے کا کیا حق تھا۔ اس پر آپ نے اسے جھڑک دیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہودی محبان علی میں سے تھا اور حضرت عمر کی خلافت سے خوش نہ تھا روایت کے اصل الفاظ آپ دیکھ چکے ہیں

قارئین کے لیے یہ غور کا مقام ہے اسلام میں تو یہ بدبخت ابھی آیا نہیں اور خلافت کے مسئلہ کو وہ پہلے سے اٹھا رہا ہے۔ کیا یہ بات یقین کرنے کے لیے کافی نہیں کہ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں مسئلہ خلافت کو اختلافی بنائے اور سوال بھی اس کے ایک تاریخی نوعیت کے تھے کسی دینی اور اعتقادی نوعیت کے نہ تھے اس سے ہر نقاد اور مورخ یہ نتیجہ نکالے بغیر نہ رہ سکے گا کہ سنی شیعہ اختلافات کے پیچھے ایک یہودی سازش کارفرما تھی کتاب وسنت کی روشنی میں مسلمانوں میں مسئلہ خلافت میں کبھی کوئی بنیادی اختلاف اس وقت تک نہ اٹھا تھا۔

اس یہودی کے وہ سوالات کیا تھے؟ پیشتر اس کے کہ ہم انھیں ہدیہ قارئین کریں نامناسب نہ ہوگا کہ ہم پہلے اس روایت پر کچھ تبصرہ کر دیں جسے ہم نے اپنے اس دعوے پر پیش کیا ہے کہ سنی شیعہ اختلاف کے پیچھے واقعی ایک یہودی سازش کارفرما رہی ہے یہ کوئی دو فرقوں کا اختلاف نہیں ہے۔

اس روایت سے یہ امور مستفاد ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ تھے تو حضرت علیؓ ان کی مجلس میں عام موجود ہوتے تھے اور وہ آپ سے کسی پہلو سے کنارہ کش نہ ہوتے تھے اور نہ آپ نے پہلے کبھی حضرت علی کے مکان کا دروازہ گرایا ہوگا ورنہ وہ آپ کے پاس اس طرح کبھی حاضر باش نہ رہتے ظالم اور مظلوم کبھی اس طرح بیٹھے نہیں دیکھے جاتے۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے اس وقت اپنے آپ کو اور حضرت علی کو ایک ملت کہا ہے اس روایت میں اہل ملتنا کے الفاظ اس کی قوی شہادت ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں ایک ملت پر تھے اور دونوں میں ہرگز کوئی اعتقادی اختلاف نہ تھا۔ حضرت علی آپ کی مجلس میں بحیثیت وزیر تشریف فرما ہوتے تھے۔

۳۔ اسلام میں علم کے اصل منابع قرآن وسنت ہیں اور یہی میراث محمدی ہے اور حدیث ثقلین یہی ہے کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں کتاب اللہ اور اپنی سنت یہ نہیں کہ حضور کے نام مبارک کو نکال کر اس کی بجائے دو منابع علم قرآن اور عترت کو سمجھا جائے عترت تیسرے درجے میں آ سکتی ہے۔ ثقلین وہی رہیں گے جو حضرت عمرؓ نے اس مجلس میں ذکر کیے یعنی کتاب وسنت اور حضرت علیؓ نے ان سے کوئی اختلاف نہ کیا نہ کہا کہ روایت ثقلین تو کچھ اور ہے۔

۴۔ یہ آنے والا شخص یہود کا سب سے بڑا عالم تھا اتنے بڑے عالم کا خود ارادہ اسلام کرنا اور اپنے عوام کو اس پر نہ

لا نا معنی خیز ہے اگر وہ دل سے ارادہ اسلام کرتا تو اپنے ساتھ اپنے معتقدین کا ایک جم غفیر لے کر آتا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس مجلس اسلامی میں اعتقاد اسلام کے لیے نہیں صرف اظہار اسلام کے لیے آیا تھا ابو عمرو الکشی نے رجال میں ایسے موقع پر ایک دوسرے یہودی کے لیے اظہر الاسلام کے الفاظ لکھے ہیں اور کہا ہے کہ اسی سے یہ بات چلی ہے کہ شیعہ عقائد کے پیچھے یہودی سازش کار فرما ہے علامہ کلینی کے ان الفاظ پر پھر سے غور کریں۔

اقبل یهودی من علماء یثرب و تزعم یهود المدینة انه اعلم اهل زمانه حق رفع الی عمرؓ فقال له یا عمر انی جئتک ارید الاسلام.

اب ہم وہ سوالات بھی ہدیہ قارئین کرتے ہیں جو اس نے کیے اور سیدنا حضرت علی مرتضیٰ نے حضرت عمر کے ارشاد پر ان کے جوابات دیے۔

(۱) وہ کونسا پتھر ہے جو سب سے پہلے زمین پر رکھا گیا (آپ نے فرمایا حجر اسود) (۲) وہ کونسا درخت ہے جو سب سے پہلے زمین پر اگا (آپ نے فرمایا کھجور) (۳) وہ کونسا چشمہ ہے جو سب سے پہلے زمین پر بہا (آپ نے فرمایا آبِ حیات)

پھر اس نے تین سوال اور کیے (۱) اس امت میں ائمہ ہدایت کتنے ہوں گے؟ (۲) تمھارے نبی کا جنت میں کیا مقام ہوگا (۳) اور یہ بھی بتا کہ وہاں آپ کا رفیق جنت کون ہوگا؟

حضرت علیؓ نے دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا تھا کھجور اور یہ بھی فرمایا تھا یہود کے ہاں سب سے پہلا درخت زیتون کا تھا جو زمین میں اگا۔

علامہ کلینی نے پہلے تین سوالوں کے جوابات روایت نہیں کیے انھیں ہم باقر مجلسی کی کتاب مرأۃ العقول سے لے رہے ہیں پچھلے تین سوال تقابل ادیان کے طلبہ کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں ابھی یہ بدبخت مسلمان نہیں ہوا مگر اسے اس امت کے بارہ اماموں کی فکر ابھی سے لگی ہے معلوم ہوا ملت اسلامی میں اثنا عشری عقیدے کی پہلی آواز اس یہودی نے اٹھائی تھی اور اس کے جواب میں حضرت علی کی زبان سے یہ الفاظ وضع کیے گئے ہیں کہ جنت میں حضورؐ کے ساتھ بارہ امام ہوں گے ان کی والدہ ہوگی اور ان کی نانی حضرت خدیجہ ہوں گی۔

یہاں اس بات پر بھی نظر رہے کہ حضرت علیؓ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ وہ بارہ امام حضور اکرم ﷺ کی ذریت سے ہوں گے اثنا عشریوں کے بارہ اماموں میں سے صرف گیارہ حضورؐ کی اولاد میں سے ہیں پہلے امام حضرت علی تو حضور کی اولاد میں سے نہ تھے ورنہ ان کا نکاح حضرت سیدہ فاطمہ سے نہ ہوتا وہ حضورؐ کے داماد تھے۔ بیٹے نہ تھے۔ یہ غلط بیانی خود اس روایت کی تردید کر رہی ہے تاہم اس میں کسی کو کوئی شک نہ رہنا چاہیے کہ ملت اسلامی میں یہ اثنا عشری عقیدہ یہود سے ہی آیا

ہے اور انہی کی سازش سے ملت اسلامی میں سنی شیعہ کی آپس میں آویزش ہوئی ورنہ مومنین تو سب آپس میں بھائی تھے۔ قرآن میں یہ بات واضح طور پر کہہ دی گئی تھی۔ وانما المومنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم ہم اس وقت یہ نہیں کہہ رہے کہ اس یہودی کا نام عبداللہ بن سبا تھا وہ اٹھارہ سال تک کہیں چھپا رہا اور پھر حضرت عثمان کے زمانے میں سامنے آیا۔

ہندوستان کے مشہور عالم دین علامہ طاہر ۹۸۶ء (پٹنہ) ایک جگہ لفظ زندیق کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

والمراد ههنا...... قوم ارتدوا عن الاسلام ومثل قوم من السبائية لصحابة عبدالله بن سبا اظهروا الاسلام ابتغاءً للفتنة و تضليلاً للاسلام فسعى اولاً فى اثارة الفتنه على عثمان رضى الله عنه ثم ان انضوىٰ الى الشيعة. (مجمع البحار جلد ا ص ۶۹ تحت لفظ زند)

ترجمہ: اس جگہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام سے مرتد ہوئے (گو انھوں نے زندقہ کی راہ سے ارتداد اختیار کیا) جیسے سبائی جو عبداللہ بن سبا کے گروہ کے تھے انھوں نے اسلام کا لباس پہنا۔ اسلام میں فتنہ قائم کرنے اور اسلام میں غلط راہ نکالنے کے لیے عبداللہ بن سبا نے اولاً حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا اور پھر وہ کھلا شیعہ نظریات کی طرف چلا گیا۔

گو اس وقت شیعہ مذہب نہ بنا تھا لیکن صحابہ کے خلاف عبداللہ بن سبا نے دھویں کے آثار ضرور پیدا کر دیے تھے اور یہود کی یہ سازش چوتھی صدی میں ایک باقاعدہ مذہب بن کر ابھری۔

پیش نظر رہے کہ اصول کافی کی اس روایت میں اس کے اسلام لانے کا ذکر نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت علی کے جوابات پر اظہار اطمینان نہ کیا تھا اور یہ بات اس کی اندرونی بدنیتی کی خبر دیتی ہے۔

قرآن پاک سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کے پیروؤں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں خوشحالی کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا پر فرمایا تھا کہ یہ دنیا اور آخرت کی بہار تمھارے لیے نہیں یہ اس نبی امی کے پیروؤں کے لیے ہے جن کی خبر میں پہلے سے تورات وانجیل میں چلی آ رہی ہے۔

الذين يتبعون الرسول النبى الامى الذى يجدونه مكتوباً عندهم فى التوراة والانجيل يامرهم بالمعروف و ينههم عن المنكر و يحل لهم الطيبت و يحرم عليهم الخبئث و يضع عنهم اصرهم والاغلال التى كانت عليهم. فالذين امنوا به و عزروه و نصروه و اتبعوا النور الذى انزل معه اولئک هم المفلحون. (پ۹ الاعراف ۱۵۷)

ترجمہ: (یہ مرتبہ ان لوگوں کے لیے ہے) جو پیروی کریں گے اس رسول نبی امی کی جس کی خبریں وہ پا رہے ہیں پہلے سے لکھی ہوئی تورات میں اور انجیل میں وہ نبی پاک نیکی کا حکم دے گا۔ برے کاموں سے روکے گا۔ حلال ٹھہرائے گا ان کے لیے سب پاک چیزیں اور حرام کرے گا ان پر تمام ناپاک چیزیں۔ اتارے گا ان پر سے ان کے بوجھ اور غلامی کے وہ طوق جو ان کی گردنوں پر پڑے ہیں سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ ہیں فلاح کو پہنچنے والے۔

صحابہ کی اس دنیا اور آخرت کی بہار پر ڈھ گو رافضی کا دل اتنا جلا اور سمٹا کہ وہ عمر بھر کہتا رہا کاش کہ یہ حضرات یہ فتوحات نہ کرتے اور مسلمانوں کے جھنڈے پوری دنیا میں لہرائے نہ جاتے۔

حضرت موسیٰ کے پیروؤں کی (یہودیوں کی) یہ دعا پوری نہ ہوئی اور صحابہ کی فتوحات وہ پہلا کانٹا تھا جو یہودیوں کے دل میں چبھا یہاں تک کہ انھوں نے خلفائے راشدین کے خلاف ایک پورا مذہب ترتیب دے دیا اگر یہ صرف مسئلہ خلافت کا اختلاف ہوتا تو شیعوں کے ہاں جمہور اہل اسلام سے کلمہ اذان، نماز، افطار روزہ اور وضو تک میں اختلاف نہ ہوتا یہ تو ایک پورا مذہب ہے جو پہلے اسلام کے مقابل لا کھڑا کر دیا گیا ہے۔ شیعہ عوام میں کبھی اپنی تنہائی کے چند لمحوں میں سوچیں کہ خلافت کے اختلاف سے (اگر اسے اپنے تصور میں کچھ جگہ دی جائے) اذان وضو اور نماز میں اختلافات کیوں پیدا ہو گئے کیا کوئی پڑھا لکھا شیعہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو اذان دی جاتی تھی یہ وہی تھی جو آج اثنا عشریوں کے ہاں دی جاتی ہے اور اس میں حضرت علی کی خلافت بلافصل کا شب و روز اعلان کیا جاتا ہے یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں حضرت علی اپنی نمازیں تو ان سے علیحدہ نہ کر سکے لیکن اس وقت شیعہ کی یہ اپنی اذان موجود تھی جو شیعہ اپنی خفیہ مجالس میں رہے تھے اور اپنی باجماعت نمازیں اپنی اپنی مجالس میں پڑھتے تھے۔ حالات کا یہ عصری خاکہ کبھی کسی پڑھے لکھے آدمی کے ذہن میں نہ آ سکے گا۔

خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے اگر حضرت علی کو ثقیفہ بنی ساعدہ میں نہ بلایا گیا تو اس کی وجہ سے پوری امت کا طریق وضو کیسے مختلف فیہ ہو گیا جو سالہا سال سے مسلمان کرتے چلے آ رہے تھے کیا بدر اور احد کے میدانوں میں سب مسلمانوں نے ایک جیسی نمازیں نہ پڑھی تھیں اور کیا اس وقت ان کے وضو یکساں نہ تھے؟ شیعہ علماء نے جواباً پورا مذہب علیحدہ ترتیب دے رکھا ہے یہ بتلا رہا ہے کہ ان کا اہل سنت سے اختلاف صرف مسئلہ خلافت میں نہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نافذ کردہ اسلام کے مقابل ایک پورا دوسرا اسلام لایا گیا ہے اور ان کی تفریق امت کی یہ کوشش بالآخر کامیاب ہو کر رہی تفریق اہل اسلام کا جو خواب پہلے ان یہودیوں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر اب پوری دنیا کے سامنے ہے۔

ہم شیعہ نوجوانوں کو اس نقطہ پر غور کرنے کی دعوت دے رہے ہیں ہو سکتا ہے ان کی دنیوی تعلیم ان کے ذہن

میں یہ بات لے آئے کہ محض خلافت کے اختلاف سے پورے کا پورا اسلام کبھی اس طرح دو ایوانوں میں نہیں بٹ سکتا ورنہ جہاں تک ان کے علماء کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ڈھ گو چلے آ رہے ہیں۔ وہ دین و مذہب کیسے کسی قوم کو نقطہ یقین دے سکتا ہے جس کی بنیادیں یہودیوں نے کسی مثبت دعوت پر نہیں اکابر صحابہ کے خلاف تبرا کے ایک منفی پراپیگنڈا پر رکھی ہیں

ہم نے اس جلد میں اثنا عشریوں کے جملہ اصولی مسائل لپیٹ کر رکھ دیے ہیں۔ اللہ رب العزت کی توفیق شامل حال رہی تو ہمارے قارئین اس کی دوسری جلد میں تجلیات صداقت کے جملہ فروعی مسائل کو بھی اس طرح دیکھیں گے جیسے کوئی مکڑی کے جالے میں نظر ڈالے یہاں وہ اندھیرے کے سوا کچھ نہ دیکھ پائے گا ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون.

ہم اس پر اس جلد کو ختم کرتے ہیں اور اللہ رب العزت کے حضور صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ وہ شیعہ نوجوانوں کو اپنے علماء کی اس منفی روش سے نکلنے کی سعادت عطا فرمائے۔

تم الجلد الاوّل و یتلوه الثانی ان شاء اللّٰه وهو المستعان و علیه التکلان

مولف عفا اللہ عنہ۔ حال مقیم مانچسٹر

مطالعہ قادیانیت کی چار جلدیں

جسٹس ر سپریم کورٹ ڈاکٹر علامہ خالد محمود کے قلم سے

◇◇◇

جلد اوّل — عقیدۃ الامت فی معنی ختم النبوۃ (۳۶۸ صفحات)

ختم نبوت کا معنی چودہ سو سال سے امت کیا سمجھ رہی ہے

◇◇◇

جلد دوم — عقیدۃ خیر الامم فی مقامات عیسٰی بن مریم (۵۱۰ صفحات)

نزول عیسٰی بن مریم کا عقیدہ چودہ سو سال سے کیا چلا آ رہا ہے

◇◇◇

جلد سوم — عقیدۃ الاعلام فی الفرق بین الکفر والاسلام (۳۶۸ صفحات)

کفر و اسلام کا معیار امت میں چودہ سو سال سے کیا چلا آ رہا ہے

◇◇◇
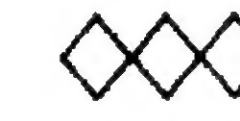
جلد چہارم — مرزا غلام احمد قادیانی (۴۵۶ صفحات)

اپنی عادات، پیشگوئیوں اور کردار کے آئینہ میں

◇◇◇

شائع کردہ: محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ لاہور

جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی شاہدرہ لاہور